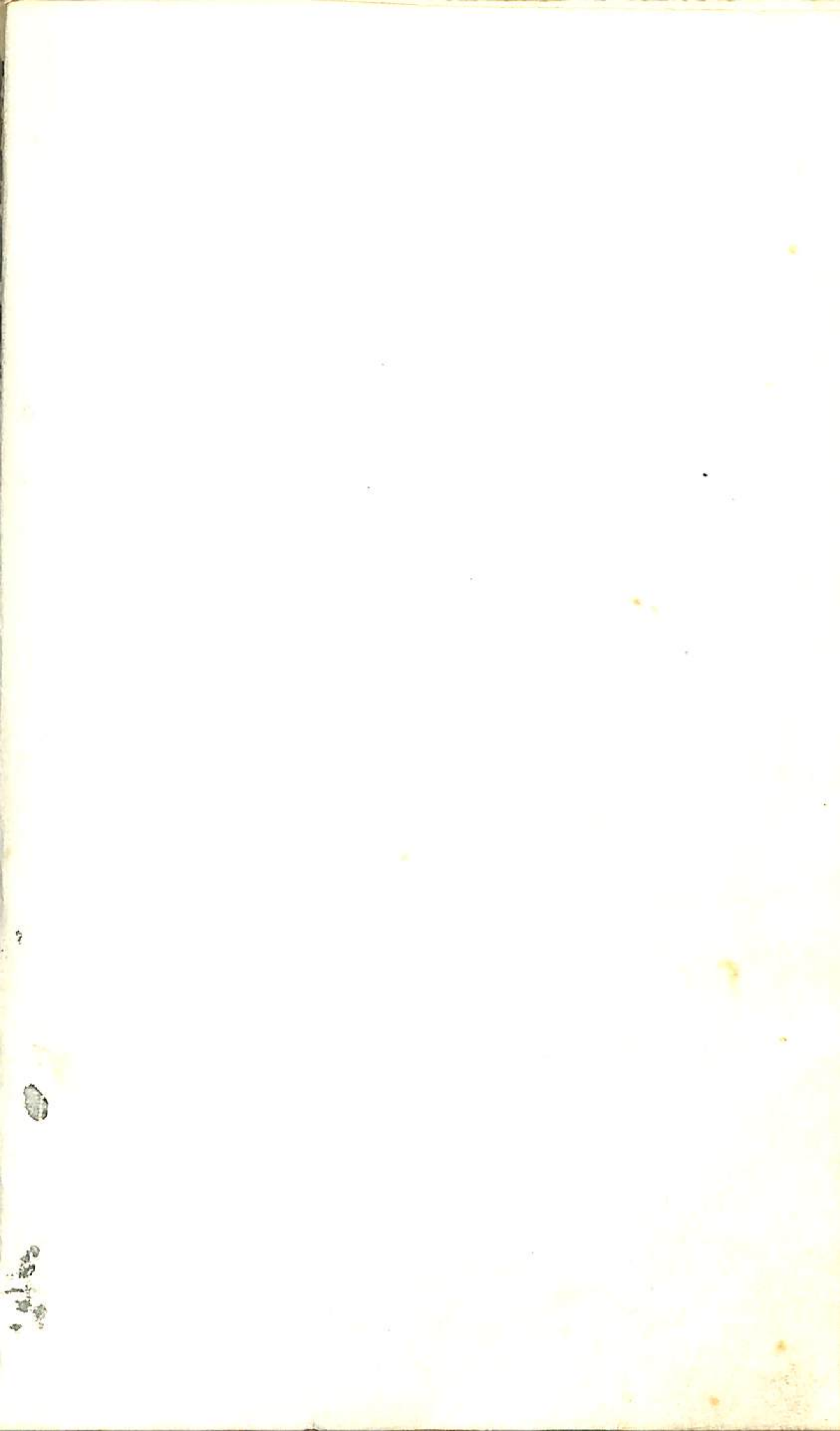
# نعرۂ حق

جلد سوم



# نعرۂ حق

سوامی وویکانند کی تقاریر اور تصانیف سے اِنتخاب



جلد سوم

# NÂRA-É-HÂQ

Selections from speeches and writings of

## SWAMI VIVEKANANDA

VOLUME : III

*Published by*
SWAMI SWAHANANDA
*Secretary*
Sri Ramakrishna Mission
NEW DELHI



FIRST EDITION
1964

Ordinary Binding
*Rs. 8-00*

Deluxe Binding
*Rs. 10-00*

Kapur Printing Press, Delhi

پبلشر
سوامی سواہ آنند
سیکرٹری
شری رام کرشن مشن، نئی دہلی

پہلا
ایڈیشن

قیمت
عام جلد ...... آٹھ روپیہ
مجلّد فل کلاتھ دس روپیہ

مؤلف و مترجم:- دھرم پال جرنلسٹ

# فہرست مضامین

صفحہ




उत्तिष्ठत जाग्रत प्राप्य वरान्निबोधत

اُٹھو، جاگو اور اُس وقت تک نہ رُکو جب تک منزل نہ پالو

# دیباچہ

سوامی وویکانند کی تصانیف اور تقاریر کو اُردو میں پیش کرنے کا جو سلسلہ نعرۂ حق، جلد اوّل سے شروع کیا گیا تھا، زیرِ نظر کتاب اس کی تیسری اور سرِدست آخری کڑی ہے۔ اس مجموعہ کا نام نعرۂ حق، جلد سوم ہے۔ سوامی وویکانند علم و عمل کے پیکر، ہندوستان کی روحانیت کے بے مثل پیغامبر اور اس کی ثقافت کے بے بدل سفیر تھے۔ اس کتاب میں ان کے گلزارِ تخیّل سے جی بھر کر گل چینی کی گئی ہے، اُردو ترجمہ اور تالیف کا کام نعرۂ حق، جلد دوم کے مترجم اور مؤلف شری دھرم پال جرنلسٹ کے ہی سپرد کیا گیا تھا، جو کہنہ مشق اخبار نویس ہی نہیں، سوامی وویکانند کے پروانے اور دیوانے بھی ہیں مترجم کی ہر چند یہی کوشش رہی ہے کہ اس کتاب کا ایک ایک ورق دامنِ باغبان اور کفِ گل فروش بنا دیا جائے۔ لیکن احتیاط کے باوجود اگر ترجمہ اور تالیف میں کہیں کوئی خامی یا تشنگی نظر آئے تو از راہِ شفقت مترجم کو معاف کر دیا جائے۔

نئے ہندوستان کے معماروں میں سوامی جی کا نام سرِ فہرست آتا ہے، ان کی مختصر سی زندگی ہندوستان کو روحانی، اخلاقی، ذہنی، معاشرتی غفلت کی نیند سے بیدار کرنے میں گذری۔ وہ ایک روشن ضمیر عالمِ دین، پیکرِ ایمان، سالارِ انقلاب ہی نہیں، اعلیٰ ترین درجہ کے

دانشور اور صاحبِ طرز نثر نگار، شعلہ بار خطیب، روحانی تنظیم کے رہبر اور معاشرتی مصلح بھی تھے، سچ تو یہ ہے کہ ان کی ذات میں روحانیت، اخلاقیات، معاشرت اور علم و ادب کے سینکڑوں رنگ سمٹے یکجا ہو گئے تھے۔ ان کا اندازِ تکلّم، ان کی عظمتِ افکار سے پوری طرح سے ہم آہنگ تھا۔ وہ بولتے تھے تو لفظ لفظ وقار، جادو اور محبت سے معمور ہوتا تھا۔ وہ لکھتے تھے تو جواہر ریزوں کے سمندر میں جوار بھاٹا آ جاتا تھا جیسی ان کی تحریر مرصّع اور سحر طراز ہوتی تھی، اسی تناسب سے ان کا لہجہ پُر شکوہ اور جادو اثر ہوتا تھا۔

لیکن سوامی ویویکانند محض ہندوؤں یا ہندوستان کے لئے ہی پیغامِ انقلاب نہیں لائے تھے بلکہ ان کا دل تو پوری انسانیت کے لئے دھڑکتا تھا اور ان کا پیغام پوری انسانیت کے لئے نویدِ حیات تھا۔ آج ہندوستان بلکہ دنیا بھر کے سامنے جو روحانی، معاشرتی، اخلاقی اور دوسرے مسائل اور معاملات ہیں، سوامی جی نے ان کا بے خطا علاج برسوں پہلے تجویز کر دیا تھا۔ ان کی تحریروں اور تقریروں کو اردو لباس میں پیش کرنے کی اہم ترین غرض و غایت یہی ہے کہ اردو دنیا کو سوامی جی کے اس پیغامِ حیات بخش کی انقلاب آفرینیوں سے روشناس کرایا جائے۔

"نعرۂ حق" جلد سوم میں سوامی ویویکانند جی کی جن تقاریر و تصانیف کا ترجمہ شامل ہے ان میں "دوست کے نام" (To a friend)، "مشرق و مغرب" (East and the West)، "نیا ہندوستان" (Modern India) کے علاوہ Inspired Talks کو "غبارِ خاطر" کے زیرِ عنوان پیش کیا گیا ہے۔ اور Coversations and Dialogues اور Questions and Answers کو "نشاطِ روح" کے زیرِ تحت شائع کیا گیا ہے۔ Memoirs of European travel کو "سفرنامہ یورپ" کے عنوان سے سجایا گیا ہے۔ ان کے علاوہ سوامی جی کے چند دوسرے مضامین — ویدانت اور ہندوستانی زندگی، ہندوستان کا مستقبل — ہمیں کیا کرنا ہے، اور ہندوستان کا پیغام دنیا کے نام — "میرا پیغام" کے زیرِ عنوان یکجا کر دیئے گئے ہیں۔

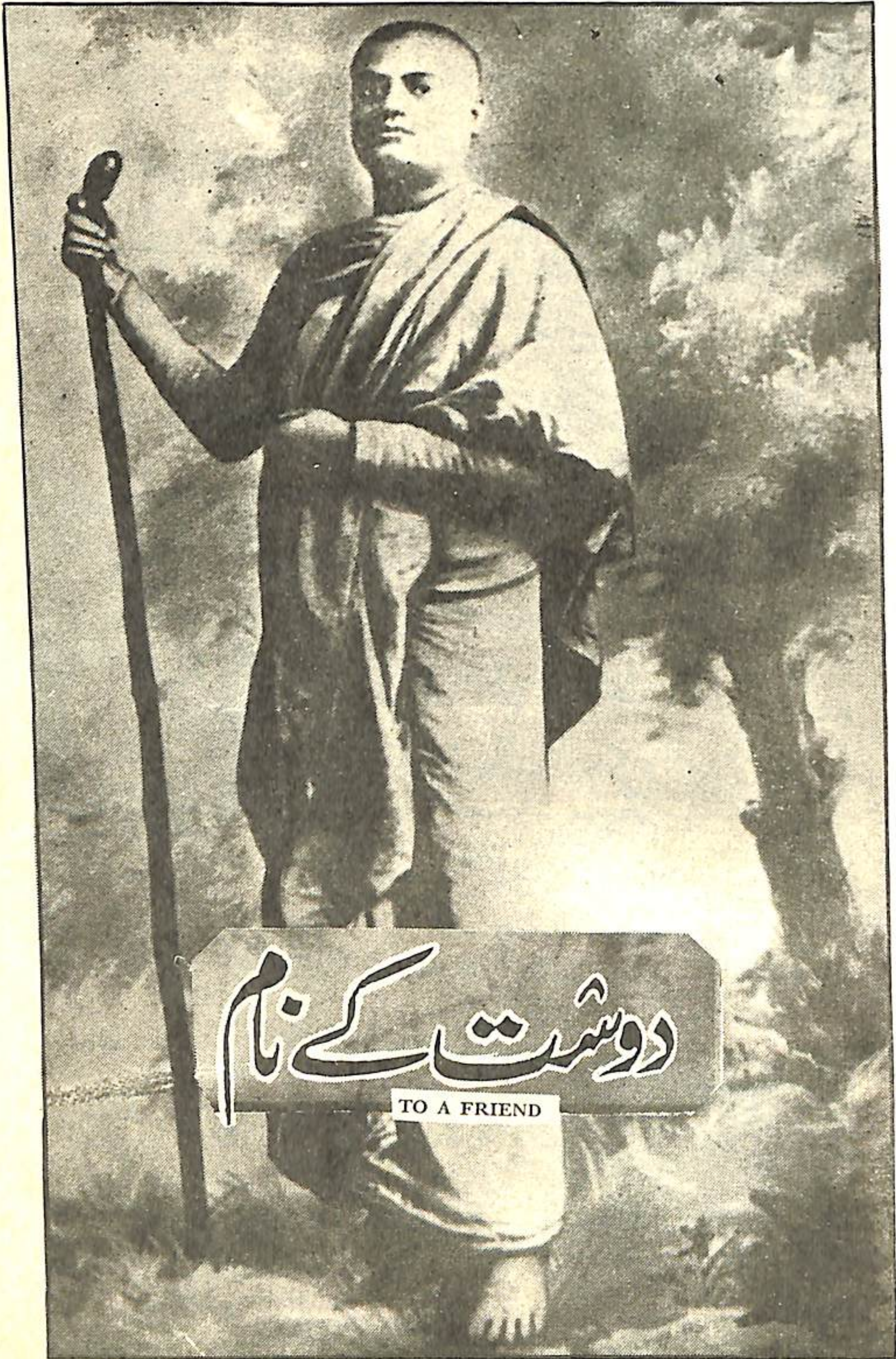
امید کامل ہے کہ یہ جلد بھی مقبول و ہر دلعزیز ثابت ہوگی۔

سوامی سواہ آنند

سیکرٹری

شری رام کرشن مشن، نئی دہلی

15 مارچ 1964


دوشت کے نام
TO A FRIEND



جہاں اندھیروں کو کہتے ہیں روشنی اَے دوشت!
مُصیبتوں کا جہاں نام ہے خُوشی اَے دوشت!
مرض پہ صحت کا کرنے لگیں گماں جس جا
جہاں دے گریۂ مولُود زندگی کا پتا
وہاں نہ ڈُھونڈھ اَے ہمدم مسرّتوں کا نشاں
یہاں خُوشی کی توقّع نہ کر، خُوشی اور یہاں؟



جہاں ہو جنگ و تقابل کا سلسلہ اَے دوشت
جہاں ہو باپ سے بیٹے کا معرکہ اَے دوشت
مُدام نفس پرستی کا غلغلہ ہو جہاں
وہاں نہ ڈُھونڈھ اَے ہمدم متاعِ امن و اَماں

یہ ایک دوزخ و جنّت کا نقش تابندہ
ہے کس کے بازُوئے پرواز میں یہ دَم اَے دوشت
کہ اُڑ کے مایا کے سنسار سے نکل جائے
کرم کی بیڑی سے بوجھل ہیں یہ قدم اَے دوشت
غُلام کس طرح بھاگے کہاں شرن پائے



سوامی وویکانند کی ایک بنگالی نظم کا منظُوم ترجمہ



یہ رستہ عشرتِ دنیا کا شادمانی کا
یہ گھر گرہست جنہیں احتیاجِ دولت ہے
مگر یہ جادۂ سنیاس زندگانی کا

جہاں یہ تیاگ ہے عرفان ہے عبادت ہے
جہاں یہ تزکیۂ نفس ہے ریاضت ہے
گزر چکا ہوں میں ان وادیوں سے اے ہمدم
کہ جانتا ہوں سب ہی راستوں کا پیچ و خم



یقین کر مرے ہمدم تمام راہوں میں
میں ڈھونڈھ آیا مسرت کی اک کرن بھی نہیں
تمام زندگی اک تلخ جام ہے ہمدم
یقین کر کہ زمانہ کی عام راہوں میں
عظیم تر ہے فقط تیرا ایک قلب حزیں
وقف ہے جس کے لئے بیشتر غم





کُشادہ قلب، محبّت کا تُو پجاری ہے
سمجھ کہ تیرا زمانے میں مرتبہ کیا ہے
وُہ چوٹ مرمریں صُورت میں جس کی تاب نہیں
وُہ چوٹ سینہ پہ فولاد اپنے سہتا ہے



کمینگی و رذالت جو تجھ میں گھُل جائے
زبان میٹھی مگر زہر بھرا ہو سینے میں
غرض کا بندہ بنے انحراف سچ سے کرے
مرے ندیم! تجھے تب ملے گا اپنے لئے
ٹھکانہ محفلِ دنیا کے اس قرینے میں؟

حصولِ علم کا بیڑہ اُٹھا کے اے ہمدم
گزاری میں نے زمانے میں آدھی عمرِ عزیز
ملے ہیں پیار کی معصوم جستجو میں مجھے
وُہ ناچتے ہوئے سائے کہ جن میں رُوح نہیں





تلاشِ حق میں چھانے ہیں اَن گنت مسلک
رہا ہوں غاروں میں اکثر تو مَرگھٹوں میں کبھی
بسا ہوں گنگا کے ساحل پہ ایک مُدّت تک
پوِتّر دوسرے دریاؤں کے کنارے بھی
نہ جانے بھکشا پہ کاٹے ہیں کتنے دن ساتھی

پھٹا لباس، بے املاک، بے رفاقت کے
کسی سے بھکشا میں جو مل گیا ہے کھایا ہے
ہے چُور چُور بدن بوجھ سے ریاضت کے
نہ پوچھ عُمر میں اے دوست کیا کمایا ہے؟



ندیم! سُن! میں کہوں تجھ سے اپنے دل کی بات
ملی ہے عُمر میں اپنی مجھے یہ سچائی
بھرا ہے موجوں سے گرداب سے یہ بحرِ حیات
بس ایک سچ کا سفینہ ہے جس میں اے زنہار
جو تجھ کو لے کے چلی جائے گا سمندر پار





عبادتوں کے طریقے یہ چلیں دم اے دوشت
یہ علم فلسفہ، سائینس اور جملہ علوم
یہ ترک دنیا، یہ افلاک، یہ حشم اے دوشت
سراب فکر وتخیّل ہے اور کچھ بھی نہیں
بس ایک شے ہے "محبّت" خزانۂ معلوم

ہر ایک جیو میں ہر ذی حیات میں ہمدم
پری میں دیو میں طائر میں اور حیواں میں
خدا میں اور برہمن میں اور انساں میں
دل طپیدن کل کائنات میں ہمدم
ہے عشق جوہر مطلق جو کار فرما ہے



بتا کہ کون خداؤں میں ہے خدائے عظیم
بتا کہ کون چلاتا ہے سارے عالم کو
جوان بیٹے پہ مرتی ہے مادر مشفق
متاع بیش بہا لوٹ لیتے ہیں ڈاکو
یہ دونوں باتیں الگ ہیں مگر اے میرے ندیم
ہے ان میں روح محبّت کا ایک ہی پہلو





بتا سکے نہ جسے عقل و نطق کی قوّت
گرفتِ فکر سے انساں کی ہے بالا تر
حیات و موت کی شکتی کا ایک سرچشمہ
اسی سے آتا ہے ہر رنج اور ہر راحت
ہے آپ کالی بھی اور آپ مہرباں مادر

یہ زخمِ مفلسی، یہ رنج و غم، یہ بیماری
یہ دھرم جس کے مقابل ادھرم ہے اے دوست
یہ کچھ نہیں ہے مگر مختلف طریقے ہیں
اسی کی پوجا کے معبود جس کو کہتے ہیں



بتا کہ کرتا ہے کیا کوئی جیو اپنے آپ
نہیں ہے دہر میں کچھ اختیار اے ساتھی

خوشی کی جس کو طلب ہے فریب خوردہ ہے
جو چاہتا ہے مصیبت، ہے ایک دیوانہ
وہ سادہ لوح جسے آرزو ہے مرنے کی
حیاتِ جاوداں گویا خیالِ بے معنی





بعید فاصلے تو چاہے جتنے طے کر لے
حسین و خوشنما ان جگمگاتی کاروں میں
سفر یہ ہوگا مگر زندگی کے ساگر میں
کہ پڑ رہے ہیں بھنور حس کی تیز دھاروں میں





پرندِ روح کی آوازِ بال و پر سن کر
ذرا یہ سوچ مآلِ حیات کیا ہوگا
نجات کا یہ طریقہ نہیں ہے اے ساتھی
کرے گا وار زمانہ اجل کا پھر تجھ پر
جو تیرے بس میں نہیں اس کی جستجو کیسی
جو شے محال ہے اس شے کی آرزو کیسی

بھروسہ علم پہ اپنے نہ کر فضول ہے یہ
بھروسہ کر نہ عبادت پہ اور نہ شکتی پر
نجات کا ہے زمانہ میں ایک ہی ذریعہ
تجھے پتنگا بتاتا ہے مکتی کا رستہ
یہ دیکھ کس طرح شعلے سے لپٹا جاتا ہے!





حقیر و ادنیٰ پتنگا نظر نہیں جس کی
جمال اس کا بڑھاتا ہے حوصلہ اے دوست
ہے مست رُوح تری جامِ عشق سے ہمدم
بدل دے عشق کو شُعلہ سے برملا اے دوست
جو خاک کردے خودی اور تری غرضمندی



مُسرّتیں کبھی آتی نہیں گدا کے قریب
ہے کوئی مقصدِ خیرات اِس سے بھی اچھا
اُمّیدِ اجر نہ رکھ دے کے کوئی چیز حبیب
خزانہ ہے ترے سینہ میں ایک دولت کا



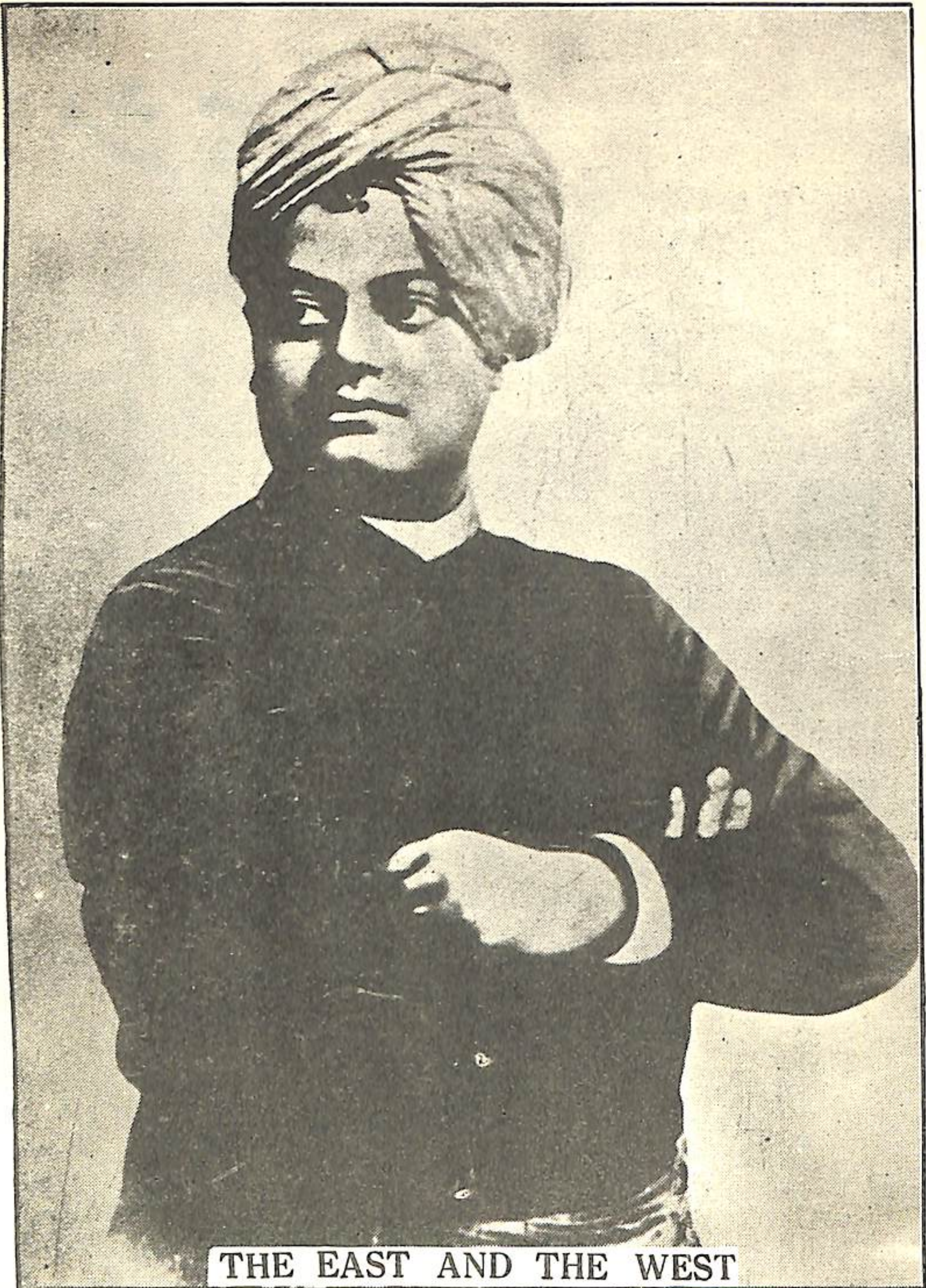
بے لازوال کا تو جانشین اے ساتھی
ہے تیرے دل میں محبت کا بحرِ طوفانی
لُٹا۔ لُٹا کہ طلب تجھ سے کون کرتا ہے
یہ ایک بُوند جو پھیلے تو ایک دریا ہے



ہر ایک شئے میں نمایاں اسی کی صورت ہے
وہ برہمن ہو کہ ادنیٰ سا کوئی کیڑا ہو
حسین پھول ہو یا وہ حقیر ذرّہ ہو
ہے ہر جگہ وہی معبود جو محبت ہے
اسی کے قدموں پہ جھک جا یہی عبادت ہے



ہزار عکس ہیں اس کے ہزار پرتو ہیں
ہے ایک شمع مگر بے شمار پرتو ہیں
بتا کہ ان میں سے کس سے نگاہ موڑے گا
جسے بھی چھوڑے گا تو ایشور کو چھوڑے گا
وہ ایشور جو ہر اک شئے سے پیار کرتا ہے
وہی ہے تیری عبادت کا مستحق اے دوست
وہی ہے تیری محبت کا مستحق اے دوست



THE EAST AND THE WEST

مشرق و مغرب

# مشرق و مغرب

صفحہ

# گردشِ زمانہ

کُشادہ وعمیق، رواں دواں، پُرشور دریا، دریاؤں کے کناروں پر پُرشکوہ اور مسرت آفریں باغات جن پر سورگ سمان نندن کانن کو بھی رشک آئے، ان مسرت آفریں باغات کے درمیان سنگِ مرمر کے خوبصورت محلات کے سربفلک مینار جنہیں فنونِ لطیفہ کے ماہرین کی چابکدستی نے آراستہ وپیراستہ کیا ہے، اور ان خوبصورت محلات آس پاس عقب وپیش قطار اندر قطار جھونپڑیاں جن کی شکستہ وخستہ چھتیں، اور دراڑ پڑی ہوئی دیواریں اور چھتوں کے نظر آتے ہوئے وہ بانس جو جھونپڑی کا کل ڈھانچہ بناتے ہیں۔ اور ان جھونپڑیوں میں گھومتے پھرتے نظر آنے والے کمزور لاغر، چیتھڑے لگائے ہوئے جوان اور بوڑھے جن کے چہروں پر سینکڑوں برس پرانی مفلسی اور مایوسی کے گہرے نقوش، گائیں، بیل اور ہر جگہ بھینسیں اور ہاں —— ان کی آنکھوں میں بھی وہی حسرت، وہی مایوسی —— ان کے جسم بھی ویسے ہی لاغر، ناتواں اور نڈھال —— راستہ پر کیچڑ، گوبر اور گندگی کے انبار —— یہ ہے ہمارا آج کا ہندوستان!

محلات کے پہلو بہ پہلو ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیاں، مندر کے احاطہ کے آس پاس گندگی کے ڈھیر، شاندار پوشاک پہنے ہوئے لوگ ان کے اغل بغل پوشتِ شیر سے ملتے جلتے کپڑے کا محض ایک چیتھڑا لگائے ہوئے چلتے پھرتے سنیاسی، شکم سیر اور خوب کھائے پئے لوگوں کو حسرت سے تکتی ہوئی فاقہ کشوں کی بیقرار نظریں —— یہ ہے ہمارا وطن!

طاعون اور ہیضہ کی پھیلائی ہوئی بھیانک تباہی، قوم کی ہڈیوں کو گھن کی طرح لگا ہوا ملیریا، فاقہ کشی اور نیم فاقہ کشی جو فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ موت سے مشابہ قحط جو بالعموم اپنا بھیانک اور المناک ناچ ناچتا ہے، مصیبت ویاس کا کورکشیتر (میدانِ جنگ) گم شدہ امید وعمل، مسرت ونشاط اور ہمت وجرات کی مردہ ہڈیوں سے بھری ہوئی وسیع ترین شمشان بھومی، اور ان ہڈیوں کے ڈھیر پر چھائے ہوئے سناٹے کی حکمرانی! اور یوگی روحانی تسکین کے ساتھ گہرے مراقبہ میں گم، جس کی زندگی کا مقصد سوائے موکش کے اور کچھ بھی نہیں —! یہ ہیں وہ مناظر جو ہندوستان میں یورپین سیاحوں کی آنکھوں کے سامنے آتے ہیں۔

---

تیس کروڑ آتماؤں کا ایک انبوہ، جو محض صورتاً انسانوں سے مشابہ ہے اور جس کو خود اس کے اپنے لوگوں اور بدیشی قوموں نے کچل کچل کر زندگی کا رس نچوڑ لیا ہے، اس سے ان لوگوں نے بھی پامال کیا ہے جو اس کے ہم مذہب ہیں اور ان لوگوں نے بھی جو غیر ملکی عقائد کے حامل ہیں۔ وہ محنت و مصیبت میں صابر ہے۔ اور محروم ہے ایک غلام کی طرح، اس حق سے کہ اپنی مرضی کے مطابق قدم اٹھائے، اس کا کوئی ماضی نہیں ہے کوئی مستقبل نہیں ہے، وہ بہر صورت موجودہ زندگی کو برقرار رکھنے کی خواہش رکھتا ہے، چاہے یہ زندگی کتنی ہی غلیظ کیوں نہ ہو اور چاہے وہ اپنی نوعیت میں اتنی خراب ہی کیوں نہ ہو جو غلاموں کو زیب دیتی ہے جسے اپنے ساتھیوں کی خوشحالی برداشت کرنے کی تاب نہیں ہے ایک ایسے آدمی کی طرح جس کی تمام آسائشیں مر چکی ہیں۔ اس کی شردھا بھی فنا ہو چکی ہے —— بے اعتماد، بے آسرا ایک لومڑی کی طرح مکاری، شاطری و ستمگری، اس کی مدافعت کا ہتھیار ہے، جس نے غرضمندی و خود غرضی کا خول چڑھا لیا ہے، جو طاقتور کے پاؤں کی دھول چاٹ رہا ہے اور ان لوگوں پر ہلاکت آفریں گھونسوں کی بارش کر رہا ہے جو اس سے نسبتاً کمزور ہیں، بدی بد نمائی سے معمور، ان توہم پرستیوں میں غرق، جنہیں قدرتی طور پر وہی لوگ جنم دیتے ہیں جو کمزور اور مستقبل کی طرف سے مایوس ہوتے ہیں، کوئی اخلاقی معیار اس کے پاس ہے نہیں۔ جو اس کی زندگی کے ڈھانچہ میں ریڑھ کی ہڈی کا کام دے۔ اس قماش کی یہ تیس کروڑ آتمائیں ہیں۔ جو ہندوستان کی سرزمین پر یوں زمرغہ کئے ہوئے ہیں جیسے کسی سڑی ہوئی چیز میں کیڑوں کے چھتے ہوتے ہیں —— اس تعبیر کا ہم سے تعلق ہے اور یہی وہ تصویر ہے جسے انگریز حکام قدرتی طور پر پیش کیا کرتے ہیں۔

تازہ تازہ حاصل کئے ہوئے بادۂ اقتدار کے نشہ میں مدہوش، صحیح اور غلط کے درمیان تمیز کرنے سے قاصر وحشی درندوں کی طرح خونخوار، زن مرید، حریص، غرق مئے ناب، عبادت و پاکیزگی کے تصور ہی سے ناواقف و نا آشنا، نہ ہی عادات و اطوار میں صفائی، صرف مادیت میں عقیدہ اور وہ تمدن، جس کی اساس مادیت اور مادیت کے مختلف مظاہر پر مبنی ہے، نیز طاقت مکاری اور ستمگری کے ذریعہ دوسرے ملکوں اور دوسروں کی دولت کا استحصال اور اس خود غرضانہ استحصال سے کسب مسرت اور اس جیون کے بعد کے جیون میں نہ کوئی اعتقاد نہ کوئی یقین، جن کی نظر میں یہ شریر ہی "آتما" بھی ہے اور جن کی پوری زندگی خلاصہ ہے حیوانی جبلتوں کا، یہ ہندوستانیوں کی نظر میں مغربی باشندے "اسُر" کا ایک روپ ہیں، ابلیس کی ایک صورت ہیں۔

جانبین کے مبصرین و مشاہدین کے یہ نقطہ ہائے نگاہ ہیں —— اور یہ نقطہ ہائے نگاہ پیدا ہوتے ہیں باہمی روابط اور مصنوعی معلومات یا بے خبری کی کوکھ سے۔ بدیشی باشندے یورپین ہندوستان آتے ہیں۔ اور ہمارے شہروں کی عالیشان عمارتوں اور صاف ستھرے اور صحت مند کوارٹروں میں قیام کرتے ہیں۔ اور اپنے وطن کے صاف ستھرے اور منصوبہ بند شہروں کے دلکش مکانات سے مقامی باشندوں کے مکانوں کا مقابلہ اور موازنہ کرتے ہیں۔ اور صرف ان ہی ہندوستانیوں سے انہیں ملنے جلنے کا موقع ملتا ہے جو ایک ہی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو ان کے ماتحت کسی قسم کی ملازمت کرتے ہوں۔ اور بلاشبہ کسی جگہ کبھی مصیبت، مایوسی اور مفلسی کا اس طرح مقابلہ نہیں کیا گیا جس طرح ہندوستان میں، مزید برآں اس کہاں کا کوئی فائدہ نہیں ہے کہ ہر جگہ گندگی ہی گندگی ہے۔ یورپین ذہنوں کے لئے یہ ناقابل فہم ہے کہ اتنی گندگی* ایسی غلامی اور ایسی گراوٹ کے درمیان بھی کوئی بھلائی اور بہتری ممکن ہو سکتی ہے۔

---

مشرق و مغرب —— صفحہ ۴

دوسری جانب ہماری نگاہیں یہ دیکھتی ہیں کہ یورپین ہر چیز بلا پرہیز کھا لیتے ہیں۔ صفائی کا جو تصور ہمارا ہے وہ اس تصور ہی سے ناواقف و ناآشنا ہیں، ذات پات کی کوئی تمیز نہیں کرتے، عورتوں سے آزادانہ طور پر ملتے جلتے ہیں۔ شراب پیتے ہیں۔ اور رقص گاہ میں مرد اور عورت ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈال کر بے حیائی سے رقص کرتے ہیں۔ اور ہم حیرت زدہ ہو کر دل ہی دل میں یہ سوچنے لگتے ہیں کہ اس تماش کی قوم بننے میں کونسی اچھائی ہو سکتی ہے۔

یہ دونوں نقطہ ہائے نگاہ سطحی ہیں۔ اور ان کا ماخذ وہ شے ہے جو اصلاً ہے نہیں۔ ہم بدیشیوں کو اپنی سوسائٹی میں آمیزش کا موقع نہیں دیتے۔ اور ہم انہیں "ملیچھ" کہتے ہیں۔ وہ بھی جب ان کی باری آتی ہے تو ہم سے اس طرح نفرت کرتے ہیں جیسے غلاموں سے کی جاتی ہے۔ اور وہ بھی ہمیں "کالا آدمی" کہنے لگتے ہیں۔ ان دونوں نقطہ ہائے نگاہ میں کچھ صداقت تو ضرور ہی ہونی چاہیئے۔ لیکن جانبین نے ان حقیقی چیزوں کو نہیں دیکھا ہے جو دونوں ہی کے پس پشت ہیں۔

ہر آدمی کے اندر ایک آدرش ہوتا ہے۔ آدمی کا ظاہر تو محض اس آدرش کی عمل پذیری کا ایک نقش ہے۔ لیکن اس کا حقیقی مفہوم بیان کرنے والی اصل زبان تو آدمی کا باطن ہی ہوا کرتی ہے۔ بالکل اسی طرح ایک قوم بھی ایک قومی آدرش کی حامل ہوتی ہے۔ یہ آدرش دنیا بھر کے لئے عمل پذیر ہے اور ضروری ہے کہ اس کا تحفظ کیا جائے۔ جس روز ایک آدرش کی ضرورت، دنیا کے تحفظ کی خاطر ایک عنصر کے طور پر ختم ہو جائے گی۔ اسی روز اس آدرش کا ظرف چکنا چور ہو جائے گا۔ خواہ یہ آدرش ایک فرد کا ہو خواہ ایک قوم کا!

بے انتہا ادبار، مصیبت، مفلسی اور اندرونی و بیرونی تشدد اور کچلے جانے کے باوجود ہم ہندوستانی ابھی تک زندہ ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ایک قومی آدرش رکھتے ہیں۔ جو اب بھی دنیا کے تحفظ کی خاطر ضروری ہے۔ یورپین بھی ایک قومی آدرش رکھتے ہیں۔ جو ان کا اپنا ہے اور جس کے بغیر دنیا کی گاڑی آگے نہیں چلے گی۔ لہٰذا وہ اس قدر طاقتور ہیں۔ ایک شخص اگر اپنی ساری شکتی کھو دے تو کیا ایک لمحہ کے لئے بھی وہ زندہ رہ سکتا ہے؟ ایک قوم بہت سے افراد کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اگر ایک قوم کی حرکت و طاقت ضائع ہو جائے تو کیا وہ زندہ رہ سکے گی؟ یہ ہندو نسل کس وجہ سے فنا نہیں ہوئی؟ جبکہ اسے اتنی مصیبتوں کا سامنا ہوا۔ اور ایک ہزار برس تک شورش و ہنگامہ سے گزرنا پڑا۔ اگر ہمارے رواج و رسوم اتنے ہی خراب ہیں تو انہوں نے کس طرح ہمیں اس وقت تک چھوڑ دیا ہے۔ اور کیوں نہ ہمیں مٹی میں ملا کر مٹی کر ڈالا۔ کیا مختلف بدیشی فاتحین نے ہمیں کچل ڈالنے کے لئے کوئی کسر چھوڑی ہے؟ پھر کیا وجہ ہے کہ دوسرے غیر متمدن ممالک کی اقوام کی طرح ہم صفحۂ ہستی سے مٹ نہ سکے؟ کیوں ہندوستان کی آبادی فنا نہ ہوئی؟ اور یہ ملک ویرانہ نہ بنا؟ پھر کیوں بدیشی باشندوں نے ہندوستان آنے اور یہاں آ کر آباد ہونے کا کوئی موقع نہ چھوڑا؟ اور اس کی زرخیز زمین بھی اس طرح جوتی جس طرح انہوں نے آسٹریلیا، امریکہ، اور افریقہ کی زمینوں کو جوتا ہے؟ بہر حال میرے بدیشیو! آپ اتنا طاقتور نہیں ہیں جتنا آپ اپنی طاقت کا تخمینہ رکھتے ہیں۔ یہ محض خام خیالی ہے۔ پہلے سمجھئے کہ ہندوستان بھی ایک شکتی رکھتا ہے۔ اور اب بھی وہ اصل و حقیقت بدستور باقی ہے جس پہ اس کی اساس مبنی ہے۔ مزید برآں یہ سمجھئے کہ ہندوستان اب بھی زندہ ہے اس لئے کہ عالمی تمدن کے ذخیرے میں اسے اب بھی اپنا حصہ دینا ہے اور آپ بھی پوری طرح اور بخوبی یہ بات سمجھیں۔ میری مراد اپنے وطن کے ان لوگوں سے ہے جو اپنی ظاہری عادات اور اپنے خیالات و نظریات میں قطعی طور پر یورپین زدہ بن چکے ہیں۔ اور آنکھیں پھاڑ کر متواتر یورپینوں کی دُہائی دے رہے ہیں۔ اور چلا چلا کر یہ گزارش کر رہے ہیں کہ "وہ انہیں بچائیں۔" ہم گراوٹ میں مبتلا ہیں اور گرتے گرتے زندگی کی سطح پر آ پڑے ہیں۔ اے یورپ کے لوگو! تم ہمارے مسیحا ہو ہم

پُرترس کھاؤ۔ ہمارا ہاتھ تھامو۔ اور ہمیں اس پستی کے غار سے نکالو۔ اور آپ بھی یہ سمجھیں جو "ٹی ڈیمس" (Te Deums) کا ترانہ گا رہے ہیں۔ اور یہ شور و غل مچا رہے ہیں کہ عیسیٰ مسیح کو ہندوستان آنا ہے۔ اور جو اس بات کے انتظار میں ہیں کہ مناسب وقت آنے پر آسمانی فرمان پورا ہی ہو گا۔ میرے پیارو! نہیں، نہ عیسیٰ کو آنا ہے نہ موسیٰ کو، نہ ہی وہ آئیں گے، اس لئے کہ اس وقت تو وہ اپنے ہی گھروں اور اپنے ہی پیروکاروں کو سنبھالنے کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ان کے پاس ہمارے ملک آنے کے لئے وقت ہی کہاں ہے؟ یہاں تو اب بھی ہمیشہ کی طرح وہی قدیم شیو جلوہ گر ہے جو بالذات ایک ہے اور وہی خونخوار "کالی مائی" پیکر یکتائی ہے۔ جس کی پوجا ہو رہی ہے اور وہی مرقعِ محبت چرواہا ——— شری کرشن ——— ہے جو سرمدی بانسری بجا رہا ہے۔ ایک مرتبہ اس قدیم شیو نے اپنے بیل پر سوار ہو کر اپنا الیشوری نقارہ لے کر، ہندوستان سے سفر کیا تھا۔ ایک جانب سماٹرا، بورنیو، سیلیبس، آسٹریلیا، اور امریکہ کے دور دراز سواحل تک اور دوسری جانب یہی قدیم شیو اپنے بیل پر سوار ہو کر تبت، چین، جاپان اور سائبیریا سے بھی پرے گیا تھا۔ اور یہی سفر وہ اب بھی کر رہا ہے، کالی مائی اب بھی چین اور جاپان تک میں اپنی پرستش کرا رہی ہے اور یہ دیوی وہی تو ہے جسے عیسائی استعارتاً "پاک مریم" کہا کرتے ہیں اور مادرِ عیسیٰ کے طور پر اس کی پرستش کرتے ہیں۔ ہمالیہ کو دیکھئے! اس کے شمال میں کیلاش ہے، بھگوان شیو کی خاص جلوہ گاہ! وہ تخت جسے دس سروں اور بیس ہاتھوں والا راون تک جنبش نہیں دے سکا ——— اب یہی کام مشنری بھی سرانجام دینے کی کوشش کر کے دیکھ لیں ——! الیشور میری آتما کو شانتی دے! یہاں ہندوستان میں قدیم شیو اپنا نقارہ "ڈمرو" سدا بجاتا رہے گا۔ کالی مائی جانوروں کی قربانی کے ساتھ اپنی پوجا کراتی رہے گی اور پیارا شری کرشن اپنی بانسری بجاتا رہے گا، وہ کوہ ہمالیہ کی طرح میخ گیتی ہیں جو اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے، اور کوئی بھی انہیں اپنی جگہ سے ہٹا دینے کی کسی بھی کوشش میں کامیاب نہ ہو گا۔ چاہے وہ عیسائی ہوں چاہے دوسرے مبلغین ہوں، اگر آپ انہیں گوارا اور برداشت نہ کریں ——— ہٹا دیجئے! لیکن آپ چند افراد کیا ایک پوری قوم کے ہاتھ سے صبر و تحمل کا دامن نہ چھڑوا دیں گے۔ اور کیا اسے مر جانا گوارا نہ ہو گا؟ آپ کیوں کسی دوسری جگہ نہیں چلے جاتے۔ جہاں آپ کو میدان ملیں۔ اور آپ آزادی کے ساتھ انہیں چر سکیں ——— ساری دنیا آپ کے سامنے کشادہ پڑی ہوئی ہے، لیکن نہیں، آپ ایسا نہیں کریں گے۔ وہ شکتی ہے کہاں جو یہ کام کر دے؟ وہ تو قدیم شیو ہی کا نمک کھائیں گے اور اسی سے نمک حرامی کریں گے، اس پر بہتان دھریں گے، جھوٹی باتیں گھڑیں گے اور ایک بدیشی مسیحا کی عظمت کا گیت گائیں گے ——— میرے عزیزو! ہمارے دیس کے ایسے لوگوں کی نظریں جو بدیشیوں کے دو پڑ گڑ گڑانے جایا کرتے ہیں ہم بہت پست ہیں، بہت ذلیل ہیں، بہت گرے ہوئے ہیں۔ ہماری ہر چیز خراب وخستہ اور ابتری ہوتی ہے ——— ان لوگوں سے ہمارا کہنا ہے۔ ہاں! یہ سچ ہو سکتا ہے، اور تو کچھ بھی نہیں۔ بس سچ ہی ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ آپ اپنی سچائی کا اعلان فرماتے ہیں۔ اور آپ کے اس اعلان پر یقین نہ کرنے کی ہمارے پاس کوئی وجہ نہیں ہے۔ لیکن بڑے مہربانی ہے ذرا بتائیے کہ آپ "ہم" کی ضمیر میں پوری قوم کو کس وجہ سے شامل کر لیا کرتے ہیں؟ فرمائیے جناب! یہ کن اچھے طریقے کی ایک قسم ہے؟

اولاً ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ اچھی صفات میں سے کوئی صفت نہیں ہے جو کسی ایک قوم کی جاگیر بن گئی ہو۔ بے شک

یہ ٹھیک ہے کہ جس طرح افراد میں اچھی صفات کم و بیش ہوتی ہیں۔ اسی طرح بعض اقوام میں بھی بعض صفات کی کمی و بیشی ہو سکتی ہے یعنی یہ کہ ایک قوم میں ایک صفت زیادہ ہو سکتی ہے دُوسری میں کم ہو سکتی ہے۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہمارا نمایاں ترین آدرش ہے مُکتی۔ لیکن مغربیوں کا جو آدرش ہے وہ ہے "دھرم"۔ ہم جو کچھ چاہتے ہیں وہ ہے "مُکتی" اور وہ جو کچھ چاہتے ہیں وہ ہے "دھرم"۔ یہاں لفظ "دھرم" مماسکوں کے مطلب میں استعمال کیا گیا ہے۔ "دھرم ہے کیا؟ دھرم وہ چیز ہے جو اس دُنیا میں یا اس کے بعد کی دُنیا میں آدمی کے لئے حصُولِ مسرّت کا ذریعہ بنتا ہے۔ دھرم عمل پر منحصر ہے اور وہ رات دن آدمی کو اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ مسرّت کی جستجو کی جائے اور حصُولِ مسرّت کے لئے کام کیا جائے۔

مُکتی کیا ہے؟ وہ شے جو اس بات کا سبق دیتی ہے کہ اس زندگی کی مسرّت بھی غلامی کے مترادف ہے۔ اور آنے والی زندگی کی مسرّت بھی ایسی ہی ہے۔ اس لئے کہ نہ دُنیا قوانینِ فطرت سے ماورا ہے نہ عُقبیٰ، اس دُنیا کی غلامی اور عُقبیٰ کی غلامی میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف اتنا جو لوہے کی زنجیر اور سونے کی زنجیر میں ہو سکتا ہے۔ مزید برآں مسرّت جہاں کہیں بھی ہو سکتی ہے۔ قوانینِ فطرت کے اندر ہی ہو سکتی ہے اور اس بنا پر فنا ہو جائے گی اور اسے ابدیت حاصل نہیں ہو گی۔ لہٰذا آدمی کو کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ مُکت بنے، اسے قیودِ جسمانی سے ماورا ہونا چاہیئے۔ غلامی کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ موکش کی یہ راہ صرف ہندوستان میں ہے اور کہیں نہیں ہے۔ اسی طرح بار بار کہی جانے والی یہ بات بھی سچ ہے کہ مُکت آتمائیں صرف بھارت ہی میں ہوا کرتی ہیں۔ اور دُنیا کے کسی دُوسرے ملک میں نہیں ہوتیں۔ لیکن اس سچ کے مساوی یہ بات بھی سچ ہے کہ مستقبل میں دُوسرے ملکوں میں بھی مُکت آتمائیں ہوں گی، یہ خوب اور بہت ہی اچھا ہے۔ اور ہمارے لئے مسرّت و خوشی کی ایک چیز ہے۔ ہندوستان میں ایک زمانہ تھا جب دھرم مُکتی کا حریف تھا۔ یہاں یدھشٹر، ارجن، دریودھن، بھیشم، اور کرن جیسے دھرم کے پجاری تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ ویاس، سکھا اور جنک جیسے مُکتی کے پیکر و مظاہر بھی تھے، بُدھ ازم کی ابتدا ہونے پر دھرم قطعی طور پر نظر انداز کر دیا گیا اور صرف موکش کی راہ نے نمایاں حیثیت اختیار کر لی ہے اور سب پر غلبہ پا لیا۔ چنانچہ اگنی پران میں ہم استعارات و تشبیہات کی زبان میں پڑھتے ہیں کہ گئے اسُر ــ یعنی بُدھ نے سب لوگوں کو موکش کا راستہ دِکھا کر دُنیا کو تباہ و برباد کر دینے کی کوشش کی۔ لہٰذا دیوس نے ایک کونسل منعقد کی۔ اور چالاکی سے اسے ابدی نیند سلا دیا۔ بہر حال بنیادی حقیقت یہ ہے کہ اسی دھرم کا بے پناہ فقدان ہمارے ملک کے اس زوال کی وجہ ہے جس کے بارے میں ہم اتنا بکھان سنا کرتے ہیں۔ اگر پوری قوم موکش کی راہ اختیار کرے اور اس پر چلتی رہے تو بہت ہی اچھا ہے لیکن کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے؟ حصُولِ نشاط و مسرّت کے بغیر ترکِ دُنیا آتا ہی نہیں، پہلے نشاط و مسرّت حاصل کیجئے تب ہی آپ تارک الدنیا بن سکتے ہیں۔ ورنہ پوری قوم اگر ایک دم سنیاس لے لے تو اس سے وہ نفع حاصل نہیں ہو گا جس کی وہ خواہش اور طلب رکھتی ہے بلکہ وہ فائدہ بھی کھو جائے گا جو اس نے حاصل کر لیا تھا۔ گویا ہاتھ کی چڑیا تو اڑ گئی اور جھاڑی کی چڑیا ہاتھ نہ آئی۔ جب کہ بُدھ ازم اپنے عروج پر تھا تو ان دنوں میں ایک ایک منڈپ میں ہزاروں سنیاسی بسر کیا کرتے تھے اور یہی وہ زمانہ تھا جب ملک بربادی کے کنارے پر آ گیا تھا، بودھ کرسچین مُسلمان اور جینی سب کے لئے یکساں قانون اور یکساں ضابطہ تجویز کرتے ہیں اور یہی سب سے بڑی غلطی ہے، تعلیم، عادات، رواج، قوانین اور ضوابط مختلف لوگوں اور مختلف قوموں کے لئے مختلف ہونے چاہئیں جن میں ان کے مزاجوں کے فرق کو ملحُوظ رکھا جائے اور اس فرق سے مطابقت

پیدا کی جائے۔ اگر کوئی شخص تمام لوگوں میں زبردستی یکسانیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا کیا حاصل ہوگا؟ بدھوں کا یہ قول ہے کہ زندگی میں موکش سے زیادہ پسندیدہ کوئی چیز نہیں ہے جس کی طلب کی جائے۔ "تم کوئی بھی ہو حصولِ موکش کے لئے آئیے، جوق در جوق آئیے اور سب آئیے" میرا سوال ہے کیا یہ ممکن ہے؟ کیا کبھی ایسا ہو سکتا ہے؟ اگر آپ گرہستی ہیں اور اس قسم کی چیزوں سے خود کو بہت زیادہ وابستہ نہیں کر سکتے پس آپ اپنا سودھرم کریں پس ہندو عقاید کی کتابوں میں یہ بات کہی گئی ہے۔ اور یہی بات قطعی طور پر صحیح بھی ہے۔ ایک شخص جو اپنے پاؤں پہ کھڑا نہ ہو سکتا ہو وہ ایک ہی جست میں لنکا کا سمندر پار کرنے کے لئے چھلانگ لگائے! یہ کونسی فراست ہے کونسی دانائی ہے؟ آپ اپنے ہی گھر والوں کا پیٹ تو بھر نہیں سکتے، اپنے وطن کے دو[2] بھائیوں کے لئے تو کھانے کا کوئی انتظام نہیں کر سکتے۔ آپ دوسروں کے ساتھ مل جل کر، مفادِ عامہ کا معمولی سا کام تک تو انجام نہیں دے سکتے۔ اور آپ دوڑ رہے ہیں مکتی کے پیچھے! ہندو عقاید کی کتابوں میں بھی یہ بات کہی گئی ہے کہ بلا شبہ موکش دھرم سے بہت زیادہ برتر چیز ہے لیکن سب سے پہلے دھرم کی تکمیل ہونی چاہئیے۔ بدھوں نے چونکہ محض موکش پہ انحصار کیا۔ لہٰذا شر کی تمام اقسام آگئیں۔ — اہنسا ٹھیک ہے، برداشت برائی نہیں ہے، بہت بڑی چیز ہے۔ لیکن ہندو شاستروں میں تعلیم دی گئی ہے کہ "تو دنیا دار ہے، اور اگر تیرے منہ پہ کوئی طمانچہ مارے اور تو آنکھ کے بدلے میں آنکھ اور دانت کے بدلے میں دانت نہ لے تو بلا شبہ تو گناہ کرے گا اور گناہگار ہوگا۔" منو کا قول ہے کہ ایک شخص چاہے وہ برہمن ہی کیوں نہ ہو۔ اگر تمہیں قتل کر دینے کی غرض سے آئے اور تم اسے مار ڈالو۔ تو یہ کوئی گناہ نہیں ہے (منو سمرتی VIII) یہ قطعاً درست ہے اور ایسی بات ہے جو کبھی فراموش نہ کرنی چاہئیے، صرف اہلِ ہمت و شجاعت ہی دنیا کا لطف اٹھاتے ہیں، اپنی جرأت و شجاعت دکھائیے۔ سیاست کے چار گر ہیں۔ صلح، رشوت، تفرقہ اور جنگ حالات کی مطابقت میں یہ چار گر استعمال کیجئے۔ تاکہ آپ اپنے ادبار و مصائب پہ غلبہ پا کر دنیا کا لطف اٹھائیں تب ہی آپ دھارمک رہیں گے! اگر آپ اپنی توہین اور بے عزتی کو اپنی جیب میں رکھتے ہیں تو آپ کی زندگی بہت ہی بدنما اور شرمناک ہو کر رہ جائے گی۔ اگر کوئی شخص آپ کو کچلے اور ٹھوکر مارے۔ اور ایسا کرنے پر اس کے سر میں جواباً کوئی ٹھوکر نہ لگے تو آپ کی یہ زندگی بھی بالیقین جہنم بن جائے گی۔ اور اس کے بعد کی زندگی بھی جہنم ہی ہوگی، یہ ہے وہ تعلیم جو ہمارے شاستروں میں دی گئی ہے، آپ سودھرم کریں۔ یہ سچائی ہے — سچائیوں کی سچائی ہے، میرے عزیز ہم مذہبو! آپ کے لئے میرا یہی مشورہ ہے، میری یہی صلاح ہے، بے شک کوئی غلط بات نہ کیجئے۔ نہ کسی کو زخمی کیجئے نہ کسی کے لئے ظالم بنئے۔ بلکہ دوسروں کے لئے بحتی الامکان نیکی کرنے کی کوشش کیجئے۔ مگر دوسروں کی کی ہوئی غلط باتوں کے سامنے بلا عذر سر جھکا دینا ایک گناہ ہے — اس کے لئے جو گرہستی ہے، دنیا دار ہے، اس سے جیسا برتاؤ کیا جائے، ویسا ہی برتاؤ اسے بھی کرنا چاہئیے، فوراً اور اسی جگہ! ایک گرہستی کو پورے جوش و خروش کے ساتھ اور زبردست محنت کر کے روپیہ کمانا چاہئیے۔ اور اس روپیہ سے اپنے اہلِ خاندان اور دوسرے لوگوں کی کفالت کرنی چاہئیے۔ اور ان کے لئے آرام و آسائش کا سامان کرنا چاہئیے اور جہاں تک ممکن ہو سکے نیکی کے کام کرنے چاہئیں۔ اگر آپ یہ نہیں کر سکتے تو انسان ہونے کا دعویٰ کس طرح کر سکتے ہیں؟ — جب آپ گرہستی تک نہ ہوں، تو آپ کے لئے موکش کی بات کرنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں، کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں "دھرم کا انحصار عمل پہ ہے"۔ حسن و خوبی کے ساتھ، سعیِ پیہم و عملِ مسلسل ہی دھرم کی جبلت و

نظرت ہوا کرتا ہے۔ اکثر مماسکوں تک کی یہ رائے کیوں ہے کہ ویدوں کے ان اجزا کو، جن میں عمل کی کوئی تعلیم نہیں دی گئی ہے، اگر صحیح بات کہی جائے تو وید نہیں کہا جا سکتا۔ وہ بالیقین وید نہیں ہیں۔ چنانچہ جیمنی کے خیالات میں سے ایک خیال کا خلاصہ یہ ہے کہ

आम्नायस्य क्रियार्थत्वादानर्थक्यमतदर्थानाम्—

ویدوں کا اصل مقصد ہے — عمل کی تعلیم — اور ویدوں کے جن اجزاء کا تعلق عمل کی تعلیم سے نہیں ہے وہ اپنے معیار سے پست ہیں۔

اوم۔ اوم کی گردان سے اور اس کے معنی پر غور کرتے رہنے سے ہر چیز حاصل ہو سکتی ہے۔ ایشور کا نام جپنے سے تمام پاپ دھل جاتے ہیں۔ جو لوگ خود کو ایشور کی مشیت پر چھوڑ دیتے ہیں، اور اس کی مرضی کے آگے سر انداختہ ہو جاتے ہیں وہ بھی ان سب کو اپنا بنا لیتا ہے، — ہاں! یہ ہیں شاستروں اور یوگیوں کے الفاظ اور بلا شبہ یہ الفاظ سچ ہیں۔ لیکن کیا آپ دیکھتے ہیں کہ ہم میں سے ہزاروں لوگ ہیں جو زندگی بھر اوم پر دھیان دیتے رہتے ہیں اور پر جوش انداز میں ایشور کے نام کی مالا جپتے ہیں۔ اور زبان سے چلاتے ہیں — "بس تیری مرضی ہو گی۔ میں نے خود کو تیری سپردگی میں دے دیا ہے"۔ لیکن اس سب کے بدلے میں حقیقتاً وہ پا کیا رہے ہیں؟ کچھ بھی نہیں! آپ اس کی کیا وجہ پیش کرتے ہیں؟ وجہ یہ ہے اور اسے پوری طرح سمجھنا چاہئیے، کس کا دھیان حقیقی و مؤثر ہوتا ہے؟ کون سچائی کے ساتھ ایشور کی مشیت کے آگے سر انداختہ ہو سکتا ہے؟ کون ہو سکتا ہے جو بجلی کی کڑک کی طرح ناقابل برداشت شکتی کے ساتھ ایشور کا نام پکارتا ہے۔ یہ وہی ہو سکتا ہے جس نے "چِت شُدھی" پراپت کر لی ہے، یعنی وہ شخص جس نے اپنے عمل سے تزکیۂ نفس کیا ہے — دوسرے الفاظ میں وہ شخص جو دھارمک ہے، روحانی ہے۔



یہ تصویر 1898ء میں کشمیر میں لی گئی تھی (بائیں سے دائیں) (1) مس جے میکلوڈ (2) سوامی وویکانند (3) بہن نویدیتا

سوامی جی کے قدموں میں بیٹھی ہوئی ———— مسز اولے بل

# عِلم و عمل

ہر فرد شکتی کے ایک حصّہ کے بروئے کار رہنے کا مرکز ہوتی ہے اور یہ شکتی ہمارے سابقہ اعمال کے نتیجہ کے طور پر اکٹھی ہوتی ہے۔ اور ہم میں سے ہر شخص اس شکتی کو اپنی پشت پر لے کر پیدا ہوتا ہے۔ جب تک کہ یہ شکتی خود ہی اپنے عمل کو نہ چھوڑے اس وقت تک کس کے لئے یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائے اور کام چھوڑ دے۔ لہٰذا جب تک یہ شکتی فعال و متحرک رہے گی، ایک شخص اپنے اچھے یا برے اعمال کے نتیجہ کے طور پر آرام پائے گا یا ادبار میں مبتلا رہے گا۔ اور بے اختیار کام کرنے کے لئے مجبور رہے گا۔ جب اس شکتی کے فعال و متحرک رہنے کے وقت تک نہ مسرت سے باز رہا جا سکتا ہے نہ کام چھوٹ سکتا ہے تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ برے اعمال کی بجائے اچھے اعمال کئے جائیں۔ تاکہ ادبار میں مبتلا ہونے کی بجائے آرام کا لطف اٹھایا جائے۔ شری رام پرشاد[۱] کہا کرتے تھے — وہ دو لفظ بولتے ہیں — ایک نیکی دوسرے بدی، ان میں سے اچھا یہ ہے کہ نیکی کا کام کیا جائے۔

اب سوال یہ ہے کہ نیکی ہے کیا، جسے اختیار کرنا چاہیئے؟ جو شخص موکش کا طالب ہے اس کے لئے ایک عمل نیکی ہے اور جو شخص دھرم کا طالب ہے، اس کے لئے دوسرا۔ یہ بہت بڑی صداقت ہے جسے کشافِ گیتا بھگوان شری کرشن نے ذیل کے الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی عظیم صداقت پر ورن آشرم کے نظام اور ہندو مذہب کے نظریہ سودھرم وغیرہ کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

अद्वेष्टा सर्वभूतानां मैत्रः करुण एव च ।

निर्ममो निरहंकारः समदुःखसुखः क्षमी ॥

(گیتا — ادھیائے ۱۲ — شلوک ۱۳)

---

۱؎ ایک بنگالی یوگی جو کالی دیوی کے پجاری اور بہترین شاعر تھے، انہوں نے کالی دیوی کی تعریف و توصیف اور عقیدت میں بہت سے بھجن کہے ہیں۔ جو بہت مقبول ہیں۔ ان میں انہوں نے دھرم کی مجرد صداقتوں کو بہت ہی سہل اور عام فہم سادہ الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔

"وہ جس کا کوئی دشمن نہیں ہے، جو سب کے ساتھ دوستی اور مہربانی سے پیش آتا ہے اور جو "میں اور میرا" کے احساس سے آزاد ہے۔ جو دکھ سکھ دونوں حالتوں میں مطمئن رہتا ہے اور صبر و رضا سے کام لیتا ہے۔ اس خوبی کے علاوہ جن میں ایسے دوسرے اوصاف ہوا کرتے ہیں جو موکش پراپتی کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیتا ہے۔"

क्लैब्यं मास्म गमः पार्थ नैतत्त्वय्युपपद्यते ।
क्षुद्रं हृदयदौर्बल्यं त्यक्त्वोत्तिष्ठ परन्तप ॥

(گیتا۔ ادھیائے ۲ ۔ شلوک ۱۳)

"اے پرتھی کے فرزند! انسانیت سوزیوں کے سامنے گردن نہ جھکا! اپنے دشمنوں کو تہس نہس کر دینے والے! اس ذلت آفریں بزدلی کو چھوڑ کر کھڑا ہو جا۔"

तस्मात्त्वमुत्तिष्ठ यशो लभस्व जित्वा शत्रून्भुंक्ष्व राज्यं समृद्धम् ।
मयैवैते निहताः पूर्वमेव निमित्तमात्रं भव सव्यसाचिन् ॥

(گیتا ادھیائے ۱۱ ۔ شلوک ۳۳)

"پس تو اٹھ اور ناموری حاصل کر! اپنے دشمنوں پر فتح پاکر اپنی فتح مندی کا وہ لطف اٹھا جس کا کوئی حریف اور مدِ مقابل نہ ہو۔ یقین کر کہ اے سویہ ساچی (ارجن) پہلے سے ہی میرے مارے ہوئے ہیں۔ تو تو محض ان کے قتل کا ایک ہتھیار ہے۔"

ان میں اور گیتا کے ایسے ہی دیگر شلوکوں میں بھگوان کرشن نے دھرم کا راستہ دکھایا ہے۔ بے شک یہ بھی ایک صداقت ہے کہ عمل میں ہمیشہ ہی نیکی و بدی مخلوط ہوتی ہے۔ اور عمل کرنے میں ہر شخص کم و بیش گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ لیکن اس سے ہوتا کیا ہے؟ ایسا ہو تو ہونے دیجئے۔ کیا کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر نہیں ہے؟ کیا ناکافی خوراک کا ہونا خوراک نہ ہونے کے مقابلہ میں بہتر نہیں ہے؟ کیا کام کرنا خواہ اس میں نیکی و بدی دونوں ہی مخلوط ہوں اس بات سے بہتر نہیں ہے کہ آدمی کوئی کام نہ کرے، سُست و ناکارہ اور غیر فعال زندگی بسر کرنے لگے۔ اور پتھر کی طرح بے حرکت و بے حس بن کر رہ جائے۔ گائے کبھی جھوٹ نہیں بولتی اور پتھر کبھی چوری نہیں کرتا لیکن اس کے باوجود گائے گائے رہتی ہے اور پتھر پتھر ہی رہتا ہے۔ آدمی جھوٹ بولتا ہے، آدمی چوری کرتا ہے مگر اس کے بعد بھی یہ آدمی ہی ہوتا ہے جو دیوتا بن جاتا ہے۔ ستوگ جوہر ہونے پر ایک شخص بے عمل بن جاتا ہے اور گہرے دھیان یا مراقبہ میں غرق رہ کر آرام پاتا ہے لیکن رجس جوہر ہونے پر ایک شخص اچھے اعمال بھی کرتا ہے اور برے اعمال بھی کرتا ہے اور تامس جوہر ہونے پر وہ پھر بے عمل ہو جاتا ہے اور اس میں عمل کی شکتی نہیں رہتی۔ اب مجھے بتائیے کہ صرف باہر سے دیکھ کر کس طرح سمجھیں کہ آپ جس حال میں ہیں وہ ستو کا حال ہے یا تامس کا! آیا ہم اس منزل میں ہیں جہاں ایک شخص تمام اعمال و افعال اور ہر قسم کے دکھ سکھ سے بلند تر ہو کر ساتوک سکھ، سرور، سکون و اطمینان پا لیتا ہے یا ہم تامسک حالت کی اس پست ترین منزل میں ہیں جیسے ایک شخص پتھر کی طرح بے حس بن جاتا ہے، اس میں زندگی کی کوئی علامت نہیں رہتی۔ اس پر قنوطیت و جمود طاری ہو جاتا ہے۔ وہ کوئی کام نہیں کرتا۔ اس لئے کہ اس میں کام کرنے کی کوئی شکتی نہیں ہوتی۔ پس وہ اندر ہی اندر آہستہ آہستہ سڑنے گلنے لگتا ہے۔ اور اس کے اندر بدی و بدعنوانی چپکے چپکے اپنی جگہ بنا لیتی ہے۔ میں سنجیدگی سے آپ سے یہ سوال پوچھتا ہوں اور اس کا جواب چاہتا ہوں آپ اپنے ہی من سے پوچھئے اور پھر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ حقیقت کیا ہے۔"

مچائی گئی ہے؟ لیکن جواب کا انتظار کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ شخص جو ستو کی حالت میں بے عمل ہے وہ مطمئن ہے
اس میں طمانیت ہے، ایقان ہے۔ لیکن اس کی یہ بے عملی اس بنا پر ہے کہ اس میں تمام بڑی شکتیاں مجتمع ہو گئی ہیں اور اس کی طمانیت کی کوکھ بے پناہ شکتی کو جنم دے
رہی ہے۔ یہ عظیم ساتوک شخص یہ عظیم آتما، اس بات سے بے نیاز ہوا کرتی ہے کہ وہ ہماری طرح اپنے ہاتھوں اور اپنے پاؤں سے کام لے — اس کے
لئے بس اتنا ہی کافی ہے کہ وہ چاہے اور اس کے تمام کام اس کی خواہش اور مرضی کے مطابق فوراً انجام پا جائیں۔ جس شخص میں ساتوک جوہر کی افراط
ہوتی ہے وہی برہمن ہوتا ہے۔ جو سب کے لئے معزز ہے کیا وہ گھر گھر جا کر صدا لگاتا ہے اور دوسروں سے اپنے اعزاز کی بھیک مانگتا ہے؟ خالق
کائنات نے اپنے ہاتھ سے اس کے ماتھے پر سنہرے حروف میں لکھ دیا ہے — "اس کی سب پرستش کریں! یہ عظیم انسان! یہ میرا فرزند!" اور
دنیا یہ تحریر پڑھتی اور سمجھتی ہے اور اس کے سامنے اپنا سر تسلیم و اطاعت خم کر دیتی ہے۔ حقیقت میں یہ آدمی ہے —

अद्वेष्टा सर्वभूतानां मैत्रः करुण एव च ।
निर्ममो निरहंकारः समदुःखसुखः क्षमी ॥

(گیتا۔ ادھیائے ۱۲ — شلوک ۱۳)

"— وہ جس کا کوئی دشمن نہیں ہے، اور جو سب کے ساتھ دوستی اور مہربانی سے پیش آتا ہے، جو "میں اور میرا" کے احساس سے آزاد ہے،
جو دکھ سکھ دونوں حالتوں میں مطمئن رہتا ہے اور صبر کرتا ہے۔" اب اس بات کا آپ ان چیزوں سے موازنہ کیجئے جو آپ بزدلوں میں دیکھتے ہیں۔ ان
نکموں میں دیکھتے ہیں جو بولتے ہیں تو ناک میں اور ہر لفظ چبا چبا کر، جن کی آواز ایک ہفتہ سے فاقہ کرنے والے کسی آدمی کی آواز کی طرح کمزور اور
دھیمی ہوتی ہے، جو ایک چیتھڑے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ کبھی کسی بات پر احتجاج نہیں کرتے۔ اگر کوئی انہیں ٹھوکر بھی مار دے تو بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلتے۔
— یہ باتیں تو بدترین تامس کی علامتیں ہیں، یہ موت کی نشانیاں ہیں، یہ ستو کی نشانیاں نہیں ہیں — یہ سب کچھ بدی ہی بدی ہے، گراوٹ ہی گراوٹ
ہے! ارجن میں چونکہ اس درجہ کے لوگوں کی گراوٹ آ رہی ہے۔ لہٰذا بھگوان نے گیتا میں ان تمام معاملات کی اس شدید اصرار کے ساتھ وضاحت
کی۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟ بھگوان کی زبان سے سب سے پہلے جو الفاظ نکلے تھے۔ ان الفاظ کو سنیئے۔

- क्लैब्यं मास्म गमः पार्थ नैतत्त्वय्युपपद्यते—

"باطل کے سامنے مت جھک! اے پارتھا! یہ بدی تجھے فائدہ نہیں دے گی۔" اور اس کے بعد —

- तस्मात्त्वमुत्तिष्ठ यशो लभस्व

"پس تو اٹھ اور ناموری حاصل کر۔" جینیوں، بدھوں اور دوسروں کے زیر اثر آ کر ہم ان راستوں پر پڑ گئے جو تامسک لوگوں کا راستہ ہے۔
گزشتہ ہزار برسوں کی مدت میں سارا ملک ایشور کا نام لے کر فضاؤں کو معمور کرتا رہا۔ اس کی پوجا کرتا رہا۔ لیکن ایشور نے کیا اس نے کبھی ان کی طرف کوئی
توجہ نہیں کی، کوئی دھیان نہیں دیا۔ اور ایشور نے ایسا کیوں کیا؟ جب ایک عام آدمی تک کسی بے وقوف کی پکار پر دھیان نہیں دیتا۔ تو ایشور کسی بیوقوف
کی آواز کیوں سننے لگا؟ لہٰذا ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے۔ کہ ہم گیتا میں بھگوان کے الفاظ سنیں۔

-क्लैब्यं मास्म गमः पार्थ —

"باطل کے سامنے مت جھک اے پارتھ!

"तस्मात्त्वमुत्तिष्ठ यशो लभस्व—

پس تو اٹھ اور ناموری حاصل کر!

آیئے اب ہم اپنے موضوع کی طرف پلٹ آئیں۔ "مشرق اور مغرب"۔ پہلے تو یہ تضاد دیکھئے! یورپیوں کے بھگوان یسوع مسیح نے یہ تعلیم دی ہے کہ کسی کو دشمن نہ بناؤ۔ جو برائی کرے اس سے بھی بھلائی کرو۔ جو تمہارے ایک گال پہ طمانچہ مارے تم اپنا دوسرا گال بھی اس کے سامنے کر دو۔ سب کام چھوڑ کر بس آخرت کی تیاری کرو۔ قیامت کا دن نزدیک آ پہنچا ہے۔ اور گیتا میں ہمارے بھگوان نے جو تعلیم دی ہے وہ یہ ہے کہ سدا شوق اور جوش کے ساتھ کام کرتے رہو۔ اپنے دشمنوں کو تہس نہس کر دو۔ اور دنیا کا لطف اٹھاؤ۔ لیکن اس کے بعد ہوا کیا؟ یہ کہ یسوع مسیح اور کرشن کی تعلیمات کا قطعی طور پر تبادلہ ہو گیا۔ یورپین باشندوں نے کبھی یسوع مسیح کے الفاظ پر سنجیدگی سے دھیان نہیں دیا۔ اجسک مزاج و فطرت کی بنا پر وہ ہمیشہ منفعل و متحرک رہے اور انہوں نے زبردست ہمت و طاقت سے کام لے کر دنیا بھر کے مختلف ممالک کا آرام و آسائش سمیٹ کر اپنے گرد جمع کر لیا۔ اور جس طرح ان کا دل چاہا اس طرح انہوں نے آرام و آسائش کی ان چیزوں سے لطف اٹھایا۔ اور ہم اپنا سارا ساز و سامان سمیٹ کر ایک گوشہ میں بیٹھ گئے۔ اور رات دن موت کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ اور ہمارے لبوں پہ یہ گیت گونجنے لگے—

नलिनीदलगतजलमतितरलं तद्वज्जीवनमतिशयचपलम्—

"زندگی اتنی بے ثبات اور عارضی ہے جتنی شبنم کی وہ بوند جو کنول کی پتی پہ تھرتھرا رہی ہے"۔ نتیجہ یہ ہوا کہ موت کے دیوتا "یم" کے خوف سے ہمارا خون ٹھنڈا ہونے لگا۔ اور ہمارا گوشت پگھلنے لگا۔ اور افسوس کہ "یم" بھی ہماری زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کی تعمیل کرنے لگا۔ چنانچہ ہمارے ملک میں طاعون اور ہر قسم کی دیگر وبائیں پھیلنے لگیں۔ کون لوگ ہیں جو گیتا کی تعلیمات پر عمل کر رہے ہیں؟ — وہ یورپین ہیں! اور کون لوگ ہیں جو یسوع مسیح کی مرضی کے مطابق عمل کر رہے ہیں؟ — وہ شری کرشن کے پیروکار اور معتقد ہیں! یہ خوب سمجھنا چاہیئے کہ وہ وید ہیں جن میں موکش کی تلاش سب سے پہلے کی گئی ہے اور پہلے پہل موکش کے راستہ کی جانب التجا کی گئی ہے۔ موکش کا دلہوا خذ وید ہی ہیں۔ اور کسی بھی عظیم ہادی نے چاہے وہ مہاتما بدھ ہوں چاہے یسوع مسیح ہوں ویدوں کے بعد ہی اپنی تعلیمات دی ہیں۔ مزید برآں وہ سنیاسی تھے، لہٰذا ان کا کوئی دشمن نہ تھا۔ اور وہ سب کے ساتھ دوستی اور مہربانی سے پیش آتے تھے۔ یہ ان کے لئے خوب اور بہتر تھا۔ لیکن اس کی کیا وجہ ہے پوری دنیا کو موکش کے اسی راستہ پہ زبردستی چلانے کی کوشش کی جائے۔ کیا "خوبصورتی" رگڑنے اور چھیلنے سے بن سکتی ہے؟ کیا توڑ جوڑ یا طاقت استعمال کر کے کوئی شخص اپنے ہی جیسا کوئی آدمی بنا سکتا ہے؟ مہاتما بدھ اور یسوع مسیح اس آدمی کے لئے کیا فرماتے ہیں۔ جو نہ تو کبھی نصب العین کا طالب بنا، نہ اسے حاصل کرنے کی اس میں اہلیت و استعداد ہی ہے؟ — وہ کچھ بھی تجویز نہیں فرماتے! ان کی نظر کے سامنے دو ہی راستے ہیں، ایک موکش (حیاتِ جاوداں) دوسرے فنا! یا تو آپ موکش پا جائیں یا فنا ہو جائیں۔ ان کے سامنے کوئی درمیانی راہ نہیں ہے سوائے موکش کے اگر آپ کوئی دوسری چیز حاصل کرنا چاہیں۔ تو آپ اپنے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے پائیں گے، ایک لمحہ ہی کے لئے سہی۔ لیکن اس دنیا سے آپ کس طرح زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہو سکتے ہیں؟ اس معاملہ میں وہ کوئی رہنمائی نہیں کرتے، کوئی راستہ نہیں دکھاتے، نہ صرف یہ کہ انہوں نے اسی دنیا سے لطف اندوز ہونے کی کوئی راہ نہ کھولی، بلکہ انہوں نے آپ کو ایک تھیلی میں رکھ کر سر بمہر کر ڈالا۔

---

مشرق و مغرب صفحہ ۱۳

اتنا ہی نہیں بلکہ ہر قدم پر انہوں نے ایک رکاوٹ بھی کھڑی کر دی، یہ صرف ویدک دھرم ہے جو انسان کی زندگی کے چار درجے دھرم، ارتھ، کام اور موکش مقرر کرتا ہے۔ اور پھر ہر درجہ تک پہنچنے کے ذرائع متعین کرتا ہے۔ اصول، ضابطے اور قوانین وضع کرتا ہے، مہاتما بدھ نے ہمیں برباد کر ڈالا، اور یسوع مسیح نے اسی طرح یونان و روم کو برباد کر ڈالا۔ پھر وقت آیا اور یورپین خوش قسمتی سے پروٹسٹنٹ بن گئے اور انہوں نے یسوع مسیح کی تعلیمات کے متعلق پوپائی اقتدار کی جانب سے ہونے والی تشریحات، تعبیرات کا جوا اپنی گردن سے اتار کر رکھ دیا۔ اور اطمینان کا سانس لیا۔ ہندوستان میں کمارل بھٹ نے ایک بار پھر کرم مارگ کی جانب رہنمائی کی۔ یعنی انہوں نے اصرار کیا کہ صرف کرم کی راہ اختیار کی جائے۔ شنکر آچاریہ اور راما نج نے دھرم، ارتھ، کام اور موکش کو ان کی نسبت بھر اہمیت دے کر ایک توازن قائم کیا۔ اور لا فانی ویدک دھرم کی پائیدار تجدید کی۔ اس طرح پوری قوم کو اپنی گم شدہ زندگی دوبارہ حاصل کرنے کی راہ پر لایا گیا۔ لیکن ہندوستان میں تیس کروڑ روحیں، ہے جنہیں جگانا اور بیدار کرنا ہے، لہٰذا تاخیر تو ہونا ہی ہے تیس کروڑ کی نشاۃ ثانیہ — کیا ایک دن کا کام ہو سکتا ہے؟

بدھ مت اور ویدک دھرم کے مقاصد یکساں ہیں۔ لیکن بدھ مت نے جو طریقے اختیار کئے ہیں وہ درست نہیں ہیں، اگر بدھ مت کے طریقے صحیح ہوتے تو ہم کاہے کو مایوس کن انداز میں برباد و تباہ ہوتے، یہ کہنے سے کام نہیں چلے گا کہ وقت کے اثرات نے قدرتی طور پر یہ خرابی پھیلائی ہے۔ کیا وقت سبب و مسبب، یا علل و معلول کے قوانین پر اثر انداز ہو سکتا ہے؟

لہٰذا اس بات کے باوجود کہ اغراض و مقاصد یکساں ہیں، بدھوں نے صحیح ذرائع کے فقدان کی بدولت ہندوستان کو گراوٹ کے گڑھے میں گرا دیا۔ غالباً میری یہ بات میرے بدھ بھائیوں کے لئے موجبِ خلش و تکلیف اور باعثِ رنج و ملال ہو گی۔ لیکن کوئی چارہ کار نہیں ہے، سچائی تو کہنی ہی چاہیئے۔ اور مجھے انجام کی کوئی فکر نہیں ہے کوئی پرواہ نہیں ہے، ٹھیک اور صحیح ذرائع تو بس ویدوں ہی کے ہیں — یعنی جاتی دھرم — گویا وہ دھرم جو مختلف جاتیوں کی فطرت کے عین مطابق ہو — سو دھرم یعنی ایک شخص کا ذاتی دھرم یا ان فرائض کا مجموعہ جو اس کی حیثیت و استعداد کو ملحوظ رکھ کر متعین کئے جائیں — یہی وہ چیز ہے جدید کہ دھرم اور ویدک سماج کی اصل و اساس ہے، مزید برآں میں ان متعدد دوستوں کے جذبات کو بھی مجروح کر رہا ہوں جو یہ کہتے پھرتے ہیں کہ میں اپنے ابنائے وطن کی مداحی اور خوشامد کر رہا ہوں۔ میں ہی مرحلہ پر ان سب سے آخری بار پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس مداحی و خوشامد سے مجھے کیا نفع ہوتا ہے؟ کیا وہ ساز و سامان اور روپے پیسے سے میری مدد اور میری حمایت کرتے ہیں؟ برخلاف اس کے وہ تو اس روپیہ کو بھی ہتھیانے کی گھات میں لگے رہتے ہیں جو میں ہندوستان کے باہر سے بھیک مانگ مانگ کر جمع کرتا ہوں۔ تاکہ بے آسرا اور قحط زدہ لوگوں کا پیٹ بھروں۔ اور اگر وہ مجھ سے یہ روپیہ نہیں پاتے تو پھر مجھے گالیاں دیتے ہیں اور طعن و تشنیع کرتے ہیں۔ اے میرے وطن کے تعلیم یافتہ لوگو! میرے وطن کے لوگ اسی قماش کے۔ میں انہیں خوب اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ لہٰذا ان کی خوشامد سے کیا پا سکتا ہوں اور کیا توقع کر سکتا ہوں، میں جانتا ہوں کہ ان سے اسی طرح نمٹنا چاہیئے اور ویسا ہی سلوک کرنا چاہیئے جیسا کسی پاگل سے اور ہر معالج کو جو کسی دیوانہ کو دوا پلاتا ہے اس بات کے لئے تیار رہنا چاہیئے کہ دوا پلانے کے بدلے میں اسے دیوانہ ٹھوکریں بھی مارے گا، کاٹے گا بھی لیکن سچا دوست وہی ہے جو زبردستی کر کے حلق کے نیچے دوا اتار دے اور ہر بات کو صبر کے ساتھ برداشت کر لے۔

---

مشرق و مغرب صفحہ ۱۴

بہر طور یہی جاتی دھرم اور یہی سودھرم ہے۔ جو ہر ملک میں تمام سوسائیٹیوں کے لئے فلاح کا راستہ بھی ہے اور بام آزادی تک پہنچنے کی واحد سیڑھی بھی ہے۔ اسی جاتی دھرم اور اسی سودھرم کے زوال سے ہمارے ملک کو زوال کا منہ دیکھنا پڑا ہے، لیکن موجودہ زمانہ میں اونچی جاتیاں جاتی دھرم اور سودھرم کا بالعموم جو مفہوم سمجھتی ہیں۔ اسی مفہوم کو تو ایک نیا شر اور ایک نئی بدی کہا جا سکتا ہے۔ جس کی کہ مخالفت اور سخت نکمتہ چینی ہونی چاہیئے۔ ان کا خیال تو یہ ہے کہ وہ جاتی دھرم کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں جانتے، اپنے دیہی رواجوں کو ویدوں کے متعین کئے ہوئے لافانی رواجوں کے مطابق گرداننا اور تمام مراعات اپنے ہی لئے محفوظ کر لینا، تباہ کن ہے اور وہ اپنی بربادی کے راستہ پر چل رہے ہیں۔ میں جات پات کے اوصافی نظام کے بارے میں بات چیت نہیں کر رہا ہوں۔ صرف وراثتی نظام کی بات کر رہا ہوں۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ جات پات کا اوصافی نظام اصل شئے ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ خوبیوں کا جنم دو تین نسلوں کے بعد رک جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری قومی زندگی کی بنیاد کو صدمہ پہنچا۔ ورنہ اس پستی میں ہمارے ڈوب جانے کی کیا وجہ ہونی چاہیئے؟ گیتا میں آپ پڑھتے ہیں —

-संकरस्य च कर्ता स्यामुपहन्यामिमाः प्रजाः-

"تب مجھے نسلوں کے اختلاط کا موجب ہونا چاہیئے اور پس ان ذی روحوں کو فنا کر دینا چاہیئے —"

یہ بھیانک ورن سنکر کیسے ہوا؟ یعنی تمام جاتیوں کا یہ زوال اور تمام اوصاف و اقدار کا خاتمہ — ہمارے آباؤ اجداد کا گورا رنگ اب کالا کیسے ہو گیا؟ ستوگن کی جگہ اس تامس نے کیوں لے لی؟ جس سے ایسی کرنیں نکل رہی ہیں جیسے اس میں راجس موجود ہے، یہ لمبی کہانی ہے اور میں اپنا جواب کسی دوسرے موقع کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔ فی الحال تو اسے ہی سمجھنے کی کوشش کیجیئے کہ اگر جاتی دھرم کو ٹھیک رکھا جائے اور سچائی کے ساتھ اس کا تحفظ کیا جائے تو پھر قوم کبھی گرے گی نہیں، اگر یہ بات سچ ہے تو پھر ہمارے زوال کی کیا وجہ ہے؟ ہمارا زوال ہی اس بات کی یقینی علامت ہے کہ جاتی دھرم کی بنیاد کو چھیڑا گیا ہے، توڑ پھوڑ کی گئی ہے، پس آپ جسے جاتی دھرم کہتے ہیں وہ اس جاتی دھرم سے بالکل مختلف ہے جو ہمارے یہاں رائج ہے۔ پہلے آپ اپنے شاستروں کو سطر بہ سطر پڑھیئے پھر آپ کو یہ بات آسانی سے نظر آ جائے گی کہ شاستروں میں جاتی دھرم کی جو تعریف کی گئی ہے، وہ جاتی دھرم ملک کے گوشہ گوشہ سے قریب قریب ناپید ہو گیا ہے، لہٰذا سچے جاتی دھرم کو واپس لانے کی کوشش کیجیئے تب ہی ملک کو ایک حقیقی اور پائدار بنیاد ملے گی۔ میں نے جو کچھ پڑھا اور سنا ہے اور سمجھا ہے اسے صاف صاف الفاظ میں آپ سے کہہ رہا ہوں۔ میں کسی بدیش سے درآمد نہیں کیا گیا ہوں کہ میں آؤں اور آپ کو بچاؤں اور یہ کہ آپ کے احمقانہ رواجوں کو جاری رکھنے پر اصرار کروں اور ان کی سائنسی تعبیرات دیتا رہوں اس کی ہمارے بدیشی دوستوں کے لئے کوئی وقعت نہیں ہے، اسے تو وہ بدرجہ اتم کر سکتے ہیں، آپ انہیں خوش کر دیجیئے، ان کی مدح سرائی کیجیئے اور بس یہی ان کی خواہش ہے آرزو اور تمنا ہے، لیکن آپ کی صورت پر اگر خاک دھول ڈالی جائیگی آپ پر کیچڑ اچھالی جائے گی تو کیا وہ مجھ پر نہ گرے گی؟ کیا آپ یہ بات نہیں سوچتے، نہیں سمجھتے؟

---

# قومی سیرت

میں نے کسی جگہ کہا ہے کہ ہر قوم کا اپنا ایک قومی مقصد ہوا کرتا ہے' قانونِ فطرت کے تحت یا عظیم شخصیتوں کی برتر ذہانت فراست کے وصف سے ہر قوم کے رواج اس طور پر صورت پذیر ہوتے ہیں کہ اس کا قومی مقصد نتیجہ کے طور پر حاصل ہو' ہر قوم کی زندگی میں صرف وہی طور و طریق اور رواج و رسوم بنیادی طور پر ضروری ہوتے ہیں جو اس کے قومی مقصد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ باقی سب طریق و رواج صرف توہم ہوا کرتے ہیں۔ توہمات کی بقا یا فنا کا کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن ایک قوم کی زندگی کا بنیادی مقصد جب مجروح ہوتا ہے تو وہ یقینی طور پر فنا ہو جاتی ہے۔

بچپن میں ہم نے کسی پری کی یہ کہانی سنی تھی کہ اس کی جان چڑیا میں تھی۔ اور جب تک چڑیا نہ مرتی' وہ پری مر نہ سکتی تھی' ایک قوم کی زندگی بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔ مزید برآں آپ ایک اور چیز کا مشاہدہ کریں گے اور وہ یہ کہ ایک قوم کو آپ اس کے قومی مقصد سے تعلق نہ رکھنے والے کسی حق سے محروم کر دیجئے چاہے سب ہی حقوق چھین لیجیے لیکن اس بات کی بنا پر اس میں بدلہ لینے کی تمنا یا بہت سخت جذبہ پیدا نہیں ہو گا مگر جیسے ہی اس کے مقصد پر ہلکی سی چوٹ لگے گی جس پر اس کی قومی زندگی منحصر ہے ویسے ہی اس کا ردِ عمل بہت ہی شدید اور طاقتور ہو گا۔

مثال کے طور پر ان تین زندہ قوموں کو لے لیجیے جن کی تاریخ کم و بیش آپ جانتے ہی ہیں یعنی فرانسیسی' انگریز اور ہندو' فرانسیسی باشندوں کی سیرت میں سیاسی آزادی ریڑھ کی ہڈی جیسی بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ فرانس کے باشندے ہر قسم کے تشدد کو صبر و سکون کے ساتھ برداشت کر لیتے ہیں۔ ان پر بھاری ٹیکسوں کا بوجھ لاد دیجئے لیکن وہ اس بوجھ کے خلاف چوں بھی نہ کریں گے' پوری قوم کو مجبور کر دیجئے کہ وہ فوج میں بھرتی ہو جائے مگر انہیں کبھی اس زبردستی کی کوئی شکایت نہیں ہو گی لیکن ان کی سیاسی آزادی میں اگر کسی شخص کی جانب سے دخل در معقولات کی کوئی مثال ملے گی۔ تو پھر پوری قوم ایک فرد کی طرح اٹھ کھڑی ہو گی اور اس کا ردِ عمل دیوانہ وار ہو گا۔ کسی بھی شخص کو چاہے وہ دانشور ہو چاہے جاہل ہو' چاہے امیر ہو چاہے غریب ہو' چاہے جنم سے اعلیٰ ذات کا ہو چاہے کمتر طبقہ سے تعلق رکھتا ہو' اس بات کی اجازت اور موقع نہیں دیا جا سکتا کہ وہ ہمارے سر والہانہ اپنے اقتدار کو مسلط کر دینے کے لئے فتنہ و شورش برپا کرے ہم سب اپنے ملک کی

حکومت میں مساوی حصہ رکھتے ہیں اور ہم اپنے سماج کے آزاد محافظ و پاسباں ہیں ـــــ فرانسیسی باشندوں کی سیرت کا یہ بنیادی اصول ہے اس آزادی میں جو شخص بھی دخل دے گا اسے اپنے کیے پر پچھتانا پڑے گا۔

انگریز کی سیرت میں لین دین کی پالیسی کارفرما دکھائی دیتی ہے۔ ایک تاجر کا کاروباری اصول انہیں اپنی سیرت میں ورثہ کے طور پر ملا ہے۔ انگریز مساوات اور فوائد کے ذرائع و وسائل اور مواقع کی یکساں تقسیم ہی کو بنیادی طور پر اہمیت دیتا ہے۔ ایک انگریز[1] اپنے بادشاہ کے روبرو عاجزی سے سر جھکائے گا، امراء کے حقوق و مراعات کو تسلیم کرے گا۔ لیکن اسے اپنی جیب سے اگر ایک پائی بھی دینی پڑے گی تو وہ اس کا حساب لینے کے لئے ہر وقت تیار رہے گا۔ بادشاہ ہے تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ وہ اس کی اطاعت اور اس کے احترام کے لئے ہر وقت خود کو تیار رکھتا ہے لیکن بادشاہ اگر روپیہ طلب کرتا ہے تو اس کے جواب میں انگریز یہ بات کہتا ہے "اچھا! اگر بادشاہ روپیہ مانگتا ہے تو سب سے پہلے مجھے یہ سمجھنے دیجئے کہ روپیہ کی ضرورت کیوں ہے اور بادشاہ کو روپیہ دینے کا فائدہ کیا ہوگا، اس کے بعد یہ روپیہ جس طرح خرچ کیا جائے اس میں میرا مشورہ بھی ہونا چاہیئے۔ تب ہی میں یہ روپیہ دے سکوں گا۔" ایک مرتبہ انگلستان کے بادشاہ نے جب انگریز عوام سے زبردستی روپیہ وصول کرنے کی کوشش کی۔ تو وہ ایک عظیم انقلاب لے آئے۔ انہوں نے بادشاہ کو مار ڈالا۔

ہندوؤں کا قول یہ ہے کہ سیاسی و سماجی آزادی اچھی چیز ہے۔ لیکن حقیقی چیز روحانی آزادی ہے ـــ یعنی مکتی! ہمارا قومی مقصد یہ روحانی آزادی ہے۔ آپ چاہے ویدک ہوں، جینی یا بدھ ہوں، ادویتیہ، وششٹ ادویتیہ یا دویتیہ ہوں ـــ لیکن ان سب کا ذہن المقصد ایک ہی ہے اس مقصد سے آپ قطع نظر کر لیں اور جو جی میں آئے کرتے رہیں۔ ہندو کو آپ کی کسی بات کی کوئی چنتا نہ ہوگی۔ وہ چپ سادھے رہے گا لیکن آپ اگر اس مقصد کے ساتھ فریب کریں گے تو یاد رکھیئے کہ آپ اپنی تباہی کو دعوت دیں گے اور اپنے پاؤں پر اپنے ہاتھ سے کلہاڑی ماریں گے۔ اس کی ہر چیز لوٹ لیجئے، اسے ٹھوکر ماریئے، اسے حقارت سے کالا آدمی کہیئے یا کسی بھی نام سے مخاطب کیجئے۔ اسے ان باتوں کی زیادہ پرواہ نہیں ہوگی لیکن صرف ایک دروازے کو آزاد چھوڑ دیجئے ـــ یعنی دھرم کے دروازے کو، اس دروازہ میں کوئی توڑ پھوڑ نہ کیجئے۔ کوئی دخل نہ دیجئے! ذرا غور فرمایئے کہ ماضی قریب میں کتنے ہی پٹھان حکمران آئے اور گئے لیکن وہ ہندوستان کی سرزمین پر اپنی سلطنت کی پائدار بنیاد نہیں رکھ سکے۔ اس لئے کہ وہ سب کے سب ہندو دھرم پر بھی حملہ کر دیتے تھے لیکن اس کے برعکس ذرا مغل سلطنت کی طرف دیکھئے کہ اس کی بنیاد کتنی پائدار اور کتنی مستحکم رہی۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ صرف یہ کہ مغلوں نے اس چیز کو نہیں چھیڑا، واقعتاً ہندو ہی مغل سلطنت کے حقیقی ستون تھے، کیا آپ نہیں جانتے کہ جہانگیر، شاہجہان، دارا شکوہ یہ سب ہندو ماؤں کی گود میں پیدا ہوئے تھے۔ اب یہ مشاہدہ بھی کیجئے کہ جیسے ہی بدنصیب اورنگ زیب نے اس چیز کو چھیڑا ویسے ہی وہ عظیم مغل سلطنت اس طرح ختم ہو گئی جیسے وہ ایک خواب تھی۔ کیا وجہ ہے کہ ہندوستان میں انگریز حکومت کی بنیاد اتنی پائدار رہی اتنی مضبوط اور اتنی مستحکم رہی۔ وجہ یہ ہے کہ انہوں نے کسی طرح بھی ملک کے دھرم کو کبھی چھیڑنے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے۔ چالاک عیسائی مشنریوں نے اس چیز کو ذرا سا چھیڑنے کی کوشش کی تھی۔ تو اس کا نتیجہ غدر ۱۸۵۷ء کی صورت میں برآمد ہوا۔ جب تک انگریز اس حقیقت کو پوری طرح سمجھتے رہیں گے اور اس کے مطابق کام کرتے رہیں گے اس وقت تک ہندوستان میں ان کے اقتدار کی بنیاد مضبوط رہے گی اور متزلزل نہیں ہوگی۔ عاقبت اندیش اور عقلمند انگریز اس حقیقت کو محسوس کرتے ہیں۔ اور اس کا اقرار کرتے ہیں ـــ لارڈ رابرٹ کی کتاب

---

[1] مشرق و مغرب صفحہ ۱۷

"فورٹی ون ایرس اِن انڈیا"[1] پڑھیئے۔

اب آپ اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے کہ اس "پری" کی جان کہاں ہے؟ ــــــ وہ دھرم میں ہے، چونکہ کوئی بھی اسے مٹا نہیں سکتا، برباد اور فنا نہیں کر سکتا، لہٰذا ہندو قوم اب بھی زندہ ہے اور ان گنت مصائب اور زلزلوں سے گزرنے کے باوجود زندہ ہے ــــ خوب! ایک ہندوستانی دانشور نے یہ سوال فرمایا ہے کہ "ایک قوم کی روح کو دھرم کے پنجرے میں بند رکھنے کا فائدہ کیا ہے؟ آپ دوسری اقوام کی طرح اسے سیاسی یا سماجی آزادی میں کیوں نہیں رکھتے"؟ اس قسم کی باتیں کرنا بہت سہل ہوتا ہے۔ اگر محض دلائل و کی خاطر یہ فرض کر لیا جائے کہ دھرم، روحانی آزادی، آتما، ایشور اور مکتی، یہ سب جھوٹی باتیں ہیں تو بھی آپ دیکھیں گے کہ اصل مسئلہ بدستور باقی رہتا ہے۔ چونکہ ایک ہی سوز مختلف شکلوں میں برسرِ کار ہے لہٰذا ایک ہی عظیم شکتی ہے جو اپنے ایک روپ میں فرانسیسی باشندوں کی سیاسی آزادی میں برسرِ کار ہے اور اپنے دوسرے روپ میں انگریزوں کی تاجرانہ ذہنیت اور حدود و مساوات کی توسیع کے جذبہ میں کارفرما ہے۔ اور اسی طرح ہندوؤں میں وہ مکتی یا روحانی آزادی کی طلب و خواہش کی صورت میں موجود ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ اسی عظیم شکتی نے مقدرات کے نشیب و فراز کے درمیان صدیوں کی مدت میں اپنے عمل کے ذریعہ انگریز اور فرانسیسی باشندوں کی سیرت تعمیر کی ہے اور یہی وہ عظیم طاقت ہے کبھی ولولہ انگیزی نے ہزاروں صدیاں بیت جانے کے بعد ہندو قومی سیرت کے احیاء کی تحریک پیدا کی ہے۔ میں پوری سنجیدگی سے پوچھتا ہوں ـــ آسان کیا ہے؟ اس قومی سیرت کو ترک کر دینا، جو ہزاروں صدیوں میں تعمیر ہوئی ہے یا اس بدیشی سیرت کو اختیار کر لینا، جس کی عمر صرف چند سو برس کی ہے۔ انگریز کیوں اپنی جنگجویانہ عادتیں فراموش نہیں کر دیتے اور کیوں خونریزی اور جنگ سے باز نہیں آ جاتے اور کیوں آرام و سکون سے بیٹھ کر اپنی ساری شکتی اس بات پر نہیں لگاتے کہ دھرم ان کی زندگی کا بنیادی مقصد بن جائے؟

واقعہ یہ ہے کہ ایک دریا جو اپنے پہاڑی منبع سے نکل کر ہزاروں میل دور بہہ آیا ہے۔ کیا وہ اپنے منبع کی جانب پلٹتا ہے یا پلٹ سکتا ہے؟ اگر وہ اپنے بہاؤ کو واپس اپنے منبع کی جانب پلٹانے کی کوشش کرے گا۔ تو اس کا سیدھا سا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ادھر ادھر پھٹ جائے اور مختلف سمتوں میں منتشر ہو کر سوکھ جائے۔ ایک دریا چاہے خوشنما اور خوبصورت میدانوں سے گزرے، یا سطح مرتفع پر سے ٹکیاتا ہوا آگے بڑھے۔ لیکن اس کے لئے یہ بات ہر طور پر یقینی ہوتی ہے کہ وہ جلد یا بدیر سمندر میں جا گرے گا۔ اگر ہماری اس ہزار برس کی قومی زندگی ایک غلطی ہے تو پھر اس کا کوئی ازالہ نہیں ہے۔ لیکن اب اس کی جگہ اگر ہم نئی سیرت کو تعمیر کرنے کی کوشش کریں گے تو اس کا ایک ہی نتیجہ ہوگا اور وہ یہ کہ ہم فنا ہو جائیں۔

لیکن میرا یہ کہنا معاف فرمائیے کہ ہمارے قومی آدرش کو ایک غلطی سمجھنا محض جہالت و بے خبری اور کم عقلی کا نتیجہ ہے، پہلے دوسرے ممالک میں جائیے اور ان کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیجیے ـــ دوسروں کی آنکھوں سے نہیں۔ اور اگر آپ کے پاس عقل ہو تو عادات و اطوار اور رسوم و رواج کا عقل کے ساتھ مطالعہ کیجیے۔ پھر اپنی قدیم کتابیں اور اپنا قدیم ادب پڑھیئے

---

Forty-one Years in India.[1]

[1] ملاحظہ ہو ــــــ تیسواں (۳۰) اور اکتیسواں (۳۱) باب!

---

پورے ہندوستان کا سفر کیجئے، اس کے مختلف حصوں میں رہنے والے لوگوں سے ملئے، ان کے عادات و اطوار کا بیدار مغزی سے مطالعہ اور ایک عاقل کی نظر سے مشاہدہ کیجئے، ایک بے وقوف کی نگاہ سے نہیں، تو آپ پر روزِ روشن کی طرح یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ اب بھی قوم کی زندگی کا شیرازہ بندھا ہوا ہے اور اس کی زندگی کی نبض اب بھی چل رہی ہے، آپ خاکستر میں اب بھی دبی ہوئی چنگاریاں پائیں گے ہماری قومی زندگی کی آگ اب بھی دہک رہی ہے۔ دھرم ہی اس قوم کی زندگی ہے، اس کی زبان ہے، اس کا آدرش ہے، اس کی سیاست ہے، سوسائٹی ہے، میونسپلٹی ہے، انسدادِ طاعون کی مہم ہے، قحط زدوں کی امداد کا کام ہے — یہ سب کام اسی طرح انجام دیئے جائیں گے جس طرح ہمیشہ انجام دیئے جاتے رہے ہیں یعنی دھرم کے ذریعہ ورنہ میرے دوست! آپ کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوگی۔ اور آپ کا یہ رنج و ملال بیکار جائے گا۔

اس کے علاوہ ہر ملک میں بہر طور ذرائع تو یکساں ہی ہوا کرتے ہیں یعنی یہ کہ چند مٹھی بھر اربابِ اقتدار زبان سے جو کچھ کہہ دیتا وہ پتھر کی لکیر بن جاتا ہے۔ اور باقی لوگ تو صرف بھیڑوں کے گلہ کی طرح ان کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں، اللہ اللہ خیر سلا! میں نے آپ کی پارلیمنٹ، سینٹ، آپ کا ووٹ، اکثریت، بیلٹ سب کچھ دیکھا ہے میرے دوست باہر جگہ یہی چیر ہے، ہر ملک کے طاقتور لوگ سوسائٹی کو اپنی مرضی کے مطابق چلاتے ہیں، جدھر چاہتے ہیں ادھر لے جاتے ہیں۔ اور باقی لوگ محض بھیڑوں کا گلہ ہوتے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں یہ طاقتور لوگ کون ہیں؟ — یہ وہی لوگ ہیں جنہیں دھرم کی دنیا میں قوی و توانا کہا جاتا ہے، یہی لوگ ہیں جو ہماری سوسائٹی کو چلاتے ہیں اور سوسائٹی کے قوانین میں حسبِ ضرورت تغیر و تبدل کرتے ہیں ہم ان کی بات دھیان سے سنتے ہیں اور ان کے کہنے کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ ہمارے معاملہ میں صرف اتنا سا فرق ہے کہ ہم میں اپنی برتری کا کوئی طنطنہ نہیں ہے اور نہ ہی ہم اکثریت، ووٹ، بیلٹ اور اسی طرح کی دوسری کشمکش و کشاکش کی چیزوں پر دوسرے ممالک کی طرح شورش مچاتے! کل اتنی سی بات ہے!

بے شک ہم وہ تعلیم نہیں پاتے جو مغرب کے عام آدمی کو ووٹ اور بیلٹ وغیرہ کے طریقِ کار کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے لیکن دوسری جانب ہمارے درمیان ان لوگوں کا کوئی طبقہ بھی نہیں ہے جو سیاست کے نام پر دوسروں کو لوٹتے ہیں۔ اور ان کے خون کو چوس کر خود کو قوی و توانا بناتے ہیں جیسا کہ یورپ کے تمام ممالک کے عوام کی زندگی کے خون کو چوسا جاتا ہے میرے دوست! کیا آپ نے کبھی یہ ہیبت ناک منظر دیکھا ہے؟ جو ان سیاست دانوں کے اعمال و افعال کے پس پردہ دکھائی دیتا ہے — کیا آپ نے رشوت ستانی میں یہ حسد ملاحظہ کیا ہے، روزِ روشن کی یہ ڈکیتی دیکھی ہے، آدمی کے اندر شیطان کا یہ رقص دیکھا ہے، جو ایسے مواقع پر ناچ اٹھتا ہے — آدمی کے بارے میں آپ کو مایوسی ہوگی! دودھ کو کوئی منہ نہیں لگاتا جب کہ شراب خانہ کھچا کھچ بھرا رہتا ہے، ایک بار عصمت عورت کے لئے کبھی اوقات ستر پوشی ناممکن ہوتی ہے جبکہ شہروں کی عورت اپنے جملہ زیورات پر فخر و تکبر کرتے دکھائی دیتی ہے۔ ان کی حکومت کے ہاتھ میں جو روپیہ ہے وہ لوگوں سے لوٹا جا رہا ہے اور حکومت انہیں بطور سپاہی دوسرے ممالک کے سواحل پر لڑنے اور مرنے کے لئے بھیج رہی ہے؛ تاکہ فتح ہونے کی صورت میں ان کے تابوت اس سونے سے بھر کر واپس آئیں۔ جو ان کی حکومت دوسرے ممالک میں اپنی رعایا کا خون بیچ کر خرید رہی ہے — اور رعیت؟ — وہ تو صرف اپنا خون بہانے کے لئے ہے! یہ ہے سیاست! میرے دوست! کیا آپ لرزہ براندام نہیں ہوتے؟ آپ سیاست کی ان بھول بھلیوں

---

مشرق و مغرب صفحہ 19

میں گم نہیں ہو جاتے ؟

سب سے پہلے یہ سمجھنے کی کوشش کیجئے! آدمی قانون بناتا ہے یا قانون آدمی کو بناتا ہے؟ روپیہ آدمی کو بناتا ہے یا آدمی روپیہ کو بناتا ہے عزت و شہرت آدمی کے لئے ہوتی ہے یا آدمی عزت و شہرت کے لئے ہوا کرتا ہے ؟

میرے دوست! پہلے آدمی بنیئے۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ کس طرح یہ سب چیزیں آپ کے لئے خود بخود ہو جاتی ہیں۔ اس جذبہ نفرت کو ترک کیجئے ایک دوسرے پر کتے کی طرح بھونکنا اور کاٹنا چھوڑ دیجئے۔ اور اچھے مقصد کو اپنی زندگی کا موقف بنائیے۔ صحیح ذرائع اختیار کیجئے۔ صحیح جرأت شجاعت سے کام لیجئے اور بہادر بنئے! جب آپ آدمی پیدا ہوئے ہیں تو اپنے پیچھے ایسے نقوش چھوڑ جائیے جو کبھی مٹ نہ سکیں ہمیشہ نمایاں رہیں۔ "اے تلسی[1]! جب پہلے دن تو اس دنیا میں آیا تھا تو سب ہنس رہے تھے اور تو رو رہا تھا۔ لیکن اب اس طرح زندگی بسر کر اور ایسے کام کر جا کہ جب تو اس دنیا کو چھوڑے تو سب روتے ہوں اور تو ہنستا ہو۔" اگر آپ ایسا کر سکتے ہیں تو آدمی کہلانے کے مستحق ہیں ورنہ آپ کا کیا فائدہ!

مزید برآں میرے دوست! آپ کو یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ بہت سی چیزیں ہم دوسری قوموں سے سیکھتے ہیں۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ اب اسے کچھ سیکھنا نہیں ہے وہ اپنے خاتمہ کی حد پر پہلے ہی پہنچ چکا ہوتا ہے، جو قوم یہ کہتی ہے کہ وہ سب کچھ جانتی ہے وہ اپنی بربادی کے کنارے پر کھڑی ہوتی ہے۔ جب تک میں زندہ رہوں گا۔ اس وقت تک تحصیل علم کرتا رہوں گا، کچھ سیکھتا رہوں گا۔ لیکن یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیئے کہ جب ہم دوسروں سے کوئی بات سیکھیں تو ہمیں چاہیئے کہ ہم اسے اپنے طور و طریق کے مطابق ڈھال لیں۔ دوسروں سے ہم جو کچھ سیکھیں گے وہ ہمارے خزانہ میں اضافہ ہوگا لیکن ہمیشہ ہی یہ بات بھی پوری طرح اپنے دھیان میں رکھنی چاہیئے کہ کونسی چیز ہماری اپنی ہے۔ مثال کے طور پر فرض کیجئے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ میرا رات کا کھانا یورپین طریقے سے پکایا جائے۔ یورپین کرسیوں پر بیٹھتے ہیں۔ اور ہم سپاٹ زمین پر بیٹھ کر کھانا کھانے کی عادت رکھتے ہیں۔ یورپین باشندوں کی نقالی کرتے ہوئے اگر میں یہ ہدایت کر دوں کہ میرا ڈنر مجھے میز پر کھلایا جائے اور میں ایک کرسی پر ایک گھنٹہ سے زیادہ دیر تک پاؤں لٹکائے بیٹھا رہوں۔ تو ان کے قول کے مطابق میرے قدم موت کے دروازے تک پہنچنے کے لئے سارا راستہ صاف ہو جائے گا۔ اور میرے اس بات کی مجھے سخت سزا دی جائے گی۔ آپ اس بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں؟ لہٰذا یورپین کھانے کھاتے ہوئے بھی مجھے اپنے طریقہ کے مطابق سپاٹ زمین پر بیٹھنا چاہیئے۔ اسی طرح جب ہم دوسروں سے کچھ سیکھیں تو اسے اپنے فیشن اور اپنے طور و طریق کے مطابق ڈھال لینا چاہیئے اور ہمیشہ اپنی قومیت کے اوصاف کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ مجھے پوچھنے دیجئے کہ لباس آدمی کے لئے ہوتا ہے یا لباس سے آدمی بنا کرتا ہے؟ دانشمند آدمی چاہے کوئی بھی لباس پہنتا ہو لیکن اس کی عزت کی جاتی ہے۔ لیکن میرے جیسے بے وقوفوں کی کون پرواہ کرتا ہے۔ چاہے وہ اپنے پیٹ پر دھوبی کے گدھے کی طرح کپڑوں کا گٹھڑ اٹھائے پھرتے ہوں!

---

[1] ہندوستان کے مستانہ ہندی شاعر اور ایک اوتار بھگت —— ہندی رامائن کے شہرہ آفاق مصنف اس مقام پر انہوں نے خود اپنی ذات سے خطاب کیا ہے۔

# رنگ و بُو

تعارف کے طور پر یہ تعارف اور ابتدائیہ اگرچہ کافی طویل ہوگیا۔ لیکن ان باتوں کے بعد ہمارے لئے دو قوموں کا موازنہ کرنا آسان ہوگا ــــــ وہ اچھے اور خوب ہیں ــــ اور ہم بھی بہت اچھے ہیں، آپ نہ تو ایک کی تعریف کر سکتے ہیں نہ دوسرے کو بُرا کہہ سکتے ہیں، دونوں پیمانے برابر ہیں۔ اگرچہ اچھائی کی اقسام اور درجہ بندی ضرور ہے اور کل اتنی ہی بات ہے!

ہمارے خیال کے مطابق آدمی تین چیزوں سے مل کر بنتا ہے، جسم، عقل اور رُوح! پہلے ہم آدمی کے جسم کے بارے میں سوچنے دیجئے جو دکھائی دینے والی ایک چیز ہے۔

پہلے تو یہ دیکھئے کہ آدمی کے جسم ہی کی کتنی مختلف اقسام پائی جاتی ہیں، ناک، صورت، بال، رنگ، لمبائی، چوڑائی وغیرہ وغیرہ کی کتنی اقسام ہوتی ہیں!

علم الانساب کے جدید ماہرین کا کہنا ہے کہ رنگوں کے فرق کی وجہ اختلاط و آمیزش خون ہوا کرتی ہے، اگرچہ کسی مقام کی گرم یا سرد آب و ہوا بھی رنگ پر کسی نہ کسی حد تک اثر انداز ہوا کرتی ہے۔ لیکن رنگ کے تغیر و تبدل کا حقیقی و بنیادی سبب وراثت ہی ہوا کرتی ہے۔ دنیا کے سرد ترین مقامات میں بھی کالے رنگ کے لوگ پائے جاتے ہیں، اسی طرح گرم ترین مقامات پر گہرے رنگ کے لوگ موجود ہیں، کناڈا کے اصلی قبائلی لوگوں کا رنگ امریکہ میں اور قطب شمالی کے علاقوں میں پائے جانے والے اسکیموؤں کا رنگ گورا نہیں ہوا کرتا، جب کہ بعض جزائر جیسے بورنیو اور ابلیس وغیرہ میں جو خطِ استوا کے منطقہ میں واقع ہیں، مقامی لوگوں کا رنگ سفید یا گورا ہوتا ہے،

ہندو شاستروں کے مطابق تین ہندو جاتیاں برہمن کشتری اور ویش اور بیرونِ ہند متعدد قومیں چین، ہن، دارد، پہلو، یونا اور کش یہ سب کی سب آریہ ہیں، ہمارے شاستروں کے مطابق یہ چین، وہ قوم نہیں ہے جسے اس زمانہ میں چینی باشندہ کہا جاتا ہے، مزید برآں اس زمانہ میں چینی باشندے خود کو کبھی چین نہیں کہا کرتے تھے، یہ ایک ممتاز و طاقتور قوم تھی جو کشمیر کے شمال مشرقی علاقوں میں آباد تھی اور درد قوم ان علاقوں

میں بستی تھی جہاں اب ہندوستان و افغانستان کے درمیان پہاڑی قبائل آباد ہیں۔ قدیم چینی قوم کے پسماندگان اب بھی بہت تھوڑی تعداد میں موجود ہیں اور اسی طرح دردستان بھی موجود ہے۔ کشمیر کی تاریخ راج ترنگنی میں دردراج کی طاقت اور برتری کے اکثر حوالے ملتے ہیں۔ ہنوں کا ایک قدیم قبیلہ مدت مدید تک ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں میں حکومت کرتا رہا۔ تبتی باشندے بھی خود کو ہن کہتے ہیں لیکن یہ ہن غالباً ہیون ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے جن ہنوں کا تذکرہ کیا ہے وہ موجودہ زمانہ کے تبتی باشندے نہیں تھے تاہم یہ گمان اغلب ہے کہ اس زمانہ کے تبتی باشندوں کی نسل قدیم آریائی ہنوں اور بعض دیگر مغل قبائل کے اختلاط کی پیداوار ہوگی جو وسط ایشیا سے تبت میں آئے تھے۔ روسی سیاح پیرجیوسکی اور فرانسیسی سیاح ڈک ڈی اورلینس Duc d' Orleans, Prjevalski کے بیانات کے مطابق تبتی قبائل کے بعض علاقوں میں اب بھی آریائی شکل و شمائل سے ملتی جلتی صورتیں اور آنکھیں پائی جاتی ہیں۔ یونہ وہ نام ہے جو یونانیوں کو دیا گیا تھا۔ اس نام کی ابتدا کیسے ہوئی اس بارے میں بہت سے اختلافات ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یونانیوں کے اس قبیلے کو ممیز کرنے کے لئے پہلے پہل یہ نام "یونہ" وضع کیا گیا جو ایک مقام "ایونیا" میں آباد تھا لہٰذا سمراٹ اشوک کی پالی زبان کی تحریروں اور زبانوں میں یونانیوں کو "یوناس" کہا جانے لگا اور اس کے بعد اس لفظ "یونہ" سے سنسکرت کا لفظ "یون" بن گیا۔ اسی طرح آثارِ قدیمہ کے بعض ہندوستانی ماہرین کی رائے کے مطابق "یاونہ" نام سے یونانی مراد نہیں ہیں۔ لیکن یہ سب رائیں غلط ہیں لفظ "یون" ایک مجرد لفظ ہے اور نہ صرف ہندو بلکہ مصری اور بابلی تک یونانیوں کو اسی نام سے پکارتے تھے۔ لفظ "پہلوی" سے مراد وہ قدیم پارسی ہیں جو پہلوی زبان بولتے تھے۔ لفظ کش اب تک نیم متمدن آریائی قبائل کے لئے مستعمل ہے جو ہمالیہ اور دوسرے پہاڑی علاقوں میں آباد ہیں۔ جن معنوں میں یہ لفظ مستعمل ہے ان کے مطابق موجودہ یورپین باشندے انہی کشوں کی اولاد قرار پاتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر وہ تمام آریائی قبیلے جو زمانہ قدیم میں غیر متمدن تھے کش کہلایا کرتے تھے۔

علمائے عصر کے خیال میں آریوں کا رنگ سرخی مائل سفید ہوتا تھا۔ ان کے بال کالے یا سرخ ہوتے تھے، ستواں ناک اور آنکھیں بڑی ہوتی تھیں اور ان کے جسمانی ڈھانچہ میں بالوں کے رنگ کی مطابقت سے تھوڑا بہت فرق ہوتا تھا۔ جہاں رنگ کالا ہوتا تھا، وہاں اس تبدیلی کی وجہ یہ ہوتی کہ آریوں کے خالص خون میں سیاہ فام نسلوں کا خون مل جاتا۔ وہ یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ بس ہمالیہ کے مغربی سرحدی علاقوں ہی میں کچھ ایسے آریائی قبیلے اب بھی موجود ہیں جو خالص آریائی خون رکھتے ہیں اور باقی سب کے خون میں آمیزش ہو چکی ہے، ورنہ ان کا رنگ کالا ہو جانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یورپ کے علماء کو اس وقت تک کم سے کم یہ بات معلوم ہی ہو جانا چاہئیے تھی کہ اب بھی ہندوستان کے جنوبی علاقوں میں بہت سے بچے جب پیدا ہوتے ہیں تو ان کے بال سرخ ہوتے ہیں جو دو یا تین برس کے بعد کالے ہو جاتے ہیں نیز ہمالیائی علاقوں میں اب بھی بہت سے لوگوں کے بال سرخ اور آنکھیں نیلی یا گہری بھوری ہوتی ہیں۔

خود علماء ہی کو اس بات پر آپس میں جھگڑنے دیجئے۔ کہ یہ ہندو ہیں جو خود کو ہمیشہ آریہ کہا کرتے ہیں۔ ان کا خون چاہے خالص ہو چاہے نہ ہو لیکن یہ بات یقینی ہے کہ ہندو ہی آریہ ہیں! اگر یورپین ہمیں آریوں کو پسند نہیں کرتے اس لئے کہ ہمارا رنگ کالا ہے تو وہ اپنا کوئی دوسرا نام رکھ لیں ہمیں اس سے کیا واسطہ؟

رنگ چاہے کالا ہو چاہے گورا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن دنیا بھر کی تمام قوموں کے مقابلہ میں ہندوؤں کے خد و خال نہایت نفیس، نہایت نازک اور نہایت دلکش ہوتے ہیں۔ میں نہ تو مدح سرائی کر رہا ہوں نہ اس بنا پر کسی بات میں غلو کر رہا ہوں کہ میں اسی قومیت سے تعلق رکھتا ہوں بلکہ یہ وہ حقیقت ہے جسے ساری دنیا جانتی ہے۔ دنیا کے کس حصہ میں خوبصورت مردوں اور خوش جمال عورتوں کا تناسب ہندوستان سے زیادہ ہے؟

مزید برآں یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ دوسرے ملکوں کی نسبت ہمارے ملک میں زینت و آرائش کا کتنا ہی اہتمام کیا جاتا ہے جب کہ یہ واقعہ ہے کہ ہمارے ملک کے لوگوں کے جسم کا زیادہ حصّہ کھلا رہتا ہے۔ دوسرے ملکوں میں ہمیشہ ہی اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ بدصورت لوگوں کو بھی خوبصورت پوشاک پہنائی جائے تاکہ وہ خوبصورت دکھائی دیں۔

بلاشبہ مغرب کے باشندوں کی صحت ہم سے بہت بہتر ہے مغربی ممالک کے مرد چالیس برس اور عورتیں پچاس برس کی عمر ہوتے ہوئے بھی جوان رہتے ہیں۔ اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے اس لئے کہ انہیں کھانے کو اچھی غذا ملتی ہے اچھی پوشاک پہنتے ہیں اور اچھی آب و ہوا میں رہتے ہیں اور ان سب کے علاوہ ان کی صحت کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ وہ اوائل عمر میں شادی نہیں کرتے خود ہمارے یہاں جو طاقتور اور توانا قبائل ہیں ہمیں ان ہی سے پوچھ لینا چاہیئے کہ وہ کس عمر میں شادی کرتے ہیں، پہاڑی قبائل مثال کے طور پر گورکھوں، پنجابیوں، جاٹوں اور آفریدیوں سے پوچھئے کہ وہ کس عمر میں شادی کرتے ہیں۔ اس کے بعد اپنے شاستر پڑھیئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ برہمن کے لئے شادی کی عمر تیس برس مقرر کی گئی ہے کشتری کے لئے ۲۵ برس اور ویش کے لئے ۲۰ برس! درازیٔ عمر، جسمانی و دماغی طاقت کے نقطۂ نگاہ سے اور مغربی ممالک کے باشندوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہے جیسے ہی ہماری عمر چالیس برس کی ہوتی ہے ویسے ہی ہمارے عزائم اور ہماری جسمانی و دماغی طاقت کا انحطاط شروع ہو جاتا ہے جب کہ مغرب کے لوگ اس عمر میں جوان اور توانا ہوتے ہیں۔ ان کے دل عزائم کی قوتوں سے معمور ہوتے ہیں اور سچ پوچھئے تو ان کی اصل زندگی اس عمر کو پہنچ کر ہی شروع ہوتی ہے۔

ہم سبزی خور ہیں — ہم زیادہ تر معدے کی بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ہمارے بوڑھے مرد اور عورتیں امراضِ شکم سے مرتے ہیں جب کہ مغرب میں بوڑھے مرد اور عورتیں دل یا پھیپھڑوں کی بیماری میں مرتے ہیں۔ مغرب کے ایک فاضل ڈاکٹر کی یہ رائے ہے کہ جو لوگ معدے اور پیٹ کے امراض میں مبتلا ہیں وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے عموماً ترکِ دنیا کی طرف مائل ہوتے ہیں ان پر قنوطیت و جمود طاری ہوتا ہے اور جو لوگ دل یا جسم کے اوپری حصّہ سے تعلق رکھنے والے کسی مرض میں مبتلا ہوتے ہیں وہ ہمیشہ پُرعزم رہتے ہیں اور ان کی ہمت آخری دم تک بندھی رہتی ہے ہیضہ کا مریض ابتدا ہی سے ڈرنے لگتا ہے کہ کہیں وہ مر نہ جائے جب کہ تپ دق کے مریض کو آخری لمحہ تک اپنے صحت یاب ہو جانے کی توقع ہوتی ہے میرے دوست ڈاکٹر نے اس تجربہ کی بنا پر یہ دلیل پیش کی تھی کہ ہندوستانی اس وجہ سے ترکِ دنیا کی جانب راغب رہتے ہیں۔ اور اپنی موت کے بارے میں سوچا کرتے ہیں اور بات چیت کیا کرتے ہیں چونکہ میرے پاس اس دلیل کا کوئی قطعی اور تشفی بخش جواب نہیں ہے۔ اس بنا پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالباً اس دلیل میں کوئی صداقت ہے اور یہ دلیل اس بات کی مستحق ہے کہ اس پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔

ہمارے ملک میں بہت کم لوگ دانتوں اور بالوں کے امراض میں مبتلا ہوتے ہیں مگر مغرب میں قدرتی اور صحت مند دانت رکھنے والے گنتی ہی کے لوگ ہوتے ہیں اور ہر جگہ کے لوگ بالعموم گنجے ہوا کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں کی عورتیں زیورات پہننے کے لئے اپنے کان اور اپنی ناک چھدواتی ہیں مگر مغرب کے اعلےٰ طبقات کی عورتیں بھی اس زمانہ میں یہ سب کچھ نہیں کرتیں لیکن اپنے پستانوں کو سخت اور نوکدار دکھانے کے لئے اپنے سینے کو کس کر باندھتی ہیں اور محض اپنی ہیئت کذائی کی نمائش کے لئے اپنے جگر اور اپنے پھیپھڑوں کی ساخت

خراب کر لیتی ہیں اور خود کو موت کے منہ میں جھونک دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان پر لباس کا بوجھ لادا ہوا ہوتا ہے جس سے وہ اپنے جسم کے اعضا کی زیادہ سے زیادہ نمائش کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مغربی لباس بہرحال کام کرنے کے لئے موزوں ہوتا ہے۔ دولتمند طبقات کی عورتیں سوسائٹی میں جو لباس پہنتی ہیں اسے چھوڑ کر مغربی ممالک کی عورتوں کی پوشاک بالعموم بدنما اور بدصورت ہوتی ہے، ہماری عورتوں کی ساری، چوغہ، اچکن اور ہمارے مردوں کے صافہ کا لباس خوبصورتی کے نقطۂ نظر سے کوئی جواب ہی نہیں ہے۔ تنگ لباس اتنے خوبصورت اور اتنے جامہ زیب نہیں ہو سکتے جتنے خوبصورت اور جامہ زیب وہ ڈھیلے لباس ہوتے ہیں جو جسم کی قدرتی ساخت کے مطابق ٹھیک ہوں۔ لیکن ہمارے جملہ لباس جو مروج ہیں وہ کام کرنے کے لئے مناسب و موزوں نہیں ہیں، کام کرتے ہوئے وہ خراب ہو جاتے ہیں اور ان کے خراب ہو جانے کا احتمال رہتا ہے۔ مغرب میں ایک ایسی چیز ہے جسے فیشن کہا جاتا ہے، ان کے لباس میں فیشن ہے اور ہمارے رسم و رواج میں، اگرچہ ان دنوں میں ہمارے لباس میں بھی تھوڑا تھوڑا فیشن چلا ہے۔ پیرس عورتوں کے لباس کے لئے فیشن کا مرکز ہے اور لندن مردوں کے لباس کے لئے۔ پیرس کی ایکٹرسیں بالعموم فیشن نکالتی ہیں، ایک مشہور ایکٹرس کسی نئے فیشن کا جب کوئی لباس پہنتی ہے تو فیشن کی دنیا جو بسیانہ انداز میں اس کی نقالی شروع کر دیتی ہے۔ پوشاک بنانے والی بڑی بڑی فرمیں اس زمانہ میں فیشن ایجاد کرتی ہیں، ہم سوچ بھی نہیں سکتے کہ مغربی ممالک میں کتنے لاکھ پونڈ سالانہ صرف لباس پر خرچ کیا جاتا ہے، پوشاک تیار کرنے کے کاروبار نے ایک مستقل علم کی شکل اختیار کر لی ہے ـــ ایک لڑکی کے رخساروں اور بالوں کے رنگ کی مطابقت میں اسے کس رنگ کا سوٹ پہننا چاہیئے، اس کے لباس میں سے اس کے جسم کے کون کون سے خاص اعضا اپنے حسن کے ساتھ نمایاں طور پر نظر آنے چاہئیں، اس کے جسم کے کن خاص اعضا کی مصنوعی طور پر ساخت بدلی جائے اور اس کے لباس کی خوشنمائی میں حتی الامکان اضافہ کیا جائے، یہ اور اسی طرح کے دیگر نکات ہیں جن پر آج کل پوشاک تیار کرنے والے ماہرین خصوصی طور پر توجہ دیتے ہیں، مزید برآں وہ لباس جو بہت اونچی پوزیشن اور بلند مرتبہ خواتین پہنتی ہیں، دوسری عورتوں کو بھی وہی لباس پہننا پڑتا ہے، ورنہ ان کی عزت کو بٹہ لگ جاتا ہے اور ان کی وقعت گھٹ جاتی ہے۔
ـــ اس کا نام ہے فیشن!

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ فیشن ہر دن بدلتا بدلتا رہتا ہے، سال میں چار مرتبہ تو وہ موسم کے ساتھ ساتھ لازمی طور پر بدل ہی جاتا ہے، ان چار موسموں کے علاوہ دیگر مواقع پر بھی فیشن میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، جدید ترین فیشن کے مطابق امراء اور دولتمند لوگ اپنا لباس ان فرموں سے تیار کراتے ہیں جو فیشن کی ماہر سمجھی جاتی ہیں، درمیانی درجہ کے لوگ جدید ترین فیشن کے مطابق اپنا لباس یا تو خود اپنے ہاتھ سے سیتے ہیں یا ان عورتوں سے اپنے گھروں پر تیار کراتے ہیں جو سلائی کے کام میں مہارت رکھتی ہیں۔ اگر ایک فیشن کے چلتے ہی کوئی دوسرا نیا فیشن بھی شروع ہو جائے تو وہ فوراً ہی یا تو اپنا لباس بدل ڈالتے ہیں یا اپنے کپڑوں کو نئے فیشن کے مطابق درست کر لیتے ہیں۔ ورنہ وہ نئے فیشن کے نئے کپڑے خرید لیتے ہیں، دولتمند طبقہ کے لوگ اپنے لباس جو فیشن سے خارج ہو جاتے ہیں اپنے ملازمین اور نوکروں کو بانٹ دیتے ہیں یہ نوکر چاکر ان لباسوں کو بیچ ڈالتے ہیں اور پھر یہ لباس افریقہ، ایشیا اور آسٹریلیا کی مختلف نوآبادیوں میں بھیجے جاتے ہیں جو یورپینوں نے قائم کر رکھی ہیں اور وہاں یہ لباس دوبارہ استعمال کیا جاتا ہے، بہت زیادہ دولت مند لوگوں کا لباس عام طور پر پیرس سے سل کر آتا ہے، ان سے کم دولتمند لوگ اپنا لباس اپنے ہی وطن کے درزیوں سے تیار کراتے ہیں لیکن

عورتوں کی ٹوپیاں تو فرانس ہی کی بنی ہونی چاہئیں، واقعتاً انگریز اور جرمن عورتوں کا لباس اچھا نہیں ہوتا۔ چند دولتمند اور اونچے طبقات کو چھوڑ کر انگریز اور جرمن عورتیں عموماً پیرس کے فیشنوں کی پیروی نہیں کرتیں، لہٰذا دوسرے ممالک کی عورتیں اپنے طور پر ان کا مذاق اڑایا کرتی ہیں، لیکن انگلستان کے مردوں کا لباس بہت خوب ہوتا ہے، امریکہ کے مرد و زن بلا امتیاز بہت ہی فیشن ایبل لباس استعمال کرتے ہیں، اگرچہ امریکن گورنمنٹ اپنے ملک کے بازاروں سے بدیشی مال کو دور رکھنے کی غرض سے پیرس اور لندن سے درآمد ہونے والے ہر قسم کے لباس پر بہت بھاری ٹیکس لگایا کرتی ہے، لیکن یہ سب ہوتے ہوئے بھی عورتیں اپنے لباس کی تیاری کا پیرس کو آرڈر دیتی رہتی ہیں اور مرد لندن سے اپنا لباس منگواتے رہتے ہیں، ہزاروں عورتیں اور مرد صرف اس کام پر لگے ہوئے ہیں کہ وہ روزانہ مختلف اقسام اور رنگوں کے اونی اور ریشمی کپڑے بازاروں میں پیش کرتے رہیں اور ان کے علاوہ ہزاروں لوگ ہیں جو ان کپڑوں سے لباس تیار کرنے کے کام پر لگے ہوئے ہیں، جب تک کہ لباس بالکل ہی اپ ٹو ڈیٹ نہ ہو، مرد اور عورتیں اس وقت تک سڑکوں پر چلتے پھرتے خود کو ان لوگوں کے فقروں سے محفوظ نہیں رکھ سکتے جو فیشن ایبل ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک کے لوگوں پر اگرچہ اپنے لباس و پوشاک کے معاملہ میں اس حد تک فیشن زدگی طاری نہیں ہے لیکن زیورات میں بے شک کسی نہ کسی حد تک فیشن کا دخل ہے۔ مغرب میں ریشم، اون اور دوسری اشیاء کے تاجر ہر وقت فیشن کی تبدیلی پر اپنی نظریں لگائے رکھتے ہیں اور یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ لوگوں نے کس قسم کی چیزوں کو پسند کرنا شروع کر دیا ہے یا وہ خود اپنے ذہن سے نیا فیشن ایجاد کرنے کی دھن میں لگے رہتے ہیں اور اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ لوگ ان کے ایجاد کئے ہوئے فیشن کی طرف توجہ دیں، جب ایک تاجر بازار میں لائے ہوئے اپنے خاص فیشن کی طرف لوگوں کی نگاہیں مرکوز کرنے کے مقصد میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے تو پھر اس آدمی کی زندگی بن جاتی ہے، فرانس کے بادشاہ نپولین سوم کے عہد میں اس کی ملکہ یوجین زمانہ بھر میں مغربی فیشن کی اوتار مانی جاتی تھی، اسے کشمیری شال بہت پسند تھے لہٰذا اس کے زمانہ میں لاکھوں روپیہ کی مالیت کے شال ہر برس کشمیر سے یورپ بھیجے جاتے تھے، نپولین سوم کے زوال کے بعد فیشن بدلا اور کشمیری شالوں کی بکری ختم ہو گئی۔ جہاں تک ہمارے ملک کے تاجروں کا تعلق ہے وہ ہمیشہ کے فقیر بنے رہتے ہیں، وہ بدلے ہوئے حالات میں اپنے ذہن سے کوئی ایسا نیا طریقہ ایجاد نہیں کرتے جو مغرب کے ذہن کو اپنی جانب راغب کر سکے۔" نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ہاتھ سے یہ منڈی نکل گئی ہے۔ کشمیر کو متعدد بار زبردست دھکے لگے اور اس کے دولتمند اور بڑے تاجروں کا اچانک دیوالہ نکل گیا۔

اگر آپ کے پاس دیکھنے والی آنکھیں ہیں تو یہ دنیا آپ کی ہے، نہیں ہیں تو یہ میری ہے، یہاں کون ہے جو کسی دوسرے کا انتظار کرتا ہے۔

---



# پاکیزگی

"دنیا کے مختلف حصوں کے آرام طلبوں اور عشرت پسندوں کو رغبت دلانے کے لئے مغرب کے لوگ طرح طرح کے طریقے وضع کر رہے ہیں، نئے نئے ذرائع اختیار کر رہے ہیں، وہ دس آنکھوں سے صورتِ حال کا مشاہدہ کرتے ہیں اور دو سو ہاتھوں سے کام کرتے ہیں گویا یہ ان کا فریضہ ہے لیکن ہم ہرگز ہرگز کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو شاستروں کے مصنفین نے کتابوں میں نہیں لکھا ہے لہٰذا ہم پرانی پگڈنڈی پر چلے جا رہے ہیں اور کسی نئی بات اور کسی نئے آرام کی ہماری جانب سے کوئی کوشش ہی نہیں ہوتی، اور انجام کار ہم ندرت وایجاد کی استعداد و اہلیت ہی کھو بیٹھتے ہیں، پوری قوم بھوک بھوک کی چیخوں سے آسمان کو سر پر اٹھائے ہوئے ہے اور فاقہ کشی سے ہلاک ہو رہی ہے لیکن اس میں قصور کس کا ہے؟ ہمارا اور صرف ہمارا! ہم اپنی قوم اور ملک کو اس خوفناک اور دردناک حالت سے باہر نکلنے والا راستہ ڈھونڈنے کے لئے کونسا طریقہ اختیار کر رہے ہیں؟ اس کا جواب ہے "نفی" — بہت بڑا صفر! ہم بڑی اور کھوکھلی باتیں کرتے ہوئے صرف شور بلند کرتے ہیں، کل اتنا ہی کام ہے جو ہم کر رہے ہیں، اپنے تنگ گوشوں سے نکلتے کیوں نہیں، اور اپنی آنکھیں کھول کر کیوں نہیں دیکھتے کہ دنیا کس طرح آگے کی طرف بڑھ رہی ہے؟ تب دماغ کھلے گا، سوچنے سمجھنے کی طاقت آئے گی اور خود بخود بر وقت عمل کی اہلیت پیدا ہوگی۔ آپ یقینی طور پر دیووں اور اسروں کی کہانی کو بخوبی جانتے ہیں، دیووں کو اپنی آتما پر اعتماد تھا، ایشور پر اعتقاد تھا، اور وہ اس زندگی کے بعد کی زندگی میں عقیدہ رکھتے تھے جبکہ اسروں نے صرف اسی زندگی کو اہمیت دی تھی لہٰذا خود کو اس دنیا کا لطف اڑانے کے لئے وقف کر دیا تھا، اور وہ ہر ممکن طریقہ سے جسمانی آرام و نشاط حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے، ہم اس مقام پر یہ بحث نہیں کر رہے ہیں کہ آیا دیو اسروں سے بہتر تھے یا اسر دیووں سے برتر تھے لیکن پرانوں میں ان کے بارے میں تفصیلات پڑھنے سے ایسا لگتا ہے کہ اسر سچ مچ دیووں سے زیادہ آدمی تھے اور ان میں انسانیت و بشریت کے اوصاف دیووں کی بہ نسبت کہیں زیادہ تھے، لہٰذا اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ دیو اسروں کے مقابلہ میں متعدد اعتبارات سے کمتر تھے، اب مشرق و مغرب کے فرق کو سمجھنے کے لئے اس سے بہتر مثال پیش نہیں کر سکتے کہ ہندو وہاں

---

مشرق و مغرب — صفحہ ۲۶

کو دیوؤں کی اولاد سے تعبیر کریں اور مغربی باشندوں کو امَروں کی اولاد سے۔

جسمانی صفائی کے متعلق ان کے جو خیالات ہیں سب سے پہلے ہمیں ان کو دیکھنا چاہیئے' پاکیزگی کا مطلب ہے دماغ اور جسم کی صفائی' مؤخر الذکر کی صفائی کے لیے پانی وغیرہ استعمال کیا جاتا ہے۔ کوئی بھی قوم جہاں تک جسمانی صفائی کا تعلق ہے ہندوؤں سے زیادہ صاف نہیں ہوتی، جو افراط کے ساتھ پانی استعمال کرتے ہیں چند مستثنیات سے قطع نظر غسل کرتے ہوئے غوطہ لگانے کا رواج دوسری قوموں میں نہیں پایا جاتا' انگریزوں نے اپنے ملک میں غوطہ لگانے کا رواج تب ہی شروع کیا جب وہ ہندوستان آئے اور انہوں نے یہاں کے لوگوں کو غوطہ لگاتے ہوئے دیکھا' اب بھی ہمارے ملک کے ان طلبہ سے پوچھیئے جو انگلستان میں تحصیل علم کے لئے مقیم ہیں کہ وہاں غسل کرنے کے انتظامات کی کتنی کمی ہے' مغربی باشندے جب نہاتے ہیں — اور وہ بھی ہفتہ میں ایک بار — تو وہ اپنے نیچے کے کپڑے یعنی بنیان اور جانگیا وغیرہ تبدیل کرتے ہیں۔ جن لوگوں کے پاس زیادہ وسائل ہیں وہ بے شک اس زمانہ میں زیادہ غسل کرنے لگے ہیں' متعدد لوگ روزانہ غسل کرتے ہیں' اور امریکن باشندے نسبتاً زیادہ غسل کرتے ہیں' لیکن جرمن باشندے بس ہفتہ میں ایک ہی بار غسل کرتے ہیں اور فرانسیسی تو شاذ و نادر ہی نہاتے ہیں۔ سپین اور اٹلی گرم ملک ہیں لیکن وہاں بھی کم ہی غسل کیا جاتا ہے' ذرا تصور کیجئے کہ وہ پیاز کثرت سے کھاتے ہیں' ان کے بدن سے بدبودار پسینہ رات دن نکلتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ غسل نہیں کرتے' آدمی کا کیا ذکر ہے ان کے پاس تو بھوت بھی کھڑے نہیں ہو سکتے۔ وہ بھی ان کے بدن سے آنے والی بدبو سے بھاگ کھڑے ہوں گے۔ مغرب کے لوگ غسل کے کیا معنی سمجھتے ہیں؟ صرف یہ کہ منہ دھو لیا جائے' ہاتھ اور سر دھو لیا جائے یعنی جسم کے وہ حصے جو کھلے رہتے ہیں' میرے ایک لکھ پتی دوست نے مجھے ایک مرتبہ اپنے یہاں پیرس میں بلایا — وہ پیرس جس کو تمدن جدید کی راجدھانی کہنا چاہیئے — پیرس جسے روئے زمین پر عیش و عشرت' مسرت و شادمانی اور فیشن کی جنت سمجھنا چاہیئے — جو علوم' سائینس اور فنون لطیفہ کا مرکز ہے' میرے دوست نے مجھے ایک عالیشان ہوٹل میں ٹھہرایا' جہاں کھانے پینے کا ہر انتظام شاہانہ طریقے سے تھا — لیکن غسل! جی ہاں اس کا تو نام بھی وہاں نہیں تھا۔ دو دن تک تو میں نے خاموشی سے برداشت کیا — لیکن اس کے بعد مجھ میں برداشت کی طاقت نہ رہی اور میں نے اپنے دوست کو یہ خط لکھا —

پیارے بھائی! یہ شاہانہ ٹھاٹ آپ اپنے اور اپنے متعلقین کے لئے اٹھا رکھیئے' میں اس جگہ جو حالت ہے' اس سے باہر نکلنے کے لئے بیقرار ہوں' اتنا گرم موسم ہے اور غسل کی کوئی سہولت نہیں ہے اگر یہ صورت حال یونہی چلتی رہی تو مجھے ڈر ہے کہ سگ گزیدہ کی طرح کہیں میں بھی پاگل نہ ہو جاؤں' میں آپ کو یہاں مزید قیام نہ کرنے دوں گا' آئیے ہم چل کر اس سے بہتر جگہ اپنے قیام کے لئے تلاش کریں۔

مشہور مشہور بارہ ہوٹلوں کو ہم نے دیکھا' لیکن ان میں سے کسی میں بھی نہانے کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا' وہاں حمام الگ ہیں اور ایک شخص ان میں چار یا پانچ روپے دے کر غسل کر سکتا ہے' کیا تماشا ہے؟ اسی دن تیسرے پہر کو میں نے ایک اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ ایک بوڑھی عورت غسل کے ٹب میں اترتے ہی مر گئی۔ ڈاکٹر کچھ بھی کہیں لیکن میرا اپنا خیال تو یہ ہے کہ اس نے شاید اپنی عمر میں پہلی بار اتنی زیادہ مقدار میں پانی دیکھا تھا۔ اور وہ اسے دیکھنے کی تاب نہ لا سکی اور اچانک بیہوش ہو کر گر پڑی' یہ مبالغہ نہیں ہے' اسی طرح روسی اور دوسری قوموں کے لوگ بہت زیادہ میلے کچیلے رہتے ہیں۔ تبت سے لے کر آگے تک اس پورے علاقہ میں میلا پن پایا جاتا ہے۔ البتہ امریکہ کے ہر گھر میں ایک غسلخانہ بھی ہے اور نل کے پانی کا انتظام بھی موجود ہے۔

---

بہرحال دیکھئے کہ ہم میں اور ان میں کتنا بھاری فرق ہے؟ ہم ہندو کس لئے غسل کرتے ہیں؟ اس لئے کہ ہمیں پاپ کا ڈر رہتا ہے، مگر مغربی باشندے صرف جسمانی صفائی کے لئے اپنے ہاتھ اور منہ دھوتے ہیں، بدن پر چاہے تیل اور گرد لگی رہ جائے لیکن بدن پر پانی ڈال لینے ہی سے ہمارا کام چل جاتا ہے اور ہمارے نزدیک یہی اشنان ہے، ہمارے جنوبی ہند کے بھائی اتنا لمبا چوڑا تلک لگاتے ہیں کہ اگر پتھر سے رگڑ رگڑ کر بھی اسے دھویا جائے تو اس کا صاف ہونا آسان نہیں ہوتا، مگر دوسری جانب ہمارا اشنان بہت ہی سہل معاملہ ہے کہیں بھی ایک غوطہ لگا لیا اور کام چل گیا۔ مگر مغربی ممالک میں ایسا نہیں ہے، انہیں اپنے کپڑوں کی پوری ایک گانٹھ اتارنی پڑتی ہے جن میں نہ جانے کتنے بٹن کتنے ہک اور کتنے کاج ہوتے ہیں، ہمارا بدن کھل جائے تو ہمیں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی لیکن انہیں اس معاملہ میں بڑی تکلیف ہوتی ہے، مردوں میں آمنے سامنے اپنے کپڑے اتار کر اپنا بدن کھولا جا سکتا ہے مثلاً باپ اور بیٹا ایک دوسرے کے سامنے کپڑے اتار سکتے ہیں لیکن عورتوں کے سامنے انہیں سر سے پاؤں تک ضروری اور باقاعدہ لباس پہننا ہی پڑتا ہے۔

ظاہری صفائی کا یہ رواج، دوسرے تمام رواجوں کی طرح بسا اوقات بڑھتے بڑھتے ایک طرح کا ظلم بن جاتا ہے۔ اور اچار (صفائی) کا مفہوم ہی پلٹ جاتا ہے۔ یورپین باشندوں کا قول ہے کہ جسم سے تعلق رکھنے والے سب ہی کام خلوت میں انجام دینا چاہئیں، یہ بات بہت اچھی اور بہت ٹھیک ہے لیکن دوسروں کے سامنے تھوکنا بھی بڑی بیہودگی ہے اور سب کے سامنے منہ دھونا اور کلی کرنا بھی، لوگوں کی انگشت نمائی کے ڈر سے وہ کھانا کھا کر نہ تو منہ دھوتے ہیں نہ کلی کرتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ دانت خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمارے یہاں سوسائٹی کے ڈر سے عدم صفائی کی ایسی کوئی مثال نہیں ملتی، ہم لوگ سب کے سامنے منہ دھوتے ہیں کلی کرتے ہیں سڑک پر بیٹھ کر منہ میں اس طرح ہاتھ ڈال ڈال کر منہ اور دانت صاف کرتے اور اس طرح کھنکارتے ہیں جیسے ہم بیمار ہو گئے ہیں —— یہ بھی صفائی کے معاملہ میں انتہا پسندی ہے اور ایک طرح کا ظلم ہے، یہ سب کام، اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ تنہائی میں ہونے چاہئیں اور خاموشی سے ہونے چاہئیں، لیکن صرف سوسائٹی کے ڈر سے صفائی کا یہ کام نہ کرنا بھی بڑی غلط بات ہے۔

مزید برآں سوسائٹی ان باتوں کو خاموشی اور صبر کے ساتھ برداشت کر لیتی ہے جو کسی خاص آب و ہوا میں ناگزیر ہوتی ہیں۔ اور پھر ان کے جاری رکھنے کی گنجائش پیدا کر دیتی ہے ہمارے ملک کی طرح ایک گرم ملک میں ہم پانی کے گلاس پر گلاس چڑھا جاتے ہیں۔ اس لئے ڈکار کا روکنا ممکن ہی نہیں ہے، لیکن مغربی ممالک میں ڈکار لینا بڑی بدتمیزی ہے، لیکن کھانا کھاتے ہوئے بھی اگر آپ رومال لے کر ناک چھنکیں تو یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے، مگر ہمارے یہاں یہ بڑی ہی گھناؤنی بات ہے، ان کی طرح کے ٹھنڈے ملک میں تو بمجبوری ناک صاف ہی کرنی پڑتی ہے، کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

ہم ہندو لوگ میل کچیل سے بہت گھن کھاتے ہیں مگر اس کے ساتھ یہ واقعہ بھی ہے کہ ہم خود بسا اوقات بہت میلے رہتے ہیں ہمیں میلے سے اتنی گھن آتی ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی جب میلے کو چھوتا ہے تو وہ فوراً ہی اشنان کرتا ہے لہٰذا ہم اپنے آپ کو میلے سے دور رکھتے ہیں اور اسی لئے اپنے گھر کے نزدیک میلے کے ڈھیر کو گلنے سڑنے دیتے ہیں بس ایک ہی بات کا ہمیں دھیان رہتا ہے اور وہ یہ کہ میلے کو چھونا نہیں ہے مگر اس کے برعکس ہمیں کیا کبھی بھی اس بات کا دھیان ہوتا ہے کہ ہم سچ مچ جہنم میں زندگی بسر کر رہے ہیں،

ایک چھوٹے سے اناچار سے آنکھ موڑ کر ہم دوسرا اور بہت بڑا الٹا چار پیدا کر لیتے ہیں، ایک پاپ سے بچنے کے لئے دوسرے پاپ کو جنم دیتے ہیں جو اس سے بھی بڑا اور بہت بڑا ہوتا ہے۔ ایک شخص جو اپنے گھر میں میلے کے انبار اکٹھا رکھتا ہے وہ پاپی ہے گناہگار ہے اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اس پاپ کی سزا بھگتنے کے لئے اسے دوسرا جنم لینا پڑے گا اور اس زندگی میں بھی تا دیر قیام کر کے اسے پاپ کا گٹھر اپنے سر پہ اٹھانا ہوگا!

لکشمی (خوش نصیبی اور دولت و ثروت کی دیوی) اور سرستی (علم و فضل کی دیوی) دونوں کی کرپا اور کرم کا آفتاب مغربی باشندوں کے سر پہ اپنی آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہے، وہ صرف حصولِ مسرت پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ ہر قسم کا حسن اور شان بھی حاصل کرنے کی دھن میں لگے رہتے ہیں، اپنے کھانے پینے میں، اپنے گھروں اور اپنے گرد و پیش غرضیکہ وہ ہر چیز میں ایک خوبصورتی اور دلکشی چاہتے ہیں، کسی زمانہ میں ہماری بھی یہی خواہش رہتی تھی لیکن یہ وہ وقت تھا جب ہمارے ملک میں بھی خوشحالی اور دولت تھی، اب تو ہمارے یہاں بے انتہا غریبی ہے لیکن خرابی میں اور زیادہ خرابی پیدا ہو رہی ہے، اس لئے کہ ہم اپنی تباہی کے دو راستوں پہ چل رہے ہیں ایک یہ کہ جو چیزیں ہماری اپنی ہیں ہم ان کو ٹھکرا کر پھینک رہے ہیں دوسرے یہ کہ ہم اوروں کی عادتیں اور آدرش اختیار کرنے کی سعی رائیگاں کر رہے ہیں وہ قومی قدریں جن کے ہم لوگ حامل تھے، بتدریج فنا ہو رہی ہیں اور مغربی اقوام کی قومی قدروں ہی سے کوئی بھی قدر نہ ہم میں آ رہی ہے، نہ ہم پا رہے ہیں، نشست و برخاست اور گفتار و رفتار میں ایک زمانہ تھا جب ہمارا اپنا خوبصورت ڈھنگ تھا۔ لیکن یہ خوبصورت ڈھنگ اب ہے نہیں، یہ فنا ہو چکا ہے ــــ اور مغربی طرز اور ڈھنگ اختیار کرنے کی ہم میں اہلیت و استعداد کی ابھی تک کمی ہے، وہ پراچین دھارمک علوم اور رواج و رسوم وغیرہ جو ہمارے پاس رہ گئے تھے آج ہم دریا کی طوفانی موجوں کے سامنے ڈال دیتے ہیں کہ وہ انہیں خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائیں اور ان کی جگہ کوئی نئی چیز جو وقت کے تقاضوں کے مطابق ہو ابھی بن نہیں رہی ہے اور ہمارے درمیان کوئی نیا پودا ابھی اگ نہیں رہا ہے اور ہم میں اس کی جڑیں مضبوطی اور پائیداری کے ساتھ نہ جم رہی ہیں نہ پھیل رہی ہیں، ہماری موجودہ مایوسی کی وجہ یہ ہے کہ ہم ان دو لائنوں کے درمیان معلق ہیں، بنگال جس کی بنیاد مضبوط و پائیدار ہونے کی توقع تھی، ابھی تک وہ بھی اپنی پائیدار بنیاد نہیں پا سکا ہے ہمارے سب فنون سب سے زیادہ بربادی کا نشانہ بنے ہیں ماضی میں ہماری بوڑھی عورتیں چاول کی لئی بنا کر اپنے گھروں کا فرش، دیواریں اور دروازے رنگا کرتی تھیں ان پہ تصویریں بنایا کرتی تھیں اور مختلف اقسام کے خوبصورت نقش و نگار بناتی تھیں، وہ خوبصورت اور آرٹسٹک ڈھنگ سے کیلے کے پتے کاٹتی تھیں اور ان پہ بھوجن پروستی تھیں، پلیٹوں وغیرہ پہ پائیدار مسالوں سے نقاشی و مصوری کے فن کا شاندار مظاہرہ کرتی تھیں لیکن ان دنوں میں یہ تمام فنون آہستہ آہستہ ختم ہوتے جا رہے ہیں یا ختم ہو جانے والے ہیں۔

بلاشبہ نئی چیزیں سیکھنی چاہئیں، انہیں رائج کرنا چاہیئے اور ان پہ محنت کرنی چاہیئے لیکن یہ کام کیا صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ سب پرانی چیزیں پانی میں بہا دی جائیں اور صرف اس تصور میں بہا دی جائیں کہ وہ پرانی ہیں، وہ کیا نئی چیزیں ہیں جو آپ کو سکھانا ہیں؟ اس کے جواب میں صرف اتنا ہی کہیئے کہ "کوئی بھی نہیں" اور خود کو الفاظ کی جادوگری سے بچا لیجیے! جنگ زرگری سے محفوظ رکھیئے! حقیقتاً آپ کو کونسی مفید ترین اور فائدہ بخش فن سیکھنا ہے؟ اب بھی دور افتادہ دیہات میں جایئے اور دیکھئے لکڑی کے قدیم اور عمارت سازی کے قدیم فن کو! آپ کے

---

قصبات کے بڑھئی دروازہ کی ایک نفیس جوڑی تک نہیں بنا سکتے، آیا یہ جوڑی محض ایک جھونپڑی کے لئے بنائی گئی ہے یا ایک محل کی تعمیر بہت مشکل کام ہے۔ انہیں بلاشبہ اوزاروں کی خریداری بہت پسند ہے، گویا بڑھئی کا سارا کام بس یہی اوزار ہیں، افسوس! حالات کی یہ صورت ہمارے ملک کے جملہ مسائل پر چھا کر رہ گئی ہے، ہماری اپنی چیزیں جو ہمارے پاس تھیں وہ سب کی سب ضائع ہو رہی ہیں اور اس کے باوجود ہم نے بدیشیوں سے جو کچھ سیکھا ہے وہ محض گپ بازی کا فن ہے، محض پڑھنا اور گپ مارنا! بنگالی اور یورپ میں آمیزش دو نسلیں ہیں جن کو ایک ہی خانہ میں رکھا جا سکتا ہے ــــ باتیں، باتیں! اور صرف باتیں! محض الفاظ کا کھیل! یہ دونوں قومیں خطابت اور تقریر کے فن میں اپنا کوئی جواب نہیں رکھتیں۔ اگر ذرا سے عمل اور ذرا سے کام کی ضرورت آپڑے تو پھر ان کی کوئی جگہ نہیں ہے ــــ اس پر طرفہ تماشہ اور سونے پر سہاگہ یہ کہ ان کے لوگ ایک دوسرے پر غراتے رہتے ہیں اور عمر بھر آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔

مغربی باشندوں کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنی ہر چیز صاف ستھری رکھتے ہیں۔ غریب سے غریب آدمی بھی ہر وقت اس بات پر توجہ رکھتا ہے کہ اس کی ہر چیز صاف ستھری ہو، اور صفائی کا یہ لحاظ ہر بات میں رہتا ہے، مثال کے طور پر اگر لوگ صاف ستھرا سوٹ نہ پہنے ہوں تو انہیں کوئی بھی شخص ملازمت نہیں دے گا، گھر کے ملازم، خادمائیں اور باورچی وغیرہ سب کے سب صاف ستھرے بے داغ کپڑے پہنے ہوئے ہیں، ان کے گھروں میں خوب صفائی ہوتی ہے، وہ روزانہ برش سے اپنے گھر صاف کرتے ہیں، فرش دھوتے ہیں اور در و دیوار کا میل کچیل صاف کرتے ہیں، انہیں تربیت دی جاتی ہے کہ وہ اپنی چیزیں ادھر ادھر نہ پھینکیں اور ہر چیز کو اس کی مقررہ جگہ پر رکھیں ــــ ان کے باورچی خانے صاف اور روشن رہتے ہیں، ترکاریوں کی چھیلن وغیرہ اور اسی طرح کی دوسری چیزیں وہ ایک الگ برتن میں علیحدہ اٹھا کر رکھ دیتے ہیں اور جب صفائی والا آتا ہے تو وہ اس کوڑے کو اٹھا کر لے جاتا ہے اور ایک فاصلہ پر اسے لیجا کر اس کی مقررہ جگہ پر پھینک آتا ہے۔ اور ان چیزوں کو اپنے گھروں کے آنگن یا سڑکوں پر نہیں پھینکتے!

دولتمند لوگوں کے گھر اور دوسری عمارتیں، حقیقت میں دیکھنے کے لائق ہوتے ہیں، یہ دن رات آراستگی اور صفائی کا بہترین نمونہ بنی رہتی ہیں مزید برآں ان میں یہ عادت بھی ہے کہ وہ مختلف ممالک کے فنی شاہکار اکٹھا کرتے ہیں اور ان چیزوں سے اپنے کمروں کی سجاوٹ کرتے ہیں۔ موجودہ حالات میں ہمارے لئے اس کی ادنیٰ ضرورت بھی نہیں ہے کہ ہم فنی شاہکار جمع کریں لیکن جو چیزیں ہمارے قبضہ میں ہیں اور برباد ہو رہی ہیں کیا انہیں بھی محفوظ نہ رکھنا چاہیئے یا محفوظ رکھنا چاہیئے؟ سنگتراشی مجسمہ سازی اور مصوری کے فنون میں ان جیسی خوبی، مہارت اور اہلیت کارکردگی حاصل کرنے میں ہمیں کافی وقت لگے گا، ہم فنون کے ان دونوں شعبوں میں کبھی بھی بہت زیادہ لائق اور ہوشیار نہیں تھے، یورپینوں کی نقالی کر کے ہم زیادہ سے زیادہ اپنے درمیان ایک یا دو روی ورما پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن ان آرٹسٹوں سے کہیں زیادہ بہتر ہمارے پٹوے تھے جو بنگال میں ہمارے دیوتاؤں کے چال چتر[1] بنایا کرتے تھے، ان کے کاموں میں بہر حال چمکدار رنگوں کے جرأت مندانہ استعمال ضرور دکھائی دیتا ہے، روی ورما اور دوسروں کی پینٹنگ بس ایسی ہی ہیں جیسے کوئی کسی سے شرما کر اپنا منہ چھپانے کی کوشش کرتا ہے گویا اشک شوئی!

---

[1] یعنی دیوتاؤں کی مورتیوں کے اوپر بنائی جانے والی محرابیں جن پر پرانوں کے عہد سے متعلق مختلف تصویریں بنائی جاتی تھیں۔ اور انہیں بہترین زیورات وغیرہ پہنا کر آراستہ کیا جاتا تھا ــــ!

ان سے بہتر تو جے پور کی بھڑک دار تصویریں اور درگا دیوی کا چل چتر ہے جو زمانہ قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ یورپین فنِ مصوری و سنگ تراشی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار میں کسی دوسرے موقع پر کروں گا۔ یہ بہت وسیع موضوع ہے اور یہاں اس پر تفصیلی گفتگو نہیں کی جا سکتی۔

اب پخت و پز کے مغربی فن کے بارے میں کچھ سنیئے! ہمارے یہاں کھانا پکانے میں پاکیزگی اور صفائی کا جتنا خیال رکھا جاتا ہے دنیا بھر میں کسی جگہ بھی اتنا خیال نہیں رکھا جاتا، لیکن دوسری جانب انگریزی ٹیبل جتنی صاف ستھری ہوتی ہے ہمارے یہاں کھانا کھانے اور کھلانے کا طریقہ اتنا صاف ستھرا، منظم اور بہتر نہیں ہے۔ ہمارے یہاں کھانا بنانے والا روزانہ پہلے اشنان کرتا ہے، پھر لباس بدلتا ہے تب ہی رسوئی کے اندر قدم رکھتا ہے۔ وہ تمام برتنوں کو مٹی اور راکھ سے مانجھ کر خوب اچھی طرح صاف کرتا ہے اور پانی سے خوب دھوتا ہے اور اگر کھانا بناتے ہوئے وہ اتفاقاً اپنے ہاتھ سے اپنا منہ، ناک یا بدن کے کسی حصہ کو چھو لیتا ہے تو کھانے کو ہاتھ لگانے سے پہلے وہ اپنا ہاتھ دھوتا ہے۔ اس کے برعکس مغربی ممالک میں کھانا بنانے والے باورچی بہت کم غسل کرتے ہیں، مزید برآں وہ جس چمچہ کو کھانا بنانے کے کام میں استعمال کرتا ہے اسی چمچہ سے بننے والی چیز کو چکھتا جاتا ہے اور پھر اسی چمچہ کو بلا تکلف پتیلی میں ڈال دیتا ہے، اپنا رومال نکال کر وہ زور زور سے چھینکتا ہے اور پھر اسی ہاتھ سے میدا گوندھنے لگتا ہے۔ وہ جب باہر سے آتا ہے تو اسے اپنا ہاتھ دھونے کی کوئی چنتا نہیں ہوتی، وہ ہاتھ دھوئے بغیر فوراً ہی کھانا بنانے کے کام میں مصروف ہو جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ اس کے کپڑے اور ٹوپی برف کی مانند سفید ہوتے ہیں، وہ میدا گوندھتے ہوئے ایسا لگتا ہے جیسے کوئی ناچ رہا ہو، اپنے بدن کا پورا وزن میدے پر ڈال دیتا ہے اور اس کے بدن کے پسینہ کی بوندیں میدے پر گرتی ہیں لیکن اسے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ اس کا پسینہ بھی میدے میں شامل ہو رہا ہے (خوش قسمتی سے ان دنوں میدہ گوندھنے کا کام مشینوں سے لیا جانے لگا ہے) اس میلے کچیلے ڈھنگ کے بعد جب اس میدے کی روٹی تیار ہو جاتی ہے تو اسے دودھ جیسے تولیہ کے اوپر چینی کی پلیٹ میں سجا کر صاف چادر بچھی ہوئی ٹیبل پر، صاف کپڑے پہنے ہوئے کہنی تک ہاتھوں پر دستانہ چڑھائے ہوئے ایک نوکر لا کر سامنے رکھ دیتا ہے ـــ ذرا اس دستانہ کو دیکھئے! کہیں ایسا نہ ہو کہ نوکر کسی چیز کو اپنے ہاتھ سے چھو لے، کھانے کی کسی چیز میں اس کا کھلا ہوا ہاتھ لگ جائے۔

اب ہمارے یہاں دیکھئے! ہمارے یہاں براہمن رسوئیا پہلے تو اشنان کر کے خود کو پاک کرتا ہے۔ تب صاف ستھرے برتنوں میں کھانا بناتا ہے لیکن وہ کھانا پروسے گا تو گوبر سے لپی پوتی زمین پر ایک تھال میں رکھ کر! اور اس کے کپڑے اگرچہ وہ روزانہ دھلتے ہیں پھر بھی وہ اتنے میلے دکھائی دیتے ہیں جیسے برسوں سے نہ دھلے ہوں، اور ساگر کیلے کا پتہ! جو کبھی کبھی پلیٹ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے کسی جگہ سے پھٹ جا[illegible] رہتا ہے کہ شوربے میں زمین کی میلن اور گوبر نہ مل جائے اور کھانے کا ذائقہ بالکل ہی عجیب نہ ہو جائے،

بہترین اشنان کے بعد بھی ہم میلے دکھائی دینے والے کپڑے پہن لیتے ہیں جو تیل میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ لیکن مغرب کے لوگ اشنان کے بغیر ہی اپنے میلے کچیلے بدن پر خوب صاف ستھرے کپڑے پہنتے ہیں، یہ بات بخوبی سمجھ لینی چاہئے، اس لئے کہ یہ بات مشرق و مغرب کے درمیان بنیادی فرق کی حیثیت رکھتی ہے، ہندو کی نگاہ سیرت اور جوہر کو دیکھتی ہے، لیکن مغربی باشندوں کی نظر صرف صورت کو دیکھتی ہے، ظاہری حسن تک محدود رہتی ہے، نظر کا یہ فرق، ان کے تمام رسوم و رواج میں دکھائی دیتا ہے، ہندو ہمیشہ باطن کو دیکھتا ہے اور مغربی باشندے صرف ظاہر کو دیکھتے ہیں، ہندو گدڑی میں لعل لپیٹ کر رکھتے ہیں اور مغربی باشندے مٹی کا دیا،

سونے کے فانوس میں رکھ دیتے ہیں، ہندو اپنے بدن کو صاف رکھنے کے لئے اشنان کرتا ہے، اسے اس بات کی چنتا نہیں ہوتی کہ اس کے کپڑے کتنے میلے دکھائی دیتے ہیں لیکن مغربی باشندے صاف ستھرا لباس پہننے پر بڑا دھیان دیتے ہیں، حالانکہ بدن میلا ہونے کی صورت میں صاف کپڑے پہننے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، ہندو اپنے گھر کے اندر کمرے، دالانے، فرش سب کچھ صاف ستھرا رکھتا ہے لیکن وہ اس بات کی کوئی چنتا نہیں کرتا کہ اس کے گھر میں داخل ہونے والے دروازے کے باہر میلے کا کتنا بڑا ڈھیر لگا ہوا ہے، مغربی باشندے ایسا لگتا ہے کہ اپنے گھروں کے فرش کو خوبصورت قالینوں سے چھپانا چاہتے ہیں۔ لیکن ان قالینوں کے نیچے کتنی ہی گرد چھپی ہو انہیں اس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ کوڑا کرکٹ اگر چھپ جانے سے کام چل جائے تو بس سب کچھ ٹھیک ہے، ہندو اپنے گھروں سے نکل کر سڑک پر آنے والی نالیاں کھلی چھوڑ دیتے ہیں جن سے ہر وقت بدبو اٹھتی رہتی ہے لیکن بدبو سے اسے کبھی گھبراہٹ محسوس نہیں ہوتی مگر مغربی ملکوں میں نالیاں بالعموم زیر زمین ہوتی ہیں، جنہیں ٹائیفائیڈ بخار کا سرچشمہ کہنا چاہیئے! ہندو اندرونی صفائی کرتا ہے اور مغربی باشندے بیرونی!

چاہیئے کیا؟ صاف بدن پر صاف کپڑے! منہ دھونا، دانت مانجھنا یہ سب ضروری ہے لیکن یہ کام اکیلے میں علیحدگی میں ہونا چاہیئے۔ گھر بھی صاف ستھرے رہنے چاہئیں گلی کوچے اور عام گزرگاہیں بھی! رسوئی کو اپنے بدن کی طرح اپنے کپڑے بھی صاف ستھرے رکھنے چاہئیں، مزید برآں صاف ستھری جگہ پر بیٹھ کر، صاف ستھرے اور بے داغ پلیٹوں اور پیالوں میں کھانا کھانا چاہیئے "اچار" یا زندگی میں عمل کرنے کے مروج اصول اور ضابطے کی پابندی کرنا، دھرم کی راہ پر پہلا قدم بڑھانے کے مترادف ہے مزید برآں جسم و دماغ اور ہر چیز کی صفائی کو دھرم کے معاملہ میں خصوصی اہمیت حاصل ہے، جو شخص بھی آچار سے منہ موڑے گا وہ کبھی بھی دھارمک نہیں ہو سکتا، کیا آپ کی نظر کے سامنے ان لوگوں کا ادبار نہیں ہے جو آچار سے انحراف کرتے ہیں، دیکھئے اور سبق لیجئے کہ آچار سے انحراف کی ہمیں کتنی گراں قیمت دینی پڑ رہی ہے، ہندوستان میں ہیضہ، ملیریا، اور طاعون نے مستقل گھر بنا لیا ہے اور لاکھوں لوگ ان بیماریوں کے منہ کا لقمہ بن رہے ہیں، یہ قصور کس کا ہے؟ ہمارا! یقین کیجئے ہمارا اور صرف ہمارا قصور ہے، ہم نے بہت ہی افسوسناک طریقے پر آچار سے گریز کیا ہے، انحراف کیا ہے،

ہندوؤں کے تمام طبقات شرتی سمرتی[1] کی اس کہاوت کی سچائی کا اقرار کرتے ہیں،

—आहारशुद्धौ सत्त्वशुद्धिः सत्त्वशुद्धौ ध्रुवा स्मृतिः—

"اچھی اور پاک غذا سے دل میں نیکی آتی ہے، دل نیک ہونے سے تزکیہ نفس ہوتا ہے اور روحانیت کی تکمیل سے حافظہ بڑھتا ہے، یادداشت کی قوت میں قیام و دوام پیدا ہوتا ہے۔ شنکر آچاریہ کے خیال کے مطابق آہار کا مطلب ہے حواس خمسہ لیکن رامانج کی رائے میں یہ لفظ "غذا" کے ہم معنی ہے۔ لیکن حل کیا ہے؟ سب طبقات یہ مانتے ہیں کہ دونوں ہی چیزیں ضروری ہیں اور دونوں ہی چیزوں پر دھیان دینا چاہیئے، خالص غذا کے بغیر اعضائے رئیسہ کس طرح اپنا ٹھیک ٹھیک عمل جاری رکھ سکتے ہیں؟ سب ہی لوگوں کا یہ تجربہ ہے کہ ناقص غذا قوت باہ کو گھٹاتی ہے اور اعضائے رئیسہ کا عمل آدمی کی مرضی کے خلاف ہونے لگتا ہے، یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ بدہضمی ہونے کی صورت میں آدمی کی آنکھوں کو ایک منظر کی جگہ دوسرا منظر اور ایک چیز کی جگہ دوسری چیز دکھائی دینے لگتی ہے اور غذا کی احتیاج و ضرورت ہی کی بنا پر آدمی کی

---

[1] چھاندوگیہ اپنشد VII. XXVI. 2.

بینائی بھی کمزور ہو جاتی ہے اور دوسرے حواسِ خمسہ بھی ماند پڑ جاتے ہیں، اسی طرح بسا اوقات یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کوئی خاص قسم کی غذا آدمی کے جسم اور اس کے دماغ کی حالت ہی کو بدل دیتی ہے اس کے دماغ کی حالت کوئی خاص شکل اختیار کر لیتی ہے اور اس کے جسم کی کوئی خاص صورت پیدا ہو جاتی ہے، اس کی جو اصل وجہ ہے وہ ان تمام ضوابط کی جڑ اور بنیاد ہے جن پر ہندو سوسائٹی میں سختی سے عمل درآمد کیا جاتا ہے، یعنی یہ کہ کھانے کی ایک قسم ہمیں لینی چاہیئے اور ایک قسم سے ہمیں پرہیز کرنا چاہیئے، اگرچہ ہم بہت سے معاملوں میں اصل و حقیقت کو پسِ پشت ڈال کر صرف ظاہری سوال پر لڑنے جھگڑنے لگتے ہیں اور ہماری ساری اچھل کود بس فروعی بحث تک محدود رہتی ہے، اصل و حقیقت سے ہمیں کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔

---



سوامی جی اپنے گورو بھائیوں کے ساتھ (یہ تصویر فروری 1901ء میں کلکتہ میں کھینچی گئی تھی)

# حفظانِ صحت

۱

کھانے پینے کے مسئلہ میں راماچ آچاریہ نے صرف تین باتوں سے بچنے کی ہدایت کی ہے جو ان کے خیال میں غذا کو ناقص اور خراب بنا دیتی ہیں۔ ان تین باتوں میں سے پہلی بات ہے "جاتی دوش" یعنی وہ نقص جو کھانے میں پیاز، ادرک اور لہسن وغیرہ شامل ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ ان چیزوں کے کھانے سے آدمی کے مزاج میں حرارت پیدا ہوتی ہے اور یہ حرارت دماغ میں بے چینی پیدا کرتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر عقل و ادراک پر ان چیزوں کے کھانے کا خراب اثر پڑتا ہے۔ دوسری بات ہے "آشریہ" یعنی اس آدمی کی فطرت جس سے کھانا ملے۔ ایک مکار و چالاک آدمی جب کھانا پیش کرتا ہے تو اس کے دماغ میں گشت کرنے والے برے خیالات کی وجہ سے وہ کھانا بھی ناقص ہو جاتا ہے لیکن جب کوئی اچھا آدمی کھانا دیتا ہے تو اس کے اچھے خیالات کی وجہ سے وہ کھانا بھی خالص اور بہتر ہو جاتا ہے۔ تیسری بات ہے "نمتا دوش" یعنی کھانے میں گرد، دھول، کیڑا مکوڑا، یا بال وغیرہ کے شامل ہو جانے سے خرابی یا نقص پیدا ہونا۔ ایک آدمی ان تین اقسام کے نقص کھانوں میں سے جاتی اور نمتا کو تو بآسانی ہضم کر جاتا ہے لیکن اس کے لئے آشریہ سے بچنا بہت سہل نہیں ہوتا۔ یہی آشریہ دوش ہے جس سے بچاؤ کی خاطر ہمارے یہاں اس زور شور سے چھوت چھات چل پڑی ہے۔ لیکن بسا اوقات اس کا الٹا مطلب لیا جاتا ہے اور اس اصول کو سمجھنے میں غلطی اور غلط فہمی ہوتی ہے۔ اس کا ٹھیک ٹھیک مطلب نہ سمجھنے کی بنا پر یہ اصول ایک طرح کی برائی بن کر رہ گیا ہے۔ ان معاملوں میں لوگ بھاوؤں کی بجائے نسل انسانی کے ہادی پیشوا، آچاریوں کے آچار سے اختیار کرنا چاہیں یعنی وہ رواج و رسوم جو عام لوگوں میں رائج ہوں۔ ہر شخص کو شری چیتنیہ دیو جیسی عظیم شخصیتوں کی سوانح حیات کا مطالعہ کرنا چاہئیے اور دیکھنا چاہیئے کہ انہوں نے اس معاملہ میں اپنے اہل وطن کے ساتھ کیا برتاؤ روا رکھا ہے۔ جہاں تک کھانے میں جاتی دوش کا تعلق ہے ہندوستان سے زیادہ دنیا کے کسی بھی ملک میں اس کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ تمام قوموں میں صرف ہندوستانی ہی ہیں جو خالص ترین غذا استعمال کرتے ہیں کسی بھی ملک میں ہم سے زیادہ اس بات پر دھیان نہیں دیا جاتا کہ خوراک میں کوئی ایسی چیز شامل نہ ہو جو طبیعت و مزاج میں اشتعال پیدا کرے۔ اب ہندوستان میں نمتا دوش کی طرف ہمیں پہلے کی بہ نسبت زیادہ دھیان دینا چاہیئے اس لئے کہ یہ چیز ہمارے لئے ایک مصیبت بن گئی ہے یہ عام بات ہے کہ ہم لوگ بازار میں حلوائی کی دکان سے کھانے کی چیز خرید لیتے ہیں جو بالعموم بغیر کسی ڈھکن کے کھلی ہوئی رکھی ہوتی ہے۔ آپ خود ہی اندازہ کیجئے کہ

تمدّن کے نقطۂ نظر سے یہ سب چیزیں کتنی ناقص ہوتی ہیں، اور ان میں کتنی ملاوٹ ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو چیزیں بغیر ڈھکن کے کھلی رکھی رہیں گی ان پر سڑکوں کی دھول بھی اڑ اڑ کر پڑے گی اور مردہ کیڑے مکوڑے بھی مِل جائیں گے۔ بسا اوقات یہ چیزیں کتنی گلی سڑی ہوتی ہیں۔ آپ ہر گھر میں یہ بات دیکھیں گے کہ لوگوں کو بدہضمی کی شکایت ہو جاتی ہے۔ اور آجکل شہروں اور قصبوں کے باشندے بالعموم ذیابیطس میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن گاؤں کے لوگوں کو آپ دیکھیں گے کہ وہ ان بیماریوں میں مبتلا نہیں ہوتے، جس کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کے بازاروں کے نزدیک نہیں ہیں، جہاں سے وہ اپنا من للچانے پر کچی کچوری جیسی زہریلی چیزیں — غذائیں — خرید سکیں! میں اس موضوع پر پھر کسی وقت ذرا تفصیل سے گفتگو کروں گا۔

مختصراً یہ ہے کھانے سے متعلق ہمارا قدیم ضابطہ، لیکن اس بارے میں ماضی میں بھی بہت کافی اختلاف رہا ہے تھا اور اب بھی ہے۔ مزید برآں جانور کا گوشت کھانا اچھا ہے یا برا، ہمیں صرف سبزی کھا کر ہی بسر کرنی چاہیئے یا گوشت خوری کا بھی نفع اور نقصان اُٹھانا چاہیئے؛ یہ سوال جس طرح ماضی میں متنازعہ فیہ تھا اسی طرح آج بھی ہے۔ آیا جانور کو مارنا ٹھیک ہے یا غلط ہے، یہ سوال بھی ہمیشہ ہی زبردست جھگڑے کا موجب بنا رہا ہے۔ ایک فریق کا یہ کہنا ہے کہ جانور کو مارنا مہاپاپ ہے اور کبھی کسی جانور کی جان نہ لینی چاہیئے، لیکن دوسرا فریق یہ جواب دیتا ہے کہ آپ کی عقل پر تو پتھر پڑ گئے ہیں، جان نہ لینا اور زندہ رہنا ممکن ہی نہیں ہے۔ شاستروں میں بھی اختلاف ہے، بلکہ اس مسئلہ پر شاستروں میں ایک طرح کا ابہام اور تضاد پیدا ہو گیا ہے۔ ایک مقام پر شاستروں میں یہ بات کہی گئی ہے کہ "یگیہ بھومی میں جانوروں کی ہتیا کرو" (بلی دو)۔ اور دوسری جگہ یہ ہدایت کی گئی ہے کہ "جیون ہتیا مت کرو"۔ ہندوؤں کا سدّھانت یہ ہے کہ سوائے قربانی کے، جانوروں کی ہتیا کرنا مہاپاپ ہے، لیکن یگیہ بھومی میں جانور کی قربانی دینے کے بعد گوشت خوری کا لطف اُٹھایا جا سکتا ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ گرہستیوں کے لئے ایسے متعدد ضابطے اور قاعدے ہیں جن کے تحت خاص خاص مواقع پر جانور کا مارنا ان پر لازم آتا ہے جیسے شرادھ اور اسی طرح کے دوسرے خاص مواقع، اگر ان مواقع پر کبھی وہ جانور کی قربانی سے پہلو تہی کرتا ہے تو اسے پاپی اور گنہگار کہا جاتا ہے اور اس کی رسوائی کی جاتی ہے، منو کا قول ہے کہ اگر وہ لوگ جو شرادھ اور ایسی ہی بعض دوسری تقاریب میں مدعو کئے جائیں اور جانور کا گوشت بطور غذا استعمال کرنے سے انکار کریں تو وہ اپنے دوسرے جنم میں جانور ہی کی صورت میں پیدا ہوں گے، اس کے برعکس جینی، بدھی، اور ویشنو مت والے احتجاجاً یہ بات کہتے ہیں کہ ہم ہندو شاستروں کی ان تعلیمات میں عقیدہ نہیں رکھتے، کسی وجہ سے بھی جیو ہتیا برداشت نہیں کی جا سکتی، ہم پڑھتے ہیں کہ بدھ دھرم کا پیرو بادشاہ سمراٹ اشوک ان لوگوں کو سخت سزائیں دیتا تھا، جو یگیہ بھومی میں جانور کی قربانی دیتے تھے اور کسی تقریب کے مدعوین کو گوشت بطور غذا پیش کرتے تھے، اس زمانہ میں ویشنو مت والے خود کو جس پوزیشن میں پاتے ہیں وہ بہت ہی مشکل ہے۔ رامائن اور مہابھارت میں ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ رام اور کرشن نے شراب بھی پی اور گوشت بھی کھایا، ویشنو مت والے رام اور کرشن کی ایشور مانتے ہوئے پرستش کرتے ہیں

[1]सीतामादाय बाहुभ्यां मधु मैरेयकं शुचि ।
पाययामास काकुत्स्थः शचीमिन्द्रो यथामृतम् ॥
मांसानि च सुमृष्टानि विविधानि फलानि च ।
रामस्याभ्यवहारार्थं किंकरास्तूर्णमाहरन् ॥

سیتا جی نے منّت مانی تھی کہ وہ گنگا جی پر گوشت چاول اور شراب کے ایک ہزار گھڑے بطور نذر چڑھائیں گی

سیتا جی کو پیار سے اپنے دونوں بازوؤں میں لیتے ہوئے کوکتسا (رام) نے انہیں خالص شراب پینے کے لیے پیش کی، بالکل اسی طرح جیسے اندر نے آبحیات شاچی کو پلایا تھا۔ نوکروں نے رام کو کھانے کے لئے مختلف اقسام کے گوشت اور پھل پیش کیے!

[2]उभौ मध्वासवक्षीवावुभौ चन्दनरूषितौ ।
स्रग्विनौ वरवस्त्रौ तौ दिव्याभरणभूषितौ ॥

(میں نے دیکھا) ان دونوں نے (کرشن اور ارجن نے) شہد سے بنی ہوئی میٹھی روحانیت آفرین شراب پی، دونوں نے ماتھے پر چندن کا تلک لگایا، ہار پہنے قیمتی پوشاک زیب تن کی اور قیمتی زیورات پہنے۔ (ادیوگ . 5 . LVIII)

[3]सुराघटसहस्रेण मांसभूतौदनेन च ।

"اے دیوی مجھ پہ کرپا کر، میں جب اپنے گھر لوٹوں گا تو تیری پوجا کروں گا۔ اور تجھے شراب کے ایک ہزار گھڑے اور وہ چاول بھینٹ کروں گا جس میں بہترین گوشت شامل ہوگا۔" (رامائن)

مغربی ممالک میں موضوع بحث یہ ہے کہ آیا جانور کا گوشت بطور غذا کے استعمال کرنے سے صحت کو نقصان پہنچتا ہے یا نہیں پہنچتا! سبزی کے مقابلہ میں گوشت زیادہ مقوّی غذا ہے یا نہیں؛ وغیرہ وغیرہ۔ ایک فریق کا یہ کہنا ہے کہ گوشت کھانے سے ہر قسم کے جسمانی روگ پیدا ہوتے ہیں۔ دوسرا فریق اس دلیل کی تردید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ سب افسانہ ہے۔ اگر یہ بات درست ہوتی تو ہندو نسل سب سے زیادہ صحت مند اور توانا قوم ہوتی، انگریز اور امریکن اور اسی طرح دوسری قومیں جو گوشت خور ہیں اب تک تو ہر قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہو کر فنا ہو گئی ہوتیں۔ ایک کہتا ہے کہ بکرے کا گوشت کھانے سے آدمی کی عقل بھی ایسی ہی ہو جاتی ہے جیسی عقل بکرے کی ہوتی ہے۔ بطخ کا گوشت کھانے سے بطخ کی اور مچھلی کا گوشت کھانے سے مچھلی جیسی عقل ہو جاتی ہے۔ دوسرا فریق اس کے جواب میں کہتا ہے، اگر یہی دلیل ٹھیک ہے تو آلو کھانے والے کی عقل آلو بن کر رہ جائے گی اور سبزی خوروں کا دماغ گھاس پھونس جیسا ہوگا۔ یعنی بے حس اور مردہ! کیا بہتر نہیں ہے کہ مردہ دماغ کی جگہ آدمی کو کم سے کم اتنی عقل تو حاصل ہی ہو جائے جو زندہ جانوروں میں ہوتی ہے۔ ایک فریق کہتا ہے کہ گوشت میں جو کیمیاوی عناصر ہوتے ہیں وہ سب کے سب مساوی طور پر سبزیوں میں بھی موجود ہیں، دوسرا فریق اس دلیل کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ کیمیاوی عناصر تو ہوا میں بھی موجود ہیں، تب تو صرف ہوا کھا کر بھی زندہ رہا جا سکتا ہے۔ ایک فریق یہ دلیل دیتا ہے کہ سبزی خور بڑے محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں اور تا دیر سخت سے سخت محنت کر سکتے ہیں، دوسرا فریق اس کا یہ جواب دیتا ہے کہ اگر یہی دلیل ٹھیک ہے تو پھر ان قوموں کو جو سبزی خور ہیں، سب سے ممتاز اور نمایاں ہونا چاہیئے حالانکہ واقعہ اس کے خلاف ہے اور وہی قومیں سب سے زیادہ ممتاز اور قوی توانا دکھائی دیتی ہیں جو گوشت خور ہیں، جو لوگ گوشت خوری کی ترغیب دیتے ہیں، وہ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ہندوؤں، جینیوں کو دیکھئے وہ کس قدر غریب ہیں اس لئے کہ وہ گوشت نہیں کھاتے اور صرف چاول اور تمام اقسام کی سبزیاں ہی بطور غذا استعمال کرتے ہیں، ذرا دیکھئے کہ ان کی حالت کتنی دردناک ہے،

---

جاپانیوں کی حالت بھی اتنی ہی دردناک تھی۔ لیکن جب سے انہوں نے گوشت خوری شروع کر دی، ان کی زندگی کی کتاب کا ورق الٹ گیا۔ اور ایک نئے باب کا آغاز ہو گیا۔ ہندوستانی رجمنٹوں میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ مقامی سپاہی ہیں۔ ذرا دیکھئے کہ ان میں کتنے سبزی خور ہیں؟ ان سپاہیوں کے سب سے بہتر عناصر جیسے سکھ اور گورکھے، سبزی خور نہیں ہیں۔ ایک فریق کہتا ہے کہ گوشت کھانے سے بدہضمی ہوتی ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ یہ سب حماقت کی باتیں ہیں۔ اس لئے کہ امراضِ شکم میں جو لوگ مبتلا ہوتے ہیں، ان میں زیادہ تر وہی لوگ ہوتے ہیں جو سبزی کھاتے ہیں۔ بہرحال ہو سکتا ہے کہ سبزیاں ہاضمہ کے نظام میں چوہڑ کا کام کرتی ہوں، لیکن محض اس وجہ سے آپ ساری دنیا کو کس طرح سبزی خور بنا سکتے ہیں؟

سبزی خور اور گوشت خور ایک دوسرے کے خلاف جو کچھ بھی کہتے ہوں اس سے قطع نظر، یہ واقعہ ہے کہ جو قومیں گوشت خور ہیں وہ نمایاں طور پر بہادر، مہم جو اور دانشمند دکھائی دیتی ہیں۔ گوشت خور قومیں اس بات پر بھی اصرار کرتی ہیں کہ جس زمانہ میں بگیہ بھومی سے دھواں اٹھ کر ہندوستان کے افق پر پھیلا کرتا تھا اور ہندو قربانی کے جانور کا گوشت کھایا کرتے تھے، صرف اسی زمانہ میں ان کے درمیان مذہبی ادبی دستیاب اور وہ شخصیتیں پیدا ہوئیں جو اپنی ذہانت و فراست کی بنا پر ساری دنیا میں عظیم تر مانی جاتی ہیں۔ لیکن جب سے انہوں نے گوشت خوری چھوڑ دی اور باباجی کی سبزی خوری اختیار کی، تب سے ان کے درمیان ایک بھی عظیم شخصیت پیدا نہیں ہوئی۔ اس خیال کے پیشِ نظر ہمارے ملک کے وہ لوگ جو گوشت کھانے کی عادت رکھتے ہیں، گوشت خوری چھوڑنے میں ایک اندیشہ محسوس کرتے ہیں۔ اس مسئلہ میں آریہ سماجی بھی دو حصوں میں بٹ گئے ہیں اور ان کے درمیان بھی اس سوال پر تنازعہ پیدا ہو گیا ہے اور بحث و مباحثہ شروع ہو گیا ہے۔ ایک پارٹی کہتی ہے کہ گوشت کھانا قطعی ضروری ہے، دوسری پارٹی اس بات کی مذمت کرتی ہے اور اس بات پر اصرار کرتی ہے کہ گوشت خوری بہت بری عادت ہے اور جانوروں پر ناروا اور بے جا ظلم کے مترادف ہے۔ یہ اختلاف رائے ایک تنازعہ کی صورت میں بڑھتے بڑھتے بدکلامی، دشنام طرازی اور لڑائی جھگڑے کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا بغور جائزہ لے کر اور غذا کے اس نازک مسئلے سے ہر قسم کے اشتعال اور ہر طرح کی ضد کو الگ رکھتے ہوئے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس بارے میں میری رائے اس زاویۂ نگاہ پر مبنی ہے کہ ہندو بہر طور ٹھیک ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ہندو شاستروں نے دوسری متعدد چیزوں کی طرح کھانے پینے کے بھی ضابطے مقرر کئے ہیں۔ اور یہ ضابطے پیشے اور جنم کے اختلاف کی مطابقت میں مختلف ہونا چاہئیں۔ یہ ٹھوس اور صحیح نتیجہ ہے جو میں نے اخذ کیا ہے۔ لیکن موجودہ زمانہ کے ہندو نہ تو اپنے شاستروں ہی پر عمل کریں گے نہ ہی اپنے عظیم آچاریوں کی تعلیمات پر دھیان دیں گے۔

گوشت خوری بلاشبہ بربریت ہے اور سبزی خوری یقینی طور پر سادگی و پاکیزگی کی علامت ہے۔ اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے؟ جو شخص روحانی زندگی بسر کرنے کا عزم رکھتا ہے، اسے تو قطعی طور پر اپنی غذا میں صرف سبزی ہی استعمال کرنی چاہیئے لیکن جو شخص اپنی زندگی کی کشتی اپنی محنت و مشقت کی پتوار سے کھے رہا ہے اور جو موت و حیات کی کشمکش سے گزر رہا ہے اور جسے اس دنیا کی مقابلہ بازی کا سامنا ہو رہا ہے، اس کے لئے گوشت کھانا ضروری اور بہت ضروری ہے۔ جب تک انسانی سماج میں یہ چیز ہے کہ طاقتور کمزور پر غلبہ پانے کی خواہش رکھتا ہے اس وقت تک جانور کا گوشت بطور غذا استعمال کرنا آدمی کی ایک ضرورت ہے۔ ورنہ کوئی ایسی چیز دریافت کرنی چاہیئے جو گوشت کا متبادل بن سکے۔ اگر ایسا نہیں ہوگا۔ تو وہ لوگ قدرتی طور پر

---

طاقتور لوگوں کے پاؤں تلے کچل کر رہ جائیں گے جبکہ دوسرے سبزی خوروں نے ایک یا چند مخصوص انسانوں پر کیا اثرات مرتب کیئے، اس بات کو ثابت کرنے کے لیئے اکا دکا مثالیں پیش کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ ایک پوری قوم کا دوسری قوم سے موازنہ کیجئے اور پھر کوئی نتیجہ اخذ کیجئے!

اتنا ہی نہیں، بلکہ سبزی خوروں میں بھی شدید ترین اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ چاول، آلو، جو، مکا (مکئی) گیہوں اور دوسری لیس دار چیزیں بطور غذا قابل استعمال نہیں، یہ چیزیں آدمی پیدا کرتا ہے اور وہ ہر قسم کی بیماریوں کا گھر ہیں لیس دار غذا جس سے ہاضمہ کے دوران میں بے چینی پیدا ہوتی ہے، صحت کو بہت زیادہ نقصان پہنچاتی ہے، گائے اور گھوڑے کو اگر چاول اور گیہوں کھلایا جائے اور ان کو اصطبل میں بند رکھا جائے تو یہ خوراک کھا کر یہ جانور تک بیمار ہو جاتے ہیں۔ لیکن انہیں گھاس چرنے کے لیئے اگر میدانوں میں چھوڑ دیا جائے تو ان کو لگی ہوئی بیماریاں تک دور ہو جائیں اور وہ صحتیاب ہو جائیں گے۔ گھاس اور ہضم ہو جانے والی دوسری ہری چیزوں میں بہت کم لیس ہوتا ہے۔ بن مانس یا بغیر دم والا بڑا بندر گھاس اور درختوں کے بیج یا پھل کھاتا ہے وہ عام طور پر آلو اور گیہوں نہیں کھاتا اور اگر کبھی یہ چیزیں اسے کھانا ہی پڑیں تو وہ انہیں ان کے پکنے سے پہلے کھاتا ہے یعنی اس وقت جب ان میں زیادہ لیس پیدا نہیں ہوتا، اس کے برعکس بعض دوسرے لوگ یہ کہتے ہیں کہ بھنا ہوا گوشت، کثیر پھل میوے اور دودھ کا بطور غذا استعمال، عمر بڑھانے کے لیئے بہترین چیز ہے، یہ خصوصی بات ہے کہ جو لوگ پھلوں کا استعمال باقاعدگی سے جاری رکھتے ہیں ان کا شباب تا دیر باقی رہتا ہے، اس لیئے کہ پھلوں کی تیزابیت اس زنگ کو تحلیل کر دیتی ہے جو ہڈیوں پر جما رہتا ہے اور بڑھاپا لانے کا موجب بنتا ہے۔

ان تمام دلائل کے خاتمہ کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس مسئلہ میں منصفانہ نقطۂ نظر جسے سب ہی تسلیم کرتے ہیں یہ ہے کہ ایسی خوراک کھانی چاہیئے جو غذائیت سے مملو ہو، صحت بخش ہو، ساتھ ہی ساتھ زود ہضم ہو، اور آسانی سے ہضم ہو جائے۔ کھانا اس قسم کا ہونا چاہیئے کہ اس کی کم سے کم مقدار میں زیادہ سے زیادہ غذائیت ہو اور جلد سے جلد ہضم ہو جائے ورنہ ضروری ہو گا کہ زیادہ مقدار میں کھانا کھایا جائے اور نتیجہ یہ ہو گا کہ پورا دن اسے ہضم کرنے کے کام میں لگ جائے گا۔ اگر ہماری ساری شکتی، صرف کھانے کے ہاضمہ پر صرف ہو جائے تو پھر دوسرے کاموں کے لیئے ہمارے پاس باقی کیا بچے گا؟

سب بھنی ہوئی چیزیں حقیقت میں زہر ہوتی ہیں حلوائی کی دکان کا دروازہ، موت کا دروازہ ہے گرم ممالک میں تیل اور صاف شدہ مکھن یا گھی کا کم سے کم استعمال ہی بہتر ہوتا ہے، گھی کی بہ نسبت مکھن زیادہ زود ہضم ہوتا ہے، برف کی مانند سفید آٹے میں غذائیت کا جزو بہت کم ہوتا ہے، غذا کے طور پر گیہوں کا بھوسی ملا آٹا ہی اچھی چیز ہوتا ہے۔ بنگال میں کھانا بنانے کا جو طریقہ رائج ہے اور دور افتادہ دیہات میں دکھائی دیتا ہے مستحق تعریف ہے، کیا آپ نے کہیں دیکھا ہے کہ بنگال کے قدیم شاعروں نے لوچی اور کچوری کی تعریف میں کوئی قصیدہ تصنیف کیا ہے؟ بنگال میں یہ لوچی کچوری شمال مغربی صوبوں سے آئی ہے، لیکن ان صوبوں کے لوگ بھی یہ چیزیں کبھی کبھی استعمال کرتے ہیں، میں نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ ہر شخص روزانہ بس گھی میں تلی ہوئی چیزیں ہی استعمال کر کے اپنی زندگی بسر کرتا ہے، متھرا کے

---

چوبے پہلوان بلاشبہ لوچی اور مٹھائی کے بڑے شوقین ہوتے ہیں لیکن چند برس کے اندر ہی ان کا ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہ نمکیات سے تیار کی ہوئی دوائیں جنہیں چورن وغیرہ کہا جاتا ہے، استعمال کرنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔

غریب بھوکے مرتے ہیں، اس لئے کہ انہیں کھانے کو کوئی چیز ملتی نہیں لیکن امیر بھی بھوکے ہی مرتے ہیں اس لئے کہ وہ جو کچھ کھاتے ہیں اسے "غذا" نہیں کہا جا سکتا۔ کوئی بھی چیز جو کھائی جائے، غذا نہیں ہوتی، حقیقی غذا صرف وہ چیز ہوتی ہے جو کھانے کے بعد خوب اچھی طرح ہضم ہو جائے۔ الم غلم سے پیٹ بھرنے کی بہ نسبت بھوکا رہنا ہی اچھا! حلوائیوں کی دکانوں میں گندگی کی بدولت شاید ہی کوئی چیز رہ جاتی ہو جسے صحت بخش کہا جا سکے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے یہ سب چیزیں — زہر بن جاتی ہیں زہر! پرانے زمانے کے لوگ ان ضرر رساں چیزوں کو شاذ و نادر ہی استعمال کرتے تھے، لیکن اس زمانہ میں شہروں کے لوگ، خصوصیت سے وہ لوگ جو دیہات سے شہروں میں رہنے کے لئے آئے ہیں اس معاملہ میں بڑے پاپی ہیں، اس لئے کہ وہ روزانہ ان چیزوں کو اپنے استعمال میں لاتے ہیں، لہٰذا اس بات پر حیرت ظاہر کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ بدہضمی میں مبتلا ہو کر قبل از وقت موت کے منہ کا نوالہ بن جاتے ہیں، اگر آپ کو بھوک لگ رہی ہو تو سب مٹھائیوں اور گھی میں تلی ہوئی چیزوں کو ٹھکرا دیجئے اور ایک پیسے کے مرمرے خرید لیجئے، وہ سستے بھی ہوں گے اور ان میں غذائیت بھی ہوگی، چاول، دال، بھوسی ملے گیہوں کے آٹے کی چپاتی، پھلی، سبزی اور دودھ لیں، یہ غذا آپ کے لئے کافی ہوگی، لیکن دال اسی طرح استعمال کرنی چاہیئے جس طرح جنوبی ہندوستان کے لوگ استعمال کرتے ہیں یعنی صرف دال کا پانی، باقی جو بچے، وہ مویشیوں کو کھلا دیجئے! وہ شخص گوشت بھی کھا سکتا ہے جو کھا سکتا ہے، لیکن گوشت تیار کرتے ہوئے اس میں بہت زیادہ بھنے ہوئے مسالے شامل کرنا چاہیئے، جیسا کہ شمال مغربی علاقوں کے لوگ کرتے ہیں، مسالے قطعی طور پر غذا نہیں ہیں، ان کا بکثرت استعمال محض بری عادتوں کا نتیجہ ہے، دال بہت اچھی غذا ہے لیکن وہ بڑی مشکل سے ہضم ہوتی ہے، مٹر کا شوربہ جو پسے ہوئے مٹر سے تیار کیا جائے زود ہضم بھی ہوتا ہے اور ذائقہ دار بھی ہوتا ہے، پیرس میں یہ بہت ہی مرغوب کھانا ہے، پہلے مٹر کو خوب ابال لیجئے، پھر انہیں پیس کر لگدی بنا لیجئے اور اس لگدی کو پھر پانی میں گھول دیجئے، پھر چمچے سے اس مرکب کو ہلاتے رہیئے، جس طرح آپ دودھ کو ابالتے ہوئے چمچے سے ہلاتے رہتے ہیں مٹر کا اوپری چھلکا اس طرح پانی کے اوپر تیرنے لگے گا، اسے نکال کر پھینک دیجئے، اس کے بعد کالی مرچ، زیرہ وغیرہ حسب ضرورت شامل کر دیجئے اور ایک چمچے میں گھی گرم کر کے اس مرکب کو بگھار دیجئے — اس طرح بہت ہی ذائقہ دار خالص دال تیار ہو جائے گی، گوشت کھانے والے اس دال میں بکرے کی سری یا مچھلی ڈال کر اسے اور زیادہ لذیذ اور ذائقہ دار بنا لیتے ہیں۔

ہندوستان میں اس کثرت سے ذیابیطس کے جو مریض پائے جاتے ہیں، اس کی حقیقی وجہ ہاضمہ کی خرابی یا بدہضمی ہے بلاشبہ اس قسم کی بھی اکا دکا مثالیں ہیں کہ بہت زیادہ دماغی محنت کرنے کی بنا پر ذیابیطس کا مرض لاحق ہو گیا۔ لیکن زیادہ تر مثالیں اس بات کی ہیں کہ یہ مرض بدہضمی کی بنا پر لاحق ہوتا ہے، گھڑے کی طرح پھولا ہوا پیٹ بدہضمی کی علامت ہے، کیا کھانے کا مطلب یہ ہے کہ معدے کو بوری کی طرح بھر دیا جائے، جتنا ہضم کیا جا سکتا ہے بس اتنا ہی کھانا ٹھیک ہوتا ہے لاغری اور موٹاپا، دونوں ہی چیزیں بدہضمی کی بدولت ہوتی ہیں، اگر آپ میں ذیابیطس کی بیماری کے آثار دکھائی دیں تو اس پر مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے

ہمارے ملک میں یہ کوئی انوکھی بیماری نہیں ہے۔ اس پر بہت زیادہ دھیان دینے کی ضرورت نہیں لیکن اپنے کھانے پر زیادہ دھیان دیجئے اور بدہضمی سے بچنے کی حتی الامکان کوشش کیجئے۔ بس اتنا ہی کافی ہے!

حتی الامکان صاف اور تازہ ہوا میں رہنے کی کوشش کیجئے! زیادہ سے زیادہ پیدل چلئے اور زیادہ سے زیادہ محنت کیجئے، پاؤں کے پٹھے لوہے کی مانند سخت ہونے چاہئیں۔ اگر آپ ملازم ہیں تو جب بھی موقع ہو چھٹی لیجئے اور کوہ ہمالیہ میں بدری ناتھ کے آشرم کی تیرتھ یاترا کیجئے۔ اگر دو سو میل کا یہ اتار چڑھاؤ کا سفر آپ پیدل ہی کریں تو آپ دیکھیں گے کہ آپ کا یہ مرض ذیابیطس رفع ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر کو اپنے قریب پھٹکنے دیجئے۔ وہ فائدہ کی جگہ زیادہ تر نقصان کا موجب بنتے ہیں۔ کوئی دوا نہ لیں۔ خود مرض ایک آدمی کو جتنے عرصہ میں مارتا ہے دوائیں اس سے پہلے ہی مار ڈالتی ہیں۔ پوجا کی سالانہ تعطیلات کے زمانہ میں اگر ممکن ہو سکے تو آپ اپنے گاؤں سے پیدل چل کر ہی شہر آیا کریں۔ ہمارے ملک میں امیر ہونے کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ ایک آدمی کاہلی کا مجسمہ بن کر رہ جائے اور اپنا کام دوسروں پر چھوڑ دے۔ ایک آدمی جسے چلنے میں دوسرے لوگ سہارا دیں، جس کے منہ میں دوسرے لوگ کھانے کے نوالے رکھیں، وہ بہت ہی دردناک حالت میں مبتلا ہوتا ہے۔ عملاً وہ ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ جو شخص اس ڈر سے کہ پوری، لوچی کہیں اسے نقصان نہ دے صرف لوچی کا اوپر کا چھلکا کھایا کرتا ہے وہ تو سچ مچ زندہ رہتے ہوئے بھی مر چکا ہے۔ اسے کیا کہنا چاہیئے آدمی یا کیڑا! جو ایک سانس میں اپنے پاؤں سے بیس میل کا فاصلہ بھی طے نہیں کر سکتا، جو شخص اپنے منہ سے موت اور بیماری کو اپنے پاس آنے کی دعوت دیتا ہے، اسے کون بچا سکتا ہے؟

جہاں تک خمیر کی ہوئی روٹی کا تعلق ہے یہ بھی زہر ہوتی ہے۔ اسے ہاتھ بھی نہ لگائیے! جس آٹے میں خمیر شامل ہو وہ صحت کو نقصان پہنچاتا ہے۔ کوئی بھی چیز جس میں خمیر ہو مت استعمال کیجئے! ہمارے شاستروں میں خاص طور پر اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اس قسم کا کھانا ہرگز ہرگز استعمال نہ کرنا چاہیئے۔ کوئی بھی مٹھائی جس میں کھٹاس آ جائے ہمارے شاستروں میں ممنوع قرار دی گئی ہے اور اسے شکت کہا گیا ہے۔ اس قسم کی چیزوں میں صرف دہی کو ہمارے شاستروں نے استعمال کرنے کی اجازت دی ہے اور دہی کا استعمال اچھا اور صحت کے لئے مفید ہوتا ہے۔ اگر آپ ڈبل روٹی کا توسٹ استعمال کریں تو اسے خوب اچھی طرح سینکنا چاہیئے!

جو کھانا اور پانی خالص نہ ہو ہمیشہ ہی بیماریوں کا گھر ہوتا ہے۔ امریکہ میں آج کل یہ رواج ہو گیا ہے کہ وہ پینے کے پانی کو صاف کرتے ہیں۔ وہ زمانہ اب بیت چکا ہے جس میں پانی کو چھان کر پیا جاتا تھا، اس لئے کہ جس چیز میں پانی چھانا جاتا تھا اس میں سے پانی کا زور پڑنے پر ہیضہ اور طاعون وغیرہ کے جراثیم نکل جاتے تھے اور پھر یہ چیز جس میں پانی چھنتا تھا، ان بیماریوں کا گھر بن جایا کرتی تھی، اس بنا پر بڑے بڑے فلٹروں میں پانی چھاننے کا رواج ختم ہو گیا ہے۔ اب یہ سیدھا سا طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ مٹی کے تین گھڑے تلے اوپر رکھے جاتے ہیں۔ نیچے کے گھڑے کو خالی رکھا جاتا ہے جس میں چھنتا ہوا پانی جمع ہوتا ہے۔ بیچ کے گھڑے میں ریت اور کوئلہ کا چورا بھر دیا جاتا ہے۔ اس میں سے ہو کر پانی گزرتا ہے اور ایک سوراخ سے سب سے نیچے رکھے ہوئے گھڑے میں گرتا ہے۔ سب سے اوپر کے گھڑے میں وہ پانی بھرا جاتا ہے جس کو چھاننا مقصود ہوتا ہے۔ لیکن ہر دوسرے یا تیسرے دن یہ ریت اور کوئلہ کا چورا بدل دینا چاہیے۔ اگر اسے بدلنے میں دشواری ہو تو اسے ایک بار گرم کر کے سکھا لینا چاہیئے۔ وہ پھر قابل استعمال بن جائے گا۔ کلکتہ کے نواح میں کپڑ

کے ذریعہ پانی چھاننے کا جو طریقہ گنگا جی کے کناروں پر دکھائی دیتا ہے وہ سب سے اچھا ہے، اس طریقہ سے پانی بالکل صاف ہو جاتا ہے
اور اس میں سے جراثیم وغیرہ بالکل نکل جاتے ہیں، بدیشی فلٹروں کے مقابلہ میں یہ سیدھا سادہ طریقہ بہت اچھا اور مفید ہے، مزید برآں اگر
پانی کو اُبال لیا جائے تو یہ سب سے اچھا ہے، اور اس کے استعمال میں پھر کوئی خطرہ نہیں رہتا، پانی کو اُبال کر چھان لیجیے اور اسے استعمال کیجیے اور ان
فلٹروں اور دوسری چیزوں کو ٹھوکر مار دیجیے! آج کل امریکہ میں پینے کے پانی کو پہلے بڑی بڑی مشینوں کے ذریعہ اُبال کر بھاپ بنایا جاتا ہے،
پھر بھاپ کو ٹھنڈا کر کے اسے دوبارہ پانی بنا لیا جاتا ہے، اور پھر دوسری مشین کے ذریعہ اس پانی پر خالص ہوا کا دباؤ ڈالا جاتا ہے
تاکہ وہ ہوا جو پانی کو بھاپ بناتے وقت خارج ہو گئی ہے اس میں دوبارہ شامل ہو جائے، یہ پانی بہت صاف اور خالص ہوتا ہے
اور آج کل ہر گھر میں یہی صاف اور خالص پانی استعمال کیا جاتا ہے

ہمارے ملک میں صاحبانِ وسائل اپنے بچوں کو ہر قسم کی مٹھائیاں اور گھی میں تلی ہوئی چیزیں کھلاتے ہیں، شاید انہیں اس
خیال سے شرم آتی ہے کہ ان کے بچوں کو صرف چاول اور چپاتی کھاتے ہوئے جب دیکھا جائے گا تو لوگ کیا کہیں گے؟ جن بچوں کو اس
طرح کی غذا پر پالا جائے گا، ان سے آپ سوائے اس کے اور کیا توقع کر سکتے ہیں کہ ان کے جسم کی ساخت بگڑ جائے گی، ان کے اعضاء
غیر متناسب ہوں گے اور وہ سست و کاہل ہوں گے، وہ بے وقوف و احمق ہوں گے اور ان کے پاس اپنے پاؤں پر آپ کھڑے
ہونے کی عقل نہیں ہوگی۔ انگریز اتنی مضبوط قوم ہے۔ وہ رات دن اتنی محنت و مشقت کرتی ہے۔ اس کا وطن اتنا سرد ملک ہے لیکن اس قوم
کے لوگ تک مٹھائیوں کے نام سے لرزتے ہیں اور مکھن میں تلی ہوئی چیز بطور غذا کھانے سے ڈرتے ہیں۔ لیکن ہم لوگ جو آگ کی طرح گرم منطقے
میں رہتے ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لئے ہلنا جلنا تک پسند نہیں کرتے۔ اپنی غذا میں جو چیزیں استعمال کرتے ہیں وہ ہیں
لوچی کچوری، مٹھائی اور دوسری چیزیں جو سب کی سب گھی یا تیل میں تلی جاتی ہیں۔ ابتدا میں ہمارے بنگال کے زمینداروں کے لئے بیس تیس
میل پیدل چل لینا معمولی سی بات تھی، وہ دس بیس کوئی مچھلی گوشت اور کانٹوں سمیت چبا جاتے تھے اور ایک سو برس تک زندہ رہتے
تھے۔ اب ان زمینداروں کے بیٹے اور پوتے کلکتہ آکر آباد ہو گئے ہیں، آنکھوں پر چشمہ لگاتے ہیں، بازار کی بنی ہوئی مٹھائیاں کھاتے ہیں،
ایک سڑک سے دوسری سڑک تک جانے کے لئے گاڑی کرایہ پر لیتے ہیں، اور ذیابیطس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان کی عمر گھٹ جاتی ہے
اور یہ وہ پھل ہے جو ان کلکتہ زدہ لوگوں کو اپنی نیت کے درخت سے مل رہا ہے، ڈاکٹر اور وید ان کی صحت کو اور بھی برباد کر دیتے
ہیں، وہ بڑے عالم فاضل بنتے ہیں اور اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہر مرض کا اپنی دوا سے علاج کر سکتے ہیں، ذرا سی کوئی شکایت ہوئی،
اور انہوں نے فوراً ہی کوئی دوا تجویز کر دی، افسوس کہ ان ویدوں اور ڈاکٹروں کے دماغ میں یہ بات نہیں آتی کہ وہ انہیں دوا کے
استعمال سے دور رہنے کا مشورہ دیں اور یہ ہدایت کریں کہ انہیں روزانہ چار پانچ میل پیدل چلنا چاہیے!

---

# صحت و غذا

میں نے متعدد ممالک میں کھانا تیار کرنے کے مختلف طریقوں کا مشاہدہ کیا ہے لیکن ہمارے بنگال میں کھانا بنانے کا جو قابلِ تعریف معیار تھا ان ممالک کے طریقے اس معیار تک ہرگز نہیں پہنچتے۔ اور اس بات پر بہت زیادہ اصرار کرتے ہوئے زور دینے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس معیار سے فائدہ اٹھانے کی خاطر اسے دوبارہ ہضم دیا جائے جو چیز فائدہ کی تھی اُسے تو دوبارہ رائج ہونا ہی چاہیئے۔ اس میں کہنے کی کیا بات ہے یہ بھی بڑے افسوس کی بات ہے کہ جن کو قدرت نے دانت دیئے ہیں وہ ان کی قدر و قیمت نہیں جانتے ہمیں غذا کے معاملہ میں اہلِ مغرب کی نقالی کیوں کرنی چاہیئے ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو اس نقالی کے اخراجات کو برداشت کر سکتے ہیں؟ ملک کے جس حصہ میں ہم رہتے ہیں اس میں مناسب ترین غذا — خالص بنگالی کھانا ہے۔ مشرقی بنگال کے عوام کی خوراک کی مانند یہ کھانا سستا بھی ہوتا ہے، ذائقہ دار بھی ہوتا ہے، اس میں غذائیت بھی ہوتی ہے اور وہ صحت بخش بھی ہوتا ہے۔ جس حد تک آپ چاہیں اہلِ مغرب کے کھانے کی نقل اتاریں لیکن آپ ان کے کھانوں کی جانب جتنا مائل ہوں گے اتنا ہی آپ غیر متمدن بنتے جائیں گے۔ آپ کلکتوی ہیں متمدن و مہذب ہیں اور اس ہلاکت آفریں دم کی مسرتوں نے آپ کو کھو دیا ہے جو خود آپ ہی نے اپنے چاروں طرف بچھا رکھا ہے یعنی بازاری مٹھائیوں کا جال — ! بنگرا نے اپنا ابلا ہوا چاول دامودر ندی میں اچھال کر پھینک دیا ہے۔ کلٹی دال نالی میں پھینک دی ہے۔ ڈھاکہ اور وکرم پور نے اپنے قدیم کھانے کتوں کے آگے رکھ دیئے ہیں — گویا بالفاظِ دیگر وہ مہذب و متمدن بن گئے ہیں اور یہ صوبائی لوگ اس قدر بے وقوف ہیں کہ وہ کلکتہ کا سارا آخور کھائیں گے اور خود کو بدہضمی اور پیچش میں مبتلا کر لیں گے۔ لیکن اس کے باوجود وہ یہ بات تسلیم نہیں کریں گے کہ اس آخور کا کھانا ان کے لئے ٹھیک نہیں ہے اس کے برعکس وہ اپنی مدافعت میں یہ بات کہیں گے کہ کلکتہ کی آب و ہوا بہت مرطوب ہے اور بہت سیلی ہوتی ہے، انہیں ہر پہلو اور ہر اعتبار سے بس اچھے قسم کا "شہری" ہونا چاہیئے۔

غذا کے اوصاف اور دوسرے رواجوں کے بارے میں اختصاراً اتنا کچھ کہا گیا ہے۔ اب میں اس مسئلہ کے متعلق کچھ کہوں گا کہ اہلِ مغرب بالعموم کیا کھاتے ہیں اور اس میں بتدریج کس طرح کی تبدیلی آ رہی ہے۔

---

تمام ممالک میں غریب لوگ مختلف صورتوں میں استعمال کرتے ہیں، زمین کے اندر پیدا ہونے والے پھل جیسے آلو وغیرہ اور سبزیاں ان کی خاص غذا ہیں، مچھلی اور گوشت لذت کام و دہن کے لئے وہ اس طرح استعمال کرتے ہیں، جیسے کوئی چٹنی کھاتا ہے، جو فصل افراط سے ہوتی ہے اور جسے ایک ملک پیدا کرتا ہے، وہ غریب طبقات کی غذا ہوتی ہے جیسے بنگال، اڑیسہ، مدراس اور مالا بار کے سواحل کے لوگوں کی خاص غذا چاول، دال اور سبزی ہے، اور کبھی کبھی مچھلی اور گوشت بھی بس چٹنی کے طور پر استعمال کر لیا جاتا ہے، ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے کھاتے پیتے گھرانوں میں پھنے ہوئے گیہوں کے آٹے کی چپاتیاں اور چاول استعمال ہوتا ہے اور عام لوگوں میں جوار، باجرہ، مکئی اور دوسرے موٹے اناج کی روٹی کھائی جاتی ہے۔

پورے ہندوستان میں سبزی، دال، مچھلی، اور گوشت وغیرہ محض روٹی یا چاول کو لذیذ بنانے کی غرض سے استعمال کیا جاتا ہے اسی غرض سے سنسکرت میں اسے "وینجن" کہتے ہیں۔ یعنی لذت غذا پنجاب، راجپوتانہ اور دکن کے امراء اور شہزادے اگرچہ ہر دن انواع و اقسام کا گوشت استعمال کرتے ہیں، لیکن ان کی خاص غذا روٹی یا چاول ہی ہوتی ہے، وہ شخص جو روزانہ آدھ سیر گوشت کھاتا ہے، وہ قدرتی طور پر اس گوشت کے ساتھ سیر بھر روٹی بھی کھا جاتا ہے۔

اسی طرح مغرب میں غریب ممالک کے عام لوگوں کی خصوصیت سے دولتمند علاقوں کے غریب لوگوں کی خاص غذا روٹی اور آلو ہے گوشت شاذونادر ہی استعمال کیا جاتا ہے، اور اگر کبھی استعمال کیا جاتا ہے تو بس چٹنی کی طرح! اسپین، پرتگال، اٹلی اور نسبتاً دوسرے گرم ممالک میں انگور افراط سے ہوتا ہے اور انگور کی شراب بہت ارزاں ہوتی ہے، ان شرابوں میں نشہ نہیں ہوتا، مطلب یہ کہ جب تک یہ شراب بہت کافی مقدار میں نہ پی جائے اس وقت تک نشہ نہیں ہوتا، اور یہ شراب بہت زیادہ صحت بخش ہوتی ہے لہٰذا ان ممالک کے غریب لوگ انگور کا رس، مچھلی اور گوشت کی بجائے استعمال کرتے ہیں، لیکن یورپ کے شمالی حصوں میں، مثال کے طور پر روس، سویڈن اور ناروے وغیرہ میں غریب لوگوں کی خوراک میں رائی کی بنی ہوئی روٹی، آلو اور خشک مچھلی ہوتی ہے۔

یورپ کے دولت مند طبقات اور امریکہ کے تمام طبقات کی خوراک بالکل ہی مختلف ہے یعنی یہ کہ ان کی خاص غذا مچھلی اور گوشت ہے اور وہ روٹی، چاول اور دال اور دوسری اشیاء بس چٹنی کے طور پر استعمال کرتے ہیں، امریکہ میں روٹی بہت کم استعمال کی جاتی ہے جب مچھلی ہوتی ہے تو بس مچھلی ہی کھائی جاتی ہے، گوشت ہوتا ہے تو بس گوشت ہی کھایا جاتا ہے اس کے ساتھ روٹی یا چاول استعمال نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا پلیٹیں بدلنی ضروری ہوتی ہے اگر دس اقسام کے کھانے ہوتے ہیں تو دس بار پلیٹ بدلنی ہوتی ہے۔ کاش ہمارے یہاں بھی اسی طرح کھانا کھایا جانے لگے ــ فرض کیجئے کہ جب گوشت (مرچ دار شوربہ) کھایا تو ایک پلیٹ میں اور جب دال کھانے کی نوبت آئی تو پہلی پلیٹ بدل کر دوسری پلیٹ لے لی، اسی طرح چاول یا لوچی کھانے کے لئے دوسری پلیٹ لے لی، اس طریقہ کا ایک فائدہ یہ ہے کہ مختلف اقسام کے کھانے ہوں تو ہر قسم کے کھانے میں سے تھوڑا تھوڑا کھایا جاتا ہے اور ایک شخص اس بات سے بچ جاتا ہے کہ وہ کسی چیز کو زیادہ کھا لے فرانسیسی باشندے صبح کے ناشتہ میں کافی، مکھن کے ساتھ ڈبل روٹی کا ایک یا دو سلائس، مچھلی اور گوشت وغیرہ لیتے ہیں، دوپہر میں تھوڑی بہت غذا لے لیتے ہیں لیکن ان کا اصل کھانا رات کے وقت ہوتا ہے، سپین اور اٹلی کے باشندوں میں بھی

یہی رواج ہے، جرمن باشندے زیادہ کھاتے ہیں، دن میں پانچ چھ بار اور ہر مرتبہ ان کے کھانے میں گوشت ہوتا ہے، انگریز دن میں تین بار کھاتے ہیں، ان کا صبح کا ناشتہ مختصر ہوتا ہے، بس چائے یا کافی، امریکن بھی بس تین ہی بار کھاتے ہیں، لیکن ہر بار ان کے کھانے کی مقدار میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور ان کھانوں میں گوشت کی مقدار بہت کافی ہوتی ہے ان تمام ممالک میں بہر حال ڈنر (DINNER) خصوصی کھانے کی حیثیت رکھتا ہے، امرا کے گھرانوں میں فرانسیسی باشندے باورچی کا کام کرتے ہیں اور ان کے کھانے فرانسیسی ڈھنگ سے تیار کئے جاتے ہیں، ان کے کھانے کی ابتدا بھنی ہوئی نمکین مچھلی یا سبزی یا کسی قسم کی چٹنی سے ہوتی ہے، یہ چیزیں درحقیقت ایک طرح کا چورن ہوتی ہیں اور چورن ہی کا کام کرتی ہیں، اس کے بعد شوربہ کا نمبر آتا ہے، پھر پھل وغیرہ چلتے ہیں جو آجکل کا فیشن ہے، اس کے بعد پھر مچھلی کا نمبر آتا ہے، پھر گوشت کا سالن، اس کے بعد بھنا ہوا گوشت اور اس کے ساتھ ترکاری، اس کے بعد پرندہ کا گوشت، وغیرہ، پھر کوئی میٹھی چیز اور آخر میں لذیذ آئس کریم! امرا کے گھرانوں میں کھانے کی میز پر جیسے جیسے کھانے بدلتے جاتے ہیں ایسے ہی ویسے کھانوں کا ذائقہ بدلنے کے لئے شراب بھی بدلتی جاتی ہے، پاک کلیرٹ اور برف میں لگی ہوئی شیمپین، انواع و اقسام کے کھانوں کے ساتھ ساتھ پیش کی جاتی ہے جس طرح ایک کھانے کے بعد دوسرا کھانا پیش کیا جاتا ہے، اسی طرح ایک کے بعد دوسری شراب پیش کی جاتی ہے، پلیٹ کے ساتھ ہی ساتھ چمچے، کانٹے اور چھری بھی بدل جاتی ہے، ڈنر کے بعد دودھ کے بغیر کافی اور بہت ہی چھوٹے ساغروں میں شراب آتی ہے، اور سب کے آخر میں سگریٹ پیش کیا جاتا ہے، انواع و اقسام کے کھانوں کے ساتھ جتنی زیادہ مقدار میں شراب پیش کی جائے گی، میزبان کو اتنا ہی امیر و غنی تصور کیا جائے گا۔ یہ اس کی دولتمندی کی ایک علامت ہوگی، ان کے یہاں ڈنر پر جتنا روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں تو درمیانی درجہ کا دولتمند آدمی اتنا روپیہ خرچ کرنے پر کنگال ہو کر رہ جائے گا۔

زمین پر بچھی ہوئی چھوٹی سی چوکی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھنا، اور اپنی پشت ایک لکڑی کے بنے ہوئے اڈے سے ٹیک کر، دھات کی بنی ہوئی تھالی میں جو چھوٹے سے سٹول پر رکھی ہوتی تھی آریاؤں کے کھانا کھانے کا طریقہ تھا، پنجاب، مہاراشٹر، راجپوتانہ اور گجرات میں اب بھی یہ طریقہ رائج ہے، بنگال، اڑیسہ، تلنگانہ اور مالا بار وغیرہ میں لکڑی کے سٹولوں پر تھال رکھ کر کھانے کا رواج نہیں رہا ہے بلکہ یہ لوگ تھال یا کیلے کے پتے زمین پر رکھ کر کھانا کھاتے ہیں، یہاں تک کہ مہاراجہ میسور بھی زمین پر ہی تھال رکھ کر کھانا کھاتے ہیں، مسلمانوں میں دسترخوان بچھانے کا رواج ہے، وہ دسترخوان کے ارد گرد بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں، برمی اور جاپانی باشندے بھی اپنے کھانے کی تھالی زمین پر رکھ کر کھاتے ہیں اور اکڑوں بیٹھتے ہیں، وہ ہندوستانیوں کی طرح آلتی پالتی مار کر نہیں بیٹھتے، چینی کرسیوں پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں، اور ان کا کھانا میز پر چنا جاتا ہے، وہ کھانا کھانے کے لئے چمچے کی جگہ لکڑی کی تیلیاں استعمال کرتے ہیں، زمانۂ قدیم میں رومی اور یونانی کوچ پر بیٹھتے تھے، اور میز پر کھانا کھاتے تھے، لیکن چمچے کا رواج نہیں تھا، وہ اپنی انگلیوں سے کھانا کھاتے تھے، یورپین کرسیوں پر بیٹھتے ہیں اور میز پر کھانا کھاتے ہیں، وہ ہاتھ سے بھی ایک زمانہ میں کھانا کھایا کرتے تھے، لیکن اب چمچہ، کانٹا اور چھری استعمال کرتے ہیں، چینیوں کے کھانے کا جو طریقہ ہے اس میں سچ مچ بڑی مہارت کی ضرورت ہے، جس طرح ہمارے یہاں کے تنبولی اپنے ماہر ہاتھوں سے لوہے کی دو پتلی تیلیوں سے پان کے پتے کترتے ہیں اسی طرح چینی بھی دو تیلیاں اپنی دو انگلیوں میں اور سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی کے درمیان دبا کر ایسا عمل کرتے ہیں، جیسے کسی کی زبان

سبزی کو اس کے حلق تک پہنچاتی ہے، اسی طرح چاول کا پیالہ اپنے منہ کے قریب لاکر، وہ ان دونوں ہتیلیوں سے چاول کو اس طرح اُچھالتے ہیں کہ ان کے منہ میں چاول کی بارش سی ہونے لگتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ہر قوم کے آباؤ اجداد وہ سب چیزیں کھا لیا کرتے تھے جو انہیں میسر آتی تھیں، جب وہ کسی بڑے جانور کو مار لیا کرتے تھے تو اس کا گوشت ایک ماہ تک استعمال کرتے رہتے تھے، اور اگر یہ گوشت سڑ بھی جاتا تھا۔ تو بھی وہ اس کے کھانے سے پرہیز نہیں کرتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ وہ متمدن و مہذب ہوتے گئے۔ اور انہوں نے کاشتکاری سیکھی، ابتدا میں شکار وغیرہ کے ذریعہ انہیں روزانہ کھانا نہیں ملا کرتا تھا، . . . . . . . ایک دن انہیں اگر کوئی جانور شکار میں ہاتھ لگ گیا تو انہوں نے پیٹ بھر لیا۔ پھر تین تین چار چار دن فاقہ کرتے ہوئے بسر ہو گئے! انہیں ہر ہفتہ چار چار یا پانچ پانچ دن فاقہ کرنا پڑتا تھا، لیکن جب انہیں کاشتکاری آ گئی تو انہیں اپنی اگائی ہوئی فصلوں کی وجہ سے روزانہ غذا ملنے لگی، لیکن وہ اس زمانہ میں بھی ماضی کی یادگار کے طور پر سڑا ہوا گوشت اور اسی طرح کی دوسری چیزیں کھایا کرتے تھے، پہلے پہلے تو سڑا ہوا گوشت غذا کا ضروری جزو سمجھا جاتا تھا، اب اس کی جگہ چٹنی یا اسی طرح کی کسی دوسری لذیذ چیز نے لے لی ہے، اسکیمو برفانی علاقوں میں رہتے ہیں، جہاں اناج کی کوئی فصل نہیں ہوتی، لہٰذا ان کا روزانہ کا کھانا یا تو مچھلی ہے یا گوشت ہے، جب ان کے منہ کا ذائقہ کسی وجہ سے خراب ہو جاتا ہے تو وہ اس ذائقہ کو ٹھیک کرنے کی غرض سے سڑا ہوا گوشت استعمال کرتے ہیں، اس زمانہ میں بھی یورپین باشندے پرندوں کا گوشت فوراً شکار کرنے کے بعد نہیں کھاتے، بلکہ شکار کئے ہوئے پرندوں کو دھوپ میں لٹکا دیتے ہیں اور جب ان کے گوشت میں سڑنے کی تھوڑی سی بو پیدا ہو جاتی ہے تو اسے استعمال میں لاتے ہیں۔ کلکتہ میں ہرن کا سڑا ہوا گوشت جیسے ہی بازار میں آتا ہے ویسے ہی فروخت ہو جاتا ہے، اور لوگ اس مچھلی کو خریدنا زیادہ پسند کرتے ہیں جو تھوڑا سا سڑ گئی ہو، یورپ کے بعض علاقوں میں اس پنیر کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے جو تھوڑا سا بودار ہوتا ہے، اس پنیر کو بہت لذیذ تصوّر کیا جاتا ہے

سبزی خور تک تھوڑی سی پیاز اور ادرک کا استعمال پسند کرتے ہیں، جنوبی ہندوستان کے براہمن تک ان چیزوں کو اپنے کھانے میں استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ہندو شاستروں میں ان چیزوں کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا ہے اور پیاز وغیرہ کے استعمال کو اس حد تک پاپ قرار دیا گیا ہے۔ خصوصیت سے ایک جانی براہمن کے لئے کہ اس کے استعمال سے اس کی جاتی تک ختم ہو جاتی ہے لہٰذا کٹر ہندوؤں نے پیاز، لہسن وغیرہ کا استعمال ترک کر دیا۔ اور ان کی جگہ زیرہ وغیرہ کا استعمال شروع کر دیا۔ جس کی بو ان دونوں چیزوں کی بو سے بھی کچھ زیادہ تیز ہوتی تھی، پہاڑی علاقوں میں رہنے والے براہمنوں نے ایک طرح کی خشک گھاس ادرک کی جگہ استعمال کرنی شروع کر دی، جس کی بو بہت تیز ہوتی ہے، اس میں بُرائی بھی کیا ہے؟ قدیم کتابوں میں ان چیزوں کے استعمال کی کوئی ممانعت نہیں ہے،

ہر دھرم میں کھانے پینے سے متعلق کچھ ضابطے ہیں، کچھ کھانوں کی اجازت دی گئی ہے، کچھ کو ممنوع قرار دیا گیا ہے اس معاملہ میں صرف عیسائی ہی سب سے الگ ہیں۔ ان کے یہاں کھانے پینے کی چیزوں پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی ہے جینی اور بدھ کسی حال میں بھی گوشت اور مچھلی نہیں کھا سکتے یعنی آلو، شکر قند اور اسی طرح زمین میں پیدا ہونے والا کوئی بھی پھل نہیں کھا سکتے۔ اس لئے کہ ان کو کھودتے وقت کسی جیو کی ہتیا ہونے کا ڈر رہتا ہے۔ وہ رات کے وقت کھانا بھی نہیں کھاتے مبادا ان کے منہ میں اندھیرا ہونے کی بنا پر کوئی کیڑا نہ چلا

یہودی وہ مچھلی نہیں کھاتے جس پر فلس نہ ہوں، وہ سور کا گوشت بھی نہیں کھاتے اور ان جانوروں کا گوشت بھی نہیں کھاتے جو جگالی نہ کرتے ہوں، مزید براں جس باورچی خانہ میں مچھلی تیار ہوتی ہو، اس میں اگر دودھ یا دودھ سے بنی ہوئی کوئی چیز لائی جائے تو یہودی سب چیزیں اٹھا کر پھینک دیں گے گویا کوئی بھی چیز ان کے کھانے کے قابل نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ کٹر یہودی دوسری اقوام کے ہاتھ کا بنایا ہوا کھانا استعمال نہیں کرتے، ہندوؤں کی طرح یہودی بھی عام ذبیحہ کا گوشت نہیں کھاتے، وہ صرف قربانی کا گوشت کھاتے ہیں، پنجاب اور بنگال میں دیوتاؤں کو بھینٹ چڑھائے جانے والے گوشت کا دوسرا نام "مہا پرساد" ہے یعنی عظیم تبرک۔ یہودی وہ گوشت نہیں کھاتے جو عظیم تبرک کی تعریف میں نہ آتا ہو، مطلب یہ کہ اس جانور کا گوشت جس کی خدا کے نام پر قربانی نہ کی گئی ہو، لہٰذا عام ہندوؤں کی طرح یہودیوں کو بھی ہر جگہ اور ہر دکان سے گوشت خریدنے کی اجازت نہیں ہے، مسلمانوں میں بھی بہت سے ایسے خود الطرائج ہیں جو یہودیوں کے ضابطوں سے ملتے جلتے ہیں لیکن یہودیوں کی طرح مسلمان انتہا پسند نہیں ہیں، وہ بے شک دودھ مچھلی یا گوشت ایک ساتھ نہیں کھاتے، لیکن ایک ہی باورچی خانہ میں یہ سب چیزیں رکھی ہوں یا ایک چیز سے دوسری چیز چھو جائے تو اس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ یہودی اور ہندو جن وجوہ سے کھانے کو بیکار اور ناقابل استعمال قرار دیتے ہیں، ان وجوہ میں یکسانیت پائی جاتی ہے، یہودی جنگلی سور کا گوشت نہیں کھاتے، جو ہندو کھا لیتے ہیں۔ پنجاب میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان زبردست تنازعہ ہونے کی بنا پر جو کام ایک کرتا ہے وہ دوسرا نہیں کرتا، چنانچہ ہندوؤں کی غذا میں جنگلی سور بہت ضروری چیز بن کر رہ گیا ہے، راجپوتانہ میں سور کا شکار اور اس کا گوشت کھانا ایک طرح سے دھرم کا جزو بن کر رہ گیا ہے، سوائے برہمنوں کے دکن کے تمام طبقات میں پالتو سور کا گوشت کھانے کا بھی رواج ہے۔ ہندو جنگلی مرغ بھی کھاتے ہیں لیکن پالتو مرغ کا گوشت نہیں کھاتے۔

بنگال سے نیپال تک اور ہمالیائی علاقہ میں سرحد کشمیر تک ہندوستانی عوام میں جہاں تک خوراک کا تعلق ہے یکساں ضابطے پائے جاتے ہیں، ان حصوں میں آج تک بھی زیادہ تر وہی ضابطے مروج ہیں جو منو نے وضع کیے ہیں، لیکن کمایوں سے کشمیر تک کے علاقوں میں ان ضابطوں کی پابندی بنگال، بہار، الہ آباد یا نیپال کی بہ نسبت زیادہ کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر بنگالی مرغ یا مرغی کا انڈا نہیں کھاتے، لیکن وہ بطخ کا انڈا کھا لیتے ہیں، اسی طرح نیپالی بھی، لیکن کمایوں سے اوپر کے علاقوں میں بطخ کا انڈا کھانے کا بھی رواج نہیں ہے۔ کشمیری جنگلی بطخ کا انڈا بڑی خوشی سے کھاتے ہیں لیکن پالتو مرغی کا انڈا نہیں کھاتے۔ الہ آباد سے شروع ہونے والے علاقوں میں سوائے ہمالیائی علاقوں کے وہ سب ہی لوگ جو بکرے کا گوشت استعمال کرتے ہیں، مرغ کا گوشت بھی کھا لیتے ہیں۔

خوراک کے معاملہ میں یہ سب ضابطے اور امتناعی احکام، اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اچھی صحت کے نقطہ نگاہ کے تابع ہیں، اور ایک ایک چیز کے بارے میں قطعی طور پر یہ متعین کرنا یقیناً بہت دشوار ہے کہ کونسی چیز صحت بخش ہوتی ہے اور کونسی چیز نہیں ہوتی۔ بطخ اور مرغ ہر طرح کی چیز کھا لیتے ہیں۔ اور بہت ہی غلیظ رہتے ہیں، لہٰذا ان کو ممنوع قرار دیا گیا۔ کوئی شخص یہ دیکھتا نہیں کہ وحشی جانور جنگلوں میں کیا چیز کھاتے ہیں، لہٰذا ان کا گوشت کھانا ممنوع نہیں کیا گیا۔ مزید براں پالتو جانوروں کی بہ نسبت جنگلی جانور زیادہ صحت مند رہتے ہیں اور کم بیمار ہوا کرتے ہیں۔ دودھ بڑی مشکل سے ہضم ہوتا ہے خصوصیت

اس طرح پینا چاہیئے جیسے بچہ ماں کی چھاتی سے پیتا ہے یعنی چسکی لے لے کر۔ اس طرح اگر آہستہ آہستہ دودھ پیا جائے تو اس کا ہضم کرنا آسان ہوگا، ورنہ نہیں۔ ایک تو وہ خود دیر ہضم ہوتا ہے لیکن جب گوشت کے ساتھ اسے بھی کھایا جائے تو وہ اور زیادہ دیر ہضم ہو جاتا ہے لہٰذا یہودیوں میں گوشت کے ساتھ دودھ کا استعمال قطعی طور پر ممنوع ہے۔

(The first line, which begins at the right edge with "دودھ" and continues onto the line below:) سے جب کسی شخص کے معدہ میں تیزابیت پیدا ہو رہی ہو تو دودھ کا صرف ایک گلاس ڈگڈگا کر پی لینا اس کی زندگی کو بسا اوقات خطرہ میں ڈال دیتا ہے۔ دودھ

بے وقوف اور جاہل ماں جو اپنے بچے کو زبردستی زیادہ سے زیادہ دودھ پلاتی ہے چند ہی ماہ بعد اپنی چھاتی اس صدمہ سے کوٹنے لگتی ہے کہ اس کے بچے کی زندگی خطرہ میں پھنس جاتی ہے۔ اس زمانہ کے طبی ماہرین پکی عمر کے لوگوں کے لئے بھی یہ تجویز کرتے ہیں کہ انہیں زیادہ سے زیادہ ایک پنٹ دودھ استعمال کرنا چاہیئے اور وہ بھی جب ایک پنٹ دودھ پی رہے ہوں تو اسے آہستہ آہستہ چسکی لے لے کر پئیں! بچوں کو دودھ پلانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں دودھ کی شیشی کے ذریعہ دودھ پلایا جائے۔ ہمارے یہاں گرہستن مائیں چونکہ امور خانہ داری میں بے حد مصروف رہتی ہیں لہٰذا اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دودھ کے لئے روتے ہوئے بچوں کو ملازمہ نے اپنی گود میں لے لیا اور اسے چمچے کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ مقدار میں دودھ پلا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچوں کو جگر کی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں اور ان کی نشو و نما متاثر ہوتی ہے۔ یہ دودھ ہی بچے کے لئے لعنت ثابت ہوتا ہے، اگر بچہ میں جینے کی غیر معمولی دفاعی طاقت نہیں ہے تو اس کا جینا محال ہو جاتا ہے اور اس خطرناک طریقہ پر غذا لے کر وہ تب ہی زندہ رہتا ہے جب اس میں زندہ رہنے کی بے پناہ توانائی ہوتی ہے۔ ذرا قدیم طرز کے ان زچہ خانوں کو دھیان میں لائیے جن میں بچوں کی مائیں بچوں کی مالش اور سینکائی کیا کرتی تھیں اور اسی طرح کے فطری علاج ہوا کرتے تھے۔ یہ بہت ہی حیرتناک طریقہ تھا، اور اسے زچہ اور بچہ دونوں کے لئے ایشور کا کرم سمجھنا چاہیئے کہ وہ سخت ترین آزمائش سے گزر کر بھی صحتمند اور توانا رہا کرتے تھے۔

---



# پوشاک ولباس

ہر ملک و قوم میں ایک شخص کی عزت کا دار و مدار بڑی حد تک اس کی پوشاک پہ ہوتا ہے۔ بنگال کے دیہی باشندوں کی کہاوت ہے کہ جب تک یہ پتہ نہ چلے کہ ایک آدمی کے پاس کتنا پیسہ ہے اس وقت تک ایک شریف کو ایک رذیل سے تمیز کرنا ممکن ہی نہیں ہے اور نہ صرف روپیہ بلکہ ایک شخص کی شرافت کو پہچاننے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کیسا لباس پہنتا ہے ساری دنیا میں کم و بیش ایسی ہی بات پائی جاتی ہے۔ بنگال میں محض دھوتی پہن کر کوئی شخص سڑکوں پہ گھوم پھر نہیں سکتا۔ ملک کے دوسرے حصوں کے لوگ سر پہ پگڑی رکھے بغیر گھر سے باہر نہیں نکلتے۔ مغرب میں فرانس کے لوگ ہر چیز اور ہر کام میں پیشقدمی کرتے ہیں، ان کے کھانے اور ان کے لباس کی دوسرے لوگوں میں نقل اتاری جاتی ہے۔ اب بھی اگرچہ یورپ کے مختلف حصوں میں اپنی اپنی خاص وضع اور خاص خاص طرز کی پوشاک پہنی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود جب بھی ایک شخص کے پاس کافی پیسہ آجاتا ہے اور وہ جنٹلمین بنتا ہے تو اپنی مقامی وضع کی پوشاک اتار پھینکتا ہے اور اس کی جگہ فرانسیسی وضع کا لباس زیب تن کر لیتا ہے۔ ڈچ کسان جس کا مقامی لباس کابلیوں یعنی پٹھانوں کی شلوار سے ملتا جلتا ہے، یونانی جو پوری سکرٹ پہنتے ہیں، روسی جن کا لباس تبتی فیشن سے مشابہ ہوتا ہے جیسے ہی جنٹیل[1] بنتے ہیں ویسے ہی فرانسیسی وضع کا کوٹ اور پتلون پہننا شروع کر دیتا ہے۔ عورتوں کے متعلق تو کچھ کہنا ہی بیکار ہے جیسے ہی ان کے پاس دولت آتی ہے ویسے ہی وہ اپنا لباس پیرس میں تیار کرانے کی ہر ممکن کوشش کرنے لگتی ہیں۔ امریکہ، انگلینڈ، فرانس اور جرمنی مغرب میں دولتمند ملک ہیں۔ یہ سب کے سب فرانسیسی فیشن پہ مرتے ہیں اور یورپ کے ہر حصے میں آہستہ آہستہ فرانسیسی فیشن فروغ پاتا جا رہا ہے۔ پورا یورپ فرانس کی نقالی میں مبتلا ہے اور اس کی ایک نقل دکھائی دیتا ہے۔ بہر حال مردانہ لباس پیرس کی بہ نسبت اب لندن میں زیادہ بہتر طریقہ پہ تیار ہونے لگا ہے۔ لہٰذا مردوں کو "لندن میڈ"[2] لباس استعمال کرنے کے لئے دستیاب ہو جاتا ہے اور عورتیں پیرس کی وضع استعمال کرتی ہیں۔ جو لوگ بہت امیر ہیں وہ ان دونوں مقامات سے اپنا لباس منگواتے ہیں۔ امریکہ بدیشی لباسوں پہ کڑا ٹیکس لگاتا ہے لیکن اس کے باوجود امریکن عورتیں پیرس اور لندن سے اپنا لباس منگوا کے ہی رہتی ہیں۔ یہ صرفہ صرف

---

ح ۱ "genteel", ح ۲ "London-made"

---

صفحہ ۴۸

مشرق و مغرب

امریکن ہی برداشت کرنے کی تاب لاسکتے ہیں۔ اس لئے کہ ان دنوں امریکہ دولت کے دیوتا "کوبیر"[1] کے لئے خصوصی وطن کی حیثیت رکھتا ہے۔

قدیم آریہ دھوتی اور چادر[2] پہنتے تھے گشتری میدانِ جنگ میں پاجامہ اور کوٹ استعمال کیا کرتے تھے، لیکن روزمرہ کی زندگی میں دھوتی اور چادر کو استعمال میں لایا کرتے تھے اور سر پہ پگڑی باندھتے تھے۔ یہی لباس اب بھی رائج ہے، سوائے بنگال کے ملک کے باقی تمام علاقوں کے لوگ اپنے لباس کو اتنی زیادہ اہمیت نہیں دیتے جتنی اہمیت اپنی پگڑی کو دیتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں مرد وزن، دونوں میں یہی رواج تھا گوتم بدھ کے عہد کی جو مورتیاں یا سنگ تراشی کے نمونے ملتے ہیں ان کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ عورتیں اور مرد کپڑے کا محض ایک ٹکڑا بطور لباس استعمال کیا کرتے تھے۔ مہاتما بدھ کے والد تک اگرچہ وہ راجہ تھے بعض پتھر کی بنی ہوئی تصاویر میں اپنے تخت پر بیٹھے ہوئے دکھائے گئے ہیں لیکن وہ بھی ایسا ہی لباس پہنے ہوئے ہیں اور مہاتما بدھ کی ماں بھی اسی لباس ہی میں ملبوس دکھائی دیتی ہیں۔ بے شک وہ کچھ زیورات وغیرہ بھی پہنے ہوئے ہیں لیکن لباس یکساں ہے۔ البتہ ان پتھر کی تصویروں میں جتنے لوگ بھی دکھائی دیتے ہیں وہ سب کے سب اپنے سروں پہ پگڑی باندھے ہوئے ہیں۔ بدھ شہنشاہ اشوک کو پتھر کی بنی ہوئی ایک تصویر میں نقارہ کی ساخت کی ایک نشست پر بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے اور اس کا لباس یہ ہے کہ وہ دھوتی باندھے ہوئے ہیں اور اپنے کندھے پر ایک چادر ڈالے ہوئے ہیں، ان کے روبرو رقاصہ لڑکیاں ناچ رہی ہیں اور وہ ناچ دیکھ رہے ہیں، یہ ناچنے والی لڑکیاں بہت ہی مختصر لباس پہنے ہوئے ہیں، ان کے لباس میں نہایت باریک ترین کپڑے کے ٹکڑے استعمال ہوئے ہیں جو ڈھیلے ڈھالے انداز میں ان کے سینہ پر پڑے ہوئے ہیں لیکن نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کے سروں پہ بھی پگڑی موجود ہے اور یہ پگڑی ہی ان کے لباس کا خصوصی جزو ہے، شاہی دربار کے اعلیٰ افسر بہرحال بہت ہی شاندار پاجاموں اور چوغوں یا لمبے کوٹوں میں ملبوس ہیں، جب راجہ "نل" نے رتھبان کا بھیس بدل کر راجہ رتیو پرن King Rituparna کا رتھ چلایا تھا۔ تو اس نے اس تیزی اور اس رفتار سے رتھ ہانکا تھا کہ راجہ رتیو پورن کے کندھے پر پڑی ہوئی چادر اڑ کر دور جا گری تھی، اور وہ چونکہ اپنی شادی کے لئے ایک سوئمبر میں شرکت کی غرض سے جا رہے تھے، لہٰذا یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ سوئمبر میں چادر کے بغیر ہی شریک ہوئے تھے، دھوتی اور چادر اس زمانہ کے معزز آدمیوں کا لباس تھا، چنانچہ اب تک کسی دھارمک تقریب کے وقت ہندو رواجاً دھوتی اور چادر ہی استعمال کرتے ہیں۔

قدیم یونانیوں اور رومیوں کا لباس بھی دھوتی اور چادر ہی تھا ــــــ دھوتی کپڑے کا ایک لمبا ٹکڑا اور چادر اس سے نسبتاً چھوٹا ٹکڑا جو ٹوگا کہلاتا تھا، اور شاید اس لفظ ٹوگا سے چوغہ نکلا ہے بسا اوقات وہ قمیض بھی پہنتے تھے مگر لڑائی کے میدانوں میں وہ پاجامہ اور کوٹ پہنا کرتے تھے عورتوں کا لباس ایک لمبا اور کافی چوڑا کپڑا ہوا کرتا تھا، بالکل اس قسم کا جیسے لمبان اور چوڑان برابر کرنے کے

---

[1] Kubera.

[2] دھوتی چاریا پانچ گز لمبے کپڑے کا ایک ٹکڑا ہوتی ہے جو ہندوستانی پاجامے یا چسٹس وغیرہ کی بجائے استعمال کرتے ہیں اور زیر ناف حصہ کو چھپانے کے لئے اسے اپنی کمر میں پہنتے ہیں تاکہ ٹانگیں اور رانیں وغیرہ چھپ جائیں چادر تین گز لمبے کپڑے کا ایک ٹکڑا ہوتی ہے جو اوپری حصہ پر ڈال لی جاتی ہے۔

لئے دو کپڑے برابر سے سی لئے جائیں۔ اس کپڑے کو وہ سر پہ ڈالتی تھیں اور ایک بار اسے اپنی کمر سے باندھتی تھیں اور پھر اسے دوسری بار اپنے کولہوں پہ باندھتی تھیں۔ اس کے بعد وہ اپنے اوپری حصّہ پہ جو کھلا ہوتا تھا، یہ کپڑا باندھتی تھیں خصوصیت سے اپنے دونوں بازوؤں پہ اس کپڑے کو بڑی بڑی پنوں ( pins ) کی مدد سے باندھتی تھیں۔ اسی قسم کا لباس اب بھی شمالی ہمالیہ کے پہاڑی قبائل کی عورتوں میں مروج ہے، اور وہ اپنے کمبل اسی انداز سے استعمال کرتی ہیں، اس لمبے لباس پہ ایک چادر بھی ہوتی تھی اور یہ لباس بہت ہی سادہ اور خوشنما ہوتا تھا۔

صرف ایرانی لوگ ہیں جو زمانہ قدیم سے وضعدار لباس استعمال کر رہے ہیں، لباس کی یہ وضع انہوں نے غالباً چینیوں سے سیکھی تھی، لباس کی تہذیب وضع اور تراش خراش کے فن میں چینی پہلے معلم کی حیثیت رکھتے ہیں اور وہی ہیں جو آرام و آسائش اور زینت و آرائش کی دوسری چیزوں کے بھی پہلے استاد کہے جاتے ہیں۔ قبل از تاریخ کے زمانہ سے چینی باشندے کرسیوں پہ بیٹھ کر میز پہ اپنا کھانا کھایا کرتے تھے اور چمچے وغیرہ بھی استعمال کرتے تھے۔ وہ مختلف النوع لباس استعمال کرتے تھے، جن میں کوٹ، ٹوپی اور پاجامہ وغیرہ شامل تھا۔

ایران فتح کرنے کے بعد سکندرِ اعظم نے بھی یونان کی قدیم طرز کی دھوتی پہننا ترک کر دی تھی۔ اور اس نے دھوتی کی جگہ پاجامہ استعمال کرنا شروع کر دیا تھا، اس بات پہ اس کے یونانی سپاہی اس قدر بر افروختہ ہوئے کہ قریب تھا کہ وہ اس کے خلاف بغاوت کر دیں لیکن سکندر ایسا آدمی نہیں تھا کہ وہ ان سے دب جاتا چنانچہ اس نے اپنے اقتدار کی طاقت کے بل پہ پاجامہ اور کوٹ بطور فیشن رائج کر دیا۔

گرم آب و ہوا میں لباس کی اتنی ضرورت محسوس نہیں ہوتی محض کپڑے کے ایک ٹکڑے سے نفاست پسندی کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے دوسرے لباس تو بس شان و شوکت کے اظہار کے لئے ہوتے ہیں۔ سرد ممالک میں لباس ایک ناگزیر ضرورت ہے، جس زمانہ میں سرد ممالک کے لوگ متمدن و مہذب نہ تھے اس زمانہ میں وہ اپنے جسم جانوروں کی کھالوں سے چھپایا کرتے تھے لیکن جیسے جیسے وہ متمدن و مہذب ہوتے گئے وہ کمبل استعمال کرنے لگے اور بتدریج وضعدار لباسوں کا رواج شروع ہوا جیسے پتلون اور کوٹ وغیرہ! ٹھنڈے ممالک میں زیورات کی خوبصورتی کی نمائش، اگر وہ ننگے بدن پہ پہنے جائیں تو شاید ممکن ہی نہیں ہے، اس لئے کہ سردی کی وجہ سے یہ زیورات بیحد ٹھنڈے ہو جاتے ہیں، اس لئے زیورات کا شوق لباس کے شوق سے بدل گیا ہے، جس طرح ہندوستان میں گاہے بہ گاہے زیورات کا فیشن بدلتا رہتا ہے اسی طرح مغرب میں لباس کا فیشن لمحہ بہ لمحہ بدلتا رہتا ہے۔

لہٰذا سرد ممالک میں رواج کے طور پر کوئی بھی شخص کسی دوسرے کے سامنے اس وقت تک نہیں آتا جب تک کہ وہ سر سے پاؤں تک باقاعدہ لباس میں ملبوس نہ ہو، لندن میں ایک شخص یا ایک عورت اس وقت تک باہر نہیں جا سکتی جب تک کہ اس کا لباس سوسائٹی کے تقاضوں کے مطابق ٹھیک نہ ہو، مغرب میں ایک عورت کا جراب نہ پہننا، سوسائٹی میں بغیر جراب پہنے چلے آنا، اور اپنے عریاں پاؤں دکھانا بد تہذیبی و بے حیائی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن رقص کے دوران میں اگر ایک عورت اپنا چہرہ، اپنے بازو، اور اپنا سینا کھول دے تو یہ کوئی نامناسب بات نہیں ہے۔ اس کے برعکس ہمارے ملک میں ایک عورت کا بے گھونگھٹ یا بے نقاب ہونا بہت ہی معیوب سمجھا جاتا ہے، عورت کے پاؤں عریاں دکھائی دیں یعنی ان پہ جراب نہ ہو تو ہمارے یہاں یہ بات معیوب نہیں ہے مزید براں راجپوتانہ اور ہمالیہ میں عورتیں اپنا سارا تن چھپائے رہتی ہیں لیکن ان کا سینہ اور پیٹ کھلا رہتا ہے۔

---

مشرق و مغرب صفحہ ۵۰

مغرب میں اداکارہ، ایکٹریسیں اور رقاص لڑکیاں بہت ہی باریک لباس پہنتی ہیں تاکہ مرد ان کی جانب مائل و متوجہ ہوں ان کے ناچ کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ موسیقی کی لے کے ساتھ ساتھ ناچ کے دوران میں ان کے بدن کے اعضاء عریاں ہوتے جائیں۔ لیکن ہمارے ملک میں شریف النسب عورتیں خواہ اپنے لباس کا اتنا زیادہ خیال نہ رکھیں لیکن رقاص لڑکیوں کا جسم سر سے پاؤں تک لباس میں پوشیدہ ہوتا ہے، مغربی عورتیں ان کے اوقات میں پوری طرح ملبوس ہوتی ہیں، لہٰذا ان کی ساری توجہ اس بات پر لگی رہتی ہے کہ وہ مختصر سے مختصر لباس پہنیں۔ ہمارے یہاں کی عورتیں ہر وقت گھروں کے اندر رہتی ہیں اور بالعموم بہت زیادہ لباس استعمال کرتی ہیں لہٰذا ہماری ساری دلکشی اس بات پر منحصر ہے کہ زیادہ سے زیادہ لباس پہنا جائے۔

مالابار میں مرد اور عورتیں دونوں صرف لنگی استعمال کرتے ہیں۔ بنگال میں بھی دھوتی ہی رائج ہے لیکن مردوں کے سامنے عورتیں گھونگھٹ نکالتی ہیں اور اپنے جسم کو لباس کے اندر پوری طرح پوشیدہ رکھتی ہیں۔

سوائے چین کے تمام ممالک میں جہاں تک ستر پوشی اور شرم و حجاب کا تعلق ہے، میں نے کچھ ایسی انوکھی باتیں محسوس کی ہیں جنہیں ایک معمہ کہا جا سکتا ہے۔ بعض بعض باتوں میں تو شرم و حجاب کی کوئی حد ہی نہیں رہتی۔ لیکن ان باتوں کے برعکس دوسری باتوں میں جن میں زیادہ شرم و حجاب کیا جانا چاہیئے بالکل ہی شرم نہیں کی جاتی۔ چین میں مرد و زن دونوں ہی پورے لباس میں سر سے پاؤں تک ہر وقت ملبوس رہتے ہیں، چینی کنفیوشس کے پیرو ہیں یا گوتم بدھ کے ماننے والے ہیں اور ان کے اخلاقی ضوابط بہت سخت اور بہت نفیس ہیں۔ بیہودہ گوئی، فحش کتابیں یا تصویریں اور کم سے کم عریانیت بھی چین میں مستوجب سزا ہے اور ان باتوں کے مرتکب کو فوراً ہی سزا دی جاتی ہے۔ عیسائی مشنریوں نے چینی زبان میں بھی بائبل کا ترجمہ کیا ہے، لیکن بائبل میں بھی ہندوؤں کے اپنشدوں کی طرح بعض اجزاء اتنے عریاں ہیں جن پر شرم دلائی جاتی ہے، چنانچہ ان کے معیار سے گرے ہوئے اجزاء کو پڑھ کر چینی باشندے عیسائیت کے خلاف اس قدر برافروختہ ہوئے کہ انہوں نے یہ فیصلہ کر ڈالا کہ وہ اپنے ملک میں بائبل کو شائع کرنے کی ہرگز ہرگز اجازت نہیں دیں گے سونے پر سہاگہ یہ کہ مشنری عورتیں اپنے رات کے لباس میں ان چینیوں سے بہت گھل مل کر باتیں کرتی تھیں جو ان کے یہاں مدعو کئے جاتے تھے۔ اس بات پر سادہ لوح چینی باشندے بہت برہم ہوئے اور انہوں نے یہ شور مچایا کہ آخر یہ مصیبت کیا ہے؟ یہ دھرم ہمارے نوجوان لڑکے لڑکیوں کے اخلاق کو تباہ کر ڈالے گا، ان کو پڑھنے کے لئے اگر یہ بائبل دی گئی اور ان کو ان نیم عریاں چالاک عورتوں سے ملنے جلنے کا موقع ملا تو وہ آسانی سے ان کے حسن و جمال کا شکار بن جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ چینی باشندے عیسائیت سے اس قدر بیگانہ و بے پروا ہیں ورنہ وہ بالعموم دوسرے مذاہب کے ساتھ بڑی رواداری سے پیش آتے ہیں۔ اب میں نے سنا ہے کہ مشنریوں نے بائبل کا نیا ایڈیشن چھاپا ہے جس میں سے وہ حصے حذف کر دیئے گئے ہیں جن پر اعتراض کیا جاتا تھا۔ لیکن ان کے اس عمل سے چینیوں کے شبہات میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔

مزید برآں مغرب کے مختلف ممالک میں مروج تہذیب و تمیز کی قدروں میں فرق دکھائی دیتا ہے۔ انگریزوں اور امریکیوں میں اخلاق و تمیز اور شائستگی کی قدریں اگرچہ ایک سی ہیں لیکن فرانس کی قدریں کچھ اور ہیں تو جرمن کی قدریں کچھ اور ہیں۔ روسیوں اور ترکیوں میں بہت کچھ مشترک ہے لیکن ترکوں کی اخلاقی قدریں بالکل ہی جداگانہ اور مختلف ہیں۔

---

# اخلاق و آداب

یورپ اور امریکہ کے لوگ ہماری نسبت اپنی نجی زندگی میں بہت زیادہ راز داری برتتے ہیں، ہم سبزی خور ہیں لہٰذا ایک مقدار میں سبزیاں وغیرہ کھا لیتے ہیں اور چونکہ گرم ملک کے باشندے ہیں، لہٰذا ایک وقت میں پانی کے دو دو تین تین گلاس پی جاتے ہیں۔ بالائی صوبہ جات کے کسان دو دو پونڈ تک باجرہ کے ستو پھانک لیتے ہیں اور تب کنوئیں سے پانی کا ڈول کھینچ کر منڈیر پر پانی پینے کے لئے بیٹھ جاتے ہیں اور جب بھی انہیں پیاس لگتی ہے وہ خوب ڈٹ کر پانی پیتے ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں ہم پیاسوں کے لئے اپنے گھروں کے سامنے پیاؤ یا سبیل لگاتے ہیں اور بانس کے نل سے لوگوں کو پانی پلاتے ہیں۔ یہ سب باتیں خلوت میں کیسے ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا ہمارے یہاں خلوت پسندی کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا شیروں کے پنجروں کا گئوشالہ اور گھوڑوں کے اصطبل سے موازنہ کیجئے! کتے کا بکری سے مقابلہ کیجئے مغربی باشندوں کی خاص غذا گوشت ہے اور سرد ممالک کے لوگ شاذ و نادر ہی پانی پیتے ہیں اشراف بالعموم چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں تھوڑی تھوڑی شراب پیا کرتے ہیں فرانسیسی باشندے تو پانی سے نفرت کرتے ہیں، البتہ امریکن لوگ وافر مقدار میں پانی پیتے ہیں اس لئے کہ ان کا ملک بھی موسم گرما میں کافی گرم رہتا ہے نیویارک نسبتاً کلکتہ سے زیادہ گرم رہتا ہے۔ جرمن بئیر کافی مقدار میں پیتے ہیں لیکن کھانے کے ساتھ نہیں پیتے!

سرد ممالک کے لوگ ہمیشہ ہی اس اندیشہ میں مبتلا رہتے ہیں کہ کہیں سردی نہ کھا جائیں، لہٰذا ان کے لئے چسکی چسکی شراب پیتے رہنا ناگزیر ہے لیکن گرم ممالک کے لوگ کھانا کھاتے وقت کافی مقدار میں پانی بھی پیتے رہتے ہیں، لہٰذا ڈکار کا آنا قدرتی بات ہے، اب تمیزداری اور شائستگی کی بات لیجئے۔ اگر آپ کسی مغربی سوسائٹی میں ڈکار لیں تو آپ کا یہ قصور اتنا بڑا ہوگا کہ کبھی معاف نہیں کیا جائے گا، لیکن آپ اپنی جیب سے اپنا رومال لے کر زور زور سے ناک چھنکیں تو یہ کوئی معیوب بات نہیں ہے ہمارے یہاں جب تک آپ کو ڈکار نہ آ جائے، اس وقت تک میزبان اس بارے میں مطمئن نہ ہوگا کہ آپ نے پیٹ بھر کر کھانا کھا لیا ہے لیکن آپ دوسروں کے ساتھ کھانا کھاتے ہوں اور رومال کر ناک صاف کریں تو آپ جانتے ہی ہیں کہ آپ کی اس بات پر دوسرے لوگ کیا کہیں گے!

انگلستان اور امریکہ میں آپ بدہضمی یا پیٹ کے کسی دوسرے مرض کا عورتوں کے سامنے کوئی تذکرہ نہیں کریں گے لیکن کسی بوڑھی عورت کے

سامنے یا اپنی کسی خوب جان پہچان والی عورت کے سامنے اس طرح کے کسی مرض کا تذکرہ کر دینا کوئی عیب کی بات نہیں۔ ان معاملات میں فرانس کے باشندے بہت زیادہ حسّاس واقع ہوئے ہیں۔ جرمن باشندے ایسی باتوں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے۔

انگریز اور امریکن مرد عورتوں کے سامنے بات چیت کرتے ہوئے بہت محتاط رہتے ہیں۔ وہ عورتوں کے سامنے لفظ "ٹانگ" تک استعمال کرنے سے پرہیز کرتے ہیں، لیکن فرانسیسی باشندے ہماری ہی طرح بالکل آزادی سے بات چیت کرتے ہیں، جرمن اور روسی باشندے تو عورت مرد سب کی موجودگی میں گالی گلوچ تک کر لیتے ہیں۔

ماں اور بیٹے میں، بھائیوں اور بہنوں میں، باپ اور اس کی اولاد میں، عشق و محبت اور اس کے معاملات سے متعلق بھی بڑی آزادانہ بات چیت ہوا کرتی ہے، باپ اپنی بیٹی سے اس کے محبوب (مستقبل کے شوہر) کے بارے میں متعدد سوال کر لیتا ہے اور اس کی نسبت یا منگنی سے متعلق ہر قسم کا مذاق تک کر لیتا ہے، ایسے مواقع پر فرانس کی ناکتخدا لڑکیاں بالعموم شرما جاتی ہیں اور حیا سے اپنی گردن جھکا لیتی ہیں، لیکن امریکن لڑکیاں اپنے باپ کو بھی برجستہ جواب دینے سے نہیں چوکتیں! بوسہ لینا اور گلے لگنا کوئی معیوب بات نہیں ہے، ایسی چیزوں کا عام طور پر چرچا بھی کیا جاسکتا ہے، لیکن ہمارے ملک میں بزرگوں کے سامنے اشارتاً و کنایتاً بھی عشق و عاشقی کے معاملات سے متعلق کوئی بات چیت نہیں کی جاسکتی۔

مغربی باشندے اب دولتمند ہو گئے ہیں، جب تک ایک شخص بہت صاف اور اپنی کیٹ سے قطعی مطابقت رکھنے والا لباس نہیں پہنتا اسے اشراف میں شمار نہیں کیا جاتا، اور وہ اشراف کی سوسائٹی میں شریک ہونے کا مستحق نہیں سمجھا جاتا، ایک شریف آدمی کو دن میں دو یا تین بار اپنی قمیص اور کالر تبدیل کرنا چاہیئے، غریب لوگ یقینی طور پر اس افراط کے ساتھ اپنا لباس تبدیل کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتے، کوٹ یا پتلون وغیرہ پر کوئی داغ یا دھبّہ نہ ہونا چاہیئے، یہاں تک کہ کوئی شکن بھی نہ ہونی چاہیئے، آپ چاہے کتنی ہی گرمی محسوس کریں لیکن آپ کو گھر سے باہر نکلتے وقت دستانے ضرور ہی پہنے ہوتے ہیں، اس لئے کہ یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ راستہ چلتے پھرتے آپ کے ہاتھ گندے نہ ہو جائیں اور کسی عورت سے آپ کو مصافحہ نہ کرنا پڑ جائے، گندے ہاتھ سے کسی عورت سے مصافحہ کرنا بہت بڑی بدتمیزی سمجھا جاتا ہے، مہذب سوسائٹی میں تھوکنا، جمائی لینا، منہ میں دانتوں کی بتیسی لگانا، ایسی باتیں ہیں جو آدمی کو نیچ بنا دیتی ہیں، اور سوسائٹی کے مہذب لوگ اسے جاہل قرار دیتے ہیں گویا کم ذات، اور قابلِ نفرین!

طاقت کی پوجا کرنا مغربی باشندوں کا دھرم ہے، اور وہ عورت کے روپ میں تخلیقی طاقت کے پرستار ہیں، ان کی نظر میں عورت کی پرستش دو مجازی جیسی کوئی چیز ہے تنتریک کے قول کے مطابق — بائیں جانب عورتیں . . . . دائیں طرف شراب کے لبریز ساغر! مختصراً یہ کہ شراب کی آمیزش کے ساتھ گرم گوشت! تنتریک کا دھرم بہت پر اسرار معمہ ہے، اور اس طلسم کو لوگ ابھی تک نہیں سمجھ سکے ہیں، تشکتی کی یہ پوجا ساری دنیا میں کھلے بندوں جاری ہے، مادریت کا تصوّر، گویا ماں اور بیٹے کا رشتہ خاص اہمیت کا۔ پروٹسٹنٹ ازم کو یورپ میں بحیثیتِ مذہب کوئی خاص طاقت حاصل نہیں ہے اور رومن کیتھولک ہی درحقیقت یورپ پر بحیثیتِ مذہب چھایا ہوا ہے، یہودی وغیرہ ثانوی حیثیت رکھتے ہیں، پرستش درحقیقت مریم کی ہوتی ہے جس کی گود میں

---

عیسیٰ مسیح پیدا ہوئے ہیں، بادشاہ، فیلڈ مارشل، ملاح، ماہی گیر، راستہ کا فقیر، غرض لاکھوں آدمیں لاکھوں طریقوں پر لاکھوں جگہ ب بند ہوتی ہیں تو وہ ایک ہی ہوتی ہیں یعنی ماں — مریم! رات دن ماں مریم، ماں مریم کی دہائی دی جاتی ہے اور ان کی پرستش کی جاتی ہے۔

اس کے بعد عورت کی پرستش کا نمبر آتا ہے، شکتی کی پرستش حرص و ہوس کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ یہ شکتی پوجا کی حیثیت رکھتی ہے کماری (غیر شادی شدہ) کی پوجا، سادھوی (شادی شدہ عورت جس کا شوہر زندہ ہو) کی پوجا جو وارانسی کالی گھاٹ اور دوسرے مقدس مقامات پر ہوتی ہے، شکتی کی یہ پوجا صرف تصور و تخیل ہی میں نہیں ہوتی بلکہ محسوس ہونے اور نظر آنے والی چیزوں کی شکل میں کی جاتی ہے ہمارے یہاں شکتی پوجا صرف مقدس مقامات پر ہوتی ہے اور اس کے لئے خاص وقت مقرر ہیں۔ لیکن مغرب میں شکتی پوجا ہر جگہ ہوتی ہے اور سدا ہوتی رہتی ہے، ہفتوں، مہینوں اور برسوں تک یہ پوجا چلتی رہتی ہے، چنانچہ مغرب میں عورت کو ہر چیز پر فوقیت اور فضیلت حاصل ہے، اس کا لباس، اس کی نشست، اس کی غذا، اس کی چاہت، اس کی عزت و احترام، غرض ہر بات میں وہ آگے رہتی ہے اور اسے شرف حاصل رہتا ہے یہ شکتی پوجا ہر عورت کی پوجا ہے، چاہے وہ جان پہچان کی ہو، چاہے اجنبی ہو، چاہے اس کا حسب نسب کچھ بھی ہو، چاہے وہ جوان اور خوبصورت ہو، چاہے نہ ہو، پہلے پہلے یورپ میں مور نسل کے لوگوں نے شکتی پوجا کو رواج دیا، جو عربوں کی مخلوط نسل ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو یورپ میں اسلام کو لے کر آئے تھے، جب کہ انہوں نے اسپین کو فتح کیا تھا، اور پھر آٹھ سو برس تک اسپین پر حکومت کی تھی، یہی مور تھے جنہوں نے یورپ میں مغربی تہذیب و تمدن اور شکتی پوجا کی تخم ریزی کی، جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، مور شکتی پوجا کو بھولتے گئے اور پھر ان کا زوال شروع ہو گیا، وہ طاقت و استحکام، کلچر و تہذیب اور اپنی شان و شوکت کی سطح سے نیچے گرنے لگے، اور پھر افریقہ کے ایک گوشہ میں جا پڑے اور گمنامی کی زندگی بسر کرنے لگے لیکن ان کی طاقت اور شان و شوکت نیز ان کا تمدن یورپ ہی میں چھوٹ گیا، ماں بھی موروں کو بھول گئی۔ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کی بارش عیسائیوں پر ہونے لگی اور ان کے گھر روشنی سے جگمگا اٹھے۔



وویکانند ہاؤس مدراس جہاں سوامی جی امریکہ سے واپس آنے پر ٹھہرے تھے

# پیرس میں

یہ یورپ کیا ہے؟ ایشیا، افریقہ اور امریکہ کے کالے، بھورے، زرد اور سرخ نام کے باشندے کس وجہ سے یورپین باشندوں کے قدموں کی خاک چاٹتے ہیں؟ اس کلجگ میں یورپ کے باشندے ہی کیوں پوری دنیا پر حکومت کر رہے ہیں؟ اس یورپ کو سمجھنے کے لئے ہمیں فرانس سے ہی مدد لینی ہوگی جو مغرب کی ہر بلند تر چیز اور ہر بلند تر خیال کا سرچشمہ بنا ہوا ہے۔ دنیا بھر پر حکومت کرنے والا یہی یورپ ہے اور اس یورپ کا عظیم مرکز ہے پیرس! وہ مغربی تمدن کا گہوارہ ہے۔ مغربی تہذیب و تمدن، رواج و رسوم، فلسفہ، مذہب، روشنی و ظلمت، نیکی و بدی غرض ہر تصور اور ہر خیال پیرس ہی میں جنم لیتا ہے اور اس کی آب و ہوا میں پرورش پاکر پروان چڑھتا ہے۔ پیرس کو ایک وسیع سمندر سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جس میں نادر و نایاب جواہر بھی ہیں، قیمتی موتی بھی ہیں، لیکن اس بیش بہا دولت کے ساتھ ہی ساتھ شارک مچھلیاں اور دوسرے دریائی جانور بھی ہیں جو درندے اور خونخوار ہیں۔

یورپ میں کام کا مرکز، میدان یا کرم کشیتر، فرانس ہی ہے۔ ایک خوبصورت و خوشنما ملک، جس کی آب و ہوا معتدل ہے اور جس کی زمین خوب زرخیز ہے۔ چین کے چند علاقوں کے سوا دنیا میں کوئی ملک نہیں ہے جو فرانس کی خوبصورتی اور آب و ہوا کے اعتدال کا مقابلہ کر سکے۔ سمندر کی موجوں میں حسن مچلتا ہے، نہ زیادہ بارش ہوتی ہے نہ خشک سالی رہتی ہے۔ آسمان صاف، سورج کی نرم اور حیات بخش کرنیں، ٹھنڈی اور فرحت بخش ہوا، دلکش سبزہ زار اور پہاڑیاں، چھوٹے چھوٹے دریا اور نظر نواز آبشار، قدرتی مناظر کی اس دلکشی نے یہاں کے لوگوں میں ذاتی جمال پیدا کر دیا ہے۔ امیر و غریب، جوان و بوڑھے اپنے گھروں، اپنے کمروں کو آراستہ پیراستہ رکھتے ہیں۔ سڑکیں، کھیت، اور باغات میں صفائی کے ساتھ دلکشی پائی جاتی ہے۔ ان کی رفتار میں بھی حسن ہوتا ہے، گفتار میں بھی خوبصورتی ہوتی ہے اور پورا ملک ایک تصویر کی طرح خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔ مناظر قدرت اور آرٹ سے اتنا زیادہ لگاؤ میں نے جاپان کے سوا دنیا کے کسی دوسرے ملک میں نہیں دیکھا، عمارتیں اور چمن ایسا لگتا ہے جیسے اندر کا سورگ زمین پر اتر آیا ہے۔ جمال آرائی اور آرٹ میں ان کی ہر کوشش کامیاب ہوتی ہے اور انہیں ان دونوں باتوں میں نمایاں خصوصیت حاصل ہے۔

زمانۂ قدیم میں بھی فرانس گالوں، رومیوں، فرانکوں، اور دوسری قوموں کی معرکہ آرائیوں کا میدان بنا رہتا تھا۔ سلطنت روم کی بربادی

کے بعد فرانکوں کو پورے یورپ پر اقتدار اور بالا دستی حاصل ہو گئی۔ ان کے بادشاہ شارلیمن نے بزورِ شمشیر یورپ میں مسیحیت کو پھیلایا۔ اور یہی لوگ تھے جنہوں نے ایشیا کو پہلے پہل یورپ سے آشنا کرایا، لہٰذا ہم لوگ اب بھی یورپین باشندوں کو فرانکی، فرنگی، بلانکی یا فلنگا وغیرہ کہا کرتے ہیں۔

قدیم یونان مغربی تہذیب و تمدن کا سرچشمہ تھا، لیکن اس کی شان و شوکت بھی ڈوب گئی اور بربر حملہ آوروں نے جب سلطنتِ روم کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا تو یورپ میں اندھیرا چھا گیا اور روشنی غائب ہو گئی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ایشیا سے ایک اور جنگجو قوم اٹھی اور یہ عرب تھے، غیر معمولی تیز رفتاری سے عربوں کی یہ لہر دنیا کے مختلف علاقوں میں پھیلی، سلطنتِ ایران کی شان و شوکت عربوں کے سامنے زمیں بوس ہو گئی اور ایران نے اسلام قبول کر لیا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اسلام نے قطعی طور پر ایک نئی شکل اختیار کی، عربوں کا مذہب اور ایران کا تمدن ایک دوسرے سے مخلوط ہو گیا۔

عربوں کی تلوار نے ایرانی تمدن کو چہار سمت میں پھیلایا۔ لیکن یہ ایرانی تمدن قدیم یونان اور ہندوستان سے مستعار لیا گیا تھا، مشرق و مغرب سے مسلم حملہ آوروں کی لہریں یورپ پر پھٹ پڑیں اور ان کے ساتھ ذہانت و فراست اور علم و تہذیب کی جو روشنی تھی اس نے یورپ میں پھیلے ہوئے اندھیرے کو چھانٹنا شروع کیا۔ اور یورپ بربریت کی جس حالت میں تھا، اس سے آہستہ آہستہ وہ باہر آنے لگا، قدیم یونان کے علوم و فنون اور فراست و ذہانت کی روشنی اٹلی میں داخل ہوئی اور اس نے بربریت پر غلبہ پا لیا۔ اور ایک بار پھر روم کے تنِ مردہ میں جو کبھی پوری دنیا کا پایۂ تخت بنا ہوا تھا، نئی زندگی کی لہر دوڑنے لگی، اس نئی زندگی کی فلورنس میں پرورش اور تربیت ہونے لگی، اور قدیم اٹلی میں حیاتِ نو کے آثار دکھائی دینے لگے اسے نشاۃ ثانیہ یا نیا جنم کہا جاتا ہے، لیکن یہ نیا جنم اٹلی کے لئے تو اس کا دوسرا جنم تھا، مگر باقی یورپ کا یہ پہلا ہی جنم تھا، یورپ نے سولہویں صدی عیسوی میں پہلا جنم لیا۔ گویا اکبرِ اعظم، جہانگیر، شاہجہاں اور دوسرے مغل سلاطین کے عہد میں جن کی ہندوستان میں پائیدار اور پُرشوکت سلطنت قائم تھی۔

اٹلی ایک قدیم قوم تھی نشاۃ ثانیہ کی آواز پر وہ خوابِ غفلت سے چونکی اور اس نے وقت کی آواز کا جواب بھی دیا۔ لیکن اس کے بعد وہ پھر اپنے بسترِ استراحت پر کروٹ بدل کر غفلت کی نیند سو گئی، ہندوستان میں بھی اس زمانہ میں بیداری کی ایک لہر آئی تھی اور اس کے بہت سے وجوہ ہیں، اکبر کے بعد آنے والے تین حکمرانوں کے زمانہ میں علوم و فنون کی خوب ترقی ہوئی۔ لیکن ہندوستان بھی قدیم ترین قوم ہے لہٰذا وہ بھی کسی نہ کسی وجہ سے اس طرح سو گئی، جس طرح اٹلی کی قدیم قوم سو گئی تھی،

اٹلی میں نشاۃ ثانیہ کی جو لہر اٹھی تھی، اس نے ایک نئی قوم "فرانکوں" کو جگایا۔ اور وہ یہ طاقتور قوم اٹھ کھڑی ہوئی فلورنس میں چاروں طرف سے تمدن و تہذیب کی امواج آ رہی تھیں اور وہاں یہ امواج مل کر ایک دھارے کی شکل اختیار کر رہی تھیں، خود اٹلی میں تو اتنا دم تھا نہیں کہ وہ اس طاقتور دھارے کی تاب لا سکے، لہٰذا فرانکوں نے اس طاقتور دھارے کو اپنے اندر سمو لیا۔ ہندوستان میں جس طرح نشاۃ ثانیہ کی لہر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی شاید اسی طرح اٹلی میں بھی نشاۃ ثانیہ کی اٹھتی ہوئی لہر بیٹھ جاتی لیکن فرانکوں نے اس دھارے میں اپنی قومیت کا جہاز بخوشی ڈال دیا۔ اور وہ اس دھارے میں بہتے ہوئے مختلف سمتوں میں چلے گئے، یورپ کی دوسری اقوام نے اس دھارے سے اپنے اپنے ممالک کو سیراب کرنے کے لئے نہریں بھی نکالیں اور اس کا زور بڑھانے کے لئے اپنا خون بھی اس میں شامل کیا، یہ لہر بہ وقت ہندوستان کے ساحلوں سے بھی ٹکرائی اور جاپان کے ساحل تک بھی پہنچی اور وہ اس لہر کے پانی سے اشنان حاصل کر کے فرحت و توانائی حاصل کرنے لگا، جاپان ایشیا کی نئی قوم ہے۔

دیکھو جس طرح گنگا کا سرچشمہ ہے، اسی طرح پیرس یورپین تہذیب و تمدن کا سرچشمہ ہے، یہ مخلوط آبادی کا عظیم شہر، جنتِ ارضی کی

حیثیت رکھتا ہے یعنی مسرّت و شادمانی کا شہر۔ لندن، برلن، غرض کسی شہر میں بھی نہ اتنی مسرّت ہے، نہ اتنی شادمانی، نہ اتنی تفریح اور نہ اتنا آرام ہے جتنا پیرس میں۔ یہ درست ہے کہ لندن اور نیویارک میں دولت کی افراط ہے، برلن علم کا گہوارہ ہے لیکن فرانس میں جو بات ہے وہ کہیں نہیں ہے۔ فرانسیسی باشندوں کی ذہانت و فراست کی نظیر کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔ دولت و علم اور مناظرِ قدرت کا حسن و جمال کہیں بھی ہو سکتا ہے لیکن وہ شے جسے آدمیت کہا جاتا ہے وہ کہاں ہے؟ قدیم یونانیوں کا کردار فنا ہونے کے بعد ہی فرانسیسی کیریکٹر نے جنم لیا ہے۔ ہر وقت اطمینان و سکون، ہر وقت اُمنگ اور حوصلہ، ظاہر میں ہلکے پھلکے لیکن باطن میں بہت وزنی، ہر کام میں لگن کے ساتھ جُٹ جانے والے، مگر ذرا سا دباؤ پڑنے پر پسپا ہو جانے والے لیکن یہ پسپائی بس ایک لمحہ کے لئے ہوتی ہے اور فرانس کے چہرے پہ مایوسی کی لہر دیر تک باقی نہیں رہتی۔ اندھیرے سے فوراً ہی نئی توقعات، نئی امیدوں اور نئے عزائم کی روشنی پھوٹ پڑتی ہے۔

پیرس یونیورسٹی، یورپ کی دیگر یونیورسٹیوں کا ایک ماڈل ہے، سائنس کی جملہ اکاڈمیاں جو دنیا بھر میں قائم ہیں وہ فرانسیسی اکاڈمی کی ایک نقل ہیں۔ پیرس ہی نوآبادیاتی حکومتوں کا بھی پہلا موجد اور پہلا اُستاد ہے، اسی نے دوسرے ممالک میں سامراجی نظام کا سنگِ بنیاد رکھنے کی تعلیم دی ہے۔ یورپ کی تمام زبانوں میں فرانس کی طرزِ نگارش اور اسلوبِ بیان کی نقل اتاری جاتی ہے۔ پیرس ہی سائنس، فلسفہ اور آرٹ کا وطن ہے۔ ہر جگہ اور ہر اعتبار سے سائنس، فلسفہ اور آرٹ میں فرانس کی نقالی کی جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ فرانس ایک شہر ہے اور باقی سب اقوام اس کے آس پاس آباد ہونے والے دیہات کی باشندہ ہیں۔ فرانس جو قدم اُٹھاتا ہے جرمن، انگریز اور دوسری قومیں اس کی پیروی کرتی ہیں۔ یہ نقالی چاہے بیس برس بعد ہو چاہے پچاس برس بعد، لیکن ہوتی ضرور ہے۔ فرانسیسی تمدن کی لہر سکاٹ لینڈ تک پہنچی اور جب سکاٹ لینڈ کے بادشاہوں نے انگلستان پہ اقتدار اور بالادستی حاصل کی تو انگلستان میں رائل سوسائٹی اور اسی طرح کے دیگر ادارے معرضِ وجود میں آئے۔

پھر پیرس ہی آزادی اور حریّت کا گہوارہ بھی ہے، یہیں سے عوام کے اقتدار کا پرچم بلند ہوا۔ اور سلطانی جمہور کے نعرے نے یورپ کی بنیاد تک ہلا کر رکھ دی۔ عوام کی حکومت، عوام کے لئے، عوام کے ذریعہ نعرہ اب فرانس میں تو سنائی نہیں دیتا، اور وہ دوسرے مقاصد اور دوسرے نظریات کی نقالی میں لگا ہوا ہے لیکن اس کے باوجود انقلابِ فرانس کی رُوح یورپ کی دوسری اقوام میں اب بھی بروئے کار ہے۔

پچھلے دِنوں ایک ممتاز سائنس دان نے مجھ سے کہا تھا کہ دنیا کے دائرہ میں پیرس کو مرکز کی حیثیت حاصل ہے لہٰذا ایک قوم پیرس شہر سے اپنا تعلق قائم کرنے میں جس حد تک کامیاب ہو گی وہ قوم اپنی زندگی میں بھی اسی حد تک کامیاب رہے گی۔ اس رائے میں اگرچہ مبالغہ آمیزی سے کام لیا گیا ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس دنیا کو کوئی نیا تصوّر، کوئی نیا نظریہ یا کوئی نیا عقیدہ دینا چاہتا ہے تو اس کے لئے پیرس ہی سب سے اچھا اور سب سے زیادہ مناسب مقام ہو سکتا ہے۔ پیرس سے جو بات چلتی ہے پورا یورپ اسے لازمی طور پر اختیار کر لیتا ہے۔ سنگتراشی، مصوّری، موسیقی یا کسی طرح کا کوئی رقص اگر پیرس میں مقبولیت حاصل کر لے تو پھر اسے مختلف ممالک میں مقبولِ عام ہو جانے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

---

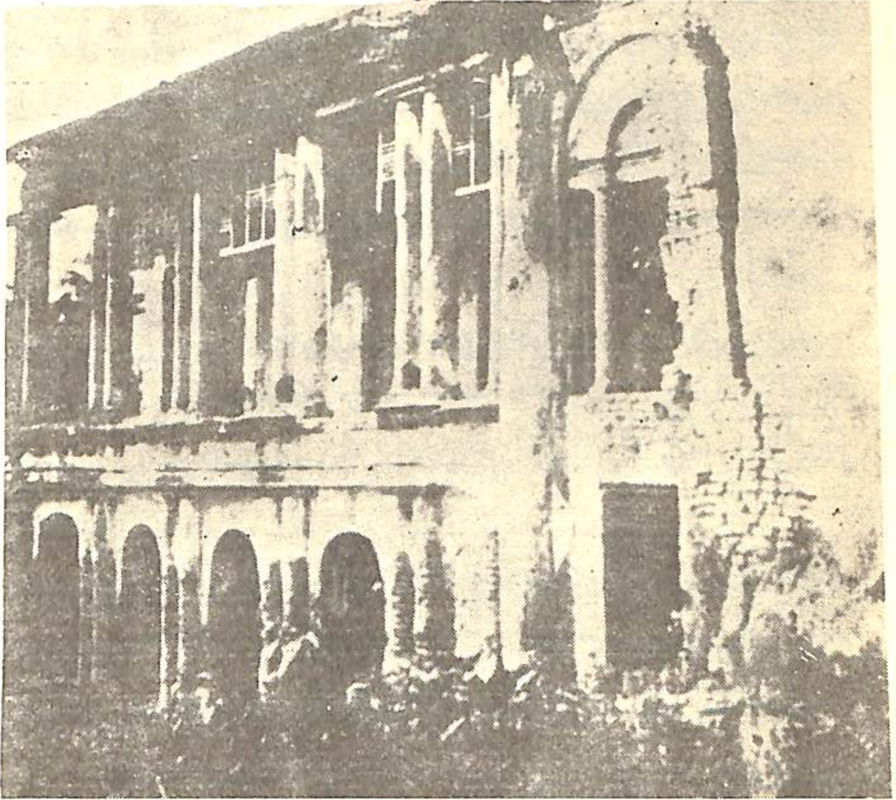
مشرق و مغرب    صفحہ ۵۷

ہم اپنے ملک میں صرف وہی باتیں سنتے ہیں جو پیرس کے تاریک پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہیں، یعنی یہ کہ پیرس بہت ہی ہولناک جگہ ہے زمین پر دہکنے والا جہنم! بعض انگریز بھی پیرس کے متعلق یہی رائے رکھتے ہیں اور دوسرے ممالک کے وہ دولتمند، جو نفس پرستی کے سوا، کسی اور طرح کی تفریح سے آشنا ہی نہیں ہیں، پیرس کو عیش پسندی اور بد اخلاقی کا گہوارہ قرار دیتے ہیں لیکن ایسی باتیں تو مغرب کے ہر بڑے شہر میں پائی جاتی ہیں۔ ؏

ایں گناہیست کہ در شہرِ شما نیست کنند

لندن، برلن، ویانا، اور نیویارک وغیرہ ان سب شہروں میں اس قسم کی باتیں موجود ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ دوسرے ممالک میں فحاشی کھلے عام ہوتی ہے لیکن مہذب پیرس اپنی گندگی پر بھی سونے کا پتر چڑھا دیتا ہے، پیرس کی مہذب تفریحات کا مجنونانہ نفس پرستی سے موازنہ کرنا، بالکل ایسا ہی ہے، جیسے کسی جنگلی جانور کی قلانچوں سے مور کے رقص کا موازنہ کیا جائے۔

---



برڈانگھم کا وہ شکستہ کھنڈروں سے اٹا ہوا مکان، جہاں 1886ء میں پہلا لام کرشن مٹھ قائم کیا گیا۔

---

# عریانی اور فحاشی

دنیا کی کونسی قوم ہے جو تفریحات کی طلبگار نہیں ہے، کونسی قوم ہے جو مسرت کی زندگی بسر کرنے کی خواہش نہیں رکھتی؟ ورنہ کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ دولتمند لوگ دوڑ دوڑ کر پیرس پہنچتے ہیں۔ بادشاہ اور سلاطین اپنے نام اور بھیس بدل بدل کر احساسِ مسرت کے اس تالاب میں غوطہ لگانے اور خوشی کی دولت سمیٹنے کے لئے کیوں آیا کرتے ہیں؟ حصولِ مسرت کی خواہش سب ہی ملکوں میں ہے اور اطمینان و سکون حاصل کرنے کے لئے کوئی دقیقہ چھوڑا نہیں گیا لیکن فرق صرف یہ ہے کہ فرانس نے اسے ایک مکمل سائنس بنا لیا ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ مسرت کس طرح حاصل کی جا سکتی ہے اور وہ مسرت و شادمانی کے معاملہ میں بام عروج تک پہنچ چکے ہیں۔

پھر بھی عریاں رقص اور فحاشی وغیرہ بدیشیوں کے لئے ہوتی ہے۔ فرانس کے لوگ ان جگہوں پر جانے میں بڑے محتاط ہوتے ہیں اور وہ ان بیکار کی چیزوں میں اپنا روپیہ ضائع نہیں کرتے۔ تمام عیش پسندیاں اور تفریحات، قیمتی ہوٹل اور کیفے، جن میں محض رات کے کھانے کا بل ہی آدمی کو تباہ کر کے رکھ دیتا ہے، صرف ان بدیشی بے وقوفوں کے لئے ہیں جو دولتمند ہیں۔ فرانسیسی باشندے انتہائی مہذب اور شائستہ ہوتے ہیں ان کے طور و طریق بہت صاف اور بہت خوب ہیں، وہ دوسرے کی جیب سے پیسہ نکالنے میں بڑے ہوشیار ہیں، اور جب بھی وہ کسی کو بے وقوف بنا کر اس کی جیب سے پیسہ نکالتے ہیں تو وہ منہ ڈھانپ کر ہنستے ہیں۔

مزید براں ایک اور چیز بھی توجہ کی مستحق ہے امریکیوں، جرمنوں اور انگریزوں کی طرح ان کی سوسائٹی بھی تمام اقوام کے لئے کھلی ہوئی ہے اسی لئے ایک بدیشی شخص بہت ہی جلد فرانس کی سوسائٹی کے ہر پہلو سے واقفیت حاصل کر لیتا ہے اور چند ہی دن کی شناسائی کے بعد امریکن ایک بدیشی کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دینے لگیں گے، جرمن بھی ایسا ہی کریں گے لیکن انگریز جب کسی بدیشی کو اپنے گھر آنے کی دعوت دے گا تو بہت دنوں کی شناسائی کے بعد! فرانسیسی عوام کا رویہ اس سے بالکل ہی مختلف ہے، وہ کسی بدیشی کو اپنے گھر والوں کے ساتھ رہنے کی دعوت نہیں دے گا اور اگر ایسا کرے گا تو صرف اس وقت جب اس کی شناسائی بہت زیادہ ہو گئی ہو اور وہ بہت گھل مل گیا ہو جب

کسی بدیشی کو ایسا موقع ملتا ہے اور اسے کسی فرانسیسی گھرانے میں رہنے سہنے کا وقت ملتا ہے تو پھر اس کی رائے فرانسیسیوں کے بارے میں ان باتوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے جو عام طور پر سنائی دیتی ہیں کیا یہ سادی طور پر احمقانہ بات نہیں ہے کہ کوئی بدیشی شخص ہندوستان آئے اور کلکتہ کے پسماندہ طبقوں کو دیکھ کر ہمارے قومی کردار کے متعلق ایک رائے قائم کر لے؟ پیرس کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے! جس طرح ہمارے ملک میں غیر شادی شدہ لڑکی کی نگرانی و نگہداشت کی جاتی ہے پیرس میں بھی اسی طرح ناکتخدا لڑکیوں کی نگرانی ہوتی ہے وہ سوسائٹی میں آنے جانے کے لیے بہت آزاد نہیں ہیں صرف شادی کے بعد ہی وہ اپنے شوہروں کے ساتھ سوسائٹی میں آزادانہ طور پر شرکت کر سکتی ہیں، ہماری طرح ان کے یہاں بھی لڑکیوں کی شادی کی بات چیت والدین ہی کی معرفت ہوتی ہے خوش طبع ہونے کی بنا پر ان کی کوئی بھی تقریب پیشہ ور رقاصوں کے بغیر مکمل نہیں ہوتی، جس طرح ہمارے یہاں پوجا اور شادی کے مواقع پر ناچنے والی لڑکیاں اپنے فن کا مظاہرہ کرتی ہیں اسی طرح فرانس میں بھی ہر تقریب میں رقاص لڑکیاں اپنا فن دکھاتی ہیں ایک ایسے ملک میں بسنے کی بنا پر جس میں کہر کی تاریکی چھائی رہتی ہے انگریز کے آئینہ خاطر پر بھی ایک طرح کا غبار چھایا رہتا ہے، اس لئے وہ عام گھروں میں اس طرح کا ناچ رنگ نامناسب خیال کرتے ہیں اور ناک بھوں چڑھاتے ہیں لیکن تھیئٹر میں یہی ناچ رنگ کوئی معیوب بات نہیں ہے یہاں یہ بات بھی سمجھنی چاہیئے ان کے رقص جس طرح کے ہوتے ہیں وہ ہماری نظروں میں بھی نامناسب دکھائی دیتے ہیں لیکن وہ ان ناچوں کے عادی ہو چکے ہیں اور انہیں ان میں کوئی نامناسب بات نہیں دکھائی دیتی۔ رقص کے دوران میں ناچنے والی لڑکی کا سینہ اور بازو عریاں ہو سکتے ہیں انگریز اور امریکن اس رقص میں مزے سے شریک بھی ہوں گے اور لطف بھی لیں گے لیکن جب اپنے اپنے وطن واپس پہنچیں گے تو فرانس کے رواجوں کی مذمت بھی کریں گے۔

اسی طرح عورت کی عصمت کا تصور ہر جگہ یکساں ہے، اس تصور سے روگردانی کسی بھی عورت کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے لیکن مردوں کے معاملہ میں کسی دوسری عورت سے ان کا تعلق رکھنا کوئی بری بات نہیں سمجھا جاتا۔ اس مسئلہ میں فرانسیسی کچھ زیادہ آزاد خیال واقع ہوئے ہیں اور دوسرے ممالک کے امراء کی طرح اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ انہیں کیا کہا جائے گا، بالعموم یورپ میں مردوں کی اکثریت ایسے رواہ روی کو بہت برا نہیں سمجھتی خصوصیت سے غیر شادی شدہ مرد کا شادی سے پہلے کسی عورت سے تعلق رکھنا کوئی معیوب بات نہیں سمجھتے، نوجوان طلباء اگر عورتوں سے شرماتے ہیں تو ان کے والدین ان کی اس شرم کو بڑی بری بات قرار دیتے ہیں، مغربی ممالک کے مردوں میں جو وصف لازمی طور پر ہونا چاہیئے وہ ہے "جرأت"! انگریزی زبان کے لفظ ورچو ( "virtue" ) اور ہمارا لفظ "ویرتو" درحقیقت ایک ہی ہے غور کیجئے کہ یہ لفظ ورچو ( "virtue" ) کہاں سے نکلا ہے اور پھر سوچئے کہ وہ اسے آدمی کا ایک وصف قرار دیتے ہیں بلاشبہ وہ عصمت کو عورت کا بہترین وصف گردانتے ہیں۔ ایک شخص اگر ایک سے زیادہ بیویاں رکھے تو سوسائٹی کے لیے یہ اتنی نقصان دہ بات نہیں ہے لیکن ایک عورت اگر ایک ہی وقت میں کئی شوہر رکھے تو اس سے ایک نسل کے زوال کی گھڑی شروع ہو جاتی ہے لہٰذا تمام ممالک میں عورتوں کی عصمتوں کا تحفظ کیا جاتا ہے ہر سوسائٹی میں عورت کی عصمت کی حفاظت کے پیچھے درحقیقت فطرت کا ہاتھ دکھائی دیتا ہے فطرت کی مشیت یہ ہے کہ آبادی میں اضافہ ہوتا رہے اور عورت کی عصمت کا تحفظ اس مشیت کے عین مطابق ہے اور اسے بڑھنے کا راستہ میں مدد دیتا ہے لہٰذا ہر سوسائٹی جو مرد کی بہ نسبت عورت کی عصمت کی حفاظت کے لئے زیادہ مستعد رہتی ہے فطرت کی مددگار بنتی ہے در افزائش نسل

کی مثبت میں معاون رہتی ہے۔

اس عنوان پہ میری یہ گفتگو، اس مقصد کو واضح کرنے کی ضرورت کے تحت ہے کہ ہر قوم کا اپنا اخلاقی معیار ہوتا ہے اور اس اخلاقی معیار اور مقصد کو ایک قوم کے رواجوں اور اس کے عادات و اطوار کو دیکھ کر ہی پرکھا جا سکتا ہے، مغربی باشندوں کو انہی کی نظر سے دیکھنا چاہیئے، ہم انہیں اپنی نظر سے دیکھیں یا وہ ہمیں اپنی نگاہ سے دیکھیں تو یہ دونوں ہی کی ایک غلطی ہوگی، ہماری زندگی کا موقف و مقصد ان کی زندگی کے مقصد و موقف سے بالکل ہی مختلف ہے۔ سنسکرت میں طالب علم کا نام ہے "برہمچاری" اور یہ نام سنسکرت کے لفظ "کام جیت"[1] کے ہم معنی ہے، ہماری زندگی کا مقصد ہے "موکش"۔ یہ مقصد برہمچاری بنے بغیر کسی طرح حاصل کیا جا سکتا ہے؟ لہٰذا ہمارے نوجوانوں کے لیئے یہ لازمی شرط ہے، کہ وہ اپنی طالب علمی کی زندگی میں اپنی نفسانی خواہشات کو اپنے قابو میں رکھیں، مغرب کی زندگی کا مقصد ہے بھوگ! لہٰذا ہماری طرح اس بات پہ بہت زیادہ زور نہیں دیا جاتا کہ لوگ برہمچاری رہیں۔

اب پھر پیرس کی جانب لوٹیئے! دنیا میں کوئی شہر نہیں ہے جو ماڈرن پیرس کا مقابلہ کر سکے، ماضی میں اس کی جو صورت تھی، آج وہ صورت قطعی طور پر بدل چکی ہے، ماضی میں اس کی صورت قریب قریب ایسی ہی تھی جیسی صورت وارانسی میں بنگالی کوارٹر وں کی ہے، ٹیڑھی میڑھی سڑکیں، گلی، کوچے، دو گھرانوں کو ایک دوسرے سے ملانے کے لیئے گلیوں پہ سے گزرتی ہوئی محرابیں، دیواروں کے پاس بنے ہوئے کنوئیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ تھی ماضی میں پیرس کی شکل، حال ہی میں ایک نمائش کے دوران قدیم پیرس کا ایک نقشہ بھی دکھایا گیا تھا، لیکن یہ سب کچھ رفتہ رفتہ بدل گیا، اس شہر کو وقتاً فوقتاً انقلابات کا سامنا ہوتا رہا ہے، اور کبھی اس کے ایک حصّہ سے اور کبھی اس کے دوسرے حصّہ سے اس طرح انتقام لیا گیا ہے، کہ ایک ایک چیز نیست و نابود کر دی گئی ہے، اپنے کھنڈرات سے نئے پیرس نے جنم لیا ہے، اور اب اس کا ایک ایک گوشہ صاف ستھرا، روشن اور بہت ہی شاندار ہے۔

ماڈرن پیرس کی تعمیر کا سہرا نیپولین سوم کے سر ہے، اس نے اس شہر کی مادّی صورت ہی بدل ڈالی، جو قدیم شاہی کے زوال کے بعد ہی سے تغیّر پذیر تھی، تاریخ فرانس کے طالب علم کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ انقلاب فرانس سے پہلے فرانس کے بادشاہوں نے عوام کو کس کس طرح بیدردی کے ساتھ کچلا تھا، نیپولین سوم خود بھی بزورِ شمشیر بادشاہ بنا تھا اور اس نے بادشاہ بننے کے لیئے بڑی خونریزی کی تھی، فرانس کے پہلے انقلاب کے بعد ہی سے اہلِ فرانس چاق و چوبند رہنے لگے اور مطلق العنان حکمران کو ان کی جانب سے ہمیشہ ہی ایک خطرہ لگا رہا، لہٰذا نیپولین سوم نے اپنی رعایا کو مطمئن رکھنے کی غرض سے پیرس کی تعمیر شروع کی تاکہ پیرس کے عوام کی خوشنودی بھی حاصل کرے اور انہیں روزگار بھی مل جائے، چنانچہ پیرس کے آثارِ قدیمہ کو محفوظ رکھتے ہوئے اس نے بڑی بڑی شاندار سڑکوں، بڑی بڑی عمارتوں، تھیٹروں اور دریا کے ساحل پہ دلکش تفریح گاہوں کی تعمیر شروع کرا دی۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ بڑی بڑی شاہراہوں کے ذریعہ شہر کی آبادی ہر سمت میں پھیلی، بلکہ نئے مکانات تعمیر ہونے کی وجہ سے شہر کا رقبہ بھی دوگنا ہو گیا، ڈی انتن اور ایسی محل تعمیر ہوا، جس کی دنیا بھر میں کوئی نظیر نہیں ہے، اس کا راستہ اپنا چوڑا ہے کہ اس

---

[1] وہ شخص جو اپنے نفس پہ قابو پا لے۔

---

کے درمیان میں دونوں طرف باغیچے لگے ہوئے ہیں اور ایک مقام ہے اس کی شکل دائرہ کی طرح گول ہو گئی ہے، اس دائرہ کا نام "ڈی لاکنکورڈ" ہے، اس دائرہ میں آٹھ عورتوں کے بت لگے ہوئے ہیں جو فرانس کے آٹھ خاص خاص قصبات کی نمائندگی کرتے ہیں، ان میں سے ایک بت ضلع اسٹراسبرگ کی نمائندگی کرتا ہے۔ لیکن 1870ء کی لڑائی میں یہ ضلع فرانس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اور اس پر جرمنی نے قبضہ کر لیا۔ اس شکست کا زخم ابھی تک تازہ ہے اور فرانس کے لوگ اس دکھ کو ابھی تک فراموش نہیں کر سکے ہیں۔ وہ اس بت پر اب بھی اپنے وطن کے شہیدوں کی یاد میں پھول چڑھاتے ہیں۔

مجھے ایسا لگتا ہے کہ دہلی کا چاندنی چوک کبھی ایسا ہی ہوگا جیسا کہ "ڈی لاکنکورڈ" ہے، یہ پورا اسکوائر (دائرہ) شیروں، عورتوں اور مردوں کے بتوں سے آراستہ و پیراستہ ہے اور ادھر ادھر شاندار فتوحات کی یادگار کے طور پر محرابیں تعمیر کی گئی ہیں۔

۲ سو توپوں کو گلا کر ایک بہت بڑی توپ فرانس کے عظیم ہیرو نیپولین بوناپارٹ کی یاد میں بنائی گئی ہے، یہ توپ بھی اسی جگہ رکھی ہوئی ہے اور اس کی نال پر ان فتوحات کو کندہ کیا گیا ہے جو نیپولین بوناپارٹ کے عہد میں فرانس کو حاصل ہوئی تھیں، اس توپ کے دہانے پر نیپولین بوناپارٹ کی تصویر بنائی گئی ہے۔ باسٹیل کے قدیم قلعہ کے پاس ایک اور یادگار بنی ہوئی ہے اور یہ یادگار جولائی 1789ء کے انقلاب سے تعلق رکھتی ہے، باسٹیل کا قدیم قلعہ ایک زمانہ میں جیل خانہ کا کام دیتا تھا، اس میں وہ لوگ قید کئے جاتے تھے جو بادشاہ کے معتوب ہوتے تھے، قدیم زمانہ میں بلا مقدمہ چلائے صرف بادشاہ کے فرمان کے تحت ان لوگوں کو جن سے بادشاہ ناراض ہوتا تھا، عمر بھر کے لئے جیل خانہ میں ڈال دیا جاتا تھا اور اس بات کا بھی کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا تھا کہ کسی شخص نے اپنے وطن کی کتنی خدمات انجام دی ہیں۔ بادشاہ کے مصاحب تک اگر کسی سے ناراض ہو جاتے تھے تو وہ بادشاہ سے اس بے چارے کی گرفتاری کا فرمان جاری کرا دیا کرتے تھے جسے "لیٹر ڈی کیچٹ" ( "Lettre de Cachet". ) کہا جاتا تھا۔ اس فرمان کے جاری ہونے کے بعد کوئی شنوائی نہیں ہوتی تھی اور آدمی کو باسٹیل کے قلعہ میں قیدی بنا کر ڈال دیا جاتا تھا، جو بدنصیب اس قلعہ میں قیدی بنا کر ڈالے گئے، ان میں سے شاید ہی کوئی خوش نصیب ہو جس کو پھر آزاد دنیا میں پلٹ کر آنے کا موقع ملا ہو، جب پوری قوم نے اس ظلم و تشدد کے خلاف بغاوت کی اور انفرادی آزادی کا یہ مطالبہ کیا کہ سب باشندے مساوی حیثیت رکھتے ہوں، نہ کوئی اونچا ہو، نہ کوئی نیچا ہو تو پیرس کے لوگوں نے بادشاہ اور ملکہ پر دیوانہ وار حملہ کر دیا۔ اور اس ہجوم نے سب سے پہلا کام جو کیا، وہ یہ تھا کہ باسٹیل کے قلعہ کو نیست و نابود کر ڈالا، جو آدمی پر آدمی کے انتہائی ظلم کی ایک علامت تھا، اور وہ رات انہوں نے باسٹیل کے کھنڈر میں ناچ گا کر بسر کی اور وہاں خوشی میں جھوم جھوم کر خوب دعوتیں اڑائیں، بادشاہ نے فرار ہو جانے کی کوشش کی لیکن عوام نے اسے گرفتار کر لیا، اور جب انہوں نے یہ سنا کہ بادشاہ کا خسر جو آسٹریا کا حکمران تھا اپنے داماد کی حمایت کرنے کے لئے بہت بڑی فوج روانہ کر رہا ہے تو وہ اس خبر کو سن کر غصہ میں پاگل ہو گئے۔ لہٰذا انہوں نے بادشاہ اور ملکہ دونوں ہی کو قتل کر ڈالا، آزادی اور مساوات کے نام پر پوری فرانسیسی قوم فریفتہ ہو گئی تھی — فرانس ایک جمہوریت بنا — اور انہوں نے تمام درباریوں کو جو ان کے ہتھے چڑھے، مار ڈالا، اور

بہت سے درباری جو اپنے خطابات و القابات وغیرہ چھوڑ کر عوام کی تحریک میں شامل ہو گئے تھے، ہلاک ہونے سے بچ گئے، اتنا ہی نہیں بلکہ انہوں نے ساری دنیا کی قوموں کو للکارا۔ کہ وہ بیدار ہوں اور تمام بادشاہوں کو ہلاک کر ڈالیں جو ظالم اور ستمگر ہیں۔ انہوں نے سب قوموں کو پیغام دیا کہ وہ بھی اپنے یہاں تمام باشندوں کے لیئے یکساں اور مساوی حقوق تسلیم کریں تب یورپ کے تمام بادشاہ اس خوف سے لرز اٹھے کہ کہیں یہ آگ ان کے ملکوں کے اندر بھی نہ بھڑک اٹھے اور ان کے تخت بھی جل کر خاک نہ ہو جائیں۔ چنانچہ انہوں نے اس تحریک کو کچل دینے کا تہیہ کر لیا۔ اور چاروں سمتوں سے فرانس پر حملہ بول دیا۔ دوسری طرف جمہوریہ فرانس کے لیڈروں نے یہ اعلان جاری کیا۔ کہ ہمارا وطن موت کے دہانہ پر کھڑا ہوا ہے اس لیئے ایک ایک بچہ کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے وطن کی حفاظت کی راہ میں قربان ہو جائے۔ اس اعلان کی گونج فرانس کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ اور اس آواز پر جوان، بوڑھے، عورت، مرد، امیر غریب، ادنیٰ اعلیٰ، غرض بچہ بچہ، بوڑھا بوڑھا، اپنا ولولہ انگیز قومی ترانہ گاتا ہوا گھر سے باہر نکل آیا — غریب فرانسیسی عوام کا یہ ہجوم اگرچہ چیتھڑے لگائے ہوئے تھا، نیم فاقہ کشی کی حالت میں مبتلا تھا، اور شدید ترین سردی میں اس کے پاؤں میں جوتے تک نہ تھے لیکن وہ حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار اپنے ہاتھوں میں بندوق اٹھائے ہوئے

—परित्राणाय . . . विनाशाय च दुष्कृताम्—

شر پسندوں کی بربادی اور اپنے گھروں کی حفاظت کے لیئے پورے جوش کے ساتھ آگے آیا اور اس نے پوری جرأت کے ساتھ یورپ کی متحدہ طاقت کا سامنا کیا، فرانس کی اس فوج کے سامنے یورپ کی متحدہ طاقت تھم نہ سکی۔ اس وقت اس فوج کے ساتھ فرانس کا وہ ہیرو موجود تھا جو آزادی و مساوات کی اس تحریک کا رہنما تھا، اور جس کی انگلی کے ایک اشارہ پر ساری دنیا لرزا اٹھتی تھی، اس ہیرو کا نام تھا نپیولین، تلوار کی دھار اور سنگین کی نوک سے اس نے یورپ کی ہڈی ہڈی میں آزادی، مساوات اور اخوت کا پیغام اتار دیا۔ اور اس طرح سہ رنگا "کوکاڈ" کو فتح مندی نصیب ہوئی، بعد میں نپیولین فرانس کا بادشاہ بن بیٹھا۔ اور اس کامیابی کے ساتھ فرانسیسی سلطنت کا شیرازہ باندھا اور پائیدار حکومت کا سنگِ بنیاد رکھا۔

انجام کار ولیعہد نہ ہونے کی وجہ سے اس نے اپنی ملکہ جوزفین کو طلاق دے دی، جو درحقیقت اس کی خوش نصیبی کا ایک فرشتہ تھی اور اسے طلاق دے کر اس نے شاہ اسٹریا کی بیٹی سے شادی رچالی، لیکن جوزفین کو چھوڑتے ہی اس کی قسمت پلٹ گئی۔ اور اس کی فوج روس کے خلاف ایک مہم کے دوران میں برف کے طوفانوں کا شکار ہو گئی۔ یورپ کو جب یہ سنہرا موقع ملا تو اس نے نپیولین کو مجبور کر دیا کہ وہ تاج و تخت کو خیرباد کہہ دے اور ایک جزیرہ میں جلاوطنی کی زندگی بسر کرے، اور اس طرح یورپ نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر فرانس کے قدیم شاہی خاندان کے ایک فرد کو از سرِ نو فرانس کے تختِ حکومت پر لا بٹھایا۔

زخمی شیر کی طرح نپیولین ایک بار پھر اس جزیرہ سے فرار ہو کر فرانس آیا جس میں وہ جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا تھا، پورے فرانس نے ایک بار پھر اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا، اور پوری قوم اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئی۔ اور فرانس کا فرماں روا یہ دیکھ کر کہ نپیولین پھر آ گیا ہے شاہی محل سے فرار ہو گیا۔ لیکن نپیولین کے مقدر نے اسے ایک بار پھر ٹھکرا کر

مادی اور یہ ٹھوکر کھاکر وہ پھر کبھی نہ اُٹھ سکا! پورا یورپ ماضی کی طرح ایک بار پھر اس کے خلاف متحد ہو گیا۔ اور واٹرلو کے میدان میں اسے شکست کھانی پڑی۔ نیپولین نے خود کو ایک انگریز جنرل کے حوالے کر دیا۔ اور انگریزوں نے اسے عمر قید کی سزا دے کر ایک دور افتادہ جزیرہ St. Helena میں قیدی بناکر ڈال دیا۔ اور دوبارہ فرانس کے شاہی خاندان کی ایک فرد کو تختِ شاہی پر لاکر بٹھا دیا، بعد میں فرانسیسی عوام میں ایک بار پھر بے چینی پھیل گئی۔ اور انہوں نے قدیم نظامِ شاہی کا تختہ اُلٹ دیا۔ اور از سرِ نو جمہوری نظام کو اس کی جگہ قائم کیا، کچھ عرصہ بعد نیپولین اعظم کے ایک بھتیجہ کو پھر عوام میں مقبولیت حاصل ہو گئی، اور وہ سازشوں کے ذریعہ بادشاہ بن بیٹھا۔ یہ تھا نیپولین سوم! کچھ عرصہ تک تو وہ بڑی طاقت اور شان و شوکت کے ساتھ حکومت کرتا رہا۔ لیکن جرمنوں سے ایک جنگ میں شکست کھانے کی بنا پر اسے تاج و تخت سے محروم ہونا پڑا۔ اور فرانس میں ایک بار پھر جمہوری نظام قائم ہو گیا۔ اور تب سے اب تک فرانس میں جمہوری نظام قائم ہے اور وہ ایک جمہوری ملک ہے!

---



پرم ہنس رام کرشن کی وفات کے بعد بڑانگر کے مٹھ میں ۱۸۸۷ء میں سوامی جی چادر اوڑھے، مالا پہنے کھڑے ہیں۔
ان کے ساتھ ان کے دوسرے گرو بھائی بھی ہیں۔

# اِرتقائے تمدّن

نظریۂ اِرتقا جو ہندوستان کے ہر ایک مکتبِ خیال کا سنگِ بنیاد ہے اب یورپ کی فزیکل سائنس (physical science) میں بھی داخل ہو گیا ہے، سوائے ہندوستان کے تمام دیگر ممالک کے مذاہب کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ کائنات اپنی ترکیب میں مختلف اجزا سے عبارت ہے جو ایک دوسرے سے قطعی طور پر مختلف اور جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں، خالق، فطرت اور بشر، یہ تینوں اپنی اپنی جگہ علیحدہ حیثیت رکھتے ہیں اور یہ تینوں اپنی جداگانہ حیثیت میں ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہیں، اسی طرح درندے، پرندے، کیڑے مکوڑے، پیڑ پودے، مٹی، پتھر، دھاتیں وغیرہ ہیں، اور ان سب میں بیّن فرق موجود ہیں، خالق نے ان سب چیزوں کو خلق کیا، اور ازل ہی میں انہیں الگ الگ کر دیا۔

علم یہ ہے کہ کثرت میں وحدت تلاش کی جائے اور جو چیزیں ہماری ظاہری نگاہوں کو ایک دوسرے سے مختلف و متفرق دکھائی دیتی ہیں، ان میں وحدت کا رشتہ قائم کیا جائے، وحدت کا یہ رشتہ جو مختلف و متفرق اشیاء میں بشر ڈھونڈ نکالتا ہے، اسی کا نام ہے قانونِ فطرت!

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ہماری تعلیم، ہماری عقل اور ہماری فراست، یہ سب چیزیں ہماری روحانیت سے تعلق رکھتی ہیں اور ہم مذہب ہی میں ان سب کی توجیہات پاتے ہیں، مغرب کے لوگ ان چیزوں کے ظہور اور کارفرمائی کو جسمانی و سماجی میدانوں میں دیکھا کرتے ہیں، قدیم ہندوستان کے مفکر رفتہ رفتہ یہ سمجھے تھے کہ نظریۂ تفریق میں غلطی ہے اور یہ کہ مختلف و متفرق اشیاء میں بھی وحدت و ہم آہنگی کا ایک رشتہ موجود ہے اور یہ رشتۂ وحدت پوری کائنات کو باندھے ہوئے ہے درختوں، جانوروں، انسانوں، دیوتاؤں یہاں تک کہ ایشور کی ذات بھی اس رشتۂ وحدت میں منسلک ہے، اور بالآخر اس نظریہ میں منتہا تک پہنچے اور انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ ہر چند سب کچھ متفرق دکھائی دیتا ہے، لیکن یہ ایک ہی کی کارفرمائی ہے، ایک ہی کا کرشمہ ہے، اور ایک ہی کا ظہور ہے اور اسی "ایک" کا نام ہے برہمن، نظریۂ تفریق غلط ہے اور وہ اسے مایا، اور یہ یا جہالت سے تعبیر کرتے ہیں اور یہاں علم کا خاتمہ ہو

---

جاتا ہے۔

ہندوستان کی بات چھوڑیئے! اگر بدیش میں کوئی اِس بات کو نہیں سمجھ سکتا تو اسے عالم یا پنڈت کیسے مانا جا سکتا ہے، لیکن بدیشوں کے عالم اور دانشور اسے سمجھ رہے ہیں، اپنے ڈھنگ سے سمجھ رہے ہیں یعنی سائنس کے ذریعہ لیکن وحدت کثرت سے کس طرح بدل گئی، یہ بات نہ ہم لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں نہ ان لوگوں ہی کی سمجھ میں آتی ہے، ہم لوگوں نے تو یہ سمجھ لیا ہے کہ یہ بات سمجھنا ہماری حدود عقل سے آگے کی بات ہے اور ان لوگوں نے بھی ایسا ہی کیا ہے، وہ "ایک" کون کون سی شکل اختیار کرتا ہے، کس طرح مختلف اقسام کی اشیاء اور مختلف افراد میں ظہور کرتا ہے اِس بات کو سمجھا جا سکتا ہے اور اِسی بات کی تحقیق و تفتیش کا نام ہے سائنس!

اِسی وجہ سے مغرب کے سب ہی لوگ ارتقاء کے نظریہ کو مانتے ہیں، چھوٹے جانور رفتہ رفتہ بڑے جانور بنتے ہیں اور بڑے جانور بعض دفعہ زوال کی طرف مائل ہو کر چھوٹے اور کمزور بن جاتے ہیں اور ایک وقت آنے پر فنا ہو جاتے ہیں۔ آدمی بھی ایک دم ہی اپنی مہذب صورت میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس زمانہ میں مغرب کا کوئی بھی مفکر یہ بات نہیں مانتا کہ آدمی اچانک اپنی موجودہ صورت میں پیدا ہو گیا، اس لئے کہ اس بات کی شہادتیں موجود ہیں کہ چند ہی سو برس پہلے تک آدمی کے آبا و اجداد جنگلی تھے اور یہ بات بھی نہیں مانی جاتی کہ اتنے کم وقفہ میں آدمی میں اتنی بڑی تبدیلی آگئی کہ وہ جنگلی جانور سے بدل کر متمدن بشر بن گیا۔ لہٰذا وہ یہ خیال رکھتے ہیں کہ آدمی کا بتدریج ارتقاء ہونا چاہیئے، وہ غیر مہذب و غیر متمدن حالت سے آہستہ آہستہ نکلا اور پھر آدمی بنا۔

ابتدائی عہد کا بشر اپنا کام لکڑی اور پتھر سے چلا لیا کرتا تھا، وہ کھال اور پتوں سے ستر پوشی کیا کرتا تھا، پہاڑیوں کے غار میں رہتا تھا، پتوں سے ڈھانپ کر اس قسم کی جھونپڑیاں بنایا کرتا تھا جس قسم کے گھونسلے پرندے بنایا کرتے ہیں اور اس حالت میں اس نے اپنی عمر کا ایک زمانہ بسر کیا، ہر ملک میں جہاں آثار قدیمہ کی کھدائی ہوئی اس قسم کی شہادتیں ملی ہیں اور بعض مقامات تو اب بھی موجود ہیں جہاں ابتدائی زمانہ کے بشر کی شکل و شباہت رکھنے والے آدمی موجود ہیں آہستہ آہستہ آدمی نے دھات کا استعمال سیکھا، نرم دھات جیسے ٹین اور تانبہ اس کے ہاتھ لگا تو اس نے ان دھاتوں سے اوزار بنائے اور پھر ان اوزاروں سے کام لے کر اس نے ہتھیار ایجاد کیے، یونان، بابل، اور مصر کے متمدن بشر کو مدت مدید تک لوہے کا پتہ نہیں چلا اور وہ لوہے کے استعمال سے واقف نہیں ہوا، اس وقت بھی جب کہ انہوں نے کتابوں کی تصنیف شروع کر دی اور سونے چاندی کا استعمال شروع کر دیا تھا، لوہے کا پتہ نہیں چلا تھا، نئی دنیا امریکہ کی ابتدائی آبادیوں میں میکسیکو، پیرو اور مایا وغیرہ کی جاتیاں دوسروں سے زیادہ متمدن تھیں، وہ بڑے بڑے مندر بناتی تھیں جن میں سونے چاندی کا خوب استعمال ہوتا تھا، یہاں تک کہ سپین والوں نے سونے چاندی کے لالچ میں ان کو تباہ و برباد کر ڈالا، لیکن یہ سب کام چکمک پتھر کے اوزاروں سے کیے جاتے تھے، لوہے کا استعمال وہ کبھی نہیں جانتے تھے کہیں بھی لوہے کا نام و نشان تک نہ تھا۔

ابتدائی عہد کا بشر جانور اور مچھلی کا شکار تیر کمان سے کرتا تھا یا جال کے ذریعہ شکار کھیلا کرتا تھا، اور اسی شکار پر گزر بسر کرتا تھا، رفتہ رفتہ اسے کاشت کرنے کا طریقہ معلوم ہوا۔ اور اس نے مویشی پالنے شروع کیے۔ وہ ان جنگلی جانوروں کو پالتو

بنایا کرتا تھا، جو اس کے کام آتے تھے، جیسے بیل، گائے، گھوڑا، ہاتھی، اونٹ، بکرا، بھیڑ، مرغ، اور اسی طرح کے دوسرے پرند و چرند! ان سب جانوروں میں کتا سب سے پہلا جانور ہے جو آدمی کا دوست اور رفیق بنا ہے!

اس کے بعد کھیتی باڑی شروع ہوئی، جو پھل میوے ساگ سبزی اور دیگر اجناس آج کل انسان کھاتا ہے وہ اس زمانے کی پیداوار سے بالکل ہی مختلف ہیں۔ جب جنگلی حالت میں کھیتی باڑی ہوا کرتی تھی، آدمی کی کوشش اور تجربہ سے جنگلی پھل اس قابل ہو گئے کہ دانتوں کے ساتھ آسانی سے کھائے جا سکیں اور جنگلی گھاس میں دھان پیدا ہونے لگا جس سے چاول نکالا گیا، اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ پوری کائنات تغیر پذیر ہے اور فطرت خود اپنے عمل کے ذریعہ لگاتار تبدیلی پیدا کر رہی ہے لیکن یہ تبدیلی بہت آہستہ آہستہ ہو رہی تھی مگر جب انسان نے اس دھرتی پر قدم رکھا تو اس نے اپنی کوشش سے تغیر پذیری کے عمل کی رفتار میں اضافہ کر دیا، وہ ایک ملک کی پیداوار درخت اور اسی طرح کی دوسری چیزیں دیگر ممالک میں لے کر پہنچا اور ایک کی قلم دوسرے میں لگا کر نئی اقسام کے جانور اور پیڑ معرض وجود میں لانے لگا۔

ابتدائی عہد کا آدمی شادی نہیں کرتا تھا، دھیرے دھیرے ازدواجی تعلقات پیدا ہونے لگے، پہلے پہلے سب سماجوں میں شادی کا رشتہ ماں پر منحصر رہتا تھا باپ کی کوئی قید نہیں تھی، ماں کے نام پر اولاد کا نام ہوا کرتا تھا، ساری دولت عورت کے ہاتھ میں رہتی تھی، وہی اولاد کو پالتی پوستی تھی، لیکن جیسے جیسے وقت گزرا، دولت مرد کے ہاتھ میں آتی گئی اور اس دولت میں عورتیں بھی شامل تھیں جو مرد کے ہاتھ میں آ گئیں، مرد کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ ساری دولت اس کی ہے اس لئے کہ اس نے محنت کر کے یہ دولت یا تو کھیتوں کے ذریعہ پیدا کی ہے یا پھر لوٹ مار کر کے جمع کی ہے اور اگر اس دولت میں سے کوئی حصہ بٹانا چاہے تو وہ اس کی مخالفت کرے گا۔ اس دعویٰ کے بعد انجام کار شادی کا سلسلہ چل پڑا۔ برتن باسن اور غلاموں کی طرح عورتیں بھی مرد کی محکومی میں آ گئیں۔ قدیم رواج یہ تھا کہ ایک دل کا مرد دوسرے دل کی عورت کے ساتھ شادی کرتا تھا۔ یہ شادی بھی عورت کو زبردستی چھین لانے پر ہی ہوا کرتی تھی، بعد میں یہ رواج بدل گیا لیکن اس کی جگہ سوئمبر ہونے لگا، لیکن آج بھی ان قدیم رواجوں کے مدھم مدھم نقوش شادیوں کے رواجوں میں ابھرتے دکھائی دیتے ہیں، اس زمانہ میں بھی شوہر پر حملہ کرنے کی نقل اتاری جاتی ہے اور یہ بات سب ہی ممالک میں دکھائی دیتی ہے بنگال اور یورپ میں دولہا پر چاول پھینکے جاتے ہیں، شمالی ہند میں دلہن کی سہیلیاں دولہا اور براتیوں کو گالیاں دیتی ہیں اور اس طرح حملوں پہ حملے کئے جاتے ہیں۔

جب سوسائٹی بنی تو مختلف ممالک کی مطابقت میں ہر سوسائٹی بھی ایک دوسری سے مختلف رہی جو لوگ سمندر کے سواحل پہ رہتے تھے ان کی گزر بسر ماہی گیری پر منحصر تھی، جو پہاڑوں پہ رہتے تھے وہ بھیڑیں چراتے تھے اور جو ریگستانوں میں آباد تھے وہ بکریاں اور اونٹ چراتے تھے، کتنے ہی لوگ جنگلوں میں رہ کر شکار کیا کرتے تھے، جنہوں نے مناسب و موزوں زمین پا کر کھیتی باڑی کرنا سیکھا، وہ بھوک کی آگ سے نجات پا کر غور و خوض کرنے لگے کہ انہیں سوچنے اور فکر کرنے کا وقت بھی ملتا تھا، اور اس طرح وہ دن بدن زیادہ مہذب و متمدن بنتے گئے، لیکن تمدن میں جیسے جیسے ترقی آئی، ان کی جسمانی طاقت ویسے ویسے گھٹتی گئی اور وہ کمزور سے

کمزور تر ہوتے گئے۔ جو لوگ کھلی ہوا میں رہتے تھے اور جن کی غذا جانوروں کے گوشت پر منحصر تھی اور وہ لوگ جو گھروں کے اندر رہتے تھے اور ساگ سبزی وغیرہ کھایا کرتے تھے، ان کے درمیان جسمانی طاقت کا فرق روز بروز بڑھتا ہی گیا۔ شکاری گڈریا اور راہی گیر ڈاکو بن گئے اور جب بھی ان کے پاس خوراک کی قلت ہوتی تو وہ دوسروں کو لوٹنا شروع کر دیتے اور ان لوگوں پر حملے کرنے لگتے جو میدانوں میں رہا کرتے تھے۔ ان میدان کے رہنے والوں نے اپنے تحفظ کی خاطر خود کو مجتمع اور متحد کر کے بڑے بڑے گروہ بنائے اور اس طرح چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے قیام کی ابتدا ہوئی۔

دیوتاؤں کا مجوزہ جن اناج ہوتا تھا، وہ سب متمدن ہوتے تھے اور گاؤں، شہر، قصبات نیز باغات میں رہا کرتے تھے اور بنے ہوئے کپڑے پہنا کرتے تھے، لیکن اسروں کا قیام پہاڑوں، ریگستانوں یا سمندر کے ساحلوں پر ہوا کرتا تھا، ان کے بھوجن میں جنگلی جانوروں کا گوشت اور جنگل میں پیدا ہونے والے پھل اور میوے وغیرہ ہوا کرتے تھے، کپڑے بھی بکری کے چمڑے وغیرہ کے ہوتے تھے جنہیں وہ مختلف چیزوں کے بدلے میں دیوتاؤں سے حاصل کر لیتے تھے، دیوتا لوگ جسمانی اعتبار سے کمزور ہوتے تھے اور ان سے تکلیف برداشت نہ ہوتی تھی، اسر جسمانی اعتبار سے بہت تندرست اور طاقتور ہوا کرتے تھے، وہ مشقت کرنے اور تکلیف جھیلنے میں بڑے مضبوط ہوتے تھے۔

اسروں کے پاس جب بھی خوراک کی قلت ہوتی تھی وہ لوگ گروہ بنا کر پہاڑوں یا سمندر کے ساحلوں کی جانب سے آتے اور گاؤں یا شہر پر حملہ کرتے اور اسے لوٹ لے جاتے، بالعموم وہ دولت اور غلہ لوٹنے کی غرض سے دیوتاؤں پر حملہ کرتے تھے، اگر ان کے مقابلہ میں بہت سے دیوتا جمع نہ ہو سکتے تھے تو پھر ان کی ہلاکت یقینی ہوتی، دیوتاؤں کی عقل تیز تھی، چنانچہ وہ طرح طرح کے ہتھیار ایجاد کرنے لگے، برہم استر، گرو ڈاستر، وشنو استر، شو استر — یہ سب دیوتاؤں کے ہتھیار تھے اور اس زمانہ کے لحاظ سے بہت ہی حیرتناک تھے، اسروں کے ہتھیار بالکل معمولی ہوا کرتے تھے، لیکن ان کے جسم میں طاقت بہت ہوتی تھی، ان اسروں نے کئی بار دیوتاؤں کو ہرا دیا۔ لیکن وہ تمدن سے واقف نہیں تھے، وہ کھیتی باڑی بھی نہیں جانتے تھے اور نہ ہی اپنی عقل کسی بات کو سمجھنے میں استعمال کر سکتے تھے۔

فتح مند اسر اگر مفتوح دیوتاؤں کے علاقوں پر حکومت کرنا چاہتے تھے تو دیوتاؤں کی عقلمندی کی بنا پر انہیں تھوڑے ہی دنوں کے بعد پھر جنگل اور پہاڑوں کی طرف بھاگنا پڑتا تھا، اسی لئے وہ صرف لوٹ مار کر کے اپنے اپنے مقامات کو لوٹ جاتے تھے، جب دیوتا لوگ متحد ہو کر اسروں پر حملہ کرتے تھے تو اس وقت وہ یا تو سمندر میں جا چھپتے تھے یا پہاڑوں اور جنگلوں میں جا کر روپوش ہو جاتے تھے، ان دونوں میں لڑائیاں چلتی رہیں اور اس اثنا میں ان کے درمیان اختلاط و اشتراک کا عمل بھی شروع ہو گیا۔

ان مختلف اقسام کی نسلوں کے اختلاط سے ہماری ماڈرن سوسائیٹیوں، عادات و اطوار اور رسوم و رواج کا ارتقاء ہوا، نئے نظریات پھوٹے اور نئے علوم کی تخم ریزی ہوئی۔ روسیوں کا ایک طبقہ آرام اور ضرورت کی چیزیں تیار کرنے میں لگ گیا اور دوسرا

---

لے دیو اور اسر کی اصطلاح یہاں اسی مفہوم میں استعمال کی گئی ہے جس مفہوم میں یہ اصطلاح گیتا میں استعمال ہوئی ہے یعنی دیوتاؤں سے مراد وہ نسلیں ہیں جن میں اوصاف علویہ (الٰہیہ) تھے اور اسر وہ نسلیں ہیں جن میں اوصاف سفلیہ تھے۔

---

صفحہ ۶۸ — مشرق و مغرب

جسمانی اور دماغی محنت و مشقت کرنے لگا۔ ایک دوسرے طبقہ نے تحفظ و دفاع کی ذمہ داری قبول کر لی اور چیز سے چیز کا تبادلہ ہونے لگا لیکن جب ایسا ہوا تو کچھ چالاک لوگ آگے آئے اور وہ ان چیزوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے لگے، اس وعدہ پر کہ وہ ان چیزوں کی اجرت ادا کریں گے۔ انہوں نے ان چیزوں کی قیمت میں سے بطور حق المحنت اپنا نفع لے لیا۔ اور اس نفع میں اصل قیمت کا بڑا حصہ ہڑپ کر گئے۔ ایک شخص زمین جوتتا، دوسرا پیداوار کی حفاظت کرتا، تاکہ وہ ڈاکوؤں کی لوٹ سے محفوظ رہے تیسرا اس پیداوار کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا اور چوتھا اس کو خریدا کرتا۔ ان چاروں کے چکر میں کسان خالی ہاتھ رہ گیا، جو پیداوار کا محافظ بنتا، وہ طاقت کے ذریعہ اپنا حق المحنت بڑے سے بڑے حصہ کی صورت میں وصول کر لیتا، تاجر جو پیداوار کو بازار میں لاتا، اپنا نفع وصول کرتا، اور خریدار کو یہ تمام نفع جوڑ کر چیزوں کی قیمت چکانی پڑتی اور اس پر ناگوار بوجھ پڑتا، جو محافظ تھا وہ بادشاہ کہا جانے لگا، اور جو پیداوار کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا تھا اسے تاجر کہا جانے لگا۔ یہ دونوں اگرچہ کوئی شے پیدا نہیں کرتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ ہر چیز کی پیداوار میں سے روغن روغن ہڑپ کر جایا کرتے تھے، کسان محنت کرتا تھا، لیکن اس کی محنت کا پھل یہ دونوں کھا لیا کرتے تھے، بیچارہ غریب کسان جو کچھ پیدا کرتا تھا اس کے ہاتھ سے نکل جاتا تھا اور وہ بسا اوقات فاقہ کشی کی حالت میں چلا یا کرتا تھا — بھگوان دیا کر، بھگوان دیا کر!

بہرحال وقت کی رفتار کے ساتھ ان تمام معاملات کی پیچیدگیاں بڑھتی گئیں اور گرہوں پر گرہیں پڑتی رہیں اور اس جال کے اندر سے ہماری موجودہ مخلوط سوسائٹی کا ارتقاء ہوا۔ لیکن سابقہ کردار کی نشانیاں اب بھی نظر آتی ہیں قطعی طور پر فنا نہیں ہوتی ہیں، جو لوگ پہلے سے بھیڑیں چراتے تھے، مچھلیاں پکڑ کر کھاتے تھے، وہ متمدن ہونے پر بھی لوٹ مار اور چوری کرنے لگے، ان کے آس پاس جنگل بھی نہیں، وہ لوگ شکار کرتے، پہاڑ بھی نہیں تھا کہ بھیڑ چلتے — جب ایک متمدن سوسائٹی میں اتفاقیہ طور پر اس کا جنم ہوا۔ اور اسے شکار، ماہی گیری اور بھیڑیں چرانے کے مواقع میسر نہ آئے تو اپنی فطرت کے تقاضے کے مطابق وہ لوٹ مار اور چوری کی طرف راغب ہو گیا، اور سوائے اس کے وہ کرتا بھی تو کیا کرتا؟ پرانوں کے عہد میں ان شہرت یافتہ عورتوں[1] کی لڑکیاں جن کے نام صبح و شام لئے جاتے ہیں، ایک وقت میں ایک سے زیادہ شوہر نہیں کر سکتی تھیں اور اگر وہ ایک سے زیادہ شوہر کرنا چاہتیں یا کرتیں تو وہ ویشیا یا طوائف بن جاتیں۔ اس طرح مختلف و متفرق کردار کے مہذب و غیر مہذب، متمدن و غیر متمدن دیوتاؤں اور راکشسوں کا مزاج رکھنے والے لوگ پیدا ہوئے اور ان کے اختلاط سے ماڈرن سوسائٹی کی صورت بنی، یہی وجہ ہے کہ ہم ہر سماج میں دیوتاؤں کی مختلف لیلائیں دیکھتے ہیں — سادھو نارائن اور ڈاکو نارائن وغیرہ! پھر کسی سماج کا کیریکٹر کیا ہے اس کا فیصلہ دیوی اور راکشسی کردار رکھنے والے لوگوں کی تعداد پر کیا جانے لگا،

پورا ایشیائی تمدن میدانوں میں بڑے بڑے دریاؤں کے کنارے جیسے گنگا یا نگسٹی کیانگ اور دجلہ و فرات کے

---

[1] اہلیہ، تارا، مندودری، کانتی اور درپدی۔

---

زرخیز ساحلوں پر پروان چڑھا ان تمام سماجوں کی بنیاد راحت پر مبنی تھی۔ اور ان سب میں دیوی فطرت و مزاج کا غلبہ تھا، اس کے برعکس یورپین سماج پہاڑی علاقوں میں یا سمندر کے سواحل پر پروان چڑھا، اس سماج کی بنیاد لوٹ مار پر مبنی تھی اور اس لئے اس پر اسُری فطرت و مزاج کا غلبہ تھا۔

اگر آجکل دیکھا جائے تو وسطی ایشیا اور صحرائے عرب اسُر کا وطن یا ان کا مسکن اور مرکز تھا، ان جگہوں پر جمع ہو کر اسُر کی اولاد چرواہوں اور شکاریوں نے تمدن دیوتاؤں کا تعاقب کیا اور ان پر حملے کر کے انہیں ساری دنیا میں ادھر ادھر منتشر کر ڈالا۔

عہدِ قدیم کے یورپ میں انسانوں کی ابتدائی نسل بلاشبہ پہلے ہی سے موجود تھی، پہاڑوں کے غاروں میں یہ نسل رہا کرتی تھی، اس کے جو لوگ زیادہ عقلمند تھے وہ تھوڑے پانی والے تالابوں میں مچان باندھ کر رہا کرتے تھے، اور گھر بار بنایا کرتے تھے، وہ لوگ اپنے سب کام چکیک پتھر سے بنے ہوئے بھالوں، چاقوؤں اور کلہاڑیوں وغیرہ سے ہی چلایا کرتے تھے۔

رفتہ رفتہ ایشیائی نسلوں کی لہر یورپ پر پھٹ پڑی، اور اس کے نتیجہ میں یورپ کے کچھ علاقوں میں تمدن کی داغ بیل پڑ گئی، روس کے بعض لوگوں کی زبان جنوبی ہندوستان کی زبانوں سے ملتی جلتی ہے؛ لیکن یورپ کا زیادہ تر علاقہ غیر متمدن ہی رہا۔ یہاں تک کہ ایشیائے کوچک سے ایک اور متمدن قوم اٹھی اور اس نے یورپ کے ملحقہ علاقوں کو فتح کر لیا۔ اور ایک نئے تمدن کی ابتدا کی جس کی قدریں اعلیٰ اور بلند تھیں، ہم لوگ ہم قوم کو "یدن" کہتے ہیں لیکن یورپین اسے گریک (Greeks.) کے نام سے پکارتے ہیں۔

اس کے بعد اٹلی میں رومن نام کی ایک وحشی نسل نے اٹرسکن ( Etruscans. ) نام کی ایک متمدن جاتی کو شکست دی اور اس کی تہذیب و علم کی روشنی لے کر اس فاتح نسل نے مفتوح نسل کے ٹوٹے پھوٹے تمدن کے کھنڈرات پر اپنے تمدن کی تعمیر کی، پھر رومن اپنے ہتھیار لے کر نکلے اور انہوں نے یورپ کے جنوب مغرب میں تمام وحشی قبائل کو شکست دے کر اس سارے علاقہ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ صرف وہ وحشی قبائل جو شمالی علاقوں میں جنگلوں میں رہا کرتے تھے، آزاد رہے۔ وقت کی گردش کے ساتھ رومن آرام طلب اور عیش پسند بن گئے، چنانچہ پھر ایک وقت آیا کہ ایشیا سے اسُروں کی افواج چلیں اور انہوں نے یورپ پر دھاوا بول دیا۔ ان اسُروں کے حملوں کی وجہ سے شمالی یورپ سے بھاگے ہوئے وحشی قبائل رومن سلطنت پر ٹوٹ پڑے اور روم برباد ہو کر رہ گیا۔ اس ایشیائی حملہ کے ردِ عمل کے طور پر ایک نئی نسل ابھری جو یورپ کے وحشی قبائل اور بچے کھچے رومیوں اور یونانیوں کے اختلاط سے پیدا ہوتی تھی، اس وقت روم نے یہودیوں کو فتح کر لیا تھا اور انہیں ان کے گھروں سے مار کر نکال دیا تھا، یہ یہودی یورپ میں پھیلے اور اپنے ساتھ وہ اپنا مذہب بھی لیکر آئے جو یورپ کے لئے نیا تھا، عیسائیت بھی یورپ میں پھیلی۔ یہ تمام مختلف نسلیں مختلف خیالات و نظریات اور اسُروں کے مختلف جنگجو رسالے جو لڑائیوں کی گرمی سے دہک رہے تھے یورپ میں مخلوط ہوئے اور ان کے اختلاط سے ماڈرن یورپ کی نسل کا آغاز ہوا۔

# آریائی تہذیب

ہندوؤں جیسا کالا رنگ، اتر پردیش کا دودھ جیسا گورا رنگ، کالے بھورے اور سفید بال، کالی بھوری اور نیلی آنکھیں ٹھیک ہندوؤں جیسی ناک، چہرہ اور آنکھیں تیز چینیوں جیسا چپٹا دہانہ — ان سب نسلی خصوصیات سے مل کر یورپ کی ایک وحشی اور بہت وحشی قوم کی تشکیل ہوئی کچھ عرصہ تک تو وہ آپس میں ہی لڑتی بھڑتی رہی جو لوگ شمال میں ڈاکوؤں جیسی زندگی بسر کر رہے تھے، انہوں نے ترقی پا کر ان لوگوں کو خوفزدہ کیا جو متمدن زندگی بسر کرنے لگے تھے اور نسبتاً متمدن نسلوں کو ہلاک کر ڈالا۔ اسی اثنا میں اٹلی کے پوپ اور جنوب میں قسطنطنیہ شہر کے پیٹریاچ (PATRIACH) نے اس وحشی نسل اور اس کے راجہ پر اپنا اقتدار مسلط کرنا شروع کر دیا۔ اور انہیں اپنا تابع بنا لیا۔

دوسری جانب صحرائے عرب سے مسلمان اٹھے، بدو عرب جو ایک عظیم پیشوا کی تعلیمات سے پرجوش بنے ہوئے تھے، ایک ایسی طاقت کے ساتھ چلے اور دنیا میں پھیلے کہ ان کی طاقت کا مقابلہ کرنا مشکل ہو گیا، یہ عرب مشرق و مغرب دونوں جانب سے ایک طوفانی لہر کی طرح یورپ میں داخل ہوئے اور اس لہر کے ساتھ علم کی روشنی بھی تھی اور قدیم ہندوستان و یونان کا کلچر بھی تھا، وہ اسے لے کر یورپ میں آئے۔

وسطی ایشیا کے ایک اثری قبیلہ نے جس کا نام سلجوق تاتار تھا اسلام قبول کر لیا۔ اور ایشیائے کوچک کو فتح کر ڈالا۔ اور دوسرے ایشیائی ممالک پر بھی غلبہ حاصل کر لیا۔ اسلامی فتوحات کی لہر میں ساری دنیا لپٹ گئی۔ لیکن ہندوستان میں اس لہر کو پسپا ہونا پڑا۔ مسلمانوں نے سندھ پر حملہ کیا، لیکن وہ اس پر اپنا قبضہ قائم نہ رکھ سکے، اور اس کے بعد انہوں نے کوئی دوسری کوشش نہیں کی۔

لیکن چند صدیوں بعد جب ترکوں اور تاتاریوں نے بدھ دھرم چھوڑ کر اسلام قبول کیا تو اس وقت انہوں نے ہندوؤں، ایرانیوں اور عربوں کو یکساں طور پر فتح کیا اور انہیں اپنی رعایا بنایا، ہندوستان کے تمام مسلم فاتحین میں کوئی بھی عرب یا ایرانی نسل کا بادشاہ نہیں تھا، وہ سب کے سب یا تو ترک تھے یا تاتاری تھے، راجپوتانہ میں تمام مسلم حملہ آور ترک کہلاتے تھے، اور یہ ایک صحیح تاریخی حقیقت ہے راجپوتانہ کے چرواہوں کا یہ گیت ہے — تورو گنگو یودھی جور — یعنی ترک بہت طاقتور ہوتے ہیں! اور یہ بات بھی سچ ہی ہے، قطب الدین

سے لے کر مغل سلاطین تک سب کے سب تاتاری تھے اور یہ وہی نسل ہے جس سے ترکی تعلق رکھتے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ تاتاریوں نے اسلام قبول کر لیا اور ان کے چلپٹے گول چہرے ہندو اور ایرانی عورتوں سے شادیاں کرنے کی وجہ سے بدل گئے۔ یہ اُمروں کی قدیم نسلیں ہیں وہ آج بھی کابل، ایران، عرب قسطنطنیہ اور قندھار یوں وغیرہ پر حکمرانی کر رہی ہیں اور ایرانی اب بھی ترکوں کے غلام ہیں۔ چین کی وسیع ترین سلطنت بھی منچورین تاتاریوں کی ٹھوکروں میں پڑی ہوئی ہے فرق صرف یہ ہے کہ منچوؤں نے اپنے مذہب کو ترک نہیں کیا اور وہ مسلمان نہیں ہوئے وہ لامائے اعظم کے پیرو ہیں ان امروں نے علم و تہذیب کی کبھی کوئی پرواہ نہیں کی وہ تو صرف لڑائی بھڑائی کے دلدادہ تھے اور صرف وہی بات سمجھتے تھے جس کا تعلق جنگ سے ہوتا تھا اس خون کی آمیزش کے بغیر جنگجوئی کا جذبہ پیدا ہونا ممکن ہی نہیں ہے اور یہی تاتاری خون ہے جو شمالی یورپ کی فوجی سپرٹ میں دکھائی دیتا ہے خصوصیت سے روسیوں کی رگوں میں دوڑنے والے خون میں تین چوتھائی بمقدار تاتاریوں کے خون کی ہے دیوتاؤں اور امروں کی ابھی مدت مدید تک چلتی رہے گی اور اس کے ختم ہونے میں ابھی دیر لگے گی۔ دیوتاؤں نے امروں کی لڑکیوں سے شادی کی اور امران کی دلہنیں چھین لے گئے اس طریقہ سے طاقتور مخلوط نسلوں کی تشکیل و تعمیر ہوئی۔

تاتاریوں نے عرب خلیفہ کے تخت پر قبضہ کر لیا بیت المقدس پر اپنی فتح کا پرچم اڑایا۔ جو عیسائی زائرین کی سب سے زیادہ متبرک جگہ ہے انہوں نے عیسائی زائرین کو بیت المقدس آنے سے روک دیا۔ اور لاکھوں عیسائیوں کو تہہ تیغ کر ڈالا گرجا گھروں کے سربراہ اسی بات پر غصہ سے بھر کر دیوانے ہو گئے، اور انہوں نے پورے یورپ میں اپنے بربری مقلدین اور پیروؤں میں جوش کی لہر دوڑا دی اور ان کے خون میں آگ بھر دی چنانچہ جب ان کی باری آئی تو انہوں نے بادشاہوں کو بھی پھونک ڈالا اور رعایا کی زندگی بھی خاکستر کر ڈالی۔ یورپین بربری گھوڑوں پر سوار ہو کر جوق در جوق ایشیائے کوچک کی جانب دوڑ پڑے تاکہ وہ بیت المقدس کو ناپاک ہاتھوں سے چھڑا لیں۔ ان میں سے بہتوں نے ایک دوسرے کے گلے کاٹے کچھ بیماریوں میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو گئے اور جو باقی بچے انہیں مسلمانوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بہرطور ان جنگلی بربریوں کا خون گرم تھا، اور جیسے ہی مسلمان انہیں مارتے ویسے ہی ان کے تازہ دم جتھے پہنچ جاتے ان میں وحشی پن بدرجہ کمال موجود تھا اور ان کی سب سے مرغوب غذا تھی مسلمانوں کا گوشت! چنانچہ انگریز بادشاہ رچرڈ تک مسلمانوں کے گوشت کو بڑی رغبت کے ساتھ کھاتا تھا۔

متمدن و غیر متمدن لوگوں کی جنگ کا جو نتیجہ نکلا کرتا ہے یہاں بھی وہی نتیجہ نکلا۔ بیت المقدس اور دوسرے مقامات فتح نہ ہو سکے لیکن یورپ میں تمدن کی داغ بیل پڑنے لگی، انگریز، جرمن، فرانسیسی اور دوسری نیم وحشی اور غیر متمدن اقوام جو کھالوں کا لباس پہنتی تھیں اور کچا گوشت کھایا کرتی تھیں ایشیائی تمدن سے آشنا ہوئیں، اٹلی اور دوسرے ممالک کے عیسائی فوجی جنہیں ہم اپنے یہاں کے ناگاؤں سے تشبیہ دے سکتے ہیں اب فلسفہ و منطق کا مطالعہ کرنے لگے اور ان کے طبقات میں سے ایک طبقہ بلاشبہ ادویتیہ ویدانتی بن گیا، اور عیسائیت کو اختیار کرنا ان کے لئے مسخرہ پن قرار پایا، جب انہوں نے دولت اکٹھی کر لی تو یورپ کے بادشاہوں نے پوپ کے ایماء سے حفاظت مذہب کے نام پر انہیں خوب لوٹا اور ان میں سے بہتوں کو فنا کر ڈالا۔

دوسری جانب ایک مسلم قبیلہ جس کا نام مور تھا، سپین میں برسر اقتدار آیا اور اس نے علوم و فنون کے متعدد شعبے کھولے اور یورپ میں پہلی یونیورسٹی قائم کی، اٹلی، فرانس اور انگلستان کے دور افتادہ علاقوں سے بھی تشنہ کام علم اس سرچشمہ سے اپنی پیاس بجھانے

کے لئے دور دور سے شاہی خاندانوں کے بچے تک اس یونیورسٹی میں اخلاق و آداب، شائستگی اور فن حرب و ضرب سیکھنے کی غرض سے آیا کرتے تھے، مکانات، مسجد، محلات اور فن تعمیر کا مظاہرہ کرنے والی فنی عمارتیں نئی وضع اور نئی طرز پر تعمیر ہونے لگیں۔

لیکن پورا یورپ بتدریج، بہت بڑا فوجی کیمپ بن کر رہ گیا، اور یہی صورت اب تک ہے، جب مسلمان کسی سلطنت کو فتح کرتے تو ان کے بادشاہ دولت کا بڑا حصہ اپنے لئے محفوظ کر لیتے اور جو کچھ باقی بچ جاتا وہ اپنے جرنلوں کے درمیان تقسیم کر دیتے، یہ لوگ اپنی جاگیروں کا کوئی لگان بادشاہ کو نہیں دیتے تھے بلکہ وہ اس کے عوض بادشاہ کی فوج کے لئے سپاہی دیا کرتے تھے، اس طرح ایک مستقل فوج کو سدا ملازم رکھنے کی زحمت سے مسلم سلاطین بچ جاتے تھے لیکن ایک طاقتور فوج پھر بھی ان کے حکم کے انتظار میں تیار کھڑی رہتی ہے جو صرف جنگ کے زمانہ میں کام آتی تھی، یہ بادشاہوں کے جاگیرداروں کی فوج ہوا کرتی تھی جو جنگ ہونے کی صورت میں بادشاہ کے احکام کی اطاعت کرتی تھی، یہی دستور اب بھی راجپوتانہ وغیرہ میں پایا جاتا ہے، مغرب میں یہ عسکری نظام مسلمانوں کے ذریعہ پہنچا اور یورپین نے اس نظام کو مسلمانوں سے سیکھا، لیکن جہاں کہیں بھی مسلمان تھے ان میں بادشاہ تھا، اس کے جاگیردار تھے، ان کی فوجیں تھیں، باقی لوگ عام رعایا کی حیثیت رکھتے تھے، یورپ والوں میں بادشاہ، امراء اور افسروں کو چھوڑ کر باقی رعایا جنگ کے زمانہ میں غلام بنالی جاتی تھی اور ہر آدمی کسی نہ کسی امیر یا جاگیردار کا غلام بن کر ہی زندہ رہ سکتا تھا، اسے حکم ملتے ہی جنگ کے لئے کمر کس لینی پڑتی تھی اور میدان میں نکل آنا پڑتا تھا۔

تمدن کے ارتقاء کا مطلب کیا ہے جس پر یورپین باشندے اتنا گھمنڈ کرتے ہیں، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ غلط طریقوں کا جواز ثابت کرتے ہوئے اپنی خواہشات و مقاصد کو کامیابی کے ساتھ حاصل کرنا، چنانچہ حالات کی مطابقت میں چوری، جھوٹ بولنا، کسی کو پھانسی پر لٹکا دینا، یہ سب کچھ جائز سمجھا جانے لگا، اسٹنلے نے اپنے مسلمان پہریداروں کو اس بناپر کوڑے لگوائے کہ وہ بھوکے تھے اور انہوں نے اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے چند روٹیاں چوری کر لی تھیں، یہ کوڑے یورپ کے اس معروف اخلاق کا جواز بھی ہیں کہ یہاں سے نکل جاؤ، ہم اس جگہ پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں، اس کی سچائی کا ثبوت تاریخ فراہم کرتی ہے، یورپین جہاں بھی گئے ہیں انہوں نے مقامی نسلوں کو فنا کر ڈالا ہے لندن میں تمدن کا یہ ارتقا ہے ازدواجی زندگی میں زن و شوہر کے درمیان بے اعتمادی کی صورت میں، اور پیرس میں شوہر کا اپنی بیوی اور بچوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر بھاگ جانا اور خودکشی کر لینا صرف ایک غلطی ہے، ایک جرم نہیں ہے،

اسلامی تہذیب و تمدن جب تیزی سے فروغ پا رہا تھا تو اس کی اشاعت و ترقی کی ابتدائی تین صدیوں کا اسی زمانہ کے مسیحی تمدن سے موازنہ کیجئے، ابتدائی تین صدیوں میں مسیحیت خود کو دنیا سے روشناس کرانے میں بہت کامیاب نہیں تھی لیکن جس دن سے اس نے اپنی سلطنت میں تلوار کو داخل کیا، اس دن کے بعد سے مسیحیت کو اپنا تمدن پھیلانے میں کس چیز سے مدد ملی، سیکولرازم سے یا روحانیت سے؟ مسیحیت نے ان یورپین علماء کو کیا صلہ دیا جو پہلی بار یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ یہ زمین گردش کرنے والا سیارہ ہے، کیا مسیحی ادب قوانین دیوانی و فوجداری یا ادب اور تجارتی پالیسیوں کے تقاضوں کا کوئی جواب دیتا ہے، اب بھی تو "چرچ" دنیوی ادب کو تخلیق کرنے کی اجازت نہیں دیتا! ایک آدمی جو دنیوی علوم اور سائنس میں غلطاں رہتا ہے، اس کے لئے تو اس زمانہ میں بھی سچا کرسچین بننا ممکن نہیں ہوتا! نئے مذہبی احکام کے اعلان تک میں تو کسی فن یا

کسی سائنس کی کھلم کھلا نہ مذمت کی گئی ہے نہ تعریف کی گئی ہے، لیکن اس کے برعکس شاید ہی کوئی علم و فن ہو جس کی قرآن اور محمدؐ کی حدیثوں میں بالواسطہ یا بلاواسطہ حوصلہ افزائی نہ کی گئی ہو، یورپ کے عظیم مفکرین و دلتائیر، ڈارون، بوشنر، فلماریون، ڈکٹر ہیگو اور ان گنت دوسرے لوگوں کی جو موجودہ زمانہ میں دانشور تسلیم کیے جاتے ہیں، مسیحیت نے ہمیشہ ہی مذمت کی ہے اور ان کے خلاف کٹر عیسائیوں نے دشنام طرازی سے کام لیا ہے، دوسری جانب اسلام ان لوگوں کو خدا میں عقیدہ رکھنے والا قرار دیتا ہے، حالانکہ یہ لوگ اسلام کے رسولؐ میں عقیدہ نہیں رکھتے تھے" آئیے اب یہ دیکھیں کہ ترقی کے راستے میں سے رکاوٹیں دور کرنے میں دونوں مذاہب کس حد تک دنیا کے مددگار بنے، اس موازنہ میں یہ ماننا پڑے گا کہ اسلام جہاں کہیں بھی گیا، اس نے مقامی باشندوں کا تحفظ کیا، ان مقامات پہ قدیم نسلیں اب بھی موجود ہیں ان کی زبانیں بھی ہیں اور ان کی قومیت بھی آج تک باقی ہے،

مسیحیت نے یہ کردار کس جگہ دکھایا؟ آج سپین کے عرب کہاں ہیں؟ امریکہ کی مقامی نسلیں کدھر گئیں؟ یورپین یہودیوں کے ساتھ مسیحیت نے کیا سلوک کیا ہے؟ سوائے چند خیراتی اداروں کے یورپ نے اپنے ہادی کی تعلیم کی مطابقت میں کون سا کام کیا ہے، یورپ نے ارتقا کی جو بلند منزل حاصل کی ہے، وہ مسیحیت کے خلاف بغاوت کر کے ہی حاصل کی گئی ہے، مسیحیت ماضی میں جس عروج پر تھی اگر آج بھی وہ اسی عروج پر ہوتی تو اس نے عہد حاضر کے سائنس دانوں کے خلاف سزا کی آگ روشن کردی ہوتی اور اس نے ڈارون اور اس کے اسکول کے دوسرے دانشوروں کو جلا کر بھسم کر ڈالا ہوتا۔ ماڈرن یورپ میں مسیحیت اور تمدن دو مختلف چیزیں ہیں، تمدن نے اب اپنے قدیم دشمن کو برباد کر دینے کے لئے اپنے تیر پیدا کر دیئے ہیں اور تعلیمی و خیراتی ادارے اپنے ہاتھ میں لے لئے ہیں، لیکن بے خبر و پسماندہ عوام کو ان کی موجودہ تکلیف دہ زندگی میں ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی حمایت نہیں دی، لہٰذا اسے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے گا۔ اس لئے کہ شہروں کے غریب لوگ اب بھی کرسچین چرچ کے دشمن ہیں، اب اسلام سے اس بات کا موازنہ کیجئے! مسلم ممالک میں تمام قوانین شریعتِ اسلامیہ پر مبنی ہیں اور اس کے علماء کی عمالِ حکومت کی جانب سے عزت کی جاتی ہے اور دوسرے مذاہب کے علماء کو بھی احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

۔یورپین تمدن کو کپڑے کے ایک ایسے ٹکڑے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جس کا چہرہ ہے سمندر کے کنارے واقع ایک وسیع پہاڑی ملک! اس کی روح ہے ایک طاقتور جنگجو قوم جو مختلف نسلوں کے اختلاط سے معرض وجود میں آئی ہے اور اس کا سوت ہے اپنی یا اپنے دھرم کی بالادستی میں جنگ! ایک شخص جس کے قبضہ میں تلوار ہے بہت بڑا آدمی ہے، اور ایک شخص جس کے قبضہ میں تلوار نہیں ہے، اپنی آزادی کے حق تک سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور کسی جنگجو کی تلوار کے سایہ میں پناہ پاکر ہی زندہ رہ سکتا ہے، اس تمدن کی اصل شمشیر ہے اور اس کی شاخیں ہمت و طاقت ہے اور اس کا پھل ہے اس زندگی اور اس کے بعد کی مسرتیں اور راحتیں!

اور ہمارا نقطۂ نظر کیا ہے؟ آریہ امن کے پرستار تھے، کاشتکار تھے، اور صرف اس بات پر خوش ہونے والے کہ ان کے گھرانے کو کوئی پریشانی لاحق نہ ہو، اس زندگی میں ان کے لئے بے پناہ مسرت تھی اور اس نا بیمان کے پاس بڑا موقع تھا کہ وہ غور و فکر کریں اور متمدن بنیں! ہمارا راجہ جنک اپنے ہاتھ سے زمین میں ہل چلاتا تھا، اور وہ اپنے عہد کا بہت بڑا عارف اور گیانی تھا، ہمارے رشی، منی اور یوگی ابتدا ہی سے پیدا ہوتے ہیں اور پہلے ہی سے یہ بات جانتے ہیں کہ یہ دنیا مختلف حیوانوں کی ایک بستی ہے، آپ چاہیں تو فساد کریں، جنگ کریں لیکن حقیقی مسرت کا

---

مشرق و مغرب صفحہ ۷۴

گھولوہے امن اور صرف امن، مسرتِ جسمانی اِن تقاضیں نہیں ہے بلکہ دماغ اور عقل کی شائستگی میں پنہاں ہے، یہ وہ باخبر لوگ تھے جو جنگلوں کی زمین کو بھی قابلِ کاشت بنا دیتے تھے،

پھر زمین کے صاف ٹکڑے پر ویدک مینارہ تعمیر ہوا، بھارت کے صاف نیلگوں آسمان کے نیچے یگیہ کا دھواں اٹھا، اس فضا میں جس امن کا سانس لیا جاتا تھا، ویدک منتروں کی آواز گونجی، اور مویشی خطرہ کے کسی احساس کے بغیر میدانوں میں اپنا پیٹ بھرنے کے لئے گھاس چرتے رہے، تلوار کی جگہ علم اور دھرم کے قدموں کے پاس تھی، اس کا ایک ہی کام تھا کہ دھرم کی حفاظت کرے انسانوں اور مویشیوں کو بچائے، خطرہ کے وقت کمزور کی حفاظت کرنے والا ہی بہادر ہیرو تھا، اور وہ کشتری! ہل اور تلوار پر دھرم کی حکمرانی تھی، جو سب کا محافظ و پاسبان ہے، ایشور بادشاہوں کا بادشاہ ہے اور وہ اس وقت بھی بیدار رہتا ہے جب ساری دنیا غفلت کی نیند سو ئی ہوتی ہے، دھرم کی پناہ میں ہر چیز آزاد تھی،

یورپین علماء کا یہ کہنا صرف احمقانہ بات ہے کہ آریہ لوگ کہیں سے گھومتے پھرتے ہندوستان آئے اور یہاں بسی ہوئی جنگلی نسل کو مار کاٹ کر اور اس کی زمینیں چھین کر خود آباد ہو گئے حیرت تو اس بات پر ہے کہ ہمارے ہندوستانی دانشور بھی ان کی آواز میں آواز ملانے لگتے ہیں، ایسی ہی نہ جانے کتنی شرارت آمیز جھوٹی باتیں ہمارے طلباء کو پڑھائی جاتی ہیں یہ بہت بری اور بہت ہی بے انصافی کی بات ہے۔

میں خود جاہل ہوں اور عالم ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ لیکن جو کچھ سمجھتا ہوں، اس کی بنیاد پر میں نے پیرس کانگریس میں ان خیالات کے خلاف زبردست احتجاج کیا تھا، میں ہندوستانی اور یورپین علماء سے اس مسئلہ پر گفت و شنید کر رہا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ اس نظریہ کی تفصیلات پر اگر موقع اور وقت ملے گا تو بہت سے اعتراضات اٹھاؤں گا، اپنے علماء سے مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ بہر حال آپ لوگ بھی عالم ہیں، اپنی قدیم کتابوں کو تلاش کیجیے اور پھر خود ہی ان کتابوں کا مطالعہ کر کے اپنے نتائج اخذ کیجیے!

جہاں کہیں بھی یورپینوں کو موقع ملتا ہے وہ مقامی نسلوں کو فنا کر کے ان کی زمینوں پر آرام کے ساتھ آباد ہو جاتے ہیں لہٰذا انہوں نے یہ قیاس کر لیا ہے کہ آریوں نے بھی ایسا ہی کیا ہوگا، مغربی لوگ سوچتے ہیں کہ اگر وہ اپنے وطنوں میں رہتے اور اپنے وسائل و ذرائع پر منحصر رہتے دوسروں کی زمینوں میں پیدا ہونے والا مال کھا کر اپنا پیٹ نہ بھرتے تو وہ صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ جاتے، انہوں نے دنیا بھر سے دولت سمیٹنے کی کوشش کی، دوسرے لوگوں کو برباد کیا، قتل کیا، اور اپنی راحتوں کے اسباب مہیا کئے لہٰذا وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ آریوں نے بھی ایسا ہی کیا ہوگا اور انہیں ایسا ہی کرنا چاہیئے تھا، لیکن اس بات کا آپ کے پاس ثبوت کیا ہے؟ کیا یہ سب قیاس آرائی ہے؟ اگر یہ قیاس آرائی ہے تو اسے آپ اپنے ہی پاس رکھیں!

کس وید میں، کس سوکت میں، اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ آریہ کسی بدیشی ملک سے ہندوستان میں آئے تھے؟ آپ کو یہ خیال کہاں سے آیا کہ وہ یہاں آئے اور انہوں نے یہاں کی غیر متمدن نسلوں کو فنا کر ڈالا، اس طرح کی احمقانہ باتیں کرنے سے آپ کو کیا فائدہ ہوتا ہے؟ آپ نے رامائن کا جو مطالعہ کیا ہے وہ بیکار گیا۔ اس سے ایک خوبصورت سی کہانی کیوں نہ گڑھی جائے؟

رامائن ہے کیا؟ جنوبی ہندوستان کی غیر متمدن و وحشی نسلوں کو آریوں نے فتح کیا، بے شک رام چندر جی ایک متمدن آریہ مہاراج تھے، اور مدد کس سے لڑے تھے؟ لنکا کے راجہ راون سے! اب رامائن پڑھیے اور آپ کو پتہ چلے گا کہ راون رام چندر جی کی بہ نسبت زیادہ تعلیم یافتہ تھا، زیادہ متمدن تھا، کم متمدن یا کم تعلیم یافتہ نہیں تھا، لنکا کا تمدن اجودھیا کے تمدن سے بلند تھا، یقینی طور پر کم تر نہیں تھا، تو پھر کب یہ فنارس (بندر) اور جنوبی ہندوستان کے دوسرے باشندے فتح کئے گئے؟ یہ تو سب شری رام چندر جی کے دوست اور اتحادی تھے! بتائیے کہ کب شری رامچندر جی نے ویلی اور گوپا کی ریاستوں کو فتح کیا اور اپنی سلطنت میں شامل کیا؟

یہ عین ممکن ہے کہ کبھی کبھار آریوں اور غیر متمدن جاتیوں کے درمیان جنگ ہوتی ہو، اکا دکا جھڑپیں ہوئی ہوں، یہ بھی عین ممکن ہے کہ ایک دو عقل مند منیوں نے راکشسوں کے جنگلوں میں مقدس آگ کے سامنے آنکھیں بند کر کے خود کو گیانی دھیانی ثابت کرنے کی کوشش کی ہو، اور وہ ہر وقت اس بات کے منتظر رہے ہوں کہ کب راکشس ان پر پتھر اور ہڈیاں پھینکتے ہیں اور جب ایسا ہوا ہو تو انہوں نے اپنے راجاؤں کو برافروختہ کر دیا ہو، اور راجہ اپنی مسلح افواج لے کر لڑائی کی آگ میں کود پڑے ہوں لیکن نیم متمدن نسلیں کتنی دیر تک پتھروں اور لاٹھیوں سے لڑ بھڑ سکتی تھیں؟ لہٰذا وہ فنا ہو جاتی تھیں، موت کے گھاٹ اتار دی جاتی تھیں یا پسپا کر دی جاتی تھیں اور راجہ اپنی راجدھانی میں پلٹ آتا تھا، ہاں یہ سب کچھ ہو سکتا ہے، لیکن اس سے یہ ثبوت کہاں ملتا ہے کہ آریہ باہر سے آئے تھے اور انہوں نے یہاں کی غیر متمدن نسلوں سے ان کی زمینیں چھین لی تھیں، رامائن میں کس جگہ اس بات کا کوئی ذکر کیا گیا ہے؟

آریائی تمدن کو بھی ایک کپڑے کے ٹکڑے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے اس کپڑے کا چرخہ تھا — وسیع گرم ملک جس میں جگہ بہ جگہ بڑے بڑے دریا رواں ہیں، اس کی کپاس تھی اعلیٰ متمدن، نیم متمدن اور وحشی قبائل، جو سب کے سب آریہ تھے! اس کا تانا تھا ورن آشرم چار[1] اور اس کا بانا تھا آفاتِ ارضی و سماوی کی تسخیر اور قدرت سے مقابلہ!

کیا میں یورپینوں سے پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے اپنے ملک میں اس سے بہتر حالت کبھی پیدا کی؟ جہاں کہیں بھی آپ کو کمزور نسلیں ملیں آپ نے ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ اور ان کو فنا کر ڈالا، آپ ان کی زمینوں پر آباد ہوئے اور وہ سدا کے لئے برباد ہو گئیں، آپ کے امریکہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، بحر الکاہل کے جزائر اور جنوبی افریقہ کی تاریخ کیا ہے؟ آج ان مقامات کی اصل نسلیں کہاں ہیں؟ وہ سب فنا ہو گئیں، آپ نے انہیں اس طرح فنا کر ڈالا جیسے وہ جنگل کے درندے تھے، صرف انہی جگہوں پر دوسری قومیں زندہ رہیں اور آپ نے انہیں زندہ رہنے دیا جہاں آپ کے پاس کافی طاقت نہیں تھی،

لیکن ہندوستان نے ایسا کبھی نہیں کیا! آریہ لوگ رحم دل اور شریف تھے، اور ان کے دل سمندر کی طرح وسیع تھے، ان کے

---

[1] قدیم آریائی نظام چار ذاتوں اور زندگی کے چار درجوں سے عبارت تھا، چار جاتیاں برہمن، کشتری، ویش اور شودر تھیں۔ چار درجے برہمچریہ (طالب علمی کی زندگی) گرہست (ازدواجی زندگی) بان پرستھ اور سنیاس (ترکِ دنیا) تھے۔

دماغوں میں مافوق البشر کی عقل تھی، ان کی زندگی میں حیوانیت کا عمل آپ کسی جگہ نہیں پائیں گے۔ میں اپنے ہی ملک کے احمقوں سے بھی پوچھنا چاہتا ہوں کہ جہاں ورن، آشرم کا نظام رائج ہو تو کیا وہاں ایسا ہو سکتا ہے کہ آریہ خود کو آباد کرنے کے لیے مقامی نسلوں کو فنا کر ڈالیں اور ان کی زمینیں چھین کر خود بس جائیں۔

یورپ کے باشندوں کا موقف یہ ہے کہ خود زندہ رہنے کے لئے دوسروں کو فنا کر ڈالو، آریوں کا موقف یہ ہے کہ سب کو ان کی اپنی جگہ پر، اپنی سطح پر رکھتے ہوئے بلند کرو، چاہے یہ سطح خود ان کی اپنی سطح سے بلند ہی کیوں نہ ہو۔ یورپین تمدن تلوار پر مبنی ہے اور آریائی تمدن مختلف ورنوں کی تقسیم پر مبنی ہے، ورنوں کی تقسیم تمدن کا سنگ بنیاد ہے جس کا یہ مطلب ہے کہ ایک شخص اپنے علم اور آدابِ مجلسی کی نسبت سے بلند تر ہوتا جائے۔ یورپ میں فتح صرف طاقتور کی ہے اور موت کمزور کی — "ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات" — ہندوستان کی سرزمین پر ہر سماجی قانون کا مقصد ہے — کمزور کا تحفظ، کمزور کی بقا!



سوامی وویکانند تھاوزینڈ آئی لینڈ پارک میں (1895ء)

# اِقبال و زوال

ہندوؤں کے نظریہ کے مطابق یہ کائنات ظاہری شکلوں کی لہروں کے چکروں میں بار بار بدلتی اور پیدا ہوتی ہے۔ یہ عروج پاتی ہے اور اپنے اوجِ کمال پر پہنچ جاتی ہے اور پھر اس کو زوال آتا ہے۔ اور کچھ عرصہ تک جیسا کہ وہ پہلے تھی بے جان ہو جاتی ہے۔ ایک بار پھر عروج پاتی ہے۔ اسی طرح عروج پاتی رہتی ہے اور زوال آتا رہتا ہے۔ لہر کے بعد لہر اٹھتی ہے۔ اور زوال کے بعد زوال آتا ہے۔ جو بات اِس دنیا پر صادق آتی ہے۔ وہی دنیا کے ہر حصّہ پر صادق آتی ہے۔ انسانی امور کی رفتارِ ترقی بھی بالکل اسی طرح کی ہے۔ اقوام کی تاریخ میں بھی یہی بات ہے۔ انہیں عروج اور زوال آتا ہے عروج کے بعد زوال آتا ہے۔ پھر زوال سے زیادہ طاقت کے ساتھ عروج جنم لیتا ہے۔ یہ چکّر ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ مذہبی دنیا میں بھی بالکل اسی طرح کا چکّر جاری ہے۔ ہر ایک قوم کی روحانی زندگی میں عروج کے ساتھ زوال بھی آتا ہے۔ اقوام کو زوال آتا ہے۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہر شے فنا ہو گئی ہے۔ اس کے بعد یہ پھر طاقت حاصل کرتی ہیں۔ اور عروج پر پہنچ جاتی ہیں۔ ایک لہر کے بعد لہر اور بعض اوقات ایک طوفانی لہر آتی ہے۔ اور اس لہر کی اونچی سطح پر ہمیشہ ایک جگمگاتی روح ہوتی ہے جسے پیغمبر کہتے ہیں۔ جو باری باری خالق ہے اور مخلوق بھی وہ ایک قوّت ہوتا ہے۔ جو کہ لہروں کو اٹھاتا ہے، قوم کو اٹھاتا ہے۔ ساتھ ہی وہ خود بھی انہیں عناصر سے جنم لیتا ہے۔ جن سے لہر بنتی ہے۔ وہ نگران کار بھی ہوتا ہے۔ اور دوسروں کی نگرانی میں بھی آتا ہے۔ وہ سوسائٹی پر اپنی عظیم طاقت کو آزماتا ہے۔ اور سوسائٹی اسے وہ کچھ بناتی ہے جو وہ ہے۔ یہ ہیں عظیم عالمی مفکرین زندگی کے پیغامبر اور ایشور کے اوتار۔

آدمی اِک یہ تصوّر رکھتا ہے کہ صرف ایک مذہب ہو سکتا ہے نیز یہ کہ پیغمبر صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اور ایشور ایک ہی بار انسانی شکل میں آ سکتا ہے لیکن یہ نظریہ درست نہیں ہے۔ ان عظیم پیغامبروں کی سوانح حیات کو پڑھ کر ہم اِس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہر ایک کی منزلِ مقصود ایک پارٹ اور صرف ایک پارٹ ادا کرنا تھی۔ نیز یہ کہ ہم آہنگی اور

مطابقت میزانِ کُل میں ہوتی ہے۔ ایک عدد میں نہیں جیسا کہ نسلوں کی زندگی دیکھنے میں آتی ہے۔ کوئی بھی نسل تنہا دنیا میں نہیں آتی یہ تعلق ہی نہیں اقوام کی اس خداداد دنیا میں ہر قوم اپنا پارٹ ادا کرتی ہے۔ ہر نسل کا ایک مشن ہوتا ہے جس کو وہ انجام دیتی ہے۔ ایک فرض ہوتا ہے جس کو وہ ادا کرتی ہے۔ کائنات ایک بڑی مفاہمت اور ہم آہنگی ہے

بس ان پیغمبروں میں سے کوئی بھی اس دنیا پر ہمیشہ حکومت کرنے کے لئے پیدا نہیں ہوا۔ نہ اس میں کوئی کامیاب ہوا ہے اور نہ کوئی ہمیشہ کے لئے حکمران بن سکتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک ایک پارٹ انجام دیتا ہے۔ اور جہاں تک اس پارٹ کا تعلق ہے۔ انجام کار یہ بات درست ہے کہ ہر ایک پیغمبر کی اسی دنیا اور اس کے تقدیری امور پر حکمرانی ہوگی۔

ہم میں سے اکثر پیدائشی طور پر ایک ذاتی مذہب پر ایمان رکھتے ہیں۔ ہم اصولوں کی بات کرتے ہیں ہم نظریات کی بحث کرتے ہیں اور یہ ٹھیک ہے۔ لیکن ہمارا ہر ایک خیال، ہر ایک عمل اور ہر ایک حرکت ظاہر کرتی ہے کہ ہم اصول کو اس وقت سمجھ پاتے ہیں جب اسے کوئی سمجھائے۔ ہم ایک نظریہ کو اس وقت اختیار کرتے ہیں جب یہ نظریہ کوئی مثالی شخصیت پیش کرے ہم مثالوں کے ذریعہ ہی اصولوں کو سمجھتے ہیں۔ ایشور کرے ہم سب اس قدر ترقی یافتہ ہوتے کہ ہمیں کسی مثال کی ضرورت نہ ہوتی۔ کسی انسان کی ضرورت نہ پڑتی۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اور قدرتی طور پر بنی نوع انسان کی ایک بہت بڑی اکثریت کو ان غیر معمولی شخصیتوں کے قدموں میں اپنی روحوں کو ڈال دینا پڑتا ہے جنہیں پیغمبر اور ایشور کا اوتار کہا جاتا ہے۔ عیسائیوں۔ بدھوں اور ہندوؤں میں اوتاروں کی پوجا ہوتی ہے مسلمان شروع ہی سے اس قسم کی پوجا کے خلاف ہیں۔ وہ پیغمبروں اور پیغامبروں کی نہ تو پوجا کرتے ہیں اور نہ انہیں شردھانجلی بھینٹ کرتے ہیں لیکن عملی طور پر وہ ایک پیغمبر کے بجائے لاکھوں صوفیوں کی پوجا کرتے ہیں۔ ہم حقائق کے خلاف نہیں جا سکتے۔ ہم شخصیتوں کی پوجا کے لئے مجبور ہیں اور یہ اچھا ہی ہے۔ اس لفظ کو یاد رکھنے۔ جو آپ کے عظیم پیغمبر نے دریافت کرنے پر کہا۔ "آقا! ہمیں باپ کو دکھائیے"۔ اس نے جواب دیا۔ "جس نے مجھے دیکھا ہے۔ اس نے باپ کو دیکھا ہے"۔ ہم میں سے کون سوائے اس کے اور کیا تصور کر سکتا ہے کہ وہ ایک آدمی ہے؟ ہم ایشور کو انسان میں اور انسانیت کے ذریعہ دیکھ سکتے ہیں۔ اس کمرہ کے اندر روشنی ہر جگہ ہے۔ ہم ہر جگہ اس کا مرکز نہیں دیکھ سکتے۔ آپ اسے صرف اس لیمپ کے اندر دیکھتے ہیں۔ ایشور سرو گیانی ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ لیکن ہماری موجودہ ساخت کچھ اس قسم کی ہے کہ ہم اس کو صرف انسانی خدا کے ذریعہ اور اس کے اندر ہی ایشور کو دیکھ سکتے ہیں اور محسوس کر سکتے ہیں۔ اور جب یہ عظیم روشنیاں آتی ہیں انسان ایشور کو جان لیتا ہے وہ ہم سے مختلف طریقہ پر آتے ہیں۔ ہم بھکاریوں کی حیثیت سے آتے ہیں اور وہ شہنشاہوں کی حیثیت سے۔ ہم یہاں یتیموں اور ایسے لوگوں کی حیثیت سے آتے ہیں جن کا راستہ گم ہو گیا ہے۔ اور وہ نہیں جانتے کہ راستہ کدھر ہے ہم کیا کریں؟ ہم نہیں جانتے کہ ہماری زندگیوں کا مطلب کیا ہے ہم اسے محسوس نہیں کر سکتے۔ ہماری حیثیت ایک معمولی تنکے کی ہے جو پانی میں آگے پیچھے ڈولتا ہے یہ ان کی سی ہے جو کہ طوفان میں ادھر ادھر اڑتے ہیں۔

لیکن انسانیت کی تاریخ میں آپ دیکھیں گے کہ یہ پیغامبر آتے ہیں۔ اور ان کی پیدائش کے ساتھ ہی ان کا مشن

شروع ہو جاتا ہے۔ پورے منصوبہ کی بنیاد پہلے ہی ٹِکی ہوئی ہے اور آپ انہیں دیکھتے ہیں کہ وہ اس سے ایک انچ بھی نہیں ہٹتے۔ چونکہ وہ ایک مشن کو لے کر آتے ہیں۔ اس لئے وہ دلائل میں نہیں پڑتے۔ کیا آپ نے ان پیغامبروں عظیم استادوں کے بارے میں سنا یا پڑھا ہے کہ کبھی انہوں نے جو کچھ کہا ہو، اس کی دلیل بھی دی ہو؟ نہیں۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے براہِ راست بات کی۔ وہ دلیل کیوں دیتے؟ وہ سچائی کو دیکھتے ہیں۔ اور نہ صرف یہ کہ وہ سچائی کو دیکھتے ہیں بلکہ دوسروں کو دکھاتے بھی ہیں۔ اگر آپ مجھ سے سوال کریں کیا کوئی ایشور ہے؟ اور میں کہوں۔ جی ہاں ہے۔ آپ مجھ سے فوراً سوال کریں گے کہ میں کن بنیادوں پر ایسا کہہ رہا ہوں۔ اور میں غریب آپ کو قائل کرنے میں اپنی پوری قوت دلائل دینے میں صرف کر دوں گا۔ اگر آپ حضرت عیسیٰ کے پاس گئے ہوتے اور پوچھتے "کیا کوئی خدا ہے؟" وہ جواب دیتے۔ ہاں ہے۔ اور اگر آپ پوچھتے۔ اس کا کوئی ثبوت؟ وہ یہ جواب دیتے کہ خدا کو تسلیم کرو۔ اور پس آپ دیکھتے ہیں کہ یہ ایک براہِ راست ادراک ہے قطعی طور پر، دلیل کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے یہ اندھیرے میں ٹٹولنا نہیں ہے بلکہ براہِ راست مشاہدہ کی طاقت ہے۔ میں اس حقیقت کو دیکھتا ہوں۔ کوئی دلیل میرے اس یقین کو ختم نہیں کر سکتی۔ یہ ایک براہِ راست ادراک ہے۔ بالکل اسی طرح وہ اپنے نظریات، اپنے مشن اور اپنے آپ پر اعتقاد رکھتے ہیں جو تمام چیزوں سے بالا ہوتا ہے۔ ان عظیم روشن روحوں کو جس قدر اپنے آپ پر اعتماد اور اعتقاد ہوتا ہے کسی دوسرے کو نہیں ہوتا۔ لوگ کہتے ہیں۔ کیا تم ایشور پر ایمان رکھتے ہو؟ کیا تم آئندہ کی زندگی پر یقین رکھتے ہو؟ کیا تم اس اصول اور اس مذہبی عقیدہ پر اعتقاد رکھتے ہو؟ لیکن یہاں بنیاد ناقص ہے۔ یہ اعتقاد خود دیر ہوتا ہے۔ ایسے جو آدمی اپنے آپ پر یقین نہیں رکھتا۔ اس سے کس طرح یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی اور چیز پر بھی اعتقاد رکھتا ہوگا۔ مجھے خود اپنے وجود کا یقین نہیں ہے۔ ایک لمحہ میں سوچتا ہوں کہ میرا وجود ہے۔ کوئی چیز مجھے تباہ نہیں کر سکتی۔ دوسرے ہی لمحہ مجھ پر موت کا خوف طاری ہو جاتا ہے۔ ایک لمحہ مجھے خیال ہوتا ہے کہ میں لافانی ہوں۔ دوسرے ہی لمحہ ایک جھٹکا لگتا ہے اور میں نہیں جان پاتا۔ کہ میں کیا ہوں اور کہاں ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ میں زندہ ہوں یا مردہ۔ ایک لمحہ میں سوچتا ہوں کہ میں روحانی ہوں۔ یہ کہ میں اخلاق ہوں دوسرے لمحہ ایک جھونکا آتا ہے۔ اور میں یہ بھول جاتا ہوں۔ کیوں؟ کیونکہ میں اپنے آپ پر اعتماد کھو چکا ہوں اور اخلاقی طور پر دیوالیہ بن چکا ہوں۔

لیکن ان عظیم استادوں میں آپ یہ علامت ہمیشہ پائیں گے۔ وہ خود پر بڑا گہرا اعتماد رکھتے ہیں۔ یہ گہرا اعتماد بے مثال ہوتا ہے۔ ہم اسے سمجھ نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان استادوں کے اقوال کی مختلف طریقوں سے وضاحت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جو کچھ انہوں نے اپنے ادراک کے نتیجہ میں کہا ہے۔ لوگ اس کی وضاحت کے لئے ہزاروں قسم کے نظریات ایجاد کرتے ہیں ہم خود اپنے بارے میں اس انداز سے نہیں سوچتے اور قدرتی طور پر ہم انہیں سمجھ نہیں سکتے۔

اسی لئے جب وہ کچھ کہتے ہیں لوگ اسے سننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جب وہ بولتے ہیں ہر لفظ براہِ راست ہوتا ہے۔ یہ بم کے ایک گولے کی طرح پھٹتا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ کس زبان کو جانتے ہیں اور کس زبان کو استعمال کرتے ہیں۔ اس کا بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کہ آپ قواعد کی غلطیاں کرتے ہیں یا فنِ خطابت سے پوری طرح واقف ہیں۔

اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کہ آپ کی زبان خوشنما ہے یا نہیں ہے۔ یہ لینے اور دینے کا سوال ہے اور سننے کا نہیں ہے۔ کیا آپ کے پاس کوئی چیز دینے کو ہے؟ یہ پہلا سوال ہے۔ اگر آپ کے پاس ہے تو دے دیجئے۔ الفاظ محض تجھ کو پہنچاتے ہیں۔ یہ بہت سے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم بالکل نہیں بولتے اور پیغام پہنچا دیتے ہیں سنسکرت کا ایک پرانا شعر ہے جس کا مطلب ہے کہ میں نے ایک ادھیایک کو پیڑ کے نیچے بیٹھا ہوا دیکھا۔ وہ سولہ برس کا ایک نوجوان تھا اور چیلا ایک بوڑھا آدمی تھا اسی برس کی عمر کا۔ استاد کی طرف سے خاموش درس دیا جا رہا تھا۔ اور چیلے کے ذہن کے اندر جو شکوک و شبہات تھے وہ رفع ہو رہے تھے۔

کبھی کبھی وہ قطعی نہیں بولتے۔ اس کے باوجود وہ سچائی کو ایک ذہن سے دوسرے ذہن میں منتقل کر دیتے ہیں۔ وہ دینے کے لئے آتے ہیں وہ ہدایت کرتے ہیں وہ پیغامبر ہیں۔ اور آپ کو ان کا حکم بجا لانا پڑتا ہے۔ کیا آپ کو خود اپنی کتاب میں وہ اتھارٹی اور اختیار نہیں ہے کہ جس اختیار سے حضرت عیسیٰ کہتے ہیں ــ اس لئے تم جاؤ اور تمام اقوام کو سبق دو ــ جو کچھ بھی میں نے تمہیں ہدایات دی ہیں ان سے ان پر عمل کراؤ۔" اس اختیار کے ساتھ انہوں نے یہ کہا۔ کیونکہ انہیں اپنے پیغام پر شدید یقین اور اعتماد تھا۔ یہ اعتماد آپ کو تمام عظیم شخصیتوں میں ملے گا۔ کہ دنیا جن کی پیغمبروں کی حیثیت سے پوجا کرتی ہے۔

یہ عظیم پیغمبر دنیا میں اس زمین پر زندہ ایشور ہیں۔ ہمیں اور کس کی پوجا کرنی چاہیئے۔ میں اپنے دماغ میں ایشور کا ایک تصور قائم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کیا ایک چھوٹی سی لغو چیز میرے دماغ کے اندر آئی۔ ایسے ایشور کی پوجا کرنا ایک گناہ ہوگا۔ مجھے چاہیئے کہ میں زمین کے ان عظیم ایشوروں کی زندگی کو آنکھیں کھول کر دیکھوں۔ یہ ایشور کے ہر اس تصور سے بلند ہیں جو میں کر سکتا ہوں۔ کیونکہ میرے جیسا آدمی جو کہ ایک شخص کے پیچھے جو میری کوئی چیز چرا لیتا ہے دوڑتا ہے۔ اور اس کو جیل میں بند کرا دیتا ہے رحم کا تصور نہیں کر سکتا۔ اور معاف کر دینے کا میرا اعلےٰ سے اعلےٰ نظریہ کیا ہو سکتا ہے۔ میرے اپنے بدن کچھ نہیں۔ آپ میں سے کون ہے جو اپنے جسم سے باہر نکل سکتا ہے آپ میں سے کون ہے جو اپنے دماغ سے باہر آسکتا ہے۔ آپ میں ایسا کوئی نہیں ہے جس چیز کے بارے میں ہمیں کوئی تجربہ نہیں ہے۔ اس کے بارے میں ہم کوئی نظریہ قائم نہیں کر سکتے۔ بس ہر حالت میں ایشور کے متعلق تصور قائم کرنے کی میری تمام کوششیں ہر حالت میں ناکام ہو جائیں گی۔ اور یہاں سادہ حقائق میں نظریاتی نہیں۔ حقیقی محبت کے حقائق، رحم اور اخلاص کے حقائق جن کے بارے میں میرا کوئی ادراک اور تصور نہیں ہے

اس لئے اگر میں ان عظیم ہستیوں کے پاؤں میں پڑ جاؤں اور ایشور مان کر ان کی پوجا کروں تو حیرت کی کیا بات ہے اور آپ بھی اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں میں اس آدمی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ جو کچھ اور کر سکتا ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی باتیں کرتا ہو۔ خالی باتیں کرنا حقیقت میں ہے۔ ایشور اور خدا کے بارے میں بات کرنا اس اور اس کے بارے میں

بات کرنا یہ سب اچھی بات ہے لیکن انسانوں کی شکل میں آئے ہوئے یہ ایشور تمام قوموں اور تمام نسلوں کے ایشور ہیں۔ آدمی ان ربانی آدمیوں کی پوجا کرتا رہا ہے۔ اور جب تک وہ رہے گا پوجا کرتا رہے گا۔ ایک حقیقت کے بارے میں یہی ہمارا اعتقاد ہے اور اسی میں ہماری توقعات ہیں جس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ وہ صرف عارفانہ وجدان ہے۔

میرا مقصد آپ سے کہنے کا یہ ہے کہ میں اپنی زندگی میں ان سب کو قابل پرستش سمجھتا ہوں اور ان کی پرستش کو ممکن سمجھتا ہوں اور ان کی پوجا کے لئے بھی تیار ہوں۔ جو آئندہ آنے والے ہیں۔ ایک ماں اپنے بچے کو خواہ وہ کسی بھی لباس میں اس کے سامنے آئے فوراً پہچان لے گی۔ اگر وہ ایسا نہیں کر پاتی۔ تو مجھے یقین ہے وہ اس بچے کی ماں نہیں ہو سکتی۔ آپ میں سے جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے کہ جو سوچتے ہیں کہ انہیں سچائی اور ایشور کا علم ہے۔ اور جو سمجھتے ہیں کہ ایشور صرف ایک انہیں کے پیغمبر کے اندر ہے۔ دوسروں کے اندر موجود نہیں ہے میں قدرتی طور پر ان لوگوں کے بارے میں جو نتیجہ نکالوں گا وہ یہ ہے کہ وہ کسی کے اندر ایشور کو دیکھ ہی نہیں سکتے۔ وہ صرف الفاظ سے کھیلتے ہیں اور خود کو ایک ہی فرقہ سے متعلق سمجھتے ہیں۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسی کہ اظہار رائے کے سلسلہ میں آپ کا تعلق پارٹی پالٹیکس سے ہوتا ہے۔ یہ قطعی طور پر کوئی مذہب نہیں ہے۔ دنیا میں ایسے بے وقوف لوگ بھی ہیں جو کھاری پانی ہی استعمال کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کے قریب ہی نفیس شیریں پانی ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کھاری پانی ان کے باپ دادا نے کھود کر نکالا تھا۔ اپنے چھوٹے سے تجربہ میں میں نے جو بات محسوس کی ہے وہ یہ ہے کہ جن برائیوں کو مذہب کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے مذہب سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کسی مذہب نے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی۔ کسی مذہب نے کبھی جادوگروں کو نہیں جلایا۔ کسی مذہب نے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی۔ تب کون سی چیز لوگوں کو اس قسم کے کام کرنے پر اکساتی ہے۔ سیاسیات — مذہب ہرگز نہیں۔ اگر اس قسم کی سیاسیات مذہب کے نام پر ہو تو قصور کس کا ہے؟

پس جب ہر آدمی کھڑا ہو کر یہ کہتا ہے کہ میرا پیغمبر ہی سچا پیغمبر ہے۔ تو وہ قطعی طور پر غلط ہے۔ وہ مذہب کی الف۔ ب۔ ت سے بھی واقف نہیں ہے۔ مذہب نہ تو کوئی قول ہے نہ نظریہ اور نہ ہی کوئی فکری تصور۔ یہ دلوں کے دل کا احساس اور ادراک ہے۔ یہ خدا کو چھونا ہے۔ یہ اس بات کو محسوس کرنا ہے کہ میں ایک روح ہوں جس کا کائنات کی روح سے اور اس کے تمام مظاہر سے تعلق ہے۔ اگر آپ باپ کے گھر میں داخل ہو گئے ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ نے اس کے بچوں کو دیکھا ہو اور آپ انہیں جانتے نہ ہوں۔ ایک ماں اپنے بچہ کو پہچان لیتی ہے خواہ اس نے کیسا ہی لباس پہن رکھا ہو۔ اور بھیس بدل رکھا ہو۔ ان تمام روحانی آدمیوں اور عورتوں کو پہچانئے جو ہر دور میں اور ہر ملک میں پیدا ہوئے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کے اندر تضاد نہیں ہے جہاں کہیں حقیقی مذہب رہا ہے۔ ربانیت کے ساتھ یہ لگاؤ اور روح کا ایشور کے ساتھ براہ راست شعوری تعلق رہا ہے ہمیشہ ذہنوں میں اتنی وسعت پیدا ہوتی رہی ہے کہ وہ ہر کہیں روشنی کو دیکھ سکیں۔

ارتقا کی جدید تھیوری اور نظریہ کے ساتھ ساتھ ایک اور چیز بھی چل رہی ہے "پرکھا روگ"۔ ہمارے اندر مذہب کے پرانے

نظریات کی طرف لوٹنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ ہمیں نئی باتیں سوچنی چاہئیں خواہ وہ غلط ہوں۔ یہ اچھا ہے کہ ہم نئی باتیں سوچیں۔ آپ نشان پر نشانہ لگانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ ناکامیوں سے ہمیں عقل آتی ہے وقت نامحدود ہے۔ دیوار کی طرف دیکھئے۔ کیا دیوار کبھی جھوٹ بولتی ہے؟ یہ ہمیشہ دیوار ہی رہتی ہے۔ آدمی جھوٹ بولتا ہے اور ایک ایشور بھی بن جاتا ہے۔ یہ اچھا ہے کہ کچھ نہ کچھ کیا جائے۔ کوئی بات نہیں اگر وہ غلط ثابت ہو۔ کچھ نہ کرنے سے کرنا بہتر ہے۔ گائے کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ لیکن وہ ہمیشہ گائے ہی رہتی ہے۔ کچھ کیجئے۔ کوئی خیال سوچئے، اس بات کی پرواہ نہ کیجئے کہ آپ درست سوچ رہے ہیں یا غلط۔ لیکن کچھ سوچئے۔ کیونکہ میرے باپ دادا نے اس طریقہ پر نہیں سوچا ہے۔ اس لئے کیا میں خاموشی کے ساتھ بیٹھ جاؤں؟ اور اپنے محسوس کرنے کے شعور اور خود اپنی سوچنے کی صلاحیتوں کو بتدریج ضائع کر دوں؟ میری حیثیت ایک مُردہ کی ہو جائے گی۔ اور اگر ہمارے مذہب کے بارے میں خود اپنے نظریات اور طریق زندگی نہیں ہے تو زندگی سے کیا فائدہ؟ دہریوں کے لئے کچھ گنجائش ہے۔ کیونکہ دوسروں میں اور ان میں فرق ہے۔ وہ اپنے لئے سوچتے ہیں۔ جو لوگ خود اپنے لئے کبھی نہیں سوچتے وہ مذہب کی دنیا میں ابھی پیدا نہیں ہوئے ہیں ان کا وجود بیکار ہے۔ وہ کبھی نہیں سوچیں گے وہ مذہب کی کبھی پرواہ نہ کریں گے۔ لیکن جو ایشور پر یقین نہیں کرتا، دہریا پرواہ کرتا ہے اور جدوجہد کرتا ہے۔ بس کچھ سوچئے، جدوجہد ایشور تک پہنچا دیتی ہے۔ روشنی ضرور آنی چاہیئے۔ اگر کوئی شخص زندگی بھر مجھے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتا ہے۔ تو میں اپنے ہاتھوں کے استعمال کو بھول جاؤں گا۔ بھیڑوں کے گلہ کی طرح صرف ایک کی پیروی روحانی لوٹ ہے موت بے عملی کا نتیجہ ہے۔ باعمل بنئیے اور جہاں کہیں عمل ہوتا ہے، سرگرمی ہوتی ہے کچھ اختلاف ہوتا ہے اختلاف زندگی کا نچوڑ ہے اختلاف ہی سے یہاں ہر چیز خوبصورت بنی ہوئی ہے۔ یہ کادنگی ہے جو زندگی کا ذریعہ ہے زندگی کی علامت ہے ہم اس سے خوفزدہ کیوں ہوں؟

اب ہم پیغمبروں کو سمجھنے کی پوزیشن میں آتے جا رہے ہیں۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب کے اندر JELLY FISH کے وجود کے علاوہ عالمگیر طور پر یہ بات ثابت ہے۔ کہ جہاں کہیں سوچنے کا ڈھنگ حقیقی رہا ہے۔ روح ایشور کی طرف بڑھی ہے اور اس نے ایشور کو پا لیا ہے۔ اور زندگی میں خواہ ایک بار ہی سہی، خواہ ایک سیکنڈ کے لئے ہی سہی براہ راست ادراک ہوا ہے۔ جب اس کو دیکھ لیا جاتا ہے جو قریب سے قریب تر اور دور سے دور تر ہے۔ تو ان کے تمام خم نکل جاتے ہیں۔ سیدھا بن جاتا ہے تمام پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں اور عمل اور کرم کے تمام پھل اڑ جاتے ہیں۔ یہی مذہب ہے یہی مذہب کا منشا ہے۔ باقی سب نظریہ ہے مذہبی عقیدہ ہے۔ براہ راست ادراک کے لئے بہت سے طریقے ہیں۔ اب ہم محض ٹوکری کے لئے لڑ رہے ہیں اور پھل کھڈ میں جا گرے ہیں۔

اگر دو آدمی مذہب کے نام پہ جھگڑتے ہیں، ان سے سوال کیجئے — کیا تم نے خدا کو دیکھا ہے؟ کیا تم نے یہ چیزیں دیکھی ہیں؟ کیا تمہارے باپ نے اس کو دیکھا تھا؟ "نہیں جناب" — کیا تمہارے دادا نے اس کو دیکھا تھا؟ — "نہیں جناب"۔ تب پھر تم کاہے کے لئے جھگڑ رہے ہو؟ پھل کھڈ میں گر چکے ہیں اور تم ٹوکری کے لئے

لڑتے ہو۔ باشعور عورتوں اور مردوں کو اس طرح جھگڑنے میں شرم محسوس کرنی چاہیئے۔

یہ عظیم پیغمبر اور پیغامبر عظیم اور سچے ہیں۔ کیوں؟ کیونکہ ان میں سے ہر ایک ایک بڑے نظریہ کی تبلیغ کے لئے آیا۔ مثال کے طور پر آپ ہندوستان کے پیغمبروں کو لیجئے۔ وہ مذہب کے قدیم ترین بانی ہیں۔ ہم سب سے پہلے کرشن جی کو لیتے ہیں۔ آپ میں سے جس کسی نے گیتا پڑھی ہے۔ اُس نے پوری کتاب میں ایک بے تعلقی کا نظریہ پایا ہوگا۔ بے تعلق رہیئے۔ دل کا پیار صرف ایک کے لئے ہے۔ کس کے لئے؟ اس کے لئے جو کبھی نہیں بدلتا۔ وہ ایک کون ہے؟ وہ ایشور ہے۔ کسی ایسے سے پیار کرنے کی غلطی نہ کیجئے جو تبدیل ہوتا ہو۔ کیونکہ اس سے تکلیف پہنچتی ہے۔ آپ ایک آدمی کو پیار کر سکتے ہیں۔ لیکن ایک روز وہ مر جائے گا۔ اور نتیجہ تکلیف کی صورت میں نکلے گا۔ آپ اپنے دوست سے پیار کر سکتے ہیں۔ لیکن کل وہ دشمن بن سکتا ہے۔ اگر آپ اپنے شوہر سے پیار کرتی ہیں تو ایک روز وہ آپ سے جھگڑ سکتا ہے۔ آپ اپنی بیوی سے پیار کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ آج یا کل مر سکتی ہے۔ دنیا کا کام اسی طریقہ پر جاری ہے۔ پس کرشن جی کہتے ہیں۔ ایشور صرف ایک ہے۔ وہ کبھی تبدیل نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ پیار کبھی نہیں مرتا۔ ہم جہاں کہیں بھی ہوں ہم جو کچھ بھی کریں وہ ہمیشہ ہمیشہ ہم پر مہربان رہتا ہے۔ اسی طرح پیار کرتا ہے۔ وہ کبھی نہیں بدلتا۔ وہ کبھی ناراض نہیں ہوتا۔ خواہ ہم کچھ بھی کریں۔ ایشور ہم سے ناراض کس طرح ہو سکتا ہے؟ آپ کا بچہ بہت سی غلط حرکتیں کرتا ہے۔ کیا آپ بچے سے ناراض ہو جاتے ہیں؟ کیا ایشور یہ نہیں جانتا۔ کہ ہم کیا کرنے والے ہیں اور ہم کیا بن رہے ہیں؟ وہ جانتا ہے کہ ہم جلد یا بدیر مکمل ہونے والے ہیں۔ وہ صبر رکھتا ہے نا محدود صبر۔ ہمیں اس سے پیار کرنا چاہیئے۔ اور جو کوئی بھی زندہ ہے وہ اس میں اور اس کے ذریعہ زندہ ہے۔ یہ بنیادی بات ہے۔ آپ اپنی بیوی سے محبت کیجئے لیکن اس لئے نہیں کہ وہ آپ کی بیوی ہے۔ شوہر کو اس لئے پیار نہ کرو کہ وہ آپ کا شوہر ہے بلکہ اس لئے کرو کہ شوہر کے اندر ایشور ہے۔ ویدانت کا فلسفہ بتاتا ہے۔ کہ شوہر اور بیوی تک کے پیار میں بھی اگرچہ بیوی سوچتی ہے کہ وہ شوہر کو پیار کر رہی ہے۔ اصل کشش ایشور کی ہے جو اس میں موجود ہے۔ صرف وہی ایک باعثِ کشش ہے۔ اور کوئی دوسرا نہیں۔ لیکن بیوی بہت سی حالتوں میں نہیں جانتی کہ ایسا ہے۔ صرف جب کوئی ناواقفیت کی بنا پر ایسا کرتا ہے تو اس سے تکلیف پہنچتی ہے۔ اگر کوئی جان کر ایسا کرتا ہے تو یہ نجات ہے۔ یہی بات ہماری کتابیں کہتی ہیں۔ جہاں کہیں محبت ہے جہاں کہیں خوشی کی ایک چنگاری ہے سمجھ لو کہ یہ اس کی موجودگی کی چنگاری ہے۔ کیونکہ وہ خوشی ہے رحم ہے اور خود محبت ہے۔ اس کے بغیر یہاں محبت نہیں ہو سکتی۔

کرشن جی کی تعلیم کا ہمیشہ کے لئے یہی رجحان رہا ہے۔ جو انہوں نے ہندو قوم کو ذہن نشین کرایا۔ تاکہ جب کوئی ہندو کوئی کام کرتا ہو۔ یہاں تک کہ شراب بھی پیتا ہو تو وہ کہتا ہے۔ "اگر اس میں کوئی نیکی ہے تو وہ خدا کے لئے ہے۔ میرے لئے نہیں۔ اچھے کاموں کی فضیلت دنیا کے لئے ہے میں جو کام کر رہا ہوں اگر اس میں کوئی نیکی ہے تو وہ دنیا کے لئے ہے اور دنیا کی برائیاں، بدیاں میرے لئے۔ ہندو کہتا ہے کہ وہ ایشور پر سب سے زیادہ یقین رکھتا ہے۔ ہندو کہتا ہے کہ ایشور ہر جگہ موجود ہے۔ ہر کہیں وہ ہر ایک کی روح کی روح ہے۔ ہندو کہتا ہے "اگر

میں اپنی تمام نیکیاں ایشور کو دے دوں تو یہ ایک بڑی قربانی ہے۔ اور وہ پوری کائنات میں پہنچ جائیں گی۔"

یہ ایک سبق ہے۔ کرشن جی کا دوسرا پیغام کیا ہے؟ جو کوئی اس دنیا کے بیچ رہتا ہے کام کرتا ہے۔ اور اپنے تمام افعال کے پھل ایشور کو ارپن کر دیتا ہے۔ دنیا کی برائیاں اسے کبھی نہیں چھو پاتیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کنول جو پانی کے نیچے اُگتا ہے۔ سطح سے اوپر کی موٹی کاٹی سے پھوٹتا ہے اور پانی کے اوپر کھلتا ہے۔ اسی طرح آدمی ہے وہ دنیا کی سرگرمیوں میں مبتلا ہے اور اپنے کرموں کے تمام پھل ایشور کو سونپ دیتا ہے (گیتا ۵-۱۰)

انتہائی عامل قوت کے استاد کے طور پر کرشن جی کا ایک اور پیغام ہے۔ کام کام دن اور رات کام۔ گیتا میں ہے۔ آپ پوچھ سکتے ہیں تب پھر امن کہاں ہے۔ اگر عمر بھر مجھے گھوڑا گاڑی کی طرح کام کرنا ہے اور تھک کر مر جانا ہے۔ تو پھر یہاں میرا وجود کس لئے ہے؟ کرشن جی کہتے ہیں۔ ہاں آپ کو امن ملے گا۔ کام سے بھاگنا امن حاصل کرنے کا طریقہ نہیں ہے۔ اگر آپ ایسا کر سکتے ہیں تو اپنے فرائض سے دست کش ہو جائیے اور ایک پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جائیے۔ وہاں بھی ذہن چکروں میں گھرا رہتا ہے۔ کسی نے ایک سنیاسی سے پوچھا۔ جناب کیا آپ کو کوئی نفیس جگہ ملی۔ آپ کتنی مدت تک ہمالیہ کی پہاڑیوں میں گھومتے رہے ہیں سنیاسی نے جواب دیا۔ چالیس برس تک۔ وہاں بہت سی خوبصورت جگہیں ہیں۔ کسی ایک کا انتخاب کر کے وہاں بیٹھ جائیے۔ تب آپ نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ "کیونکہ ان چالیس برسوں تک میرے دماغ نے ایسا نہیں کرنے دیا۔" ہم سب کہتے ہیں کہ ہمیں امن تلاش کرنا چاہیئے۔ لیکن دماغ ہمیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

آپ اس آدمی کی کہانی جانتے ہیں جس نے ایک تاتار کو پکڑ لیا تھا۔ ایک فوجی شہر کے باہر تھا۔ جب وہ بارکوں کے قریب آیا۔ تو اس نے چلا کر کہا "میں نے ایک تاتاری کو پکڑ لیا ہے" ایک آواز آئی "اس کو اندر لے آؤ" "وہ اندر نہیں آتا جناب" "تب تم اندر آ جاؤ" "وہ مجھے بھی اندر نہیں آنے دیتا" پس ہم نے اپنے اس دماغ میں ایک تاتاری کو پکڑ رکھا ہے نہ تو وہ خود خاموش رہتا ہے نہ ہمیں خاموش رہنے دیتا ہے۔ ہم سب نے "تاتاریوں" کو پکڑ رکھا ہے۔ ہم سب کہتے ہیں پُرسکون رہو۔ پُرامن ہو۔ وغیرہ وغیرہ لیکن ہر ایک بچّہ یہ بات کہہ سکتا ہے اور ایسا کرنے کے لئے سوچ سکتا ہے۔ تاہم یہ بہت مشکل ہے۔ میں نے یہ کوشش کی ہے میں نے اپنے ہر قسم کے فرائض کو پس پُشت ڈال دیا۔ اور پہاڑوں کی چوٹیوں کی طرف بھاگ گیا میں غاروں اور گھنے جنگلوں میں رہا۔ لیکن یہی ہوا۔ میں نے ایک تاتار کو پکڑا۔ کیونکہ ہر وقت میری دنیا میرے ساتھ رہی۔ تاتاری ہے جو خود میرے دماغ کے اندر ہے۔ پس ہمیں باہر کے لوگوں کو قصوروار نہیں ٹھہرانا چاہیئے۔ یہ حالات اچھے ہیں اور یہ بُرے ہیں۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ اگرچہ یہاں ہمارے اندر ایک تاتاری ہے اگر ہم اسے خاموش کر سکیں تو ہم ٹھیک رہیں گے۔

اس لئے کرشن جی کی ہمارے لئے تعلیم یہ ہے کہ ہمیں اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے جان نہیں بچانی چاہیئے۔ بلکہ پوری صلاحیت کے ساتھ انہیں پورا کرنا چاہیئے۔ اور نتیجہ کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیئے۔ غلام کو سوال کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ فوجی کو دلیل بازی کا کوئی حق نہیں ہے۔ آگے بڑھتے رہیئے۔ جو کام آپ کو کرنا ہے اس کی نوعیت کی طرف زیادہ توجّہ نہ دیجیئے۔ اگر آپ بے غرض ہیں تو اپنے دماغ سے سوال کیجئے۔ اگر آپ کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتے۔ تو کوئی چیز آپ کے مقابلہ میں نہیں آ سکتی۔ ڈوب جائیے۔ فرض کو ہاتھ کے ہاتھ نپٹا دیجئے۔ اور جب آپ ایسا کریں گے۔ تو آپ کو آہستہ آہستہ سچائی کا وجدان ہو جائے گا۔" جو کوئی شدید عمل کے

درمیان ہوتا ہے شدید امن پالیتا ہے۔ اور جو کوئی شدید امن کے درمیان ہوتا ہے شدید عمل پاتا ہے۔ وہ ایک یوگی ہے ایک عظیم روح۔ وہ پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔

اب آپ دیکھتے ہیں کہ اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کے تمام فرائض لازمی قرار دے دیئے گئے ہیں۔ دنیا میں کوئی فرض ایسا نہیں ہے جسے ہم کمتر کہہ سکیں۔ اور ہر ایک آدمی کا کام اتنا ہی اچھا ہے جتنا کہ تخت پر بیٹھے ہوئے ایک شہنشاہ کا۔

سنیئے بدھ کا پیغام۔ ایک شاندار پیغام۔ ہمارے دلوں میں اس کی جگہ ہے۔ مہاتما بدھ کہتے ہیں "خود غرضی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکو۔ اور ہر اس چیز کو جڑ سے اکھاڑ پھینکو جو تمہیں خود غرض بناتی ہے۔ نہ بیوی کچھ نہ بچہ اور نہ خاندان۔ دنیا کے مت بنو۔ مکمل طریقہ پر بے غرض بن جاؤ" ایک دنیا دار آدمی سوچتا ہے کہ وہ بے غرض ہے۔ لیکن جب وہ اپنی بیوی کے چہرہ پر نظر ڈالتا ہے تو اس میں غرض آجاتی ہے۔ ماں سوچتی ہے کہ وہ قطعی طور پر بے غرض بنے گی لیکن جب وہ اپنے بچے پر نگاہ ڈالتی ہے تو فوری طور پر اس کے اندر خود غرضی آجاتی ہے۔ اس دنیا میں یہ بات ہر ایک کے ساتھ ہے۔ جیسے ہی انسان کے اندر خود غرضی پیدا ہوتی ہے اور جیسے ہی انسان خود غرض بن جاتا ہے حقیقی آدمی ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی حیثیت ایک بے حس حیوان اور ایک غلام جیسی ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو بھول جاتا ہے پھر وہ یہ نہیں کہتا کہ پہلے آپ اور بعد میں میں۔ پھر وہ کہتا ہے پہلے میں اس کے بعد دوسرا خود اپنے لئے سوچے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کرشن جی کے پیغام میں ہمارے لئے ایک گنجائش ہے۔ اس پیغام کے بغیر ہم قطعی طور پر حرکت نہیں کر سکتے کرشن جی کے پیغام پر دھیان دیئے بغیر ہم شعوری طور پر امن۔ خوشی۔ خوشحالی نہیں پا سکتے اور نہ اپنی زندگیوں کا کوئی فرض ادا کر سکتے ہیں اگر آپ کے کام میں کوئی برائی ہے تو خوف نہ کھائیے۔ کیونکہ ایسا کوئی کام نہیں جس میں برائی نہ ہو۔ اس کو خدا پر چھوڑیئے اور اس کے نتائج کی پرواہ نہ کیجئے۔

دوسری طرف دل میں دوسرے پیغام کے لئے گنجائش رہتی ہے۔ وقت بہت تیز رفتار ہوتا ہے۔ یہ دنیا لامحدود اور تکلیف دہ ہے۔ اے اچھا کھانے اچھا پہننے اور آرام کی زندگی گزارنے والو مصنفے والے مرد اور عورتو! کیا تم نے کبھی یہ سوچا ہے کہ لاکھوں افراد دکھ کے لئے جیتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ اس بڑی حقیقت کی طرف دیکھو، سوچو کہ یہ صرف تکلیف ہی تکلیف ہے۔ اس بچہ کی آواز کو سنو۔ جو دنیا میں پیدا ہوتے ہی مرنے لگتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بچہ روتا ہے۔ یہ رونے کی جگہ ہے۔ اگر ہم پیغمبروں کی باتوں کو سنیں تو ہم خود غرض نہیں بن سکتے۔

ایک اور پیغامبر کو لیجئے۔ ان کا نام مذہب ہے۔ جو کہ ایک عبرانی زاہد تھا۔ وہ تعلیم دیتا ہے۔ تیار ہو جاؤ۔ کیونکہ موت سامنے ہے میں نے کرشن جی کے پیغام پر ہر پہلو سے غور کیا ہے۔ اور میں نے بغیر کسی غرض کے کام کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن کبھی کبھی میں بھول جاتا ہوں۔ تب اچانک بدھ کا یہ پیغام میرے سامنے آجاتا ہے "دنیا میں ہر چیز کی قدر کرو جو مٹنے والی ہے اور زندگی میں ہمیشہ تکلیف ہوتی ہے۔" میں اس پیغام کو سنتا ہوں۔ اور میں نہیں سمجھ سکتا۔ کہ کس پر یقین کروں۔ تب پھر یہ پیغام دماغ

میں بجلی کی طرح چمکتا ہے۔ "تیار ہو جاؤ۔ کیونکہ دوسری دُنیا (عالمِ قدس) سامنے ہے۔ ایک لمحہ کی تاخیر نہ کرو۔ کوئی کام کل پہ نہ چھوڑو۔ اور آخری وقت کے لئے تیار رہو۔ جو فوراً اور ابھی آسکتا ہے۔ یہ پیغام بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اور ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں، ہم اس پیغامبر کو سلام کرتے ہیں۔ ہم ایشور کو سلام کرتے ہیں۔

اور اس کے بعد حضرت محمدؐ کی باری آتی ہے۔ جو مساوات کے پیغمبر ہیں۔ آپ پوچھتے ہیں کہ ان کے مذہب میں کیا خوبی ہو سکتی ہے۔ اگر اس میں کوئی خوبی نہیں ہے تو پھر یہ باقی کیوں ہے؟ اچھائی ہی باقی رہتی ہے۔ کیونکہ صرف اچھائی ہی میں طاقت ہوتی ہے۔ ہماری اس زندگی تک میں ایک بُرے آدمی کی زندگی کتنی ہوتی ہے؟ کیا نیک آدمی کی زندگی طویل نہیں ہوتی؟ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ نیکی طاقت ہے۔ اچھائی طاقت ہے۔ "محمدن ازم" میں اگر کوئی اچھائی نہیں ہے تو وہ پھر زندہ کس طرح رہ سکتا تھا؟ اس میں بہت اچھائی ہے۔ حضرت محمدؐ مساوات کے پیغمبر تھے۔ انسانی بھائی چارہ۔ تمام مسلمانوں کے اندر بھائی چارہ کے پیغمبر تھے۔

پس ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ایک پیغمبر اور ہر ایک پیغامبر کی ایک خاص تعلیم ہے۔ جب آپ اس کے پیغام کو سُنیں تو اس کی زندگی پر نگاہ ڈالیں۔ اس کی زندگی اس کے پیغام کی شرح ہوتی ہے۔

بلے وقوف۔ جاہل بیس ہزار قسم کے نظریات شروع کرتے ہیں۔ اپنی ذہنی رسائی کے مطابق انہیں پیش کرتے ہیں اور خود اپنے خیالات کے مطابق انہیں ڈھالتے اور معنی پہناتے ہیں اور ان کو ان عظیم استادوں کے ساتھ منسوب کرتے ہیں۔ وہ اپنی تعلیم کو ان کے سر تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر ایک پیغمبر کی زندگی اس کی تعلیم کی شرح ہوتی ہے۔ اس کی زندگی پر غور کیجیے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے اس کا عمل اس کے مطابق ہوتا ہے۔ گیتا کو پڑھیے۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ کرشن جی کی زندگی کے عین مطابق ہے۔

حضرت محمدؐ نے اپنی زندگی میں عمل کر کے دکھا دیا۔ کہ مسلمانوں کے اندر قطعی مساوات اور بھائی چارہ ہونا چاہیئے۔ اس میں نسل، ذات پات، رنگ اور جنس کا کوئی سوال نہیں ہے۔ سلطان ترکی افریقہ کی غلامی سے ایک نیگرو کو خریدے اور اس کو زنجیروں میں جکڑ کر ترکی لے آئے۔ اگر وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔ تو یہ اس کے لئے کافی ہے وہ نیگرو سلطان کی لڑکی کے ساتھ شادی کر سکتا ہے اُس ملک کے اندر نیگرو باشندوں اور امریکن ہندوستانیوں کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے اس کا اس سے مقابلہ کیجیے۔ اور ہندو کیا کرتے ہیں؟ اگر آپ کے پادریوں میں سے کوئی کسی قدامت پرست شخص کے کھانے کو ہاتھ لگادے تو وہ اس کو پھینک دے گا۔ باوجودیکہ ہمارا فلسفہ عظیم ہے۔ آپ ہماری اس کمزوری کو دیکھتے ہیں۔ لیکن آپ مسلمان کی عظمت دیکھتے ہیں کہ دوسری نسلوں کے سوا وہ نسل اور رنگ کا خیال کئے بغیر مساوات اور مکمل مساوات کا مظاہرہ کرتا ہے۔

کیا دوسرے اور عظیم پیغمبر آئیں گے؟ یقینی طور پر وہ اس دنیا میں آئیں گے۔ لیکن ان کا انتظار نہ کیجیے۔ میں اس بات کو پسند کروں گا کہ آپ میں سے ہر ایک حقیقی نئے منشور (انجیل کا وہ حصہ جس میں شریعت عیسیٰ کا ذکر ہے) کا پیغامبر بنے۔ جو کہ پرانے منشور (انجیل کا وہ حصہ جس میں شریعتِ موسیٰ کا ذکر ہے) سے بنا ہے۔ تمام پرانے پیغامات کو خود اپنے احساسات کا ضمیر سمجھئے۔ اور دوسروں کے لئے پیغمبر کی

حیثیت اختیار کیجیے۔ ان اُستادوں میں سے ہر ایک عظیم رہا ہے۔ ہر ایک ہمارے لئے کچھ نہ کچھ چھوڑ گیا ہے۔ وہ ہمارے لئے دیوتا رہے ہیں ہم انہیں سلام کرتے ہیں۔ ہم ان کے خادم ہیں۔ اور چونکہ وہ ایشور کے پیغمبر اور ایشور کے بچے رہے ہیں۔ اس لئے ہم بھی پیغمبر اور ایشور کے بچے ہیں۔ وہ اپنی تکمیل کو پہنچ گئے۔ اور ہم اپنی تکمیل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ عیسیٰ کے اس پیغام کو یاد رکھیے "عالم قدس سامنے ہے"۔ اسی لمحہ ہمیں چاہیئے کہ ہم پُر جوش عزم کر لیں کہ "میں بھی ایک پیغمبر بن جاؤں گا۔ میں نور کا ایک پیغامبر ہو جاؤں گا۔ میں خدا کا ایک بچہ بن جاؤں گا۔ نہیں میں خدا بن جاؤں گا۔"

---



سوامی وویکانند کے ایک مغربی مرید (ششیہ) مسٹر جے۔ جے۔ گڈوِن جنہوں نے سوامی جی کے لیکچروں کے نوٹ لئے اور اس طرح سوامی جی کے خیالات کو قلمبند کیا۔ آپ سوامی جی کے ساتھ ہندوستان چلے آئے تھے 898ء میں اُوٹاکمنڈ کے مقام پر ان کا انتقال ہو گیا!


ओं तत् सत्
نیا ہندوستان
MODERN INDIA

# نیا ہندوستان

صفحہ

# رُخِ ماضی

ویدوں کے پنڈت اور علماء، یگیہ منتر[1] جانتے ہیں اور اس علم کو وہ اپنی برتری کی بنیاد قرار دیتے ہیں، یہی منتر ہیں، جن میں یہ شکتی ہے کہ وہ دیوتاؤں کو سورگ سے زمین پر اتار لیں اور یجمان[2] دیوتاؤں کی دعوت میں جو کھانا پینا پیش کریں وہ اسے منظور کریں اور ان کی دعائیں اور پرارتھنائیں قبول و مستجاب کریں، لہٰذا راجہ بھی اور پرجا بھی اپنی دنیوی زندگی میں خیر و فلاح کی خاطر ان پنڈتوں کی دست نگر رہتی، راجہ سوم[3] کی ایک پنڈت نے پرستش کی اور اپنے منتروں کے زور سے اسے اپنی مٹھی میں لے لیا، چونکہ سوم درخت کا رس دیوتاؤں کا مرغوب مشروب ہے، لہٰذا پنڈت یگیہ کے وقت یہ مرغوب مشروب دیوتاؤں کو پیش کرتے جس سے خوش ہو کر وہ ان کے دلوں کی خواہش پوری کر دیا کرتے، پس ایشور کی کرپا سے طاقت پذیر ہو کر، ایک پنڈت دنیوی مخالفت کی کوئی پروا نہیں کرتا، اس لیے کہ دیوتاؤں کے سامنے فانی انسانوں کی کیا وقعت ہو سکتی ہے، یہاں تک کہ ایک راجہ بھی، جو تمام دنیوی طاقتوں کا مرکز ہوتا تھا، پنڈت کے دروازے پر ماتھا رگڑتے دکھائی دیتا ہے، اس لیے کہ پنڈت کی ایک نگاہِ کرم سے اس کی کایا پلٹ ہو سکتی تھی، اور اس کا آشیرواد اس کی حکومت اور اس کے اقتدار کے لیے وہ چیز تھا، جس سے بڑی کوئی چیز نہیں تھی، بادشاہ چونکہ ایسے امور سے خوفزدہ رہتا جو اس کے لیے موت اور تباہی کا موجب بن سکتے لہٰذا وہ پجاری کے آشیرواد اور اس کے عاقلانہ مشوروں سے مستفید ہونے کی غرض سے اسے اپنا بہترین دوست اور رفیق بنائے رہتا، چنانچہ پجاری اس زریں موقع سے فائدہ اٹھاتا اور اسے راجہ کو اپنی حکمتِ عملی کے پھیلائے ہوئے جال میں پھانس لینے کا موقع مل جاتا، بسا اوقات دیکھا گیا کہ شاہی دربار کا سارا اقتدار پجاری کے ہاتھ میں آگیا، مزید برآں راجہ کو سب سے زیادہ خوف اس بات سے ہوتا کہ پجاری کو اس کے آباؤ اجداد اور اس کے شجرہ نسب کا

---

[1] ویدوں کے شلوک جو پنڈت یگیہ کے وقت دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے پڑھا کرتے ہیں [2] یگیہ کرانے والے [3] ویدوں میں سوم درخت کا ذکر عام طور پر پایا جاتا ہے۔ پنڈت، پجاری اس درخت کا رس دیوتاؤں کو یگیہ کے وقت پیش کیا کرتے ہیں۔

علم رہتا۔ اور اس کی ساری نیک نامی اور شہرت پجاری کے رحم وکرم پر منحصر ہوتی، وہ اپنے قلم کی ایک جنبش سے اس کی ساری بنی عزت اور شہرت کو خاک میں ملا سکتا تھا، اس لئے کہ وہ مؤرخ کی حیثیت رکھتا تھا، ایک راجہ اپنے عہدِ اقتدار میں بامِ عروج پر پہنچ سکتا تھا، اپنے زمانے میں عزت و شہرت کے سورج اگا سکتا تھا اور اپنی رعایا سے یہ بات منوا سکتا تھا کہ وہ نجیب الطرفین ہے اس کی ماں کی ذات بھی بہت اونچی ہے اور اس کے باپ کی ذات بھی لیکن کوئی پجاری اگر اس سے ناخوش ہو جائے تو پھر وہ اس کی عزت شہرت کے سورج کو ایک لمحے کے اندر ہمیشہ کے لئے غروب کر سکتا تھا، اور راجہ کی تمام فیض رسانیاں اور تمام شہرت و عزت اسی طرح وقت کے بھنڈار میں گر کر غائب ہو سکتی تھی جس طرح شبنم کا ایک قطرہ سمندر میں گر کر فنا ہو جاتا ہے، جن راجاؤں نے مدتوں یگیہ جاری رکھا جیسے اشومیدھ (انعام قسم کا یگیہ) کے ججمان اور جو راجہ پجاریوں پر برسات کی بدلیوں کی طرح دولت کی موسلا دھار بارش کرتے رہے ان کے نام ان پجاریوں نے تاریخ کے صفحات میں سونے کے حروف سے لکھے ہیں اور ان کے ناموں کو انہوں نے امر کر دیا ہے، دیوتاؤں کا محبوب پریہ درشی دھرم اشوک[1] کچھ نہیں ہے مگر پجاریوں کی دنیا کا ایک نام جبکہ پریکشت کا بیٹا "جنمیجے"[2] ( Janamejaya, ) کا نام ہر ہندو خاندان میں بس ایک ضرب المثل بن کر رہ گیا ہے!

اپنی حکومت کا تحفظ، عیش و عشرت سے معمور اپنی زندگی کے اخراجات کی کفالت اور اس سے بھی سوا، پجاریوں کے دامن حرص و ہوس کو لگاتار بھرتے رہنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ جس طرح سورج زمین کی نمی کو جذب کرتا رہتا ہے اسی طرح راجہ بھی اپنی رعایا کو چوستا رہے، چنانچہ اس کا خاص شکار — اس کی دودھ دینے والی گائیں — وہی ہوتے ہیں جن کو ویش کہا جاتا ہے۔

نہ ہندو راجاؤں کے عہد میں اور نہ بدھ راجاؤں کے عہد میں ہمیں یہ بات دکھائی دی کہ عام رعایا کو بھی حکومت کے معاملات میں اپنی رائے ظاہر کرنے کا کوئی حق دیا گیا، یہ ٹھیک ہے کہ یدھشٹر جب اپنے فسلن کاٹ میں بھٹے تو ویشوں اور یہاں تک کہ ان لوگوں کے گھروں میں بھی جایا کرتے تھے جو شودر کہلاتے تھے، یہ بھی ٹھیک ہے کہ اجودھیا میں رام چندر جی کے راج کی بحالی کے لئے رعایا پر اڑا رکھا گیا کرتی تھی، لیکن صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اجودھیا کے عام لوگ سیتا جی کے عمل پر نکتہ چینی بھی کرتے تھے اور انہیں جلا وطن کرانے کی غرض سے چپکے چپکے منصوبے بھی بنایا کرتے تھے، لیکن اس کے باوجود انہیں راج پاٹ کے کاموں میں براہِ راست دخل دینے کا کوئی حق نہیں تھا، عوام کی شکتی، یا رائے عامہ، بالواسطہ اور غیر منظم صورت میں بغیر کسی طریق کار کے اپنا عمل جاری رکھتی، لیکن عوام کو اپنی اس طاقت کی موجودگی کا ادنیٰ سا احساس تک نہ ہوتا، چنانچہ نہ تو ان کی جانب سے ایک متحدہ اقدام کے لئے رائے عامہ کی شکتی کو منظم کرنے کے لئے عملی طور پر کوئی کام کیا گیا، نہ ہی ان میں رائے عامہ کی طاقت کو منظم کرنے کی کوئی خواہش یا کوئی ارادہ دکھائی دیا، ان میں وہ اہلیت و استعداد نظر نہیں آتی جو طاقتوں کے چھوٹے چھوٹے سرچشموں کو جوڑتی اور انہیں ملا کر شکتی کا ایک سمندر پیدا کر دیتی ہے۔

---

[1] بدھ مت قبول کرنے کے بعد سمراٹ اشوک کا نام [2] مہا بھارت کا سرپ یگیہ کرانے والا وہ عظیم شخص، جس نے تمام سرپوں کو بھسم کر دینے کے لئے سرپ یگیہ کرایا۔

---

کیا یہ صُورتِ واقعہ اس بنا پر تھی کہ مناسب قانون مَوجُود نہیں تھے؟ نہیں ایسی بات ہرگز نہیں ہے حکومت کے ہر شعبہ کے لئے قوانین بھی ہیں، دستورُالعمل بھی ہے، طریق کار بھی متعیّن کیا گیا ہے، مالگزاری، فوج، عدالت، سزا وجزا غرض ہر چیز سے متعلق قوانین موجود ہیں اور ان قوانین کی شرح بھی موجود ہے، تفصیلات بھی موجود ہیں لیکن ان سب کا سرچشمہ ہے رشی کا قولِ فیصل! ـــ یعنی ایشور کا حکم! گویا ایشور کی حیثیت ایک رشی کے ذریعہ بُھٹے کا دیا آتی ہے اور لوگوں کو اس کا علم حاصل ہوتا ہے، بالعموم یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ قوانین اپنے اندر کوئی لچک نہیں رکھتے، ان حالات کے تحت عام لوگوں کے لئے ایسی تعلیم حاصل کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا جس سے وہ خود کو متحد کرنا سیکھیں اور مشترک مفادِ عامہ کی بُنیاد پر متحد ہو جائیں، یا جس کے ذریعہ وہ اس بات سے آشنا ہوں کہ راجہ نے اپنی رعایا کے ذریعہ جو خزانہ اکٹھا کر رکھا ہے اس میں عوام کا کیا حق ہے اور عام لوگ اس خزانہ میں سے کتنا حصّہ پانے کا استحقاق رکھتے ہیں، یا جس تعلیم کے ذریعہ ان میں یہ بیداری پیدا ہو کہ حکومت کی آمدنی اور خرچ کو کنٹرول کرنے کے لئے وہ بھی اپنی نمائندگی کا حق حاصل کریں، عوام ایسی چیزیں کیوں کرتے ہیں؟ کیا رشی پر ان کی خوشحالی اور ترقی کے نقطۂ نظر سے کوئی ذمّہ داری عائد نہیں ہوتی، کیا ان کے لئے رشی کے گیان کا کوئی فریضہ نہیں ہے؟

مزید برآں یہ تمام قوانین کتابوں میں درج ہیں، کتابوں میں مندرج قوانین کی منشا اور عملی زندگی میں ان کے نفاذ کے درمیان بہت بڑا اختلاف اور زبردست فرق پایا جاتا ہے، اگنی ورنوں[1] کے ہزاروں برس گزر جاتے ہیں تب ایک رام چندر پیدا ہوتے ہیں۔ بادشاہوں میں چنڈ اشوک[2] تو بہت دکھائی دیتے ہیں لیکن دھرم اشوک شاذ ونادر ہی نظر آتے ہیں، اکبر جیسے رعایا پرور بادشاہ تو بہت کم گزرے لیکن اورنگ زیب جیسے بادشاہوں کی کوئی کمی نہیں رہی، جو زندگی بھر عوام کا خون بہاتا رہا۔

رام چندر، یدھشٹر، دھرم اشوک، یا اکبر جیسے نیک سیرت بادشاہوں کے عہد میں بھی جن کے زمانہ میں عوام کو امن وسلامتی اور خوشحالی میسر آئی اور انہوں نے ہمیشہ باپ جیسی شفقت کے ساتھ اپنی رعایا پر حکومت کی، وہ ہاتھ جو ہمیشہ دوسروں کے منہ میں نوالا رکھتا تھا خود اپنے منہ میں نوالہ رکھنے کی توانائی کھو بیٹھا، جس آدمی کا تحفظ کوئی دوسرا کرتا ہے قدرتی طور پر وہ حفاظتِ خود اختیاری کی شکتی کھو دیتا ہے، ایک طاقتور، توانا، جوان تک اگر اس کے والدین اس کی بچّوں کی طرح نگہداشت کیا کرتے ہیں تو وہ بچّہ ہی بنا رہتا ہے، نیک نفس بادشاہوں کے عہد میں بھی چونکہ رعایا کی حفاظت وکفالت کی ذمّہ داری بادشاہوں کے کندھوں پر عائد رہی لہٰذا عوام کو حکومتِ خود اختیاری کے اصول سمجھنے کا کبھی کوئی موقع نہیں مل سکا، ایک ایسی قوم جو سدا بادشاہوں کی دستِ نگر بنی رہی اور جس نے

---

[1] اگنی ورن، سُوریہ ونشی شہزادہ تھا، جو اپنی حرم سرا سے کبھی باہر نہیں نکلا اور خواہشاتِ نفسانی کی کثرت میں مبتلا رہنے کی بنا پر بدہضمی کا شکار ہو گیا۔ [2] سمراٹ اشوک کو پہلے پہلے چنڈ اشوک کہا جاتا تھا، اس لئے کہ وہ اپنے بھائی کو قتل کر کے تخت کا وارث بنا تھا اور اس نے بہت سے ظلم کئے تھے، لیکن ۹ برس تک ظلم وتشدد کے ساتھ حکومت کرنے کے بعد جب اس نے بدھ مت اختیار کر لیا تو اس کی سیرت قطعی طور پر بدل گئی اور پھر اس کی نیک اعمالی، نیک نیتی، اور نیک نفسی کی بنا پر اسے دھرم اشوک کہا جانے لگا، ـــ یعنی وہ بادشاہ جو نیکیوں کا پیکر تھا!

---

حفاظتِ خود اختیاری یا مشترک مفاد کے لئے کبھی اپنی شکتی کو استعمال میں لانے کی کوشش نہیں کی آہستہ آہستہ موروثی شکتی اور توانائی کی محتاج بن کر رہ گئی، اگر یہ صورت واقعہ کہ ہم دوسروں کے دستِ نگر بنے رہیں اور اپنی حفاظت کے لئے دوسروں کو تکتے ہیں اسی طرح جاری رہے گی تو یہ قوم کی تباہی کا موجب بن جائے گی۔ اور اس تباہی میں بہت دیر نہیں لگے گی۔

بے شک یہ نتیجہ ضرور اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ایک ملک کی حکومت اگر شاستروں کے قوانین کے تحت عمل کرے جو عظیم رشیوں اور ہادیوں نے اپنی روحانیت، عقلِ کامل اور اپنے علم سے مرتب کئے ہیں تو ایسی حکومت راعی و رعایا، امیر و غریب، جاہل و عالم کے درمیان کوئی امتیاز روا نہیں رکھے گی اور وہ ہر شخص کی فلاح و ترقی کے لئے مساوی طور پر عمل کرے گی، مگر ہم کو تجربہ ہے کہ عملی زندگی میں یہ قوانین کس حد تک نافذ ہوئے اور انہیں کس حد تک نافذ کیا جا سکتا ہے، امریکہ کی حکومت مغرب کی نئی دنیا کی پیش رو ہے، اس کی یہ تہلکہ انگیز آواز ساری دنیا میں گونج اٹھی ہے کہ اس ملک میں جو حکومت ہو وہ عوام کی ہونی چاہیئے، عوام کے ذریعہ ہونی چاہیئے اور اسے عوام کی بہبود کے لئے عمل کرنا چاہیئے، امریکہ کے لوگ بہر حال یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ان کے نظامِ حکومت کی اس آواز سے قدیم ہندوستان کے کان نا واقف و نا آشنا تھے، یونان کے سیاح اور دوسرے لوگ جو ہندوستان آتے رہے تھے ان کے ذریعہ ہمیں اس مفہوم کے ثبوت ملتے ہیں کہ پورے ملک میں بہت سی چھوٹی چھوٹی آزاد و خود مختار ریاستیں موجود تھیں، بدھ مت کے لٹریچر میں بھی ہمیں اکثر مقامات پر اس مفہوم کے ثبوت ملتے ہیں، اور اس میں تو قطعی طور پر کسی طرح کے شبہ کی کوئی گنجائش ہے ہی نہیں کہ گاؤں پنچایت[1] کی شکل میں یہاں حکومتِ خود اختیاری کے جراثیم موجود تھے، لیکن یہ جراثیم بس جراثیم ہی کی صورت میں رہے، حکومتِ خود اختیاری کا جو تخم ان میں ڈالا گیا، وہ کبھی بار آور نہیں ہوا، اور کبھی اس تخم سے ایک تناور درخت پیدا نہیں ہوا، حکومتِ خود اختیاری بس دیہی پنچایتی نظام کی چار دیواری کے اندر محدود رہی اور اس چار دیواری سے نکل کر پورے سماج میں کبھی فروغ نہیں پا سکی۔

مذہبی حلقوں میں، بدھ مٹھوں کے درمیان، بدھ سنیاسیوں میں ہمیں اس بات کا کافی ثبوت ملتا ہے کہ حکومتِ خود اختیاری پورے طور پر فروغ پا رہی تھی، ایک شخص کو آج بھی یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ناگا سنیاسیوں میں پنچایتی نظام کس طرح حکومتِ خود اختیاری کے اصولوں پر قائم ہے، پنچوں کی حکومت کو کتنا وقار اور کتنی عزت حاصل ہے اور ہر ناگا اپنے قبیلہ میں کس طرح اپنے انفرادی حقوق کو بروئے کار لاتا ہے اور کس شاندار طریقہ پر وہ ایک تنظیمی طاقت کے ساتھ اپنی زندگی میں عمل پیرا رہتے ہیں اور کس اتحاد کے ساتھ اقدامات کرتے ہیں،

بدھ مت کی لہر اٹھی تو وہ پجاریوں کی طاقت و اقتدار کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے گئی اور راجہ مطلق العنان بن گیا، بدھ پجاری راہب تھے، تارک الدنیا تھے، مٹھوں میں اپنی زندگی بسر کرتے تھے، اور انہیں دنیوی معاملات سے کوئی واسطہ نہیں تھا،

---

[1] اصطلاحاً پانچ افراد پر مشتمل حکومت — پنچایت میں لوگ بیٹھا کرتے تھے اور آپس میں صلاح و مشورہ کر کے اپنے تمام تنازعات کا فیصلہ اور تصفیہ کر لیا کرتے تھے۔

وہ نہ تو راجہ کو اپنی بد دعا یا جادو کے تیروں کے خوف میں مبتلا کر کے اپنے کنٹرول (قبضہ) میں رکھنے کی کوشش کرتے تھے نہ ان کے دلوں میں اس بات کی کوئی خواہش ہی تھی کہ راجہ ان کے زیر اثر رہے اور ان سے سرکشی نہ کرے۔ اگر کہیں ایسی کوئی خواہش تھی بھی تو اس کی تکمیل ناممکن ہو گئی تھی، اس لئے کہ بدھ مت نے نذر و نیاز قبول کرنے والے تمام دیوتاؤں کا تخت ہلا کے رکھ دیا تھا، اور وہ ان سب کو ان کے سورگ کے ٹھکانوں سے نکال کر زمین پر اتار لایا تھا، بدھ کی حیثیت برہما اور اندر کی حیثیت سے بھی برتر مانی جانے لگی، اور بدھ کا درجہ حاصل کرنے کی غرض سے ان کے درمیان عبادت و ریاضت میں شرطیں لگنے لگیں، ہر آدمی بدھ کا درجہ حاصل کر سکتا ہے، اور اپنی اسی زندگی میں بدھ کی منزل تک پہنچ سکتا ہے، ہر شخص کے لئے اس منزل تک پہنچنے کا راستہ کھلا ہوا ہے، قدرتی طور پر اس بات کا یہ نتیجہ نکلا کہ پجاریوں کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔

انجام کار شاہی اقتدار قربانی کا گھوڑا بن کر رہ گیا، جس کی باگ پجاریوں کے ہاتھ میں نہیں رہی، وہ گھومنے پھرنے کے آزاد سے چھوٹ گیا، جہاں چاہے جائے، اور جہاں چاہے قیام کرے، اس زمانہ میں اقتدار کا مرکز نہ تو ان پجاریوں کے پاس رہا جو رگ وید کے مطابق یگیہ کیا کرتے تھے اور سوم منتر پڑھا کرتے تھے نہ اقتدار کا مرکز کشتری راجاؤں کے پاس رہا، بلکہ یہ مرکز ان دونوں سے الگ ہو گیا، جو چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستوں پر حکومت کیا کرتے تھے، اس زمانہ میں اقتدار کا مرکز وہ بڑے بڑے سمراٹ اور شہنشاہ بن گئے، جن کے زیر نگیں پورا ملک آ گیا، اس زمانہ میں وشوامتر یا وششٹ رہنما نہیں رہے، اس زمانہ میں چندر گپت اور دھرم اشوک وغیرہ لیڈر بن گئے، بدھ مت کے زمانہ میں ہندوستان کی شان و شوکت ان شہنشاہوں پر منحصر رہی، جو ہندوستان کے تخت پر حکمران بنے، انہوں نے اس سرزمین پر اس انداز سے حکومت کی جیسے وہ اس کے اقا ہیں، اس زمانہ کے خاتمہ کی خاص بات یہ ہے کہ راجپوت طاقت معرض وجود میں آئی اور "ماڈرن ہندوازم"[1] کا عروج شروع ہوا، راجپوتوں کے عروج اور بدھ مت کے زوال کی بدولت ہندوستان کے اقتدار کی مالا کا رشتہ ٹوٹ گیا اور دانہ دانہ بکھر کر رہ گیا، اور ہندوستان کے ہزاروں ٹکڑے ہو گئے، اور ان کا اقتدار بے طاقت ہاتھوں میں آ گیا، اس وقت برہمنی شکتی (پجاری) پھر نمودار ہوئی، لیکن اپنی پہلی سی کبری صورت میں نہیں، بلکہ اس مرتبہ وہ شاہی اقتدار کی معاون بن گئی!

اس انقلاب کے دوران میں پجاری اور شاہی طاقت کے درمیان وہ مسلسل کشمکش ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی جو ویدوں کے زمانہ میں جاری تھی، اور جو بدھ مت اور جین مت کے عروج تک جاری رہی، اب یہ دونوں طاقتیں ایک دوسرے کی دوست بنیں لیکن نہ تو کشتری راجاؤں میں وہ شاہانہ جاہ و جلال رہا نہ پجاریوں میں وہ روحانی روشنی رہی جو برہمنوں کا وصف خصوصی تھی، ان دونوں طبقوں کے ہاں اوصاف ضائع ہو گئے! ان دونوں طبقوں کا اتحاد جیسا کہ توقع ہو سکتی تھی، فوراً ہی اپنے مشترک مفاد کے حصول میں مصروف ہو گیا، اور وہ اپنے مشترک مخالفین خاص طور پر بودھوں کے استحصال کے لئے سرگرم کار ہو گئے، اور اسی طرح کے دیگر کام کرنے لگے، ایسا اتحاد کے نتیجہ میں جو شر اور بدی ابھر سکتی تھی وہ ابھری یعنی یہ کہ وہ عوام کا خون چوسنے لگے، دشمن سے انتقام لینے لگے، اور اپنے مخالفین کی املاک کو تباہ و برباد کرنے لگے، انہوں نے راجہ سویا اور دوسرے قدیم راجاؤں کی ویدک قربانیوں کی نقل اتارنی شروع کر دی، اور ان کی قربانیوں کو محض ایک مذاق بنا کر رکھ دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ خوشامدیوں نے ان کو اپنے نرغہ میں لے لیا، خوشامد کا بول بالا ہو گیا، اور ساتھ ہی ساتھ پجاریوں نے یگیہ، ہون اور منتروں کا ایک جال بچھا دیا، اور پھر وہ بہت ہی جلد

---

[1] عصر جدید کا ہندو دھرم

مغرب سے آنے والے مسلم حملہ آوروں کا شکار بن گئے!

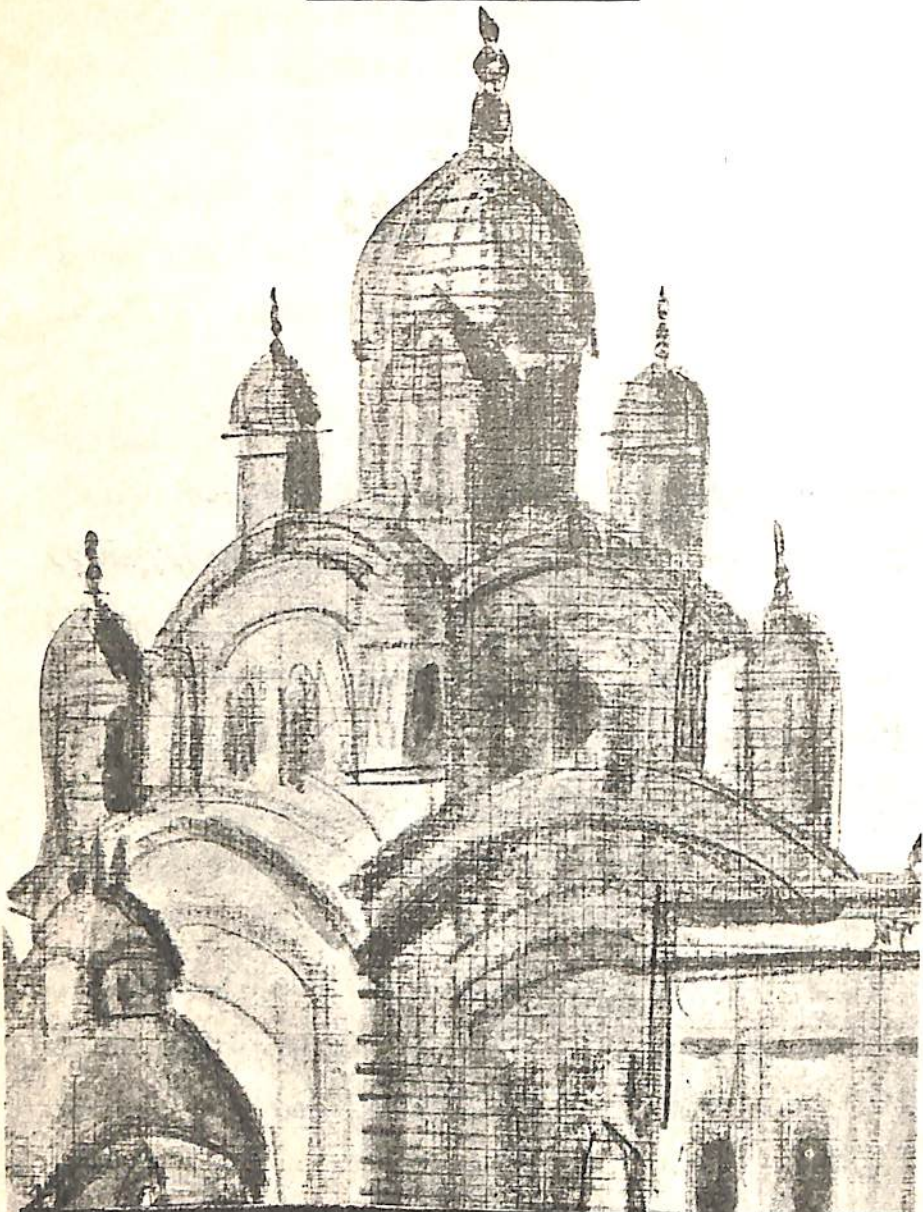
ویدوں کے زمانہ سے پجاری یہ چاہتا تھا کہ راجہ پر برتری حاصل کرے اِس خواہش کی بنا پر دونوں طبقوں میں ایک کشمکش اور ایک آویزش رہی، لیکن بھگوان شری کرشن نے اپنی فراست اعلیٰ سے کام لے کر کشتریوں کے خلاف براہمنوں کی اس آویزش کو تھوڑے عرصہ کے لئے روک دیا تھا، کم از کم اتنے عرصہ تک یہ آویزش ضرور رُکی رہی جب تک بھگوان شری کرشن کا اس زمین پر ظہور رہا، بدھ اور جین مت کے انقلابات کے دوران میں براہمنی طاقت اپنے دائرہ عمل سے قریب قریب اکھاڑ پھینکی گئی، یا طاقتور مذاہب کے بالمقابل لسماندگی کی حالت میں پڑ گئی اور بہت کمزور سی رہی، راجپوت طاقت کے مودار ہونے پر جس نے ہندوستان پر اپنا اقتدار جما لیا تھا، براہمنی طاقت نے اپنی سابقہ عظمت دوبارہ حاصل کرنے کی ایک کوشش کی، اور اپنی برتری قائم کرنے کی اس کوشش میں اس نے وسط ایشیا سے نئے نئے آنے والے نیم متمدن حملہ آوروں کے ہاتھ خود کو بیچ ڈالا، اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے ان کے قابلِ نفرین رواج و رسوم کو اس ملک کے اندر فروغ دیا، مزید براں براہمنی طاقت نے خود کو کلی طور پر اس کام میں لگا دیا کہ جاہل اور نیم وحشی حملہ آوروں کو بے وقوف بنا کر آسانی سے فائدہ اٹھایا جائے، چنانچہ وہ دھرم کے نام پر مبہم اور پُر اسرار رسمیں انجام دینے لگے اور نئی نئی تقریبیں ہونے لگیں، ان حالات کی بنا پر براہمنی طاقت کی سابقہ عقل و دانش بھی گم ہو گئی، اس کی اہلیت، علمی استعداد اور اس کی سابقہ عزت و وقار بھی کھو گیا، انجام کار کے لئے آریہ ورت میں توہم پرستی پھیل گئی، عجیب و غریب رسم و رواج شروع ہو گئے اور اپنی داخلی توانائی کھو کر انتہائی کمزور ہو گیا، اس لئے مغرب سے آنے والے مسلم حملہ آوروں کا طوفان ٹکرانے سے اگر آریہ ورت پاش پاش ہو گیا تو اس پر تعجب کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، براہمنی طاقت کو زوال آ چکا ہے اور کون جانتا ہے کہ اسے پھر کبھی عروج حاصل ہو گا!

مسلمانوں کے عہدِ اقتدار میں براہمنی طاقت کا احیا ایک ناممکن سی بات تھی، پیغمبرِ اسلام حضرت محمد صلعم اس بات کے سخت مخالف تھے کہ کوئی طبقہ مذہب کے اجارہ دار بن بیٹھے اور کسی بھی شکل میں اپنی امارت قائم کر لے، چنانچہ انہوں نے ایسے قوانین وضع کئے اور ایسے ضابطے بنائے جس کی بنا پر مذہب کی ٹھیکہ داری اور ان ٹھیکہ داروں کی طاقت چکنا چور ہو گئی۔ اسلام کے قوانین کے تحت بادشاہ ہی دین کا سردار بھی ہوا کرتا ہے اور وہی مذہبی امور میں رعایا کی رہنمائی کرتا ہے، ایک مسلمان شہنشاہ بن کر قدرتی طور پر یہ آرزو کرتا ہے کہ وہ عالمِ اسلام کے تمام معاملات میں واحد لیڈر بن جائے یعنی وہ دنیوی حکمران بھی ہو اور دینی پیشوا بھی!

مسلمانوں کو یہودیوں اور نصرانیوں سے بہت زیادہ نفرت نہیں تھی، وجہ یہ تھی کہ ان کو صاحبانِ کتاب کہا جاتا تھا، یعنی یہ کہ وہ خدا میں تھوڑا بہت عقیدہ رکھتے تھے، لیکن ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کا یہ معاملہ نہیں تھا، ہندو مورتی پوجا کرتے تھے اور وہ قابلِ نفرین کافر تھے لہٰذا وہ اس دنیا کی زندگی میں بھی اس بات کے مستحق تھے کہ ان پر ہر قسم کا ظلم کیا جائے، اور اس زندگی کے بعد بھی یعنی آخرت میں بھی یہی وہ لوگ تھے جن کو جہنم کا ایندھن بننا تھا، مسلمان بادشاہ ان کافروں کے روحانی پیشواؤں یعنی پجاریوں کے ساتھ اگر زیادہ سے زیادہ کوئی رعایت کر سکتے تھے تو وہ یہ تھی کہ وہ اپنی زندگی خاموشی کے ساتھ بسر کریں اور اپنے آخری لمحہ کا انتظار کرتے رہیں، لیسا اوقات اس رعایت کو بھی بہت بڑی ہمدردی اور بہت زیادہ رحم سے تعبیر کیا جاتا تھا، اس لئے

کہ اگر کسی مسلمان بادشاہ کا دینی جذبہ ذرا سا غیر معمولی ہوتا تھا تو وہ فوراً اس بات کا انتظام کرتا تھا کہ ان کافروں کا ذبیحہ کر کے خدا کی بارگاہ میں قربانی پیش کی جائے!

---



خاکہ دکشنیشور مندر کلکتہ۔ یہی وہ مقدس جگہ ہے جہاں پرم ہنس رام کرشن نے ہر طریقۂ عبادت سے ایشور کے درشن کئے اور یہی وہ جائے عقیدت ہے جہاں پرم ہنس نے نریندر ناتھ دت کو "وویکانند" بنایا۔

# دورِ غلامی

ایک طرف تو یہ بادشاہ، اقتدار کا مرکز بن گئے جن کا مذہب بھی جداگانہ تھا اور رسوم و رواج بھی جداگانہ تھے، دوسری جانب براہمنی طاقت اپنی موثر پوزیشن سے قطعی طور پر ہٹ گئی جو سوسائٹی کو کنٹرول کیا کرتی تھی، اور سوسائٹی کے لئے قوانین اور ضابطے وضع کرتی تھی، منو اور دوسروں کے دھرم شاستروں کی جگہ قرآن اور شریعتِ اسلام پر عمل درآمد کیا جانے لگا۔ سنسکرت بھاشا کی جگہ فارسی و عربی نے لے لی۔ سنسکرت بھاشا کا رواج بھی مفقود اور بے وقعت ہندوؤں کے مذہبی معاملات اور مذہبی تحریروں تک مخصوص و محدود رہا، جب یہ صورت پیدا ہوئی تو ہندو کی زندگی اس پجاری کے ہاتھ میں آگئی جس کی اپنی شخصیت کو کوئی وقعت حاصل نہیں تھی، اور وہ اپنی عملی زندگی میں نظری ہو چکا تھا، پجاری خود بھی جو براہمن شکتی کا وارث تھا بس اس کام کا ہو کر رہ گیا کہ وہ لوگوں کے گھروں میں پوجا پاٹھ کرا لے یا شادی وغیرہ کی رسمیں انجام دیتا رہے، اور وہ بھی بس اسی حد تک جس حد تک مسلم حکمران اجازت دیتا۔

ویدک عہد اور اس کے آس پاس کے زمانہ میں شاہی اقتدار کلی طور پر اس وجہ سے خود کو ابھرنے کا نہیں لا سکا کہ براہمنی طاقت کا دباؤ اسے کچل کر رکھ دیتا تھا، ہم جانتے ہیں کہ بدھ انقلاب کے زمانہ میں کس طرح براہمنی طاقت کو زوال آیا اور کس طرح شاہی اقتدار اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا، ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بدھ مت کے زوال اور مسلم اقتدار کے قیام کے درمیانی وقفہ میں کس طرح شاہی اقتدار راجپوتوں کے ذریعہ اپنی برتری کو قائم کرنے کی کوشش کرتا رہا، اور کس طرح وہ اپنی اس کوشش میں ناکام رہا، اس ناکامی کے اسباب کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ہمیں پتہ چلے گا کہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ براہمنی طاقت اپنی نشاۃ ثانیہ (پنر جیون) کی کوشش میں لگی ہوئی تھی، اور اس کی یہ خواہش تھی کہ وہ ایک بار پھر اپنی برتری کے اسی منصب پہ پہنچ جائے جس منصب پہ وہ ویدک زمانہ میں فائز تھی۔ براہمنی طاقت کی برتری کو اپنے قدموں کے نیچے کچل کر مسلم حکمران اس شان و شوکت کو حاصل کرنے میں قابلِ لحاظ حد تک کامیاب ہوئے جو موریہ گپت، آندھرا اور کشترپ[1] شہنشاہوں کو اپنے عہدِ رفتہ میں حاصل تھی۔

[1] آریہ ورت اور گجرات کے ایرانی گورنر!

پس برہمنی طاقت ــــــــ جسے کماریلا، شنکر، اور رامانج جیسے سادھوؤں، سنتوں نے دوبارہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی اور جس نے بدھ مت اور جین مت کے زوال کے بعد راجپوتوں کی تلوار کا سہارا لے کر اپنا ڈھانچہ دوبارہ تعمیر کرنے کی کوشش کی تھی، مسلم حکمرانوں کے عہد میں ایک بار پھر ابدی نیند سو گئی اور یہ محسوس ہوا کہ وہ شاید اب کبھی بیدار نہیں ہوگی اور ہمیشہ سوتی رہے گی اس زمانہ میں پجاریوں اور راجاؤں کے درمیان کوئی آویزش نظر نہیں آتی، اس عہد میں جو لڑائیاں ہوئیں وہ بس بادشاہوں کے درمیان ہوئیں، راجہ راجہ سے لڑتا رہا ـــ ! اس زمانہ کے آخر میں جب ہندو طاقت نے پھر سر اٹھایا اور ہندو وازم، کا مرہٹوں اور سکھوں کے ذریعہ دوبارہ بول بالا ہوا۔ تو اس زمانہ میں بھی جہاں تک ہندو وازم کے نشاۃ ثانیہ کا تعلق ہے ہمیں برہمنی طاقت کے کسی عمل و اقدام کے آثار نظر نہیں آتے، اس دور کی تحریکات میں اس کا کوئی خاص حصہ نہیں ہے، بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ جب بھی سکھوں نے کسی برہمن کو اپنے فرقہ میں شامل کیا تو انہوں نے سب سے پہلے اسے اس بات پر مجبور کیا کہ وہ عوام کے مجمع میں اپنی برہمنیت کی قدیم علامتوں کو ترک کرے اور ان کے دھرم کی نئی علامتیں اختیار کرے۔

شاہی اقتدار اور برہمنی طاقت کے عمل و ردِ عمل کی ایک طویل مدت کے بعد اس طور پر آخری کامیابی شاہی اقتدار نے حاصل کی اور ہندوستان کی سرزمین پر کئی صدیوں تک صرف راجاؤں کو کلی اقتدار اور مکمل اختیار حاصل رہا۔ یہ شاہی اقتدار جس کا اس سرزمین پر بول بالا رہا، غیر ملکیوں کا تھا، جو مختلف مذہب رکھتے تھے، اور ہندوستانی عوام کے عقائد سے مختلف عقائد لے کر یہاں آئے تھے۔ مسلم حکمرانوں کے زوال کے بعد جو طاقت یہاں نمودار ہوئی وہ قطعی طور پر مختلف اور جداگانہ تھی اور اس نے ہندوستان کی دنیا میں خود کو آہستہ آہستہ بروئے کار لانے کی کوشش شروع کی۔

یہ طاقت اتنی نئی تھی اور اس کے کام کرنے کے ڈھنگ ہندوستانی ذہن و فکر کے لئے اتنے اجنبی تھے، اس کا عروج اتنا پر فریب اور اس کی شکتی اس قدر ناقابلِ فہم تھی کہ اب تک جبکہ اس نے عنانِ حکومت بھی سنبھال لی ہے تو بھی ہندوستان کے چند ہی لوگ ہیں جو اس وقت کی ہیئت و صورت کو سمجھتے ہیں ورنہ پورے ہندوستان کے لئے اس طاقت کی صورت اب بھی قطعی طور پر اجنبی ہے!

ہم ہندوستان پر انگلستان کے اقتدار کی بات کر رہے ہیں۔

بہت قدیم زمانہ سے یہ شہرت تھی کہ ہندوستان میں بے پناہ دولت موجود ہے اور اسی شہرت نے بہت سی طاقتور بدیشی قوموں کے دل میں یہ جوش اور یہ خواہش پیدا کی تھی کہ وہ ہندوستان کو فتح کریں اور اس کی دولت حاصل کریں، چنانچہ بدیشی قومیں اس پر بار بار حملہ کرتی رہیں اور اسے فتح کرتی رہیں، اس واقعہ کی موجودگی میں یہ بات کیسے کہی جا سکتی ہے کہ ہندوستان پر انگلستان کا قبضہ ہم ہندوستانیوں کے ذہن و فکر کے لئے کوئی انوکھی اور کوئی اجنبی چیز ہے؟

مدت مدید سے ہندوستانی یہ تو دیکھتے چلے آئے تھے کہ پجاری کے خوف سے بڑے بڑے راجہ لرزہ براندام رہا کرتے تھے، پجاری دنیوی خواہشات میں غرق ہوتے ہوئے بھی روحانی طاقت، منتروں کی شکتی، دھارمک اعتقاد اور بددعا کے ہتھیاروں سے مسلح ہوتا تھا، وہ خاموشی کے ساتھ یہ بھی دیکھتے رہے تھے کہ راجا اپنے طاقتور حکمرانوں کے سامنے جن کے پاس بڑی سے بڑی فوج ہوا

کرتی تھی اس طرح اپنا سر جھکائے رہتی تھی جس طرح شیر کے سامنے بھیڑیں گردن ڈال کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ لیکن ان کے لئے اور اس ملک کے اشراف کے لئے یہ مشاہدہ قطعی طور پر نیا تھا کہ مٹھی بھر ویش (تاجر) باوجودیکہ ان کے پاس کثیر دولت ہو بادشاہ اور شاہی محل کے لوگوں کو اس بری طرح نوچیں، کھسوٹیں، انہیں ان میں سے کسی کی پروا نہ ہو، وہ تجارتی مقاصد کے لئے دریاؤں اور سمندروں میں چھلانگیں لگائیں، اپنی عقل اور اپنی دولت کے بل پر ہر سنہرہ مسلمان سلطنتوں کو اپنے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا کر رکھ دیں اور نہ صرف یہ بلکہ بادشاہوں کے درباروں میں اپنے لئے عہدے خرید دیں اور ان عہدوں کو مزید دولت کمانے کے لئے استعمال کریں۔ ان کے لئے یہ منظر بالکل انوکھا تھا کہ تاجروں کا ایک گروہ "ایسٹ انڈیا کمپنی" کے نام سے آئے گا اور وہ اس کے تابعدار بن جائیں گے۔

بے شک انہوں نے اس سے پہلے ہندوستان میں ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی تھی، یہاں کے لئے بالکل اجنبی چیز تھی!

فطرت کے مطابق ہر آدمی میں یہ تین اوصاف ست، رج اور تم، کم و بیش مقدار میں پائے جاتے ہیں، چار ذاتیں ہر زمانہ میں، ہر جگہ اور ہر متمدن سوسائٹی میں موجود رہی ہیں، یعنی براہمن، کشتری، ویش اور شودر۔ مختلف ممالک میں جہاں تک ان ذاتوں کا تعلق ہے، زمانہ کا طاقتور ہاتھ وقتاً فوقتاً ان کی طاقت اور ان کی تعداد میں کمی بیشی کرتا رہا ہے، کسی ملک میں ان میں سے کوئی ایک ذات دوسری جاتیوں پر غالب رہی ہے، اور کسی زمانہ میں کوئی ایک جاتی باقی جاتیوں سے زیادہ طاقتور ہو گئی ہے، لیکن دنیا کی تاریخ کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو قانونِ فطرت کی یکسانیت کا ثبوت ملے گا اور ہر سوسائٹی میں یہ چار ذاتیں براہمن، کشتری، ویش اور شودر موجود ملیں گی، جن میں سے یکے بعد دیگرے ہر جاتی دنیا پر حکومت کرتی رہی ہے۔

چینی، ہمرانی، بابلی، مصری، شالڈی[1]، آریہ، ایرانی، یہودی اور عرب ان تمام قدیم قوموں میں جہاں تک تاریخ کے ابتدائی دور کا تعلق ہے، سماج کی حاکمیت اور اقتدارِ اعلیٰ براہمن یا پجاری یا مذہبی پیشوا کے ہاتھ میں دکھائی دیتا ہے، اس زمانہ کے بعد اقتدارِ اعلیٰ کشتریوں کے ہاتھ میں آتا ہے جبکہ یا تو مطلق العنان حکمرانی تھی یا لوگوں کی ایک جماعت اپنا حکمران یا سردار چن لیا کرتی تھی،

عصرِ جدید کی مغربی اقوام میں جن کی سربراہی کا سہرا انگلستان کے سر ہے، سوسائٹی کو کنٹرول کرنے والی یہ طاقت پہلی بار ویشوں یا تاجر پیشہ طبقہ کے ہاتھ میں آتی ہے جس نے تجارت کے ذریعہ دولت اکٹھا کر رکھی ہے۔

اگرچہ قدیم زمانہ میں ٹرائے، کارتھیج[2]، دنیاس اور اسی طرح کی دوسری چھوٹی چھوٹی حکومتوں کا اقتدار موجودہ زمانہ کی مثل تاجروں ہی کے ہاتھ میں آگیا تھا اور انہیں زبردست اثر و رسوخ حاصل تھا، لیکن اس کے باوجود مروجہ اصطلاح کے مفہوم میں اس زمانہ کو تاجروں کے اقتدار کا حقیقی زمانہ نہیں کہا جا سکتا، اس زمانہ میں تجارت پیشہ طبقہ کی طاقت کو حقیقی عروج حاصل نہیں ہوا۔

یہ کہنا درست ہے کہ ان قدیم دنوں میں بادشاہوں کی اولاد اور ان کے متعلقین تجارت پر اپنی اجارہ داری رکھتے تھے اور وہ

---

Troy and Carthage [2] Chaldeans, [1]

---

عام لوگوں کو نوکر رکھ کر ان سے بحیثیت ملازم تجارت کرایا کرتے تھے اور اس سے جو نفع ہوتا تھا، وہ سب ان کا ہوتا تھا، ان مٹھی بھر لوگوں کے علاوہ کسی کو حکومت میں حصہ لینے یا حکومت کے کاموں میں رائے دینے کی اجازت نہیں تھی، مصر جیسے قدیم ترین ملکوں میں مذہبی پیشوا یا پجاری کو اقتدارِ اعلےٰ حاصل رہا۔ لیکن بہت تھوڑے عرصہ کے لئے، اس کے بعد وہ شاہی اقتدار کی معاون و مددگار کی حیثیت سے زندہ رہے، چین میں کنفیوشس نے اپنی ذہانت سے شاہی اقتدار کو مرکزیت دی، اور وہ گزشتہ ۲۵ صدیوں سے بلا شرکتِ غیرے مقتدرِ اعلیٰ بنا ہوا ہے، اور گزشتہ دو صدیوں سے تبت کے تمام لاماؤں کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنا زمانہ بھول جائیں اور خود کو چین کے خاقان کا محکوم بنا دیں، یہ لاما اگرچہ چین کے شاہی خاندان کے مذہبی پیشوا ہیں، لیکن ان سے ان کے اقتدار کو ترک کرایا جا رہا ہے۔

ہندوستان میں شاہی نے پجاریوں کی طاقت کو فتح کر لیا، لیکن دوسری قدیم و متمدن قوموں سے بہت بعد یہاں شاہی کو بجائے مقتدرِ اعلیٰ کی حیثیت حاصل ہوئی، یہی وجہ ہے کہ چین، مصر، بابل اور دوسری سلطنتوں کے معرضِ وجود میں آنے کے بہت بعد ہندوستانی سلطنت کا آغاز ہوا، یہ صرف یہودی لوگ تھے جنہوں نے شاہی کی اس کوشش کو شکست دی کہ وہ مقتدرِ اعلیٰ بن جائے، اور مذہبی پیشوا کی طاقت پر اپنا غلبہ حاصل کر لے، یہودیوں میں ویش بھی اقتدار حاصل کرنے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہوئے، اس کے برعکس عام لوگوں نے از خود اس بات کی کوشش کی کہ وہ مذہبی پیشوا کے چنگل سے اپنے کو آزاد کرا لیں، لیکن وہ اس کوشش میں دو طرفہ دباؤ کی چکی میں دل کر ہلاک ہو گئے، ایک دباؤ تو داخلی طور پر مسیحیت جیسی تحریکوں کی بنا پر تھا اور دوسرا دباؤ خارجی طور پر رومۃ الکبریٰ کی طاقت کی وجہ سے تھا، جیسا کہ زمانہ قدیم میں ہوا کہ برہمنی اور شاہی طاقتوں کے درمیان طویل کشمکش و آویزش جاری رہی اور شاہی کی زبردست طاقت نے برہمنی طاقت کو زیر کر لیا، اس طرح عصرِ جدید میں بھی ویش شکتی کے عروج سے قبل متعدد سلطنتیں زمیں بوس ہو گئیں اور شاہی اقتدار کے متعدد بت ٹوٹ کر چکنا چور ہو گئے، جن چند متمدن ملکوں میں بادشاہوں کو اب بھی اپنی شان و شوکت کا مظاہرہ کرنے کا موقع مل رہا ہے، ان سب میں بھی بادشاہوں کا وقار صرف ویشوں کی بے پناہ دولت کے بل پر قائم ہے ـــ نمک، تیل، چینی اور شراب کے تاجر ہی درحقیقت حکمران کی شان و شوکت کے پسِ پردہ کرشمے کار ہیں، اور ان ہی کی دولت کے بل پر نظم و نسق کی طاقت منحصر ہے۔

ویشوں کی یہ شکتی بجلی پر قابض ہے جو ایک کھمبے سے دوسرے کھمبے تک اور دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پیغام رسانی کرتی ہے، وہ سمندروں کی شاہراہوں پر اپنا قبضہ کرتی ہے، بڑے بڑے پہاڑوں کی چوٹیاں اس کے زیر اقتدار ہیں اور اشیائے ضرورت کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچاتی ہے، اس شکتی کے سامنے بڑے بڑے حکمران لرزہ براندام رہتے ہیں، ہر شے کو مسخر اور فتح کر لینے والی یہی شکتی ہے، جس نے انگلستان کے تختِ شاہی کو اس کی شان و شوکت کے ساتھ برقرار رکھا ہے،

پس ہندوستان پر انگلستان نے جو فتح پائی ہے، وہ حضرت یسوع مسیح یا بائیبل کی فتح نہیں، جیسا کہ ہمیں باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے، نہ انگلستان کی فتح ان فتوحات سے مشابہ ہے جو مغلوں اور پٹھانوں نے ہندوستان میں حاصل کی تھیں، واقعہ یہ ہے کہ حضرت یسوع مسیح اور بائیبل کے نام کے پیچھے عالیشان محلات، ہاتھیوں پر مشتمل زبردست فوجوں کے قدموں کی دھمک، گھوڑ سوار لشکر، پیدل فوج، توپ خانہ جس کے گولوں کی آواز سے زمین دہل اٹھتی ہے، باجوں اور نقاروں کی گونج، جس سے شاہی طنطنہ اور رعب و

دبدبے کا مظاہرہ ہوتا ہے اور ان سب کے پیچھے انگلستان کا ہاتھ ـــ اس انگلستان کا ہاتھ جس کا پرچم جنگ نیکٹری کی جمنی ہے جس کی فوج تاجروں پر مشتمل ہے، جس کا میدان جنگ دنیا بھر کی تجارتی منڈیاں ہیں اور جس کی ملکہ ـــ خوش نصیبی کی دیوی ہے، اسی بنا پر میں نے پہلے کہا ہے کہ ہندوستان پر انگلستان کا قبضہ ایک ایسی چیز ہے جو بالکل انوکھی ہے اور جس کا مشاہدہ اس سے پہلے نہیں ہوا۔ اس نئی طاقت سے ہندوستانی کے تصادم کا کیا اثر ہوگا اور اس انقلاب کے نتیجہ میں ہندوستان کا مستقبل کس نئے سانچے میں ڈھلے گا، یہ ایسی بات ہے جس کا اندازہ اس کے ماضی کی تاریخ کو سامنے رکھ کر نہیں لگایا جا سکتا۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ چار جاتیاں برہمن، کشتری، ویش اور شودر یکے بعد دیگرے اس دنیا پر فرماں روائی کر چکی ہیں، ان میں سے ہر ایک جاتی نے اپنے اقتدار اعلیٰ کے زمانہ میں کچھ ایسے کام کیے جن سے عوام کا بھلا ہوا، لیکن کچھ ایسے کام بھی کیے جو عوام کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئے۔

برہمنی اقتدار عقل و فراست کی پختگی اور طاقت پر منحصر تھا، اس کی بنیاد جسمانی طاقت اور مادی ہتھیاروں کی کثرت پر مبنی نہیں تھی، جیسا کہ برہمنی اقتدار جب اپنے عروج پر تھا تو علوم اور ثقافت و ادب کو ترقی حاصل ہوئی، ہر بشر کے دل میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ روحانیت کی محسوس نہ ہونے والی دنیا سے ربط و تعلق رکھے اور اس سے امداد حاصل کرے، اس دنیا میں عام بشر کا داخلہ ممکن نہیں ہے، صرف چند ہی عظیم ہستیاں جنہیں اپنے نفس اور اپنے حواس خمسہ پر مکمل کنٹرول حاصل تھا، اور جن کی فطرت میں ستوگن کا جوہر موجود تھا، اس قابل ہو سکیں کہ وہ حسیات کی دنیا کی دیواریں توڑ کر اس عالم کی سیر کریں جو حسیات سے ماورا ہے، صرف یہی چند ہستیاں اس اقلیم کو جان سکیں اور اس سے آنے والے پیغامات موصول کر سکیں جو حسیات سے ماورا تھی، ان ہستیوں نے دوسروں کو بھی اس اقلیم تک پہنچانے کی کوشش کی اور انہیں راستہ دکھایا، یہی ہستیاں برہمنی طاقت کی حامل تھیں، انسانی سماج کی محرک، نگراں اور رہنما تھیں۔

انہیں اوتاروں کا عرفان حاصل تھا، وہ اوتاروں کے پیغام موصول کرتی تھیں اور ان سے رابطہ و تعلق رکھتی تھیں، یہی وجہ تھی کہ خود پجاری کی پرستش بھی دیوتا کی طرح کی جاتی تھی، وہ دنیوی خیالات سے ماورا ہوتا تھا، اسے کبھی اپنی روزی کی فکر نہیں ہوتی تھی، اس کا ملن تیل لکڑی سے کبھی کوئی تعلق نہ ہوتا تھا، ان کا کھانا، پینا، اوڑھنا، بچھونا، سب کچھ اوتاروں اور دیوتاؤں کی پرستش ہوا کرتا تھا، اور زمین پر یہی پجاری دیوتاؤں کے حقیقی مظاہر ہوا کرتے تھے، وہ ان کی نیابت کرتے تھے، ان کی زبانیں بس دیوتاؤں کا نام جپنے کے لیے متحرک رہا کرتی تھیں، شعوری یا غیر شعوری طور پر سماج ان پجاریوں کے لیے بے پناہ آرام و آسائش کا انتظام کرتا تھا، تاکہ انہیں دھیان گیان کا موقع ملے اور وہ فطرت کی موشگافیاں کرتے رہیں، پس برہمنی طاقت سب سے پہلے علم و دانش کی ترقی کا موجب بنتی، پجاری ایک خوفناک شیر ـــ راجہ ـــ اور بھیڑوں کے گلے یعنی پرجا کے درمیان کھڑا ہوتا اور اس کے ہاتھ میں روحانیت کی جو چھڑی ہوتی، اس سے وہ شیر کی خونخواری کو کنٹرول کرتا، راجہ کی جابرانہ خواہش کا شعلہ، دولت و طاقت کے زعم میں ہر چیز کو جو اس کی راہ میں حائل ہوتی بھسم کر ڈالتا، لیکن پجاری کی زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ راجہ کی جابرانہ خواہش کے بھڑکے ہوئے شعلے کو بجھانے کے لیے آگ پر پانی کا کام کرتا، حالانکہ پجاری کے پاس نہ دولت ہوتی نہ فوج کی طاقت ہوتی۔

برہمنی طاقت کا عروج تمدن میں رشد و ہدایت کا چراغ تھا، حیوانیت پر ملکوتی اوصاف کی پہلی فتح تھی، مادیت پر روحانیت کا پہلا اقتدار تھا اور یہ روحانیت مادے کے اس غلام کے اندر موجود ہوتی ہے جو گوشت پوست کے اسی ڈھیر میں جس کو پیکرِ انسان کہا جاتا ہے، عقل کی روشنی پیدا کرتی ہے، یہ پجاری ہی ہے، جس نے پہلی بار مادہ اور روح کو جدا جدا کر کے دکھایا ہے، وہ پہلا ذریعہ ہے جو اس زندگی اور اس کے بعد آنے والی زندگی میں ایک سلسلہ قائم کرنے کا موجب بنا ہے، وہ بشر کے لئے دیوتاؤں کا پیغامبر ہے، اور اس نے راجہ اور پرجا کے درمیان رابطے کی ایک کڑی کا کام دیا ہے، وہ دنیا کی بہبود کا پہلا پودا ہے جو روحانی شکتی سے پرورش پایا، جسے گیان دھیان مکتی اور علم و دانش کی غذا اور پانی ملا، چنانچہ ہر ملک میں یہ پجاری ہی تھا جس کی سب سے پہلے اور سب سے زیادہ عزت کی جاتی تھی اور اس کی اوتار کی طرح پوجا کی جاتی تھی، اور اس کی یاد تک ہمارے لئے عبادت کے مترادف بن گئی!

قدرتی طور پر کچھ خرابیاں بھی پیدا ہوئیں، بقا کے ساتھ فنا کا تخم بھی بو دیا گیا، روشنی اور ظلمت سدا سے ایک دوسرے کے ساتھ ہیں، بے شک ایسے فتنے سر اٹھاتے ہیں جن کو اگر بروقت نہ روکا جائے، تو وہ سوسائٹی کی تباہی و بربادی کا موجب بن جاتے ہیں، مادی طاقت کے تماشے اور کرشمے تو ساری دنیا دیکھتی رہی ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ میدانِ جنگ میں کس کس طرح تلواروں سے تلواریں ٹکرائی ہیں اور کس کس طرح املاک میں لگی ہوئی آگ کے شعلے بھڑکے ہیں، ان چیزوں کے بارے میں کبھی کسی کے ذہن میں کوئی شبہ پیدا نہیں ہوا ہے لیکن جب شکتی کا یہ خزانہ آتما کے اندر ہو، چند الفاظ کے اندر ہو، جنہیں خاص طریقہ پر ادا کرنے سے یہ شکتی ظاہر ہوتی ہو اور جب کہ کسی خاص نصاب کو ذہنی و فکری طور پر بار بار دہرانے یا کسی وظیفہ کو من ہی من میں ایک خاص انداز سے گردان کرنے پر یہ شکتی نمودار ہوتی ہو اور جبکہ روشنی سے سایہ اور سایہ سے روشنی، عقیدہ کی پختگی کی بدولت مخلوط ہو جائیں، تو عام لوگوں کے ذہن میں اس طرح کا شبہ قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس طرح کا کوئی کرشمہ، کوئی کرامت یا کوئی چمتکار ممکن ہے کہ نہیں؟ اگر اس شکتی کو بالواسطہ یا بلاواسطہ لوگوں کی آنکھوں کے سامنے رکھا بھی جائے تو بھی عوام کے ذہنوں میں ان کی حقیقت و اصل کے متعلق ایک شبہ باقی رہتا ہے، جہاں غصہ، خوف، اشتعال، بدی، حرص و ہوس ہو اور انسان کے پاس اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے بے پناہ مادی ذرائع اور مادی ہتھیار موجود ہوں اور ہر شخص یہ سمجھتا ہو کہ وہ ان مادی طریقوں سے اپنے تمام مقاصد حاصل کر سکتا ہے تو وہاں استمبھن، اچھیٹنا، دشی کرن اور مرن[1] جیسے پر اسرار دماغی عمل کو مادی ذرائع کی جگہ اختیار کر کے وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے تیار نہیں ہوتے، عملیات کی دنیا میں رہنے والے لوگوں کے دماغ و ذہن پر قدرتاً ایک طرح کا دھواں چھا جاتا ہے، ان کے دل میں سیدھی انگلیوں سے گھی نکلنے کی بات نہیں آتی اور اگر کبھی ایسی بات آتی بھی ہے تو ان کا دماغ اسے قبول نہیں کرتا، اور فتنہ سازی کی جانب مائل ہو جاتا ہے، ان سب کا آخری انجام یہ ہوتا ہے کہ اخلاص و دیانت غائب ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ تنگ ظرفی و تنگ نظری لے لیتی ہے، اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ نفسانی خواہشات کی پیدا کردہ بے صبری اپنی تمام ہلاکت آفرینیوں کے ساتھ اس معاملہ میں

---

[1] جادو کے عمل سے کسی شخص کا جسمانی استحصال، تباہی و بربادی، ہلاکت یا اسے اس کے منصب سے ہٹانا۔

پیدا ہو جاتی ہے کہ دوسرے پر برتری حاصل کی جائے اور اپنی طاقت سے دوسرے کو مغلوب کر دیا جائے۔

پجاری قدرتی طور پر من ہی من میں سوچتا ہے، کہ دیوتاؤں نے مجھے شکتی دی ہے، انہوں نے جسمانی اور روحانی کمزوریوں پر مجھے غلبہ دیا ہے، بھوتوں، شیطانوں اور دوسری نظر نہ آنے والی شکتیوں کو میری خدمت پر مامور کیا ہے، جب مجھے یہ شکتی حاصل ہے تو میں اس شکتی کو اپنے سے کس بنا پر جدا کروں؟ مکتی کے بدلے میں نے یہ گراں قیمت شکتی حاصل کی ہے، میں اس شکتی کو کس طرح سے دوسروں کے حوالے کر دوں، جب انہیں بھی یہ شکتی حاصل ہو جائے گی تو پھر میری کیا اہمیت رہ جائے گی؟ دولت، عزت، شہرت اور دنیوی عیش و آرام، سب کچھ میرے ہاتھ سے نکل جائے گا، مزید براں یہ سادھی شکتی، قطعی طور پر دماغی شکتی ہے اور ان میں سے کتنے ایسے ہیں، جن پر یہ بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اسے انتہائی راز کے طور پر چھپا کر رکھیں گے، غم دوراں میں مبتلا ہونے پر آدمی کی حقیقی فطرت ابھر آتی ہے، وہ اخفائے راز کی عادت کو ترک کر دیتا ہے اور خود غرضی کا شکار بن جاتا ہے اور انجام کار زہر آلود فضا میں سانس لینے لگتا ہے۔

---



فرشتہ سیرت مسز جارج رائٹ ہیل جنہوں نے ایک دن جب سوامی جی امریکہ میں بے یار و مددگار، فاقہ کش پریشان حال بیٹھے دیکھ کر انہیں اپنے ہاں پناہ دی تھی۔

# ترقیِ معکوس

انحطاط کی یہ خواہش ہی بتدریج آدمی کو پیچھے کی طرف لوٹا دیتی ہے، یہ اس کا ردِ عمل ہوتا ہے، علم و دانش سے جب کوئی کام نہیں لیا جاتا تو وہ قریب قریب بیکار ہو جاتی ہے اور جو تھوڑا بہت اثاثہ بچ جاتا ہے وہ مافوق روحانی ذریعہ سے حاصل کیا ہوا عقیدہ یا کوئی نظریہ ہوتا ہے، لہٰذا نئے علوم حاصل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی، اور یہ بات بھی بیکار اور بے فائدہ سمجھی جاتی ہے کہ جو اثاثہ علم باقی رہ گیا ہے کم سے کم اس کو صاف ستھرا رکھا جائے اور ان نقائص کو دور کرنے کی کوشش کی جائے جو بچے کھچے علم میں پیدا ہو گئے ہیں، پس سارا سابقہ علم اور خود اعتمادی کی ناقابلِ تسخیر طاقت کو کھو کر، پجاری اب اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنے آبا و اجداد کی شہرت سے اپنی دکان چمکائے اور ان کا نام لے کر عزت کمائے اس پر آج کل "پدرم سلطان بود" کی کہاوت صادق آتی ہے، وہ چاہتا ہے کہ اسے وہی عزت، وہی اقتدار اور وہی برتری حاصل ہو جو اس کے آبا و اجداد کو حاصل تھی، لیکن اس کی یہ کوشش جب بے سود رہتی ہے اور اس کی یہ خواہش جب پوری نہیں ہوتی تو اس ناکامی کی جھنجھلاہٹ میں وہ دوسری جاتیوں سے ٹکرانے لگتا ہے اور ان کے ساتھ جارحانہ آویزش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

قانونِ فطرت کے مطابق جب بھی کوئی نئی اور طاقتور زندگی بیدار ہوتی ہے تو وہ قدیم اور زوال پذیر زندگی کی جگہ لینے اور اسے فتح کرنے کی کوشش کرتی ہے، فطرت زوال پذیر کو اکھاڑ پھینکنے اور طاقت پذیر کو اس کی جگہ جمانے میں سرگرمِ کار رہتی ہے اور اس کام میں طاقت پذیر زندگی کا ساتھ دیتی ہے لہٰذا پجاری اور دوسری جاتیوں کے اس طرح کے تصادم کا نتیجہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے۔

وہ اپنے نفس پر قابو، وہ مکتی، اور وہ سچائیوں کی کھوج میں ہمہ تن مشغولیت، جو پجاری کے عہدِ اقتدار میں اس کے خصائص تھے اب زوال پذیر ہیں، اور اب وہ نفسانی خواہشات کے حصول اور دوسری جاتیوں پر برتری اور اپنے لئے مزید مراعات

حاصل کرنے کی دھن میں لگا رہتا ہے۔ جس شرف کی بدولت اس کی عزت کی جاتی تھی، اس کی پرستش ہوا کرتی تھی، وہ شرف اب اس میں نہیں اور وہ قعرِ مذلت میں جا گرا ہے، اس کی نظر کے سامنے اب کوئی مقصد نہیں ہے، جس طرح مکڑی اپنے جال میں آپ پھنس جاتی ہے اسی طرح پجاری کا اقتدار بھی خود اسی کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس کر رہ گیا ہے، وہ زنجیریں جن کی بخشش نسلاً بعد نسلاً لوگوں کے سروں کو اس کے پاؤں پر جھکنے کے لئے مجبور کیا کرتی تھیں اب خود اس کے گلے میں پڑ گئی ہیں، جو خارجی ذرائع، آدمی کے جسم و دماغ اور سوسائٹی کو پاک وصاف کرنے کے لئے وضع کئے گئے تھے یعنی دھارمک رسمیں، دھارمک تقریبیں اور پوجا پاٹ وغیرہ کے رواج اب خود پجاری کو سر سے پاؤں تک باندھ چکے ہیں اور اس کا بندھا ہوا اقتدار موت کے زانو پر سر رکھے ہوئے بے بسی کے ساتھ پڑا ہوا ہے اب کوئی راہِ فرار نہیں ہے، یہ جال ٹوٹے گا تو پجاری کی اساس ہل کر رہ جائے گی، فطرتاً ہر آدمی میں ترقی کی خواہش ہوتی ہے اور جب پجاری رہتے ہوئے اس خواہش کی تکمیل ناممکن نظر آتی ہے تو وہ پجاریت کی بندشیں توڑ کر دوسری جاتیوں کے پیشے اختیار کرنے لگتے ہیں تاکہ کچھ روپیہ کما سکیں، اور جیسے ہی وہ دوسرے پیشے اختیار کرتے ہیں، سوسائٹی انہیں ان کے خصوصی حقوق اور خصوصی مراعات سے محروم کر دیتی ہے، سماج ان براہمنوں کی براہمنیت میں کوئی اعتماد نہیں رکھتا جو سر پر شکھا رکھنے کی بجائے اپنے بال کٹواتے ہیں اور اپنے قدیم عادات واطوار اور اپنے آباو اجداد کے رواج چھوڑ کر خود کو نیم یورپین لباس میں ملبوس رکھتے ہیں اور مغربی فیشن اختیار کر لیتے ہیں مزید برآں ہندوستان کے جن حصوں میں ان نئے آنے والے انگریز حکمرانوں نے تعلیم کا نیا طریقہ رائج کر دیا ہے اور حصولِ دولت کے نئے نئے ذرائع پیدا کر دیئے ہیں، ان سب حصوں میں براہمن نوجوان جوق در جوق اپنی قدیم روایتوں کو خیرباد کہہ رہے ہیں اور دوسری [جاہل] نیو کے پیشے اختیار کر کے دولتمند بن رہے ہیں، ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ براہمن طبقہ کے رواج و رسوم جو اسے اس کے آباو اجداد سے وراثت میں ملے تھے، زوال پذیر ہیں، اور آہستہ آہستہ نیست و نابود ہوتے جا رہے ہیں۔

گجرات میں براہمنوں کا ہر نانوی طبقہ دو حصوں میں منقسم ہو گیا ہے ایک حصہ وہ ہے جو اب بھی اپنے قدیم پیشہ سے وابستہ ہے، اور دوسرا حصہ وہ ہے جس نے پجاری کا پیشہ چھوڑ کر دیگر پیشے اختیار کر لئے ہیں، محض پہلے حصے کو جو اب بھی پجاری ہے گجرات میں براہمن کہا جاتا ہے، لیکن دوسرے حصے کے خاندانوں سے اگرچہ وہ ایک ہی نسب سے تعلق رکھتے ہیں پہلے حصہ کے خاندان شادی بیاہ تک کرنے کو تیار نہیں ہیں، مثال کے طور پر جو براہمن اب بھی پجاری ہیں اور ان کا گزر بسر دان پر ہوتا ہے، انہیں گجرات میں ناگر براہمن کہا جاتا ہے لیکن جن کو صرف ناگر کہا جاتا ہے اُن سے مراد وہ براہمن ہوتے ہیں جنہوں نے سرکاری ملازمتیں کر لی ہیں یا ویشوں کا پیشہ (تجارت وغیرہ) اختیار کر لیا ہے، لیکن ایسا لگتا ہے کہ یہ امتیاز بھی جو اس زمانہ میں دکھائی دیتا ہے مستقبل میں باقی نہیں رہے گا، اس لئے کہ ناگر براہمنوں کی اولاد بھی انگریزی تعلیم حاصل کر رہی ہے اور سرکاری ملازمتیں کر رہی ہے یا مختلف تجارتی پیشے اختیار کرتی جا رہی ہے، کٹر پنڈت بھی جو قدیم سکول سے گہری وابستگی رکھتے ہیں، مالی پریشانیوں میں مبتلا ہو کر اپنے بچوں کو انگریزی سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخل کرا رہے ہیں اور خود کو ویش، کشتری اور دیگر غیر براہمن جاتیوں میں شمار کرا رہے ہیں، اگر حالات کی رفتار اسی طرح رہی تو ہندوستان کی سرزمین سے براہمن طبقہ کا نام و نشان تک مٹ جانا بعید از امکان نہیں ہے کچھ ہی وقت لگے گا

کہ یہ طبقہ ناپید ہو جائے گا جو لوگ یہ کوشش کرنے کی غلطی کر رہے ہیں کہ ماسوا اپنے کسی ایک گھر یا کسی جماعت کی چوکھٹ تک براہمن طبقہ کی برتری کو کھینچ کر لایا جائے، انہیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ اپنے ہاتھ سے اپنے پاؤں میں کلھاڑی مار رہے ہیں اور اپنے ہاتھ سے اپنی چتا بنا رہے ہیں، اور یہ کام ہونا بھی چاہیئے یہ مناسب وقت ہے کہ اس ملک کی ہر جاتی جو خود کو جنم سے اعلےٰ جاتی قرار دیتی ہے، اور جسے اشراف میں شمار کیا جاتا ہے، اپنے ہاتھ اپنی چتا بنا لے۔ یہ اس کا اپنا فرض ہے، طاقت کا حصول، اتنا ہی ضروری ہے جتنا اس کا نفوذ، بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ! خون کی روانی، زندگی کی ناگزیر شرط ہے، اگر خون پورے جسم میں نہ دوڑے تو اس کا مطلب ہے موت! سماج کی فلاح ترقی کے لیے یہ قطعاً ضروری ہے کہ جو علوم کسی خاص وقت میں چند خاندانوں یا چند جاتیوں کے اندر محدود و مخصوص رہے ہیں اور دوسری جاتیاں ان سے محروم رہی ہیں وہ مستقبل میں پوری سوسائٹی میں پھیل جائیں اگر ایک شکتی کا نفوذ یا اخراج روکا جائے گا تو وہ پورے سماج کی بربادی کا موجب بن جائے گا، اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے،

دوسری جانب راجہ کی مثال ایک شیر کی ہے، اس میں اچھی اور بری دونوں جبلتیں موجود ہوتی ہیں، سبزی خور معصوم جانوروں کا گوشت نوچنے سے اس کے خوفناک ناخن کبھی باز نہیں رہتے، جب بھی موقع آتا ہے وہ اپنی خونخواری کی تشنگی ان کا خون پی کر بجھاتا ہے لیکن جیسا کہ شعراء نے کہا ہے کہ شیر اپنی ضعیفی اور اپنی گرسنگی کی حالت میں بھی اس کمزور لومڑی کو نہیں مارتا، جو خود کو اس کے پاؤں میں شرن پانے کے لئے ڈال دیتی ہے، اگر پرجا اس شیر کے سامنے جسے راجہ کہا جاتا ہے، اس بنا پر سر اٹھا کر کھڑی ہوتی ہے کہ اس کی نفسانی خواہشات کا سدِّباب کیا جائے تو یہ شیر اس کی جان لے لیتا ہے اور اسے اپنی سرکشی کی بڑی گراں قیمت ادا کرنی پڑتی ہے لیکن یہی پرجا اگر اس کے سامنے سر جھکا کر کھڑی ہوتی ہے اور اس کے احکام کی تعمیل کرتی ہے تو پھر وہ قطعی طور پر محفوظ رہتی ہے، صرف اتنا ہی نہیں، مانی کی بات چھوڑیئے، اس زمانہ میں بھی کوئی ملک نہیں ہے جس کے سماج میں بہت سے لوگوں کے لئے کسی ایک فرد کی قربانی اور پورے سماج کے مشترک مفاد کے لئے کسی شخص واحد کی کوشش کا پورے طور پر اعتراف کیا جاتا ہو لہٰذا ان بادشاہوں کی اب بھی ضرورت محسوس کی جاتی ہے جو خود سماج کی پیداوار ہیں، وہ سماج کی تمام شکتیوں کا مرکز ہوتے ہیں اور سماج کی بکھری ہوئی تمام شکتیاں اس میں مجتمع ہو جاتی ہیں، اور اس مرکز سے ان شکتیوں کو سماج کے سیاسی نظام میں بروئے کار لایا جاتا ہے۔

براہمنی اقتدار کے اوائل میں علم و دانش کی کھوج کا جذبہ نظر آتا ہے اور اس جذبہ کی ہوشمندانہ نگہداشت، پرورش اور تربیت دکھائی دیتی ہے، اسی طرح کشتری اقتدار کے زمانہ میں سب سے پہلے جو خواہش ابھرتے ہوئے دکھائی دیتی ہے وہ حصولِ مسرت و آرام کی خواہش ہے، اور اس خواہش و جذبہ کی بنا پر ایجادات، آرٹ اور سائنس کی ترقیات نظر آتی ہیں، یہ خواہشاتِ نفس کی تکمیل کا ذریعہ ہیں، کیا ایک راجہ اپنے سر مغرور کو کسی پسماندہ، غریب کی جھونپڑی میں اس وقت چھپا کر بیٹھ سکتا ہے جب اس کے اقتدار کا طوطی بول رہا ہو؟ یا وہ بہ رضا و رغبت اپنی شاہانہ خواہشات پر اپنے عوام کے مشترک مفادات کو ترجیح دینے کے لئے تیار ہو سکتا ہے؟

وہ شخص جس کی عظمت و عزّت لاثانی ہو، اس کرۂ ارض پر جس کی کوئی نظیر نہ ہو، وہ شخص جس کی عظمت کا تخت ایشور نے عام لوگوں کے دلوں کے اندر بچھا رکھا ہو، جسے دیکھنے کے لئے ایک نظر اٹھانا گناہِ کبیرہ تصوّر کیا جاتا ہو، اس کے دل میں عوام

کے لئے ہمدردی ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے، راجہ کا جسم، دوسرے لوگوں کے جسم سے بھی مختلف چیز سمجھا جاتا ہے، اس کو مقدس قرار دیا جاتا ہے، اور بعض ممالک میں تو یہ عقیدہ ہے کہ بادشاہ کا جسم بھی کبھی فنا نہیں ہوتا، رانی کے گرد بھی عقیدت و ارادت کا ویسا ہی چمک دار ہالہ ہوتا ہے جس کے حسن پر عام لوگ تو کجا سورج کی ایک نظر تک نہیں پڑ سکتی چنانچہ جھونپڑیوں کی جگہ راجہ اور رانی کے لئے عالیشان محل تعمیر ہونے لگے، اور رات دن موسیقی کی مدھر تانیں گونجنے لگیں، خوبصورت باغ، خوشنما چمن، دیدہ زیب گیلریاں، مسرت بخش تصاویر، آرائش کا ساز و سامان اور زرق برق پوشاک، بادشاہوں کے [illegible] رودی ہوتے گئے اور جنگل راج کے سردار جن لکڑی کے مکانوں میں رہتے تھے یا خود کو دوسروں سے ممیز کرنے کی غرض سے جو کھردرا لباس پہنا کرتے تھے، ان کے قدرتی حسن پر یہ مصنوعی آرائش اور پُر تکلف زینت اور شان و شوکت چھاتی چلی گئی، ہزاروں جفاکش کسان جو زمین جوتا کرتے تھے اب اپنی ذہانت اور اپنی عقل کو دوسرے فنون میں صرف کرنے لگے اور وہ پیشے اختیار کرنے لگے، جن میں انہیں کم محنت کر کے اپنی عقل و ذہانت کے مظاہرہ کا زیادہ موقع ملتا تھا، انجام کار گاؤں کی اہمیت کم ہونے لگی اور ان کی جگہ شہر آباد ہوتے گئے، اور ان کی جگہ شہر آباد ہوتے گئے، اور ان کی اہمیت میں اضافہ ہوتا گیا۔

ہندوستان میں بھی ایسا ہی ہوا، لیکن یہاں کے راجہ اپنی عمر کی ایک مدت تک دنیوی عیش و آرام حاصل کر کے اور اپنی نفسانی خواہشات کی پوری تکمیل کے بعد اپنی عمر کا باقی ماندہ حصہ دنیا کے بوجھ سے سبکدوش ہونے کی غرض سے جنگلوں میں بسر کیا کرتے تھے اور زندگی کے گہرے مسئلوں کو سوچنے اور غور کرنے میں صرف کر دیتے تھے، اپنے گیان دھیان اور اس طرح کی مکتی کے نتیجہ میں وہ دھرم کے ظاہری رواج و رسوم کو پسند نہیں کرتے تھے اور اپنے انتہائی گیان و دھیان سے روحانیت کے ان حقائق اور ان سچائیوں کو دریافت کیا کرتے تھے جو اپنشدوں، گیتا، جین اور بدھ مت کی مقدس کتابوں میں ملتی ہیں، یہاں بھی راجہ اور پجاری کے اقتدار میں زبردست کشمکش تھی، رواج و رسوم اور دھارمک قیود کے خاتمہ کا یہ مطلب تھا کہ پجاری کا پیشہ فنا ہو جائے، لہٰذا قدرتی طور پر ہر ملک میں اور تمام اوقات میں پجاری اپنے خونخوار شیروں سے کام لیتے رہے اور اس بات کی کوشش کرتے رہے کہ قدیم رواج و رسوم اور تمام دھارمک معمولات بدستور محفوظ رہیں اور ان میں کوئی کمی و بیشی نہ ہونے پائے لیکن دوسری جانب ان کی مخالفت میں جنک جیسے راجہ کھڑے تھے جنہیں کشتریوں کی طاقت کے ساتھ ساتھ ہی روحانی شکتی بھی حاصل تھی، بہرحال ان دونوں فریقوں کی باہمی آویزش کا کافی تفصیلی جائزہ ہم یہاں پیش کر چکے ہیں اور اس عنوان پر کافی تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے۔

پجاری چونکہ اس کام میں مصروف ہے کہ وہ خود کو جملہ علوم کا واحد مرکز بنالے اور پھر اپنی برتری کو مسلط کر دے لہٰذا راجہ بھی اس دُھن میں لگا ہوا ہے کہ تمام دنیوی طاقتیں وہ اپنے اندر جمع کر لے اور وہ تمام شکتیوں کا مرکز واحد بن جائے، اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ دونوں ہی سماج کے لئے بہت مفید عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ایک ایسا وقت آتا ہے جب سماج کی فلاح و بہبود کی خاطر ان دونوں ہی کی یکساں طور پر ضرورت پڑتی ہے لیکن ایسی ضرورت صرف اس زمانہ میں پڑتی ہے جب کوئی سماج نوعمر و نوخیز ہوتا ہے لیکن جب سماج کی نوعمری کا زمانہ گزر جاتا ہے، اور اس کے شباب کا زمانہ آجاتا ہے تو اس زمانہ میں اگر اس طرح کی کوئی

کوشش کی جاتی ہے کہ اسے اپنی قیود کے اندر باندھ کر رکھا جائے تو پھر یہ سماج یا تو اپنی داخلی تسکتی کی وجہ سے اپنی تمام بندشیں اور تمام قیود توڑ کر آگے بڑھنے کے لیے باہر نکل آتا ہے یا پھر اگر قیود و بندش توڑنے کی کوشش میں وہ ناکام رہتا ہے تو بتدریج اسے زوال آنے لگتا ہے اور وہ پھر غیر متمدن حالت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

راجہ اپنی پرجا کا شفیق باپ ہوتا ہے اور رعایا راجہ کی اولاد ہوتی ہے، پرجا کو چاہیئے کہ وہ ہر اعتبار سے راجہ کی غیر مشروط اطاعت کرتی رہے اور راجہ کو چاہیئے کہ وہ منصفانہ حکومت کرے اور اپنی رعایا کی فلاح و ترقی کے لئے اس شفقت اور درد مندی کے ساتھ انتظام کرے جس شفقت اور درد مندی کے ساتھ وہ اپنی اولاد کی فلاح و ترقی کا بند و بست کرتا ہے جو اصول اور جو ضابطہ ایک گھر پر نافذ ہوتا ہے وہی اصول اور ضابطہ پوری سوسائٹی پر بھی نافذ ہوتا ہے اس لئے کہ سوسائٹی افراد کے گھروں کا ایک مجموعہ ہوا کرتی ہے، جب بیٹے کی عمر سولہ [16] برس ہو جائے تو باپ کو چاہیئے کہ وہ اس کے ساتھ دوستانہ سلوک کرے اور اسے اپنے برابر گردانے[1] اگر ایک بچّہ کی پرورش کا یہ اصول ہے تو کیا کوئی سماج اس عمر کو نہیں پہنچا جس عمر کو ایک بچّہ پہنچتا ہے، کیا سماج کی عمر ایک بچّہ کی عمر کی طرح کبھی سولہ [16] برس کی نہیں ہوتی؟ تاریخ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ ہر سماج ایک خاص مدت کے اندر جوان ہو گیا ہے اور پھر راجہ اور سماج کے عام لوگوں کے درمیان زبردست اختلافات نے جنم لیا ہے۔ ایک سماج کی زندگی، اس کی توسیع اور اس کا تمدن عوام اور حکمران کے درمیان اس آویزش کی شکست و فتح پر منحصر ہوا کرتا ہے۔

ہندوستان کے سماج میں ایسے انقلاب آفریں تغیرات بار بار ہوتے رہے ہیں لیکن صرف یہی ایک ملک ہے جس میں یہ تغیرات دھرم کے نام پر ہوئے ہیں، اس لئے کہ دھرم ہندوستان کی روح ہے اس کی زندگی ہے، اس کی بھاشا ہے اور اس کی تمام تحریکات اور اس کے تمام اعمال کا نشان ہے، چارواک، جین، بدھ، شنکر آچاریہ، رامانج، کبیر، نانک، چیتنیہ، برہمو سماج، آریہ سماج ــــ یہ اور اسی طرح کے دیگر مت اور سمپردائے دھرم کی لہریں ہیں جو اٹھیں اور ساحل کو توڑ کر نکل گئیں، اور جنہوں نے سماج کی پیاسی سرزمین کو سیر و سیراب کر دیا، اگر چند بے معنی الفاظ دہرانے ہی سے آدمی کی تمام ضرورتیں پوری ہو جایا کرتیں تو پھر کسی کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے محنت کرنے کی احتیاج ہی کیا تھی ہاگر یہ پاگل پن کسی سماج کے اندر دخل ہو جاتا ہے تو پھر وہ سوسائٹی کاہل اور ناکارہ بن کر رہ جاتی ہے اور آہستہ آہستہ فنا ہو جاتی ہے، چارواکوں کی توہم پرستی جس کو وہ ایک حقیقت سمجھ بیٹھے تھے، کلنک کا ایک ٹیکہ تھی، جانوروں اور دوسری اقسام کی قربانیوں کے رواج اور توہم پرستیوں کے اس جال لیوا بوجھ سے ہندوستانی سماج کو ماسوا جین انقلاب کے کس نے بچایا، جس کی اساس فلسفیانہ حقائق اور اخلاق کی اعلٰے قدروں پر

---

[1] یہ سیاست دان اور مدبر پنڈت چانکیہ کے پند و نصائح میں سے ایک نصیحت ہے، چانکیہ نے کہا ہے کہ بچّہ کی عمر جب تک کہ پانچ برس کی ہو باپ کو اس کے ساتھ شفقت سے پیش آنا چاہیئے اور دس برس کی عمر تک بچّہ میں جو عیب پائے جائیں باپ کو چاہیئے کہ ان پر بچّے کو متنبہ کرے اور جب بچّے کی عمر سولہ برس کی ہو جائے تو باپ کو اس کے ساتھ دوستانہ سلوک کرنا چاہیئے اور اسے اپنے برابر سمجھنا چاہیئے!

---

مبنی تھی؟ یا بدھ انقلاب کے ماسوا پسماندہ طبقات کے کروڑوں انسانوں کو اعلیٰ جاتیوں کے ظلم و تشدد سے بچانے کے لئے کس نے کوئی اقدام کیا؟ جب بدھ مت کا زوال شروع ہوا، اور بدھ مت کے ماننے والوں میں اوصاف کی جگہ معائب نے لے لی اور ہندستانی سوسائٹی ان غیر متمدن یا نیم متمدن نسلوں کی آماجگاہ بن گئی، جنہیں بدھ مت کے ماننے والوں کی صفوں میں داخل ہونے کا موقع ملا تھا، اور اس سے عالمگیر مساوات کی پُرکشش صفت ختم ہوئی۔ تو پہلے شنکر آچاریہ اور ان کے بعد رامانج آچاریہ منظر شہود پر آئے اور انہوں نے پھر سوسائٹی کی وہ شان اور وہ وقار حاصل کرنے کی سر توڑ کوشش کی جو اسے ماضی کے دنوں میں حاصل تھا۔ اس واقعہ میں بھی شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اگر مسلمانوں کے عہد اقتدار میں کبیر، نانک اور چیتنیہ پیدا نہ ہوتے اور ہمارے زمانہ میں اگر برہمو سماج اور آریہ سماج معرض وجود میں نہ آئے ہوتے تو آج اس ملک میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی بہ نسبت ہندوؤں کی تعداد تھوڑی بہت تھوڑی رہ گئی ہوتی۔

خوراک سے بہتر اور کونسی چیز ہو سکتی ہے جو جسم کی نشو ونما کرتی ہے جو مختلف عناصر سے عبارت ہے اور دماغ کو توانائی دیتی ہے، جس سے خیالات کی لہریں اٹھتی رہتی ہیں، لیکن یہی خوراک اگر پوری طرح ہضم نہ ہو تو پھر تمام بیماریوں کی جڑ بن جاتی ہے۔

فرد کی زندگی بھی کل کی زندگی کے اندر ہے اور فرد کی مسرت بھی کل کی اجتماعی مسرت کے اندر مضمر ہے، موج دریا کے اندر موج ہے اور دریا کے باہر کچھ بھی نہیں کل سے ہٹ کر فرد کی زندگی بے وقعت ہوا کرتی ہے یہ ایک ناقابل تردید سچائی ہے اور اسی سچائی کی بنیاد پر یہ پوری کائنات کھڑی ہے، عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا، فرد کا یہ فرض ہے کہ وہ کل کی طرف بڑھے، کل سے مل کر مسرت محسوس کرے، اور کل سے جدا ہونے پر اسے تکلیف کا شدید احساس ہو حقیقت صرف اتنی ہی نہیں ہے بلکہ یہ واقعہ بھی ہے کہ کل سے فرد کے انحراف میں اس کی فنا کا راز مضمر ہوتا ہے اور کل سے اس کے ادغام میں وہ سچائی نہاں ہوتی ہے جسے حیاتِ جاودانی کہا جاتا ہے یہ فطرت کا قانون ہے اور وہ کون ہے جو فطرت کے قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک دے کوئی بھی شخص سوسائٹی کو مدت مدید تک دھوکا نہیں دے سکتا، اور اس کے ساتھ چالبازی سے کام نہیں لے سکتا، سوسائٹی کی اوپری سطح پر چاہے کتنی ہی گندگی کیوں نہ ہو کوڑے کرکٹ کا چاہے کتنا ہی بڑا ڈھیر کیوں نہ لگا ہو لیکن اس کی وہ سطح جس پر اس کی حیات منحصر ہوتی ہے ہمیشہ ہی صاف ستھری رہتی ہے اور اس میں ہمیشہ عالمی محبت کی لہریں اٹھتی رہتی ہیں، سوسائٹی کی مثال اس دھرتی جیسی ہے جو اپنی پشت پر تشدد کے کھرشنجے اور خراشیں برداشت کرتی رہتی ہے لیکن ایک دن آتا ہے جب وہ بیداری کی کروٹ بدلتی ہے، اس کی بیداری کا وقت چاہے کتنی ہی تاخیر سے کیوں نہ آئے لیکن جب یہ وقت آتا ہے تو وہ اپنی زلزلہ انگیز طاقت سے گندگی کے اس سارے کوڑے کو صاف کر ڈالتی ہے جو اس کی خوابیدگی کے زمانہ میں لاکھوں کروڑوں لوگ اس کی پشت پر جمع کر دیتے ہیں۔

---

# اثرِ مغرب

ہم اس سچائی کو نظر انداز کرتے ہیں، اگرچہ ہزاروں بار ہمیں اس بے وقوفی کا خمیازہ بھگتنا پڑا ہے لیکن ہمارے اندر ظلم کی جو فطرت ہے، وہ ہمیں اس قسم کی بے وقوفیوں پر اکساتی ہے اور ہم کو یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم کوئی بے وقوفی نہیں کر رہے ہیں، ہم فریب دینے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ہمارا ہزاروں بار کا یہ تجربہ ہے کہ ہم خود اپنے ہی کو دھوکا دیا کرتے ہیں مگر اس کے باوجود ہم اپنی خود فریبی کو نہ سمجھتے ہیں نہ اس کا اقرار کرتے ہیں، ہم کتنے پاگل ہیں، ہمارا خیال ہے کہ ہم فطرت کو اپنے قابو میں لے آئیں گے، اپنی تنگ نظری کی بنا پر ہم یہ سوچا کرتے ہیں کہ زندگی کے جزو و کل کو ہم اپنے نفس کا ہر قیمت پر محکوم و غلام بنا لیں۔

عقل، علم، دولت، انسان، مادی طاقت، روحانی شکتی، الغرض جو چیز بھی فطرت ہمیں فراہم کرتی ہے وہ اسی لئے ہوتی ہے کہ ضرورت کے وقت ہم اسے صرف کریں اور اپنے استعمال میں لائیں، ہم اکثر یہ بات پس پشت ڈال دیتے ہیں اور اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں اور ہر چیز پر "میری اور صرف میری" کی مہر لگا دیتے ہیں، حالانکہ ہم خوب جانتے ہیں کہ فطرت کی دی ہوئی اشیاء کا ہم اپنے قبضہ میں ذخیرہ کر کے اپنی بربادی کا تخم اپنے ہی ہاتھ سے بوتے ہیں،

راجہ میں اس کی پرجا کی تمام شکتیاں مجتمع ہوتی ہیں، لیکن وہ یہ بات فراموش کر دیتا ہے کہ یہ تمام شکتیاں اس میں اس غرض سے اکٹھی کی گئی ہیں کہ وہ ان میں ہزار گنا اضافہ کر کے انہیں لوٹا دے تاکہ اس سے پوری قوم کی فلاح و ترقی کا کام لیا جا سکے، راجہ وین کی طرح[✱] وہ اپنی

---

[✱] راجہ وین کا قصہ بھاگوت پران میں مذکور ہے، وہ خود کو برہما، وشنو اور مہیشور سے بھی بڑا تصور کرتا تھا اور اس بنا پر اس نے اپنی پرجا کو یہ حکم دیا تھا کہ اس کی پرستش کی جائے، پہلے پہلے تو رشیوں نے اسے یہ سمجھانے بجھانے کی کوشش کی کہ وہ اپنی اس احمقانہ حرکت سے باز آ جائے لیکن رشیوں کا نیک مشورہ قبول کرنے کی بجائے اس نے ان کی توہین ہتک کی، جس پر رشی ناراض ہو گئے اور راجہ وین ان کے غصہ کی آگ میں جل کر بھسم ہو گیا!

---

طاقت پر مغرور ہو کر خدائی کا دعویٰ کرنے لگتا ہے اور دوسرے تمام لوگوں کو اپنے مقابلہ میں حقیر انسان تصور کرتا ہے، اس کی پرجا کی طرف سے اس کی مرضی کی مخالفت چاہے وہ اچھی ہو یا بُری اس کی نظر میں گناہِ کبیرہ قرار پاتی ہے پس وہ اپنی پرجا کی حفاظت و مدافعت کی جگہ ان کو کچل دینے کا اقدام کرتا ہے، ان کو پرورش کرنے کی بجائے ان کا خون چوسنے لگتا ہے۔ اگر سوسائٹی کمزور ناتواں ہوتی ہے تو وہ بادشاہ یا راجہ کی ہر بدسلوکی کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرتی ہے اور اس کا قدرتی نتیجہ اس صورت میں نکلتا ہے کہ راجہ اور پرجا دونوں ہی قعرِ مذلت میں گرنے لگتے ہیں، اور اس قوم کا آسانی سے شکار بن جاتے ہیں جو ان سے زیادہ طاقت کی حامل ہوتی ہے۔ جہاں سماج طاقتور اور صحت مند ہوا کرتا ہے وہاں راجہ اور پرجا میں زبردست کشمکش شروع ہو جاتی ہے، اور اس کشمکش کے نتیجہ میں بادشاہ کو تاج و تخت سے بھی کبھی کبھی محروم ہو جانا پڑتا ہے اور اس کی شاہی اور شان و شوکت کے تمام آثار عجائب خانوں کی زینت بن جایا کرتے ہیں۔

اس مقابلہ کے نتیجہ میں اور اس کے ردِ عمل کے طور پر دیشوں کی طاقت نمودار ہوئی، جس کی نگاہِ قہر آلود کے سامنے بڑے بڑے تاجداروں اور بڑے بڑے بہادروں کے پِتّے پانی ہو جاتے ہیں، اس کے ہاتھ میں سونے کا ساغر دیکھ کر امیر و غریب سب کے سب اس کے پیچھے چلنے لگتے ہیں لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے، جس طرح کوئی شخص اپنا سایہ نہیں پکڑ سکتا، اسی طرح سونے کا یہ ساغر بھی کسی کے ہاتھ نہیں لگ سکتا!

برہمن کہتا ہے کہ تمام شکتیوں میں علم کی شکتی سب سے بڑی ہے، چونکہ میں عالم ہوں لہٰذا علم میری ذات پر منحصر ہے، اور اس وجہ سے سوسائٹی کو میری اطاعت کرنی چاہیئے، کچھ مدت تک ایسا ہی ہوتا رہا، کشتری کا دعویٰ یہ ہے کہ اے برہمن! مجھے اپنی شکتی پر بڑا گھمنڈ سہی لیکن اس شکتی کے باوجود تجھے صفحۂ ہستی سے مٹا دینے میں کوئی دیر نہیں لگ سکتی، لیکن یہ میری تلوار کی شکتی ہے جس نے تجھے محفوظ رکھا ہے، اگر میری تلوار کی یہ شکتی نہ ہوتی، تو تیرا وجود ہی نہ ہوتا، اس لئے میں اور صرف میں ہوں جسے سب پر برتری حاصل ہے، اور یہ واقعہ ہے کہ شعلہ ریز تلواروں کی جھنکار نے جو فضاؤں میں گونج رہی تھی، سوسائٹی کو تلوار کی برتری کا اقرار کرنے کے لئے مجبور کر دیا، اور اس نے تلوار کی طاقت کے سامنے اپنی گردن جھکا دی! علم کے پرستار تک راجہ کے پرستار بن گئے اور اس کی اطاعت کرنے لگے۔ ویشوں کا کہنا ہے — اے دیوانو! جس کو تم لکشمی کہتے ہو، وہ میرے پاس ہے، یہ چمکدار سونا! یہ قدرت کا ملا رکھنے والی دولت! دولت کی دیوی کی کرپا سے میں بھی سب کے برابر طاقت رکھتا ہوں، اے برہمن! میں لکشمی کی کرپا سے تیرا علم خرید سکتا ہوں، تیری عقل، تیری ریاضت اور تیرا گیان خرید سکتا ہوں، اور اے راجہ تیری تلوار، تیرے ہتھیار، تیری فوج، تیری طاقت، اور تیری ساری شکتی میرے سونے کی غلام ہے، میری دولت کی محکوم ہے، اور میں اپنی دولت کے ذریعہ اپنی تمام خواہشات پوری کر سکتا ہوں، کیا تو ان عالیشان محلوں کو دیکھتا ہے جن میں دولت پیدا ہوتی ہے؟ یہ سب میری شکتی کے چھتے ہیں، ان چھتوں میں ان لاکھوں مکھیوں کو دیکھو (ان مزدوروں کو!) جو ان میں شہد جمع کرتی رہتی ہیں، یہ مزدور یہ مکھیاں کس کے لئے شہد جمع کرتی ہیں، میرے لئے اور صرف میرے لئے! اور میں ان چھتوں میں سے شہد کا قطرہ قطرہ نچوڑ لیتا ہوں — اور یہ شہد میرا منافع ہوتا ہے!"

برہمن اور کشتریوں کے زمانۂ اقتدار کے دوران میں جس طرح علم کی اشاعت ہوئی، تمدن کو فروغ ہوا، اسی طرح ویشوں کے زمانۂ اقتدار کے دوران میں ہر چیز پر دولت کا تسلط ہے اور ہر شے کو دولت نے اس کی پیشانی سے پکڑ رکھا ہے، ویش کا قبضہ اس سکہ پر ہے، جس کی پرکشش جھنکار چاروں جاتیوں کے دماغ پر چھا جاتی ہے، ویش کو ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ براہمن کہیں اپنے علم کی طاقت اس کی واحد ملکیت پر قبضہ نہ کر لے اور کہیں کشتری اپنی تلوار کے بل پر اسے اس کی ملکیت سے محروم نہ کر دے اپنے ذاتی تحفظ کی خاطر تمام ویش بہ حیثیت جماعت ایک ہی ذہن اور ایک ہی دماغ رکھتے ہیں، ویش دولت کا حاکم ہے اور وہ دوسروں کی محنت کے پھل کو ایک ہی ہاتھ میں صاف کر جاتا ہے، یہی وہ اس کا طاقتور ہتھیار ہے جس کا سب ہی لوگوں کے دل پر ایک خوف طاری رہتا ہے وہ اپنی دولت کی طاقت سے ہمیشہ ہی شاہی اقتدار کو دبانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے، تاکہ شاہی اقتدار اس کے پاس آنے والی دولت کے بہاؤ پر کوئی بندھ نہ باندھ سکے، وہ اس معاملہ میں ہمیشہ ہی بہت ہوشیار رہتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کے دل میں کبھی اس بات کا ادنیٰ سا خیال تک نہیں آتا کہ حکمرانی کی طاقت منتقل ہو کر شودر طبقہ میں پہنچ جائے۔

کس ملک میں تاجر نہیں جاتا، اگرچہ خود جاہل ہوتا ہے لیکن وہ اپنی تجارت جاری رکھتا ہے اور ایک ملک کا علم، آرٹ، سائنس اور دانش و حکمت دوسرے ملک کو پہنچایا کرتا ہے، براہمن اور کھتریوں (کشتریوں) کے عہد اقتدار میں بھی عقل و دانش، تمدن اور علوم و فنون کے جواہر اطراف عالم میں ان ویشوں ہی نے اپنی تجارتی منڈیوں کے ذریعہ پہنچائے تھے، لیکن اب خود ویش طاقت پذیر ہو چکے ہیں لہٰذا ان کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے، جو ثقافت و تہذیب، علوم و فنون، ایجادات، کھانے پینے اور آرام و آسائش کی اشیا کو دنیا کے ایک حصہ سے دوسرے حصے تک لے جائے۔

اور وہ کہاں اور کس منزل میں ہیں جن کی جسمانی محنت کی بدولت براہمن کو اثر و رسوخ حاصل ہوا، کشتریوں کو تلوار کی طاقت میسر آئی، اور ویش کو دولت ملی؟ ان کی کیا تاریخ ہے جو ہر ملک اور ہر زمانہ میں سوسائٹی کا ڈھانچہ بناتے ہیں اور سماج میں سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں، مہربان اور رحم دل ہندوستان نے ان کے لیے بہت ہی نرم سزائیں تجویز کی ہیں — ان کی زبان کاٹ دو — ان کا گوشت چبا ڈالو — اور اسی طرح کی دیگر سزائیں! محض اس جرم اور اس خطا کے لیے تجویز کی گئیں کہ اگر وہ اس علم کا جس پر اعلیٰ جاتیوں کی اجارہ داری مسلط تھی، کوئی حصہ یا کوئی جزو حاصل کرنے کی کوشش کریں، ہندوستان میں یہ زندہ لاشیں ہیں اور دوسرے ممالک میں باربرداری کا یہ جانور ہیں جن کو شودر کہا جاتا ہے، ان کا زندگی میں کیا حصہ ہے؟ میں ہندوستان کے بارے میں کیا کہوں؟ اس کے پاس تو صرف شودر طبقہ ہی رہ گیا ہے، اس کے براہمن جن کے پاس کبھی روحانی علم ہوا کرتا تھا، اب بدیشی پروفیسر ہیں، اس کے کشتری انگریز حکمران ہیں، اس کے ویش بھی انگریز ہی ہیں جنہیں تجارت کا ملکہ حاصل ہے، لے دے کے ہندوستانیوں کے پاس صرف شودریت رہ گئی ہے — گویا وہ باربرداری کے جانور بن کر رہ گئے ہیں،

فی الوقت اندھیرے کی ایک چادر نے ہمیں چاروں طرف سے ڈھانک لیا ہے، اب ہم میں نہ تو مقصدیت کی ثابت قدمی ہے نہ سود و زیاں سے کھیلنے کی جرأت ہے، نہ دماغ و دل میں تاب و توانائی ہے، نہ دوسروں کی بدسلوکی کا ترکی بہ ترکی جواب دینے

کی ہمت رہی ہے نہ ہمارے دلوں میں اُمید کی کوئی کرن ہے نہ ہم میں کوئی جذبۂ محبت ہے نہ انسانیت ہے نہ غلامی کے لئے ہمارے ذہن میں جذبۂ نفرت ہے بلکہ ان سب کی جگہ ہمارے دلوں میں صرف حسد کی جڑیں گہرائی تک اُتر گئی ہیں ہم ایک دوسرے سے بُری طرح حسد کرتے ہیں اور ہماری یہ خواہش ہوتی ہے کہ ایک کمزور کو ہر ممکن طریقہ سے برباد کر ڈالیں اور انہیں اس حال کو پہنچا دیں کہ وہ طاقتور کے قدموں کو چاٹنے والا کتا بن جائیں فی الوقت ہمارے لئے صرف ایک ہی چیز موجب اطمینان بنتی ہے اور وہ ہے دولت اقتدار کی نمائش! ہم مفاد پرستی میں گم رہتے ہیں، ہماری ساری عقل صرف تحصیل دولت کے مقاصد میں صرف ہوا کرتی ہے، ہمارا ایک ہے بدی کی پرستش! ہمارا کام ہے دوسروں کی غلامی! ہمارا تمدن ہے دوسری اقوام کی نقل اتارنا! ہماری گفتگو ہے دشنام طرازی، ہمارے ادب کی خصوصیت ہے اُمراء کی قصیدہ خوانی، یا فحاشی و عریانی! ایسے ملک کے شودروں کے حقیقی طبقہ کے لئے الگ سے کیا بات کہی جا سکتی ہے، جہاں کی پوری آبادی عام طور پر اپنی گراوٹ اور پستی میں شودروں کی سطح پر آ پڑی ہے! ہندوستان کو چھوڑ کر دوسرے سب ہی ملکوں کے شودروں میں ایسا لگتا ہے کہ تھوڑی سی بیداری آ گئی ہے تھوڑی سی جاگرتی پیدا ہوئی ہے، لیکن انہیں اب بھی مناسب تعلیم کی احتیاج ہے اور ان میں اپنے ہی طبقہ کے لوگوں سے باہمی نفرت کا جذبہ موجود ہے جو شودروں کی ایک صفت ہے اگر دوسرے طبقات سے ان کی تعداد طاقت بہت زیادہ ہو تو بھی اس کا کوئی فائدہ نہیں، اس لئے کہ ان میں اتحاد کی وہ شکتی نہیں ہے جو دس آدمیوں کے اجتماع میں دس لاکھ کی طاقت پیدا کر دیتی ہے لہٰذا قانونِ فطرت کے مطابق ان کی محکومی ناگزیر ہے اور وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ ایک محکوم نسل بنے رہیں۔

لیکن آشا کی ایک کرن پھوٹتے دکھائی دے رہی ہے زمانہ کے طاقتور ہاتھوں نے براہمن اور دوسری اعلےٰ جاتیوں کو شودروں کی سطح کی طرف دھکیل دیا ہے اور شودر اپنی پستی کی حالت سے اوپر اٹھتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں، اور اونچا منصب اور مرتبے حاصل کر رہے ہیں، یورپ جو کبھی شودروں کی سرزمین تھا اور جسے روم نے اپنا غلام بنا رکھا تھا، اب کشتری کی طاقت سے معمور ہو چکا ہے، ہمارے دیکھتے دیکھتے وہ چین تک جو کبھی بے پناہ طاقت رکھتا تھا، شودریت کی سطح تک گرتا جا رہا ہے اور وہ جاپان جس کی کبھی کوئی اہمیت نہ تھی، راکٹ جیسی طاقت کے ساتھ تیزی سے اوپر اٹھ رہا ہے اور اعلیٰ جاتیوں کے حقوق پر درجہ بدرجہ چھاپہ مار رہا ہے، ماڈرن یونان اور اٹلی نے کشتریوں کے اوصاف حاصل کر لئے ہیں اور ترکی و سپین نیز دوسرے ممالک کو جو زوال ہوا ہے اس کے وجوہ پر ہمارے ملک کے لوگوں کو غور کرنا چاہیئے،

بہر حال ایک وقت آئے گا جب شودر اپنی شودریت کے تمام خصائص کے ساتھ عروج پائیں گے، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آج تو شودر زمانے میں ویش اور کشتریوں کے اوصاف پیدا کر کے عروج پا رہے ہیں لیکن آنے والے وقت میں ایسا نہیں ہوگا کہ وہ کسی اعلیٰ جاتی کے اوصاف و خصائص پیدا کر کے عروج پائیں، بلکہ ہر ملک کے شودر، شودر رہتے ہوئے اور ان تمام اوصاف و خصائص اور عادات و اطوار کے ساتھ جو ان میں جنم سے ہوتے ہیں مستقبل میں عروج پائیں گے اور سماج میں برتری کی قطعی پوزیشن حاصل کریں گے مغربی دنیا میں اس نئی سحر کی کرنیں پھوٹنی شروع ہو گئی ہیں، اور آہستہ آہستہ یہ نئی سحر طلوع ہو رہی ہے اور مفکرین عالم انتہائی

غور و خوض کے بعد اس نئی تحریک پر اپنی قطعی آراء ظاہر کر رہے ہیں۔ سوشلزم[1]، انارکی، انکارِ خدا، دہریت اور اسی طرح کے دیگر فرقے در حقیقت اس سماجی انقلاب کے مراحل ہیں جو آنے والا ہے، نہ جانے کب سے شودر ظلم و تشدد کی چکی میں دلے جا رہے ہیں اس کا قدرتی طور پر یہی نتیجہ ہونا تھا کہ وہ یا تو اتنا کمینہ ہو جائیں کہ اعلیٰ جاتیوں کے پاؤں کتوں کی طرح چاٹتے رہیں یا ان میں درندگی کے خصائص پیدا ہو جائیں اور وہ آدمی ہوتے ہوئے بھی خونخوار درندہ بن جائیں، مزید برآں ان کی توقعات و خواہشات پر ہمیشہ پانی پھرتا رہا ہے، لہٰذا ان میں نہ تو اقدام و عمل میں محتاط رہنے کا جذبہ ہے نہ مقصدیت کا استحکام ہے! ان میں یہ دونوں باتیں نہیں ہیں۔

مغرب میں تعلیم پھیلنے کے باوجود شودر طبقہ کے عروج کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ ذات اور طبقہ کا تعین کم و بیش اچھے یا برے اوصاف و خصائص کی بنیاد پر کیا جاتا ہے، قدیم ہندوستان میں جات پات کا جو نظام تھا، اس میں شودر طبقہ کو سب سے نیچے رکھا گیا تھا اور بے دست و پا بنا دیا گیا تھا، اسے دولت اور علم حاصل کرنے کا کوئی موقع نہیں تھا، حسنِ اتفاق سے اگر شودر طبقہ میں غیر معمولی اہلیت و صلاحیت اور خداداد فراست و ذہانت رکھنے والا کوئی شخص پیدا ہوتا تو جھٹ اعلیٰ جاتیاں اس پر اعزاز کی بارش کر دیتیں اور اسے اپنے زمرے میں شامل کر لیتیں، چنانچہ اس کی عقل و فراست اور خداداد قابلیت و استعداد کا فائدہ اس جاتی کو پہنچتا جس میں وہ شامل ہوتا، شودر طبقہ کو اس کی شخصیت سے کوئی فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملتا، وہ اس سے نہ کوئی فیض پاتے، نہ کوئی استفادہ کرتے، اتنا ہی نہیں بلکہ اعلیٰ جاتیاں اپنے نکمے اور ناکارہ افراد کو نکال کر شودروں میں پھینک دیتیں اور اس طرح ان کی تعداد میں اضافہ کا موجب بنتیں، وشسٹھ[2]، نارد[3]، ستیہ کام[4]، جبال، ویاس[5]، کرپ، درون، کرن اور اسی طرح دیگر طبقات، جن کے شجرہ ہائے انساب میں اشتباہ پایا جاتا ہے، اپنی طاقت یا اپنے علم کی بدولت کشتری یا برہمن کی پوزیشن کو پہنچے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس طرح جو عروج حاصل ہوا، اس سے کس طرح طوائفوں، خادماؤں، ماہی گیروں اور قصابوں نے فائدہ اٹھایا! مزید برآں اسی

---

[1] سوشلزم کا جنم 1835ء میں ہوا، باکونن انارکی کا محرک تھا، جو 1814ء میں پیدا ہوا تھا، روس میں پہلے پہل 1862ء میں انکارِ خدا کی تحریک کا آغاز ہوا، [2] وشسٹھ کا پتا برہمن تھا، لیکن ماں کی جاتی کا پتہ نہیں، [3] نارد کی ماں خادمہ تھی، لیکن باپ کی جاتی معلوم نہیں، [4] ستیہ کام جبال کی ماں خادمہ تھی، جس کا نام جبال تھا، لیکن باپ کی جاتی معلوم نہیں۔ [5] ویاس کا باپ ایک برہمن یوگی تھا جس کا نام پراشر تھا اور ماں ایک ماہی گیر کی کنواری بیٹی تھی جس کا نام متسیہ گندھا تھا، کرپاچاریہ کا باپ ایک برہمن یوگی تھا جس کا نام شردوان گوتم تھا اور ماں دیوی جن پدی تھی، درون کا باپ ایک برہمن یوگی بھاردواج تھا اور ماں دیوی گھرتاچی تھی، کرن کی ماں کنتی اپنی کنیزی کے زمانہ میں حاملہ ہو گئی تھی اور باپ سوریہ دیوتا تھا۔ — مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو (2) باب 174۔ آدی پرو مہابھارت یا رگ وید میں 7-33-11 تا 13 (3) باب 6 سکندھ شریمد بھاگوت (4) حصہ 4 پرا تھک 17 چھاندوگیہ اپنشد (5)، (6)، (7) اور (8) کی تفصیلات کے لئے بالترتیب ملاحظہ ہوں مہابھارت آدی پرو کے ابواب 105، 130 اور 111، سوسائٹی میں اپنی عزت بچانے کے لئے کنتی نے نومولود بچہ کو دریا میں پھینک دیا۔ اور اسے ایک مچھیرے نے اٹھا لیا اور اپنی گود لے لیا۔

طرح برہمن کشتری یا ویشوں کے طبقے سے جو نیچے گرا ہے، اس نے شودروں کی صف میں اضافہ کیا ہے!

نئے ہندوستان میں جو شودر والدین سے پیدا نہیں ہوتا، وہ چاہے ایک کروڑپتی ہو جائے، ایک جید پنڈت ہو لیکن اسے اپنی سوسائٹی کو چھوڑ دینے کا کبھی کوئی حق نہیں ملا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی دولت، اس کی عقل و فراست، اس کا علم الغرض سب کچھ بس اس کی جاتی کی حدوں کے اندر ہی رہا، اور وہ اپنی استعداد و اہلیت کو بس اپنے ہی طبقہ کی فلاح و ترقی کے لئے صرف کرتا رہا، پس ہندوستان میں جات پات کا یہ نظام جو وراثت پر مبنی ہے، اپنی معینہ حدوں سے آگے قدم بڑھانے کا اہل نہیں رہا ہے اور وہ صرف انہی لوگوں کی ترقی و عروج کے لئے برکت کا رہا ہے جو اس کے حلقہ کے اندر ہیں، اسی طرح ایک ایسی حکومت کے تحت جو بلا امتیاز ذات پات اس ملک پر حکمرانی کر رہی ہے، ہندوستان کے پسماندہ طبقات آہستہ آہستہ آگے بڑھتے رہیں گے سماج کی قیادت چاہے لوگوں کے ہاتھ میں ہو جنہوں نے علوم پر اپنی اجارہ داری مسلط کر رکھی ہے یا ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جنہوں نے دولت اور اسلحہ جمع کر لئے ہیں لیکن طاقت کا حقیقی سرچشمہ ہمیشہ عوام ہوا کرتے ہیں کوئی برسر اقتدار طبقہ خود کو طاقت کے اس سرچشمہ سے جس قدر دور رکھے گا اسی قدر کمزور ہوتا چلا جائے گا لیکن یہ عجیب بدنصیبی ہے، مایا کا عجیب چکر ہے کہ طاقت کے جس سرچشمہ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ فیض حاصل کیا جاتا ہے مکر و فریب، بجبر و زر، یا برضا و رغبت شکتی حاصل کی جاتی ہے اسی سرچشمہ کو اہل اقتدار بہت ہی جلدی بھلا دیتے ہیں اور اسے فراموش و نظرانداز کر دیا کرتے ہیں، جب برہمنوں نے اپنے عہد اقتدار میں خود کو عوام سے الگ تھلگ کر لیا جو ان کی شکتی کا سرچشمہ تھے تو راجاؤں نے ان کے اقتدار کا تختہ الٹ دیا اور ان کی جگہ اپنا اقتدار مسلط کر دیا، لیکن جب شاہی اقتدار اور عوام کے درمیان دوری پیدا ہوئی تو راجہ ویشوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہ گئے اور ویشوں کے اقتدار نے شاہی کی جگہ لے لی، جنہیں اس وقت بھی عوام کا زیادہ تعاون اور زیادہ قربت حاصل ہے، مگر ویشوں کا اقتدار بھی اپنی انتہا کو پہنچتا جا رہا ہے، انہوں نے بھی اپنے جملہ مقاصد حاصل کر لئے ہیں اور اب وہ بھی خود کو عوام سے الگ تھلگ کرتے جا رہے ہیں اور ان پر زیادہ بھروسہ نہیں کر رہے ہیں، لہٰذا قدرتی طور پر ان کے اقتدار کے خاتمہ کا وقت قریب آتا جا رہا ہے اور ان کے اقتدار کی بربادی کا بیج زمین میں پڑ چکا ہے۔

عوام اگرچہ تمام شکتیوں کا ذخیرہ ہیں، لیکن خود ان کے اندر ایک دوسرے کے درمیان دوری اور فاصلے موجود ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے جملہ حقوق سے محروم کئے جاتے رہے ہیں، جب تک یہ دوری اور یہ فاصلے باقی رہیں گے اس وقت تک یہی حالات بدستور باقی رہیں گے۔

مشترک خوف اور نفرت یا محبت کا کوئی مشترک جذبہ بسا اوقات عوام کے درمیان ایکتا کا موجب بن جایا کرتا ہے شکار کی مشترک غایت جس طرح جانوروں سے ان کا غول بنوا دیا کرتی ہے اسی طرح انسان بھی خود کو ایک گروہ، ایک جماعت، ایک نسل یا ایک قوم کی صورت میں جمع کر لیا کرتا ہے، اپنے وطن اور ابنائے وطن کی محبت میں ایک شخص کا غلو خود کو دوسروں کے خلاف شدید قسم کی نفرت کے رنگ میں ظاہر کرتا ہے، مثال کے طور پر یونان کی نفرت ایران سے، روم کی نفرت کارتھیج سے، عربوں کی نفرت

کافر سے سپین کی نفرت ہو سے فرانس کو نفرت سپین سے، انگلستان اور جرمنی کی نفرت فرانس سے اور امریکہ کی نفرت انگلستان سے!
لیکن یہی جذبہ تنفر ایک قوم کو دوسری قوم سے آگے بڑھانے اور بازی مار لیجانے کا موجب بنتا ہے اور ایک قوم کی ترقی و عروج کی بنیادی وجہ ثابت ہوتا ہے، اس لئے کہ یہی مشترک جذبہ ہوتا ہے جس کی بنیاد پر ایک قوم خود کو دوسری قوم کے خلاف اپنے جارحانہ عزائم میں متحد کر لیا کرتی ہے۔

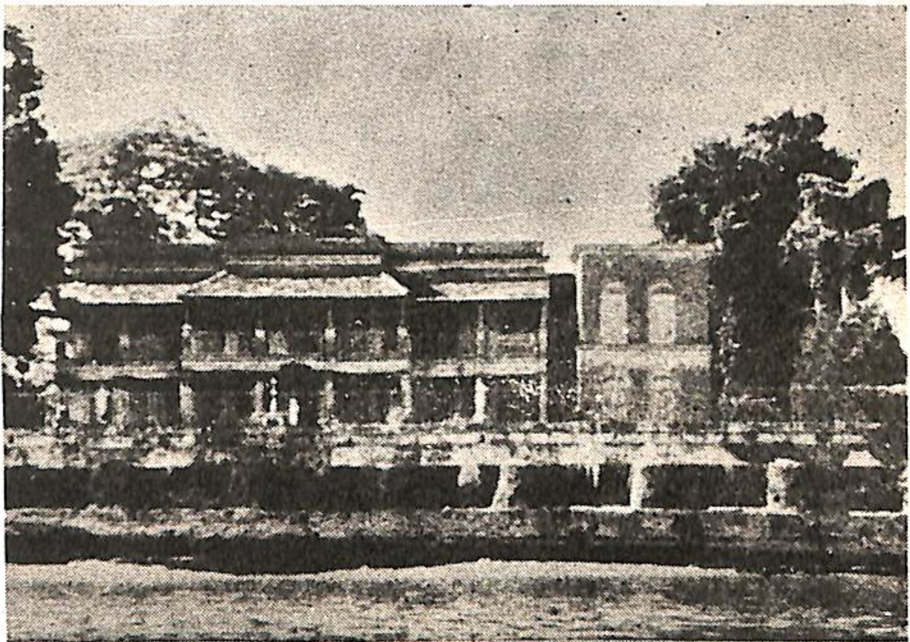
ذاتی آکس ہی ذاتی حریت و آزادی کا پہلا علم ہے، محض فرد کے مفاد کی حفاظت کے لئے ہی ایک شخص کو سب سے پہلے اجتماعی مفاد کی جانب دھیان دینا پڑتا ہے، ایک شخص کی اپنی قوم کا مفاد خود اس کا مفاد ہوتا ہے، اور قومی ترقی خود اس کی اپنی ترقی ہوا کرتی ہے، بہت سے لوگوں کے مشترکہ تعاون کے بغیر بہت سے کام کسی طرح بھی نہیں چل سکتے یہاں تک کہ حفاظت خود اختیاری بھی ناممکن سی بات ہو جایا کرتی ہے، ہر ایک ملک و ہر قوم میں یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ اپنے اپنے نجی مفاد کی حفاظت کے سوال پر بہت سے ہاتھ دوستی اور مدد کے جذبہ سے ایک ہو جایا کرتے ہیں، وہ باہمی طور پر ایک دوسرے کے مددگار بنتے ہیں، بے شک لوگوں کے نجی مفاد سے وابستگی رکھنے والا ماحول بھی مختلف اور جداگانہ ہوا کرتا ہے، ہندوستان میں زندہ رہنے کے جو کم سے کم مواقع میسر ہیں ان کو ملایا جائے، انہیں ایک دوسرے سے ضرب دے کر زیادہ سے زیادہ حاصل ضرب نکالا جائے، مزید براں اعلٰے جاتیوں کو دھرم کی منظوری سے جو مراعات حاصل ہیں ان پر کوئی حرف نہ آنے پائے، بس یہی وہ زیادہ سے زیادہ فائدہ ہے جو ہندوستانی عوام حاصل کر سکتے ہیں، نئے ہندوستان کے لئے اس سے بہتر کوئی دوسری بات قرین توقع نہیں ہے اور یہی ہندوستانی زندگی کے زینہ کی آخری سیڑھی ہے!

ہندوستان کی موجودہ حکومت میں بہت سی برائیاں بھی ہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ بہت سی خوبیاں بھی ہیں، سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ پاٹلی پتر کی سلطنت کا جب سے زوال ہوا ہے تب سے اس وقت تک ہندوستان حکمرانی کی اتنی مضبوط مشینری کے تحت نہیں آیا، جتنی مضبوط مشینری برطانوی سرکار کی ہے، اس کا اقتدار پورے ملک کے طول و عرض پر چھایا ہوا ہے، شکریہ ہے کہ اب دلیش شکتی کی اس برتری کی بدولت کہ دلیش دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تجارت کر رہے ہیں، مختلف ممالک کے نظریات و خیالات کی ہندوستان میں بھی ایک درآمد شروع ہو گئی ہے اور یہ خیالات و نظریات اس کی رگ و پے میں سرایت کرتے جا رہے ہیں، ان میں سے بعض خیالات و نظریات اگرچہ ہندوستان کے لئے مضرت رساں ہیں، لیکن بہت سے نظریات و خیالات حقیقت میں اس کے لئے بہت زیادہ مفید بھی ہیں، مرچند وہ لوگ جو بدلیشی ہیں، اپنی بے خبری و ناواقفیت کی بنا پر یہ بات نہیں سمجھ پاتے کہ اس ملک کے لئے کیا چیز مفید اور بہتر ثابت ہو سکتی ہے؟

بہر حال اچھی بری جو چیز بھی ہے وہ عوام میں داخل ہوتی جا رہی ہے اور بالیقین ہندوستان کے مستقبل کی خوشحالی و تابندگی کا ایک ابھرتا ہوا نشان دکھائی دے رہا ہے، اس کے قدیم قومی آدرشوں اور جدید نظریات و خیالات کے مابین عمل در عمل کے ایک نتیجہ کے طور پر اس میں آہستہ آہستہ بیداری پیدا ہو رہی ہے اور نئی نسل کی نیند سو کر اب وہ جاگتے ہوئے دکھائی دے رہا ہے، غلطیاں ہوں گی ہونے دیجئے غلطیوں سے کوئی نقصان نہیں ہے، اپنے عمل و اقدام میں ہم سے جو غلطیاں ہوتی ہیں ہم انہیں سے سبق بھی سیکھتے ہیں، درختوں، پتھروں اور جانوروں سے کوئی غلطی نہیں ہوتی، وہ قانون فطرت سے بندھے رہتے ہیں، یہ صرف انسان ہی ہے جو غلطیوں اور خطاؤں کا پتلا بنایا گیا،

اور یہ لشر ہی ہوا کرتا ہے جو اس زمین پر اوتار بھی بن جایا کرتا ہے، اگر مہد سے لحد تک ہماری پوری زندگی کے ہر کام کے لئے اور اگر صبح سے شام تک کے تمام معمولات کے لئے دوسرے لوگ جملہ تفصیلات پر مبنی ہمیں ایک پروگرام دے دیں اور ہمارے دماغ پر کسی دھرم کی تلوار کا خوف چھایا رہے اور ہم متعین ضوابط کی فولادی گرفت میں آجائیں تو پھر ہمارے پاس اپنے بارے میں سوچنے اور آزادی کے ساتھ غور کرنے کی کونسی بات رہ جائے گی؟ کونسی چیز ہوتی ہے جو ایک آدمی کو ایک دانشور اور ایک لیگی بنا دیا کرتی ہے؟ کیا یہ چیز سبب و مسبب اور علل و معلول نیز مرضی و خواہش کے بارے میں غور و فکر کے علاوہ بھی کوئی شے ہو سکتی ہے؟ اور عقل اور غور و فکر کی قوت سے کام نہ لیا جائے تو باقی کیا بچے گا؟ تامسی اوصاف جب پیدا ہوتے ہیں تو عقل و ضمیر گند ہو جایا کرتے ہیں اور روح مادیت میں مبتلا ہو جایا کرتی ہے بہرحال ابھی دھرم کا ہر مبلغ اور سماج کا ہر لیڈر سوسائٹی کے لئے نئے ضوابط اور نئے قوانین کے ڈھانچے تعمیر کرنے کا متمنی رہتا ہے کیا اس ملک میں ضابطوں کا کوئی فقدان ہے؟ کیا اسے قوانین کی احتیاج ہے؟ کیا اس کے پاس قوانین اور ضابطوں کا کافی ذخیرہ موجود نہیں ہے؟ ہاں ضوابط کے بوجھ کے تلے پوری قوم کراہ رہی ہے اور اپنی بربادی کے غار کے نزدیک پہنچ گئی ہے — کیا کوئی ہے جو اس بات پہ ٹھنڈے دل سے غور کرے؟

---



نیلامبر مکرجی گارڈن ہاؤس بیلور جہاں عالم بازار کے بعد ۱۸۹۵ء میں مٹھ کھولا گیا تھا۔

# سلام! اے سرزمینِ ہند

کوئی مطلق العنان حکمراں ہو، تو بھی برسرِ اقتدار طاقت کسی مفتوح قوم کے ساتھ اتنی حقارت سے پیش نہیں آیا کرتی، امرائے اقتدار میں بھی تمام رعایا کو مساوی حقوق حاصل رہتے ہیں یعنی بہ الفاظ دیگر کسی شخص کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ حکمران طاقت سے بازپرس کرے یا اسے کنٹرول کرنے لگے، لہٰذا ایسی حکومت کے زیرِ نگرانی کسی خاص نسل یا ذات کے لئے خصوصی مراعات حاصل کر لینے کی بہت ہی کم گنجائش رہ جاتی ہے لیکن جہاں مفتوح قوم پر جمہوری ساخت کی حکومت کے قوانین نافذ رہتے ہیں وہاں حاکم و محکوم کے درمیان بڑی دوری پیدا ہو جایا کرتی ہے، بڑی خلیج حائل ہو جاتی ہے اور اس حکومت کی طاقت کا بڑا جزو صرف اس بات پر ضائع ہو جایا کرتا ہے کہ محکوم نسل کو اپنے قطعی اقتدار کی گرفت میں رکھا جائے، یہ ہو سکتا ہے کہ بہت ہی تھوڑے عرصہ میں اس نوعیت کی حکومت مقتدر طبقات کے لئے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کر لے اور ان کی ترقیات کا زیادہ سے زیادہ انتظام کر دے لیکن اس کے باوجود اس کی طاقت کا زیادہ حصہ صرف محکوم نسل کو اپنے زیرِ اقتدار رکھنے کی کوشش پر ضائع جاتا ہے، مثال کے طور پر محض یہی وجہ تھی کہ سلطنت روم کے زیرِ اقتدار خود جمہوریہ روم کے عوام اتنے خوشحال نہیں تھے جتنے خوشحال اس کے محکوم ممالک کے عوام تھے محض اسی بنا پر عیسائی پیشوا سینٹ پال میں جو اگرچہ مفتوح یہودی نسل میں پیدا ہوا تھا، روم کے شہنشاہ سیزر سے[1] یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ وہ ان الزامات کا سامنا کرے جو اس کے خلاف عائد کئے گئے ہیں چنانچہ اگر یہ انفرادی طور پر ہمیں غلام یا کالا آدمی کہتے ہیں اور ہم سے اس طرح نفرت کرتے ہیں گویا ہم نیم متمدن اور وحشی ہیں تو اس بات سے نہ تو ہمارے پاس سے کچھ جاتا ہے نہ ہم کچھ پاتے ہیں، جات پات کے بھید بھاؤ کی وجہ سے ہمارے درمیان خود ہی ایک دوسرے کے خلاف زبردست نفرت و حقارت کا جذبہ موجود ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ ہمارے برہمنوں کو اگر اتفاقیہ طور پر کسی کشتری راجہ کی بے وقوفی سے شاہی اقتدار کی سرپرستی حاصل ہو جائے تو وہ توقیہ اس بات کی کوشش نہیں کریں گے کہ شودروں کی زبانیں کاٹ دو، ان کے بازو اور ٹخنے توڑ دو۔ ماضی قریب میں مشرقی آریہ ورت کی مختلف جاتیوں کے لوگوں کے درمیان تو

[1] The Acts xxv, 11. ؎۱

رجحان پیدا ہوتے ہوئے دکھائی دے رہا تھا کہ وہ اپنی موجودہ سماجی حالت کو بدلنے کی غرض سے خود کو ایک دوسرے سے وابستہ کریں اور ان کے درمیان ایک اتحاد پیدا ہو۔ اسی طرح مرہٹہ دیس میں براہمنوں نے مرہٹہ نسل کی مدح میں قصیدہ خوانی شروع کر دی تھی۔ کیا سماندہ طبقات اب بھی یہ یقین کر سکتے ہیں کہ یہ سب کچھ خود رو ہے اور کسی دلچسپی یا توجہ کا ثمر نہیں ہے!

چونکہ انگریز قوم کے ذہن میں رفتہ رفتہ یہ سچائی یہ خیال گہری جڑ پکڑتا جا رہا ہے کہ اگر اس کے ہاتھ سے ہندوستان کی سلطنت نکلے گی تو یہ ہاتھ پوری انگریز قوم کے لئے تباہی و بربادی کا موجب بن جائے گا اور ہندوستان کی سلطنت اس کے ہاتھ سے نکلتے ہی وہ اپنی بربادی سے دوچار ہو جائے گی، لہٰذا ہندوستان پر انگلستان کے اقتدار اور اس کی برتری کو ہر ممکن طریقہ سے قائم رکھنا چاہیئے، اس مقصد کو بروئے کار لانے کی غرض سے ان کا یہ خیال ہے کہ ہر ہندوستانی کے دل پر انگریز قوم کی شان و شوکت اور رعب و دبدبہ کا سکہ بٹھا دیا جائے — اس خیال پر ہنسی بھی آتی ہے رونا بھی آتا ہے، لہٰذا اس لئے آئیے کہ یہ کونسا افسوسناک خیال ہے جو انگریز قوم کے دماغ میں جڑ پکڑ لیا ہے اور کس طرح اس جذبہ کو بروئے کار لانے کے لئے اپنے ہاتھ پاؤں پھیلا رہے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان میں رہنے والے انگریز باشندے یہ بات فراموش کرتے جا رہے ہیں کہ جب تک اس کے کردار میں ان کے قومی اوصاف و خصائص باقی ہیں بس اسی وقت تک ان کا اقتدار باقی رہے گا، یعنی یہ کہ جب تک ان میں فراخ حوصلگی، احتیاط و تدبر، مقصدی یکجہتی کے وہ اوصاف رہیں گے جن کی بدولت انہیں ہندوستان کی سلطنت حاصل ہوئی اور تجارتی فراست و بیداری کے ساتھ سائنس کی وہ معاونت وابستہ رہے گی جس نے ہندوستان کو جو سونے کی چڑیا کہلاتا ہے انگلستان کی بہت بڑی تجارتی منڈی بنا دیا ہے، اس وقت تک برطانوی اقتدار کے تخت کو یہاں کوئی جنبش نہیں دی جا سکتی، جب تک برطانوی قوم میں یہ اوصاف و خصائص موجود ہیں ہندوستان جیسی ہزاروں سلطنتیں اس کے ہاتھ سے نکل سکتی ہیں، اور وہ انہیں دوبارہ حاصل کر سکتی ہے، لیکن ان اوصاف و خصائص کے چشمے اگر سوکھ جائیں تو پھر وہ محض اپنی شان و شوکت کے ذریعہ کسی ملک کو اپنا محکوم نہیں رکھ سکے گی لہٰذا انگریزوں میں جب تک بحیثیت قوم یہ اوصاف و خصائص موجود ہیں اس وقت تک محض بے معنی وقار کے نام پر اپنی شکتی اور اہلیت کا اتنا بڑا حصہ ضائع کر دینا کوئی دانشمندی کی بات نہیں ہے، اگر یہی شکتی اور اہلیت محکوم عوام کی فلاح و بہبود پر صرف کی جائے تو اس کا حاکم و محکوم دونوں ہی قوموں کو بہت بڑا فائدہ پہنچے گا!

یہ بات پہلے کہی جا چکی ہے کہ بیرونی اقوام کے میل جول سے ہندوستان میں رفتہ رفتہ جاگرتی آتی جا رہی ہے اور اس تھوڑی سی بیداری کے نتیجہ میں کسی نہ کسی حد تک ہندوستان میں آزادی و آزاد خیالی بھی پیدا ہوتی جا رہی ہے، ایک طرف مغرب کی جدید سائنس ہے جس نے سورج کی روشنی کی طرح آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رکھی ہے اور اس سائنس کے استعمال سے بے پناہ شکتی حاصل کرنے کے ذرائع ان کے ہاتھ لگتے جا رہے ہیں، دوسری جانب ان کے آباؤ اجداد کی وہ قدیم روایات ہیں جب ہندوستان بام عروج پر روشن ستارہ کی طرح جگمگا رہا تھا، اور یہ قدیم روایات اس کی تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں جن پر ان گنت صدیاں بیت چکی ہیں اور جن قدیم روایات کی رگوں میں عالمگیر محبت کا لہو دوڑ رہا ہے اور یہ وہ روایات ہیں جو اوتاروں کی دین ہیں فوق الاشر طاقت کی دین ہیں اور جو بے پناہ روحانی شکتی کی حامل ہیں، اور یہ وہ شکتی ہے جسے دنیا کی کوئی بھی طاقت کبھی کچل نہیں سکتی، یہ

شاندار روایات، مستقبل کے بارے میں بہترین توقعات پیدا کرتی ہیں، بہترین ترغیب دیتی ہیں، ایک طرف بدیشی ادب کے ذریعہ ذہن و فکر میں ہلچل پڑ گئی ہے، مادہ پرستی، حصولِ دولت، دنیوی منفعت، نفسانی خواہشات اور عشرت پسندی کا شعور جاگ رہا ہے اور ان سب باتوں کے شور میں، بہت آہستہ سہی، لیکن دوسری جانب سے ان کے کان میں قدیم رشیوں منیوں کی دل دوز آواز بھی آ رہی ہے، ایک طرف طرح طرح کا عیش و عشرت کا سامان ہے جس سے مغرب نے اسے روشناس کیا ہے، شراب نوشی ہے، مرغن غذائیں ہیں، قیمتی لباس ہے، عالیشان کوٹھیاں ہیں، نئے نئے ڈھنگ کی سواریاں ہیں، نئے نئے اطوار ہیں، طرح طرح کے فیشن ہیں، قسم قسم کی پوشاکیں ہیں، جنہیں تعلیم یافتہ خواتین پہن کر بے حیائی کی حد تک آزادی کے ساتھ گھومتی پھرتی ہیں، لیکن دوسری طرف جب منظر بدلتا ہے تو سیتا ساوتری کی موجودگی دکھائی دیتی ہے، مذہبی اصول اور عبادت و ریاضت نظر آتی ہے، برت، ترک دنیا، یوگ سمادھی، نیم برہنہ سنیاسیوں کی جٹائیں، ان کا بھگوا لباس اور آتما کی تلاش و جستجو دکھائی دیتی ہے، ایک طرف مغربی سماج کی وہ آزادیاں ہیں جو ذاتی اور نجی مفاد پر مبنی ہیں، اور دوسری جانب آریائی سماج کی وہ قدریں ہیں جو تزکیۂ نفس اور قربانیٔ نفس کے جذبہ پر مبنی ہیں، ان دو سماجی و ثقافتی قدروں کے درمیان جب برابر کشمکش تصادم ہو رہا ہو تو اس بات پر کیا حیرت ہو سکتی ہے کہ ہندوستانی سوسائٹی ہچکولے کھا رہی ہے، مغرب کا نقطۂ نظر ہے، انفرادی آزادی! زبان، سیاست، مادی وسائل و ذرائع اور وہ تعلیم جس کے ذریعہ دولت کمائی جائے! ہندوستان کا نقطۂ نظر ہے مکتی! نروان وید، روحانی وسائل و ذرائع اور تزکیۂ نفس و نجات! ایک زمانہ تک ہندوستان کے جدت پسند یہ سوچتے رہے ہیں کہ یہ روحانی فلاح کی غیر یقینی توقعات کا محض خیالی پلاؤ پکایا کرتا ہوں اور ہوائی قلعے تعمیر کیا کرتا ہوں وغیرہ وغیرہ! لیکن اس کے باوجود ہندوستان گوش ہوش سے یہ آواز سننے کے لئے مجبور ہے۔

— इति संसारे स्फुटतरदोषः

कथमिह मानव तव सन्तोषः—

"انقلاب و تغیر، بے ثباتی اور فنا کی اس دنیا میں اے انسان دیکھ کہ تیرے لئے مسرت کہاں ہے؟"

ایک طرف نیا ہندوستان یہ مطالبہ کر رہا ہے کہ ہمیں بیوی اور پتنی کے انتخاب میں پوری آزادی حاصل ہونی چاہیئے اس لئے کہ شادی ہماری زندگی بھر کی راحت و مسرت اور رنج و تکلیف کے سوالات سے تعلق رکھتی ہے اور ہمیں اپنی شادی کے مسئلہ میں آزادی اور اپنی مرضی سے فیصلہ کرنے کا حق ہونا چاہیئے، دوسری جانب قدیم ہندوستان کی یہ ضد ہے کہ شادی جسمانی نشاط اور تحصیل مسرت کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ یہ افزائش نسل کا ایک ذریعہ ہے، شادی کے بارے میں ہندوستان کا یہی نقطۂ نظر رہا ہے ایک شخص کی اولاد مستقبل میں سوسائٹی کے لئے اچھائی یا برائی کا موجب بنتی ہے اس لئے ہر شخص بچے پیدا کر کے جہاں افزائش نسل کا موجب بنتا ہے وہاں وہ اس اچھائی یا برائی کا ذمہ دار بھی ہوتا ہے جس سے وہ اپنے بچے پیدا کر کے سوسائٹی کے مستقبل کو دوچار کرتا ہے لہٰذا سوسائٹی کے لئے شادی کا صرف وہی طریقہ پسندیدہ ہو سکتا ہے جس میں اس کی فلاح کا زیادہ سے زیادہ امکان ہو لہٰذا آپ کو اپنی انفرادی خواہش و مسرت سے کثیر التعداد لوگوں کی فلاح و خیر کی بنا پر دستبردار ہونی پڑتی ہے۔

ایک طرف نئے ہندوستان کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ ہم مغربی خیالات اپنائیں، مغربی زبان اختیار کریں، مغربی خوراک استعمال کریں مغربی

لباس پہنیں اور مغربی عادات اطوار پیدا کریں تو ہم بھی مثل مغربی اقوام کے طاقتور و توانا ہو جائیں گے۔ دوسری جانب قدیم ہندوستان اس بات پہ اصرار کرتا ہے کہ بے وقوفو! محض نقالی سے تم دوسروں کے خیالات کو اپنا بنا نہیں سکتے، تمہاری کمائی تمہاری اپنی ہے کسی دوسرے کی کمائی تمہاری نہیں ہو سکتی، ایک گدھا شیر کی کھال اوڑھ کر شیر نہیں بن جاتا۔!

ایک طرف نئے ہندوستان کی دلیل یہ ہے کہ مغربی اقوام کی ہر بات اچھی ہے، ورنہ انہیں عظمت اور بڑائی کس طرح حاصل ہو گئی؟ دوسری طرف قدیم ہندوستان کا یہ کہنا ہے کہ یہ روشنی کا محض ایک کوندا ہے جس نے لمحہ بھر کے لئے تمہاری آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے ورنہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

تو پھر کیا ہمیں مغرب سے کوئی بات نہ سیکھنی چاہیئے؟ کیا ہمیں بہتر چیزیں حاصل کرنے کے لئے کوشش کرنے اور اپنی اہلیت کو بروئے کار لانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے؟ کیا ہم کامل ہیں؟ اور ہم میں کوئی نقص نہیں ہے؟ کیا ہمارے سماج کے دامن پر کوئی بدنما دھبہ نہیں ہے؟ وہ بالکل کورا اور صاف ہے؟ بہت سی چیزیں سیکھنے کی ہوتی ہیں اور ہمیں زندگی بھر اچھی اور بہتر چیزیں حاصل کرنے کی جد و جہد کرتے رہنا چاہیئے ——— جد و جہد ہی بشری زندگی کا مقصد ہے، شری رام کرشن (پرم ہنس) کہا کرتے تھے کہ "جب تک میں زندہ ہوں تب تک میں کچھ نہ کچھ سیکھتا رہوں گا۔" وہ آدمی یا وہ سوسائٹی جس کے پاس سیکھنے کو کچھ بھی نہ ہو بس سمجھ لو کہ وہ فنا ہو چکی ہے اور اس میں زندگی کے آثار باقی نہیں ہیں۔ بے شک ہمیں مغرب سے بہت سی چیزیں سیکھنی ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ کچھ خطرے بھی ہیں کچھ دھوکے بھی ہیں۔

ایک ان پڑھ نوجوان شری رام کرشن (پرم ہنس) کے سامنے اکثر ہندو شاستروں پر اعتراض کر بیٹھتا تھا، ایک دن اس نے بھگوت گیتا کی تعریف کی، اس پر شری رام کرشن (پرم ہنس) نے کہا "میرا خیال ہے کسی مغربی فاضل نے بھگوت گیتا کی تعریف کی ہے لہٰذا وہ بھی اس کی تعریف کرنے لگا ہے۔"

اے ہندوستان! تیرے لئے یہ بہت ہی خوفناک خطرہ ہے! نقالی نے ہمارے ذہن کو اس بری طرح جکڑ لیا ہے کہ ہم خود اپنی عقل سے کام لے کر یہ تمیز کرنے کی اہلیت تک کھو بیٹھے ہیں کہ کیا اچھا ہے، کیا برا ہے، بس وہ خیالات اور عادات و اطوار اچھے ہیں جنہیں گورے لوگ پسند کرتے ہیں، گویا ہر چیز کی اچھائی اور برائی کا معیار گورے لوگوں کی پسند اور ناپسند پر منحصر ہے، ہم خود نہ تو قوت تمیز و قوت فیصلہ سے کام لے کر کسی چیز کو اچھا یا برا قرار دے سکتے ہیں نہ کسی شے کی اچھائی یا برائی کے لئے اپنے شاستروں کا کوئی حوالہ دے سکتے ہیں۔ افسوس صد افسوس! ہماری بیوقوفی کا اس سے بڑا کوئی دوسرا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟

مغربی عورتیں آزادی سے ہر جگہ گھومتی پھرتی ہیں، بس یہ اچھی بات ہے، وہ اپنے پتی کا آپ انتخاب کرتی ہیں لہٰذا یہ ترقی پسندی کی سب سے بڑی علامت ہے اور ترقی کا سب سے بڑا قدم ہے، مغربی باشندوں کو ہمارا لباس ناپسند ہے، ہماری خوراک، ہمارے رواج اور ہمارے رہن سہن کے طریقے ناپسند ہیں، لہٰذا یہ سب چیزیں یقیناً بری ہی ہونی چاہئیں، مغربی باشندے مورتی پوجا کی مذمت کرتے ہیں اسے پاپ قرار دیتے ہیں، لہٰذا ہماری مورتی پوجا بہت بڑا پاپ ہے اور اس بات میں شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے!

مغربی باشندوں کا یہ عقیدہ ہے کہ روحانی فلاح و ترقی کے لئے بس ایک ہی معبود کی پرستش کرنی چاہیئے، لہٰذا ہمیں بھی چاہیئے کہ ہم اپنے

سب دیوی دیوتاؤں کو لے جا کر گنگا میں ڈبو دیں! مغربی باشندے جات پات کے بھید بھاؤ کو پاگل پن قرار دیتے ہیں، اسی لئے ہمیں تمام مختلف جاتیوں کو خلط ملط کر کے ایک کر دینا چاہیئے۔ مغربیوں کا قول ہے کہ بچپن کی شادی تمام برائیوں کی جڑ ہے لہٰذا یہ بہت ہی برا رواج ہے اور بچپن کی شادی کا رواج جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہیئے۔

یہاں ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ ان رواجوں میں سے کسی رواج کو جاری رکھنے یا منسوخ کر دینے کی بحث چھیڑی جائے بلکہ ہمارا مقصد صرف اتنا ہے کہ اگر ہمارے رواجوں کی اچھائی یا برائی کے بارے میں محض مغربیوں کی پسند یا ناپسند ایک معیار قرار پاتی ہے تو ہمیں اس صورت حال کے خلاف سخت احتجاج کرنا چاہیئے، راقم الحروف کو کسی حد تک مغربی سوسائٹی کا ذاتی تجربہ بھی ہے اور اس تجربہ سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مغربی اور ہندوستانی سوسائیٹیوں میں موقف حیات اور حصول مقصد حیات کے طریق کار کے درمیان اتنا بڑا فرق ہے کہ اگر ہندوستان میں کوئی فرقہ مغربی ماحول کے سانچے میں ڈھالا جائے گا تو اس کے پاس زندگی کا نہ کوئی مقصد رہے گا نہ کوئی موقف ہوگا، جو لوگ مغربی سوسائٹی کا تجربہ نہیں رکھتے ہیں وہ ان اصولوں اور ان پابندیوں سے واقف نہیں ہیں، جو مغربی سوسائٹی میں مرد و عورت کے تعلقات کا تقدس اور پاکیزگی برقرار رکھنے کے لئے مروج ہیں، جس طرح ہماری سوسائٹی میں مردوں اور عورتوں کا آزادی سے ملنا جلنا روا نہیں ہے، اسی طرح مغربی سوسائٹی میں مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میل جول کے باوجود ایک طرح کی پابندی لگی ہوئی ہے جو مغربی خواتین کی عصمتوں کے تحفظ کی ایک ضمانت رہتی ہے!

میں نے مغرب میں دیکھا ہے کہ کمزور اقوام کے وہ بچے بھی جو انگلینڈ میں پیدا ہوتے ہیں خود کو یونانی، پرتگالی، اسپینی وغیرہ کہلوانے کی بجائے انگریز کہلانا پسند کرتے ہیں، گویا ہر کوئی طاقت کی طرف میلان رکھتا ہے، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک پروقار آدمی کے وقار کی جھلک خود اس کے سر پر چمکتے ہوئے دکھائی دیتی ہے، لیکن دوسرے لوگوں کے وقار کی اس چمک کو مستعار لینے کی خواہش ان لوگوں میں پیدا ہوا کرتی ہے جو طبعاً کمزور ہوتے ہیں، میں جس وقت ہندوستانیوں کو یورپین لباس میں ملبوس دیکھتا ہوں تو میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ شاید انہیں اپنی قومیت پر شرمندگی محسوس ہوتی ہے اور شاید وہ اپنے آباؤ اجداد کا نام لیتے ہوئے شرماتے ہیں، جن کے بارے میں ہندوستان کے ان پسماندگان، غریب، جاہل اور بے خبر ان کو شاید کوئی واقفیت نہیں ہے، ہندو دھرم کی غذا پر پلنے والا یہ باسی گزشتہ چودہ صدیوں میں کبھی غلام نہیں بنا! جات پات کا نظام ختم ہونے سے قبل وہ کون ہیں جنہوں نے خود میں وہ شان پیدا کر لی ہے جو زمانہ قدیم کے برہمنوں کو حاصل تھی، مزید برآں مغربیوں نے ہمیں اب یہ بات سکھانی شروع کی ہے کہ ہندوستان کی پچھڑی ہوئی جاتیوں کے لاکھوں لوگ جو قطعی طور پر بیوقوف اور جاہل ہیں حقیقت میں آریہ نہیں ہیں، انہوں نے بس شیر کی کھال اوڑھ لی ہے، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ وہ ان نسلوں سے تعلق رکھتی ہیں جو آریہ نہیں تھیں، لہٰذا ہمارا اور ان کا کوئی رشتہ نہیں ہے،

ہندوستان! افسوس! صد افسوس! کیا دوسروں کی صدائے بازگشت کے ذریعہ؛ دوسروں کی نقالی کر کے دوسروں پر بھروسہ رکھ کر اپنی اس کمزوری اور اس بے دردی کے ساتھ تو ارتقا کی راہ پر قدم اٹھا سکے گا اور کیا یہ تیرے تمدن کی بنیاد اور تیرے وقار کا معیار بن سکے گا؟ کیا اس بزدلانہ طریقہ پر تو اپنی آزادی کا مستحق قرار پا سکتا ہے جب کہ آزادی صرف بہادروں کے لئے ہوتی ہے، بزدلوں کے لئے نہیں ہوتی! اے ہندوستان! مت بھول کہ تیرے لئے عورت کا اعلیٰ نمونہ سیتا ہے، ساوتری ہے، دمینتی ہے، مت بھول کہ تیرا ایشور جس کی

پرستش کرتا ہے اوتاروں کا اوتار اور قدرت کاملہ رکھنے والا شنکر ہے مت بھول کہ تیری شادی تیری دولت، تیری زندگی صرف تیری نفسانی مسرت کے لئے نہیں ہے مت بھول کہ تیری خلقت قربانی کے لئے ہوئی ہے مت بھول کہ تیرا سماجی ڈھانچہ کچھ نہیں ہے مگر خالق کائنات کی غیر محدود قدرت کاملہ کا ایک پرتو، مت بھول کہ تیری پسماندہ جاتیاں تیرے جاہل اور غریب عوام، تیرے چمار اور تیرے بھنگی یہ سب تیرا گوشت ہیں، تیرا خون ہیں تیرے بھائی ہیں اے بہادر! جرأت مند، شریف ترین انسان! اٹھ اور اس بات پر فخر کر کہ تو ہندوستانی ہے اٹھ اور آواز دے کہ "میں ہندوستانی ہوں اور ہر ہندوستانی میرا بھائی ہے" کہو اور زبان سے کہو کہ جاہل ہندوستانی، غریب ہندوستانی، پسماندہ ہندوستانی، برہمن ہندوستانی، یہ ایک ہندوستانی، یہ سب تمہارے بھائی ہیں فخر و مباہات کے ساتھ پورے زور سے آواز دیجئے کہ ہر ہندوستانی میرا بھائی ہے، ہر ہندوستانی میری زندگی ہے اور ہندوستان کا ہر دیوتا، میرا دیوتا ہے ہر دیوی میری دیوی ہے ہندوستانی سماج میرے بچپن کا گہوارہ ہے، میری جوانی کا باغ ہے اور دارانسی میرے بڑھاپے کی عمر کا سورگ ہے میرے بھائی کہیے "ہندوستان کی سرزمین ہزاروں خلقتوں کی جنت ہے اور ہندوستان کی بھلائی میری اپنی بھلائی ہے، یہ بات اپنی زبان سے رات دن دہراتے رہیئے، بار بار کہتے رہیئے کہ اے گوری شنکر، اے سنسار کے پیدا کرنے والے! تو مجھ میں انسانیت کا جوہر پیدا کر، اے شکتی ماں! میری کمزوری مجھ سے چھین لے، اور مجھ کو انسانیت کا جوہر دلا کر آدمی بنادے — انسان بنادے۔"

---

**نوٹ**

'نیا ہندوستان' نامی مندرجہ بالا مضمون رسالہ "اُدبودھن" کے اشوع بابت ماہ مارچ ۹۹۵ء میں سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ مضمون سوامی جی کے قلم جوہر نگار کا رہین منت ہے۔ (ایڈیٹر)

# ہندوستان کا پیغام دنیا کے نام

سوامی وویکانند کے کاغذات میں سے مندرجہ ذیل اشارے دستیاب ہوئے تھے، ان کا ارادہ تھا کہ ایک کتاب تصنیف کی جائے اور اسی کام کے لئے انہوں نے ۲۴ نکات، اشارے کے طور پر قلمبند کئے تھے، ان میں سے چند نکات پر انہوں نے بطور ابتدائیہ اگرچہ کچھ لکھا ہے لیکن یہ تصنیف مکمل نہ ہو سکی، جو مسودہ دستیاب ہوا ہے ذیل میں درج کیا جا رہا ہے،

## اشارے

1. مغرب کے عوام کے لئے میرا پیغام ہے کہ حوصلہ مند بنیئے، اپنے وطن میں آپ جتنے جرأت مند ہیں اس سے زیادہ جرأت مند بنیئے!
2. شاندار مغرب میں چار برس گزارنے سے صرف اتنا ہوا کہ ہندوستان کو زیادہ بہتر طریقہ پر سمجھا جانے لگا ہے — سائے گہرے ہو گئے ہیں، روشنی زیادہ چمکیلی ہو گئی ہے۔
3. یہ جائزہ (تخمینہ لگانا) درست نہیں ہے کہ ہندوستانیوں میں گراوٹ آگئی ہے یا وہ انحطاط میں مبتلا ہیں۔
4. یہاں بھی وہی مسئلہ رہا ہے جیسا کہ کسی دوسری جگہ — یعنی مختلف نسلوں کا اختلاط و ادغام، لیکن یہاں یہ مسئلہ جتنا وسیع رہا، اتنا وسیع کسی دوسری جگہ نہیں رہا —!
5. قوت لسان، گورنمنٹ، اور ان سب سے ماسوا دھرم کی طاقت نفوذ،
6. دوسرے ممالک میں یہ کوشش بجبر و زور کی گئی — یعنی یہ کہ ایک نسل کا کلچر دوسری تمام نسلوں پر مسلط کر دیا جائے، اس کے نتیجہ میں طاقتور قومی زندگی پیدا تو ہوئی۔ لیکن یہ زندگی کم عمر ثابت ہوئی اور جلد ہی فنا ہو گئی۔

7 اس کے برعکس ہندوستان میں یہ مسئلہ جس حد تک وسیع تھا، اسی حد تک اسے نرمی سے نپٹانے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ ابتداء ہی سے ہندوستان میں مختلف عناصر کے رواجوں خصوصیت سے دھرموں کو برداشت کیا گیا اور رواداری سے کام لیا گیا۔

8 جہاں یہ مسئلہ چھوٹا تھا، اور ایکتا پیدا کرنے کے لئے کافی طاقت موجود تھی وہاں غالب عنصر کے رنگ کو چھوڑتے ہوئے تمام اقسام کے صحت مند جراثیم منہ بند کلیوں کی طرح کمہلا کر رہ گئے، صرف ایک ہی طبقہ کے دماغ والوں کی اکثریت محض اپنے وسیع مفاد کی دھن میں لگی رہتی تھی اور امکانی ترقیات کا بڑا جزو ضائع ہو جایا کرتا تھا اور اس طرح جب غالب عنصر کی شکستگی بظاہر صرف ہو جاتی تھی تو اس کی تہذیب کا قصر زمیں بوس ہو جاتا تھا، مثال کے طور پر یونان، روم اور نارمن تہذیبیں!

9 ایک مشترک زبان بہت بڑی احتیاج ہے لیکن اس کے خلاف سب سے بڑا اعتراض بھی یہی ہے کہ وہ دوسری مختلف مروجہ زبانوں کی توانائی اور نشو و نما کی بربادی کا موجب بن جایا کرتی ہے۔

10 اس کا واحد حل یہ ہے کہ ایک ایسی عظیم زبان ڈھونڈھی جائے جو دوسری تمام زبانوں کے لئے فیض کا سرچشمہ بنی رہی ہو اور یہ صرف سنسکرت بھاشا ہے!

11 دراوڑ قبیلوں کی زبانیں بنیادی طور پر سنسکرت سے تعلق رکھتی ہوں یا نہ رکھتی ہوں لیکن عملی مقاصد کے لئے اب بھی سنسکرت سے فیض حاصل کر رہی ہیں اور یہ اکتساب فیض روز بروز زیادہ سے زیادہ ہوتا جا رہا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی انفرادیت بدستور باقی ہے۔

12 ایک نسلی پس منظر ابھرا یعنی آریہ لوگ پیش پیش ہو گئے۔

13 یہ محض قیاس ہے کہ ایک ایسی نسل جسے بخوبی متعین کیا جا سکتا ہے وسطی ایشیا میں بحیرۂ بالٹک کے ساحل تک آباد تھی، جسے آریہ کہا جاتا ہے۔

14 نام نہاد اقسام انسلیں ہمیشہ مخلوط ہوتی رہیں۔

15 " "blonde" " (گورے رنگ اور سنہرے بالوں والی عورت) اور " "brunette" " (کالے رنگ اور کالے بالوں والی عورت)

16 نام نہاد تاریخی قیاس سے عملی و عقلی توجیہات کی طرف آیئے! آریہ اپنے قدیم ترین ریکارڈ کے اعتبار سے جس سرزمین پر آباد تھے وہ ترکستان، پنجاب اور شمال مغربی تبت کے درمیان واقع ہے۔

17 اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ نسلوں اور مختلف درجوں کا کلچر رکھنے والے قبیلوں کے درمیان میل جول اور اختلاط پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہو گی۔

18 جس طرح سنسکرت لسانی مسئلہ کا مناسب موزوں حل ہے اسی طرح آریہ نسلی مسئلہ کا مناسب موزوں حل ہے اسی

طرح برہمنیت مختلف مذہبوں کے ارتقاء اور کلچر کا بھی مناسب نمونہ حل ہے اور تمام سماجی و سیاسی مسائل کا بھی!

19 ہندوستان کا عظیم آدرش ــــ برہمنیت!

20 بے ملکیت، بے لوث و بے غرض، کسی قانون کا محکوم نہیں ــــ کوئی راجہ نہیں! صرف اخلاق کی حکمرانی!

21 برہمنیت کرم سے ــــ ماضی میں بھی مختلف نسلوں نے 'برہمنیت' کے حق کا دعویٰ کیا اور پایا اور زمانہ حال میں بھی اس حق کا دعویٰ کرنے والے یہ حق پا لیتے ہیں،

22 بیٹے کا نام انجام دینے والے کوئی دعویٰ نہیں کیا کرتے، یہ صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو کاہل، نکمے اور بے وقوف ہوتے ہیں۔

23 براہمنوں اور کشتریوں کا انحطاط! پرانوں میں کہا گیا ہے کہ غیر براہمن، صرف کلجگ میں ہوں گے اور یہ بات سچ ہے اور روز بروز سچ ثابت ہوتی جا رہی ہے، بہر حال گنتی کے براہمن باقی ہیں اور وہ ہندوستان میں ہیں۔

24 کشتری ــــ! انہیں براہمن کی منزل تک پہنچنے کے لیے کشتری کی منزل سے گزرنا ہوتا ہے، ہوسکتا ہے کہ ماضی میں کچھ لوگ اس منزل سے گزر لیے ہوں لیکن حال میں بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے ــــ

25 مگر پورے نظام کی آگہی صرف دھرم میں حاصل ہوتی ہے۔

26 ایک ہی نسل کے مختلف قبائل یکساں اقسام کے اوتاروں کی پرستش ایک مشابہ نام کے تحت کرتے ہیں جیسے بابلیوں کے "بال" اور اسرائیلیوں کے مولش،

27 بابل والوں نے کوشش کی کہ سب بالاؤں کو ایک بڑے بال مردوکش میں مدغم کر دیا جائے ــ اسرائیلیوں نے کوشش کی اور سب مولشوں کو مولش یاوہ یا یاہو میں مدغم کر دیا جائے،

28 بابلیوں کو ایرانیوں نے نیست و نابود کر دیا، اور اسرائیلی جنہوں نے بابلیوں کی دیو مالا لے لی تھی اور جس میں اپنی ضرورت کے مطابق کمی و بیشی کر لی تھی، وحدت پرستی کے ایک زبردست دھرم کے بانی بن گئے۔

29 وحدانیت بھی مطلق العنان آمریت کی طرح اپنے احکام کی بہ عجلت تعمیل کراتی ہے، اور زبردست طاقت کا مرکز قائم کر دیتی ہے ـ لیکن اس میں ایک بہت بڑی خرابی یہ ہے، کہ وہ بہت دور تک نہیں جاتی، اور اس کی سفاکانہ اور منتقمانہ فطرت ظہور میں آ جاتی ہے، تمام اقوام جو اس کے زیر اثر آتی ہیں چند سالہ عروج کے بعد فنا ہو جایا کرتی ہیں۔

30 ہندوستان میں بھی اس مسئلے نے اپنی شکل دکھائی اور اس کا یہ حل ملا ــــ

—एकं सद्विप्रा बहुधा वदन्ति ।

یہ ہر کامیاب ہونے والی چیز کی کنجی ہے، ہر محراب کی بنیاد ہے!

31 اسی کا نتیجہ ہے ـــــ ویدانتیوں کی حیرتناک رواداری!

32 پس بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مختلف عناصر کی انفرادیت کو مٹائے بغیر ان میں یکجہتی پیدا کی جائے، ہم آہنگی اور اتحاد پیدا کیا جائے۔

33 مذہب کی کوئی قسم نہیں ہے جو لوگوں پہ انحصار کرتی ہو چاہے وہ اس زمین کے ہوں چاہے آسمان کے ہوں۔

34 یہاں اور یہ نظام نے ایک شاندار اصول کی تعلیم دی ہے اس نے نہ صرف شخص واحد بلکہ کثیر التعداد لوگوں کو چاہے وہ بشر ہوں چاہے اوتار ہوں، اپنا پورا کردار بُرے کار لانے اور اپنا حصہ ادا کرنے کی اجازت دی ہے۔

35 یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، اس کا یہ مطلب ہے کہ ہم سدا ترقی کرتے رہے ہیں مسلم حکمرانی کے زمانہ میں سنہرا!

36 ماضی میں اور زمانہ قریب میں یہ پوری طرح چاق و چوبند بمقابلہ اسی اعتبار سے ہمارا انحطاط ہوا ہے۔

37 اسے مستقبل میں ہونا ہے! اگر ایک قبیلے کی شکتی، یا قبیل کی محنت استعمال کر کے حیرتناک نتیجہ برآمد کر سکتی ہے، تو یہاں تمام نسلوں کا اجتماع اور اختلاط کا عمل بتدریج جاری ہے اور ناگزیر طریقہ پہ تمام خون اور عقائد خلط ملط ہوتے جاتے ہیں لہٰذا میرے دل کی نظریں اس مستقبل کو دیکھ رہی ہیں جو اپنی پوری شکتی اور تابندگی کے ساتھ ظہور میں آنے والا ہے ہندوستان کا مستقبل ـــــ اس دنیا کی تمام قوموں میں سب سے کمسن اور سب سے شاندار بھی اور ساری اقوام عالم کے مقابلہ میں سب سے زیادہ قدیم بھی!

38 راستہ ـــــ ہمیں کام کرنا ہوگا! سماجی رواج، بطور رکاوٹ، بعض جس صورت میں سمرتیوں میں موجود ہیں لیکن شرتیوں سے کوئی بھی نہیں! سمرتیاں وقت کے ساتھ بدلنی چاہئیں یہ طے شدہ قانون ہے!

39 ویدانت کے اصولوں کی نہ صرف یہ کہ ہندوستان میں ہر جگہ تعلیم دی جائے بلکہ ملک کے باہر بھی ان اصولوں کی تعلیم دی جانی چاہیئے ہمارے خیالات اور ہمارے عقائد کو ہر قوم کے ذہنی ڈھانچہ میں داخل ہونا چاہیئے، تحریروں کے ذریعہ نہیں، بلکہ لوگوں کے ذریعہ!

40 کلجگ میں صرف کرم ہی ایک تحفہ ہے، کوئی علم پا نہیں سکتا، جب تک کہ کرم سے پاک نہ ہو،

41 روحانی اور سیکولر تعلیم کا تحفہ!

42 مکتی ـــــ تزکیہ نفس ـــــ قوم کی آواز!

## تمہید

گجرات منڈ بنئے! مغرب کے لوگوں کے لئے میرا پیغام ہے لیکن اپنے ابنائے وطن کے لئے میرا پیغام یہ ہے کہ بہت زیادہ

جرأت مند بنئے! مغرب کی نئی اقوام کو میں نے قدیم ہندوستان کا پیغام پہنچا دیا ہے، یہ اچھا ہوا، یا برا ہوا، اس کا جواب مستقبل ہی دے گا، لیکن اسی مستقبل کی طاقتور آواز نے اپنی نازک لہریں بھیجنی شروع کر دی ہیں اور فضا میں ان کی گونج آسانی سے محسوس کی جا سکتی ہے اور جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے ان لہروں کی طاقت میں اضافہ ہو رہا ہے، خود ہندوستان کے لئے ہندوستان کا پیغام یہ ہے کہ وہ جیسا ہے ویسا ہی رہے!

مختلف نسلوں کے درمیان رہ کر مجھے بہت سے نظاموں، رواجوں اور بہت سے مسلکوں کی شکتی اور توانائی کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے، لیکن اپنے مشاہدہ اور مطالعہ کے دوران میں سب سے زیادہ حیران کن چیز جو میری نظر کے سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ بظاہر مختلف رنگ رکھنے والے تمام کلچروں، تمام رواجوں اور تمام عقائد کی تہہ میں انسان کا ایک ہی دل دھڑکتا ہے، ایک ہی طرح کی مسرتیں ہیں، ایک ہی طرح کے غم ہیں، ایک ہی طرح کی کمزوریاں ہیں، اور ایک ہی طرح کی شکتی ہے،

خیر و شر ہر جگہ ہے اور ان دونوں میں حیرتناک توازن بھی ہے لیکن اس سے بھی ماسوا ہر جگہ ایک شاندار چیز ہے اور وہ انسان کی آتما ہے جو ہر اس شخص کی بات سمجھتی ہے، جو یہ جانتا ہے کہ اسے اپنی زبان میں کس طرح بات کرنی چاہیئے! ہر نسل میں مرد بھی ہیں عورتیں بھی ہیں جن کی زندگیاں عالم انسانیت کے لئے موجب تشکر ہیں اور سمراٹ اشوک کے ان الفاظ کی تصدیق کرتی ہیں "ہر ملک میں براہمن اور شرمن نبردآزما ہیں"۔

میں مغربی ممالک کا شکرگزار ہوں جنہوں نے گرمجوشی سے میرا سواگت کیا اور وہ پریم دیا جو صرف بے لوث و بے غرض اور پاک طاہر آتما ہی دے سکتی ہے لیکن میری زندگی میرے اسی وطن سے وابستہ ہے، اور اگر مجھے ہزار بار زندگی ملے تو میرے وطن کے لوگو! اے میرے دوستو! میں ان تمام زندگیوں کا ایک ایک لمحہ آپ کی خدمت کے لئے وقف کر دوں گا۔

اس لئے کہ میرے پاس جسمانی، دماغی اور روحانی طور پر جو اثاثہ بھی ہے وہ سب اسی وطن کی دین ہے اور اگر مجھے کوئی کامیابی حاصل ہوئی ہے تو اس کا سہرا آپ کے سر ہے میرے سر نہیں۔ میری چیزیں تو صرف میری کمزوریاں ہیں، میری ناکامیاں ہیں، اس لئے کہ وہ میری نااہلیت کا تقاضہ ہوتی ہیں اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ میں ان شاندار تعلیمات سے اکتساب فیض کرنے کا اہل ثابت نہیں ہوا جو اس ملک میں پیدا ہونے والے ہر شخص کو جب سے کہ وہ پیدا ہوتا ہے اپنے حصار میں لئے رہتی ہیں،

کیسی شاندار سرزمین ہے یہ! اس مقدس سرزمین پر جو بھی کھڑا ہوتا ہے چاہے وہ اسی دھرتی کا سپوت ہو چاہے یہاں درآمد ہوا ہو لیکن وہ محسوس کر پاتا ہے کہ وہ ان شاندار تعلیمات کے حصار میں ہے، اگر کسی بشر کی آتما گراوٹ میں مبتلا ہو کر درندگی کی سطح تک نہ پہنچ گئی ہو تو پھر اس کرۂ ارض پر پیدا ہونے والے ان پاکیزہ ترین انسانوں کے خیالات کی عظمت کو وہ مقدس طور پر محسوس کر سکتا ہے جو صدیوں سے حیوانِ ناطق کو اونچا اٹھا کر فرشتہ بنا رہے ہیں اور ان کے ان شاندار کارناموں کا آغاز کب سے ہوتا ہے تاریخ میں اس کا پتہ لگانا تک ممکن نہیں ہے، پوری فضا روحانیت کے جوہر سے معمور ہے، اس مقدس سرزمین نے ایشور بھگتی اور روحانیت کے فلسفہ کو جنم دیا ہے، جس کے تحت یہ انتظام ہے کہ بشر کی حیوانی جبلتیں بھی محفوظ رہیں اور وہ اپنے چہرہ سے درندگی کی نقاب بھی اتار پھینکے اور خود کو اس آتما کے روپ میں ظاہر کرے جو غیرفانی ہے۔

---

نیا ہندوستان صفحہ ۱۴۱

وہ سرزمین جس پر مسرتوں کا پیالہ لبریز ہوا، اور مصیبتوں کا جام چھلک پڑا، اور انسان نے پہلے پہل یہ محسوس کیا کہ یہ سب وہم و خیال ہے اور اس نے گمان و قیاس اور تکلف و تصنع کے پردے چاک کر دیئے، مجاز کی نقاب الٹ دی اور حقیقتوں کا جمال آشکار کر دیا، یہ اس وقت ہوا جب انسان کا اٹھتا ہوا شباب تھا، وہ عشرتوں کی باہوں میں مسرتوں کی سانس لے رہا تھا اور اس کے اقتدار کا سورج اپنے عروج پر تھا، یہاں ـــ انسانیت کے اس سمندر میں مسرت و غم، درد و آرام، طاقت و ناتوانی، دولت اور مفلسی اشک و تبسم کے ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے تیز دھاروں کے شور و غل کے درمیان لازوال سکون کا ترانہ بھی چھیڑا اور اسی سمندر کے پانی کی سطح پر تکتی اور تزکیہ نفس کا تخت بھی بچھایا گیا، یہاں اس سرزمین پر فنا اور بقا کے پیچیدہ مسئلے حل کیے گئے، زندگی کی تشنگی اور اس کے تحفظ کی طلب خواہش میں سعی لاحاصل کی گتھیاں سلجھائی گئیں اور یہاں پہلی بار یہ منکشف کیا گیا کہ زندگی بجائے خود کوئی شے نہیں ہے بلکہ وہ کسی حقیقت کا ایک پرتو ہے، ایک سایہ ہے، صرف اسی سرزمین کا دھرم عملی اور حقیقی ہے، صرف اسی سرزمین کے مرد و زن اس جرأت کے ساتھ حقیقت کو ڈھونڈتے ہیں جب کہ دوسرے ممالک کے لوگ محض زندگی کی مسرتوں کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتے رہتے ہیں اور اپنے کمزور بھائیوں کو لوٹ کر مسرتیں حاصل کرتے ہیں، صرف اسی سرزمین کے انسان کا دل نہ صرف یہ کہ انسانوں کے لئے کشادہ ہوتا ہے بلکہ پرندوں، چرندوں، درندوں اور درختوں تک کے لئے خود کو وسیع کرتا ہے اور اس میں اوتاروں سے لے کر خاک کا ایک ایک ذرہ تک اپنی سمائی کی جگہ پا لیتا ہے آدمی کے دل میں پست و بلند سب کے لئے گنجائش ہوتی ہے اور اس کی وسعت کی کوئی حد نہیں ہے، صرف اسی زمین پر انسان کی آتما نے دیدی کائنات میں وحدت کا ایک رشتہ دیکھا ہے اور اس نے ہر شے میں اپنے دل کی دھڑکن محسوس کی ہے،

ہم سب ہندوستان کے انحطاط کے متعلق بہت کچھ سنا کرتے ہیں ایک وقت تھا کہ مجھے بھی ان باتوں پر یقین آ جاتا تھا لیکن مجھے جو تجربات ہوئے ہیں ان سے میری آنکھیں کھل گئی ہیں اور دوسرے ممالک کی جو رنگین تصویریں دکھائی جاتی ہیں مجھ پر اب ان کی حقیقت ظاہر ہو چکی ہے اور میں بڑی عاجزی کے ساتھ اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ ہندوستان کے انحطاط کی باتوں پر جب میں یقین کر لیا کرتا تھا تو یہ میری بہت بڑی غلطی تھی، اے آریوں کے عظیم وطن! تو وہ سرزمین ہے جو کبھی انحطاط سے دوچار نہیں ہوئی! بے شک حکومتیں بدلتی رہیں ایک کے بعد دوسرا راجہ آتا رہا، لیکن ہندوستان میں شاہی اقتدار شاید ہی کبھی قومی زندگی کے دھارے کو ہاتھ لگا سکا ہو اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک اپنا راستہ چلنے کے لئے آزاد رہے اور وہ قومی زندگی کے راستہ پر چلتے رہے ان میں سے کچھ اگر آہستہ چلتے تو کچھ بہت تیز اور پوری ہوشیاری و بیداری کے ساتھ چلتے، یہ عظیم الشان جلوس صدیوں سے چل رہا ہے اور مجھے اس جلوس کا سلسلہ کسی جگہ سے بھی ٹوٹتے ہوئے دکھائی نہیں دیتا، کہیں کہیں اس عظیم الشان جلوس کے سلسلہ کی کوئی کڑی تھوڑی سی مدھم ضرور دکھائی دی لیکن اس مدھم کڑی کے بعد ہی کوئی دوسری روشنی اور شاندار کڑی آ گئی اور اس جلوس کے پر وقار قدم اپنے راستہ پر آگے کی طرف اٹھتے ہی رہے تاکہ وہ اپنی شاندار منزل پر پہنچے۔ آسمان و زمین میں کوئی طاقت نہیں ہے جو اس کے بڑھتے ہوئے قدم روک سکے ـــ آدمی کا ارتقاء اور آدمی میں ایشور کا پرتو!

ہاں ـــ کتنی شاندار اور کتنی عظیم ہے یہ منزل! میرے بھائیو! پراچین کال سے، اپنشدوں کے زمانہ سے ہم دنیا کو یہ چیلنج دیتے

آئے ہیں:——

: न प्रजया न धनेन त्यागेनैके अमृतत्वमानशुः——

"آدمی کو ابدیت صرف مُکتی کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے، نہ اقتدار کے ذریعہ نہ دولت کے ذریعہ"۔ نسل بعد از نسل، اس چیلنج کو قبول کرتی رہی ہے اور وہ اپنی خواہش کے گھوڑے پر سوار ہو کر دنیا کے مسئلہ کو حل کرنے کی مقدور بھر کوشش کرتی رہی ہے، ماضی میں وہ سب ناکام ہوئے۔ اگلے زمانے کے لوگ مصیبت و ادبار کے بوجھ تلے دب کر فنا ہو گئے، اس بوجھ کے ساتھ اقتدار کی حرص اور دولت کی ہوس بھی اور نئے زمانے کے لوگ بھی، اب باری آ رہی ہے کہ اس غار میں گر پڑیں، جو فنا کا غار ہے، موت کا گڑھا ہے، اس مسئلہ کا بہر حال اب بھی فیصلہ ہونا ہے کہ آیا امن باقی رہے گا یا جنگ ؟ آیا صبر باقی رہے گا یا بے صبری، قناعت و توکل باقی رہے گا یا حرص و ہوس ؟ آیا نیکی باقی رہے گی یا بدی، خیر و سلامت رہے گا یا شر، آیا جسمانی طاقت باقی رہے گی یا عقل و دانش، آیا دنیا داری باقی رہے گی یا روحانیت ؟ سینکڑوں برس پہلے ہم نے اس مسئلہ کو حل کر لیا تھا، — اور ہمارا حل تھا — دنیا سے دست کشی — اور — مکتی!

روحانیت — ہندوستان کی قومی زندگی کی اساس ہے اور اسی بنیاد پر اس کی زندگی کا سارا ڈھانچہ تعمیر ہوا ہے وہ کسی زمانہ میں بھی اس راہ سے الگ نہیں ہوا، تاتاریوں کی حکومت رہی ہو یا ترکوں کی، مغلوں کی حکومت رہی ہو یا انگریزوں کی لیکن ہندوستان روحانیت کی راہ پر گامزن رہا، اور وہ بال بھر بھی ادھر ادھر نہیں ہٹا!

میں ہر شخص کو چیلنج کرتا ہوں کہ مجھے یہ دکھایا جائے کہ وہ کونسا زمانہ ہے جب ہندوستان کی قومی زندگی روحانی پیشواؤں سے خالی رہی ہو، روحانیت اس کا کام ہے، اس کا موقف زندگی ہے اور یہ کام نہ تو جنگی نقاروں کے ذریعہ دکھایا جا سکتا ہے نہ مارچ کرتی ہوئی فوجوں کے ذریعہ! دنیا کے ذہن پر ہندوستان جو اثر چھوڑتا ہے اس کی مثال پھول پر گرنے والے شبنم کے نازک قطرہ کی ہے، شبنم کے گرتے ہوئے قطرہ کو کون دیکھتا ہے؟ کون اس کے گرنے کی آواز سنتا ہے؟ لیکن دنیا میں مسکرانے والے ہر پھول کی گود میں شبنم کے یہ قطرات موجود رہتے ہیں، اس اثر کو مناسب ماحول ملے اس کے لئے ہمیں ابھی انتظار کرنا پڑے گا، اس ملک سے باہر نکلئے اور دوسرے ممالک میں جائیے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خود اس ملک کی سرحدوں کے اندر روحانیت کی اثر پذیری رک گئی ہے، تاریخ کے طالب علم خوب جانتے ہیں کہ جب بھی تاتاریوں، ایرانیوں، یونانیوں یا عربوں نے اس ملک کا بیرونی ممالک سے رابطہ قائم کیا تو یہاں سے روحانیت کے اثرات کا ایک دھارا ابل پڑا، اور روحانی اثرات کی یہ بدلی ساری دنیا میں اس زور سے برسی کہ اس نے جل تھل بھر دیئے، ایسے ہی حالات ایک بار پھر ہمارے سامنے آئے ہیں، انگریزوں نے جو اگرچہ ایک چھوٹے سے جزیرہ کے باشندے ہیں لیکن اپنی حیرتناک شکتی کو بروئے کار لا کر بحر و بر کی بڑی بڑی شاہراہوں کے ذریعہ ایک بار پھر ہندوستان کا رابطہ دوسرے ممالک سے قائم کر دیا ہے اور ہندوستان کا وہی کام پھر شروع ہو چکا ہے، میرے الفاظ پر غور کیجئے! یہ محض چھوٹی سی ابتدا ہے، اس کے بعد ہی بڑے کام ہونے والے ہیں، ہندوستان کے باہر اس وقت جتنا کام ہوا ہے اس کے نتیجہ کے بارے میں کوئی قطعی بات میں نہیں کہہ سکتا، لیکن اتنی بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ لاکھوں لوگ اس پیغام کے انتظار میں ہیں جو انہیں

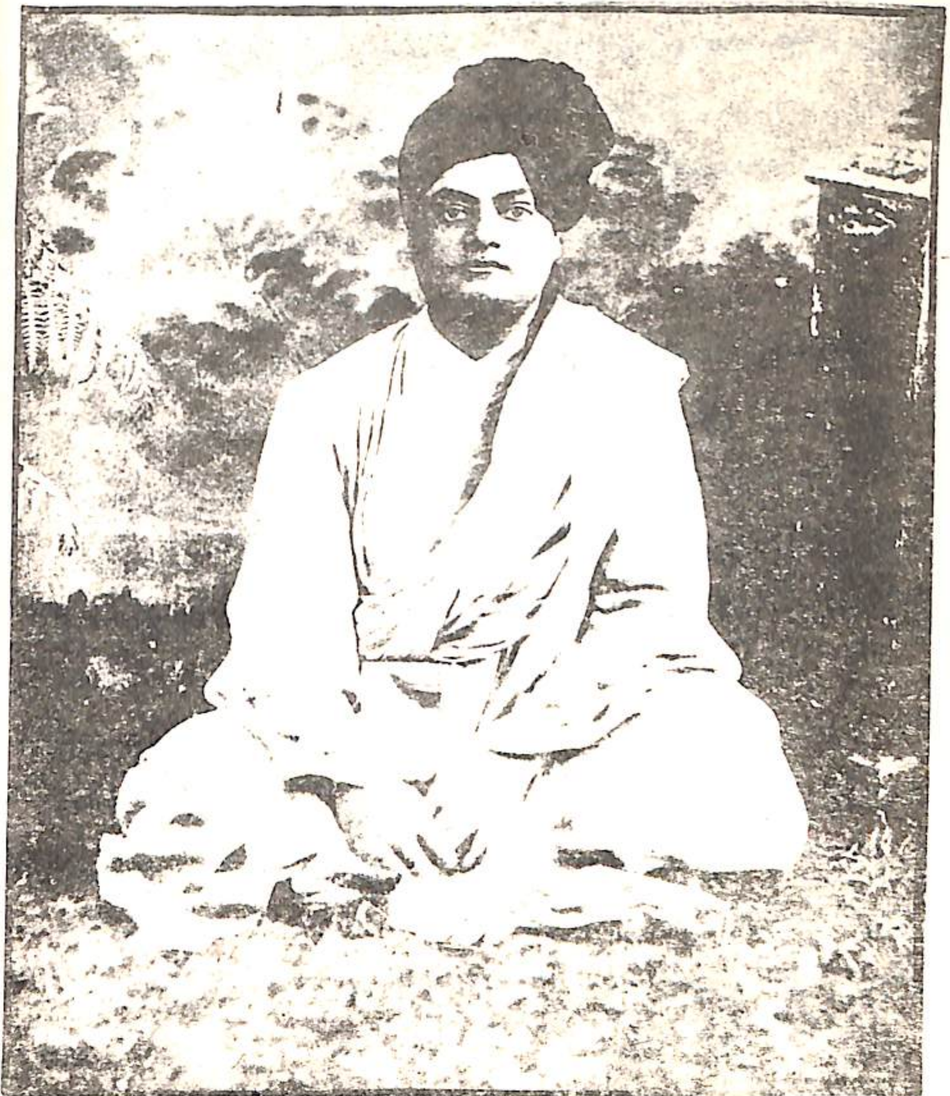
---

نیا ہندوستان — صفحہ ۴۳

مادیت پرستی کے اس دور میں محفوظ و مامون رکھے گا جس میں دولت کی پوجا ہو رہی ہے۔ نئی سماجی تجربات کے بہت سے لیڈروں پر یہ حقیقت منکشف بھی ہو چکی ہے کہ صرف ویدانت ہی کے ذریعہ سماجی خواہشات میں روحانیت کا عنصر پیدا کیا جا سکتا ہے۔ میں اس عنوان پر آخر میں گفتگو کروں گا، لہٰذا میں دوسرے بڑے سوال اٹھاتا ہوں جن پر اس ملک کے اندر ہمیں کام کرنا ہے۔

اس مسئلے کے دو پہلو ہیں، صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ آدمی میں روحانیت پیدا کی جائے بلکہ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جن مختلف عناصر سے مل کر ہندوستانی قوم کی تشکیل ہوتی ہے ان میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ مختلف نسلوں کو مدغم کر کے ایک بنانا ہر قوم کی زندگی کا ایک کام ہوا کرتا ہے۔

---





# میرا پیغام

# میرا پیغام

صفحہ

# ہندوستان کا مستقبل

معرفت اور گیان کی جنم بھومی، علم و آگہی کا گہوارہ، مذہب کا منبع مخرج اور روحانیت کا سرچشمہ ہندوستان ہی وہ قدیم و عظیم ملک ہے جہاں سے مذہب، تہذیب اور تمام علوم و فنون دنیا کے دوسرے ممالک میں پہنچے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روحانیت یہاں طبعی صورت میں مجسم ہو گئی ہے۔ یہاں کے دریاؤں میں سمندر کی وسعت اور گہرائی ہے، بے پناہ روحانیت کا ایک سیلاب عظیم ہے جو سمندروں کی طرح متلاطم دریاؤں میں امڈتا چلا آ رہا ہے۔ یہاں کے پہاڑوں میں آسمان کی بلندی اور پہنائی ہے۔ زندۂ جاوید ہمالیہ کی برف پوش چوٹیاں عالم بالا کے پردۂ اسرار سے جھانکتی ہوئی نظر آتی ہیں، یہ ہندوستان ہی کی سرزمین ہے، جو مدتوں دنیا کے عظیم ترین سنتوں، مہاتماؤں اور رشیوں منیوں کے متبرک و مقدس قدموں سے شرف یاب ہوتی آئی ہے۔ یہی وہ ملک ہے جہاں انسانی فطرت اور داخلی دنیا کے بارے میں سب سے پہلے تحقیقات شروع ہوئی۔ یہیں سب سے پہلے اس اصول (سدھانت) نے جنم لیا کہ روح لافانی ہے۔ یہیں تمام عالم کائنات کے مالک اور پروردگار (رب العالمین) کے تصور کی تخلیق ہوئی۔ یہیں شخصی خدا کا یہ تصور غیر شخصی خدا کے تصور میں مبدول ہوا، وہ خدا جو بیک وقت کائنات کے ذرّے ذرّے میں موجود ہے اور فطرت کو محیط بھی کئے ہوئے ہے، جو خود انسان کے اندر بھی موجود ہے اور باہر بھی۔ اس طرح مذہب اور فلسفے کے بلند ترین آدرشوں کی رسائی انتہائی نقطہ معراج تک یہیں ہوتی ہے، یہی وہ سرزمین ہے جہاں سے فلسفہ اور مذہب بار ہا طوفان بن کر اٹھے اور انہوں نے تمام دنیا کو سیراب و شاداب کیا اور ہاں یہی وہ سرزمین ہے جہاں سے روحانیت کی طوفان خیز لہریں پھر اٹھیں گی اور جہاں بلب قوموں کی روحانی تشنگی کو دور کر کے انہیں ایک نئی زندگی بخشیں گی، انحطاط پذیر انسانی نسلوں میں ایک نئی زندگی کا پیام ہندوستان ہی سے ملے گا، یہی وہ ہندوستان ہے

جس نے خود صدیوں تک حوادثِ زمانہ کا مقابلہ کیا ہے۔ یہاں سینکڑوں غیر ملکی جمع ہوئے۔ یہاں آداب و دیانت کے متعدد انقلاب آئے لیکن ان سب باتوں کے باوجود ہندوستان اپنی جگہ چٹانوں کی مضبوطی اور مستقل مزاجی کے ساتھ اب تک قائم اور برقرار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ہستی طبعی (مادی) نہیں بلکہ روحانی ہے۔ اس میں کوئی غیر فانی قوت کام کر رہی ہے۔ اس میں کسی روح کی کارفرمائی ہے جو کبھی کسی صورت سے بھی تباہی اور بربادی کا شکار نہیں ہو سکتی۔ روح کی طرح اس کی زندگی کی بھی کہیں ابتدا ہے نہ انتہا۔ اس کو کبھی فنا نہیں ہے۔ وہ لازوال اور زندہ جاوید مادرِ وطن جس کی اولاد ہونے کا فخر ہمیں حاصل ہے۔

ہندوستان کے سپوتو! آج میں آپ کے سامنے کچھ عملی باتیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ جو میں نے اپنے دیش کی عظمت و شوکت کا ذکر کیا ہے اس سے میرا مقصد صرف یہی ہے کہ آپ کی توجہ ماضی کے اس بنیادی پہلو کی طرف دلاؤں، جس پر حال اور مستقبل کی تعمیر ہوتی ہے۔ مجھے بارہا یہ کہا گیا ہے کہ صرف ماضی کی جانب نظر جمائے رکھنے سے کچھ ہاتھ نہیں آتا بلکہ اکثر اس سے قوموں میں پستی آجاتی ہے۔ اس لئے ہماری نظر تو ہمیشہ مستقبل کی جانب اٹھنی چاہیئے ہمیں آئندہ کی فکر کرنی چاہیئے۔ یہ خیال بالکل بجا ہے لیکن ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ مستقبل کی تعمیر خلا میں نہیں ہوتی، اس لئے جہاں تک نظر کام کرے اپنے ماضی کا معائنہ کیجئے اور اپنایئے۔ اپنی گذشتہ تہذیب کے صاف و شفاف چشموں کا آبِ حیات پی کر تازہ دم ہو جایئے، آگے کی جانب قدم بڑھایئے اور ہندوستان کو پہلے سے بھی زیادہ تابناک عظیم اور بلند بنایئے۔ ہمارے آباد و اجداد کی ہستی نہایت عظیم ہستی تھی، پہلے ہمیں ان کی یاد تازہ کرنا چاہیئے۔ ہمکو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہماری ہستی کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں، ہماری رگوں میں کون سا خون دوڑ رہا ہے، ہم کو اس خون پر اور ان کارناموں پر ناز ہونا چاہیئے جو اس خون کی بدولت انجام پائے ہیں۔ ہمیں اپنے ماضی کی عظمت سے استقلال اور خود اعتمادی حاصل کرنا چاہیئے۔ ایسا ہی کر کے ہم اپنے اس اعتماد اور احساسِ عظمت کی بنیاد پر ہر ایک ایسے ہندوستان کی تعمیر کر پائیں گے جو پہلے سے بھی زیادہ عظیم اور شاندار ہو گا۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے ملک کی تاریخ میں تباہی اور زوال کے بھی متعدد دور گزرے ہیں لیکن میں ان کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ ہم سب کو اس تلخ حقیقت کا علم ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اس نوعیت کے دوروں کا آنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس قسم کے دور ہمیشہ ترقی کا پیش خیمہ ہوتے ہیں، ان سے ایک نئی زندگی جنم پاتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ ایک بڑے بھاری پیڑ سے ایک پکا اور خوبصورت پھل زمین پر گر پڑتا ہے اور اس میں خرابی آجاتی ہے، وہ سڑ جاتا ہے لیکن اسی خرابی سے ایک نئے پیڑ کی جڑ پڑتی ہے اور یہ نیا پیڑ پہلے پیڑ سے بھی زیادہ تناور اور مضبوط ہوتا ہے۔ ہم پستی اور انحطاط کے اس دور سے گزرے ہیں۔ اس کا آنا بھی ضروری تھا۔ اس پستی و انحطاط سے زمانۂ مستقبل کا ہندوستان ابھر رہا ہے۔ یہ وہ زبردست اور تناور پیڑ ہے جس کی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں، جس میں پتیاں بھی آ گئی ہیں۔ ہندوستان کا عظیم الشان دور زبردست مستقبل منصۂ شہود

پر آنے کے لئے بیتاب ہے۔ اسی شاندار کا ذکر مجھے آپ سے کرنا ہے۔

ہندوستان کے مسائل اور دُوسرے تمام ملکوں کے مسائل کے بمقابلہ میں زیادہ پیچیدہ اور اہم ہیں۔ نسل۔ مذہب زبان اور طرزِ حکومت کے مسائل سے کم و بیش ہر قوم کو دو چار ہونا پڑتا ہے یہی وہ عناصر ہیں، جن کے امتزاج سے قوموں کے کردار کی تشکیل ہوتی ہے لیکن جہاں ایک طرف دنیا کی دوسری قوموں کی تاریخ میں یہ چاروں عناصر بیک وقت کم ہی نظر آئیں گے، وہاں دوسری طرف ہندوستان میں یہ چاروں عناصر ہمیشہ بیک وقت موجود رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے مسائل آج بھی زیادہ سے زیادہ پیچیدہ ہے۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اس ملک کی تعمیر میں آریوں، دراوڑوں، تاتاریوں، ترکوں، مغلوں اور یورپینوں نے یکے بعد دیگرے بہت بڑا حصہ لیا ہے جس سے یہاں مختلف زبانوں کا نہایت حیرت انگیز اجتماع ہو گیا۔ یہاں طرزِ رہائش طور طریقے اور قسم قسم کے رواج اور دستور ایک دوسرے سے اس قدر زیادہ مختلف اور جُداگانہ رہے ہیں کہ اتنا اختلاف تو مشرق اور مغرب کی قوموں میں بھی نہیں پایا جاتا ہے مگر ان سب اختلافات کی ایک مشترکہ بنیاد ہے اور وہ ہے ہماری مقدس روایت یعنی مذہب اور رُوحانیت۔ ہمارے ملک کی آئندہ تعمیر اسی مشترکہ بنیاد پر ہو سکتی ہے۔ اس کی ترقی کا اور کوئی طریقہ ہی نہیں ہے۔ یوروپی ممالک میں قومی اتحاد بیشتر سیاسی تصورات پر مشتمل ہوتا ہے لیکن اس کے برعکس ایشیا میں قومی اتحاد اور یکجہتی کی تشکیل مذہبی آدرشوں سے ہوتی ہے۔ اس لئے ہندوستان کا مستقبل تیار کرنے کی پہلی شرط ہے۔ مذہبی یکتائی۔ اس کے بغیر ہماری ترقی محال ہے۔ اس ملک کے طول و عرض میں یکتائی کا ہونا لازمی ہے، اس سے میری یہ مُراد نہیں، کہ سارے ہندوستان میں ہند۔ و دھرم یا عیسائیت یا اسلام کو رائج کر دیا جائے۔ اگر کوئی ایسا کرنا بھی چاہے تو کر نہیں سکتا۔ یہ قطعاً ناممکن ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری مذہبی زندگی کی چند مشترکہ بنیادیں ہیں۔ جن پر ہر مذہبی فرقے کی عمارت کھڑی ہے۔ ان فرقوں کے مطالبہ اور ان کے دعوے باہم دیگر کیسے ہی مختلف کیوں ہوں۔ لیکن ان کے درمیان یہ سارے اختلاف محض سطحی ہیں۔ اصل سب کی ایک ہے۔ بنیادی طور پر ہمارا مذہبی اصول یہی رہا ہے کہ ظاہری اختلاف سے مذہبی زندگی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا بشرطیکہ یہ مذہبی فرقے رُوحانیت اور مذہب کے بنیادی اصولوں سے انحراف نہ کریں۔ ہمارے ملک میں ہر فرقے کو اپنے مخصوص طریقے سے مذہبی اور سماجی زندگی بسر کرنے کی پوری آزادی حاصل ہے۔ اس پر کوئی بھی روک ٹوک اور کوئی پابندی نہیں۔ اس حقیقت سے کون واقف نہیں۔ اس لئے آج ضرورت اس بات کی ہے کہ مذہب کے ان حیات بخش مشترکہ اصولوں کو جو رسم و رواج کے اختلافات کی تہہ میں دب کر رہ گئے ہیں، پھر سے اُبھار کر بلند سطح پر لایا جائے تاکہ اس ملک کے طول و عرض میں ہر مرد عورت اور بچہ ان اصولوں کو سمجھے اور انہیں اپنا کر روزانہ زندگی میں ان پر عمل کرنے کی کوشش کرے۔ اگر ہمیں اپنے ملک کی ترقی اور بہبودی منظور ہے تو ہمیں سب سے پہلے کوئی ایسا قدم اُٹھانا ہوگا جس سے ہماری بنیادی یکجہتی عملی صورت میں ظہور پذیر ہو جائے۔ یقین مانیئے کہ ایشیا میں اور خاص طور پر ہندوستان میں طرح طرح کی یہ

---

میرا پیغام صفحہ ۵

نسلی۔لسانی۔سماجی اور قومی مشکلات، مذہب کی اس متحد کرنے والی طاقت کے آگے ٹھہرنے کی تاب نہیں لا سکیں گی۔ مذہب کی یہ زبردست طاقت ایک ایسی آگ ہے جس کے سامنے تمام مشکلات پگھل کر رہ جاتی ہیں۔ ذرا بھی اس کی آنچ نہیں سہہ سکتیں ہمیں معلوم ہے کہ ایک ہندوستانی کی نگاہ میں مذہبی آدرشوں سے زیادہ بلند اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ہندوستانی زندگی کا ہی بنیادی تصور ہے اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان ترقی کی راہ میں گامزن ہو تو ہمیں مذہب ہی کی قوت محرکہ سے کام لینا ہوگا۔ کامیابی کا راز ہمیشہ ہی رہا ہے کہ ہم دو طریقۂ کار اختیار کریں۔ اس انداز سے کام کریں جس میں مقاومت اور مخالفت کی گنجائش کم سے کم ہو۔ اور چونکہ ہندوستان میں مذہب کا نصب العین ہی سب سے زیادہ بلند نصب العین ہے۔ اس لئے ہندوستان کے معاملے میں تو کام کرنے کی صرف ایک ہی ممکن صورت ہے، اور وہ ہے مذہبی نصب العین۔ کو عمل میں لانا۔ اس وسیلے کو مضبوط کئے بغیر اور کسی بھی دوسرے انداز سے کام کرنا ہمارے حق میں تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔ مستقبل کے ہندوستان کی تعمیر کے لئے بنیادی تختہ ہندی ہی کی ضرورت ہے۔

ماضی کی مضبوط چٹان سے مستقبل کا راستہ کاٹنے کے لئے ہمیں پہلا قدم مذہبی وحدت پر جانا پڑیگا۔ ہمیں یاد رکھنا ہوگا کہ خواہ دویت وادی[1] ہوں، خواہ وششٹ وادی[2] اور خواہ ادویت وادی[3]۔ شیوی ہوں۔ خواہ ولیشنوی خواہ پشوپتی چاہے جس مت سے بھی ہمارا تعلق ہو، سب کے پس پشت کچھ مشترکہ اصول کام کر رہے ہیں اور اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم خود اپنی اور اپنی نسل کی بہبودی کے لئے یہ سب چھوٹے چھوٹے لڑائی جھگڑے ختم کر دیں اور سارے باہمی اختلافات دُور کر دیں۔ یہ لڑائی جھگڑا، یہ فتنہ و فساد تو بالکل بے بنیاد ہے۔ ہماری کُتب مقدسہ میں اس کی بڑی مذمت کی گئی ہے، ہمارے آباؤ اجداد نے اسے ممنوع قرار دیا ہے اور جن عظیم انسانوں کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور جن کا خون ہماری رگوں میں رواں دواں ہے، وہ اپنی اولاد کو ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑتے جھگڑتے دیکھتے ہیں تو ان کو دُکھ ہوتا ہے۔

جس روز آپس کے یہ تمام جھگڑے ختم ہو جائیں گے، ترقی اور اصلاح کی تمام راہیں کھُل جائیں گی۔ اگر ہمارا خون صاف ہو تو کوئی بیماری ہمارے پاس پھٹک نہیں سکتی۔ قومی لحاظ سے ہمارا خون ہماری روحانیت ہے۔ اگر اس خون میں روانی توانائی اور پاکیزگی اور قوت ہوگی تو ہماری قوم کے جسم میں امراض کے جراثیم کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔ اگر ہمارے خون میں صفائی اور پاکیزگی ہے تو ہر قسم کی سیاسی، سماجی اور دُوسری بیماریاں دُور ہو جائیں گی۔ جتنے کہ ملک کا افلاس بھی جاتا رہے گا۔ موجودہ علم الادویہ کے مطابق کسی مرض کے پیدا ہونے کے

---

[1] دویت وادی dualists، یعنی دوئی کے ماننے والے۔ [2] وششٹ ادویت qualified monists، یعنی مشروط وحدت کے ماننے والے۔ [3] ادویت وادی monists، یعنی جو توحید کے قائل ہوں۔

دو سبب ہوتے ہیں۔ اوّلاً خارجی زہریلے جراثیم، دوئم خود جسم کی حالت۔ جب تک جسم میں کوئی ایسی خرابی واقع نہ ہو جائے جس سے جراثیم اس میں داخل ہو سکیں اور جب تک اس میں قوّتِ حیات اتنی کم نہ ہو جائے کہ یہ جراثیم اس میں داخل ہو کر نشو و نما پانے اور تعداد میں بڑھنے لگیں، اس وقت تک دنیا بھر کے ان جراثیم سے جسم میں کوئی بیماری پیدا نہیں ہو سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص کے جسم میں لاکھوں جراثیم برابر داخل ہوتے رہتے ہیں لیکن جس وقت تک جسم میں توانائی رہتی ہے۔ اس کو ان جراثیم کا پتہ بھی نہیں لگتا۔ جراثیم کا غلبہ تو اس حالت میں ہوتا ہے اور ان سے بیماریاں اس حالت میں پیدا ہوتی ہیں۔ جب جسم کمزور ہوتا ہے۔ اس کی قوّت میں کمی آجاتی ہے یہی کلیہ قومی زندگی پر بھی عائد ہوتا ہے جب ہمارا قومی جسم کمزور ہو جاتا ہے۔ اسی وقت مرض پیدا کرنے والے جراثیم قوم کی سیاسی، سماجی، تعلیمی یا ذہنی کیفیت میں نمودار ہو جاتے اور خرابی پیدا کر دیتے ہیں۔ اب اس مرض کے دفعیہ کے لئے ہم کو اس کا بنیادی سبب دُور کرنا اور اس کے خون کو ہر قسم کی کثافتوں سے پاک کرنا ہوگا، ہمیں انسان کو مضبوط بنانا ہوگا۔ اس کے جسم میں توانائی پیدا کرنا ہوگی تاکہ ان تمام خارجی سمّیات کا مقابلہ کرکے انہیں اپنے رگ و ریشہ سے خارج کر سکے۔

جسمانی توانائی ہماری طاقت نہیں بلکہ ہماری قومی زندگی کا راز ہمارے مذہب میں مضمر ہے، مجھے یہاں اس سے بحث نہیں کہ قومی زندگی کی بنیاد روحانیت پر رکھنا کہاں تک درست ہے اور آگے چل کر یہ قومی خصوصیت سود مند بھی ثابت ہوگی یا نہیں۔ لیکن ہمارا قومی کردار بھلا ہے یا بُرا۔ اب تو اس کی تشکیل اس طرح ہو چکی ہے۔ اب تو مذہب ہماری گھُٹی میں پڑ چکا ہے۔ آپ مانیں یا نہ مانیں، میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ اگر ہمیں اپنی قومی زندگی برقرار رکھنا ہے تو مذہب کے بغیر چارہ نہیں۔ اگر ہم مذہب اور رُوحانیّت کو خیر باد کہہ دیں گے تو ہماری قومی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ہمارا وجود پاش پاش ہو کر رہ جائے گا۔ مذہب ہماری نسل کی، ہماری قوم کی جان ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قوم طاقت ور اور مضبوط ہو تو ہمیں اپنے مذہب میں توانائی پیدا کرنا ہوگی اسی مذہبی طاقت کی بدولت آپ ہر سال ہا سال جو حادثات گزرے ہیں، آپ نے ہمّت اور استقلال کے ساتھ ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے۔ مذہب نے آپ کو اپنی جان تک لڑا دینے کی طاقت بخشی اور اس کی اس بے بہا دولت کی آپ نے ہر ممکن طریقے سے نگرانی اور حفاظت کی۔ آپ نے کبھی اس پر اپنی ہر چیز کو قُربان کرنے سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ آج بھی آپ کو یہی طریقہ کار استعمال میں لانا ہے۔ آپ کے آباد اجداد نے ہر مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ انہوں نے کبھی موت کے آگے سر نہیں جھکایا کسی طرح سے بھی اپنے مذہب پر آنچ نہ آنے دی۔ غیر ملکی حملہ آوروں نے پے در پے نجانے کتنے مندر توڑے لیکن جونہی یہ رو ختم ہوئی۔ مندروں کے کلس پھر بلند ہو گئے۔ جنوبی ہندوستان کے پرانے مندروں یا گجرات کے سومناتھ جی کے مندر کو لے لیجئے۔ ان

مندروں میں ہمارے قومی کردار کا عکس موجود ہے۔ ان کو دیکھ کر جو شوکت حاصل ہوتی ہے، وہ کتابیں پڑھ لینے سے حاصل نہیں ہوتی۔ یہ مندر ہماری قومی تاریخ کا خزانہ ہیں۔ ان مندروں پر سینکڑوں بار حملے ہوئے لیکن ہر بار انہیں دوبارہ زندگی حاصل ہوگئی۔ ان کی مسلسل شکست و ریخت بھی ہوئی اور مسلسل ان کے کھنڈروں کی از سرِ نو تعمیر بھی ہوئی۔ ان میں ہمیشہ کی طرح ایک نئی زندگی پیدا ہوگئی۔ ہر بار ان میں ایک تازہ توانائی آگئی۔ یہ ہے ہمارے دماغ کا جھکاؤ۔ یہ ہے ہماری قومی زندگی کے بہاؤ کی صورت، آپ اگر چاہیں بھی تو اس کے خلاف نہیں جا سکتے۔ قومی زندگی کے اس متلاطم دریا کی لہروں کے ساتھ ساتھ تیرنا سیکھئے، اسی میں آپ کی شان ہے۔ شوکت ہے۔ اگر آپ زندگی کے اس دھارے کے باہر قدم رکھیں گے تو ماہی بے آب کی طرح سسک سسک جان دے دیں گے۔ مر جائیں گے۔ کوئی بھی قوم اپنی خاص روش کو چھوڑ کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مذہب اور روحانیت کے علاوہ دوسری باتیں ضروری نہیں، میرا یہ بھی مدعا نہیں کہ سیاسی یا سماجی اصلاحوں کی ضرورت نہیں۔ میرے کہنے کا منشا تو صرف یہ ہے اور میں صرف یہ نکتہ آپ کے ذہن نشین کر دینا چاہتا ہوں، کہ مذہب کی ہمیں سب سے پہلے ضرورت ہے اور دوسری چیزوں کی بعد میں۔ دوسری چیزوں کی اہمیت ثانوی ہے۔ ایک ہندوستانی دماغ پہلے مذہبی ہوتا ہے۔ اس کے بعد اور کچھ ہوتا ہے۔ اس کی اس ذہنیت کو تقویت دینا چاہیئے۔ آج میں آپ کو بتاؤں گا کہ میرے خیال میں قومی زندگی میں روحانیت کو تقویت دینے کا طریق کار کیا ہے۔ جو خیالات آج میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں، وہ میرے دماغ پر مسلط ہیں۔ امریکہ جانے سے بہت پہلے ہی قوم کو مضبوط اور توانا بنانے کے خیالات مجھے گھیرے رہتے تھے۔ میں امریکہ گیا، میں انگلستان گیا۔ وہاں بھی یہی خیالات میرے ساتھ رہے بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ میرے وہاں جانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ ان خیالات کی اشاعت کی جائے۔ پارلیمنٹ آف ریلیجنز[1] (مجلسِ مذاہب) میں شرکت کا موقع تو اتفاق سے حاصل ہو گیا۔ ہاں تو قومی تقویت کے لئے جو بات میں سب سے ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ علم معرفت کے ان جواہر پاروں کو عوام تک پہنچایا جائے یا تو یہ جواہر پارے ہماری دینی کتابوں کے خزانوں میں بکھرے پڑے ہیں یا کچھ ایسے بزرگوں کے قبضے میں ہیں، جنہوں نے ترک دنیا کر کے خانقاہوں اور جنگلوں میں مراقبت اختیار کر لی ہے۔ میں ان تارک الدنیا عارفوں سے یہ دولت حاصل کر کے اسے لٹا دینا چاہتا ہوں۔ ان متبرک کتابوں سے روحانیت کے ان جواہر پاروں کو برآمد کرنا چاہتا ہوں۔ ان متبرک کتابوں کا یہ خزانہ بہت حد تک ہماری دسترس سے باہر ہے۔ کیونکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہماری قوم خود اس زبان سے بیشتر ناواقف ہے جس میں یہ خزانہ ابھی تک محفوظ ہے۔ دوسرے سنسکرت زبان کے دامن پر صدیوں کی گرد تہہ بہ تہہ کچھ اس طرح جمی ہوئی ہے کہ بعض اوقات صحیح معنی سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے لیکن ان مشکلات کے

---

[1] Parliament of Religions

باوجود میں چاہتا ہوں کہ ہر فرد کو ان بلند اور اعلےٰ صداقتوں سے واقف کر دوں۔ ان جان بخش خیالات کو لوگوں تک خود انہیں کی زبان میں پہنچانا ہوگا، میں جانتا ہوں کہ اس مقصد میں پوری کامیابی حاصل ہونا ممکن نہیں۔ کیونکہ سنسکرت ایسی جلیل القدر اور ممتاز زبان کی جگہ اور کونسی زبان لے سکتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اپنے روحانی ورثہ کو پانے کے لئے سنسکرت کا جاننا ضروری ہے۔ سنسکرت کے الفاظ اور لہجے میں بذات خود ایک خاص قوت توانائی اور عظمت ہے جس کی وجہ سے کوئی دوسری زبان کا عالم بنانا ہوگا۔ لیکن اس کام میں کافی وقت لگے گا۔ یہ کام کتنا مشکل ہے، اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ اگرچہ میں نے تمام عمر سنسکرت زبان کا مطالعہ کیا ہے لیکن اس کے باوجود میں یہ دعوےٰ نہیں کر سکتا کہ میرے لئے اس زبان میں کوئی ایسی چیز باقی نہیں ہے جو نئی ہو۔ اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ جب تک سنسکرت کو دوبارہ عروج حاصل نہیں ہوتا، اس وقت تک لوگوں میں ان کی اپنی زبان میں روحانیت اور مذہب کی دولت پہنچائی جائے۔ بھگوان سری رامانج آچاریہ، سری چیتنیہ مہاپربھو اور مہاتما کبیر نے اسی طریقے کو عمل میں لاکر ہندوستان کے ادنےٰ طبقہ کو اوپر اٹھانے میں کامیابی حاصل کی۔ ان بزرگوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنی کوششوں کو بار آور ہوتے ہوئے دیکھا۔ ہمیں آج بھی یہی طریقہ کام میں لانا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس غلطی سے بچنا بھی ہے جس کی وجہ سے ان بزرگوں کی تعلیمات کا اثر ان کے گزر جانے کے بعد ہی ایک صدی کے اندر اندر زائل ہو گیا اور وہ غلطی یہ تھی کہ ان بزرگوں نے سنسکرت زبان کی تعلیم پر زور نہیں دیا۔ ان مہاتماؤں نے ادنےٰ طبقوں کے لوگوں کو اوپر ضرور اٹھایا لیکن وہ سنسکرت کے جلال سے محروم رہے اور بلندیوں پر قدم نہ جما سکے۔ یہی غلطی ہزاروں سال پہلے بھگوان بدھ سے بھی ہوئی تھی۔ انہوں نے بھی عوام کو سنسکرت زبان کی تعلیم دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔ فوری نتائج حاصل کرنے کی غرض سے انہوں نے روحانی خیالات کا اظہار اس زمانے کی رائج الوقت زبان پالی میں کیا۔ انہوں نے عوام کو خود ان کی زبان میں تعلیم دی اور عوام نے بھی ان کو سمجھا یہ بجائے خود ایک معرکہ آرا کام تھا۔ اس کی وجہ سے ان کے خیالات کی اشاعت بہت جلد ہو گئی۔ دور دور تک لوگوں کے کانوں میں ان کی آواز پہنچی لیکن میرا خیال ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ سنسکرت زبان کی تعلیم بھی جاری رہنا چاہیئے تھی۔ ایسا نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کو علم تو حاصل ہوا لیکن ان عظمت اور وقار سے محرومی رہی۔ یہی وہی بنیادی کمزوری تھی، جس کی وجہ سے بدھ مت اپنی جنم بھومی سے تقریباً بالکل ہٹ گیا۔ حادثات زمانہ کا مقابلہ محض معلومات سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے اس ثقافت کی ضرورت ہوتی ہے جو کسی قوم کی رگ و پے میں سرایت کر گئی ہو۔ زمانہ حال میں بھی ہمیں ایسی اقوام کا حال معلوم ہے۔ جن میں علم کی دولت کا کوئی ٹھکانہ نہیں لیکن محض ایک ثقافت سے محروم ہونے کے باعث یہ قومیں درندہ خصلت نظر آتی ہیں، وحشی ہیں۔ علم تو تہذیب کی

طرح ایک سطحی چیز ہے ۔اس کی تہہ میں اوائل ارتقا کی وحشیانہ فطرت بدستور موجود ہوتی ہے ۔علم اور تہذیب کا پول تو آئے دن کھلتا رہتا ہے ، ہمیں اس خطرہ سے بچنا ہوگا ۔عوام الناس کو ان کی اپنی مادری زبان میں تعلیم تو دی جا سکتی ہے ۔ان کو نئے نئے خیالات بھی بہم پہنچائے جا سکتے ہیں اور ان کی معلومات میں بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے لیکن جب تک ان کو ثقافت کی دولت میسر نہیں آتی ۔ان کی بہتر حالت زیادہ مدت تک قائم نہیں رہ سکتی ۔ثقافت کے وقار اور سنسکرت کے جلال کا سہارا نہ پاکر آہستہ آہستہ اس مقام سے گرنے لگتے ہیں ۔جہاں ان کے روحانی رہبروں نے اپنی طاقت سے ان کو پہنچا دیا تھا ۔درحقیقت ہوتا یہ ہے کہ کچھ عرصے بعد ان لوگوں کا صرف نام باقی رہ جاتا ہے اور ان کے پیرو مختلف فرقوں میں بٹ جاتے ہیں ۔اس سے سنسکرت جاننے والے لوگ ان پر غالب بھی آجاتے ہیں اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ جن لوگوں کو عام طور پر نیچی ذات کا کہا جاتا ہے ، ان کی ترقی کا واحد طریقہ یہ ہے کہ وہ سنسکرت پڑھیں ۔اونچی ذات والوں سے لڑنا جھگڑنا ، ان کے خلاف قلم اٹھانا اور تُف رو وہاں ہونا بالکل بے معنی ہے ۔اس سے کچھ حاصل نہیں ، اس سے فتنہ اور فساد اور بڑھتا ہے اور یہ قوم جس کے بیشمار ٹکڑے مختلف فرقوں کی صورت میں ہو چکے ہیں ، اور بھی زیادہ سے زیادہ منتشر ہوتی چلی جائے گی اور ، اس طرح اس میں نہ جانے کتنے اور فرقوں کا اضافہ ہو جائے گا ۔نیچی ذات والوں کو اوپر اٹھانے کے لئے ان میں وہی ثقافت اور شائستگی پیدا کرنا ہوگی ۔انہیں وہی تعلیم دینا ہوگی جو اونچی ذات والوں کے حصے میں آئی ہے اور جس کی بنا پر ان کو ہر قسم کی طاقت مہیا ہوتی ہے ۔اگر آپ ایسا کریں گے تو آپ کا ذاتی منشا پورا ہو جائے گا ۔

قوم کے انتشار کی بات چل پڑی ہے ، تو میں اس خاص مسئلے کا بھی ذکر کر دوں ، جس کا تعلق صرف مدراس سے ہے ۔یہ مسئلہ ہے دراوڑوں اور آریوں کا کئی حضرات کہتے ہیں کہ جنوبی ہندوستان میں دراوڑ نام کی ایک نسل تھی جو بہت باتوں میں شمالی ہندوستان کی آریہ نسل سے مختلف تھی ۔اس نظریہ کے مطابق جنوبی ہند میں یہ جو تھوڑے بہت براہمن نظر آتے ہیں ۔ان کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے ، وہ شمالی ہند سے آئے ہوئے ہیں اور ان کا تعلق آریہ نسل سے ہے ۔جنوبی ہند کے دوسرے تمام باشندوں کا تعلق دراوڑ نسل سے ہے ، جو وہاں کے براہمنوں سے ذرا بھی ملتی جلتی نہیں علم اللہ کے عالم تھے ۔معاف کریں یہ نظریہ بالکل بے بنیاد ہے ۔آخر اس کا ثبوت اس کے سوا اور کیا ہے کہ شمالی اور جنوبی ہند کے درمیان زبان کا فرق ہے ۔مجھے تو اس کے علاوہ اور کوئی فرق نظر نہیں آتا ۔اس مجمع میں شمالی ہند کے اکثر اشخاص بیٹھے ہیں لیکن میرے یورپی دوست جو یہاں موجود ہیں ۔اگر شمالی اور جنوبی ہند کے باشندوں کو الگ کر دکھائیں تو یہ معلوم ہو جائے گا کہ ان کے درمیان کوئی فرق ہے یا نہیں ، اگر کوئی فرق ہے تو بس وہی زبان کا ہے اس بنا پر یہ کہنا کہاں تک صحیح ہوگا کہ براہمنوں کا تعلق ایک نسل سے ہے جو جنوبی ہند میں آئی تھی اور جس کی زبان سنسکرت تھی ۔باقی جو لوگ ہیں ، وہ دراوڑ قوم کے ہیں ۔اگر آریہ براہمنوں نے یہاں آکر دراوڑ بھاشا سیکھ لی اور اپنی سنسکرت زبان

بھول گئے تو دُوسری ذات والوں نے بھی ایسا ہی کیا ہوگا۔ دُوسری ذات والے بھی یکے بعد دیگرے شمالی ہند سے جنوبی ہند میں آئے ہوں گے انہوں نے بھی دراوڑ بھاشا سیکھ لی ہوگی اور خود اپنی بھاشا بھول گئے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ اگر جنوبی ہندوستان کے براہمن آریہ ہیں تو غیر براہمن بھی آریہ ہو سکتے ہیں۔ برعکس اس کے اگر غیر براہمن دراوڑ قوم سے تعلق رکھتے ہیں تو براہمن بھی اسی نسل سے ہو سکتے ہیں۔ اس قسم کی دلیلیں دو رُخی ہوتی ہیں۔ بہرحال ان کے بے سود اور بے معنی ہونے میں کوئی شک نہیں، ان باتوں پر یقین نہ لایئے۔ جنوبی ہند میں کوئی دراوڑ نسل پہلے ضرور رہتی ہوگی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام و نشان مِٹ گیا۔ جو کچھ تھوڑے سے دراوڑ باقی رہ گئے۔ وہ جنگلوں وغیرہ میں آباد ہو گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ شمالی ہند سے آئے، وہ آرین نسل سے تعلق رکھتے تھے اور یہی لوگ رفتہ رفتہ سارے ہندوستان میں پھیل گئے۔ اِسی لئے تمام ہندوستانی نسل آریہ ہے، اس کے سوا اور کوئی نسل آباد نہیں۔ اگر جنوبی ہندوستان میں جا کر ان آریوں نے وہاں کی زبان سیکھ لی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی اَور نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں ایک اور غلط العام خیال کا ذکر کرنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو آج ہم شودر کہتے ہیں، وہ تو یقینی طور پر اس ملک کے اصلی ابتدائی باشندے ہوں گے، وہ آریہ نہیں ہو سکتے۔ اس نظریے کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ ان لوگوں کا درجہ غلاموں کا ہے اور اکثر فاتح قومیں مفتوح ملکوں کے اصلی باشندوں کو غلام بنا لیتی ہیں۔ مثال کے طور پر اس نظریے کے حامی کہتے ہیں کہ امریکن، انگریز، ڈچ اور پرتگالی لوگ جب افریقہ والوں پر غالب آ گئے تو انہوں نے افریقہ والوں کو کم و بیش اپنا اپنا غلام بنا لیا اور ان سے سخت سے سخت کام لیا۔ یہ حالت نسل در نسل چلتی رہی۔ اس مثال کے پیشِ نظر یہ کہا جاتا ہے کہ ہزاروں سال پہلے بھی ہندوستان میں کچھ ہُوا ہوگا۔ یعنی فاتح آریوں نے یہاں کے اصلی باشندوں کو غلام بنا لیا ہوگا اور یہی لوگ بعد میں شُودر کہلائے ہوں گے۔ میری نگاہ میں اس طرح کے نظریوں کی وقعت قیاس آرائی سے زیادہ نہیں۔ پہلے تو یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ ہر فاتح قوم کا کردار یکساں ہوتا ہے یعنی آج سے ہزاروں سال پہلے آریہ لوگ وہی کچھ کرنے پر مجبور تھے جو بعد میں یورپین لوگوں نے کیا۔ دوسرے یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ آریہ لوگ ہندوستان کے باہر سے آئے اور بہت بڑی حد تک یہاں کے باشندوں کو تباہ و برباد کر کے ملک پر قابض ہو گئے لیکن اس باب میں بھی آثارِ قدیمہ کے ماہروں کی آرا جُدا جُدا ہیں۔ کسی کا خیال ہے کہ ہندوستان کسی زمانے میں بھوری آنکھ والے آدی واسیوں (ابتدائی باشندوں) سے آباد تھا اور چمکتے ہوئے چہروں والے ذہین آریہ لوگ کہیں اور سے آئے۔ بعضوں کی رائے ہے کہ یہ لوگ تبت وسطیٰ سے یہاں آئے اور کچھ کہتے ہیں کہ یہ لوگ وسط ایشیا سے آئے۔ بعض وطن پرست انگریز ایسے بھی ہیں، جن کے خیال میں آریوں کے بال سُرخ ہوتے تھے بعض اہلِ الرائے کہتے ہیں کہ ان کے بالوں کا رنگ سیاہ تھا۔ حال ہی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ آریہ لوگ

سوئیٹزرلینڈ کی جھیلوں کے کنارے آباد تھے بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ آریہ شمالی قطب میں آباد تھے ۔
اب یہ آپ کے سوچنے کی بات ہے کہ ان میں سے کون سی بات سچ ہے ۔ ان سب باتوں میں اتنی ہی صداقت ہے جتنی میرے اس کہنے میں ہے کہ یہ سب اہلِ قلم کی ذاتی خیال آرائیاں ہیں کسی مصنف کے بال سیاہ ہوئے تو اس نے لکھ دیا کہ آریہ لوگوں کے بال سیاہ تھے اور اگر کسی مصنف کے بال سُرخ تھے تو اس نے آریوں کے بال سرخ قرار دے دیئے ۔ باقی رہا آریوں کے ہندوستان کے باہر سے آنے کا سوال تو اس کے متعلق ہمارے ہاں کوئی ثبوت نہیں ملتا ۔ ہمارے مذہبی گرنتھوں میں تو اس قسم کا کوئی ذکر ہے ہی نہیں ، جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ آریہ نسل والے کہیں باہر سے ہندوستان آئے ۔ اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ قدیم زمانے میں افغانستان بھی ہندوستان میں شامل تھا ۔ اس کا ایک حصّہ تھا ۔ یہ نظریہ کہ شودر لوگ غیر آریہ تھے اور ان کی تعداد بہت زیادہ تھی ۔ غیر منطقی اور معقولیت سے بعید ہے ۔ یہاں آ کر مُٹھی بھر آریوں کا آباد ہو جانا اور ان کا لاکھوں غلاموں کا مالک بن کر رہنا اس زمانے میں قطعی طور پر ممکن نہ تھا ، اگر ایسا ہوتا تو یہ غلام پانچ منٹ میں آریوں کی چٹنی بنا کر رکھ دیتے ۔ اس تمام معاملے کی صحیح وضاحت اگر کہیں ملتی ہے تو مہا بھارت میں ملتی ہے ۔ مہا بھارت میں درج ہے کہ شروع شروع میں جب ست جُگ کا دَور دورہ تھا تو ہندوستان میں صرف ایک نسل براہمنوں کی آباد تھی اور بعد میں پیشوں کے اعتبار سے ان میں مختلف فرقے پیدا ہوتے چلے گئے ۔ یہی وضاحت صحیح بھی ہے اور عقل کی رُو سے قابلِ قبول بھی ۔ ظاہر ہے کہ آریہ اور غیر آریہ کے فرق کی کوئی بنیاد ہی نہیں ۔ ہماری کتابوں میں تو لکھا ہے کہ ست جُگ پھر آئے گا اور یہ سب فرقے سب ایک ہو کر اپنی پہلی حالت میں پہنچ جائیں گے یعنی یہ سب تفرقات مٹ جائیں گے ۔

اس لئے ہندوستان میں ذات پات کے جھگڑے کا حل یہ نہیں ہے کہ اُونچی ذات والوں کو نیچی ذات والوں کی سطح تک لایا جائے ۔ ہماری مشکل براہمنوں کو مٹا دینے سے دُور نہیں ہو سکتی جیسا کہ شری شنکر آچاریہ کے اپنے بھاشیہ کے شروع شروع میں لکھا ہے ، ہندوستان میں براہمن کے معنی ہیں آدرش انسان ، مردِ کامل ، انسانیت کے آدرش کو مٹا کر ہمارے پاس باقی ہی کیا رہ جائے گا ، دراصل مٹایا ہی نہیں جا سکتا ، بھلا بھگوان اسے مٹنے ہی کب دیں گے ۔ بھگوان کرشن نے یہ اعلان فرمایا تھا کہ وہ براہمنوں کے تحفظ کی خاطر اوتار لیتے ہیں ۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ بھگوان خود انسانیت کے آدرش کی حفاظت کرتے ہیں ۔ یہی عظیم مقصد خود بھگوان کرشن کے پیشِ نظر تھا ۔ براہمن حقیقت میں اُس شخص کو کہتے ہیں جس کو برہم گیان حاصل ہو ، جو معرفتِ الٰہی میں کامل ہو ، جو ایک آدرش ایک مکمل انسان ہو ، اس کو دنیا میں ہمیشہ قائم رہنا ہے ، اس کو معدوم نہیں ہونا ہے ۔ مانا کہ ذات پات کے اس دستور میں بہت سی خرابیاں واقع ہو گئی ہیں ۔ اس کے باوجود اس بات کا فخر صرف برہمنوں ہی کو

حاصل ہے کہ دوسری ذات کے لوگوں کے بمقابلہ اس ذات سے ایسے بزرگ زیادہ پیدا ہوئے ہیں جو اصلی معنوں میں براہمن تھے، یہ آدرش انسان تھے، دوسری ذات والوں کو اس بات کا اعتراف کرنا ہوگا اور انہیں براہمنوں کی خدمت میں خراجِ تحسین ادا کرنا ہوگا کہ انہوں نے کامل انسان کے نصب العین کی علمبرداری کی، اور وہ اس نصب العین کو بارہا عملاً مجسم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ براہمنوں میں جو نقائص پیدا ہوگئے، جو خرابیاں آگئیں، ان کو کسی نہ کسی طریقے سے نظر انداز کر دیا جائے۔ آپ بڑی خوشی سے ان سب نقائص کا ذکر کیجئے، لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنی فراخدلی کا بھی ثبوت اس طرح دیجئے جس سے کہ براہمنوں کی مخصوص خوبیوں کے اعتراف کا پہلو پیدا ہو۔ اگر ان کی خامیوں کے خلاف کچھ کہنا ہے، ان کی مذمت کرنا ہے تو ضرور کیجئے۔ لیکن ان کے کمال کی تعریف بھی تو کیجئے۔ انگریزی زبان کا یہ پرانا قول یاد رکھیئے "جس چیز پر کسی کا حق ہے وہ اسے ضرور ملنا چاہیئے۔ اس سے آپ کے خیالات کا توازن بگڑنے سے بچ جائے گا۔"

میرے دوستو! مختلف ذاتوں کا یہ آپس میں لڑنا جھگڑنا بالکل بے سود ہے، قطعاً بے معنی ہے آخر اس سے کیا فائدہ پہنچے گا۔ اس سے تو تفرقات اور بڑھ جائیں گے۔ ہم اور زیادہ منقسم ہو جائیں گے۔ اس سے ہم میں اور بھی زیادہ گراوٹ آجائے گی۔ یہ نہ بھولئے کہ اونچی ذات والوں کے لئے خاص مراعات اور خاص حقوق کا زمانہ ہمیشہ کے لئے سرزمین ہندوستان سے رخصت ہو چکا ہے اور یہ برکت انگریزوں کے راج سے حاصل ہوئی ہے۔ انگریزوں سے پہلے مسلمانوں کی حکومت میں بھی اونچی ذات والوں کی مراعات خصوصی کا پرانا دستور ختم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اسلام کے نظریہ مساوات کے سامنے حقوق خصوصی کا دستور ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ ہندوستان پر مسلمانوں کی فتحیابی سے پسماندہ لوگوں کو سماجی بندھنوں سے نجات ملنے کی ایک راہ مل گئی۔ ہماری آبادی کا پانچواں حصہ مسلمان ہو گیا۔ ان لوگوں کو محض تلوار ہی کے زور سے مسلمان نہیں بنایا گیا۔ ایسا سمجھنا حماقت اور تعصب کی نشانی ہے۔ بیشتر اشخاص نے اپنا سماجی درجہ بلند کرنے کی غرض سے اسلام قبول کیا اور اسی وجہ سے اسی زمانے میں بھی لوگ عیسائی بنتے چلے جا رہے ہیں۔ اگر آپ لوگوں نے احتیاط اور خبرداری سے کام نہ لیا تو آپ کے دیکھتے دیکھتے یہاں کی آبادی کا پانچواں نہیں بلکہ نصف حصہ تک عیسائی مذہب قبول کرلے گا میں نے مالابار میں جو کچھ دیکھا اس سے زیادہ احمقانہ بات دنیا کے پردے پر اور کہیں نظر نہ آئے گی۔ مالابار میں ایک غریب اور بے چارہ پاریا[1] (اچھوت) اس گلی میں قدم بھی رکھنے کا اہل نہیں جس میں سے ہو کر ایک اونچی ذات والا گزرتا ہے۔ لیکن اگر وہی پاریا اگرام ٹگرام کوئی انگریزی نام رکھ لیتا ہے یا مسلمانی نام اختیار کر لیتا ہے تو پھر اس میں کوئی خرابی نہیں رہتی اور وہ سینہ تان کر اونچی ذات والوں کے سامنے گزرتا ہے، اس سے آپ اس کے سوا اور کیا نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ان مالاباریوں کی عقل ٹھکانے نہیں رہی۔ کم از کم مجھے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ پاگل ہو گئے ہیں۔ ان لوگوں کا تو علاج ہی یہ ہے کہ ان کے

---

[1] ح

ساتھ وہی سلوک کیا جائے جو پاگلوں سے کیا جاتا ہے تاکہ ان کے ہوش ٹھکانے لگیں، جب تک یہ لوگ اپنا طرزِ عمل نہیں بدلیں گے ہندوستان میں رہنے والی اور تمام قومیں ان کو تضحیک و تمسخر کا نشانہ بناتی رہیں گی اور رہنا بھی ایسا ہی چاہیئے۔ لعنت ہے ان لوگوں پر جو اس قدر شر انگیز اور ابلہانہ دستوروں کو گوارا کرتے ہیں جو اپنے ہی ہم مذہب بھائیوں پر ہر طرح کا ظلم روا رکھتے ہیں، انہیں نیچ سمجھتے ہیں، انہیں کھانے پینے کو نہیں دیتے۔ لیکن جونہی یہ غریب کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لیتے ہیں پھر ان کا شمار نیچ ذاتوں میں نہیں ہوتا، پھر وہ اچھوت نہیں رہتے، ان کی پرورش و پرداخت بہت اچھی طرح ہونے لگتی ہے۔ کیا اس سے زیادہ لغو اور شرمناک کوئی اور بات ہو سکتی ہے۔ میرے بھائیو، اب بھی سنبھل جاؤ اور اس اونچ نیچ کی تمیز کو مٹا ڈالو۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جو اونچی ذات والے ہیں ان کو پست کیا جائے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نیچی ذات والوں کو اوپر اٹھایا جائے اور اسی طرزِ عمل کی ہدایت ہمارے گرنتھوں میں بھی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہمارے یہاں کئی ایسے اشخاص بھی ہیں جو نہ خود اپنے گرنتھوں کے معنی و مطلب سمجھ سکتے ہیں اور نہ اپنے قدیم بزرگوں کے لائحہ عمل ہی کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ بہت سی بے معنی باتیں کرتے ہیں لیکن جن لوگوں کے پاس دماغ ہے اور جن میں ان بزرگوں کے کارناموں کے امکانات کلی کو ذہن نشین کرنے کی صلاحیت ہے، وہ قومی زندگی کے رجحانات کو خوب سمجھتے ہیں اور وہ دیکھتے ہیں کہ ہماری قومی زندگی کا کارواں صدیوں سے اپنی مخصوص راہ پر چلا آرہا ہے۔ وہ اس راز سے واقف ہیں، وہ اپنی منزل سے بھی آگاہ ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ہماری قومی ارتقا اسی راہ کے اختیار کرنے سے ہو سکتی ہے اور یہ راہ ہے۔ نیچ سے نیچ آدمی کو آدرش براہمن کے مرتبے تک لے جانے کی راہ۔ ایسے لوگ ماضی اور حال کی کتابوں کا غلط مطلب نہیں نکالتے۔ ان کی نظر ہمیشہ حقیقت پر ہوتی ہے۔ ان کے ہاتھ صحیح عمل کے لئے بیزار رہتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ہمارا لائحہ عمل کیا ہے۔ ہمارا بلند ترین آدرش ہے۔ براہمن یعنی مردِ کامل بننے کا آدرش اور اس کے خلاف انسانیت کا سب سے گرا ہوا نمونہ چنڈال، اچھوت، ہمارا کام تو بس یہی ہے کہ چنڈال کو ترقی دے کر براہمن کے درجے تک پہنچایا جائے۔ امتدادِ زمانہ سے براہمنوں کے مخصوص فرائض، حقوق اور مراعات کی صورت میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ مثلاً ویدوں کا پڑھنا پڑھانا براہمنوں کا فرض تھا۔ جب اس نے خود غرضی کا لبادہ پہن لیا تو اس کی یہ صورت ہو گئی کہ براہمنوں اور ان کے اونچی ذات والے شاگردوں کے علاوہ اور کسی کو ویدوں کے پڑھنے کا حق نہیں رہا۔ خصوصاً غریب شودروں کے لئے تو یہاں تک کہہ دیا گیا کہ اگر وہ وید سُن لیں تو ان کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ بھر دو، اور اگر اس کو وید کی ایک سطر بھی یاد ہو جائے تو اس کی زبان کاٹ لو۔ اب آپ ہی سوچئے کہ خود غرضی کی اس سے بڑھ کر شیطانی اور وحشیانہ صورت اور کیا ہو سکتی ہے؟

اگر ایسی باتیں پُرانے شاستروں میں ملتی ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہمارے مذہب کا جزو ہیں یا یہ کہ وہ جائز اور درست ہیں۔ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ شاستر کاروں نے اس زمانے کے کسی خاص مذہبی فرقے کے دستوروں اور رواجوں کو قلمبند کر دیا ہے۔ قریب قریب ہر زمانے اور ہر ملک میں شیطان صفت انسان پیدا ہوتے آئے ہیں۔ ہمارے ملک میں جن لوگوں نے اس قسم کے دستور روا رکھے وہ اسی قسم کے لوگ تھے لیکن آپ جانتے ہیں کہ بعد میں ان کا لہجہ کسی قدر بدل گیا اور وہ کہنے لگے "شودروں کو مت چھیڑو لیکن ان کو بلند اصولوں کی تعلیم نہ دو، اونچی باتیں نہ بتاؤ۔ اس سے اور آگے چل کر ہدایت کی گئی ہے کہ اگر شودر لوگ براہمنوں کے آداب اور اخلاق اور دستوروں کی تقلید کریں تو بہت اچھی بات ہے، ان کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیئے، اور اس طرح درجہ بدرجہ خیالات میں وسعت آتی گئی میرے پاس زیادہ وقت نہیں ورنہ میں آپ کو تفصیل سے بتاتا کہ کس طرح آہستہ آہستہ ہمارا یہ آدرش بن گیا کہ سب ذاتوں کو بتدریج براہمنوں کے مقام پر پہنچنا ہے اور یہ آدرش محض ذہنوں میں محفوظ نہیں رہا۔ بسا اوقات عملی طور پر ایسا ہوا بھی ہے کہ گروہ کے گروہ براہمنوں میں شامل ہو گئے۔ اگر کسی خاص ذات کے لوگ براہمن ہونے کا دعوے کریں اور اپنے آپ کو براہمن کہنے لگیں تو انہیں ایسا کرنے سے کون روک سکتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں دیکھا ہے کہ جب کسی ذات یا گروہ کو طاقت حاصل ہو جاتی ہے تو پھر سماج اس ذات یا گروہ کو اعلےٰ درجہ دینے سے انکار نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے آپ کو کھشتری کہیں یا براہمن۔ دنیا ان کو ویسا ہی مان لیتی ہے۔ ذاتوں کے بدلنے کی ایک صورت اور بھی ہے عموماً یہ مختلف ذاتیں، یہ تمام فرقے اپنے آپ میں مست رہتے تھے۔ ایک دوسرے کے معاملات میں دخل اور معقولات سے کام نہیں لیتے تھے۔ اس لئے اگر کوئی فرقہ متفق ہو کر اپنے آپ کو براہمن کہنے لگتا تو دوسرے لوگ بھی اس کو براہمن ہی کہنے لگتے۔ ذاتوں کے معاملوں میں تیسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ ہمارے بڑے بڑے رشیوں منیوں اور مذہبی رہنماؤں نے جن کو چاہا اونچی ذات کا مرتبہ بخش دیا۔ مثلاً یہ امر واقعہ ہے کہ ان بزرگوں نے بلوچیوں کے ایک گروہ کو کھشتری کا لقب دے کر اس ذات میں شامل کر لیا اور ماہی گیروں کے ایک گروہ کو براہمن قرار دے کر انہیں شودر سے براہمن بنا ڈالا اور اس طرح یہ ثابت کر دیا کہ ذات پات کے دستور کی کوئی قدت نہیں اگر ہمارے بزرگ ہمارے رشی منی یہ سب کچھ کر سکتے تھے تو ہمارے لئے ذات پات میں کچھ مشکل نہیں ہونا چاہیئے۔ آخر ہم بھی انہیں بزرگوں کے پیرو ہیں۔ ہم انہیں جھکاتے ہیں۔ آیئے، ہم ان کے نقشِ قدم پر چلیں، ہم خود بھی رشی بن جائیں کرنے کا یہی ایک راز ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، ہم سب رشی بن جائیں۔ یہ مراد ہے وہ ہستی جو پاکیزہ ہو۔ پہلے آپ پاکیزہ بن جایئے۔ پھر آپ کو ہر قسم

خود کو رشی کہہ دینے سے کوئی رشی نہیں ہو جاتا۔ لیکن جب آپ کو رشی کا درجہ حاصل ہو جائے گا۔ اس وقت دوسرے اشخاص خود بخود آپ کے احکام بجا لائیں گے، آپ کے سامنے سر اطاعت خم کریں گے۔ اگر آپ کو رشی کا درجہ حاصل ہو جائے تو آپ کی ذات سے ایک ایسی پُراسرار طاقت پذیر ہونے لگے گی کہ لوگ آپ کی پیروی کرنے لگیں گے۔ آپ کی بات سُننے پر مجبور ہو جائیں گے اور اپنی مرضی کے خلاف بھی شعوری طور پر آپ کے احکام کی تعمیل کرنے لگیں گے، یہ ہے وہ رشی کا درجہ جس تک ہم سب کو پہنچنا چاہتے ہیں۔ ذات پات کا رُوحانی ارتقا کے اس مقام سے کوئی تعلق نہیں۔ ان مصنوعی تفرقات کو تو مٹنا ہی ہوگا مگر یہ کام کئی نسلوں میں جا کر پُورا ہوگا۔ البتہ آج ہم اتنا ضرور کر سکتے ہیں کہ ان تمام جھگڑوں کو ختم کرنے کا تہیّہ کر لیں اور یہی مشورہ دینے کے لئے مَیں آپ کے سامنے آیا ہُوں، مجھے اس بات کا خاص طور پر افسوس ہے کہ اس زمانے میں بھی مختلف ذاتوں کے درمیان اس قدر نا اتفاقی جاری ہے۔ یہ سلسلہ فوراً بند ہو جانا چاہیئے۔ اس سے نہ اُونچی ذات والوں کو کچھ حاصل ہوگا نہ نیچی ذات والوں کو کچھ فائدہ پہنچے گا۔ اُونچی ذات والوں یعنی براہمنوں سے مجھے اتنا اور کہنا ہے کہ اب مراعات اور حقوق خصوصی کا زمانہ رُخصت ہو چکا ہے۔ ہر حاکم کو بالآخر اپنی قبر آپ کھودنا پڑتی ہے[1] جتنی جلد دُوسروں پر حکومت کے خیالات کو دفنا دیا جائے، اتنا ہی بہتر ہوگا۔ ورنہ ڈر ہے کہ ایسے لوگ کُتّے کی موت مریں گے اور حقوق خصوصی کی لاش سے سماج میں سڑاند اور گندگی پیدا ہو جائے گی۔ اس لئے براہمنوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستان کے دُوسرے انسانوں کی ترقی اور بہبودی کے لئے کام کریں محض دوسروں کو نجات دلانے ہی کے کام سے ان کا شمار براہمنوں میں ہوگا۔ لیکن اگر وہ روپیہ کمانے کے پھیر میں پڑ جائیں گے تو وہ کسی حالت میں بھی براہمن کہلائے جانے کے مستحق نہیں رہیں گے۔ سچا براہمن وہی ہے جس کو دنیا داری سے کوئی تعلق نہ ہو۔ دنیا دارانہ مشاغل دوسری ذات والوں کے لئے ہیں۔ براہمن کو ان سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیئے۔ براہمنوں کا واحد فرض یہی ہے کہ وہ ہندوستان کے باشندوں کو اُونچا اُٹھانے کے لئے سخت جاں کاہی سے کام لیں اور جو کچھ انہیں خود معلوم ہو، وہ سب کو سکھائیں جو تہذیب اور ثقافت انہوں نے صدیوں کی کاوش سے حاصل کی ہے۔ اس سے دُوسروں کو بھی آراستہ و پیراستہ کریں۔ ہندوستان کے براہمنوں کو ضرور یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ براہمن ہونے کے اصل میں کیا معنی ہیں۔ منوجی کا ارشاد ہے کہ یہ سب مراعات اور سہولتیں براہمنوں کے لئے اس وجہ سے واجب ہیں کہ نیکی کا خزانہ ان کے قبضے میں ہے۔ انہیں چاہئے کہ دل کھول کر اس خزانے کو لُٹائیں اور اس میں جتنے بھی بیش قیمت ہیرے اور جواہرات رکھے ہوئے ہیں اُنہیں

---

[1] لہ

دنیا بھر میں تقسیم کر دیں۔ یہ وہ خزانہ ہے جو لٹانے سے اُور بھرپور ہو جاتا ہے۔ براہمنوں کی برتری سے کس کو انکار ہو سکتا ہے لیکن آج تو ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ پھر ترک نفس اور خدمت خلق سے اپنی برتری قائم کریں۔ ہندوستان میں معرفت کا اُپدیش سب سے پہلے انہیں براہمنوں نے دیا۔ انہیں نے زندگی کی بلند ترین معرفت حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے اپنا سب کچھ تیاگ دیا۔ اس زمانے میں جب دوسروں کے دل و دماغ میں معرفت کا خیال کبھی نہیں پیدا ہوا تھا۔ یہ لوگ عرفان کی اس منزل تک پہنچ گئے تھے۔ بھلا اس میں بھی کوئی شک کی گنجائش ہے کہ دوسری ذاتوں کے بمقابلہ سب سے پہلے انہوں نے روحانی ترقی کے میدان میں قدم رکھا۔ اب اگر وہ اس معاملے میں دوسروں سے آگے نکل گئے تو اس میں ان کا کیا قصور ہے۔ دوسری ذات والوں کو ان کے انداز پر سوچنے اور عمل کرنے سے کسی نے روکا تھوڑا تھا، وہ کیوں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے۔ انہوں نے براہمنوں کو اس دوڑ میں بازی لے جانے کا موقع ہی کیوں دیا۔ اس لئے براہمنوں کا احساس برتری حق بجانب ہے۔ جب کبھی طاقت کا استعمال نامناسب مقاصد کی تکمیل کے لئے کیا جاتا ہے، وہ سفاکانہ ہو جاتا ہے۔ اس کا استعمال صرف نیک مقصد کے لئے ہونا چاہیئے۔ اس لئے براہمنوں سے میری درخواست ہے کہ تہذیب اور شائستگی کی جو یہ دولت آپ کو صدیوں میں حاصل ہوئی ہے اور جس کا بار امانت آپ کے سپرد ہے، اس سے تمام عوام الناس کو مالا مال کر دیجئے۔ خزانے کا سانپ بن کر بیٹھنا آپ کی شان کے شایاں نہیں۔ اس سے آج تک قوم کو بہت نقصان پہنچ چکا ہے۔ اسے اور زیادہ نقصان نہ پہنچنے دیجئے۔ چونکہ آپ نے عوام کو اس دولت سے اس روحانی طاقت سے محروم رکھا اور ان میں ایک قسم کا احساس کمتری پیدا کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے مسلمانوں کو اور بعد میں انگریزوں کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی جرأت ہوئی۔ سالہا سال سے ہم پر اس شخص کے پیروں تلے روندے جاتے رہے ہیں، جسے ہندوستان آنے کی سوجھ گئی۔ اسی وجہ سے ہمیں تباہی و بربادی سے دوچار ہونا پڑا۔ اسی وجہ سے ہماری تذلیل و تحقیر ہوئی۔ اس لئے ہمارا پہلا کام یہ ہے کہ ان قلعوں کو توڑ ڈالیں جن میں ہمارے بزرگوں کا اکٹھا کیا ہوا حیرت انگیز خزانہ چھپا ہوا ہے جس میں ہماری روحانی طاقت بند پڑی ہے۔ براہمنوں کا فرض ہے کہ وہ اس سلسلے میں سب سے آگے قدم بڑھائیں۔ بنگال میں کہاوت ہے کہ سانپ کے کاٹے کو سانپ ہی بچا سکتا ہے۔ اگر کسی شخص کو سانپ نے کاٹ لیا ہو اور پھر وہی سانپ اسی شخص کے جسم سے اپنے زہر کو چوس کر نکال لے تو اس شخص کی جان بچ جاتی ہے۔ اس لئے براہمنوں سے میری التجا ہے کہ وہ اپنے کاٹے کے زہر کو خود ہی چوس لیں اور غیر براہمنوں سے مجھے یہ کہنا ہے کہ ذرا ٹھہریئے، بے صبری سے کام نہ لیجئے۔ ہر موقع پر براہمنوں سے دست و گریباں ہونے کی ضرورت نہیں۔ آخر اپنی زبوں حالی کے ذمہ دار تو بہت حد تک آپ خود ہیں۔ قصور آپ ہی کا ہے۔ روحانیت اور سنسکرت زبان کو نظر انداز کرنے کی صلاح آپ کو

کس نے دی تھی۔ ابھی تک آپ کہاں تک رہے، کیا کرتے رہے۔ آپ نے اس طرف بے توجہی کیوں اختیار کی۔ اور اگر آج دوسرے لوگ آپ کے بمقابلہ زیادہ اہلِ دماغ ہوگئے ہیں، ان میں زیادہ توانائی آگئی ہے۔ وہ آپ سے زیادہ ہوشیار اور ذہین ہوگئے ہیں تو پھر آپ کف در وہاں کیوں ہوتے ہیں۔ بیکار بحث و مباحثہ اور لڑائی جھگڑے میں تضییع اوقات کیوں کرتے ہیں۔ آئے دن ایک دوسرے کا سر کیوں پھوڑتے ہیں۔ اگر ہمت ہے تو براہمن کی تہذیب اور شائستگی کے حاصل کرنے میں اپنی قوتیں صرف کیجئے۔ سنسکرت زبان کے عالم و فاضل بنیئے۔ تمام ذات والوں کو سنسکرت زبان کی تعلیم دینے پر لاکھوں روپیہ صرف کیجئے۔ ان باتوں سے تو کچھ کار برابری کی صورت نکل سکتی ہے، ورنہ یہ سارا شور و غل بے سود ہے۔ آپ کو اپنے عمل سے ہی براہمن کے مساوی مرتبہ حاصل ہو جائیگا۔

ہندوستان میں تو طاقت حاصل کرنے کا بس یہی ایک راز ہے۔ ہندوستان میں سنسکرت زبان اور عظمت اوتار دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتی رہی ہیں۔ اگر آپ سنسکرت زبان میں مہارت حاصل کرلیں تو پھر آپ کو خاص وقار بھی حاصل ہو جائے گا اور پھر کسی کو آپ کے خلاف ایک حرف بھی زبان پر لانے کی جرأت نہ ہو سکے گی۔ لیکن ہندوستان کے مستقبل کو شاندار بنانے کے لئے صرف ہی کافی نہیں، ساتھ ہی ساتھ آپ ذات پات کے تفرقات کو بھی مٹا دیجئے اور ہر ذات کے لوگوں کو سنسکرت کی تعلیم دے کر ان پر روحانیت کے خزانوں کے دروازے کھول دیجئے تاکہ ہر شخص انسانیت کے آدرش یعنی براہمن کے مرتبے تک پہنچ سکے لیکن یہ قدم تو پہلا قدم ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک منظم و متحدہ جماعت کی حیثیت سے قوم میں قوتِ ارادی پیدا کی جائے۔ اُدویت وادیوں کے مطابق تمام کائنات کے شعور کی نوعیت ایک قسم کی از خود سحر گشتگی ہے گویا ہم پر خود ساختہ ہپناٹزم سے ایک قسم کی غشی طاری ہو جاتی ہے اور اس حالت کو ہم حالتِ شعور کہنے لگتے ہیں لیکن در اصل ہستی ہے تو بس ہماری قوتِ ارادی کی۔ یہی کائنات کی قوتِ محرکہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ مصمم ارادہ رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ان کے گرد ایک نورانی ہالہ سا بن جاتا ہے اور اس سے دوسرے تمام لوگوں کے دل میں بھی وہی متحرک، وہی ارتعاشی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جو خود ان کے دماغ میں ہوتی ہے اور یہ محض ہماری آرائی نہیں ہے کیونکہ واقعتاً دنیا میں ایسے عظیم الشان انسان ہو گزرے ہیں۔ ان کی عظمت و طاقت کا راز صرف یہ ہے۔ کہ ان کی شخصیت ہمارے دلوں میں گھر کر لیتی ہے۔ ہم ان کے خیالات کو کچھ اس طرح اپنا لیتے ہیں گویا وہ خیالات خود ہمارے ہی دلوں میں پیدا ہوئے ہیں۔ جب خیالات اس طرح ایک نقطے پر مرکوز ہو جاتے ہیں تو ان میں توانائی آ جاتی ہے، ہمیں اپنی طاقت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جتنی زیادہ منظم کوئی جماعت ہوتی ہے وہ اتنی ہی زیادہ طاقت کی مالک ہوتی ہے۔ یہ بات تو صریحاً غلط ہے کہ تنظیم فقط مادی سطح پر ہوتی ہے۔ مثال کے

---

طور پر یہ دیکھئے کہ کس طرح چار کروڑ انگریز یہاں تیس کروڑ باشندوں پر حکومت کرتے ہیں؟ نفسیاتی نقطۂ خیال سے اس کے علاوہ اس کی اور کیا وضاحت ہو سکتی ہے کہ ان چار کروڑ انسانوں کی قوتِ ارادی ایک جگہ مرکوز ہو کر ایک ایسی بے پناہ طاقت میں بدل گئی جس کی تاب تیس کروڑ ہندوستانیوں کی منتشر قوت نہیں لا سکی۔ ہماری تعداد تیس کروڑ ضرور ہے لیکن ہم سب کی قوتِ ارادی ایک دوسرے سے علاوہ ہے۔ بکھری ہوئی ہے، یہی انتشار ہماری کمزوری ہے۔ اگر ہمیں ہندوستان کے مستقبل کو عظیم بنانا ہے تو ہمیں منظم ہونا پڑے گا۔ اپنی منتشر طاقتوں کو ایک مرکز پر مجتمع کرنا ہوگا، اور اپنے بے لگام ارادوں میں ایک زبردست ربط اور ہم آہنگی پیدا کرنا ہوگی۔

اس سلسلے میں وہ مجھے اتھروویدسنگھتا کا وہ شلوک یاد آ رہا ہے، جس میں یہ دعا مانگی گئی ہے کہ "تم سب متحد و متفق ہو جاؤ۔ تمہارے سب کے خیالات تمہارے مقاصد اور تمہارے ارادے ایک ہو جائیں۔ کیونکہ پچھلے زمانے میں تمام دیوتا ایک دل اور خیال کے ہوتے تھے اور اسی دن ان کو چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے۔ دیوتا انسانوں کے آدرش محض اس لئے بن سکتے ہیں کہ ان میں یک دلی ہوتی ہے۔ دیکھا آپ نے دیوتاؤں کی طاقت اور عظمت کا راز اتھروویدہ آپ کو دعوت دیتا ہے کہ آپ یک دلی اور یک جہتی پیدا کر کے بچاریوں کے مقام سے بلند ہو کر دیوتاؤں کے مقام تک جا پہنچیں۔ یہ بکھرے ہوئے ارادے یہ منتشر قوتیں آپکو مصمم ارادوں اور متحدہ قوتوں کے آگے سر جھکانے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ انہیں یکدلی اور یکجہتی کے شیرازے میں باندھ لیجئے اور دنیا اور عقبےٰ اس طرح سربلند کر کے اور سینہ تان کر کھڑے ہو جائیے۔ یاد رکھیئے کہ کسی قوم یا کسی جماعت کی تمام طاقت یک دلی ہی میں مضمر ہے۔ یہ مت بھولئے کہ جتنا زیادہ آپ ان فروعیات مثلاً دراوڑ اور آریہ یا براہمن اور غیر براہمن کے مسئلے یا دوسری باتوں پر آپس میں لڑیں جھگڑیں گے۔ اتنا ہی آپ اس قوت اور توانائی کے اجتماع سے دور رہیں گے جس پر ہندوستان کے مستقبل کی تعمیر تمام تر منحصر ہے۔ ہر بات کا دارومدار ہم ہندوستانیوں کی قوتِ ارادی کے اجتماع پر ہے۔ یہی ہماری کامیابی کا راز ہے۔ ربط باہمی یعنی سب کو یکجا کر کے ایک نقطۂ نظر پر لانا۔ جب تک ہم اس طرح متحد نہیں ہوں گے۔ ہم میں طاقت نہیں آئے گی اور ہم غلام ہی بنے رہیں گے۔ اس اصول کی ایک اور مثال چین اور جاپان کے مطالعہ سے ملتی ہے۔ چین کا ہر باشندہ اپنے جداگانہ ڈھنگ سے سوچتا ہے۔ ہر چینی کا ایک ذاتی نقطۂ نگاہ ہے۔ چینی قوم بھی ہماری طرح منتشر ہے لیکن جاپانی جو تعداد میں بہت تھوڑے ہیں۔ سب کے سب ایک انداز سے سوچتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ کم تعداد ہونے کے باوجود منظم قومیں بیشتر ایسی قوموں پر مسلط اور حکمران ہو جاتی ہیں جن کے افراد کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ اسے قابو میں رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسا ہونا عین فطری ہے کیونکہ قلیل التعداد قومیں زیادہ آسانی سے منظم و مربوط ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنے خیالات کو ایک نقطۂ نظر پر آسانی

لا سکتی ہیں۔ اِسی لیئے وہ جلد ترقی کر کے دُوسروں سے آگے بڑھ جاتی ہیں۔ بر خلاف اس کے کثیر الانعداد قوموں کے لیئے تنظیم اور باہمی ربط کا پیدا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان کی صورت ایک غیر منظم گروہ کی ہوتی ہے۔ اسی لیئے ان کے مابین باہمی اِتفاق اور اتحاد مشکل سے قائم ہوتا ہے لیکن ایسی قوموں کو بھی ایک مرکز پر لانا ناممکن نہیں ہے۔ کم از کم ہمیں یہی کرنا ہوگا۔ ہمارے ملک میں تو اب اس قسم کے اِنتشار اور افتراق کا سِلسلہ موقوف ہو جانا چاہیئے۔

ہم میں ایک نقص اور بھی ہے۔ معزز خواتین ..... مجھے یہ کہنے پر آپ معاف فرمائیں کہ صدیوں کی غلامی نے گویا ہمیں عورتوں کی قوم بنا دیا ہے۔ عام طور پر عورتیں خواہ وہ ہندوستانی ہوں خواہ کسی اور ملک کی۔ آپس میں مِل کر کام نہیں کر سکتی ہیں۔ ان میں کسی نہ کسی بات پر آپس میں لڑائی ہو ہی جاتی ہے۔ یورپ کے ملکوں میں عورتوں نے اپنی بڑی بڑی انجمنیں بنا رکھی ہیں اور وہ عورتوں کی طاقت اور اختیار کے بارے میں بڑے بڑے اعلان بھی کیا کرتی ہیں۔ اس کے باوجود ان کے درمیان شکر رنجی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ آپس میں لڑنے لگتی ہیں۔ آخرکار اس کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کوئی مرد آ جاتا ہے اور وہ ان سب پر اپنی حکومت جتانے لگتا ہے۔ تمام دُنیا میں حکومت کرنے کے لیئے اب تک مرد ہی کی ضرورت درپیش ہوتی آئی ہے۔ ہم لوگ بھی بالکل اُنہیں عورتوں کی طرح ہیں۔ اگر کوئی عورت اپنی ہم جنسوں کی رہنما ہوتی ہے تو وہ فوراً اس پر آپس میں نکتہ چینی شروع کر دیتی ہیں اور آخرکار اس کو ہٹا دیتی ہیں۔ لیکن اگر کوئی مرد آ کر ان کے ساتھ سختی سے پیش آنے لگتا ہے۔ اور وقتاً فوقتاً ان کو ڈانٹتا پھٹکارتا رہتا ہے تو سب سیدھی ہو جاتی ہیں۔ سارا معاملہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ عورتیں کچھ اس قسم کے سلوک کی عادی سی ہو گئی ہیں جس میں مسمریزم کا سا عمل ہوتا ہے۔ ساری دنیا اس قسم کی مسمریزم اور ہپناٹزم کے عاملوں سے بھری ہوئی ہے۔ اسی طرح اگر ہمارا کوئی ہموطن کھڑا ہو جاتا ہے اور بڑا آدمی بننے کی کوشش کرتا ہے تو ہم سب اس کو نیچا دِکھانے کے درپے ہو جاتے ہیں لیکن اگر کوئی ولائتی آ کر ہمارے ساتھ ٹھوکر سے بات کرتا ہے تو ہماری عقل دُرست ہو جاتی ہے، سب کام ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ ہم لوگ تو اس سلوک کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہے نہ ایسی بات؟ لیکن اگر غلاموں کو بھی ایک روز آقا بننا ہے۔ اگر ہمیں آزاد ہونا ہے تو ہمیں سب سے پہلے اپنی غلامانہ ذہنیت کو ترک کرنا ہوگا اور اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ آئندہ پچاس سال تک ہم سب یکسو ہو کر مادرِ وطن کی خدمت کا بیڑا اُٹھا لیں۔ ہمارے دِل و دماغ پر ہر وقت وطن ہی کی عظمت کا خیال چھایا رہے! ایک وطن ہی ہمارا معبود ہو۔ ہم صرف اسی ایک خدا کی پرستش کریں۔ جب ہمارے سامنے وطن کا زندہ دیوتا موجود ہے، تو پھر کسی معبود کی عبادت کے کیا معنی۔ اس سے کیا حصول ہمارے دِلوں میں اس خیال تک نہیں آنا چاہیئے۔ باقی سب دیوی دیوتا سو رہے ہیں، بے جان ہیں، ہماری زندہ قوم کا ہمارے زندہ وطن کا دیوتا بیدار ہے۔

ہر جگہ اور ہر طرف موجود ہے۔ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھئے۔ ہمارے سامنے اس عظیم الشان دیوتا کے پاؤں ہیں، اس کے پاؤں پر سر جھکائیے۔ ہمارے سامنے ان دیوتاؤں کے ہاتھ ہیں۔ ان سے سعادت اور برکت لیجئے۔ یہ دیوتا ہماری بات سننے کے لئے تیار ہے۔ اس سے بھگتی، پریم اور بے لاگ سیوا کی طاقت مانگئے۔ اٹھئے، میرے ہم وطن احباب! دیش پوجا کے لئے اپنا تن من دھن سب کچھ بلیدان کر دیجئے۔ اگر آپ میں اس زندہ دیوتا کی پوجا کا بل نہیں۔ اگر آپ اس شکتی سے محروم ہیں تو دوسرے ہزاروں دیوتاؤں کے پیچھے بھٹکنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ان کے آگے گڑگڑانے سے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ ہمارا وطن تو بھگوان کا وراٹ روپ ہے، اسی کی پوجا کیجئے۔ جب ہم اس دیوتا کی پوجا کرنا سیکھ جائیں گے۔ جب ہمیں پرستش کا طریقہ آجائے گا تو پھر دوسرے دیوتاؤں کی پوجا بھی کر لی جائے گی۔ ان کی پوجا تو آپ ہی آپ ہو جائے گی۔ آپ پوجا کا مطلب غلط سمجھ بیٹھے ہیں۔ شائد آپ کا خیال ہے کہ صبح اور شام پوجا اور دھیان کرنے سے آپ یوگی اور مہاتما بن جائیں گے اور آپ کو دنیا کے فرائض سے چھٹکارا مل جائے گا۔ آپ ان فرائض سے آزاد ہو جائیں گے۔ یہ درست نہیں۔ دراصل آپ بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں، یوگی یا مہاتما بننا اتنا آسان نہیں جس نے ابھی چلنا ہی نہیں سیکھا، وہ بھلا دوڑ کیا لگائے گا جس میں دو فرلانگ بھی چلنے کی طاقت نہیں۔ وہ ہنومان جی کی طرح سمندر کیونکر پھاند جائے گا۔ یوگی مہاتما بننا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے سخت محنت اور سرگرم تیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ دنیاداری کے دھندوں میں دن گزار کر شام کے وقت چند لمحوں کے لئے ناک پھلا پھلا کر پرانایام کرنے یا پوجا پاٹھ کرنے سے کوئی یوگی نہیں بن جاتا۔ یوگ اور گیان کا حاصل کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اگر آپ نے تین چار بار پرانایام کر لیا تو آپ کے اس عمل سے خوش ہو کر رشی منی ہوا میں اڑ کر آپ کے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔ معرفت کا حاصل کرنا کوئی ہنسی مذاق نہیں۔ ان بیہودہ باتوں میں نہ پڑیئے۔ ہمیں جو چیز درکار ہے، وہ ہے چت کی شدھی یعنی دل کی صفائی۔ یہ دل کی صفائی کیونکر حاصل ہوتی ہے؟ بھگوان کے وراٹ روپ کی پوجا سے۔ بھگوان انسانوں اور جانوروں کا روپ دھارن کئے ہوئے ہمارے سامنے موجود ہیں۔ آئیے ہم اسی روپ میں بھگوان کی پوجا کریں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہم محض پاکیزگی قلب کی خاطر خلق کی خدمت میں لگے رہیں۔ خدمت کا درجہ اور ہے اور پوجا کا مقام اور۔ سنسکرت میں اس کے لئے جس لفظ کا استعمال کیا گیا ہے اس کا مفہوم تو پوجا اور عبادت سے ادا ہو سکتا ہے۔ ہاں تو میں کہتا ہوں کہ یہ سب انسان، یہ سب جانور خدا ہیں۔ آیئے، ہم اب ان کی پرستش کریں۔ آیئے ہم اپنے ہم وطنوں، اپنے دیس باسیوں کی پوجا کریں[1]۔ اس پوجا میں حسد کی گنجائش نہیں، آپس میں لڑائی جھگڑا کرنے کا امکان نہیں حسد اور جنگ و جدل کے ان بھیانک کرموں کا خمیازہ تو ہمیں اٹھانا پڑ رہا ہے۔ پھر بھی ہماری آنکھیں نہیں کھلتیں۔ میرے دوستو۔ ہوش میں آئیے اور اپنا طرز عمل بدل دیجئے۔ میرے پاس تو ایک یہی علاج ہے کہ قوم اور ملک کی پوجا کیجئے۔

---

[1] اگر ہم اپنے ایک بھوکے بھائی کو کھانا نہیں کھلا سکتے تو مندروں میں پرشاد چڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اگر ہم دکھیا دلوں میں ہمدردی کے غنچے نہیں کھلا سکتے تو ہمارا دیوی دیوتاؤں پر پھول چڑھانا بے معنی ہے۔ اگر ہم ہر انسان نہیں ہیں بلکہ جانور کو اپنا ہی بھائی نہیں سمجھ سکتے تو مساوات کی یہ بڑی بڑی باتیں بنانا مذاق نہیں تو پھر اور کیا ہے۔ یہ سب فضول باتیں ہیں۔

یہ موضوع بے حد وسیع اور عظیم ہے، اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اسے ختم کہاں کروں۔ بہر حال میں آپ کے سامنے چند الفاظ میں اپنا لائحہ عمل پیش کرکے اس تقریر کو ختم کر دوں گا۔ میرے خیال میں سب سے پہلے تو ہمیں قوم کی روحانی اور دینوی تعلیم کو سنبھالنا ہے۔ یہ بہت زبردست کام ہے۔ آپ ذرا میرا منشا سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ سوتے جاگتے اسی خیال کو تقویت دیجئے۔ ہر وقت اسی کا چرچار ہے۔ اسی کے بارے میں سوچ بچار ہو، جب کہیں جاکر آپ سمجھ پائیں گے کہ میرا منشا کیا ہے۔ جب جاکر اس خیال کی عملی صورت پیدا ہوگی۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا، قوم کو غلامی سے نجات حاصل نہیں ہوگی۔ آپ کو جو تعلیم دی جارہی ہے، اس میں کچھ باتیں یقیناً اچھی ہیں مگر اس تعلیم سے ایک نقصان بھی پہنچ رہا ہے اور وہ نقصان اس قدر زبردست ہے کہ ان کے آگے نفع اور اور فائدے کی باتوں کا کوئی مول ہی نہیں رہتا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ تعلیم مردساز نہیں۔ اس سے انسان کا کردار نہیں بنتا۔ اس میں دلیری اور جذبات نہیں ابھرتے، یہ تعلیم ہمیں خوف سے چھٹکارا نہیں دلاتی۔ اس تعلیم کی نوعیت بالکل منفی ہے اور منفی تعلیم و تربیت موت سے بھی زیادہ ہولناک ہوتی ہے۔ آپ ذرا غور کریں کہ ہمارے بچوں کو سکولوں میں سکھایا کیا جاتا ہے۔ پہلی بات جو ایک نوواردبچہ مدرسے میں سیکھتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس کا باپ احمق ہے۔ اسکو دوسری یہ بات سکھائی جاتی ہے کہ اس کا دادا پاگل ہے۔ تیسری بات یہ سکھائی جاتی ہے کہ سارے معلم فریبی اور مکار ہیں اور چوتھی بات یہ بتائی جاتی ہے کہ اس کے سارے دھارمک گرنتھ یا مذہبی کتابیں محض جھوٹ کا پلندہ ہیں۔ اس مردکش تعلیم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سولہ سال کی عمر تک پہنچنے پر بچے کی ذہنیت بالکل منفی ہو جاتی ہے۔ اس کی کوئی شخصیت تعمیر نہیں ہونے پاتی۔ اس کے کردار یعنی کیریکٹر کی تشکیل نہیں ہوتی۔ اس میں کسی بات پر ٹکنے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی اور وہ مٹی کا ایک بے جان تودہ بن کر رہ جاتا ہے، جیسے اس کے جسم میں ہڈی کا نام بھی نہ ہو۔ پچاس سال تک اس قسم کی تعلیم سے تینوں نسلوں میں ایک شخص بھی ایسا پیدا نہیں ہوا، جس میں اصلیت کا کچھ مادہ ہو۔ اگر کسی شخص میں آپ کو شخصیت کا کچھ مادہ نظر آئے تو سمجھ لیجئے کہ اس کی تعلیم کسی دوسری جگہ ہوئی ہوگی، اس ملک میں نہیں ہوئی ہوگی۔ ایسے اشخاص اپنے ملک کی قدیم درسگاہوں میں جاکر پاتے ہیں تاکہ بدیشی تعلیم سے پیدا شدہ وہم و جہالت کی گرد ان کے دل سے دھو جائے۔ تعلیم سے مراد وہ سرمایہ معلومات نہیں، جو آپ کے دماغوں میں بھر دیا جاتا ہے اور زندگی بھر وہیں سڑا کرتا ہے۔ تحلیل نہیں ہو پاتا۔ ہمیں تو ایسے خیالات کے رچانے پچانے کی ضرورت ہے۔ جن سے تعمیر حیات ہوتی ہے، جن سے انسان میں انسانیت آتی ہے اور جن سے انسان کا کردار بنتا ہے۔ اگر آپ پانچ باتیں بھی بخوبی سمجھ کر انہیں اپنے دل میں پیوست کرلیں اور اپنی زندگی اور اپنے کردار کا جزو بنالیں تو سمجھ لیجئے کہ آپ کو اس شخص کے بمقابلہ زیادہ تعلیم حاصل ہے۔ جس نے اپنے دماغ کو کتب خانہ بنا رکھا ہے

यथा खरश्चन्दनभारवाही भारस्य वेत्ता न तु चन्दनस्य ।—

یعنی جس گدھے پر چندن کا بوجھ لدا ہوا ہے۔ اس کو صرف چندن کے بوجھ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ چندن کی قدر و قیمت کا واقف نہیں ہوتا۔ اگر تعلیم سے مراد صرف ذخیرہ معلومات ہے تو کتب خانوں سے بڑھ کر دانا اور پیامبر اور کون ہو سکتا ہے اور یہ جتنے انسائیکلوپیڈیا ہیں، انہیں کو رشی کہنا چاہیئے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ تعلیم کچھ اور ہی

ٹ

چیز ہے تعلیم کا مطلب کردار سازی ہے کتب بینی نہیں۔ اس لئے ہمارا آدرش، ہمارا مسئلہ نظریہ ہے کہ ہمارے ملک میں ہماری روحانی اور دنیوی تعلیم کا سارا بند و بست خود ہمارے ہاتھوں میں ہونا چاہیئے، اسکی نوعیت قومی ہونا چاہیئے اور حتی الامکان اس کا طریقہ کار بھی قومی ہونا چاہیئے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ سکیم ایک بہت بڑی سکیم ہے، یہ منصوبہ نہایت عظیم ہے۔ نجانے اس پر کبھی عملدرآمد ہو بھی سکیگا یا نہیں، لیکن ہمیں کام تو شروع ہی کر دینا چاہیئے۔ مگر اس کی صورت کیا ہو گی مثلاً مندر ہی کو لے لیجیئے۔ یہاں ایک مندر ہونا چاہیئے کیونکہ ہندوؤں کے لئے مذہب ہی سب سے زیادہ مقدم چیز ہے آپ کہیں گے کہ اس مندر کے سلسلے میں مختلف فرقوں کے درمیان لڑائی جھگڑا ہو گا لیکن ہم تو اس مندر کو غیر فرقہ دارانہ بنائیں گے۔ اس کا نشان "اوم" ہوگا۔ جو تمام نشانوں میں افضل ترین نشان ہے۔ اگر کوئی فرقہ ایسا ہو جو "اوم" کو افضل ترین نشان نہ سمجھتا ہو، تو اس فرقے کو ہندو کہلانے کا کوئی حق ہی حاصل نہیں ہے۔ البتہ اس میں ہر شخص کو اپنے ذاتی فرقے کے عقائد کی رُو سے ہندو مت کی تاویل کرنے کا حق ہو گا لیکن سارے فرقوں کے لئے ایک مشترکہ نشان کا ہونا لازمی ہے۔ آپ اپنی مورتیاں اور اپنے نشانات دوسرے مقامات پر رکھ سکتے ہیں۔ لیکن خدا کے لئے آپ ان لوگوں سے دست و گریباں نہ ہوں۔ جن کے خیالات آپ کے خیالات سے ملتے جلتے نہ ہوں یہاں اس بات کی تعلیم ہونی چاہیئے کہ مختلف مت والوں کے لئے درمیانی مشترکہ بنیاد کیا ہے۔ ان میں بنیادی طور پر کیا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ اس مندر میں ہر فرقے کو آنے اور اپنے اپنے اصولوں کی تعلیم دینے کی مکمل آزادی حاصل ہو گی۔ پابندی صرف یہ ہو گی کہ یہ فرقے آپس میں فتنہ و فساد نہ برپا کریں، لڑیں جھگڑیں نہیں۔ آپ کو جو کچھ کہنا ہے کہیئے، دُنیا کو اس کی ضرورت ہے لیکن دُنیا کے پاس یہ سُننے کا وقت نہیں ہے کہ دوسروں کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں۔ از راہِ کرم ان خیالات کو اپنی ہی ذات تک محدود رکھیئے۔

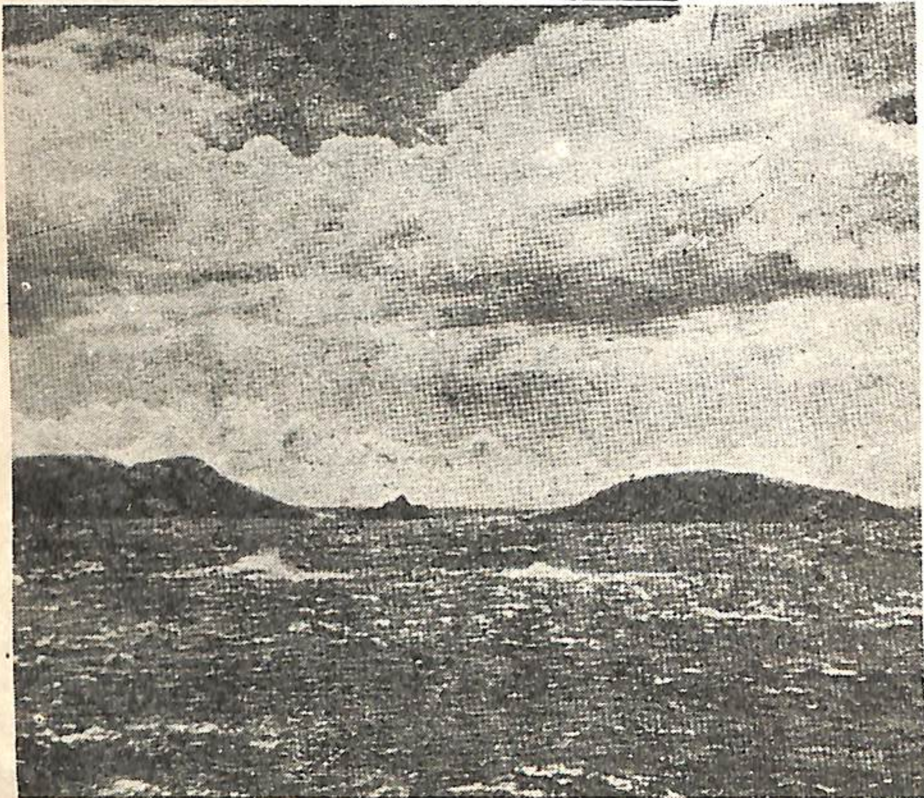
ثانیاً اس مندر کے ساتھ ایک درسگاہ بھی ہونی چاہیئے۔ جہاں ایسے معلموں کو تربیت دی جا سکے جو بعد میں ملک کے کونے کونے میں جا کر ہمارے ہموطنوں کو مذہبی اور دینوی تعلیم دیں۔ آج تک ہم مذہبی تعلیم تو گھر گھر جا کر دیتے آئے ہیں لیکن اب ہمیں اس کے ساتھ غیر مذہبی یعنی دُنیا دارانہ تعلیم بھی دینا ہو گی اور یہ کام اُن معلموں کے ذریعہ بآسانی ہو سکتا ہے۔ جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ یہ کام روز بروز بڑھتا چلا جائے گا اور آہستہ آہستہ ہمیں دُوسرے مقامات پر بھی ایسے ہی مندر بنوانے پڑیں گے۔ حتیٰ کہ تمام ہندوستان میں ان مندروں کا ایک سلسلہ قائم ہو جائے گا، یہ ہے میرا منصوبہ۔ ممکن ہے لوگ اسے ناقابلِ عمل سمجھیں۔ کیونکہ یہ کام بہت بڑا ہے۔ لیکن اس کام کی بڑی ضرورت ہے۔ آپ دریافت کریں گے، اس کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے لئے روپے کی تو ضرورت ہے ہی نہیں۔ میری نظر میں روپے کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اپنی زندگی کے گذشتہ

بارہ سال میں مجھے یہ پتہ نہیں رہا کہ ایک وقت کھانا کھانے کے بعد مجھے دوسرے وقت کا کھانا ملے گا یا نہیں لیکن جو کام مجھے کرنا تھا اس کے لئے ساری سہولتیں مہیا ہوتی چلی گئیں۔ اگر ہم اس کام کے سلسلے میں بھی دل سے ٹھان لیں۔ عزم مصمم کرلیں تو روپیہ پیسہ اور ہر قسم کی دوسری سہولت ہمیں ضرور خود بخود میسر آجائے گی۔ کیونکہ یہ چیزیں تو ہماری غلام ہیں۔ ہم خود ان کے غلام نہیں ہیں۔ مجھے اس میں رتی بھر بھی شک نہیں۔ میرے درپیش اگر کوئی سوال ہے تو یہ کہ اس کام کے لئے آدمی کہاں سے آئیں گے۔ میرے نوجوان دوستو! مجھے آپ سے بڑی امیدیں ہیں۔ کیا آپ ہماری قومی آواز پر لبیک کہیں گے؟ کیا آپ میں اتنی ہمت ہے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں، اس پر ایمان لے آئیں۔ میں آپ کے شاندار مستقبل کا ذمہ لیتا ہوں۔ آپ اپنی ذات میں زبردست اعتماد پیدا کیجئے۔ مجھ کو جو کچھ کامیابی حاصل ہوئی ہے اس کا راز ہی خود اعتمادی ہے، مجھے بچپن سے اپنے آپ پر یقین رہا ہے اور میں اب تک اس سے کام لے رہا ہوں۔ آپ کو بھی اپنی ذات میں اپنا ہی زبردست اعتماد ہونا چاہیئے۔ آپ میں سے ہر شخص کے لئے لازم ہے کہ اپنے دل میں اس اعتقاد کو جگہ دے کہ دوامی طاقت اور توانائی ہر روح کے اندر جاگزیں ہے اور اس کے ذریعہ آپ سارے ہندوستان میں دوبارہ زندگی کی لہر دوڑا دیں گے۔ یہی نہیں بلکہ ہم دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی اپنے خیالات کا پرچار (اشاعت) کریں گے۔ یہاں تک کہ یہ خیالات ان مختلف قوتوں کا جزو بن جائیں گے جو دنیا کی ہر قوم میں کارفرما رہتی ہیں۔ ہم کو ہندوستان اور ہندوستان سے باہر رہنے والی ہر قوم کی زندگی پر اثر انداز ہونا ہے۔ یہ صورت حالات پیدا کرنے کے لئے ہم کو سخت محنت کرنا پڑے گی۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے ہمیں نوجوانوں کی ضرورت ہے۔
ویدوں میں لکھا ہے کہ مضبوط، تندرست، ذہین اور تیز فہم نوجوان لوگ ہی پرماتما تک پہنچ سکتے ہیں کبھی بوڑھے اور کھوسٹ کی خدا تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ ابھی آپ میں جوانی کا زور ہے۔ اسی لئے اس امر کا فیصلہ بھی آج اور اسی وقت ہونا چاہیئے کہ آپ اپنا مستقبل کیسا بنائیں گے۔ یہ فیصلہ کرنا اس وقت مشکل ہوگا، جب آپ ضعیف ہو جائیں گے، تھک جائیں گے، کام کیجئے یہی وقت کام کرنے کا ہے کیونکہ صرف وہی تر و تازہ اور شگفتہ پھول بھگوان کے چرنوں میں بھینٹ کئے جاتے ہیں۔ جن کو نہ کسی کا ہاتھ لگا ہو اور نہ کسی نے سونگھا ہو۔ جو پھول مرجھا چکے ہیں، جن کی خوشبو اڑ چکی ہے، ان سے بھگوان کی پوجا نہیں ہوتی۔ اسی لئے اپنی جوانی کو مادر وطن کی بھینٹ کر دیجئے۔ اٹھئے جاگئے اور کوئی کارِ نمایاں کر دکھایئے۔ اس چند روزہ زندگی کا مقصد یہ نہیں کہ پڑھ لکھ کر محض وکیل بن جایئے یا اور کسی دوسرے دھندے میں پڑ جایئے یا بس دوسروں سے لڑنے جھگڑنے میں وقت گذار دیجئے۔ ہمیں اس سے کہیں زیادہ عظیم کام سرانجام دینا ہے اور سب سے زیادہ عظیم کام یہ ہے کہ اپنی قوم کے مفاد کی خاطر اور بنی نوع انسان کی بہبودی کے لئے خود کو قربان کر دیجئے۔ آخر اس زندگی میں رکھا ہی کیا ہے۔ آپ ہندو ہیں اور یہ عقیدہ تو آپ کی فطرت میں داخل ہے کہ زندگی ایک لافانی شے ہے۔ آپ

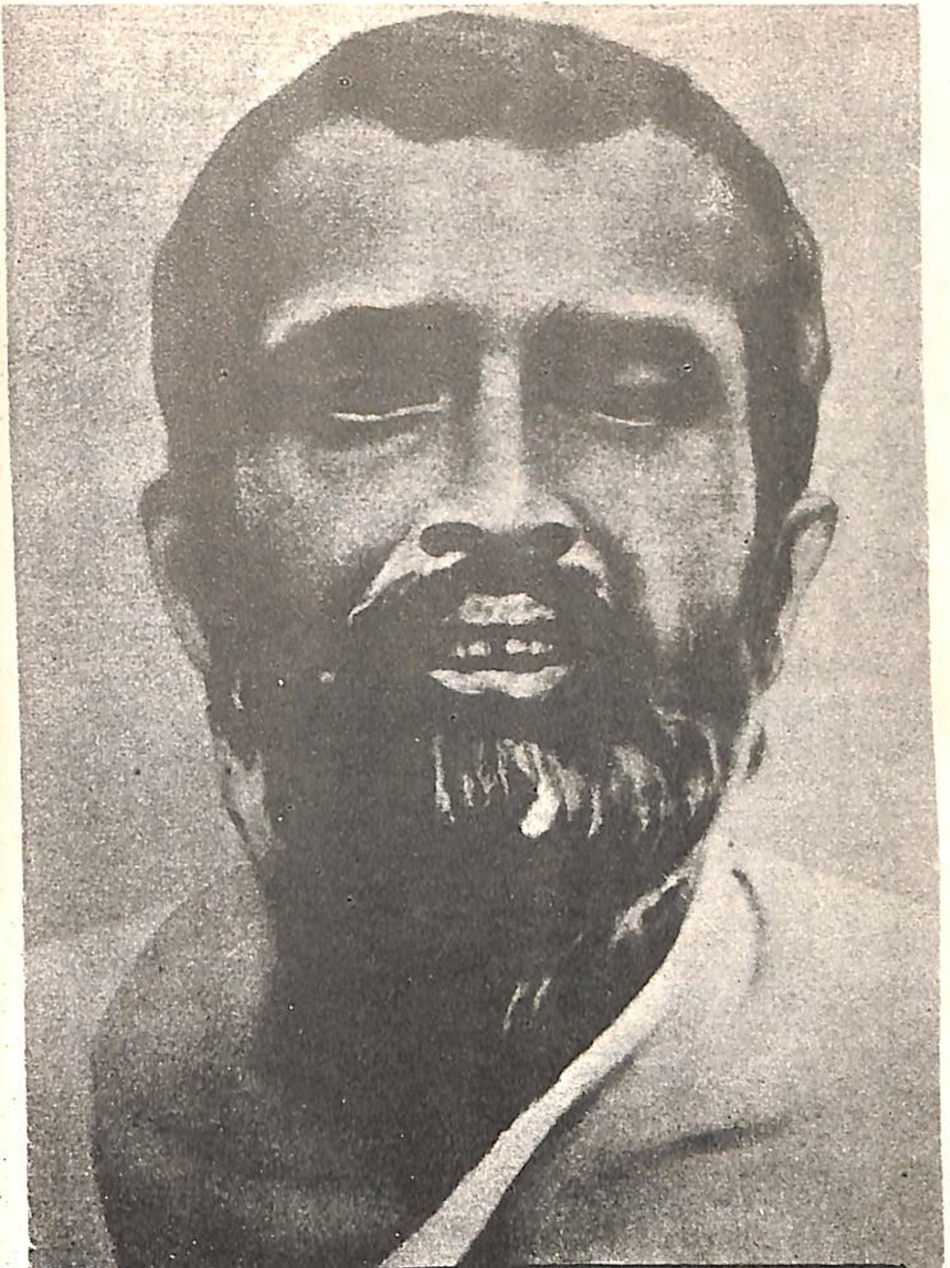
---

میرا پیغام — صفحہ ۲۴۴

بھگوان کی ہستی سے لاکھ انکار کریں، لاکھ مادیت کی باتیں کریں لیکن اپنی فطرت کو نہیں بدل سکتے۔ آپ کے لئے تو قربانی ایک کھیل ہونا چاہیئے۔ کبھی کبھی میرے پاس بھی بہت سے جوان آ کر اس قسم کی باتیں کرتے ہیں لیکن مَیں یہ نہیں مانتا کہ کبھی کوئی ہندو کبھی پرماتما کی ہستی سے منکر ہو سکتا ہے، وہ یورپ کے مصنفوں کی کتابیں پڑھ سکتا ہے اور اس کا رجحان مادیت کی طرف ہو سکتا ہے لیکن یہ محض ایک وقتی چیز ہے۔ یہ تو آپ کے خون کا جزو ہی نہیں ہے۔ آپ وہ بات ہرگز مان نہیں سکتے جو آپ کی ساخت میں آپ کے ضمیر میں داخل نہیں۔ ایسی ناممکن بات کے لئے کوشش نہ کیجئے۔ جب مَیں نوعمر تھا تو مَیں نے بھی اس قسم کی کوشش کی تھی، لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ زندگی چند روزہ ہے لیکن رُوح لافانی ہے، دوامی ہے اور اگر کوئی چیز یقینی ہے تو وہ صرف موت ہے۔ اس لئے ایک عظیم آدرش کو پیش نظر رکھ کر اپنی تمام زندگی اسی کے لئے وقف کر دیجئے۔ یہی ہمارا عزم مصمم ہونا چاہیئے۔ میری پرارتھنا ہے کہ وہ بھگوان جو ہمارے گرنتھوں کے مطابق اپنے بھگتوں کے آدھار کے لئے بار بار ظہور پذیر ہوتا ہے۔ وہ بھگوان کرشن ہمیں برکت دے اور ہمارے مقاصد کی تکمیل میں ہماری رہنمائی کرے ۔



کنیا کماری کی وہ پہاڑی جہاں سوامی وویکانند کو مشرق و مغرب کو جگانے اور ہندوستان کی تعمیرِ نَو کا عظیم کام کرنے کا فرمانِ الٰہی نازل ہوا۔



"مجھ میں اگر کوئی چمک دمک ہے تو یہ میرے گرو دیو پیر و مرشد روحانیت کے آفتاب پیکر ریاضت و عبادت مجسم خدا
پرم ہنس بھگوان شری رام کرشن کی دین ہے۔ بنی نوع انسان کو ان جیسا مرد کامل صدیوں کے بعد نصیب ہوتا ہے میرا مقصد حیات تم
تک ہے کہ ان کا یہ پیغام گھر گھر پہنچا دوں کہ سب مذہبوں عقیدوں اور ایمانوں کی منزل ایک ہے سب کا منتہائے مقصود ایک ہے اٹھو
جاگو اس منتہائے مقصود کو حاصل کرنے کیلئے جٹ جاؤ اور تب تک نہ رکو جب تک منزل نہ پالو۔" (ویویکانند)

# ہمیں کیا کرنا ہے

جیوں[1] جیوں دنیا آگے بڑھتی ہے زندگی کا مسئلہ روز بروز زیادہ گہرا اور وسیع ہوتا چلا جاتا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زندگی کا بنیادی اصول علم و آگہی کا جوہر آج سے ہزاروں سال پہلے اس وقت دریافت ہو چکا تھا جب ویدانت کا فلسفۂ حیات منظر عام پر آیا تھا۔ یہ فلسفہ تمام زندگی کی وحدت کا آئینہ دار ہے۔ اس فلسفے میں ہمیں یہ تعلیم ملتی ہے کہ زندگی ہر رنگ میں ایک ہے اس کی تمام وسعتوں کا مرکز ایک ہے۔ اس عالم کائنات میں ایک ذرّے کی بھی مجال نہیں کہ دوسرے سے علاحدہ ہو کر برائے نام بھی حرکت کر سکے۔ دنیا کے ایک سرے پر کوئی واقعہ ہوتا ہے تو اس کا اثر دوسرے سرے تک پہنچ جاتا ہے، در اصل جس وقت تک دنیا بھر کو اس سے استفادہ پہنچنے کے امکانات نہ پیدا ہو جائیں، یہاں کسی قسم کی ترقی ممکن ہی نہیں اور یہ بات روز بروز صاف اور واضح ہوتی جا رہی ہے کہ کسی مسئلہ کا بھی حل نسلی، قومی یا کسی اور بنا پر جس کا دائرہ بہت محدود ہو، دستیاب نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی ترقی سے متعلق، ہر خیال اور سماج کی بھلائی ے منتہا ۔ بہ تصوّر میں زیادہ سے زیادہ وسعت پیدا کرنا پڑے گی حتیٰ کہ تمام دنیا اس میں شامل ہو جائے ہماری ذہنیت کو عالمی ہونا پڑے گا، ہر ارمان اور ہر تمنّا میں مسلسل توسیع کا ہونا ضروری ہے اور وہ ہو گی تاکہ ہمارے احساسات اور مدرکات یک روزہ معمول پر نہیں بلکہ تمام زندگی پر چھا جائیں

---

[1] یہ لیکچر ٹرپلی کین لٹریری سوسائٹی مدراس میں ارشاد فرمایا گیا۔

اور تمام عالم ان کے احاطے میں محصور ہوجائے۔ اگر ہماری ہمدردی کا دائرہ محدود ہوگا تو ہم کبھی صحیح معنوں میں ترقی نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلی چند صدیوں میں ہمارا ملک اپنے شاندار ماضی کے اعلیٰ مقام سے ہٹ کر آہستہ آہستہ تنزل کی طرف مائل رہا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پستی اور انحطاط کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہماری نظر محدود ہو گئی تھی۔ ہمارے عمل کا دائرہ تنگ ہوگیا تھا۔ آج ہم اپنے ماضی پر نظر ڈال کر اپنے مستقبل کا نقشہ تیار کریں۔ زمانۂ گذشتہ پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ دو قومیں ایک ہی نسل سے پیدا ہوئیں لیکن بعد میں دونوں کے حالات اور ماحول میں فرق آگیا، دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوگئیں اور اسی سبب سے دونوں نے مسائل زندگی کا حل اپنے اپنے ڈھنگ سے تلاش کیا۔ میری مراد ہے قدیم زمانے کے ہندوؤں اور یونانیوں سے۔ ہندوستان میں رہنے والے آریوں کا ماحول یہ تھا کہ شمال میں برف پوش ہمالہ پربت کی دیوار عظیم کھڑی تھی۔ یہی عظیم الشان پربت ان کا پاسبان تھا۔ میدان میں سمندروں کی گہرائی اور وسعت لئے بے شمار دریا متلاطم تھے جن کے تازہ اور جاں بخش پانی کی بدولت چاروں طرف ہرے بھرے کھیت لہلہاتے تھے۔ ہر چیز کی افراط تھی۔ پہاڑوں پر گھنے جنگل جاودانی زندگی کے علمبردار نظر آتے تھے۔ ایسے ماحول میں جہاں قدرت نے انسان کی ہر ضرورت مہیا کر رکھی تھی اور جہاں کوئی خارجی خطرہ نہ تھا۔ آریہ ہندوؤں کی نظر کا رخ قدرتی طور پر باطن کی طرف ہوگیا۔ بس پھر کیا تھا۔ خود بینی کے سارے سامان اکٹھے ہوگئے۔ آریہ دماغوں کی بلند پایہ لطافت، ان کے گردوپیش کے ارفع ترین مناظر اور اس پر ان کا فطری رجحان، ان تینوں باتوں نے مل کر آریوں کی طبیعت کو قدرتی طور پر دروں بینی کی طرف مائل کر دیا اور ہندوستانی آریوں کا مطمح نظر خود اپنے دل و دماغ کا تجزیہ بن گیا۔

دوسری طرف یونانی آریہ ایک ایسے خطہ میں جا پہنچے تھے جہاں عظمت و کمال کے بجائے قدرت نے اپنے حسن و جمال کو چاروں طرف فراخ دلی سے بکھیر رکھا تھا۔ اس میں یونانی مجمع الجزائر کے حسین و جمیل جزیرے شامل تھے۔ یونانی آریوں کے گردوپیش قدرت نے اپنی فیاضیوں کی کچھ اس طرح بارش کی کہ وہ اس حسن سادہ کے گرویدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کا دماغی رجحان خارجی ہوگیا۔ ان کی نظر جمال قدرت کے نورانی جلوؤں میں الجھ کر رہ گئی اور حسن کا جو حقیقی مرکز تھا اس سے دور ہوگئی۔ ان کے بازو اس حسن کا احاطہ کرنے کے لئے پھیلنے لگے۔ انہوں نے خارجی دنیا کا تجزیہ کرنا چاہا، اسی عالم رنگ و بو کو سمجھنا اور اپنانا چاہا۔

---

نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی سرزمین سے وہ علوم نمودار ہوئے جن کا مقصد تھا تجزیہ و تحلیل اور یونان نے ان علوم کو جنم دیا جن کا مقصد تھا واقعات سے کلیہ قائم کر کے اس خارجی دنیا کو سمجھنا اور اس پر قدرت حاصل کرنا۔ ہندوؤں کے دماغ نے اپنی روش اختیار کی جس کے حیرت انگیز نتائج ایسے عظیم الشان فلسفے اور روحانیت کی صورت میں دنیا کے سامنے آئے جس کا جواب آجتک پیدا نہیں ہو سکا۔ اس زمانے میں بھی ہندوؤں کی منطقی صلاحیتوں کا کہیں جواب نہیں۔ ہندوستانی دماغ میں جو زبردست طاقت پائی جاتی ہے وہ کسی اور میں نہیں ملتی۔ عام طور پر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جب بھی ہمارے ملک کے لڑکوں کا مقابلہ کسی دوسرے ملک کے لڑکوں سے ہوتا ہے تو جیت ہمارے ہی لڑکوں کی ہوتی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہندوستان پر مسلمانوں کی فتح سے سو دو سو سال کی تاریخ کے دوران ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہماری اس قومی صلاحیت میں انتہا درجے کا غلو پیدا ہو گیا جس سے یہ صلاحیت تنزل کا شکار ہو گئی۔ اس میں پستی آگئی اور یہ پستی ہمیں اس عہد کی نقاشی اور مصوری میں، موسیقی اور دوسرے فنون لطیفہ نیز دیگر مختلف علوم غرض کہ ہر چیز میں نظر آتی ہے۔ نقاشی اور مصوری میں وسعت نظر مفقود ہو گئی۔ ہیئت کی ہم وضعی اور تخیل کی بلندی کا خاتمہ ہو گیا۔ اسلوب میں تصنع اور رنگینی پیدا کرنے کی زبردست کوشش کی جانے لگی اور اس طرح نسلی خصوصیت ہاتھ سے جاتی رہی۔ اسی طرح موسیقی میں بھی قدیم سنسکرت کی موسیقی کے وہ روح میں ارتعاش اور ہیجان پیدا کرنے والے تصورات نقش معدوم بن گئے۔ کوئی سُر بھی اپنی جگہ قائم نہیں رہا اور کی حیرت انگیز کیفیت خواب و خیال ہو گئی۔ ہر سُر کی انفرادیت کا خاتمہ ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آجکل کی موسیقی محض بے ترتیب کا سُروں کا ایک مجموعہ بن کر رہ گئی ہے۔

یہ موسیقی اب کیا ہے۔ سُرگموں کا ایک انبار اور وہ بھی ابتری و انتشار کا شکار۔ یہ اس کی پستی کی نشانی ہے زوال کی علامت ہے۔ اسی طرح اگر آپ اس زمانے کے غیر مادی روحانی تصورات اور عقائد کا تجزیہ کرنے بیٹھیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ ان پر بھی اسی قسم کے تصنع اور آراستگی و پیراستگی کا غلبہ ہے، جدت کا کہیں نام ہی نہیں۔ یہاں تک کہ ہمارے مخصوص موضوع یعنی مذہب میں بھی انحطاط اور زوال کے آثار نظر آنے لگے۔ کتنے بڑے دکھ کی بات ہے کہ اسی طرح سال بسال گرتے گرتے ہم پستی کی انتہائی گہرائیوں تک پہنچ گئے ہیں۔ آپ ہی سوچیے کہ ایک ایسی نسل سے آپ کو کیا توقع ہو سکتی ہے جو کئی صدیوں سے محض ان فروعی باتوں پر

بحث ومباحثہ میں پڑی ہوئی ہے کہ ہمیں پانی دائیں ہاتھ سے پینا چاہیے کہ بائیں ہاتھ سے۔ اس سے زیادہ پستی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہمارے ملک کے بڑے بڑے اہل دماغ سالہا سال ایک تو اچھوتوں سے متعلق اس قسم کے مسائل میں الجھے رہے کہ یہ چیز کھانا چاہیے یا وہ اور دوسرے چھوت چھات کے متعلق عالمانہ بحث سے مغز پچی کرتے رہے کہ میں آپ کو چھوؤں یا نہیں یا آپ مجھے چھو سکتے ہیں یا نہیں۔ اور اگر اچھوت کسی کو چھولے تو اس کی کیا سزا ہونا چاہیے۔ اس قابل رحم گراوٹ کا نتیجہ یہ نکلا کہ ویدانت کی تعلیمات اور خدا نیز روح کے متعلق اعلیٰ اور بلند ترین عقائد بہت بڑی حد تک لوگوں کے دماغوں سے مٹ گئے۔ زندگی بخش تصورات کو شہر بدر ہو کر جنگلوں میں پناہ لینا پڑی جہاں معدودے چند سنیاسیوں نے ان کا تحفظ کیا۔ باقی تمام قوم چھوت چھات کے پھیر میں پڑی رہی۔ اس کا کام صرف غذا اور پوشاک کے ہنگامی موضوعات پر بحث ومباحثہ کرنا رہ گیا۔ تو یہ تھی آریہ قوم کی حالت اس زمانے میں جب مسلمان حملہ آوروں نے ہندوستان پر اپنی حکومت کی بنیاد رکھی۔ اسلامی راج سے ہندوستان کو کچھ حاصل بھی ہوا لیکن اس سے ہماری نسل کو کسی قسم کی قوت نہیں پہنچی ، اس میں زور نہیں پیدا ہوا۔ مسلمانوں کے بعد انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ جما لیا۔ یہاں مجھے اس سے بحث نہیں کہ انگریزی راج ہمارے حق میں برا ثابت ہوا یا اچھا۔ میں جانتا ہو کہ غیر ملکی حکومت بجائے خود برائی کی جڑ ہے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ غیر ملکی غلامی ایک نہایت درجہ روح فرسا عذاب ہے، ایک باعث شرم گناہ ہے، لیکن بعض مرتبہ برائی سے بھی بھلائی کا پہلو پیدا ہو جاتا ہے۔ انگریزوں کی حکومت سے بھی ہمیں کچھ فائدہ ہی پہنچا ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ صرف انگلستان ہی نہیں، سارا یوروپ اپنی تہذیب کے لئے یونان کا منت پذیر ہے۔ یوروپ کی ہر چیز میں یونان کا رنگ جھلکتا ہے، یوروپ کی ہر زبان سے یونان کی آواز آتی ہے۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یورُپ کی ہر عمارت پر، ساز و سامان کی ہر چیز پر یونان کی چھاپ ہے۔ سائنس ہو یا آرٹ یوروپ کے سارے علوم وفنون دراصل یونان کے ذہن کی پیداوار ہیں۔ یہ بے بہا دولت یورپ کو یونان ہی سے ملی ہے۔ ہندوستان کو انگریزی راج اور کچھ ملا ہو یا نہ ملا ہو اتنا ضرور ہوا ہے کہ اس کی سرزمین پر آج قدیم آریہ تشکل کی یونانی اور ہندو شاخیں ضرور مل رہی ہیں۔ قدیم یونانی اور ہندو تہذیب کا دوبارہ اتصال ہو رہا ہے اور ایک نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ زندگی میں ہر طرف ایک نئی حرکت ایک نئی خلش نمودار ہو رہی ہے۔ اس دور میں یہ جو وسعت پذیر اور حیات بخش نئی تحریک جاری ہے وہ انہیں دونوں طاقتوں

---

میرا پیغام — صفحہ ۲۹

کے امتزاج سے پیدا ہوئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حیات عالم ایک ہی منزل کی طرف قدم اٹھا رہی ہے، یہ تحریک جس سے ایک طرف ماضی کی عظمت اور شان ابھر رہی ہے اور دوسری طرف مستقبل کی قوت اور حشمت کی جھلک نظر آتی ہے، ہندوؤں کی دروں بینی اور یونانیوں کی جمال پرستی کے باہمی اتصال سے جنم لے رہی ہے۔ زندگی ہر روز زیادہ سے زیادہ وسیع اور کشادہ ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ہمارے خیال میں وسعت اور ہمہ گیری اور ہمارے احساسات میں گہرائی پیدا ہو رہی ہے۔ شروع شروع میں تو ہم اپنی قومی زندگی کے نئے انداز کو سمجھ نہیں پائے۔ ہم نے غلط فہمی کے زیر اثر تنگ دلی سے کام لیا اور اس بات کی کوشش کی کہ اپنی خود ساختہ پرانی حدود کے اندر ہی مقید رہیں۔ اب ہم کو پتہ چل گیا ہے کہ کشادہ دلی کی یہ لہریں جو ہماری قومی زندگی کی بظاہر پرسکون سطح پر نمودار ہو رہی ہیں در اصل ہماری نسلی اور قومی عظمت کی ہی ایک نئی صورت ہیں۔ ہمارے سطحی جمود کو ہماری گہرائی کی ایک کروٹ نے پھر سے توڑ دیا ہے۔ زندگی کے متعلق ہمارے نظریوں میں یہ جو وسعت آج نظر آتی ہے وہ ہماری مقدس قدیم کتابوں کی منطقی نتیجہ ہے۔ ہمارے بزرگوں نے جو بنیادی تصورات قائم کئے تھے آج انہیں پر عمل ہو رہا ہے۔ آخر وسعتِ نظر کا پیدا کرنا ہی تو ہماری زندگی کی غایت انتہائی ہے۔ عملی اشتراک و امتزاج ہی تو ہمارا مذہبی معیار ہے۔ انفرادی عنانیت کو مٹا کر کائناتی شخصیت کا ظہور ہی تو ہمارا روحانی مقصد ہے، تمام کائناتی ذروں کو ملا کر عالمی حیثیت بخشنا، قطروں کو سمندر ہونے کا احساس دلانا ہی تو ہمارا آدرش ہے۔ یہی سبق تو ہمیں اپنی مذہبی کتابوں اور اپنے بزرگوں سے ملا ہے۔ اگر ہم اتنے دنوں تک اپنے آپ کو حقیر اور کمتر سمجھتے رہے ہیں تو یہ ہمارا ہی قصور ہے۔ اگر ہم میں ابتری پیدا ہو گئی ہے تو اس کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔ یہ صورت حال اس نقشے کے مطابق نہیں جو ہمارے بزرگوں نے ہماری مذہبی کتابوں میں کھینچ رکھا ہے۔ ہمیں ان کے اس مقرر کردہ معیار پر پورا اترنے کی کوشش کرنا ہو گی۔

ہمارے راستے میں متعدد خطرے درپیش ہیں اور ان میں ایک خطرہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنے آگے دوسروں کو تو ہیچ سمجھیں اور خود کو دنیا کی اعلیٰ ترین قوم کہتے پھریں۔ حب الوطنی کا جذبہ میرے دل میں بھی موجود ہے اور میں بھی اپنے اسلاف کا تہہ دل سے احترام کرتا ہوں اس کے باوجود میرا خیال ہے کہ ہمیں دنیا کی دوسری قوموں سے بھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔ ہمیں ہر اس شخص اور ہر ایسی قوم کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے

جس میں ہمیں کچھ سکھانے کی صلاحیت ہے۔ یاد رکھئے کہ ہمیں دوسروں سے بہت کچھ سبق مل سکتا ہے۔ ہم ہر شخص اور ہر قوم سے کچھ نہ کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ہمارے محسنِ اعظم منوجی کا ارشاد ہے کہ ہم کو نیچ سے نیچ لوگوں سے بھی کچھ نہ کچھ سیکھنا چاہیئے۔ پست نژاد لوگوں سے ہم یہ سیکھ سکتے ہیں کہ سچی خدمت کیا ہے اور خدمت کے ذریعہ نجات کیونکر حاصل کی جاسکتی ہے اس لئے صحیح معنوں میں منوجی کی اولاد ہونے کی حیثیت سے ہمیں ان کے حکم پر چلنا چاہیئے اور دنیا اور ماسوا کے متعلق جس کسی سے بھی کچھ علم حاصل ہوسکے اسے حاصل کرنا چاہیئے۔ یہ امر بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ ہمیں بھی دنیا کو ایک پیغام عظیم دینا ہے۔ ہندوستان کے باہر جو دنیا آباد ہے اس سے الگ تھلگ رہ کر ہم کسی طرح سے بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ ہمارا خیال تھا کہ اس علیٰحدگی سے ہمارا کام چل سکتا ہے لیکن یہ ہماری غلطی تھی بھول تھی اور ہم نے تقریباً ایک ہزار سال تک دوسروں کے غلام رہ کر اپنی اس حماقت کا خمیازہ اٹھایا ہے۔ ہمارے قومی زوال کا واحد سبب یہی ہے کہ ہم نے ہندوستان سے باہر جاکر دوسری قوموں کے ساتھ اپنے حالات کا مقابلہ نہیں کیا۔ ہم نے ان کارروائیوں پر نظر ہی نہیں رکھی جو ہمارے گردو پیش کے ملکوں میں جاری ہوتی رہی ہیں۔ اس کوتاہ نظری کی سزا ہمیں مل گئی۔ لیکن اب ہماری جانب سے ایسی کوتاہی نہیں ہونا چاہیئے۔ اس قسم کے خیالات کہ ہم ہندوستانیوں کو اپنے ملک سے باہر قدم نہیں نکالنا چاہیئے انتہا درجہ کی طفلانہ ذہنیت کا ثبوت ہیں۔ ایسے خیالات کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دینا ہی اچھا ہے۔ جس قدر زیادہ آپ اپنے ملک سے باہر جائیں گے اور دوسری قوموں میں گھومیں گے، آپ کے اور آپ کے ملک کے حق میں اتنا ہی بہتر ہوگا۔ اگر پچھلے سینکڑوں برسوں میں ہم نے خود کو دنیا سے الگ تھلگ نہ کر لیا ہوتا تو ہمیں ملک گیر قوموں کے سر نہ جھکانا پڑتا۔ ہماری صدیوں کی غلامی ہماری علاحدگی اور کم نظری سے پیدا ہوتی رہی ہے میرے کہنے کا منشاء یہ ہے کہ آپ کو پھیلنا چاہیئے، وسعت اختیار کرنا چاہیئے۔ ظہورِ زندگی کے معنی ہیں پھیلاؤ۔ جہاں زندگی ہے وہاں حرکت ہے وہاں آپ کو پھیلاؤ ضرور نظر آئے گا سکون تو موت کی نشانی ہے۔ اگر ہمیں زندگی مطلوب ہے تو طبعی روحانی پھیلاؤ کی بات کرنا ہوگی۔ اگر ہمیں ایک زندہ قوم کی حیثیت سے دنیا میں رہنا ہے تو دل و دماغ کی ہر قسم کی وسعت سے آشنا کرنا ہوگا۔ دبک کر بیٹھ رہنے سے کام نہیں چلنے کا۔ اس طرح تو موت ہمارے سر پر سوار ہو جائے گی۔

آپ نے ابھی میرے امریکہ اور یورپ کے سفر کا ذکر کیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مجھے وہاں جانا پڑا۔ کیونکہ مجھے اپنی قومی زندگی کے احیا کا ایک ایسا نشان پیدا کرنا تھا جس کو دیکھ کر ہمیں اپنے

زندہ ہونے یقین آجائے۔ میرا یورپ اور امریکہ کا دورہ ہماری قومی کی سب سے پہلی علامت ہے
ہماری قومی زندگی کی روح دوبارہ بیدار ہو رہی ہے اس بظاہر مردہ سے جسم میں ایک نئی جان پڑ رہی
ہے۔ اسے پنپنا ہے آگے بڑھنا ہے اور جوان ہو کر حرکت اور جوش میں آنا ہے۔ اسی خوابیدہ طاقت
کی ایک کروٹ نے مجھے یورپ اور امریکہ پہنچا دیا، اور وہ دن دور نہیں جب ہندوستان کی
ابھرتی ہوئی جوانی اور اس کی ہمہ گیر زندگی میری طرح دوسرے ہزاروں اشخاص کو دنیا کے کونے
کونے میں پہنچا دے گی تاکہ ہم بھی انسانی علم وشعور کے روز بروز بڑھتے ہوئے ذخیرے میں اپنے
حصے کا اضافہ کرسکیں اور دنیا میں نئے نئے انقلاب لانے کے لئے دوسری قوموں کے مددگار ومعاون
بنیں۔ یاد رکھئے کہ اگر ہماری قوم کو زندہ رہنا ہے تو ایسا ہو کر رہے گا۔ وسعتوں میں سانس لئے بغیر
زندگی ناممکن ہے۔ یہی خارجی پھیلاؤ، یہی نقل وحرکت ہمارے زندہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل
ہوگی۔ اس علامت سے ہماری زندگی کا پتہ چلے گا اور یہ کوئی نئی بات بھی تو نہیں ہے۔ آپ میں سے جو
حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستانی تو ہر زمانے میں اپنے ملک کی چار دیواری ہی کے اندر محبوس و
مقید رہے ہیں، ان کا خیال قطعی طور پر غلط ہے۔ اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو آپ نے ہماری قدیم کتابوں
کا ٹھیک مطالعہ ہی نہیں کیا۔ آپ نے اپنی قوم کی تاریخ صحیح طریقے سے پڑھی ہی نہیں۔ جائیے اور
ایک بار پھر اپنا اتہاس پڑھئے۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ دنیا میں صرف منفرد اشخاص ہی نہیں بلکہ
قومیں بھی ایک دوسرے کے سہارے سے جیتی ہیں۔ جو قوم فقط اپنے لئے جیتی ہے وہ جلد ہی
زندہ رہنے کا حق کھو بیٹھتی ہے۔ اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے ہر قوم کا فرض ہے کہ وہ
دوسری قوموں کو زندہ رہنے میں ان کی امداد کرے۔ ان کی دستگیری میں پیش پیش رہے۔ اس دنیا
میں صرف لینے سے کام نہیں چلتا، اس کے بدلے میں کچھ دینا بھی پڑتا ہے اور پھر زندگی کا بیش بہا
تحفہ تو زندگی کی پیشکش کے بدلے میں ہی ملتا ہے۔ اب ذرا سوچئے کہ ہماری قوم پچھلے ہزاروں سال
سے زندہ ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے۔ "آخر کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری" اور
وہ بات مسلمہ طور پر یہ ہے کہ ہماری قوم ہمیشہ دوسری قوموں کو مذہب، فلسفہ، روحانیت اور عرفان
آگہی کا بیش بہا تحفہ پیش کرتی رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ صرف فوجی فتوحات کو سمجھنے کی
اہلیت رکھتے ہیں۔ ان کو شاید یہ نہیں معلوم کہ مذہبی اشاعت اور روحانی پیام رسانی کے لئے لشکروں
کی ضرورت نہیں ہوتی۔ عرفان وآگہی کی نقل وحرکت کے لئے خون کے دریا بہانا لازمی نہیں۔ یہ فرشتے
تو صلح وآشتی کے پروں سے پرواز کرتے ہیں۔ علم اور فلسفہ خون آلودہ جسموں کو روند کر نہیں

پھولتے پھلتے۔ انہیں جبر و تشدد کے سہارے کی ضرورت نہیں انہیں تو امن اور محبت کے نشہ پر ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ حقیقت سمجھ میں ذرا مشکل سے آتی ہے۔

لندن میں ایک معزز خاتون نے مجھ سے دریافت کیا "تم ہندوؤں نے آخر کیا ہی کیا ہے۔ تم نے تو کبھی کسی قوم کو بھی فتح نہیں کیا"۔ ایک انگریز کے نقطۂ خیال سے یہ بات بالکل صحیح ہے۔ کیونکہ انگریز کا کردار ایک بہادر اور جنگجو سپاہی کا کردار ہے اور بہادر سپاہی کی شان اسی میں ہے کہ وہ دوسروں پر فتح یاب ہو۔ اس نقطۂ خیال سے تو اس معزز خاتون کا ارشاد بالکل درست ہے۔ لیکن ہمارے نقطۂ نظر سے معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اگر میں خود اپنے آپ سے یہ سوال کروں کہ ہندوستان کی عظمت کا حقیقی سبب کیا ہے؟ تو میرا جواب یہ ہوگا کہ ہماری عظمت کا راز یہ ہے کہ ہم نے کبھی کسی دوسرے ملک کو بزور شمشیر فتح نہیں کیا اور نہ آج تک کسی قوم کو غلام ہی بنایا ہے۔ ہماری شان اسی میں ہے۔ مجھے یہ سنکر بڑی تکلیف ہوتی ہے انتہائی دکھ ہوتا ہے کہ ہم میں سے بعض اشخاص کی معلومات اگرچہ اس قدر کم بھی نہیں تاہم آئے دن اپنے مذہب کی برائی اس بنا پر کرتے رہتے ہیں کہ ہندو مذہب میں دوسروں کو مغلوب کرنے کی طاقت نہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہندو مذہب نے کبھی جارحانہ صورت اختیار نہیں کی۔ یہی تو ہمارے مذہب کی کمزوری نہیں بلکہ اس کی عظمت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ اس لحاظ سے ہمارا مذہب دوسرے مذاہب کے بمقابلہ زیادہ سچا ہے۔ کیونکہ اس نے کبھی کسی کو مفتوح و مغلوب نہیں بنایا۔ نہ ہی اس نے کبھی کسی قسم کی خونریزی کی اجازت دی۔ اس کی زبان سے سب کے حق میں ہمیشہ خیر و برکت، صلح و امن اور مہر و محبت کے کلمے نکلتے رہے ہیں۔ ہندوستان ہی وہ ملک ہے جہاں سب سے پہلے رواداری کی تعلیم دی گئی اور صرف یہیں ہمدردی اور رواداری کے جذبے کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ کہنے کو تو دوسرے ملکوں میں بھی لوگ رواداری کا دم بھرتے ہیں لیکن محض نعرہ بازی سے ان باتوں میں ترقی نہیں ہوتی۔ ہمارے ملک میں تو رواداری عمل کی حد تک پہنچ چکی ہے یہ ہمارا ہی ملک ہے جہاں ہندوؤں نے مسلمانوں کے لئے مسجدیں بنوائی ہیں اور عیسائیوں کے لئے گرجا گھر تعمیر کرائے ہیں۔

آپ نے ملاحظہ کیا کہ ہمارا روحانی پیام بارہا دنیا کو پہنچا ہے لیکن رفتہ رفتہ، چپکے چپکے، نہایت خاموشی اور سکون کے ساتھ۔ یہی تو ہماری خصلت ہے کہ ہم کسی پر زبردستی نہیں کرتے، بے جا زور نہیں ڈالتے۔ خاموشی اور سکون ہندوستانی فکر کی خصوصیت میں داخل ہیں لیکن اس سکون کے پس پشت ایک اور زبردست طاقت مخفی ہے جس کا اظہار کبھی تشدد کی صورت میں نہیں ہوتا۔ ہندوستانی فکر کی

تہہ میں مسمریزم کا سا خاموش عمل ہوتا ہے۔ بسا اوقات دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر کسی دوسرے ملک کا باشندہ ہمارے ادب کا مطالعہ کرنے لگتا ہے تو شروع شروع میں اس کو اس سے بڑی کوفت ہوتی ہے ایسے ہمارے ادب میں وہ جوش وہ تحرک نہیں ملتا جس میں طبیعت میں اشتغال پیدا ہوتا ہے، مثلاً یوروپ اور ہندوستان کے المیہ ڈراموں (ٹریجڈی[1]) سے معلوم ہوتا ہے کہ یوروپ کی ٹریجڈی میں شروع سے آخر تک عمل وحرکت موجود ہے جس سے ڈرامے کے دوران وقتی طور پر ناظرین کے دل ودماغ میں خوب جوش پیدا ہو جاتا ہے لیکن جب کھیل ختم ہو جاتا ہے تو اس کا رد عمل اس طرح ہوتا ہے کہ اس کا سارا اثر دماغ سے زائل ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس ہندوستانی ٹریجڈی تو ایک طرح سے مسمریزم کی حامل ہے۔ ان ڈراموں کا ماحول پرسکون ہوتا ہے۔ جوش وخروش کے بجائے ان میں امن اور شانتی ہوتی ہے، آپ ان کا جتنا زیادہ مطالعہ کریں گے اتنی ہی آپ کی طبیعت ان کی طرف کھنچے گی، آہستہ آہستہ ان کا جادو آپ پر کچھ ایسا اثر کر جائے گا کہ آپ اس میں جکڑ کر رہ جائیں گے اور جس کسی نے بھی ہمارے ادب کو ہاتھ لگانے کی جرأت کی ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کے طلسم سے مسحور ہو گیا ہے۔ ہندوستان نے دنیا کے تخیلی سرمائے میں جو اضافہ کیا ہے اس کی مثال نرم ونازک شبنم کے قطروں کی سی ہے جو دبے پاؤں راتوں کی تاریکیوں کے سناٹے میں سیال درخشندگی کو ساتھ لئے ہوئے آسمان سے نازل ہو جاتے ہیں۔ جن کا گرنا نہ کسی کو دکھائی دیتا ہے نہ کوئی انہیں آتے دیکھتا ہے نہ کسی کو ان کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے لیکن ان قطروں سے آنکھوں کو تراوت اور دل کو فرحت اور تازگی میسر آتی ہے۔ اسی طرح ہندوستان نے جو کچھ بھی دنیا کو دیا ہے اس کا انداز کچھ ایسا لطیف ہے کہ بالکل غیر مرئی معلوم ہوتا ہے۔ اسے کوئی دیکھ نہیں سکتا پھر بھی اثر کے لحاظ سے اس میں ہر قسم کی طاقت ہوتی ہے۔ ہندوستان کی دین کو نہ کوئی دیکھ سکتا ہے نہ دکھا سکتا ہے لیکن دنیا اس کے اثر کو قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس کی خاموش طاقت کا کمال یہ ہے کہ تمام دنیا کے فکری نظام میں انقلاب آگیا ہے لیکن کچھ اس طرح کہ کسی کو اس انقلاب کے آنے کی کبھی خبر تک نہ ہوئی۔ ہماری قوت فکر کا یہ راز آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ایک مرتبہ مجھ سے کہا گیا کہ ہندوستان کی معرکہ آرا کتابوں کے مصنفوں کا نام اور پتہ دریافت کرنے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ میں نے جواب میں کہا کہ یہی تو ہم ہندوستانیوں کی خصوصیت ہے

---

[1] Tragedy

یہی تو ہمارے انداز فکر کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہاں خیال کی جدّت اور فکر کی گہرائی کو مصنفوں کے نام وغیرہ کے بمقابلہ زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ یہاں مُصنّف کا نام رہے یا نہ رہے مگر ان چیزوں کو زندہ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ قدیم ہندوستان کے مُصنّفوں کا معیار آج کل کے مصنّفوں سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ آجکل کے مُصنّف اپنی تصانیف میں ۹۰ فی صد خیالات تو دوسروں سے لیتے ہیں ان کے نتیجی خیالات دس فی صد سے زیادہ نہیں ہوتے لیکن ان میں اپنے متعلق کچھ اتنا زعم ہوتا ہے کہ دیباچوں میں ہمیشہ یہی ارشاد فرماتے ہیں کہ "ان خیالات کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر ہے"۔ وہ عظیم اہلِ دماغ جنہوں نے قلب انسانی پہ مہتم بالشان اثرات پیدا کئے ہیں، بڑے بے نیاز قسم کے بزرگ تھے۔ انہوں نے بڑی بڑی کتابیں لکھ ڈالیں مگر کبھی مصنف کی حیثیت سے اُنہوں نے اپنا نام نہیں ظاہر کیا اور چپ چاپ دنیا سے چل بسے۔ ہاں اپنے کارنامے آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے چھوڑ گئے کس کو خبر ہے کہ ہمارا فلسفہ کس کے دماغ کا نتیجہ ہے۔ کون جانتا ہے کہ ویدا اور اپنشد کس کی تصنیف ہیں۔ کچھ کتابیں ویاس، کپل اور بعض دوسرے رشیوں کے عام ناموں سے منسوب کی جاتی ہیں لیکن بیشتر کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کس کتاب کا مصنف کون ہے۔ یہ گیتا کی تعلیم کا عملی ثبوت کہ پھل کی فکر کئے بغیر اور نام و شہرت کی آرزو سے قطعی طور پر بے نیاز ہو کر یہ بزرگ ہمارے لئے علم و ہنر اور روحانیت کا اتنا بڑا اثاثہ چھوڑ گئے جس سے نہ صرف خود ہم مستفید ہوتے آئے ہیں بلکہ تمام دنیا کو فیض پہنچا ہے اور آج بھی پہنچ رہا ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خیالات کی نقل و حرکت کے لئے وسائل کا ہونا اتنا ہی لازمی ہے جتنا تجارتی مال کی درآمد و برآمد کے لئے۔ پچھلے زمانے میں یہ وسائل ایک عجیب انداز سے وجود میں آئے۔ یعنی وقتاً فوقتاً کئی قومیں ایسی اٹھیں جنہوں نے دنیا کے مختلف حصوں کو فتح کر کے ایک رشتے میں منسلک کر دیا۔ اس سلسلہ میں ہندوستان کا فلسفہ حیات دور دور تک پھیل گیا اور غیر شعوری طور پر ہر قوم کے رگ وریشہ میں پیوست ہو گیا۔ آج اس بات کے تاریخی ثبوت میسر ہو چکے ہیں اور آئے دن ان تاریخی ثبوتوں میں اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ ہندوستانی فلسفہ بدھ مت کے وجود میں آنے سے پیشتر ہی دنیا کے بیشتر حصوں میں داخل ہو چکا تھا اور اگر دیکھا جائے تو بدھ مت بجائے خود ہندو دھرم کی باغی اولاد ہے۔ بہر حال بدھ مت سے پیشتر ویدانت مت چین، ایران اور مشرقی مجموعۃ الجزائر میں پہنچ چکا تھا۔ اس کے بعد ہندوستانی فلسفہ ایک بار پھر اس زمانہ میں ابھرا جب یونان کی طاقت نے مشرقی دنیا کے

مختلف حصوں میں باہمی ربط پیدا کیا۔ عیسائی مت کو اپنی تہذیب پر بجا طور پر ناز ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی ہندوستانی فلسفے کی جزئیات کا ایک مجموعہ ہے۔ میرے کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مجھے بدھ مت یا عیسائیت کی عظمت کا اعتراف نہیں۔ دونوں مذہب اپنی اپنی جگہ عظیم ہیں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان دونوں کا بنیادی فلسفہ ہندوستان ہی کا فلسفہ ہے۔ بدھ مت تو خیر پیدا ہی ہندو دھرم کے ہاں ہوا لیکن عیسائیت پر بھی ہندو فلسفے کا اثر اظہر من الشمس ہے۔ یہ اثر اس گذشتہ دور کی نشانی ہے جب یونانی حکومت نے مغرب اور مشرق کے درمیان اختلاط اور ربط و ضبط پیدا کر دیا تھا۔ فی زمانہ پھر ایک دور کا آغاز ہو گیا ہے۔ آج انگلستان کی زبردست طاقت کے زیر دنیا کے مختلف حصے ایک دوسرے سے منسلک ہو رہے ہیں۔ انگلستان کی سڑکیں ملک روم کی سڑکوں کی طرح تھوڑی ہیں جو دنیا کے محض چند برّی علاقوں تک پھیلی ہوئی ہوں۔ یہ شاہراہیں تو بحری سطحوں پر بھی بچھ گئی ہیں اور دنیا کا ہر حصہ دوسرے حصوں سے ملا دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی کمیونی کیشن communication (رسل و رسائل) کے ذرائع میں اس قدر ترقی ہو گئی ہے کہ دنیا کی تمام وسعتیں سمٹ گئی ہیں اور فاصلے دور ہو گئے ہیں۔ ان موزوں اور موافق حالات میں ہم ہندوستان کو ایک بار پھر ابھرتا ہوا دیکھ رہے ہیں اس میں ایک بار پھر دورِ احیاء کا آغاز ہو گیا ہے اور آج پھر وہ دنیا کی ترقی اور تہذیب میں حصہ لینے کے لئے آمادہ ہے۔ یہ جو مجھے کسی طاقت نے امریکہ اور انگلستان جانے پر مجبور کر دیا اور میری معرفت وہاں ہندوستانی فلسفے اور روحانیت کے خیالات کی جو اشاعت ہوئی یہ اسی تحریک کا نتیجہ ہے۔ دیکھو وہ وقت آ گیا ہے کہ ہندوستان پھر دنیا کو روحانیت اور فلسفے کا اور امن و آشتی کا سبق دے رہا ہے۔ ہر بات میں مبارک آثار نظر آ رہے ہیں۔ ہندوستان کا فلسفہ ہندوستان کا روحانی مسلک ایک بار پھر ملک سے باہر جا کر دنیا کو فتح کرے گا۔ اسی لئے ہمارے سامنے جو مسئلہ در پیش ہے اس کی اہمیت اور اس کے امکانات میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ ہمارے لئے صرف اپنے ملک کے احیاء پر قانع رہنا ہی کافی نہیں یہ تو ایک معمولی بات ہے۔ میری نظر تو بہت دور تک پہنچتی ہے میں تو چاہتا ہوں کہ ہم تمام دنیا پر چھا جائیں۔

دنیا میں بڑی بڑی فاتح قومیں ہوئی ہیں۔ ہم نے دوسروں کے ملک تو فتح نہیں کئے ہم نے کسی کو اپنا غلام تو نہیں بنایا لیکن اگر مذہب، روحانیت اور فلسفے کی فتوحات کا خیال کیا جائے تو ہمارا شمار بھی فاتحانِ عالم میں ہونا چاہئے۔ ہماری فتوحات کا ثبوت شریف النفس

---

مہاراجہ اشوک کے کارناموں سے ملتا ہے۔ ہندوستان کے اس شہنشاہ نے مذہب اور روحانیت کی فتح کو ملک گیری پر ترجیح دیکر ہمارے کردار کو ہمیشہ کے لئے مجسم بنا دیا ہے۔ یہ کردار آج پھر نئے سرے سے زندہ ہورہا ہے ایک بار پھر دنیا پر ہندوستان کی فتح ہوگی اور یقیناً ہوگی۔ میری زندگی کا تو یہی ایک خواب ہے، اسی کی خاطر میں جی رہا ہوں اور میری خواہش ہے کہ آپ میں سے ہر شخص میرے اس سنہرے خواب کو دیکھے اور حقیقت کی اس جھلک کو دیکھ کر اس کے لئے اس قدر وارفتہ و دیوانہ ہوجائے کہ جب تک اس خواب کی تکمیل نہ ہوجائے کہیں دم لینے کا نام نہ لے میں جانتا ہوں، مجھے یقین ہے کہ بعض حضرات آپ سے یہ کہیں گے کہ پہلے اپنا گھر کا سدھار کیجئے پھر دوسروں کی فلاح وبہبود میں سر کھپایئے، پہلے اپنے دیش کی خبر لیجئے پھر دوسرے دیشوں کا بھی خیال کر لیجئے گا۔ لیکن مجھے ایسے حضرات سے اتفاق نہیں ہے۔ میں تو یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ دوسروں کا بھلا کرنے سے خود اپنا بھی بھلا ہوجاتا ہے۔ دوسروں کے لئے کام کرنے سے اپنا کام تو ساتھ ہی ساتھ ہوتا جاتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ گذشتہ زمانے میں بھی ہم نے ترقی اسی وقت کی ہے جب ہم نے دوسروں تک روحانیت کا پیغام پہونچانے کا نیک کام سرانجام دیا ہے اور سمندر پار جاکر غیر ملکی زبانوں میں اپنے خیالات کی اشاعت کی ہے اور یہ جلسہ اس بات کا بدیہی ثبوت ہے کہ کس طرح دوسرے ملکوں کو ہندوستان کے روحانی خیالات سے مستفید کرنے کے ساتھ ساتھ خود ہمارے ملک کو بھی فائدہ پہونچ رہا ہے۔ اگر میرے خیالات ہندوستان ہی تک محدود رہتے اگر میں ملک سے باہر نہ گیا ہوتا، تو یہاں میری تقریر سننے کون آتا۔ میرے انگلستان اور امریکہ جانے سے جو اثر یہاں پیدا ہوا ہے اور جس خوشی کا اظہار آپ نے کیا ہے اس کا چوتھائی حصہ بھی دیکھنے میں نہ آیا ہوتا۔ اسی لئے تو میں آپ سے صرف ایک بات کہوں گا اور وہ یہ ہے کہ آپ کا سب سے بڑا آدرش ہے ساری دنیا پر ہندوستان کی روحانی فتح۔ ہمیں اس سے کم کسی چیز کو قبول نہیں کرنا چاہیئے، ہم سب کو اس آدرش کی تکمیل کے لئے کمربستہ ہوجانا چاہیئے اور اس کے لئے حتی الامکان زیادہ سے زیادہ کوشش کرنا چاہیئے۔ اگر غیر ملکی لوگوں نے ہم پر تلوار کے زور سے حکومت کی ہے تو اس کا علاج یہی ہے کہ تم بھی کھڑے ہوجاؤ، مستعدی سے کام لو، اپنی روحانیت کے ذریعہ ساری دنیا پر چھا جاؤ اور جیسا کہ اس سرزمین پر پہلے بالاعلان کہا جا چکا ہے یاد رکھو کہ محبت ہمیشہ نفرت پر غالب آتی ہے۔ نفرت کو نفرت سے کبھی سر نہیں کیا جا سکتا۔ مادیت اور مادیت سے پیدا شدہ مصائب پر غلبہ مادیت سے نہیں حاصل ہوسکتا۔ جنگ وجدل سے جنگ وجدل کا خاتمہ نہیں

ہوتا جب فوجوں کا مقابلہ فوجوں سے کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو جنگ کے امکانات اور بھی بڑھ جاتے ہیں، فوجوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے اور اس سے انسانوں میں درندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ فوجی طاقت پر تکیہ کرنے والے اہل مغرب کو بھی اب آہستہ آہستہ یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ قوموں کے تحفظ کے لئے ان کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہے روحانیت۔ لیکن مغرب والوں کو ابھی یہ نہیں نظر آتا کہ آخر یہ مقصد کیونکر حاصل ہوگا۔ مغرب کو پھر ایک نہ ایک رہنما کی ضرورت ہے۔ آخر انہیں یہ روحانیت حاصل کہاں سے ہو؟ کہاں ہیں وہ لوگ جو ہندوستان کے مہارشیوں کا پیغام لے کر دوسرے ملکوں میں جانے کے لئے تیار ہوں؟ کہاں ہیں وہ لوگ جو اس مقصد کے لئے اپنا سب کچھ قربان کے لئے آمادگی ظاہر کریں کہ دنیا کے ایک ایک کونے تک ان رشیوں کا پیغام پہونچ جائے۔ حق اور صداقت کے اس پیغام کو نشر کرنے کے لئے ایسے ہی جانبازوں کی کی ضرورت ہے۔ ہندوستان کے باہر جا کر ویدانت کے عظیم حقائق کی اشاعت کے لئے ایسے بہادر اور سورما درکار ہیں۔ دنیا کو پھر سے حق و صداقت کی راہ پر لانا ضروری ہے ورنہ دنیا برباد ہو جائے گی۔ سارا مغرب ایک آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر بیٹھا ہوا ہے کون جانے کہ یہ پہاڑ کب پھٹ جائے اور پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے۔ مغرب والوں نے دنیا کا گوشہ گوشہ چھان ڈالا ہے لیکن انہیں کہیں امن وسکون کی صورت نظر نہیں آئی۔ ان لوگوں نے خوب سیر ہو کر عیش وعشرت کی شراب پی ہے اور دیکھ لیا ہے کہ اس عیش وعشرت میں ذرا بھی حقیقت نہیں۔ اس میں نام کو بھی پائیداری نہیں ہے۔ یہ تو خود ستائی کی ایک صورت ہے اس سے کچھ ہاتھ آنے کا نہیں۔ اب وہ وقت آپہنچا ہے کہ ہندوستان کے روحانی خیالات کی اشاعت عالمگیر پیمانے پر کی جائے تاکہ یہ خیالات مغرب کی نس نس میں داخل ہو جائیں۔ اس لئے اے مدراس کے نوجوانو! یاد رکھو کہ ہندوستان سے باہر قدم نکال کر ہمیں اپنی روحانیت اور فلسفے کے ذریعہ ساری دنیا پر چھا جانا ہے اس کام میں جان کی بازی لگا دو۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں۔ قومی بیداری کی یہی مقدم شرط ہے، قوم کی ابھرتی ہوئی طاقت کا یہی تقاضا ہے۔

ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بات بھی بھولنا نہیں چاہئے کہ روحانی خیالات کے ذریعہ دنیا کی تسخیر سے میرا مدعا یہ نہیں ہے کہ ہم ان ہزاروں قسم کے توہمات کی اشاعت کرتے پھریں جنہیں ہم مذہب کا نام دیکر ایک مدت دراز سے سینے سے لگائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ ہمیں دنیا کو روحانیت کے حیات آفریں اصولوں سے آگاہ کرنا ہے۔ توہمات کو تو خود اپنی سرزمین سے بھی خارج کرنا ہے

انہیں بیخ دین کی جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہے تاکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کا خاتمہ ہو جائے۔ ہمارا یہ قومی زوال انہیں توہمات کا نتیجہ ہے اور اگر ہم نے ان توہمات کو ترک نہ کیا تو ہماری تمام دماغی صلاحیتیں نیست و نابود ہو جائیں گی۔ ایسا پست دماغ جس میں نہ قوت پرواز ہو نہ قوت خیال، ہماری انفرادی اور قومی زندگی کے لئے ایک نہایت خطرناک چیز ہے۔ جس طرح بھی ہو ہمیں اس قسم کی ذہنیت سے خود کو بچانا چاہیئے جس میں زور اور قوت کا نام تک نہیں اور جو مذہب کے نام پر قسم قسم کے توہمات سے مسموم ہو چکی ہو۔ ہمیں اپنی قومی ترقی کے لئے دو باتوں کی خاص طور پر ضرورت ہے۔ ایک تو کئی قسم کے خطرات کا سامنا کرنا چاہیئے مگر یاد رہے کہ سب سے زیادہ خطرناک پرلے سرے کی مادہ پرستی ہے اور دوسرے حد درجہ کی توہمات پرستی سے بچنا چاہیئے۔ ایک طرف تو وہ لوگ ہیں جو مغربی علوم کی شراب کا محض ایک گھونٹ پی کر سمجھنے لگے ہیں کہ وہ دنیائے کل ہیں، تمام عقل و دانش انہیں پر ختم ہو گئی ہے۔ یہ لوگ ہمارے قدیم رشیوں منیوں کا نام سنکر ہنس پڑتے ہیں اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان کی نظر میں ہندوستان کا تمام سرمایۂ فکری ایک قسم کی فضول بکواس ہے اور ان کا فلسفہ بچوں کی بے معنی باتوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ وہ مذہب کو احمقوں کا ڈھکوسلا سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف کچھ ایسے لوگ ہیں جو تعلیم یافتہ ہونے پر بھی مذہب کے معاملے میں دماغی توازن کھو بیٹھتے ہیں۔ ان کی انتہا پسندی، خبط کی حد تک جا پہنچی ہے۔ مذہب ان کے لئے ایک توہمات کا پلندہ بن کر رہ گیا ہے۔ ایسے اشخاص اپنے مخصوص نسلی، سماجی اور قومی توہمات کی توضیح فلسفہ اور مابعد الطبیعات کی رو سے کرتے پھرتے ہیں۔ ان طفلانہ باتوں کی حد یہ ہے کہ گمنام سے گمنام گاؤں کے مقامی توہمات کو ویدک احکام (احکام الٰہی) کا درجہ دیدیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ان احکام کی پابندی پر ہی قومی زندگی کا انحصار ہے۔ مجھ سے پوچھو تو اس قسم کے پڑھے لکھے جاہل سے تو منکر ہونا زیادہ اچھا ہے، جو شخص خدا کے وجود سے انکار کرتا ہے اس میں کم از کم جان تو ہے، اس میں انکار کی جرأت تو ہے۔ اپنے اسی انکار کے دم سے وہ ارتقائے حیات کی بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے۔ لیکن جہاں زندگی کے آثار ہی نہ ہوں، جہاں عقل و ہوش سے کچھ سروکار ہی نہ ہو، جہاں دماغ میں توہمات ہی توہمات بھرے ہوں وہاں بھلا ترقی اور ارتقا کی کوئی امید ہو سکتی ہے۔

توہمات دماغی کمزوری کی علامت ہیں اور دماغی کمزوری موت کا پیش خیمہ ہے۔ دماغی کمزوری ہمیشہ انسان کے انحطاط اور تنزل کا باعث ہوتی ہے اس لئے ہر صورت میں اپنی دماغی

قوت کی حفاظت کرو۔ دنیا بہادروں کے لئے ہے۔ بہادر بنو۔ حوصلے سے کام لو۔ زندگی تمہارے قدموں میں کھیلے گی۔ آج ہندوستان کو ایسے شیر مردوں کی ضرورت ہے جن کے خون میں گرمی اور جوش ہو۔ جن کے دست و بازو میں قوت اور توانائی ہو۔ جن کے اعصاب میں لوہا بھرا ہوا ہو اور جن کی رگوں اور نسوں میں فولاد کا تناؤ ہو۔ بزدلوں کے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں۔ ہمیں ان بے معنی باتوں سے کچھ مطلب نہ ہونا چاہئے جن سے کمزوری پیدا ہو۔ ایسی باتیں چھوڑ دو۔ مابعد الطبیعات سے تعلق رکھنے والی اور پراسرار باتوں کو ترک کر دو۔ مذہب اور روحانیت کو رموز و اسرار سے کیا واسطہ۔ مذہب کوئی جادو ٹونے کا سلسلہ تو ہے نہیں۔ مذہب کی ہر بات کھلے بندوں ہوتی ہے۔ اسرار بازی تو محض پاکھنڈ ہے پاکھنڈ۔ کیا ویدانت اور ویدوں سنگھتاؤں اور پرانوں میں کوئی بھید کی بات لکھی ہے؟ کیا قدیم زمانے میں ہمارے رشیوں منیوں نے اپنے خیالات کی اشاعت کے لئے کبھی کوئی خفیہ جماعت قائم کی تھی؟ کیا کہیں اس بات کا ذکر آیا ہے کہ انہوں نے روحانیت کے شاندار حقائق کو بنی نوع انسان کے سامنے میں چالاکی اور جادوگری سے کام لیا۔ خفیہ رسم و رواج اور توہمات یہ سب کے سب کمزوری کی علامتیں ہیں۔ انہیں باتوں سے تو زوال کا آغاز ہوتا ہے اور بالآخر قومیں مرجاتی ہیں۔ ان باتوں کو ترک کر دو۔ اپنے آپ کو مضبوط بناؤ۔ اپنے پیروں کے بل پر کھڑے ہو جاؤ۔ بھلا کبھی کوئی چیز جادو ٹونے سے حاصل ہوئی ہے۔ اس قسم کی امید کرنا بے بسی اور کمزوری کی نشانی ہے۔

میں جانتا ہوں کہ دنیا میں کئی ایسے غیر معمولی واقعات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں جن سے ہم پر حیرت و استعجاب کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ کئی ایسی باتیں دیکھنے سننے میں آتی ہیں جنہیں ہم معجزوں کا نام دیدیتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ باتیں جنہیں ہم مافوق الطبع قرار دیتے ہیں کبھی فطرت کے اصولوں سے باہر نہیں ہوتیں۔ قصور تو ہماری سمجھ کا ہے۔ ہمارے شعور و ادراک کا دائرہ محدود ہے اس میں وسعت پیدا کرو۔ پھر یہ معجزے اور یہ مافوق الطبع باتیں معمولی واقعات

---

یہاں سوامی دویکانند نے مادہ پرستی اور توہمات پرستی کو ایک یونانی افسانے کے دو کرداروں سلا اور چاربڈیس Scylla and Charybdis, سے تشبیہہ دی ہے جو چھ سروں والا ایک دیو تھا اور جو جہازرانوں اور ملاحوں کو پھاڑ کھاتا تھا اور ابنائے مینا کی چٹان پر ایک گرداب کے کنارے رہتا تھا۔

---

کی صورت میں نظر آنے لگیں گی۔ ان کی تشریح جادو ٹونے اور خفیہ رسومات سے کبھی ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ ان باتوں سے وسعت نظر تھوڑی پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک کی سرزمین پر کبھی اس خیال کی اشاعت نہیں کی گئی کہ مذہبی حقائق رمز بازی اور اسرار فروشی سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ مذہبی صداقتوں کا انحصار نہ تو پوشیدہ اسرار و رموز پر ہے اور نہ ہی یہ کسی جماعت خصوصی کی ملکیت ہیں جو ہمالیہ کے برف پوش غاروں میں چھپی رہتی ہے۔ میں تو ہمالیہ کی وادیوں میں خوب گھوما ہوں۔ آپ وہاں نہیں گئے۔ کیونکہ ہمالیہ آپ کے گھروں سے سینکڑوں میل دور ہے۔ میں تو ایک سنیاسی کی حیثیت سے مسلسل چودہ سال سے ملک کے گوشے گوشے میں گھومتا پھرتا رہا ہوں۔ مجھے تو کسی خفیہ جماعت سے پالا پڑا نہیں۔ میری بات پر یقین کرو اور ان توہمات کے پیچھے پڑنا چھوڑ دو خدا کے وجود سے انکار کر دینا اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ اس طرح تم میں طاقت تو آ جائے گی خود اعتمادی تو پیدا ہو گی۔ لیکن اگر توہمات کے گورکھ دھندے میں پھنس جاؤ گے تو گراوٹ تباہی اور موت ہو جائے گی۔ میں نہیں سمجھتا کہ انسانی غیرت یہ کیسے گوارا کر سکتی ہے کہ اچھے بھلے پڑھے لکھے صحت مند اور توانا لوگ کسی قسم کے توہمات کو نہ صرف قبول کریں بلکہ ان کی فرسودگی کے باوجود ان کی تاویل اور تشریح کے لئے مثالیں ایجاد کریں اور اس طرح اپنے وقت کا خون کریں۔ اس تضیع اوقات سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ ہمت سے کام لو اور توہمات کو محض توہمات سمجھ کر ترک کر دو۔ اس سے مذہب کی شان میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ ان توہمات کی حمایت ہی سے تو مذہب پر حرف آتا ہے اس کی بدنامی ہوتی ہے۔ جیوں جیوں وقت گذرتا ہے ہر مذہب میں قسم قسم کے توہمات پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ ہم میں بھی متعدد قسم کے توہّمات رواج پا گئے ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ یہ توہمات ہمارے جسم میں پھوڑے پھنسیوں کی طرح ابھر آئے ہیں۔ ہماری صحت کا دارومدار ان پر تو نہیں۔ ان سے خلاصی پاتے ہی سے ہماری توانائی کا اظہار ہو گا۔ ان تمام توہمات کو مٹا ڈالو یہ ہمارے مذہب، ہماری قومی زندگی اور ہماری روحانیت کے لئے قطعاً ضروری نہیں ہیں۔ ان کے مٹ جانے سے مذہب کو کوئی بھی نقصان نہیں پہنچ۔ مذہب کا ہر سچا اصول ہر صحیح نظریہ بجائے خود قائم ہے۔ ان اصولوں کو اپنے قیام و بقا کے لئے کسی خارجی سہارے کی ضرورت نہیں بلکہ جتنی جلد توہمات کے یہ سیاہ داغ مذہب کے پاک دامن سے دور ہو جائیں اتنا ہی ہمارے لئے اچھا ہے۔ ان توہمات کے مٹتے ہی ہمارے سنہری اصول جگمگا اٹھیں گے۔ ان کی شاندار تابانی پھر ابھر آئے گی۔ آج ان درخشاں اصولوں کی اس روشنی کی دنیا کو سخت ضرورت ہے۔ یوں تو دنیا کے

---

میرا پیغام صفحہ ۱۴۱

ہر مذہب کو دعویٰ ہے کہ اس میں عالمگیر ہونے کی صلاحیت ہے اور وہ آجکل کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ دعوے غلط اور بے بنیاد ہیں۔ یہ تو کبھی ممکن ہی نہیں کہ دنیا ایک ہی مذہب اختیار کرے۔ بنیادی اصول تو عالمگیر ہو سکتے ہیں لیکن مخصوص مذہبی رسم و رواج جو تاریخی اور مقامی حیثیت رکھتے ہیں، مقبول عام نہیں ہو سکتے۔ آجکل تو اسی مذہب سے دنیا کی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں جو مقامی اور تاریخی لوازمات سے بالاتر ہو۔ خوش قسمتی سے ویدانت تمام تر بھاری اور گراں مایہ اصولوں پر مبنی ہے۔ ویدانت کے علاوہ اور جتنے بھی مذاہب ہیں ان کا دار و مدار کسی ایک شخص کے تاریخی وجود پر ہوتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر کسی مذہب کی بنیاد کسی تاریخی ہستی پر ہے تو اس مضبوط بنیاد کو کوئی ہلا نہیں سکتا لیکن غور سے دیکھا جائے تو جس چیز کو مضبوطی سے تعبیر کیا جاتا ہے وہی مذہب کی ضعف اور کمزوری کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر کسی تاریخی ہستی کے مستند ہونے میں شک پیدا ہو جائے تو اس کے نام سے جو مذہب منسوب ہوتا ہے اس کی بنیادیں بھی ہل جاتی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ سب کے عظیم بانیان مذاہب کی زندگی کا نصف سے زیادہ حصہ غلط ثابت ہو چکا ہے اور باقی نصف حصہ بھی مکمل طور پر قابل یقین نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ان بانیان مذہب نے جن حقائق کی تعلیم دی تھی ان کو بھی دھکا پہنچ گیا ہے۔ ویدانت کا دار و مدار کسی ایک شخص پر نہیں ہے۔ ہمارے یہاں بھی بیسیوں بڑی بڑی ہستیاں گذری ہیں لیکن ویدانت کسی خاص ہستی کے نام سے منسوب نہیں بلکہ یہ سب اپنے آپ کو ویدانت کا مفسر کہتے ہیں اور تو اور بھگوان کرشن کو ہم اوتار مانتے ہیں لیکن ان کی عظمت کا راز اس بات میں نہیں ہے کہ وہ کرشن تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو ان کا نام بھی بدھ کی طرح ہندوستان سے مٹ گیا ہوتا۔ سری کرشن کی بڑائی تو اس میں ہے کہ انہوں نے دنیا کو ویدانت کی تعلیم دی اور کسی نئے مذہب کی بنیاد نہیں ڈالی۔ انہوں نے تو ویدانت کے اصولوں پر چلنے کا راستہ دکھایا ہے۔ ہم تو اصول کے بندے ہیں کسی خاص شخص کے غلام نہیں۔ یہ تمام بڑی بڑی ہستیاں اصولوں کا مجسمہ ہوتی ہیں۔ اگر اصول برقرار رہیں گے تو ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں عظیم الشان ہستیاں بھی ظہور پذیر ہو جائیں گی۔ اگر اصول محفوظ رہیں گے تو بدھ ایسے انسان ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں پیدا ہوتے رہیں گے لیکن اگر ہم مذہب کے اصولوں کو بھلا دیں انہیں اٹھا کر طاق پر رکھ دیں اور اپنی قومی زندگی کو کسی تاریخی ہستی سے وابستہ کر دیں تو پھر ہمارے مذہب کی خیر نہیں اس کے لئے ہر وقت خطرہ ہی خطرہ لاحق ہے۔ یہ صرف ہمارا ویدانت مت ہے جو کسی ایک خاص ہستی سے وابستہ نہیں۔ اس کا دار و مدار تو اصولوں پر ہے۔ انہیں بلند اصولوں

کے مرد ساز ماحول میں ہزاروں سنت مہاتما، فلاسفر اور پیغامبر پیدا ہوتے آئے ہیں اور آئندہ بھی پیدا ہوتے رہیں گے۔ ان اصولوں میں منطق اور فلسفے کی سی خشکی نہیں۔ ویدانت کی سرزمین وہ زرخیز سرزمین ہے جہاں سے انسانیت کے آدرش پیدا ہوتے ہیں۔ آدرش انسان مذہب اور روحانیت کی جان ہیں لیکن یہ کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ وہ اصولوں کے موجد نہیں ہوتے۔ ان کا مرقع ہوتے ہیں۔ ان کی مثال سے اصولوں کی بنیادی صداقت ثابت ہوتی ہے لیکن اصول خود اپنی جگہ قائم ہیں۔ ان کا دارومدار کسی انسان کی ہستی پر نہیں ہے۔ ویدانت کے تمام اصول آج بھی قائم ہیں ان کی صداقت میں ہزاروں سال گذرنے پر بھی رتی بھر فرق نہیں آیا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ رفتارِ زمانہ سے کچھ گرد ان کے چہرے پر بھی پڑگئی ہے یہ ہمارا فرض ہے کہ اپنے مذہبی اصولوں کے دامن سے صدیوں کے اس گرد وغبار کو دور کریں۔ ہماری زندگی کی آب وتاب میں فرق نہ آنے پائے۔ اس عرصے میں قوم پر ترقی اور تنزل کے کئی دور گذرے لیکن ویدانت کے اصول جیوں کے تیوں برقرار ہیں۔ ہمارے مذہبی گرنتھ دنیا کے سب سے زیادہ محفوظ گرنتھوں میں ہیں۔ دوسری کتابوں کی طرح ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوئی۔ کبھی ان کے اصل مفہوم کو بگاڑا نہیں گیا اور نہ کبھی من مانے مفہوم کی خاطر اصل عبارت میں ردوبدل کیا گیا۔ ان کے مطلب و معنی، ان کے غور وفکر کے اسالیب آج بھی پہلے کی طرح بدستور برقرار ہیں۔ آج بھی انسان کو ان سے اپنے نصب العین تک اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے ہدایت ملتی ہے۔ آج تک کبھی کسی شیطان سیرت شخص کی اتنی جرأت نہیں ہوئی کہ ان میں اپنی طرف سے کوئی شرانگیز اضافہ کر کے ان کی پاکیزگی کو نقصان پہنچا سکے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہمارے روحانی اصول اپنی اصل پاکیزگی کے ساتھ قائم ہیں تو پھر ہندوستان میں مختلف مذہبی فرقے کیونکر پیدا ہوئے اور بیشمار تفسیریں کیوں لکھی گئیں جو صاف طور پر ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ یہ سچ ہے کہ بہت سے مفسروں نے ہماری مقدس کتابوں کی متعدد تفسیریں لکھی ہیں۔ بڑے بڑے آچاریوں (معلموں) نے ان کی تعلیم دی ہے اور ان کی بنا پر متعدد فرقے وجود میں آئے ہیں۔ بعض بعض مقامات پر تو آپ کو خود ویدوں ہی میں ایسی باتیں ملیں گی جن میں باہم تضاد نظر آتا ہے مثلاً ان میں بعض جگہ دوئی کو تسلیم کیا گیا ہے اور بعض جگہ توحید کی تعلیم ملتی ہے۔ اب ہوتا یہ ہے کہ جب ویدوں میں ادویت (وحدت) کا ذکر آتا ہے دویت وادی (دوئی کے ماننے والے) اپنے محدود نقطۂ نظر کی وجہ سے اس کو بھی توڑ پھوڑ کر اپنے ہی نظریہ کے مطابق بنا لیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ پرچارک (مبلغ) اور پروہت (مذہبی علما) یہ سب کے سب مطالب کی

توضیح دویت وادی نقطۂ نظر سے کرتے ہیں۔ اسی طرح ادویت وادی ہر شلوک کو توڑ موڑ کر اپنے نظریۂ وحدت الوجود کی حمایت کرتے ہیں۔ اس طرح ویدوں کی بعض تعلیمات میں بظاہر تضاد پیدا ہو جاتا ہے لیکن اس میں ویدوں کا کیا قصور۔ دراصل یہ ثابت کرنے کی کوشش کرنا کہ ویدوں پر صرف دویت واد (دوئی) کی تعلیم ملتی ہے گویا برعکس اس کے ان سے صرف ادویت واد یعنی وحدت الوجود ہی کا ذکر کرنا ہے، اپنی کم علمی اور بے بصری کا اعلان کرنا ہے۔ بات یہ ہے کہ دویت واد اور ادویت واد اس تعلیم کے دو رخ ہیں جو ویدوں سے ہمیں ملتی ہے۔ اس طرح وید دونوں وادوں (عقیدوں) کی تعلیم دیتے ہیں۔ آج ہم جدید خیالات کی روشنی میں ویدوں کو بہتر سمجھنے لگے ہیں۔ انسان کی روحانی ترقی کے لئے دویت واد اور ادویت واد دونوں قسم کے عقائد کا ہونا ضروری ہے۔ انسان ایک درجے سے اٹھ کر دوسرے تک پہونچتا ہے اسی لئے ویدوں میں دونوں نظریوں کی تعلیم پائی جاتی ہے۔ یہ تو ویدوں نے ہم پر کیا، تمام نسل انسانی پر بڑا احسان کیا ہے کہ ہمیں بلند ترین منزل پر پہنچنے کے لئے مختلف راہیں بتائی ہیں۔ کبھی کبھی یہ راہیں ایک دوسرے کی ضد نظر آتی ہیں۔ دراصل ویدوں میں جتنے بھی مختلف طریقے بتائے گئے ہیں، سب کے مابین کسی قسم کا تضاد نہیں ہے۔ آخر وید کوئی بچوں کے دل بہلاوے کی کتابیں تو ہیں نہیں نہ ہی یہ کچھ لایعنی باتوں کا پلندہ ہیں۔ وید مقدس تو چھوٹوں بڑوں سب کو ان کی اہلیت کے مطابق روحانی راہ دکھاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جب تک ہم جسم اور حواس کی قید میں ہیں اور جب تک ہم میں "میں" کا خیال باقی ہے، جب تک ہم میں انانیت کا ذرا بھی شائبہ رہے گا ہم دنیا کے صرف خارجی پہلو کو دیکھ سکیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ ہمارے لئے تو ایک شخصی خدا کا ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ اگر ہم حواس خمسہ کے مقام سے بلند و بالا نہیں ہیں اگر ہمارا احساس خودی محض جسم تک ہی محدود ہے تو ہم کبھی پرماتما (خدا) پرکرتی (قدرت) اور جیو (منفرد روح) کے تصورات سے اوپر نہیں اٹھ سکتے۔ یہ اور یہ بات ہے کہ آپ کسی ایک پہلو پر زیادہ زور دیں لیکن اگر تینوں میں سے کسی ایک کو مانیں گے تو باقی دو کو بھی تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔ یہ ایک مثلث ہے اس مثلث کی ایک لکیر کو مانیں گے تو باقی دو لکیروں کے وجود کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ جب تک آپ کی نظر کے سامنے یہ خارجی دنیا موجود ہے، جب تک دیکھنے والی نظر دکھائی دینے والی دنیا سے اپنے آپ کو علاحدہ محسوس کرتی ہے اس وقت تک شخصی خدا اور منفرد روح کے بھی علاحدہ علاحدہ وجود کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس سے انکار کرنا کسی طرح بھی پاگل پن سے کم نہیں لیکن جب انسان روحانی ارتقار کی انتہائی منزل کے قریب پہنچ جاتا ہے تو رشیوں اور منیوں

میرا پیغام صفحہ ۴۴

کی طرح اس کی زندگی میں ایسے مواقع بھی پیش آجاتے ہیں جب اس کا دماغ اپنی حدود سے بھی برتر و بلند ہو جاتا ہے، جب وہ دائرۂ فطرت سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے اور اس عالم میں پہنچ جاتا ہے جس کے بارے میں مشرقی میں لکھا ہے:

"یہ وہ منزل ہے جس پر پہنچ جانے کا یقینی احساس ہوتا ہے لیکن جہاں بیان تو کیا خود قوت فکر کی بھی رسائی ممکن نہیں۔ انسانی دماغ اس مقام کی بلندی کے خیال کی تاب بھی نہیں لا سکتا نہ وہاں تک نگاہ پہنچ سکتی ہے نہ زبان اور نہ دل مگر پھر بھی نہ تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں جانتے اور نہ ہی یہ کہ ہمیں علم و عرفان کی دولت حاصل ہو گئی ہے۔ اس مقام پر انسانی روح تمام حدود کو پار کر جاتی ہے اور اس حالت میں ادویت یعنی وحدت الوجود کا مقدر جگمگا اٹھتا ہے اور انسان کہنے لگتا ہے کہ میری ذات اور یہ سارا عالم کائنات دونوں ایک ہی چیز ہیں، میری ہستی اور خُدا کی ہستی ایک ہی ہے۔"

روحانیت کے اس بلند ترین مقام پر صرف گیان یعنی معرفت اور فلسفے ہی کے ذریعہ نہیں پہنچا گیا ہے، ایشور بھگتی یعنی محبت الٰہی کے ذریعہ بھی انسان کو یہ عرفان حاصل ہوا ہے۔ شریمد بھگوت گیتا میں آپ نے پڑھا ہوگا کہ جب بھگوان سری کرشن الوپ ہو گئے (پردۂ غیب میں چھپ گئے) تو گوپیاں یکایک ان کی جدائی سے تڑپ اٹھیں اور رو رو کر بے حال ہو گئیں اس فرقت کی شدت میں وہ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھیں انہیں ہر وقت صرف سری کرشن ہی کا خیال رہنے لگا۔ یہاں تک کہ بھگوان کرشن کا دھیان ان کے دل پر اس قدر غالب آگیا کہ ہر گوپی اپنے آپ کو کرشن سمجھنے لگی اور کرشن ہی کی طرح لباس پہن کر کرشن ہی کی طرح کھیلنے لگی۔ دوسرے لفظوں میں ہر گوپی کی ہستی برہمہ کی ہستی ہو گئی، اس کے دل سے اپنے وجود کا شعور مٹ گیا اور وجود واحد کا احساس پیدا ہو گیا۔ یہ احساس وحدت جو عشق و محبت سے پیدا ہوا وہی عرفان ہے جو گیان سے حاصل ہوتا ہے اس خیال کو فارسی زبان کے ایک صوفی شاعر نے یوں بیان کیا ہے:

"میں اپنے محبوب کے گھر گیا۔ اس کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے آواز آئی "کون ہے"؟ میں نے جواب دیا "میں ہوں"، لیکن دروازہ نہیں کھلا۔ جب دوسری بار پھر میں نے دستک دی تو اندر سے پھر وہی آواز آئی۔ میں نے کہا "میں فلاں آدمی ہوں"، اس پر بھی دروازہ نہیں کھلا۔ میں تیسری بار پھر محبوب کے در پر گیا۔ پھر اندر سے وہی آواز آئی "کون ہے"؟ اب کے میں نے جواب دیا "میرے محبوب میں وہی ہوں جو تو ہے"۔ میرے یہ کہتے ہی دروازہ کھل گیا۔"

---

صفحہ ۴۵

میرا پیغام

یاد رکھئے کہ اس مقام پر پہنچنے کے لئے کئی مدارج اور مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ ارتقاء کا سلسلہ متواتر جاری ہے۔ اپنے اپنے رجحان طبیعت کے مطابق ہر شخص اپنے اپنے درجے سے گذر رہا ہے۔ اس بارے میں کسی قسم کا بحث و مباحثہ یا جھگڑا نہیں ہونا چاہئے۔ یہ جو کچھ اختلافات قدیم زمانے کے مفسروں کے درمیان نظر آتے ہیں وہ دراصل مختلف مراحل کا بیان ہیں لیکن اگر بفرض محال ان بزرگوں کے درمیان فی الواقع کچھ تفرقات ہیں بھی تو یہ کہاں کی دانش مندی ہے کہ ہم ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے لگیں۔ ہمیں ان بزرگوں کا پورا احترام ہے اور ہونا بھی چاہئے۔ لیکن علم کی تو کوئی انتہا ہے نہیں۔ علم کُل نہ عہد ماضی میں کسی ایک خاص شخص یا جماعت کی ملکیت رہا ہے نہ زمانۂ حال ہی میں اس کا کوئی واحد ٹھیکے دار ہے۔ اگر زمانہ گذشتہ میں بڑے بڑے رشی منی گذرے ہیں تو یقین رکھئے کہ اس زمانے میں بھی ایسے دانا و بینا ضرور پیدا ہوں گے۔ اگر پچھلے زمانے میں ویاس والمیکی اور شنکر آچاریہ ایسے بزرگ پیدا ہوئے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آج بھی آپ حضرات میں سے کیوں ہر شخص شنکر آچاریہ نہیں بن سکتا۔ اس سلسلے میں اس بات کا یاد رکھنا ضروری ہے دنیا کے تمام دوسرے مذاہب کی کتب مقدسہ کے تمام ارشادات الہامی قرار دیئے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ان الہامات کا انکشاف چند خاص ہستیوں کے ذریعہ ہوا۔ عوام الناس کو تو بس انہیں کی پیروی کرنا چاہئے۔ مثلاً عیسائیوں کے کہنے کے مطابق حقیقت عیسیٰ مسیح پر نازل ہوئی اور ہم سب کو ان کے ارشادات کی تعمیل کرنا چاہئے۔ ہندوستان میں بھی ہم کہتے ہیں کہ حقیقت کا نزول رشیوں پر ہوا۔ ہم ان رشیوں کو منتر ورشٹا کہتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کو منتروں کا دیدار حاصل تھا۔ یعنی جو چیز عام لوگوں کے لئے محض الفاظ ہی الفاظ پر مشتمل ہے وہ اپنی پوری آب و تاب سے ان پر چمک اٹھتی ہے اور ان کو ذاتی طور پر حقیقت کا شعور و احساس ہو جاتا ہے لیکن ہندوستان میں ہم کبھی یہ نہیں کہتے کہ صرف یہ رشی منی ہی حقیقت کے واحد علم بردار ہیں۔ ہمارا تو اصول یہ ہے کہ ؎ دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد۔ اگر ہم بھی ان رشیوں منیوں کی طرح یک سوئی کے ساتھ حقیقت کی جستجو کریں تو تمام حقائق ہم پر بھی نازل ہو جائیں گے۔ آخر کسی بات کا ثبوت تو اسی وقت ملتا ہے جب ہر شخص ذاتی طور پر اس کا تجربہ کر لیتا ہے۔ ذاتی تجربے کے لئے تیاری کی ضرورت رہتی ہے۔ لیکن اگر ہم میں اس تیاری کرنے کی ہمت ہے تو ہمارے ہی حلقے میں ایسے بیدار مغز، بلند فکر، اور روشن ضمیر پیدا ہوں گے جن پر پرانے رشیوں منیوں کی طرح ذاتی طور پر یہ حقائق نازل ہوں گے البتہ زبانی باتیں بنانے یا محض کتابی علم حاصل کر لینے سے حقیقت کا

شعور اور ادراک نہیں ہو سکتا۔ عالموں اور زبان دانی کے ماہروں کو کبھی حقیقت کا الہام نہیں ہوتا۔ اس کا نزول تو ان بزرگوں پر ہوتا ہے جو فکر و نظر رکھتے ہیں۔ ذات تک رسائی علم سے نہیں ہوتی۔ عرفان محض اعلیٰ ذکاوت یا محض کتب مقدسہ کے مطالعہ سے نہیں ملتا۔ یہ تو ہماری کتب مقدسہ میں بھی ارشاد کیا گیا ہے کہ آپ کو دنیا کی کسی اور مقدس کتاب میں یہ لکھا ہوا نظر آتا ہے کہ اس مقدس کتاب کو محض پڑھ لینے سے خدا کا دیدار نصیب نہیں ہوتا۔ ایسا کہنے کی ہمت ہمیں ہیں ہے ہمارے بزرگوں نے ہمارے ہی گرنتھوں میں یہ اعلان کیا ہے:

"محض ویدوں کو پڑھ لینے سے آتم درشن یا دیدار ذات کی دولت ہاتھ نہیں آسکتی۔ وصلِ الہٰی چیز ہی اور ہے۔ اسے پانے کے لئے عمل کی سخت راہ سے گذرنا پڑتا ہے۔ اپنے دلوں کے دروازے کھول دیجئے۔ محض مندروں مسجدوں یا گرجاؤں میں جانے یا پیشانی پر کسی قسم کا تلک لگا لینے سے یا کسی خاص وضع اور رنگ کے کپڑے پہن لینے کا نام مذہب نہیں ہے۔ آپ قوس و قزح تمام رنگوں سے لاکھ اپنی جامہ زیبی کر لیں لیکن جب تک آپ خود کو بھگوان کے رنگ میں نہیں رنگ لیں گے اس تمام ساز و سامان کے کوئی نہیں، یہ محض بے سود ہے۔"

ایک طرف آپ دنیا بھر کے علوم سے اپنے دماغ کو بھر سکتے ہیں لیکن اگر دوسری طرف آپکے دل میں کشادگی نہیں ہے اگر آپ پرماتما کے گیان یا معرفت الہٰی سے محروم ہیں تو آپ کی یہ ساری جسمانی اور دماغی آرائش فضول ہے۔ اصل بات تو حسن باطن کے نکھرنے کی ہے۔ یہ خارجی سامان یہ ظاہری رنگ و آرائش بھی تو بس ایک حد تک کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں بشرطیکہ ان کی مدد سے ہم اپنی زندگی کے حقیقی نقوش کو ابھار سکیں۔ ہمیں اس حد تک تو ان چیزوں کے مفید ہونے کا اعتراف ہے لیکن عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ ہم اپنا مقصد بھول جاتے ہیں اور صرف ان خارجی جزئیات ہی کو مذہب سمجھ بیٹھتے ہیں اور اس طرح راستے ہی میں بھٹک کر اپنی حقیقی منزل سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ جس چیز کو کام میں لاکر آگے بڑھنا تھا اسی سے کام میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ لوگ مندر، مسجد یا کلیسا میں جانے ہی کو مذہب سمجھ لیتے ہیں، ان کا مذہب کسی پنڈت ملّا یا پادری کو دان دینے ہی میں ختم ہو جاتا ہے۔ روحانی ارتقا کی رو سے یہ رجحانات سخت خطرناک ہیں ان کا انسداد فوراً ہونا چاہئے۔ ہمارے مقدس گرنتھوں میں تو بار بار یہی تنبیہہ اور تاکید کی گئی ہے کہ کوئی وسیع سے وسیع علم بھی ہمیں کبھی مذہب کے درجے تک نہیں پہنچا سکتا۔ مذہب تو اسے کہتے ہیں جس سے ہمیں ایک لامتغیر ہستی کا ادراک اور احساس ہوتا ہے۔ ہر شخص کا اصل

مذہب یہی ادراک ہستی ہے۔ جس شخص کو اس مافوق الفطرت حقیقت کا اشراق ہو جاتا ہے جس کو خود اپنی ذات میں آتما کا وجود محسوس ہوتا ہے اس کے متعلق یہ سمجھ لیجئے کہ وہ خدا کے روبرو پہنچ جاتا ہے۔ ایسے شخص کو جو خدا کو اپنی آنکھوں سے اپنے سامنے دیکھ رہا ہے، خدا ہی خدا نظر آتا ہے۔ ہمارے یہاں ایسے خدا رسیدہ آدمی کو رشی کہتے ہیں۔ رشی کے لفظی معنی ہیں "دیکھنے والا یا دیدار کردہ"۔ جب تک آپ کو یہ رشی کا درجہ حاصل نہیں ہو جاتا اس وقت تک آپ کی زندگی مذہبی نہیں کہلائی جا سکتی۔ اس درجے پر پہنچ کر ہی سچی مذہبی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سے پہلے تو محض تیاریوں کی منزل ہوتی ہے۔ رشیوں کے بلند مقام پر پہنچنے کے بعد ہی مذہب اور روحانیت کے حقیقی معنی سمجھ میں آتے ہیں۔ اس سے پہلے تمام مذہبی باتیں عام درس و تدریس کی باتیں ہوتی ہیں ان کی وقعت زبانی بحث و مباحثوں اور محض ذہنی ورزش اور قلابازیوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ سخت سے سخت ریاضتیں بھی جسمانی کلفتیں بھی اذیت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ یاد رکھئے کہ ہمارے مذہب کی صاف اور واضح تلقین یہ ہے کہ موکش یا نجات کے ہر طلبگار کو رشی کا درجہ حاصل کرنا ہے، منتر درشٹا بننا ہے پرماتما یا خدا کے دیدار سے سیر چشم ہونا ہے اسی کا نام ہے موکش یا نجات۔ یہ ہے وہ آئین جس کا ذکر ہمارے مذہبی گرنتھوں میں کیا گیا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ رشی بن کر ہی ہم مذہبی گرنتھوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ اسی منزل پر پہنچنے کے بعد ان کے معانی مجسم شکل اختیار کر کے ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ اس سے پہلے تو محض زبانی باتیں ہوتی ہیں لفاظی ہی لفاظی، سے کام لیا جاتا ہے۔ پہلے زمانے میں ہمارے یہاں بڑے بڑے رشی مہارشی گذرے ہیں۔ ہمیں ان سب کا احترام ہے لیکن ہماری زندگی محض ان بزرگوں کا نام لینے سے ہی نہیں سکتی، ہم کو تو خود ان کے مقام تک پہنچنا ہے بلکہ ان سے بھی زیادہ بڑا ہونا ہے۔ انہوں نے عہد ماضی میں بڑے بڑے کام کئے ہیں ہمیں اپنے زمانے میں ان سے بھی زیادہ عظیم کام سرانجام دینا ہیں۔ ہندوستان قدیم میں سینکڑوں رشی مہرشی ہوئے ہیں لیکن آج ہمیں لاکھوں رشی مہرشی پیدا کرنا ہیں اور یاد رکھئے ایسا ہو کر رہے گا اور جتنی جلد آپ میں سے ہر شخص اس حقیقت پر ایمان لے آئے گا اتنا ہی خود صرف ہندوستان کے حق میں نہیں بلکہ ساری دنیا کے حق میں بہتر ہو گا۔ زندگی کی تشکیل آدمی کے ایمان سے ہوتی ہے۔ جیسا آپ اپنے متعلق یقین کریں گے ویسے ہی ہو جائیں گے اگر آپ کو یہ یقین ہے کہ آپ ایک روز رشی منی بن جائیں گے تو یقیناً ایسا ہو کر رہے گا۔ دنیا کی کوئی شے آپ کو رشی بننے سے روک نہیں سکے گی۔ یہی تو ہمارے مذہب کا بنیادی اصول ہے۔ باقی یہ جو ظاہری تفرقات نظر آتے ہیں اور جن کی وجہ سے آپس میں مخالفت ہوتی رہتی ہے، آئے دن ایک نہ ایک جھگڑا

ہوتا رہتا ہے۔ یہ سب باتیں اس بنیادی اصول سے منحرف ہونے کی نشانیاں ہیں جو ان کی تہہ میں کام کر رہا ہے اور جس کے مطابق یہ تمام آب و تاب یہ ساری قوت اور پاکیزگی خود روح کے اندر پہلے ہی سے موجود ہے۔ ودیت وادی سری رامانج آچاریہ کے ارشاد کی رو سے روح کا دائرۂ عمل تنگ یا وسیع ہوتا رہتا ہے اور اسی سے زندگی مختلف صورتوں میں رونما ہوتی ہے۔ روحانی ارتقا کی آخری منزل وہ ہے جہاں روح اپنی وسعت کو پالیتی ہے۔ ادویت وادی شنکر آچاریہ فرماتے ہیں کہ روح تو ہمیشہ پاک ہے لامحدود ہے دانائے کُل ہے اور قادرِ کُل ہے صرف اس پر مایا کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس پردے کے ہٹ جانے سے روح اپنے آپ کو پالیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ عملی طور پر دونوں بزرگوں نے جو کچھ زور دیا ہے وہ انکشافِ ذات پر دیا ہے اور اگر دونوں کے درمیان کچھ فلسفیانہ فرق ہے بھی تو آپ کو اس سے کیا مطلب۔ آپ اس کی کچھ پروا نہ کیجئے۔ بہر حال یہ حقیقت تو سب نے تسلیم کی ہے کہ روح ہی ساری طاقت کا مخزن ہے اور کبھی یہ طاقت نمایاں ہوتی ہے کبھی پنہاں۔ مطلب تو اس سے ہے کہ آپ اپنی ذات کی حقیقت کو سمجھیں، اپنی لامحدود طاقت کو محسوس کریں۔ جتنی جلدی یہ نکتہ آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ ساری طاقت آپ ہی ذات میں ہے اتنا ہی آپ کے حق میں بہتر ہوگا۔ یقین مانئے آپ ہر کام کرسکتے ہیں آپ کا یقین تو پختہ طور پر اس حقیقت میں ہونا چاہئے۔ بھول کر بھی یہ نہ سمجھئے اگر لوگ ہمیں خبطی کہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم سچ مچ خبطی ہیں۔ اگر سماجی رسم و رواج سے ہم میں کچھ کمزوریاں آ بھی گئی ہیں تو انہیں دور کیا جا سکتا ہے اور اس کے لئے ہمیں چنداں کسی رہنمائی کی بھی ضرورت نہیں دنیا میں کوئی بات غیر ممکن نہیں ساری طاقت خود آپ میں موجود ہے۔ اس لئے اُٹھو میرے شیر دلو اور اس یزدانیت کا اظہار کرو جو تمہاری ذات میں موجود ہے۔



# ویدانت اور ہندوستانی زندگی

ہمارے مذہب اور ہماری قوم کو ہندو کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ "ہندو" قدرے وضاحت طلب ہے۔ اس لفظ کی اصل صورت "سندھو" ہے۔ قدیم اہل فارس نے یہ نام دریائے سندھ کو دے رکھا تھا۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ جہاں سنسکرت زبان میں حرف "स" (سا) استعمال ہوتا ہے۔ قدیم فارسی زبان میں یہ "स" (سا) حرف "ह" (ہا) میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ اس طرح سے لفظ "سندھو" "ہندو" بن گیا۔ اور یہ بھی آپ سب کو معلوم ہوگا کہ یونان والے حرف "ہا" (ह) کا تلفظ بڑی مشکل سے ادا کر پاتے تھے۔ اس لیے انہوں نے یہ حرف بھی خارج کر دیا۔ اور "سندھ" جسے اہل فارس نے "ہند" بنا دیا تھا، اہل یورپ کے لئے "انڈس" "انڈین" بن گیا۔ اسی وجہ سے ہم لوگ انڈین کہلانے لگے۔ تو آپ نے ملاحظہ کیا کہ یہ لفظ "ہندو" دریائے انڈس (سندھ) کے اس پار رہنے والوں کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ لیکن زمانہ قدیم کے یہ معنی آج اس لفظ پر عائد نہیں ہوتے۔ اس لفظ کی ہیئت ہی بدل گئی ہے۔ کیونکہ آج جو لوگ دریائے انڈس کے اس پار رہتے ہیں اب ان کا کسی واحد مذہب سے تعلق نہیں رہا۔ ان میں ہندو، مسلمان، پارسی، عیسائی، بودھ اور جینی یہ سبھی شامل ہیں۔ اس لفظ کے لغوی معنی کے اعتبار سے ان تمام مذاہب والوں کو "ہندو" کہہ سکتے ہیں۔ لیکن مذہب کے اعتبار سے ان کو ہندو کہنا غلط ہوگا۔ کیونکہ عام استعمال میں اس لفظ کا اطلاق ہمارے مذہب پر ہوتا ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ لفظ بھی پوری طرح ہم پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ ہمارے مذہب کے لیے کسی عام نام کا تلاش کرنا مشکل ہے کیونکہ یہ مذہب دراصل مجموعہ مختلف مذہبی خیالوں، رسموں، اور دستوروں کا۔ کئی لحاظ سے تو ان میں سے ہر ایک کو ایک الگ مذہب کہا جا سکتا ہے۔ لیکن چونکہ ان مذاہب کی کوئی اپنی انفرادی ہستی نہیں ہے نہ ان کی کوئی مخصوص تنظیم ہی ہے اور نہ کوئی مخصوص عبادت گاہ، اس لیے وہ آپس میں خلط ملط ہو کر ہندو دھرم کا جزو بن گئے ہیں۔ صرف ایک لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک ہی مذہب کی مختلف صورتیں ہیں اور وہ یہ ہے کہ یہ سب کے سب ویدوں کو مانتے ہیں، وید ہی وہ مرکز ہیں جہاں یہ سب فرقے یکجا ہوتے ہیں۔ اس امر پر تو سب کو اتفاق ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک ہندو کہلائے جانے کا حقدار نہیں ہو سکتا،

جب تک وہ ویدوں کو سب سے زیادہ افضل اور برتر سند تسلیم نہیں کر لیتا۔ اس لئے اگر کوئی ایک لفظ ہمارے وسیع دامن مذہب کا احاطہ کر سکتا ہے تو وہ ہے "ویدانت" کا لفظ۔ یہ تو آپ سب جانتے ہی ہیں کہ وید دو حصوں میں منقسم ہیں، ایک حصہ کرم کانڈ (شریعت) پر مشتمل ہے اور دوسرا گیان کانڈ (معرفت) کہلاتا ہے۔ کرم کانڈ میں بہت سے یگیہ اور رسم و رواج شامل ہیں جن کا زیادہ حصہ فی زمانہ مستعمل نہیں۔ گیان کانڈ ویدوں کی روحانی تعلیمات پر مشتمل ہے۔ یہ تعلیمات "اپنشد" اور "ویدانت" کے نام سے مشہور ہیں سب ہادیوں، فلاسفروں اور مصنفوں نے اس کو سب سے زیادہ مستند صحیفہ قرار دیا ہے خواہ وہ دویت وادی[1] (دوئی کے ماننے والے) ہوں خواہ ادویت[2] (وحدانیت) خواہ وششٹ ادویت (صفاتی وحدانیت) کے عقیدے سے تعلق رکھتے ہوں۔ ہر شخص اپنے مخصوص فلسفے اور اپنے فرقے کے اصولوں اور طریقوں کے لئے سند یا شہادت اپنشدوں میں تلاش کرتا ہے، اگر وہ ایسا نہیں کرتا۔ تو کوئی شخص اس کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اس لئے اگر دور حاضرہ میں سارے ہندوؤں کو کسی ایک نام سے منسوب کیا جا سکتا ہے تو وہ نام "ویدانتی" یا "ویدک" ہی ہو سکتا ہے۔ کم از کم میں تو لفظ "ویدانت مت" یا "ویدانت" کو انہیں معنوں میں استعمال کرتا ہوں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں اتنی وضاحت اور کر دی جائے۔ کہ بعض لوگ لفظ ویدانت کا اطلاق صرف ادویت واد پر کرنے لگے ہیں۔ ایسا کرنا ٹھیک نہیں۔ ادویت تو ان مختلف النوع فلسفیانہ نظاموں کی ایک شاخ ہے جن کی بنیاد اپنشدوں پر رکھی گئی ہے اور جن کے مجموعے کو "ویدانت" کہتے ہیں۔ اپنشد ان سب مذہبی نظریوں اور نظاموں کا مخزن اور ماخذ ہیں۔ وششٹ ادویت وادی[3] ہوں یا ادویت وادی[4]۔ دونوں اپنشدوں کی تعظیم کرتے ہیں۔ دونوں کی بنیاد فلسفہ یہ ہے دونوں ویدوں کو سند مانتے ہیں۔ اسی طرح دویت وادیوں اور دوسرے مذہبی فرقوں کا ماخذ بھی وید اور اپنشد ہی ہیں۔ یہ جو عام خیال ہے کہ "ویدانت" سے مراد ہے ادویت واد بہت حد تک غلط فہمی سے پیدا ہوا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ مقدس ویدوں اور اپنشدوں کے علاوہ ہماری مذہبی کتابوں میں سمرتیاں اور پران بھی شامل ہیں جن کی تصنیف ویدوں کے بعد ہوئی ہے اور جن میں ویدوں کی تعلیم کا مثالی رخ پیش کیا گیا ہے۔ ان دینی کتابوں کی اہمیت اور ان کا درجہ و مقام مقابلتاً ویدوں اور اپنشدوں سے کم ہے لیکن ہمارے مذہبی ادب میں ان کتابوں سے برابر حوالے دیئے جاتے ہیں حقیقت میں ہوا یہ کہ ادویت واد کے مفسر عظیم شری شنکر آچاریہ نے اپنی تفسیروں میں زیادہ تر اسناد اپنشدوں ہی سے پیش کی ہیں سمرتیوں سے اگر کوئی سند پیش کی گئی ہے تو کسی ایسے نکتے کی وضاحت کے لئے کی گئی ہے جس کا ذکر شرتیوں میں مشکل سے ملتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں کہیں ایک طرف سمرتیوں پرانوں اور دوسری طرف ویدوں کے درمیان اختلاف ہو ویدوں کی بات مانی جائے گی اور سمرتیوں کی بات رد کر دی جائے گی۔ شری شنکر آچاریہ کے پیروؤں نے بھی یہی سلسلہ جاری رکھا، بخلاف اس کے دوسرے مکاتیب فکر نے بیشتر شرتیوں کے بمقابلہ سمرتیوں کے گلشن سے نکتہ چینی کی ہے، یہاں تک کہ دویت وادیوں کے ادب میں شرتیوں سے کم اور سمرتیوں سے بہت زیادہ حوالے ملتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عام لوگ یہ سمجھنے لگے کہ اپنشدوں میں "ویدانت" کا مطلب "ادویت"۔ ہے صورت حال کچھ بھی معنی ہو حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی ساری مذہبی زندگی لفظ "ویدانت" کی ذیل میں آجاتی ہے۔ "ویدانت" ویدوں کا نچوڑ ہونے کی حیثیت سے ویدوں ہی کا ایک جزو ہے جسے سب نے متفقہ طور

---

ے[1] dualists    ے[2] Advaita    ے[3] Vishishtâdvaitic

ے[4] Advaitist,

---



یہ فوٹو پرم ہنس رام کرشن جی کے برہم لین ہونے پر 16 اگست 1886ء کو لی گئی ۔ 1۔ ہٹارناتھ گپتا (م) جی کالی (سوامی ابھید آنند)
5۔ شرت (سوامی سارد ننند) 6۔ یمنی ملک ۔ 7۔ گنگا دھر (سوامی اکھنڈ انند) 8۔ نتیہ پال ۔ 9۔ سریندر ۔ 10۔ تارک (سوامی
شوانند) 13۔ بڑے گوپال (سوامی ادویت آنند) 15۔ ویکنٹھ ۔ 17۔ منموہن ۔ 18۔ ہریش ۔ 19۔ نارائن ۔ 21۔ ششی (سوامی
رام کرشنانند) 22۔ لاٹو (سوامی ادبھوتانند) 23۔ کھادناتھ ۔ 24۔ بابورام (سوامی پریم انند) 25۔ نرنجن (سوامی
نرنجنانند) 26۔ نریندر (سوامی ویویکانند) 27۔ رام چندر دت ۔ 28۔ بلرام بوس ۔ 29۔ راکھل (سوامی برہمانند) 30۔
نتیہ گوپال ۔ 31۔ یوگیندر (سوامی یوگانند) 32۔ دیویندر

یہ ہمارا قدیم ترین مذہبی ادب تسلیم کر لیا ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ ویدانت، محض ادویت وادہی پر حاوی ہے صحیح نہیں ہے۔ میرے خیال کے مطابق تو ویدانت میں دوئی کا عقیدہ بھی شامل ہے۔ "ادویت" اور "وششٹ ادویت" دونوں کا عقیدہ اسی کا ایک جزو ہے بلکہ اگر بودھ اور دھرم، جینی، پرانہ مانیں تو میں تو یہی کہنے کی جرأت کروں گا کہ بودھ اور جین مت بھی ویدانت کے وسیع دائرے میں شامل ہیں۔ ہم انہیں بھی ویدانت ہی کی ذیل میں شمار کر سکتے ہیں۔ ان کے مذہبوں کے کئی حصے بنیادی نظریے کے اعتبار سے ویدانت ہی کے فلسفے پر مبنی ہیں۔ ہمارے یہ بھائی کچھ خود ہی ہم سے الگ ہیں ورنہ ہم تو ہر وقت ان کو لبیک کہنے کے لئے آمادہ ہیں کیونکہ اگر اچھی طرح تجزیہ کیا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ بدھ مت کا سارا جوہر اپنشدوں ہی سے لیا گیا ہے۔ خصوصاً بودھوں کی مشہور زمانہ اور حیرت انگیز اخلاقیات تو حرف بحرف اپنشدوں میں موجود ہیں۔ یہی حال جین مت کا بھی ہے۔ کچھ ضمنی اور غیر ضروری باتوں کو چھوڑ کر قریب قریب ان کے سارے اصول اپنشدوں میں ملتے ہیں۔ صرف بدھ اور جین مت ہی پر منحصر نہیں ہندوستان کے مذہبی تصورات میں جو اضافے بعد کو ہوئے ہیں ان کی بنیاد بھی اپنشدوں میں پائی جاتی ہے اور اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں کیونکہ ویدوں اور ویدانت میں روحانی زندگی کے وہ ازلی اور ابدی اصول درج ہیں جن کی مختلف صورتوں میں تفسیر کی گئی ہے۔ دوسرے لوگ خصوصاً زمانۂ حال کے مغربی علماء چاہے کچھ کہیں۔ ہمارا تو یہ عقیدہ ہے کہ وید محض مذہبی کتابیں نہیں جنہیں مختلف زمانوں میں لکھا گیا ہے، بلکہ یہ تو وہ حقیقتیں ہیں جو خود خدا کے شعور میں ہمیشہ محفوظ رہتی ہیں اور جو خدا رسیدہ عارفوں پر رشیوں منیوں اور بھگوتوں پر بیک وقت نازل ہوتی ہیں۔ اس لئے چاہے مذہبی اصول کوئی بھی صورت اختیار کرے اس کی اصل ویدانت اور ویدوں میں ہی ملے گی۔

اس کے باوجود بعض لوگ کہتے ہیں کہ اپنشدوں میں بھگتی کا کہیں ذکر نہیں۔ اس بات کی حمایت میں کوئی دلیل تو نہیں پیش کی جاتی۔ البتہ بار بار اسی قسم کی باتیں کر کے عوام کے دلوں میں یہ خیال جما دیا ہے۔ جن حضرات نے اپنشدوں کا مطالعہ کیا ہے ان کو معلوم ہے کہ اس بیان میں شمہ بھر بھی تو صداقت نہیں ہے۔ ہر اپنشد میں بھگتی کے متعلق بھی بہت کچھ درج ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ تلاش و تحقیق کا شوق کس کو ہے اور کس میں اس کی ہمت ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اپنشدوں میں نہ صرف بھگتی کے اصولوں کا ذکر ہے بلکہ ان میں ان تمام خیالات کا بیج بھی موجود ہے جن کا ارتقا بعد کو پرانوں اور سمرتیوں میں ہوا ہے یا یوں کہیے کہ ان کا ڈھانچہ تو اپنشدوں ہی میں موجود تھا۔ اس ڈھانچے کی تکمیل بعد کو بعض پرانوں میں ہوئی۔ یہی حال ہمارے دوسرے دینی مسلکوں کا ہے۔ سب کا ماخذ وید اور ویدانت ہیں۔ ہمارا کوئی بھی باضابطہ دینی مسلک یا نصب العین ایسا نہیں ہے جس کا بنیادی سلسلہ اسی سرچشمے یعنی اپنشدوں میں نہ پایا جاتا ہو۔ بعض ایسے لوگوں نے جو اپنشدوں کی تعلیمات سے بے بہرہ ہیں بھگتی کے تصور کو کسی غیر ملکی منبع و مصدر سے ملانے کی مضحکہ خیز کوششیں کی ہیں۔ لیکن آپ سب کو معلوم ہے ان کی یہ کوششیں ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ ان اپنشدوں میں بھگتی اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ موجود ہے اور صرف اپنشدوں ہی میں نہیں بلکہ سنگھتاؤں[1] میں بھی بھگتی کے تمام اجزاء مثلاً عبادت، محبت وغیرہ کا ذکر پایا جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جوں جوں مذہبی ادب میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے تفصیلات بڑھتی چلی جاتی ہیں، دوسرے یہ کہ بھگتی کا آدرش بلند سے بلند تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ مثلاً سنگھتاؤں میں کہیں کہیں خوف اور اذیت کا ذکر آتا ہے۔ سنگھتا میں کبھی کبھی کسی پجاری کو ورن یا کسی اور دیوتا کے سامنے ڈر کے مارے کانپتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ سنگھتاؤں میں آپ کو گناہوں کا بھیانک تصور بھی ملتا ہے۔

---

[1] Samhitâs,

لیکن اُپنشدوں میں اِس قسم کے تصوّرات ہرگز نہیں پائے جاتے۔ اُپنشدوں میں خوف اَور دہشت دلانے والے کسی دینی مسلک کا ذکر تک نہیں۔ ان میں تو ہمیں جس مسلک کی تعلیم ملتی ہے وہ ہے پاک محبت کا مسلک۔ مکمّل شعور و احساس (گیان) کا مسلک۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہمارے مذہب کا سنگِ بنیاد ویدا اَور اُپنشد ہیں تو پھر یہ بے شمار اختلافات کیونکر پیدا ہو گئے؟ دراصل ہمارے مذہبی گرنتھ تو یہ اُپنشد ہی ہیں۔ ان کی شرحیں اَور تفسیریں البتّہ مختلف صورتوں سے کی گئی ہیں اَور جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں اگر کہیں ان کی اَور پرانوں کی تعلیمات کے مابین باہم دِگر کوئی اختلاف ہے تو بھی پرانوں کو ویدوں کے سامنے جھکنا پڑتا ہے فضیلت ویدوں ہی کو دی جاتی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ عملی طور پر ہم میں سے نوّے فیصد سے زیادہ لوگ پرانوں کی دکھائی ہوئی راہ پر چلتے ہیں اَور صرف دس فیصدی بلکہ اس سے بھی کچھ کم لوگ ویدوں کا مسلک اختیار کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے یہاں قسم قسم کے متضاد اَور متصادم رسم و رواج پائے جاتے ہیں اَور ہماری سوسائٹی میں ایسے ایسے مذہبی خیالات اَور نظریے پیدا ہو گئے ہیں جن کی کوئی سند ہمارے دھارمک گرنتھوں میں نہیں ملتی۔ ان نام نہاد دینی کتابوں میں تو بعض ایسی ایسی عجیب و غریب باتیں لکھی ہوئی ملتی ہیں کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسے غیر معقول دستور مرّوج نظر آتے ہیں کہ عقل پریشان ہو جاتی ہے۔ ان تمام رسموں رواجوں کی نہ کوئی سند ویدوں میں ملتی ہے نہ سمرتیوں اَور پرانوں میں۔ ان دستوروں کی نوعیّت محض مقامی ہوتی ہے لیکن ہماری جہالت کی انتہا دیکھئے کہ اگر اس قسم کا کوئی مقامی دستور ختم ہو گیا تو عوام الناس یہی سمجھ بیٹھتے ہیں کہ ان کے خاتمے سے ان کا مذہب بھی ختم ہو جائے گا۔ ان کی نظر میں ویدانت کا مسلک اَور ان کے یہ مقامی دستور آپس میں کچھ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ اب ان کا ایک دوسرے سے جدا ہونا ناممکن سا ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کبھی گرنتھوں کے پڑھنے کی نوبت بھی آتی ہے تو یہ لوگ اپنے عمل اَور ان گرنتھوں کی تعلیم میں کوئی فرق نہیں محسوس کرتے۔ گرنتھ اس قسم کے رسم و رواج کی اجازت نہیں دیتے اَور اس بات کا سمجھ لینا تو ان کے لئے اَور بھی مشکل ہے کہ ان رسموں رواجوں سے دستکش ہو جانا ان کے لئے کسی نقصان کا باعث نہیں ہو سکتا۔ وہ تو سمجھتے ہیں کہ انہیں رسموں رواجوں کی بدولت ان میں بہتر انسان بننے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں ہمیں ایک بات اَور یاد رکھنا چاہیئے اَور وہ یہ ہے کہ ہمارے گرنتھ بے شمار ہیں۔ اَور ان کی بے اندازہ وسعت کا یہ حال ہے کہ ہر موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اَور گرنتھوں کی کئی شاخیں نکال دی گئی ہیں مثلاً مہرشی پاتنجلی کی تصنیف مہابھاشیہ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سام وید کی ایک ہزار شاخیں تھیں لیکن امتدادِ وقت سے یہ تمام شاخیں زائل ہو گئی ہیں۔ یہی حال باقی دوسرے ویدوں کا بھی ہے۔ ان گرنتھوں کا بیشتر حصّہ نایاب ہو چکا ہے۔ اَور ان کا صرف تھوڑا سا حصّہ ہمارے پاس باقی رہ گیا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ یہ گرنتھ سینہ بہ سینہ محفوظ رکھے جاتے تھے اَور اس تحفّظ کی ذمّہ داری خاص خاص کنبوں پر عاید ہوتی تھی۔ ہر کنبہ اپنی اپنی شاخ کا نگہبان ہوتا تھا، اَب یا تو یہ خاندان از خود مر کھپ گئے یا غیر ملکی جبر و استبداد کا شکار ہو گئے، بہرحال کسی نہ کسی طرح ان کا نام و نشان مٹ گیا۔ اَور انہیں کے ساتھ ویدوں کے علوم کی وہ شاخیں بھی صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو گئیں۔ بس کہیں کہیں ان کا ذکر باقی رہ گیا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں کہیں کسی نے کوئی نیا مت یا فرقہ کھڑا کرنا چاہا۔ اس کی بنیاد ان گم شدہ گرنتھوں پر رکھ دی گئی۔ اَور اس طرح ہر قسم کے نئے نئے رواجوں کو پرانے گرنتھوں کا سہارا مل گیا۔ خواہ وہ ویدوں کے اصولوں کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں اَور اگر کوئی شخص

ان مقامی دستوروں اور روایتوں کے درمیانی اختلاف دکھا کر کہتا ہے کہ فلاں مقامی دستور گرنتھوں کے خلاف ہے تو اس کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا بلکہ ان روایتوں کا ذکر شرتیوں کی ان شاخوں میں موجود تھا جو مٹ چکی ہیں۔ آخر ان دستوروں کی کوئی نہ کوئی بنیاد ضرور رہی ہوگی۔ کوئی رواج یوں ہی رائج نہیں ہو جاتا۔ اور ہمارا یہ دستور تو ایک تسلیم شدہ دستور ہے۔

اب آپ خود ہی بتائیے کہ اس قسم کی دلیل کا کیا جواب دیا جائے۔ ایک تو ہمارے موجودہ گرنتھوں کی تعداد ہی بہت کافی ہے دوسرے جب بے شمار غیر موجود گرنتھوں کی سند بھی پیش کی جانے لگے تو ہمارا مذہب چند معقول اور چند غیر معقول رواجوں کا محض ایک گورکھ دھندا بن کر رہ جاتا ہے اور عوام کے لئے بنیادی اصولوں تک پہنچنا بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے خصوصاً جب رسم و رواج میں بہت کچھ اختلاف پایا جائے تو مشترکہ عناصر کا ڈھونڈنا کوئی آسان بات نہیں ہوتی۔

اس مشکل کو ہمارے مفسروں نے اور بھی پیچیدہ بنا دیا ہے۔ شاید ادویت وادی مفسر تفسیر کرتے وقت ادویت فلسفے کے حامی شلوکوں کو بجنسہ ان کی اصلی صورت میں پیش کرتا ہے لیکن جب اس کے سامنے کوئی ایسا شلوک آتا ہے جس سے ادویت واد کی حمایت نہیں ہوتی یا جو صریحاً دویت واد کے حق میں ہوتا ہے تو یہ مفسر ایسے شلوکوں کو حتی الامکان مسخ کر کے رکھ دیتا ہے اور اس کے عجیب و غریب معنی نکال لیتا ہے۔ بعض اوقات اس قسم کی تفسیریں مضحکہ خیز صورت اختیار کر لیتی ہیں مثلاً سنسکرت زبان کا ایک لفظ ہے "اجا" (अजा) جس کے معنی ہیں "جو نہ پیدا ہو" لیکن بعض مفسروں نے اس کے معنی "بکری" قرار دیئے ہیں۔

اسی طرح دویت وادی مفسروں نے بھی اصل متن کو توڑ پھوڑ کر اپنے نظریہ کے مطابق مطلب نکالنے کی کوشش کی ہے ان تفسیروں میں دویت وادی مفہوم کو تو برقرار رکھا جاتا ہے اور جو ادویت وادی مفہوم ہوتا ہے اس کو حسب مرضی مسخ کر دیا جاتا ہے وجہ یہ ہے کہ اول تو سنسکرت زبان بجائے خود ایک بے حد پیچیدہ زبان ہے، اس پر طرہ یہ کہ ہمارے یہ وید مقدس نہایت قدیم ہیں اور پھر سنسکرت کی لسانیات اس قدر مکمل ہیں کہ محض ایک لفظ کے سلسلے میں بحث و مباحثہ کا لامتناہی سلسلہ مدتوں جاری رہ سکتا ہے۔ اگر کسی پنڈت کو دھن سما جائے تو وہ دلیل اور منطق کی طاقت سے مذہبی کتابوں اور دوسری چیزوں کا حوالہ دے دے کر بے معنی باتوں کو بھی اس طرح پیش کر سکتا ہے گویا وہ گہری صداقتیں ہوں۔ تو یہ ہیں وہ مشکلات جو ہمیں اپنے مذہب کی حقیقت کے سمجھنے میں پیش آتی ہیں۔ ہم بنیادی تفرقات کے باعث بنیادی یکسانیت کو سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں اور فرقہ دارانہ تعصب کے زیر اثر اپنشد ایسے عظیم گرنتھوں کے معنی بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ طرح طرح کے رسوم و رواج نے روحانیت کی حقیقت پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہمارے مذہب کے ان منقسم حصوں در حصوں کی تہہ میں کوئی مشترکہ عنصر ضرور ہے۔ ان مذہبی اختلافات میں یکسانیت کا کوئی ایسا لائحہ عمل ضرور ہے جس کی بنیاد پر یہ چھوٹی چھوٹی عمارتیں کھڑی کی گئی ہیں ورنہ ہندو دھرم کی یہ عمارت اتنے دنوں تک قائم ہی نہیں رہ سکتی تھی۔ آخر وہ کیا چیز ہے جس کے باعث ہمارا مذہب ہزاروں سال سے قائم ہے؟ میں آج اس کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے مذہب کی حقیقی طاقت کا راز میں نے ایک ایسے عظیم الشان بزرگ کے قدموں میں بیٹھ کر پایا جو بیک وقت، پرخلوص ادویت بھی تھے اور دویت وادی بھی۔

جو پریمی بھگت بھی تھے اور معرفت مآب گیانی بھی۔ یہ انہیں کی پاک اور نورانی صحبت کا اثر تھا جس سے میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اپنشدوں اور دوسرے مقدس صحیفوں کا آزادانہ مطالعہ کروں اور قدیم مفسروں کی اندھی تقلید سے کام نہ لوں۔ اپنی تحقیقات اور مطالعہ کی بنا پر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہمارے مذہبی گرنتھ ایک دوسرے کی ضد نہیں، ان سے ایک دوسرے کی تردید نہیں ہوتی۔ ہمارے مذہب پر یہ جو طرح طرح کے حملے کئے جاتے ہیں ان سے بچنے کے لئے ہمیں ان گرنتھوں کو توڑ موڑ کر ان سے خاطر خواہ معنی نکالنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ان کتابوں کی اصل عبارت بڑی خوبصورت اور دلنواز ہے۔ ایک دوسرے کی تردید تو درکنار، ان میں باہم دیگر مطابقت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ایک خیال سے دوسرا خیال پیدا ہوتا ہے۔ ہاں ایک خاص بات یہ ہے کہ تمام اپنشدوں کا آغاز تو ہوتا ہے دویت وادی نظریوں سے۔ سب کے شروع میں پوجا پاٹھ اور ایسی ہی دوسری چیزوں کا ذکر آتا ہے، لیکن ان کا اختتام ہوتا ہے ادویت وادی عظیم الشان شگفتگی پر۔ جس چیز کو میں نے پرم ہنس بھگوان شری رام کرشن کی زندگی میں مجسم پایا، وہی چیز مجھے اپنشدوں اور دوسرے مقدس گرنتھوں کے مطالعہ سے دستیاب ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ دویت وادیوں اور ادویت وادیوں میں باہمی اختلاف کی کوئی وجہ ہی نہیں، ان کے مابین کسی قسم کا تصادم نہیں ہونا چاہیئے۔ ہماری قومی زندگی میں تو ان دونوں کو ایک نہایت عظیم مقام حاصل ہے، دویت وادیوں کا بھی وجود قائم رہنا چاہیئے۔ کیونکہ ادویت وادیوں کی طرح وہ بھی ہماری قومی زندگی کا ایک جزو ہیں، ایک کا وجود دوسرے کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ ایک کی کمی دوسرے سے پوری ہوتی ہے۔ اگر ایک عمارت ہے تو دوسرا اس کی چھت ہے۔ اگر ایک جڑ ہے تو دوسرا اس کا پھل ہے، اس لئے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ بس ادویت وادیا دویت وادی سچ ہے اپنشدوں کی اصل عبارت کو مسخ کرنے کی کوشش مجھے تو نہایت تمسخر آمیز معلوم ہوتی ہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ سچے ہیں۔ یہ بنیادی نقطہ ذہن نشین کر لیجئے اور اپنشدوں کی عبارت کو توڑ پھوڑ کر بحث مباحثے کا ذریعہ نہ بنائیے پھر آپ دیکھیں گے کہ اپنشدوں کی زبان کس قدر حیرت انگیز ہے اس میں شک نہیں کہ اپنشدوں کے بلند پایہ فلسفے کی عظمت انسان کو حیرت میں ڈال دیتی ہے یہ سچ کہ اپنشدوں کا علم الٰہی انسان کو نجات کا راستہ دکھاتا ہے۔ اگر آپ اپنشدوں کا مطالعہ محض ادبی حیثیت ہی سے کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کی عظمت بجائے خود کتنی حیرت انگیز ہے۔ ہم اپنشدوں کا مطالعہ بیشتر فلسفہ اور علم الٰہی کے لئے کرتے ہیں اور ان کے ادبی پہلو کو نظرانداز کر دیتے ہیں لیکن جن لوگوں نے اپنشدوں کا مطالعہ بطور ادب کے کیا ہے اور جو دوسری قوموں کے ادب سے بھی واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ دنیا کے ادب میں انسانی بلند پروازی کے جتنے نمونے ملتے ہیں اپنشدوں کا تصور ان سب سے ارفع اور اعلے ہے جہاں تک انسانی دماغ اور احساس سے کام لیا جا سکتا ہے ان میں بلند ترین مافوق الفطرت مقام کا صاف اور واضح عکس پیش کیا گیا ہے اپنشدوں کے مطالعہ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ انسانی دماغ کی یہ ذاتی قوت کیا ہے۔ اور خصوصاً ہندوؤں کے ادھیاتمک گیان میں جہانی دماغ کی رسائی کہاں تک ہے۔ قریب قریب تمام دوسری قوموں کے ادب میں بھی انسانی رفعت کا نقشہ پیش کیا گیا ہے لیکن ان سب قوموں کے ادب میں انسانی ارتقا اور بلندی سے مراد ہے مادی اور جسمانی طاقت حاصل کرنا۔ اسی لئے ان کی نظر میں آدرش انسان وہ ہے جو تنومند ہے، خوبصورت ہے اس کے اعصاب میں تناسب اور زور ہے۔ اس کی شخصیت میں جسمانی صحت اور توانائی

کارحب ہے۔ مثال کے طور پر آپ ملٹن۔ ڈانٹے۔ ہومر[1] یا کسی اور مغربی شاعر کو لے لیجئے، ان کی تخلیقات میں بھی مافوق الفطرت علویات، ماورائے ادراک کے متعلق حیرت انگیز اجزاء ملتے ہیں لیکن ان تخلیقات کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کے کارنامے حواس کی حدود سے پرے نہیں جا سکے۔ ان کے تخیل کی اڑان حواس کے پروں کی سکت پر ہوئی ہے۔ وہ اس ہستی کو جو لامحدود اور بے پایاں ہے متشکل اور مجسم کرنا چاہتے ہیں۔ ہستی کے اس احساس کو جو حواس کی حد سے باہر ہے حواس کے دائرے میں محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی نظر میں لامحدودیت وسعت بے پایاں کے مترادف ہو کر رہ جاتی ہے۔ لامکانیت مکان کے تصور تک محدود ہو جاتی ہے۔ ہمارے یہاں بھی اسی قسم کے تصور پائے جاتے ہیں اپنشدوں کی بلند پروازیوں سے پہلے ہمارے دینی ادب میں بھی مافوق الفطرت ہستی کو محدود و مجسم صورت میں پیش کیا گیا ہے مثلاً سنگھتا ہی کے ان حسین شلوکوں کو لیجئے جن میں دنیا کی پیدائش کا ذکر درج ہے آپ دیکھیں گے کہ ان شلوکوں کے لکھنے والوں نے مافوق الفطرت ہستی کو زمان و مکان کی وسعتوں کی صورت میں پیش کر کے اپنے انتہائی کمال کا ثبوت دیا ہے شعر و فن تخیل و تصور سب کچھ یہاں کی نقاشی اور مصوری میں موجود ہے لیکن ان باکمال فنکاروں کو بہت جلد یہ پتہ چل گیا کہ اس لامحدود ہستی تک انسان کی رسائی دماغ اور تخیل کی بلند پروازیوں کے ذریعے ممکن نہیں انہیں معلوم ہو گیا کہ زمان و مکان کی وسعتوں اور خارج فطرت کی رفعتوں کے تصورات لامحدودیت کے اس خیال کی ترجمانی نہیں کر سکتے جو ان کے دل میں بیتابی سے اپنے اظہار کے لئے مچل رہا تھا۔ اس لئے انہیں ایک نئی راہ اختیار کرنا پڑی۔ انہوں نے زبان و بیان کا انداز بدل ڈالا عبارت کے نئے اسالیب مہیا کئے اور زبان کو ایک نئی طاقت بخشی۔ تاکہ وہ کسی حد تک ان خیالات کا بوجھ اٹھا سکے جو درحقیقت بیان کی حدود سے باہر ہیں۔ زبان و بیان کے اس نئے اسلوب اور انداز کا استعمال اپنشدوں میں ہوا۔ اپنشد کی زبان بعید از بیان خیالات کا اظہار منفی الفاظ میں کرتی ہے اس لئے ان کی عبارت میں بعض اوقات بڑا الجھاؤ پایا جاتا ہے لیکن عام طور پر بیان کا یہ انداز ہمیں ماورائے حواس لے جانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اس طرح ایک ایسی چیز کی جھلک دکھا دیتا ہے جس کا تصور نہ ہمارے ذہن میں آ سکتا ہے اور نہ ہی جسے حواس کے ذریعہ محسوس کیا جا سکتا ہے ہمیں اس حقیقت کا یقین ہونے لگتا ہے جو ادراک و مشاہدہ کے امکان سے باہر ہے ہمیں اس ہستی کا وجود محسوس ہونے لگتا ہے جو حواس سے بالاتر ہے مثلاً اپنشدوں کے اسی بیان کو لیجئے۔

—न तत्र सूर्यो भाति न चन्द्रतारकं नेमा विद्युतो भान्ति कुतोऽयमग्निः ।

یعنی "وہاں سورج کی روشنی نہیں پہنچ سکتی۔ وہاں چاند ستاروں کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ آگ تو آگ وہاں بجلی کا بھی گزر نہیں" تمام دنیا کے ادب میں آپ کو ایسا بیان اور یہ تصور کہیں نہیں ملے گا۔

یا مندرجہ ذیل شلوکوں پر غور کیجئے۔ جن میں تمام دنیا کے فلسفے کا نچوڑ نکال کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس اختصار کے باوجود فلسفۂ حیات کا اس سے زیادہ مکمل بیان آپ کو شاید ہی کہیں ملے۔ اس تمام فلسفے کو جو ہندوؤں کے سرمایۂ فکر کا جوہر ہے اور جس میں بنی نوع انسان کے حصول نجات کی امیدیں مضمر ہیں صرف چار سطروں میں ہندی کر کے رکھ دیا گیا ہے اور حقیقت زندگی کی تصویر اتنے

---

[1] Milton, Dante, Homer,

---

خوبصورت اور حسین اشعاروں میں کھینچ کر رکھ دی گئی ہے جس کی مثال اور کہیں نہیں مل سکتی۔

द्वा सुपर्णा सयुजा सखाया समानं वृक्षं परिषस्वजाते ।
तयोरन्यः पिप्पलं स्वाद्वत्त्यनश्नन्नन्यो अभिचाकशीति ॥
समाने वृक्षे पुरुषो निमग्नोऽनीशया शोचति मुह्यमानः ।
जुष्टं यदा पश्यत्यन्यमीशमस्य महिमानमिति वीतशोकः ॥

ان شلوکوں کا مطلب یہ ہے[1]

"ایک ہی درخت پر خوبصورت پروں والی دو چڑیاں بیٹھی ہیں دونوں میں بڑا میلاپ ہے ان میں سے ایک چڑیا نچلی شاخوں پر بیٹھی ہوئی پھل کھا رہی ہے اور دوسری چپ چاپ درخت کی چوٹی پر بیٹھی ہوئی ہے کچھ کھاتی پیتی نہیں نچلی چڑیا کے منہ میں کبھی میٹھے اور کبھی کڑوے پھل آ جاتے ہیں اور وہ کبھی خوش ہو جاتی ہے تو کبھی رنجیدہ لیکن جو دوسری چڑیا شان سے درخت کی چوٹی پر چپ چاپ بیٹھی ہوئی ہے وہ نہ تو میٹھے پھل کھاتی ہے اور نہ کڑوے نہ اس کو سکھ کی کچھ پرواہ ہے نہ دکھ کی فکر وہ اپنی ذات میں اپنے جلال میں غرق ہے یہ ہے تصویر روح انسانی کی۔ انسان اسی زندگی کے میٹھے پھل بھی کھا رہا ہے اور کڑوے بھی۔

انسان لعل و دولت کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ حواس کی غلامی کر رہا ہے۔ زندگی کی بے بنیاد ٹیپ ٹاپ پر لٹو ہو رہا ہے اور بڑی بری طرح پاگلوں کی مانند اسی روش پر چلا جا رہا ہے۔ حالانکہ اس کی اصل حقیقت جلال اور سکون ہے۔ — اسی طرح ایک اور جگہ اپنشدوں نے روح انسانی کو رتھ بان سے تشبیہ دی ہے اور حواس کو ایسے گھوڑوں سے مشابہ کیا ہے جو بے قابو ہیں۔ بالکل یہی نقشہ ہے ان انسانوں کی زندگی کا جو دنیا کی بے حقیقت چیزوں کے پھیر میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کی حالت یا تو ان بچوں کی سی ہے جو امید بھرے سنہرے خواب دیکھ رہے ہوں اور ابھی اس بات سے واقف نہ ہوں کہ ان کی کوئی حقیقت نہیں اور یہ تمام خواب آخر کار ایک نہ ایک دن ہیچ ثابت ہوں گے اور یا ان کی حالت ان بوڑھوں کی سی ہے جنہیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ زندگی کرموں کے بھوگ (عمل اور ردِ عمل) کا سلسلہ ہے اپنی نجات کی کوئی صورت نظر نہ آتی ہو۔ لیکن ان تمام مجبوریوں کے باوجود ہر انسان کی زندگی میں کچھ ایسے روشن لمحات بھی آتے ہیں جب جہالت کے تاریک پردے اٹھتے ہوئے نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ صورت عموماً شدتِ غم یا انتہائی خوشی میں پیدا ہوتی ہے۔ انسان غم کی گہرائیوں میں ڈوب کر دیکھتا ہے۔ کہ زندگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اسی طرح مسرت کی پہنائیوں میں بھی پہنچ کر انسان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ زندگی ان ہی پہنائیوں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ ایسے سنہری لمحوں میں انسان کو اپنی حقیقت کی کچھ کچھ جھلک نظر آنے لگتی ہے۔ اس وقت خورشیدِ ہستی کو چھپا لینے والی بدلی چھٹ سی جاتی ہے اور ازلی نور کی کرنیں جلوہ پاشی کرنے لگتی ہیں۔ ہماری بے بصری گھڑی بھر کے لئے تابِ جلوہ میں بدل جاتی ہے۔ ہماری بے بسی اور مجبوری ہماری ذات کی بے پناہ قوت میں بدلتی ہوئی نظر آنے لگتی ہے۔ اور جو چیز ہمیشہ ہماری دسترس سے باہر رہی ہے وہ ہمارے نزدیک آنے لگتی ہے تمام فاصلے معدوم ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ہمیں اس ہستی کا احساس ہونے لگتا

---

[1] ان کا مطلب زیادہ وضاحت کے ساتھ اگلے صفحات پر درج ہے۔

ہے جو تمام حواس سے - اِس دُنیا سے - اس کی بے بُنیاد مُسرّتوں اَور لُطفوں سے بے حد پرے ہے - جو فطرت کی کرشمہ سازیوں سے بالاتر ہے اَور جس تک دُنیا و عُقبےٰ کی راحتوں کا تصوّر بھی نہیں پہنچ سکتا - جو زر و دولت، شُہرت و ناموری اَور کی تمنا نیز دُوسری تمام دُنیوی خواہشات سے کوسوں دُور ہے۔ یہ جھلک دیکھ کر انسان اپنے دُنیاوی کاروبار میں لمحہ بھر کے لئے رُک جاتا ہے - اس تمثیل کی چڑیا کی طرح جس کا مَیں نے ابھی ذکر کیا ہے، اس کی نظر دُوسری چڑیا (یعنی خُود اپنی حقیقی ہستی) پر پڑتی ہے، جو نہایت سکون میں اَور شان کے ساتھ درخت کی چوٹی پر بیٹھی نہ میٹھے پھل کھاتی ہے نہ کڑوے بلکہ اپنی عظمت اَور جلال کے احساس میں غرق اَور آسودہ بالذات ہے جیسا کہ گیتا میں بھگوان (کرشن) نے کہا ہے -

यस्त्वात्मरतिरेव स्यादात्मतृप्तश्च मानवः

आत्मन्येव च संतुष्टस्तस्य कार्यं न विद्यते ॥

یعنی جس کی لگن آتما سے لگی ہے - جو آتما کے عِلاوہ دُنیا کی کسی چیز کا طلبگار نہیں، جس کو آسُودگی بالذات حاصل ہے اُس کے لئے دُنیا کا کوئی فرض بھی باقی نہیں رہتا، ایسا شخص آخر دُنیا کا غُلام بن کر کیوں رہے لیکن عموماً ایسا ہوتا ہے کہ انسان کو حقیقت کی جھلک نظر آجاتی ہے مگر وہ اس کو جھٹ بھُول جاتا ہے اَور تمثیل والی چڑیا کی طرح زندگی کے میٹھے اَور کڑوے پھل کھانے لگتا ہے کچھ عرصے بعد جب کسی کڑوے پھل سے اُس کے مُنہ کا ذائقہ خراب ہو جاتا ہے تو اس کو دوبارہ اپنی اصل ذات کا خیال آنے لگتا ہے اَور اِس طرح جب مسلسل چوٹ پر چوٹ پہنچتی ہے تو وہ نچلی شاخ پر بیٹھی ہوئی چڑیا کی طرح اُڑ کر چوٹی پر بیٹھی ہُوئی چڑیا یعنی اپنی اعلےٰ ذات کے اَور بھی قریب پہنچ جاتا ہے - اگر خوش قسمتی سے کبھی اس کو مسلسل سخت چوٹیں پہنچتی رہیں تو وُہ اپنے ساتھی (یعنی پرم آتما - روحِ اعظم جو ہر جنم کا ساتھی ہے) کے اَور بھی نزدیک پہنچ جاتا ہے اَور جُوں جُوں وہ اپنے اس ہمدم کے قریب ہوتا جاتا ہے اس کو محسُوس ہونے لگتا ہے کہ اس کی ذات کا نور اس پر برس رہا ہے۔ ایسا معلُوم ہوتا ہے کہ اس کی ہئیت ہی بدلتی جا رہی ہے حتّیٰ کہ اس کو اپنا وُجود غائب ہوتا ہُوا نظر آنے لگتا ہے اَور آخر کار اس کو اس بات کا شعور ہو جاتا ہے کہ دراصل اس کا کوئی وجود بالذات تھا ہی نہیں ہستی تھی تو بس اس کی جسے وہ اپنا عدم سمجھتا تھا - اس شعُور اَور احساس کے پیدا ہوتے ہی انسان بالکل بے باک اَور مطمئن ہو جاتا ہے اس کو سکون کامل مِل جاتا ہے، اس کی زندگی میں سنجیدگی پیدا ہو جاتی ہے اَور وہ معنی خیز ہو جاتی ہے - جب نیچی شاخ والی چڑیا دیکھتی ہے کہ وہ اس اُوپر والی چڑیا ہی کا ایک عکس ہے جو نہایت سکون و اطمینان اَور شان و جلال کے ساتھ چوٹی پر بیٹھی ہے تو وہ اس کی ہستی میں محو ہو جاتی ہے - اس طرح استعارے سے کام لے کر اپنشد رِشی دوئی کے مقام سے اُٹھا کر ادویت کے بامِ بلند پر پہنچا دیتے ہیں -

میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ اَور مثالیں پیش کی جائیں یا اپنشدوں کی بلند پرواز شاعری کی عظمت اَور مافوق الفطرت تصوّرات کے نمُونے دکھائے جائیں - لیکن ایک اَور بات مَیں ضرور کہُوں گا یعنی یہ کہ اِن اپنشدوں کی زبان بالکل سادہ اَور ستھری ہے اَور ان کے طرزِ بیان میں، ان کے خیالات میں حد درجہ صفائی اَور وضاحت پائی جاتی ہے - یہ ناممکن ہے کہ کوئی انہیں پڑھے اَور سُنے اَور پھر بھی اس پر ان کا کوئی اثر نہ ہو، یہ تو ممکن ہی نہیں ہے ان کو پڑھنے سے ان کے معنی فوراً براہِ راست دل میں اُتر

جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کسی تیز تلوار کی دھار آناً فاناً سینے میں اُتر گئی ہے یا کسی بھاری بھرکم ہتھوڑے کی زبردست چوٹ سر میں آن لگی ہے۔ ان کے معنوں میں غلط فہمی کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں۔ یا یوں کہیئے کہ اپنشد ایک ایسا سنگیت ہیں جس کا ہر سُر صاف اور مستقل طور پر اپنی جگہ قائم ہوتا ہے اور اپنا پورا پورا اثر پیدا کرتا ہے۔ اپنشدوں کے سنگیت میں اُستادی دکھانے کی کہیں بھی کوشش نہیں کی گئی۔ ان میں خیالی نقش آرائیوں کا کہیں نام بھی نہیں ہے۔ اس میں آپ کو دھرپد کی سادگی اور عظمت ملے گی۔ اس میں سُروں کے زیر و بم سے دیوانہ وار کھیلا نہیں گیا۔ اور نہ اس میں کبھی کسی قسم کی کوئی پیچیدگی پیدا کی گئی جس میں دماغ بھٹک کر رہ جائے۔ اس میں ایسا کوئی لفظی ہیر پھیر نہیں جس سے طبیعت گھبرا جائے، جی اکتا جائے۔ اس میں تو آتش نفس مغنیوں کے بمق پاش نغموں کی شعلہ بار صدائیں ہیں، جن سے فیضیاب نہ ہو سکنے کا کوئی امکان ہی نہیں۔ اپنشدوں کی سب سے بڑی خوبی ان کی سادگیٔ بیان ہے۔ بیان کی پیچیدگی تو دراصل انحطاط کی علامت ہوتی ہے۔ اپنشدوں میں اس کا نشان تک نہیں ملتا۔ ان میں نہ تو اصل بات کے گرد دور اُفتادہ کتابوں کو جمع کیا گیا۔ اور نہ معانی کو اسم ہائے صفت کے ہجوم میں چھپایا گیا ہے۔ اپنشدوں میں اس قسم کے طرزِ بیان کی پیچیدگیاں کہیں نہیں ملیں گی جس سے مضمون میں اتنا اُلجھاؤ پیدا ہو جائے کہ سارا مفہوم ہی مفقود ہو جائے، جس سے دماغ معطل ہو جائے اور انسان کو اس قسم کے ادب کی بھول بھلیوں سے نکلنے کا راستہ ہی نہ مل سکے۔ اپنشدوں کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس عظیم الشان ادب کے خالق دیوتا نہیں بلکہ انسان ہیں تو یقیناً وہ انسان کسی ایسی قوم کے فرد تھے، جس کی قوت اور توانائی ابھی زائل نہیں ہو چکی تھی۔ مجھے تو اپنشد کے ہر صفحے سے قوت اور توانائی کی آواز آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، اور یہی ایک بات تو یاد رکھنے کے لائق ہے کہ طاقت اور توانائی، بہادری اور دلیری ہی زندگی کی اصل ہے مجھے تو زندگی نے بس یہی سکھایا ہے اور اسی قوت کا، محض قوت کا پیغام ہمیں اپنشدوں سے ملتا ہے۔ اپنشد للکار للکار کر ہم سے کہتے ہیں کہ طاقت و توانائی سے کام لو۔ خبردار تم میں کوئی کمزوری نہ آنے پائے۔ کیا انسان میں کمزوریاں نہیں ہوتیں؟ کمزوریاں انسان میں ہوتی ہیں اور ضرور ہوتی ہیں، لیکن اپنشدوں کا کہنا ہے کہ کیا کمزوریوں کا علاج یہ ہے کہ اس سے اور بھی کمزوریاں پیدا کر لی جائیں۔ کیا کبھی گرد سے گرد دھل سکتی ہے؟ کیا گناہ سے گناہ کا ازالہ ممکن ہے؟ کیا ناتوانی کا علاج ناتوانی سے ہو سکتا ہے؟ اپنشدوں کا پیغام تو بس یہی ہے کہ طاقت حاصل کر لو اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ اور مضبوط بن جاؤ۔ اپنشدوں کے علاوہ صفحۂ دنیا پر اور کوئی ادب ایسا نہیں ہے جس سے آپ کو بے خوفی کی تعلیم ملتی ہو "ابھے" (अभय) یعنی بے خوفی کا لفظ اپنشدوں میں بار بار آتا ہے دُنیا کے کسی اور مذہبی صحیفے میں یہ صفت بھگوان (خدا) اور انسان سے منسوب نہیں کی گئی ہے۔ بے خوفی اور دلیری کی تعلیم اپنشدوں ہی کا حصّہ ہے۔ اپنشدوں کی اس تعلیم کا ذکر آنے سے میرے دماغ میں اس وقت ہندوستان کی تاریخ کا ایک واقعہ تازہ ہو گیا ہے۔ شہنشاہِ اعظم سکندر دریائے سندھ کے کنارے کھڑا ہوا ہمارے ملک کے ایک سنیاسی سے بات کر رہا ہے۔ یہ بوڑھا سنیاسی بالکل برہنہ پتھروں کے ایک ڈھیر پر بیٹھا ہوا ہے اور سکندرِ اعظم اس کی دانائی اور بینائی سے متاثر ہو کر اسے یونان آنے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ اس کو مال و زر، جاہ و مرتبہ اور عزت و شہرت کا لالچ دیتا ہے لیکن وہ بزرگ سنیاسی سکندر کی زبان سے دولت و مرتبت کا ذکر سن کر مسکرا دیتا ہے۔ ذرا دیکھئے تو کہ جس فاتحِ اعظم شہنشاہ کے آگے بڑے بڑے بادشاہوں نے سرِ اطاعت خم کر دیا، اس کی بات ایک نادار فقیر اس طرح سے ٹھکرا دیتا ہے اور یونان جانے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس

---

میرا پیغام صفحہ ۵۹

سکندر کو غصہ آجاتا ہے، وہ اپنے رعب و داب اور اختیار و اقتدار کے زعم میں سنیاسی سے کہتا ہے کہ اگر تم میرے ساتھ نہیں چلو گے تو میں تمہیں موت کے گھاٹ اتار دوں گا"۔ یہ سن کر سنیاسی خوب زور سے قہقہہ لگاتا ہے اور کہتا ہے "شہنشاہِ سکندر! تم نے شاید اپنی زندگی میں اس سے بڑا جھوٹ نہیں بولا ہوگا۔ تم مجھے موت کے گھاٹ اتار دو گے، بھلا میری جان کون لے سکتا ہے؟ تم تو اس مادی دنیا کے شہنشاہ ہو۔ تم میری جان کیا لے سکتے ہو، یہ تو کبھی ممکن ہی نہیں۔ کیونکہ میں تو روح ہوں جو نہ کبھی پیدا ہوتی ہے اور نہ کبھی فنا ہوتی ہے۔ میری تو کہیں ابتدا اور انتہا ہی نہیں۔ میں تو ہمیشہ اور ہر جگہ موجود رہتا ہوں۔ تم کیا میری جان لو گے۔ تم تو ابھی بالکل بچے ہو"۔ یہ ہے حقیقی طاقت۔ اس کا نام ہے قوت اور توانائی، جس کی تعلیم ہمیں اپنشدوں سے ملتی ہے، جو ہمیں ورثے میں ہاتھ آئی ہے۔ میرے دوستو! میرے ہم وطنو! ہم لوگ اس معیار سے بہت نیچے گر گئے ہیں۔ میں اپنشدوں کا جتنا زیادہ مطالعہ کرتا ہوں اتنا ہی زیادہ شدید احساس مجھے اپنی گراوٹ کا ہوتا ہے، اتنا ہی زیادہ مجھے اپنی حالت پر رونا آتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم اپنشدوں کی تعلیم کو پھر سے عملی جامہ پہنائیں۔ ہمیں تو طاقت چاہیئے طاقت، لیکن یہ طاقت ہم میں آئے گی کہاں سے؟ کون ہے جو ہم میں از سر نو زندگی کی روح پھونک دے گا؟ ہم کو کمزور بنانے کی ہزاروں صورتیں ہیں اور قصے کہانیاں بھی ہم بہت سن چکے ہیں۔ ہمارے ہر پران میں اتنی کتھائیں، اتنی کہانیاں ملیں گی۔ کہ ان سے دنیا بھر کے کتب خانوں کا تین چوتھائی حصہ بھر جائے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے ہر ایسی چیز کو اپنا رکھا ہے جو کسی قوم کو کمزور بنا سکتی ہے۔ شاید اس تمام طویل مدت میں ہمارا مطمح نظر صرف یہ رہا ہے کہ ہم روز بروز زیادہ سے زیادہ کمزوری اور ناتوانی کا شکار ہوتے رہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری قومی زندگی کا مقصد طاقتور ہونے کے بجائے کمزور بننا اور دلیر ہونے کے بجائے بزدل ہونا بن گیا تھا اور بے خوفی کی جگہ ہمارے دلوں میں ڈر (بھے) نے لے لی تھی۔ اس ہزاروں سالہ گراوٹ کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ہم انسان تو انسان حیوان کے درجے سے بھی نیچے گر گئے اور محض زمین پر رینگنے والے کیڑے بن کر رہ گئے جنہیں جو چاہے پاؤں تلے کچل کر رکھ دے ہم میں ذاتی عزت اور وقعت کا مادہ نہیں رہا۔ ہمارا احساس خودی اس بری طرح سے مر گیا ہے کہ ہم اپنے اوپر رعب جمانے والے ہر چھوٹے بڑے کے پاؤں پڑنے لگتے ہیں۔

میرے دوستو! میرے بھائیو! میری بات کا برا نہ ماننا میں کوئی غیر نہیں ہوں۔ میرا آپ کا خونی رشتہ ہے۔ ہم سب کی رگوں میں ایک خون دوڑ رہا ہے۔ ہم سب کو ایک ساتھ جینا اور مرنا ہے۔ جو میں کہتا ہوں آپ اس پر کان دیجیے۔ میں تو آپ سے بار بار یہی کہوں گا کہ ہمیں طاقت کی، توانائی کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر جینا دو بھر ہو جاتا ہے، اس کے بغیر عزت کی زندگی ناممکن ہے۔ ہمارے اپنشد اس طاقت کی بڑی زبردست کان ہیں، ان کے اندر اتنی عظیم طاقت چھپی ہوئی ہے کہ ان سے ساری دنیا میں جان پڑ سکتی ہے، قوتِ حیات پیدا ہو سکتی ہے اور بے پناہ طاقت اور توانائی حاصل ہو سکتی ہے۔ ہمارے اپنشد تمام قوموں، ملکوں اور فرقوں کے کمزوروں، مصیبت زدوں اور زمانے کے ہاتھوں پامال لوگوں سے بآوازِ دہل یہ کہہ رہے ہیں کہ اٹھو، اپنے پیروں پر کھڑے ہو اور ہر طرح کی غلامی سے نجات پاکر مطلقاً آزاد ہو جاؤ۔ جسمانی، ذہنی اور روحانی آزادی کا آدرش ہی تو اپنشدوں کا ازلی پیغام ہے۔ اگر ہم کچھ عرصے کے لئے اس پیغام کو بھول بھی گئے ہیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ آیئے آج ہم اسی جان بخش اور "مردسازِ" تعلیم کو پھر سے اپنائیں، اور اپنی طاقت بحال کریں۔

اور ساری دنیا میں اپنشد ہی تو وہ متبرک صحائف ہیں جو نجات پر زور دینے کے بجائے آزادی کی تعلیم دیتے ہیں، جو ہمیں فطرت کی زنجیروں سے

آزاد ہونا سکھاتے ہیں۔ اور ہمیں کمزوری سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اپنشد ہمیں بتاتے ہیں کہ آزادی تو ہماری ذات کی صفت ہے، یہ تو ہم میں پہلے ہی سے موجود ہے۔ یہی تو اپنشدوں کے اپدیش کی خصوصیت ہے یہی تو ان کا بنیادی اصول ہے کہ روح ہمیشہ آزاد کل ہے شاید آپ اس اصول کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں آپ شاید دویت وادی ہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن دویت وادی ہونے کی حیثیت سے آپ اتنا تو ضرور مانتے ہیں کہ روح فطرتاً مکمل ہے لیکن اس کے اعمال کی وجہ سے اس کی وسعت میں کمی آگئی ہے۔ دویت وادی شری رامانج آچاریہ کا نظریہ آخر یہی تو ہے کہ روح کی وسعت میں اعمال سے کمی بیشی ہوتی رہتی ہے آپ غور کریں تو یہ نظریہ زمانہ حال کے اصول ارتقا[1] اور ضد ارتقا (رجعت قہقری) سے ملتا جلتا ہے، سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ انسان آہستہ آہستہ ترقی کر کے منزلیں طے کرتا ہے اسے ارتقا کہتے ہیں لیکن کبھی کبھی وہ ان مقامات کی طرف مڑ جاتا ہے، جن سے وہ گزر آیا ہے، اس عمل کو رجعت قہقری کہہ لیجئے یا ضد ارتقا۔ اسی طرح دویت وادی اعتقاد کے مطابق روح کبھی اپنے مرکز کی طرف مائل ہو جاتی ہے اور کبھی اپنی وسعتوں میں جلوہ گر ہوتی ہے کبھی اس کی طاقتیں سو جاتی ہیں تو کبھی بیدار ہو جاتی ہیں کبھی اس کی بالیدگی بیج کی شکل میں مخفی ہو جاتی ہے اور کبھی سرو و صنوبر کی صورت نمایاں ہو جاتی ہے۔ یہ اظہار کمال نیک اعمالی سے ہوتا ہے جیسے کہ بیج کو اچھی زمین میں بو کر اس کی نشو و نما کرنے سے بڑے بڑے درخت رونما ہو جاتے ہیں، اسی طرح اچھے کاموں اور نیک خیالوں سے روح اپنی شان و شوکت حاصل کر لیتی ہے، دویت وادیوں کے اس نظریے اور ادویت وادیوں کے اصول کے درمیان بس یہی فرق ہے کہ ادویت واد روح کی ارتقا کا نہیں بلکہ فطرت کی ارتقا کا قائل ہوتا ہے۔ اس کی مثال یوں ہے: فرض کر لیجئے کہ ایک پردہ ہے اور اس پردے میں ایک چھوٹا سا سوراخ ہے میں اس پردے کے پیچھے کھڑا ہوا ہوں اور اس عظیم الشان اجتماع کی جانب دیکھ رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس چھوٹے سے سوراخ میں سے مجھے صرف چند چہروں کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آئے گا۔ اب اگر یہ سوراخ زیادہ بڑا ہو جائے تو مجھے اور بہت سے لوگ دکھائی دینے لگیں گے۔ اور جب یہ سوراخ بڑھتے بڑھتے یہاں تک بڑھ جاتا ہے کہ پھر کوئی پردہ درمیان میں حائل ہی نہیں ہوتا تو آپ سب کی شکلیں مکمل طور پر میری نظر کے سامنے آجاتی ہیں ایسی حالت میں میرے اور آپ کے درمیان کوئی حد فاصل باقی نہیں رہتی۔ مگر نہ آپ میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی نہ مجھ میں۔ جو کچھ تبدیلی ہوئی وہ پردے میں ہوئی۔ شروع سے آخر تک آپ آپ ہی رہے۔ آپ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ صرف پردے میں تغیر رونما ہو گیا۔ تو یہ نظریہ ہے ادویت وادیوں کا۔ ارتقا کے بارے میں وہ فطرت کے ارتقا اور روح مخفی کے اظہار کے قائل ہیں لیکن وہ یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ روح کسی صورت سے سکڑ سکتی ہے، روح میں تو کوئی تبدیلی ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ لاتغیر ہے جس کی کہیں ابتدا ہے نہ انتہا۔ اس پر مایا کا پردہ پڑا ہوا ہے اور جوں جوں یہ مایا کا پردہ اٹھتا جاتا ہے، اتنی ہی روح کی چمک دمک اور قدرتی تابانی ظاہر ہوتی جاتی ہے اور اس کا جلوہ زیادہ سے زیادہ نمایاں ہوتا جاتا ہے۔ یہی ہے وہ واحد اصول جس کا سبق ہندوستان سے لینے کے لئے تمام دنیا چشم براہ ہے۔ لوگ چاہے جتنی گویائی سے کام لیں، بڑھ بڑھ کر جتنی چاہے باتیں کریں، آخر کار سب اسی نتیجے پر پہنچیں گے۔ زمانہ اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جائے گا۔ دنیا پر یہ بات ظاہر ہوتی جائے گی کہ اپنشدوں کے اصول ہی مذہب اور تہذیب کے بنیادی اصول ہیں آپ

---

[1] Evolution

---

دیکھتے ہیں کہ آئے دن ہمارے گرد و پیش انقلاب واقع ہو رہا ہے۔ کل جس چیز پر لوگوں کو یقین تھا آج اس کو کوئی نہیں مانتا مثلاً کل تک سب یہی مانتے تھے کہ جب تک کوئی چیز اچھی نہ ثابت ہو جائے اسے بُرا ہی سمجھنا چاہیئے، کم از کم لوگ اس اصول پر عمل کرتے تھے۔ ہمارے طریقۂ تعلیم کی بنیاد اسی پر تھی (تعلیم ایک خارجی جنس سمجھی جاتی تھی جسے طلباء کے دماغ میں زبردستی ٹھونسنا ہوتا تھا) مجرموں کی اصلاح کے معاملے میں بھی یہی اصول کارگر تھا (اور ہم سخت سزا کے حامی تھے) پاگلوں کی دیکھ بھال کا طریقہ یہ تھا کہ انہیں زنجیروں سے جکڑ کر مارا پیٹا جاتا تھا۔ بیماریوں کے علاج کی بھی یہی صورت تھی (اور ہم بہت سی دوائیں دے دے کر علاج کرتے تھے) لیکن زمانۂ حال میں یہ کیفیت بدل چکی ہے۔ اب تو اصول ہی نئے نئے نکل آئے ہیں مثلاً آج کل انسانی جسم کو بیماری کا گھر نہیں بلکہ صحت کا مخزن سمجھا جاتا ہے۔ خود ہمارے جسم میں اپنی بیماریوں کا علاج آپ کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ دوا کے ذریعہ تو صرف یہ صلاحیت حرکت میں آتی ہے۔ اسی لئے دوا بہت کم دی جاتی ہے کیونکہ دوا تو ہماری قوتِ معالجہ کو بیدار کرتی ہے بالفاظِ دیگر خود ہمارے ہی جسم میں وہ طاقت موجود ہوتی ہے جس سے وہ نشو و نما پاتا ہے۔ اسی طرح جرم اور سزا کے متعلق جدید نظریہ یہ ہے کہ کوئی مجرم خواہ کتنا ہی حقیر اور پست کیوں نہ ہو، اس میں کچھ نہ کچھ خودداری اور شرافت کا مادّہ ضرور ہوتا ہے اور اسی حقیقت کو مدِنظر رکھ کر مجرموں کے ساتھ سلوک کیا جانا چاہیئے یا 'ویدانت' کے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ گرے سے گرے ہوئے آدمی میں بھی یزدانیت کا عنصر موجود ہوتا ہے جس میں کبھی کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی۔ یہ تمام نئی نئی باتیں آہستہ آہستہ پرانی باتوں کی جگہ لے رہی ہیں۔ اور اب قید خانوں کے بجائے اصلاح خانے[1] قائم کئے جا رہے ہیں۔ یہی حالت دوسری چیزوں میں بھی پائی جاتی ہے، شعوری یا لاشعوری طور پر ہندوستان کا یہ نظریہ کہ ہر چیز کے اندر یزدانیت جلوہ گر ہے، دوسرے ملکوں میں بھی پھیلتا جا رہا ہے۔ آپ کی مقدّس کتابوں میں مسائلِ زندگی کے ایسے ایسے حل درج ہیں۔ ایسی ایسی وضاحتیں موجود ہیں، جن کی دنیا کو مدت سے تلاش رہی ہے اور جن کا تقاضا تہذیبِ حاضر خصوصاً کر رہی ہے یہی وجہ ہے کہ آج کی مہذب اور ترقی پسند قومیں 'ویدانت' کے نظریوں کو قبول کر رہی ہیں اور وہ دن بہت زیادہ دور نہیں جب انسانوں کے مابین باہمی سلوک کے متعلق تمام پرانے نظریے قطعاً بدل جائیں گے اور بنی نوعِ انسان کی کمزوریوں پر زور دینے والے اور اس میں نقص نکالنے والے قدیم طریق کو رخصت ہونا پڑے گا۔ اس قسم کے پرانے اور فرسودہ خیالات اسی صدی کے اندر اندر مٹ جائیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ آج دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو ویدانت کی بلند خیالی پر نکتہ چینی کرتے ہیں جن کی جانب سے ہم پر طرح طرح کے اعتراضات وارد کئے جاتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مجھ پر اعتراضات کی بوچھار ہوئی ہے، میرے خلاف الزام یہ ہے کہ میں شر انگیز خیالات کی تلقین کرتا پھرتا ہوں، میں سب سے یہ کہتا پھرتا ہوں کہ گناہ کوئی چیز ہی نہیں ہے، ایسے لوگوں کو، جو کچھ بھی وہ کہنا چاہتے ہیں کہنے دیجئے، اس کی کوئی پروا نہیں کہ یہ لوگ مجھے گناہوں کا پیغمبر کہتے ہیں لیکن یاد رکھیئے کہ وہ دن دور نہیں جب انہیں لوگوں کی اولاد مجھے خیر و صداقت کا پیامبر مان کر مجھ پر سلام بھیجے گی۔ لیکن میں تو نیکی کی تعلیم دیتا ہوں۔ گناہ کی تبلیغ نہیں کرتا۔ میں تاریکی نہیں بلکہ روشنی کی راہ دکھانے کے لئے آیا ہوں مجھے اس پر بجا طور

---

[1] Reformatory

---

پر فخر ہے۔ انسان کی یزدانیت اور اس کی ربانی فطرت کے بلند تصور کے ساتھ ساتھ دنیا کو اپنشدوں سے جو دوسرا عظیم تصور حاصل ہوا
ہے وہ ہے تمام عالم کائنات کی وحدت اور یکتائی کا تصور۔ اہل فکر و نظر کو ایسے تصور کی ہمیشہ تلاش رہی ہے۔ لیکن آج تو وہ خصوصاً اس کے
لئے بیتاب ہیں۔ تقسیم اور اختلاف کے پرانے خیالات اب بڑی تیزی کے ساتھ مٹ رہے ہیں۔ دنیا کے مختلف حصے آپس میں بجلی اور
بھاپ کے ذریعہ ملتے جا رہے ہیں۔ آج اپنی پرانی تہذیب کے بل بوتے پر ہندو یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے ہندوستان سے باہر تو بس دیو اور
شیطان بستے ہیں اور نہ ہی عیسائی ملکوں کے باشندے اب یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں آدم خور اور وحشی لوگ رہتے ہیں جس وقت
ہم اپنے ملک کی حدود سے باہر قدم رکھتے ہیں تو ہم کو دوسرے ملکوں میں بھی اپنے ایسے انسان ملتے ہیں۔ ان سے مل کر ایسا محسوس ہوتا
ہے جیسے کسی بچھڑے ہوئے بھائی سے ملاقات ہو رہی ہو۔ ان کے سینے میں بھی وہی دردمند دل دھڑک رہا ہے جو ہمیں ودیعت
ہوا ہے۔ ان کے مضبوط ہاتھ بھی دوسروں کی مدد کرنے کے لئے بیتاب ہیں ان کے لبوں پر بھی دعا خیر اور سلام کے خوش آئند الفاظ
ہیں بلکہ بعض مرتبہ تو ہمارے غیر ملکی بھائی ہمارے اپنے دیش بھائیوں کے بمقابلہ کئی لحاظ سے کہیں زیادہ بہتر ثابت ہوتے ہیں۔ ایسی
طرح جب دوسرے ممالک کے لوگ ہمارے یہاں آتے ہیں تو ان کو بھی یہاں اخوت اور مروت نظر آتی ہے انہیں بھی یہی محسوس ہوتا
ہے کہ ہمارے دلوں میں ان کے لئے محبت بھری ہے اور انہیں بھی یہی محسوس ہوتا ہے اور ہمیں ہر طرح سے ان کی خوشنودی اور
بھلائی منظور ہے۔ آج کل کے زمانے میں تفریق اور اختلافات مٹتے چلے جا رہے ہیں۔ آج تک جو تفرقات موجود تھے ان کی وجہ
زیادہ تر کم علمی تھی۔ اپنشدوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں ہر قسم کے دکھ اور اذیت کا باعث جہالت ہے یہ قول زندگی کے
سماجی اور روحانی غرضیکہ اور بھی تمام شعبوں پر عاید ہوتا ہے جہالت اور محض جہالت کے زیر اثر ہم ایک دوسرے کو نفرت کی نگاہ سے
دیکھتے ہیں اور یہ محض جہالت ہی کا نتیجہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کو جانتے اور پہچانتے نہیں اور ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے۔
جوں ہی جہالت کا پردہ ہمارے درمیان سے اٹھ جائے گا، ہم ایک دوسرے سے واقف ہو جائیں گے اور ہمارے درمیان
محبت پیدا ہو جائے گی، آخر ہماری سب کی اصل ایک ہے۔ یہ تفریق اور اختلاف تو سطحی چیزیں ہیں، درحقیقت ہم سب ایک
ہیں۔ ہم سب میں یکتائی ہے۔ وحدت ہے یگانگی ہے آخر کار ہمیں متحد ہونا ہے، ایک ہونا ہے۔ آج کل کی دنیا میں تو ہم ایک دوسرے
سے علیحدہ رہ کر جداگانہ زندگی بسر کر ہی نہیں سکتے۔ سیاسیات اور معاشریات میں بھی جو مسئلے آج سے بیس سال پہلے محض ایک قوم
تک محدود سمجھے جاتے تھے، اب محض قومی اسباب کی بنا پر ان کا حل دستیاب نہیں ہو سکتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بات ہے
کہ ان مسئلوں کی نوعیت میں بھی تبدیلی واقع ہو رہی ہے۔ قوموں کی چھوٹی چھوٹی مشکلات دنیا کے بڑے بڑے مسئلوں کی
شکل اختیار کر رہی ہیں۔ ان کی اہمیت ترقی کر کے بین الاقوامی رنگ اختیار کر رہی ہے اور اب تو ان کا حل اسی حالت
میں ممکن ہو سکے گا۔ جب ان پر وسیع تر بین الاقوامی نقطہ خیال سے نظر ڈالی جائے گی۔ آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ آج کل تو ہر طرف
بین الاقوامی ادارے بین الاقوامی گروہ بندیاں اور دستور پیدا ہو رہے ہیں جن سے یکجہتی کی نشان دہی ہوتی ہے سیاسی اقتصادی
یا سماجی خیالات سے کہیں زیادہ وسعت سائنس میں ہو رہی ہے مادے کو آج تک محدود سمجھا جاتا تھا۔ آج مادے کی

تعریف یہ ہے کہ وہ تمام کائنات کا بنیادی عنصر ہے۔ مادّہ وہ چیز ہے جس سے تمام جہان شہود کا وجود قائم ہے۔ یہ تمام کائنات مادّے ہی کا ایک سمندر ہے جس میں آپ ہیں۔ یہ سورج۔ یہ چاند۔ یہ ستارے غرضیکہ دنیا کی تمام چیزیں اس سمندر کے چھوٹے چھوٹے گرداب کے مختلف نام ہیں بس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہیں۔ سمندر اپنی جگہ ازلی اور ابدی ہے۔ اس میں کوئی حرکت رونما نہیں ہوتی، کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا کیونکہ یہ دونوں تو اضافی چیزیں ہیں۔ اس طرح ذہنی سطح پر بھی خیال کا یہ عالمگیر سمندر موجزن ہے۔ میری اور آپ کی انفرادی ہستیاں ہمارا شعور، ہماری فکر، ہمارے تخیل کی پرواز، ہمارے مدرکات و مشاہدات اور مادّی علوم کے بارے میں ہماری معلومات غرض کہ ہمارے دماغ کی تمام حرکات اس ذہنی سمندر میں چھوٹے چھوٹے گردابوں کی مانند ظہور پذیر ہیں، لیکن سمندر بجائے خود متحرک اور متغیر نہیں ہو سکتا۔ وہ تو ہمیشہ سے ایک ہے اب اگر غور سے دیکھا جائے تو مادّہ اور ذہن (دونوں چیزیں بجائے خود) دراصل ایک ہیں۔ جہاں تک روح کا تعلق ہے اس میں کوئی حرکت نہیں ہوتی۔ کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ آتما وہ واحد حقیقت ہے، وہ ذات ہے جو ہمیشہ مکمل اور ثابت ہے جس کے ٹکڑے نہیں کیے جا سکتے۔ جس میں کسی قسم کے تغیر کا امکان ہی نہیں۔ اور جو بنیادی طور پر ہمیشہ ایک حالت میں رہتی ہے اور جس میں تفریق اور اختلاف کی کوئی گنجائش ہی نہیں)

ویدانت کا یہی تو نظریہ ہے جس سے ایک طرف زمانۂ حال کے فلسفہ اور سائنس کو تقویت پہنچتی ہے اور دوسری طرف جس کی تائید جدید خیالات سے بھی ہوتی ہے۔ ان سے ان کا ثبوت مہیا ہوتا ہے، اسی وحدت اور یکتائی پر ہی تمام اخلاقیات کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ آج دنیا نہ صرف مذہب اور روحانیت کو سائنٹیفک نقطۂ خیال سے پرکھنا چاہتی ہے بلکہ اخلاقیات کا تجزیہ بھی عقل و شعور کے معیار سے کرنا چاہتی ہے۔ آج لوگ مذہب اور اخلاقیات کو الہام اور دینی احکام کی صورت میں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ان دونوں کے لیے اگر کہیں تسلی بخش اور معقول وضاحت موجود ہے تو 'ویدانت' ہی میں موجود ہے اور اسی لیے دنیا کے اہلیانِ فکر و نظر روز بروز 'ویدانت' ہی کو ذہنی طور پر قبول کرتے چلے جاتے ہیں تو کیا ہمارے لیے صرف اس بات پر فخر کرنا کافی ہے کہ مذہب اور روحانیت کا سرچشمہ ہمارے مقدس گرنتھ ہیں۔ میرے بھائیو ہمیں اپنے فلسفہ اور اخلاقیات کو عمل میں لانا ہے۔ اگر غیر ملکیوں کو ان چیزوں کی ضرورت ہے تو خود ہندوستان کو ان کے مقابلہ ان کی بیس گنا زیادہ ضرورت ہے۔ مانا کہ ہمارے ہاں بڑے بڑے رشی منی ہوئے ہیں۔ مانا کہ ہمارے آباؤ اجداد کا درجہ دوسری نسلوں کے مقابلہ زیادہ بلند ہے، مانا کہ اس پر ہم بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں۔ لیکن فی زمانہ حقیقت یہ ہے کہ ہم کمزور ہیں، بے حد کمزور ہیں۔ دوسرے ہم میں دماغی اور اخلاقی کمزوریاں بھی آ گئی ہیں۔ اوّل تو ہم جسمانی طور پر کمزور ہیں اور یہ جسمانی کمزوری کم از کم ہماری ایک تہائی مصیبتوں کا باعث ہے۔ ان کمزوریوں کی وجہ سے ہم سست ہو گئے ہیں، نکمے ہو گئے ہیں۔ ہماری کمزوری نے ہمیں پرلے درجے کا خود غرض بنا رکھا ہے۔ ہم مل کر کام نہیں کر سکتے۔ ہم ایک دوسرے سے محبت نہیں کر سکتے۔ ہم میں تین آدمی بھی ساتھ مل کر نہیں بیٹھ سکتے۔ جب ملیں گے ایک دوسرے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھیں گے، ایک دوسرے سے رشک کریں گے، حسد کریں گے۔ آج ہماری یہ حالت ہو گئی ہے، ہم میں ہر طرف انتشار برپا ہے، کوئی تنظیم نہیں۔ کوئی رابطہ نہیں۔ ہم انتہا درجے کے خود غرض بن چکے ہیں، ہماری گراوٹ کی یہ حالت ہے کہ ہمارے خیالات بلند اور اعلیٰ فکر و شعور کے قابل ہی نہیں رہے۔ ہماری عمل کی طاقت سلب سی ہو گئی ہے اور ہمارے

تمام توجہ، تمام قوت فضول باتوں میں لگ گئی ہے۔ ہمیں شرم نہیں آتی کہ ہم صدیوں سے بس اتنی سی بات پر آپس میں لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے کا سر پھوڑتے آ رہے ہیں کہ ہمارے ماتھے پر تلک کس انداز سے لگایا جانا چاہیئے، ہمارا تلک نقطے کی شکل میں ہو یا لکیر کی صورت میں۔ متوازی لکیر کی صورت میں ہو یا مستقیم خط کی صورت میں ــــ ہمارے پاس کام کی باتوں کے لئے وقت نہیں ایسے فضول مسائل پر کتابوں پہ کتابیں لکھتے چلے جاتے ہیں کہ کسی خاص شخص کے دیکھنے سے ہمارا کھانا ناپاک ہو جاتا ہے یا نہیں؟ کئی صدیوں سے ہم انہیں باتوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ آپ خود ہی سوچئے کہ ایک ایسی قوم سے کیا بلند توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں جس کی تمام دماغی طاقت ایسے ہی مسائل پر صرف ہوتی رہی ہے جس کی کھوج اور دریافت کا رخ ایسی بیکار چیزوں کی طرف پھر چکا ہو، میں پوچھتا ہوں کیا ہم کو اپنی اس حالت پر شرم نہیں آتی؟ شرم آتی ہے اور ضرور آتی ہے۔ کئی بار ہمارا سر ندامت سے جھک جاتا ہے پھر بھی ان باتوں کو لغو اور بے سر و پا کہنے کے باوجود ہم انہیں ترک نہیں کرتے۔ کہنے کو ہم ان باتوں کی مذمت کرتے ہیں لیکن عملاً انہیں کے پابند رہتے ہیں، ان کی برائی میں چند فقرے ہم طوطے کی طرح رٹ لیتے ہیں اور دہراتے چلے جاتے ہیں لیکن ان کو عمل میں نہیں لاتے، بولنا بہت اور کام کرنا دھرنا کچھ نہیں یہ ہماری عادت میں داخل ہو گیا ہے گفتار بسیار اور کردار کم ہماری قومی خصلت بن گئی ہے۔ ہم گفتار کے غازی تو بن گئے ہیں کردار کے غازی ابھی تک نہیں بن پائے جو جسم اور جو دماغ کمزور ہوتا ہے اس سے کچھ بن نہیں پڑتا ہمیں اپنے جسم و دماغ کو طاقتور اور مضبوط بنانا ہے، سب سے پہلے ہمیں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہمارے نوجوان مضبوط اور توانا ہوں جب تک طاقت اور توانائی نہیں آئے گی مذہب کا سوال ہی نہیں اٹھتا، مذہب اور روحانیت مردوں کا کام ہے، شیروں کا کام ہے، کمزور اور ناتواں لوگ اس میدان میں قدم بھی نہیں رکھ سکتے میرے نوجوان دوستو! تم مضبوط بنو، توانا بنو۔ تم کو میری یہی نصیحت ہے یہی مشورہ ہے۔ اگر تم میں ہلنے کی طاقت نہیں تو کسی کونے میں پڑے رہنے اور محض گیتا پڑھ لینے سے حقیقی روحانی نعمت حاصل نہیں ہو گی۔ کہیں اس طرح بھی نجات ملتی ہے؟ گیتا کا پیغام ہر زمانے کے ارجنوں کے لئے ہے، اپنے دل میں ارجن کی طاقت پیدا کرو۔ اٹھو پہلے میدان عمل میں آؤ۔ گیتا پڑھنے کی بجائے فٹ بال کھیلو۔ اگر تمہیں کسی بہشت کی خواہش ہے تو بھی گیتا کے مطالعہ کی ضرورت نہیں۔ فٹ بال کھیلنے سے تم اپنی مطلوبہ بہشت میں زیادہ آسانی سے جا سکو گے، میں جانتا ہوں کہ میں سخت گستاخانہ الفاظ استعمال کر رہا ہوں لیکن اس دریدہ دہنی کے بغیر اب کوئی چارہ ہی نہیں۔ مجھے تم سے محبت ہے، میں تمہیں دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ مجھے معلوم ہے کہ ہماری مصیبتوں کی جڑ کیا ہے۔ مجھے بھی دنیا کا تھوڑا بہت تجربہ ہے، میں اپنے تجربے کی بنا پر پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ مذہب اور روحانیت محض دماغی تخیل پہ منحصر نہیں۔ گیتا اور گرنتھوں کا اکتساب محض ذہن سے نہیں ہوتا۔ اگر آپ کا جسم زیادہ گٹھا ہو گا۔ آپ کے پٹھے زیادہ مضبوط ہوں گے تو آپ گیتا کو بھی زیادہ اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔ اگر آپ کے خون میں توانائی ہو گی تو آپ بھگوان کرشن کی زبردست ذہانت اور انتہائی طاقت کا بھی اندازہ زیادہ بہتر طریقے سے کر سکیں گے۔ جب آپ خود اپنے پیروں کے بل پہ کھڑے ہوں گے اور اپنے اندر مردانگی محسوس کریں گے اس وقت اپنشدوں کے معنی و مطلب بھی آپ کی سمجھ میں زیادہ اچھی طرح آ سکیں گے۔ اس وقت آپ کو اپنی آتما، اپنی روح کی جلالت اور شوکت کا اندازہ اور احساس زیادہ صحیح طور پر ہو سکے گا اور آپ ان ازلی حقیقتوں کو اپنے حالات کے مطابق عملی صورت دے سکیں گے اور اس طرح انہیں اپنی زندگی کے سانچے میں ڈھال سکیں گے۔ بسا اوقات لوگ مجھ سے اس بات کی شکایت کرتے ہیں کہ میں ہر وقت ادویت واد ہی کی

تعلیم دیتا رہتا ہوں جس سے انہیں وحشت سی ہونے لگتی ہے، ان کی شکایت سر آنکھوں پر میں نہ ادویت واد کی تعلیم دیتا ہوں نہ دویت واد کی اور نہ کسی اور مسلک کی میں تو یہ کہتا ہوں کہ ہمیں اپنی روح سے آگاہی پیدا کرنا ہے میں تو آپ کے سامنے روح کا حیرت انگیز تصور پیش کرتا ہوں اس روح کا جو قادر کل ہے جو ہمیشہ مکمل ہے، جولا زوال پاکیزگی اور نشاطِ ابدی ہے جس کی طاقت جاودانی ہے توانائی جاودانی ہے پاکیزگی جاودانی ہے اور جس کی تکمیل جاودانی ہے اگر میری اولاد ہوتی تو میں اسے جنم دن سے ہی یہ سبق دیتا کہ "تو ہی وہ پاک ہستی ہے" آپ نے پرانوں میں رانی مدالسا کی کہانی پڑھی ہوگی۔ اس کی گود بچے سے آباد ہوتی ہے تو وہ اس کی پرورش اپنے ہاتھوں کرتی ہے خود اسے پالنے میں لٹاکر جھولا جھلاتی ہے اور ساتھ ہی یہ گیت گاتی ہے — "تو ہی وہ پاک، بے داغ، بے گناہ ہستی ہے تو بڑی زبردست قوت کا مالک ہے تو نہایت عظیم ہے" — دیکھئے اس گیت میں کیا جادو بھرا ہے اپنے دل میں اپنی عظمت کا احساس پیدا کیجئے۔ یہ میری آنکھوں دیکھی بات ہے میرا ذاتی تجربہ ہے، مغرب میں عیسائی مت کے پیرو گناہ کا ذکر کرتے ہیں اور اپنے آپ کو گناہگار بھی کہتے ہیں لیکن دراصل یہ صرف کہنے کی باتیں ہیں، عملاً وہ اس اصول سے کوسوں دور ہیں، مثلاً اگر تمام انگریز اپنے متعلق یہ سمجھنے لگتے کہ وہ گناہگار ہیں تو ان لوگوں کی حالت وسطی افریقہ کے حبشیوں سے زیادہ بہتر نہ ہو پاتی۔ لیکن بھگوان کی کرپا (یعنی خدا کے لطف وکرم) سے کوئی انگریز اپنے آپ کو ذلیل اور گناہگار نہیں سمجھتا، بخلاف اس کے ہر انگریز یہ سمجھتا ہے کہ وہ دنیا پر حکومت کرنے کے لئے ہی پیدا ہوا ہے وہ سمجھتا ہے کہ وہ دنیا کا مالک ہے، اس کو یقین ہے کہ اس کی ہستی ایک عظیم ہستی ہے اور وہ جو چاہے کر سکتا ہے اگر اس کو سورج یا چاند تک جانا پڑے تو جا سکتا ہے، اگر وہ اپنے پادریوں کی اس تلقین پر ایمان لے آتا کہ وہ حقیر، بے بس اور ناچیز گناہگار ہے اور اس کو ہمیشہ جہنم کی آگ میں جلنا پڑے گا تو آج انگریزوں میں یہ شان نہ ہوتی جس کا وہ آج مالک ہے یہی حال دوسری قوموں کا ہے۔ اگر صبح وشام گناہ کا ذکر کرنے والے ان پروہتوں اور پادریوں کا بس چلے تو یہ کسی کو جینے ہی نہ دیں، شکر کا مقام ہے کہ ان کے ہوتے سوتے اور ان تو ہمات کے باوجود ہر زندہ قوم میں یزدانیت کا عنصر خود اعتمادی کی شکل میں جلوہ نما ہوتا ہے۔ ہم ہندوستانیوں کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ ہم میں سچا اعتقاد تو رہا ہی نہیں۔ اگر یقین وایمان خود اعتمادی کی صورت میں نمودار ہو کر کارہائے نمایاں کے محرک نہیں ہوتے تو پھر یہ یقین وایمان صرف کہنے ہی کی باتیں ہیں، شاید آپ کو میری بات کا یقین مشکل سے آئے لیکن امر حقیقت یہی ہے، اس سے انکار ممکن نہیں۔ ہم خود کو لاکھ خاصانِ خدا میں شمار کریں اور دن رات مذہب اور روحانیت کی رٹ لگاتے رہیں لیکن ہم میں ایک عام انگریز مرد یا عورت کے بمقابلہ اعتقاد کی بہت زیادہ کمی ہے۔ یہ صاف اور صریح واقعات ہیں اور میں ان کے اظہار سے باز نہیں رہ سکتا۔ اور تو اور خود مذہب اور روحانیت کے معاملے میں آپ نے کئی بار دیکھا ہوگا کہ جو انگریز مرد اور عورتیں ہمارے آدرشوں کو بخوبی سمجھ لیتے ہیں وہ کس طرح ان کے پیچھے دیوانے ہو جاتے ہیں، اور اگرچہ ان کا تعلق حکمران جماعت سے ہے، پھر بھی وہ ہندوستان آتے ہیں اور ہمارے ہی مذہب کی تعلیم وتدریس میں مصروف ہو جاتے ہیں، اس سلسلے میں ان کو بسا اوقات اپنے ہم وطنوں کے طعنہ وتشنیع کا بھی شکار ہونا پڑتا ہے۔ ان پر فقرے کسے جاتے ہیں ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے، لیکن وہ اس کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتے۔ آپ میں سے کتنے صاحب ایسا کر سکتے ہیں؟ کیا کبھی آپ نے سوچا ہے کہ آپ ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟ آج آپ ان سے کس بات میں کم ہیں؟ کیا آپ میں علم کی کمی ہے؟ نہیں بلکہ دین اور

مذہب کے معاملے میں تو آپ کی واقفیت اُن سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ آپ کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ آپ ضرورت سے زیادہ عقل مند ہو گئے ہیں۔ آپ نے ہر بات میں بال کی کھال اتارنے میں کمال حاصل کر لیا ہے لیکن آپ کی عملی طاقت سلب ہو کر رہ گئی ہے، آپ کا دماغ تیز و طرار ہو گیا ہے اور آپ کے ہاتھ مفلوج ہو گئے ہیں، آپ کا خون خون نہیں رہا، پانی ہو گیا ہے، آپ کا جسم کمزور ہو گیا ہے، آپ کی رگ رگ میں سستی اور کاہلی سرائیت کر گئی ہے۔ آپ کو اپنا ہیولے بدلنا ہوگا۔ جسمانی کمزوری کے باعث آپ کی یہ حالت ہو گئی ہے اس کا اور کوئی سبب نہیں۔ اس کمزوری کو دور کرنا اور اپنے جسم کو تندرست اور توانا بنانا ہوگا۔ جسمانی کمزوری اور کاہلی کی وجہ سے آپ کا دماغ بے سروپا باتوں کی دلدل میں پھنس گیا ہے اور کیچڑ میں کھیلنے کے باعث اپنی زبوں حالی کا خیال آپ کے ذہن سے اتر گیا ہے، آپ کا یہ دلدل میں پھنسنا آپ کی موت کا پیش خیمہ ہے زندگی صاف و شفاف پانی کے تیز دھاروں میں ہوتی ہے، آپ کو اس دماغی دلدل سے نکلنا ہوگا، جسم اور دماغ کو چست و چالاک بنا کر میدانِ عمل میں آنا ہے۔ اصلاحوں اور ایسی ہی تمام چیزوں کا ذکر آپ پچھلے سو سال سے کر رہے ہیں۔ لیکن جب عمل کا موقع آتا ہے تو پھر آپ کہیں نہیں دکھائی دیتے۔ دنیا کو آپ پر اعتبار نہیں رہا۔ دوسرے ممالک کے لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ آپ صرف باتیں بنانا جانتے ہیں، کام نہیں کرنا چاہتے، آپ کی زبان سے اصلاح کا نام سن کر یہ لوگ ہنس دیتے ہیں، آپ زمانے کے تمسخر کا ایک نشانہ بن گئے ہیں۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ کیا آپ کو اس کا سبب معلوم نہیں؟ سچ پوچھئے تو آپ کو بخوبی معلوم ہے کہ یہ حالت پیدا کیونکر ہوئی، اس کا ایک ہی سبب ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ کمزور ہیں ہر لحاظ سے کمزور ہیں، آپ کا جسم کمزور ہے آپ کا دماغ کمزور ہے آپ کو اپنی ذات میں اعتماد نہیں رہا۔ میرے بھائیو! آپ جانتے ہیں کہ کئی صدیوں سے آپ پر لگاتار ظلم ٹوٹتے رہے ہیں، اونچی ذات والوں کی خود غرضی نے آپ کا خون چوسا۔ راجوں، مہاراجوں اور بادشاہوں کے جبر و تشدد نے آپ کو پاؤں تلے روندا اور آپ خود اپنے بھائی بندوں کی حرص و ہوس کا شکار بنتے رہے۔ ان سب کے ہاتھوں جو حوصلہ شکن تشدد اور ظلم آپ پر برپا ہوتا رہا، اس سے آپ کی تمام طاقت زائل ہو گئی ہے۔ آپ میں بالکل دم نہیں رہا، آپ کی کمر ٹوٹ گئی ہے اور آپ کی حالت ان کیڑوں کی مانند ہو گئی ہے، جن کو ہر شخص اپنے پیروں سے روندتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہماری حالت اب بھی سدھر سکتی ہے، ہم پھر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہیں، ہم نہ صرف گزشتہ عظمت کو واپس لا سکتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ شان و شوکت پیدا کر کے دنیا کی عظیم قوموں کی صفِ اوّل میں کھڑے ہو سکتے ہیں۔ میں آپ سے بار بار یہی کہتا رہوں گا کہ ہمیں قوت اور توانائی کے علاوہ اور کچھ درکار نہیں ہے۔ ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ طاقت ہے اور یہ طاقت اور توانائی آپ کو کہیں باہر سے نہیں ملے گی، یہ مردانگی آپ میں دوسروں کے بل بوتے پر نہیں آئے گی۔ یہ جواں مردی اور خود اعتمادی تو آپ کو خود پیدا کرنا ہوگی۔ اس کے لیے آپ کو جو پہلا قدم اٹھانا ہے وہ یہ ہے کہ آپ اپنشدوں کے علم بردار ہو کر اس حقیقت پر ایمان لے آئیں کہ "میں روح ہوں۔ آتما ہوں۔ تلوار مجھے کاٹ نہیں سکتی، ہتھیار مجھے زخمی نہیں کر سکتے، آگ مجھے جلا نہیں سکتی۔ اور ہوا مجھے تباہ نہیں کر سکتی۔ میں قادرِ مطلق ہوں، مجھے ہر قسم کی قدرت حاصل ہے۔ میں حاضر و ناظر ہوں، میرا جلوہ ہر جگہ اور ہر شے میں موجود ہے۔ میرے بھائیو! یہ مبارک اور نجات بخش الفاظ بار بار زبان پر لاتے رہو۔ یہ ہرگز نہ کہو کہ ہم کمزور ہیں۔ یاد رکھو کہ ہم کوئی بھی

---

میرا پیغام صفحہ ۶۷

کام سرانجام دے سکتے ہیں۔ ایسا کون سا کام ہے جو ہم نہیں کر سکتے ہم سب کے قالب میں وہی ایک پُرجلال روح موجود ہے۔ اور ہم اس پر ایمان لائیں نچیکیتا کی طرح دل کو اعتقاد کی دولت سے معمور کر دو آپ کو نچیکیتا[1] کی کہانی تو یاد ہو گی جب نچیکیتا کے دل میں وہ ایمان اور اعتقاد پیدا ہو گیا جسے کوئی ہلا نہ سکا۔ اور جس کی بدولت اس نے موت کا راز پا لیا تو اس کو حیاتِ ابدی حاصل ہو گئی میں چاہتا ہوں کہ ویسا ہی اعتقاد آپ سب کے دل میں بھی پیدا ہو جائے اور آپ میں سے ہر شخص ایک دیو عظیم کی طرح کھڑا ہو جائے اور اپنی زبردست عقل و ذہانت سے کام لے کر ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دے ہر لحاظ سے لا انتہا اور لا ابتداء ایزدانی طاقت کا مظہر بن جائے میری خواہش ہے کہ آپ میں سے ہر شخص کو یہ قدرت حاصل ہو اور یہ وہ طاقت ہے جو آپ کو اپنشدوں سے حاصل ہوتی ہے یقین اور اعتقاد کی ہی وہ دولت ہے جو آپ کو اس لافانی اور عظیم خزانے سے ملتی ہے لیکن آپ کہیں گے یہ ساری تعلیم تو سنیاسیوں کے لئے موزوں ہے۔ اس کا تعلق علم سینہ سے ہے اپنشد تو سنیاسیوں کی کتابیں ہیں اور یہ لوگ تو دنیا کو ترک کر کے جنگل کے رہنے والے ہیں بھلا جو کتابیں ایسے بن باسیوں کے لئے موزوں ہوں ان سے ہم کیا حاصل کر سکتے ہیں۔ مانا کہ سوامی شنکر آچاریہ نے ازراہِ لطف اتنا فرما دیا ہے کہ گرہست یا خانہ دار لوگ بھی اپنشدوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں اس سے ان کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ اس سے ان کو نقصان پہنچنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ پھر بھی آخر اپنشد تارک الدنیا لوگوں کے لئے ہی تو ہیں دنیادار انسان یہ کیسے عمل کر سکتے ہیں میں مانتا ہوں کہ عام خیال یہی ہے کہ اپنشدوں میں سنیاس کی زندگی کا ذکر ہے لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ کچھ دن ہوئے میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ویدوں کی جو سب سے زیادہ مستند تفسیر خود بھگوان کرشن نے گیتا میں کی ہے اس سے زیادہ مستند تفسیر نہ ہے نہ کبھی پہلے ہوئی ہے اور نہ آئندہ کبھی ہو سکتی ہے کیونکہ جس عظیم ہستی سے وید ظہور میں آتے جب وہی خود اوتار لے کر ویدوں کی تفسیر کرنے آئے تو پھر اس سے بڑھ کر تفسیر اور کون ہو سکتی ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا گیتا سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ اپنشد صرف سنیاسیوں ہی کے لئے مخصوص ہیں۔ ہرگز نہیں گیتا کی تعلیم صلائے عام ہے یہ کسی خاص فرقے یا پیشے یا ذات کے لوگوں کے لئے مخصوص نہیں۔ جو تعلیم میدانِ جنگ میں دی گئی اور جس کا مقصد ارجن کو آمادۂ عمل کرنا تھا وہ بن باسی سنیاسیوں کے لئے کیونکر مخصوص ہو سکتی ہے۔ یہ تعلیم ہر شخص کے لئے مقصود ہے خواہ اس کا تعلق کسی بھی شعبۂ زندگی سے کیوں نہ ہو۔

آج ہمیں اس بات کو سمجھنا ہے ویدانت کا فلسفہ، ویدانت کے عقائد، ویدانت کا طریقہ کار تارک الدنیا عارفوں ہی کے لئے نہیں بلکہ ہم سب کے لئے ہے۔ ویدانت کو مساروں اور غاروں میں بند ہونے والا علم نہیں۔ ہر رہگزر اس کی رہگزر ہے اس کا پرچار ہر وقت اور ہر مقام پر مناسب اور لازمی ہے اس پر گھر کی چار دیواری کے اندر بھی عمل ہونا چاہیے اور گلی کوچوں اور بازاروں میں بھی اسی علم کی مدد سے

---

[1] مختصر کہانی یوں ہے۔ جب اس کا باپ یگیہ کر رہا تھا تو نچیکیتا نے دیکھا کہ کچھ دبلی پتلی اور بوڑھی گائیں اور دوسری ناکارہ چیزیں دان کی جا رہی تھیں اس نے باپ سے کہا کہ یگیہ میں تو سب سے اچھی اور پیاری چیز بھگوان کے اَرپن کرنا چاہیے۔ باپ کو یہ سن کر غصہ آیا اور اس نے کہا۔ "اچھا تو میں اپنی سب سے پیاری چیز یعنی تمہیں یم دیوتا کے سپرد کرتا ہوں۔ اس کے بعد نچیکیتا یم دیوتا کے یہاں جاتا ہے اور وہاں یم سے موت کا راز دریافت کرتا ہے یم دیوتا اسے دنیا کی دولت بادشاہت، عیش و عشرت وغیرہ کا لالچ دیتا ہے لیکن نچیکیتا اپنی بات پر قائم رہتا ہے اور آخر موت کا راز معلوم کر کے امر ہو جاتا ہے۔

ہر قسم کا کاروبار چلانا چاہیئے۔ کام کوئی بھی کیوں نہ ہو، دیکھنا یہ ہے کہ کرنے والے کا نقطۂ نظر کیا ہے؟ عدالتوں اور وکالت خانوں میں، مندروں، مسجدوں اور گرجوں میں، سکولوں، کالجوں میں، مفلسوں اور ناداروں کی جھونپڑیوں میں اور ماہی گیروں کے گھروندوں غرض کہ ہر جگہ ویدانت کی ضرورت ہے۔ ہر شخص اس سے مستفید ہو سکتا ہے۔ اپنشد تو سب کو صلائے عام دے رہے ہیں کہ آئیے اور ہماری لازوال دولت سے اپنی اپنی جھولیاں بھر لیجئے۔ ہر مرد، عورت اور بچہ خواہ اس کا کچھ بھی مشغلہ کیوں نہ ہو اور خواہ وہ کہیں بھی ہو، ان عقائد سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔ سوال تو ان کی تعلیم پر عمل کرنے کا ہے، اس میں ڈرنے کی کوئی بات بھی ہے؟ یہ نہ سوچئے کہ اپنشدوں کی تعلیم پر عمل کرنے سے آپ فوراً سنیاسی بن کر جنگلوں میں نکل جائیں۔ عام لوگ مثلاً ماہی گیر وغیرہ اپنشدوں کے آدرشوں کو عملی جامہ کیونکر پہنا سکتے ہیں۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ویدانت کے سرچشمے سے ہر شخص اپنی اپنی بساط کے مطابق فیض پاتا ہے۔ ویدانت کا راستہ سب کے لئے کھلا ہے، یہ کوئی تنگ گلی نہیں جو کسی خاص طبقے کے لوگوں کے لئے مخصوص ہو۔ روحانیت ایک لامحدود شئے ہے۔ مذہب کی نہ کہیں ابتدا ہے نہ انتہا۔ آپ جس مقام پر ہیں مذہب اسی مقام پر آپ کی مدد کر سکتا ہے، مذہب آپ کو کام سے دست بردار ہونے کی تعلیم نہیں دیتا، وہ تو آپ کو یہ بتاتا ہے کہ جو کام آپ خلوص اور صدق دلی کے ساتھ انجام دیں وہی آپ کے حق میں مفید ہے اسی کے ذریعہ روحانیت حاصل ہو سکتی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے کام بھی اگر بخوبی سرانجام دیئے جائیں تو ان کے نتائج نہایت حیرت انگیز نکلتے ہیں، اسی کے ذریعہ روحانیت حاصل ہو سکتی ہے۔ کام کوئی بھی کیوں نہ ہو، دیکھنا یہ ہے کہ کرنے والے کا نقطۂ نظر کیسا ہے؟ اگر ماہی گیر کو اپنی روح یا آتما کا احساس ہو جائے تو وہ ایک بہتر ماہی گیر بن جائے گا۔ اگر طالب علم سمجھتا ہے کہ وہ آتما ہے تو وہ پہلے سے بہتر طالب علم ہو جائے گا اور اسی طرح اگر ایک قانون دان اپنے آپ کو آتما سمجھے گا تو وہ بہتر وکیل بن جائے گا۔ یہ ہر پیشے اور ہر طبقے کے لوگوں پر عائد ہوتا ہے۔ ویدانت سماج کی تقسیموں کو مٹاتا نہیں، ان سے تفریق اور نفرت کے عنصر کو نکال کر زندگی کو خوشگوار اور پرمعنی بنا دیتا ہے۔ سماج کی تو یہ فطرت ہے کہ وہ خود کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ ویدانت ان گروہوں کو، ان مختلف ذاتوں کو برقرار رکھتا ہے لیکن ان گروہوں کے ساتھ جو حقوق اور مراعات وابستہ رہتے ہیں ان کو ختم کر دیتا ہے، ویدانت روحانی مساوات کی تعلیم دیتا ہے، کوئی شخص اپنی ذات یا اپنے پیشے کی وجہ سے دوسروں کے مقابلہ بہتر اور برتر نہیں ہو سکتا۔ سب انسان درحقیقت برابر ہیں مثلاً فرض کیجئے کہ آپ حاکم ہیں حکومت کرتے ہیں۔ اور میں موچی ہوں فقط پرانے جوتوں کی مرمت کر سکتا ہوں، لیکن ضروری نہیں کہ آپ کو حکمران ہونے کی حیثیت سے مجھ پر برتری اور فضیلت حاصل ہو حالانکہ میں حکومت کا کام نہیں چلا سکتا۔ لیکن آپ بھی تو جوتوں کی مرمت نہیں کر سکتے حالانکہ میں صرف جوتوں کی مرمت کے کام میں ہوشیار ہوں اور آپ ویدوں کے مطالعہ میں ماہر ہیں لیکن اس سے آپ کو یہ اختیار نہیں پہنچتا کہ آپ میرے سر پر پاؤں رکھ کر چلیں۔ آخر یہ کہاں تک حق بجانب ہے کہ ایک "بڑا" آدمی اگر کسی کو قتل بھی کر دے تو اس سے کچھ بازپرس نہ کی جائے اور ایک غریب آدمی کو اپنا یا اپنے بچوں کا خالی پیٹ بھرنے کے لئے سیب یا روٹی کا ٹکڑا چرانے کے جرم میں پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ اس فرق کو، اس امتیاز کو تو مٹانا ہی ہوگا۔ ذات بجائے خود کوئی بری چیز نہیں۔ سوسائٹی ہمیشہ سے مختلف طبقوں اور جماعتوں میں منقسم ہوتی آئی ہے۔ اس میں کوئی ہرج نہیں، زندگی کے مسائل کو حل کرنے کا یہی ایک قدرتی طریقہ ہے اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔ آپ جہاں بھی جائیں کسی نہ کسی صورت میں ذات کا دستور آپ کو وہاں برابر نظر

آئے گا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی ایک ذات یا جماعت کو دوسری ذات یا جماعت سے افضل اور برتر مان کر اس کو کچھ خاص مراعات دی جائیں۔ ان خاص مراعات کے دستور کو تو میرے سے مٹانا ہی پڑے گا اور اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ انسان کو اس کی حقیقت اور عظمت سے آگاہ کر دیا جائے۔ اگر ایک ماہی گیر پر اس کی حقیقی عظمت کا راز کھل جائے اگر اس کو ویدانت کی تعلیم مل جائے تو وہ ضرور کہے گا کہ میں بھی آپ کی طرح انسان ہوں آپ فلاسفر ہیں تو مراکھوں پر۔ بہت خوب لیکن میں ماہی گیر ہوں۔ آخر میرے قالب میں بھی اسی خدا کا جلوہ ہے جو آپ کے قالب میں موجود ہے۔

یہ ہے وہ عملی ویدانت جس کی میں آپ کو تعلیم دیتا ہوں۔ میں ذات پات کے سلسلے کو مٹانا نہیں چاہتا، اگر ان ذاتوں کا وجود مٹنے کے قابل ہے تو وہ خود بخود مٹ جاتے گا۔ میں تو بس یہی چاہتا ہوں کہ کسی ذات کو بھی خاص مراعات نہیں دی جانی چاہئیں۔ سب کے لئے مساوی مواقع مہیا ہوں اس لئے ہمیں سب کو بتانا ہو گا کہ خدا ہمارے سب کے اندر موجود ہے۔ اس کے بعد ہر شخص اپنی نجات کا سامان خود مہیا کر لے گا۔ اور اصلاح و ترقی کی صورت خود بخود پیدا ہو جائے گی۔ ہر شخص آزاد ہو کر اپنی نجات خود ڈھونڈھ لے گا۔ یاد رکھئے کہ کوئی کسی کو نجات نہیں دلا سکتا۔ آزادی نشوونما اور ترقی کی پہلی شرط ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ وہ ان پڑھ اور پسماندہ عورتوں کی حالت سدھار سکتا ہے یا غریب بچوں کی مدد کر سکتا ہے اور اس طرح ان سب کی بہتری اور سماجی نجات کا سامان مہیا کر سکتا ہے تو یہ خیال سراسر غلط ہے ہزار بار غلط ہے۔ مجھ سے بیواؤں کی شادی کے مسئلے اور خصوصاً عورتوں کی بہتری کے دوسرے معاملوں کے متعلق بارہا پوچھا گیا ہے کہ ان مسائل کے بارے میں میری کیا رائے ہے؟ میری طرف سے اس کا جواب قطعی طور پر یہ ہے کہ میں کوئی بیوہ نہیں ہوں کہ آپ کے اس سوال کا جواب دے سکوں۔ میں کوئی عورت نہیں کہ عورتوں کی مشکلات آپ پر واضح کر سکوں۔ عورتوں کا مسئلہ حل کرنے والے آخر آپ کون ہیں؟ آپ کوئی خدا تو ہیں نہیں جس کی ہر بیوہ اور ہر عورت پر حکمرانی ہو۔ آپ ان باتوں سے دست بردار ہو جائیے۔ عورتوں کو ان کے اپنے معاملات میں آزادی دیجئے، یہ بیوائیں اور عورتیں اپنے مسئلوں کا حل خود ہی دریافت کر لیں گی۔ میں تو کہوں گا کہ ہمارا یہ سمجھنا کہ ہم کسی کے لئے کچھ کر سکتے ہیں، بجائے خود ظلم ہے، دوسروں پر حکومت جمانے کی ایک صورت ہے جس کو ہم نے سدھار کا نام دے رکھا ہے، ان باتوں کو چھوڑئیے بھگوان سب کی خبر آپ ہی لیں گے آپ ہیں کون؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کو ہر بات کا علم ہے؟ آپ کو بھلا یہ خیال کرنے کی جرأت ہی کیسے ہوتی ہے، کیا آپ دوسروں کی زندگی کا رخ بدل سکتے ہیں؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کو خود خدا پر بھی کچھ اختیار حاصل ہے۔ آپ یہ بھول رہے ہیں کہ ہر آتما در اصل پرماتما ہے، آپ اپنے کرموں کی فکر کیجئے۔ آپ کے اٹھانے کے لئے کرموں کا اتنا بھاری بوجھ ہر پر موجود ہے پھر آپ دوسروں کی ذمہ داری کیا اٹھائیں گے۔ یاد رکھئے کہ آپ سماج کو دھوکا دے سکتے ہیں لیکن بھگوان سے کچھ چھپا نہیں سکتے۔ سماج آپ کی بڑی بڑی باتوں کے رعب میں آ کر آپ کو اونچی اونچی مسند پر بٹھائے گا، خوشامدی لوگ آپ کے منہ پر آپ کی تعریف بھی کریں گے، عوام آپ کی جے کے نعرے بھی لگائیں گے لیکن بھگوان کی آنکھیں ان سب نمائشی باتوں کے پردے میں چھپی ہوئی اصل حقیقت کو دیکھ رہی ہیں۔ آخر آپ کو اپنے کرموں کا پھل مل کر رہے گا، اگر واقعی آپ کوئی کار خیر کرنا چاہتے ہیں تو پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ ہر مرد و زن میں، ہر ذرہ میں خود خدا جلوہ گر ہے۔ آپ خدا کی خدمت کر سکتے ہیں، مدد نہیں کر سکتے۔ اور خدا کی خدمت کا واحد طریقہ ہے خدا کے بندوں کی خدمت۔

---

خدا کی قربت کا شرف حاصل کرنا ہو تو خدا کی اولاد بنی نوع آدم کی خدمت کرنا سیکھئے۔ مبارک ہے اس شخص کا جسم جسے بھگوان کے بھگتوں کی خدمت کا موقع ملتا ہے خوش نصیب ہے وہ انسان جس کو خدا کی اولاد کے کام آنے کا فخر حاصل ہے۔ یہ سعادت ہر کسی کے حصے میں نہیں آتی۔ یہ انعام عام نہیں۔ کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ اگر آپ کو اس کی خدمت کا موقع ملا ہے تو خدا کی اس رحمت اور شفقت کا (بھگوان کی دیا اور کرپا کا) بار بار شکر بجا لائیے۔ کہ اس نے آپ کو یہ نعمتِ عظمےٰ عطا کی ہے بنی نوع انسان کی خدمت کو خدا کی پرستش سمجھئے۔ خدمتِ خلق ہی آپ کی نماز ہے۔ عام لوگوں کی سیوا ہی آپ کے لیے پوجا کا درجہ رکھتی ہے۔ ہر غریب آدمی میں خدا کو موجود دیکھ کر اس کی خدمت کیجئے۔ دنیا کے امراء و رؤسا کی امارت اور عظمت کے رعب میں آکر تو ساری دنیا ان کے سامنے سر جھکاتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ غریبوں اور مفلسوں میں خدا کی ہستی کو موجود پاکر اس کے جلال کے آگے سجدے کیجئے۔ اسی میں آپ کی نجات ہے۔ عامۂ خلائق کی خدمت اس خیال سے نہ کیجئے کہ اس میں دوسروں کا بھلا ہے، ان کی خدمت تو آپ اس خیال سے کیجئے کہ اس میں خود آپ کی بھلائی اور بہبودی ہے، یہ خود آپ کی مکتی (نجات) کا وسیلہ ہے۔ خدمت ہی برکت حاصل کرنے کا واحد طریقہ ہے۔ خدا نے غریبوں اور مصیبت زدہ مفلسوں کا روپ اس لیے دھارن کر رکھا ہے کہ ہمیں اس کی خدمت کا موقع ملے اور اس طریقہ سے ہم اس تک پہنچ کر نجات حاصل کر سکیں۔ خدمتِ خلق وہ عبادت ہے جو نجات کا وسیلہ ہوتی ہے۔ خدا آپ کے سامنے بیمار بن کر آتا ہے اس کی بیماری کو دیکھ کر اس سے کترائیے نہیں، اس کا علاج کیجئے۔ وہ آپ کے سامنے "پاگل" کی صورت میں آتا ہے، اس سے دور نہ بھاگئے، بجائے اس کے اس سے ہمدردی کا سلوک کیجئے۔ خدا کوڑھی اور گنہگار کی شکل میں آپ کے سامنے آتا ہے، اس سے نفرت نہ کیجئے۔ اس کے کوڑھ اور اس کے گناہ کی غلاظت کو دور کرنے میں اس کی مدد کیجئے۔ اگر آپ خدا کی خدمت ان صورتوں میں نہیں کر سکتے تو مندروں، مسجدوں اور گرجاؤں میں بیٹھ کر آپ کا یہ عبادت کرنا بالکل فضول ہے۔ بے معنی ہے۔

میرے پیغام کو سننے کے لیے ذرا دلیری اور ہمت چاہیئے، میرے راستے پر چلنے کے لیے مردانگی اور ثابت قدمی کی ضرورت ہے۔ اٹھو میرے شیر دلو! میں تمہیں بار بار للکار کر آواز دے رہا ہوں۔ میدانِ عمل میں آکر اپنی روحانیت آشکارا کرو۔ اگر دنیا میں کوئی سعادت، کوئی مبارک کام ہے تو وہ یہی ہے کہ انسان کو خدا کے غریب بندوں کی خدمت کرنے کا موقع ملے۔ اس دنیا میں خدا کی رحمت اور برکت کا اگر کوئی ثبوت ہے تو وہ بس یہی ہے کہ ہمیں مفلسوں۔ ناداروں۔ مظلوموں اور مصیبت زدہ لوگوں کی خدمت کا حق عطا ہو، یہی سچی پوجا ہے، یہی عبادت صادق ہے۔ یہی اصل زہد و تقوےٰ ہے۔ یہی قربانیوں کی قربانی ہے کہ آدمی اپنی ہر ... دوسروں کی بے لاگ خدمت کے لیے وقف کر دے۔

آپ یہ خیال دل سے نکال دیجئے کہ دوسروں کے ساتھ بھلائی ان پر حکومت کر کے کی جا سکتی ہے۔ آپ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہیں کہ کسی کو ضرورت کے وقت تھوڑا سا سہارا مہیّا کر دیں جیسے نا ننک پودے کی نشو و نما کا سامان تو مہیّا کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی بالیدگی خود اس کی اندرونی طاقت پر منحصر ہے۔ آپ بیج اچھی جگہ بو سکتے ہیں آپ پودے کو پانی دے سکتے ہیں اسے کھلی ہوا میں لگا سکتے ہیں لیکن پودا اگتا اپنی ہی فطرت کے مطابق ہے۔ اسی طرح آپ اسی حد تک دوسروں کے

کام آسکتے ہیں کہ ان کی فطری نشوونما کی خوابیدہ طاقت کو حرکت میں لے آئیں۔

ہر شخص کی فطرت ربانی ہے، ہر شخص لا انتہا قوت کا مالک ہے۔ اگر کسی کی کوئی سب سے بڑی خدمت انجام دی جا سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ کم و بیش اس کی سوئی ہوئی قوت کو بیدار کر دیا جائے۔ اس کے بعد وہ خود اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر اپنی مدد آپ کر لے گا۔ انسان اپنی حقیقت کے معجزوں سے (چمتکار سے) واقف نہیں۔ اس کا یہ دائمی نور غفلت اور جہالت کے تہہ در تہہ پردوں میں چھپا ہوا ہے، اگر ہو سکے تو اسی اندھیرے کو دور کیجئے۔ خود آگہی کی شمعیں جلائیے، ہر طرف نور ہی نور پھیلا دیجئے۔ لیکن یہ کام اس وقت تک آسانی سے انجام نہیں دیا جا سکتا۔ جب تک ہر بنی نوع انسان کے دل کا چراغ جل نہیں اٹھتا۔ یہ کام کسی صورت سے ختم نہیں ہو سکتا۔ اٹھئے اور اندھیرے کے بھیب سایوں کو روشنی کے آگے سے بھاگنے پر مجبور کر دیجئے۔ دل میں یہ تہیہ کر لیجئے کہ آپ ساری دنیا کو جگمگا دیں گے۔ غریبوں مفلسوں، ناداروں اور مظلوموں کی اندھیری کوٹھڑیوں میں گیان کے قمقمے جلائیے اور اس طرح انہیں ان کی حقیقت سے آگاہ کر دیجئے۔ امیروں کے محلوں میں جا کر ان میں پڑے ہوئے دبیز پردوں کو ہٹائیے اور انہیں دکھا دیجئے کہ حقیقت کے سورج کی روشنی کے بجائے ان کی خود غرضی اور عیش و عشرت کے چراغوں سے تیرگی پھیلتی ہے۔ اس لحاظ سے امیروں کو روشنی کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ انہیں تو تاریکی کا احساس ہی نہیں۔ ان پڑھ، گنواروں کی جہالت کے اندھیرے کو دور کیجئے اور تعلیم یافتہ لوگوں کی علم نما جہالت کی تاریکی کو کافور بنا دیجئے، کیونکہ ان کی جہالت انجانوں کی جہالت کے بمقابلہ کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ یہ لوگ کال کوٹھڑی میں چراغ کی لو کو آفتاب سمجھ بیٹھے ہیں۔ اس کوٹھڑی کے پٹ کھول دیجئے، اس کی خود ستائی اور خود پسندی کی دیواروں کو گرا دیجئے۔ اس کے تعصبات کی چھت کو ڈھا دیجئے، آپ نور کے دیوتا ہیں اٹھئے اور اپنے چمکار سے دنیا میں ہر طرف روشنی پھیلا دیجئے۔ یہی سب سے اعلیٰ عبادت ہے، یہی سب سے سچی سیوا ہے، باقی سب کچھ خدا پر چھوڑ دیجئے۔ بھگوان نے خود اپنی زبانِ مقدس سے کہا ہے "تمہارا حق صرف کام کرنے کا ہے۔ کام کئے جاؤ۔ اس کام کے پھل پر تمہارا کوئی حق، کوئی ادھیکار نہیں"۔ بس آپ کام کئے جائیے کبھی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہ بیٹھئے۔ لیکن کام کے نتائج کی توقع نہ رکھئے۔ نتائج کی توقع بجائے خود ایک بندھن ہے، اس میں نہ پھنسیئے۔

میری دعا ہے کہ جس بھگوان نے خود اوتار لے کر ہمارے دیش کے بزرگوں کو ان اعلیٰ اور بلند مقام آدرشوں سے آگاہ کیا، وہی بھگوان ہم سب کو اس بات کی توفیق (شکتی) دے کہ ہم اس کے احکام کو عمل میں لا سکیں۔

---



# آغازِ کار

معزز خواتین و حضرات[1] ! آج صبح کی تقریر کا عنوان ہے۔ "فلسفۂ ویدانت" یہ موضوع بجائے خود بیحد دلچسپ ہے، لیکن ہے بہت ہی خشک اور بہت وسیع !

اسی اثناء میں صدر صاحب نے اور کچھ دوسرے اصحاب نے مجھ سے کہا ہے کہ میں انہیں یہ بھی بتاؤں کہ میری سرگرمیاں کیا ہیں، میں کیا کام کرتا رہتا ہوں اور میرا مقصد کیا ہے؟ ہوسکتا ہے کہ یہاں آپ کے لئے یہ بات کسی حد تک موجب دلچسپی ثابت ہو لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے اس بات میں میرے لئے ادنیٰ اسی بھی دلچسپی نہیں ہے، واقعہ تو یہ ہے کہ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ یہ بات آپ کے سامنے کس ڈھنگ سے رکھوں، اس لئے کہ اپنی زندگی میں میرے لئے یہ پہلا موقع ہے کہ میں اس عنوان پر کچھ بول رہا ہوں

بہرحال یہ سمجھنے کے لئے کہ میں اپنے چھوٹے سے دائرہ میں رہ کر کیا کرتا رہا ہوں میں آپ کو خیال و تصور کے راستہ سے ہندوستان لئے چلتا ہوں، اس عنوان کے تمام پہلوؤں پر گفتگو کرنے اور تمام تفصیلات پیش کرنے کے لئے ہمارے پاس وقت نہیں ہے، نہ ہی اتنے مختصر وقت میں ایک بدیشی قوم کے لئے تمام پیچیدگیوں کا سمجھ لینا ممکن ہوسکتا ہے، آپ کے لئے بہرحال اتنا ہی کافی ہے کہ ہندوستان جو کچھ ہے میں اس کا ایک ہلکا سا خاکہ آپ کے سامنے پیش کرنے کی ایک کوشش کروں گا،

یوں سمجھئے کہ ہندوستان کی حالت اس عالیشان عمارت کی حالت سے ملتی جلتی ہے جو

---

[1] کیلی فورنیا کے مقام پیس ڈینا کے شیکسپیر کلب میں ۲۷ جنوری ۱۹۰۰ء کو سوامی وویکانند نے ایک تقریر کی تھی جس کا ترجمہ درج ذیل ہے) اگلا مضمون "فلسفۂ عمل" بھی اسی تقریر کا حصہ ہے (ایڈیٹر)

انہدام پذیر ہے اور برباد ہو رہی ہے، پہلی نظر میں ایسا ہی لگے گا مگر تھوڑی سی اُمید ابھی باقی ہے، یہ ایک قوم ہے جو برباد ہو رہی ہے، فنا ہو رہی ہے لیکن آپ توقف کریں، اور گہری نظر سے مطالعہ مشاہدہ فرمائیں تو آپ تباہی و بربادی کے اِن نشانات کے ماسوا بھی کوئی چیز پائیں گے، واقعہ یہ ہے کہ ایک پیکرِ انسانی کے وہ زاویے جب تک چوٹ نہیں کھاتے جن پر وہ قائم ہوتا ہے اس وقت تک وہ زندہ رہتا ہے اور اُس کی زندگی کی آشا بندھی رہتی ہے، مثال کے طور پر اگر آپ کا کوٹ بیس بار بھی چوری ہو جائے تو بھی یہ واقعہ آپ کی بربادی کا موجب نہیں بنے گا، آپ اس کی جگہ ایک نیا کوٹ لے لیں گے، کوٹ کوئی لازمی شے نہیں ہے، اگر ایک امیر آدمی کی دولت کوئی لُوٹ لے تو اس سے اس کی زندگی کی بُنیاد کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور یہ لُوٹ اس کی موت کی بنا نہیں بنے گی، آدمی زندہ رہے گا،

اِس اُصول پر کھڑے ہو کر جب ہم ہندوستان کے اندر جھانکیں تو ہم کیا دیکھیں گے؟ یہ کہ ہندوستان اب ایک سیاسی شکتی نہیں رہا۔ وہ ایک غلام بن چکا ہے، اپنی حکومت میں ہندوستانی عوام کی نہ کوئی آواز ہے، نہ کوئی دخل ہے۔ وہ تیس کروڑ غلام ہیں اور اُس سے زیادہ کچھ نہیں!۔ ہندوستان میں ایک آدمی کی اوسط آمدنی دو شلنگ ماہانہ ہے، عوام کی بہت بڑی تعداد مستقل فاقہ کشی میں مُبتلا ہے، ہندوؤں کی آمدنی میں اگر ذرا سی بھی کمی ہو جاتی ہے تو لاکھوں لوگ ہلاک ہو جاتے ہیں، معمولی سا قحط تک ہلاکت و فنا کا موجب ثابت ہوتا ہے، ہندوستانی زندگی کے اس رُخ کو دیکھنے سے مجھے بھی بربادی و فنا کے آثار دِکھائی دیتے ہیں، مایوس کن آثار ــــــ!

ساتھ ہی ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ "دولت" نہ تو کبھی ہندوستان کی نسل کا موقف رہی، نہ کبھی مقصدِ حیات بنی! بے شک ہندوستانی نسل نے بے پناہ دولت حاصل کی، اور شاید دُنیا کی ہر قوم سے زیادہ دولت حاصل کی لیکن اس کے باوجود "دولت" ہندوستانی نسل کا موقف اور مقصدِ حیات نہیں رہی، صدیوں تک ہندوستان ایک طاقتور سلطنت رہا، لیکن شاہی اقتدار بھی کبھی اُس کی زندگی کا موقف نہیں رہا اور وہ کسی مُلک کو فتح کرنے کے لئے نہیں نکلا، اپنی سرحدوں کے اندر اس نے خود کو محدود رکھا اور وہ کبھی کسی سے نہیں لڑا، ہندوستانی قوم نے کبھی شوکت و سطوتِ شاہی کو اپنی زندگی کا موقف نہیں بنایا، دولت و اقتدار، ہندوستانی نسل کا نہ کبھی آدرش بنا، نہ کبھی موقف

حیات ٹھیرا،

تو پھر کیا چیز ہے جو ہندوستان کا آدرش ہے، موقف اور مقصدِ حیات ہے؟ بحیثیت مجموعی ہندوستانی قوم کا بچّہ بچّہ یہ عقیدہ رکھتا ہے اور بڑا پختہ عقیدہ رکھتا ہے کہ یہ زندگی حقیقی زندگی نہیں ہے، یہ اعتقاد صحیح ہے یا غلط ہے ہم اس سوال پر یہاں بحث نہیں کر رہے ہیں، اس قوم کا یہ اعتقاد ہے کہ بس ایشور ہی ایک حقیقت ہے، اور ہمیں ایشور تک پہنچنا چاہیئے، ہر طریقہ سے ہر ممکن طریقہ سے! اپنے انحطاط کے دوران میں بھی ہندوستانی نسل دھرم ہی کو اوّلیت دیتی ہے، ایک ہندو آدمی کا کھانا پینا، چلنا پھرنا، سونا جاگنا، شادی بیاہ، اور لباس و پوشاک، الغرض اُس کی ہر چیز دھرم کی تابع ہے اور وہ جو کچھ کرتا ہے، دھرم کے بتائے ہوئے طریقے سے کرتا ہے،

کیا اس جیسا کوئی ملک آپ نے کبھی دیکھا ہے؟ اگر ڈاکوؤں کا کوئی گروہ جمع کرنا کسی کا مقصد ہو تو سب سے پہلے اُسے اِس کام کے لئے کسی قسم کے دھرم کا پرچار کرنا پڑے گا، کچھ بوگس دھارمک ضابطے بنانا پڑیں گے، کچھ اس طرح کا عقیدہ پیدا کرنا پڑے گا کہ صرف یہی صاف اور سیدھا راستہ ہے جس پر چل کر آدمی بھگوان کو پا سکتا ہے، اگر وہ ایسا کرے گا تو اُسے اپنے ماننے والے بھی مِل جائیں گے، معتقد اور پیرو کار بھی مِل جائیں گے، ورنہ نہیں! اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی نسل کی اساس اور موقف حیات دھرم اور صرف دھرم ہے اور چونکہ یہ موقف محفوظ و مامون ہے اور یہ بُنیاد مستحکم و پائیدار ہے لہٰذا یہ نسل بھی ابھی زندہ ہے اور فنا نہیں ہوئی ہے،

روم کو دیکھیئے! رُوم کا موقف تھا۔ شاہی اقتدار اور سلطنت میں توسیع! جیسے ہی یہ موقف زخمی ہوا روم چور چور ہو کر فنا ہو گیا، یُونان کا موقف تھا علم و دانش، لیکن وہ بھی فنا ہو گیا۔ کیوں؟ اس لئے اس کا یہ موقف مجروح ہو گیا تھا، ٹوٹ گیا تھا! اسپین اور دیگر ممالک کے ساتھ عصرِ جدید میں بھی ایسا ہی ہوا، ہر قوم پُوری دُنیا کے لئے ایک مشن رکھتی ہے، جب تک یہ مشن مجرُوح نہیں ہوتا، اُسے کوئی چوٹ نہیں لگتی، وہ قوم بھی زندہ و سلامت رہتی ہے، تمام مشکلوں کے باوجُود زندہ و سلامت رہتی ہے، لیکن جیسے ہی یہ مشن فنا ہوتا ہے ویسے ہی وُہ قوم بھی نیست و نابُود ہو جاتی ہے،

بہرحال ہندوستان کی مستحکم و پائیدار بُنیاد پر ابھی تک چونکہ کوئی چوٹ نہیں لگی ہے اور اُس نے اپنے مشن کو ابھی تک ترک نہیں کیا ہے جو پُوری دُنیا کے لئے وہ اپنے پاس رکھتی ہے لہٰذا اپنی

---

میرا پیغام صفحہ ۷۵

تمام توہم پرستیوں کے باوجود وہ ابھی تک زندہ ہے، تندرست وتوانا ہے! خوفناک توہم پرستیاں موجود ہیں، جن میں سے بعض بہت ہی ہیجان انگیز بھی ہیں، لیکن اُن کی چِنتا نہ کیجئے!۔ قومی زندگی کا دھارا موجود ہے۔ یعنی قومی موقف، قومی مِشن!

ہندوستانی نسل کبھی ایک طاقتور اور فاتح قوم نہیں تھی، کبھی نہیں تھی، وہ آئندہ بھی کبھی ایک زبردست سیاسی طاقت نہیں بنے گی یہ اس کا کام نہیں ہے، اس کا مقصدِ حیات نہیں ہے، یہ دیکھنے کی چیز ہی نہیں کہ ہندوستان اقوام کے مابین باہمی یکجہتی کے لئے کیا کردار انجام دیتا ہے؟ لیکن اُسے کرنا کیا ہے؟ صرف یہ کہ وہ دُنیا کو خُدا سے روشناس کرائے اور دُنیا میں خدا کے نام کا بول بالا کرے! جب تک وہ اِس مقصد سے اس طرح پلٹا ہوا ہے جس طرح موت آدمی کو اپنی گرفت میں لئے رہتی ہے تب تک آشا ہے۔ آشا ہے! پس اس جائزہ کے بعد آپ یہ نتیجہ اخذ کریں گے کہ یہ سب چیزیں یعنی یہ مفلسی، یہ مصیبتیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں! اُن کی کوئی وقعت نہیں ہے،۔ آدمی زندہ ہے اور وہ زندہ ہے تو آشا کی ایک کرن بھی موجود ہے!

بہرحال آپ دیکھتے ہیں کہ ملک کے طول وعرض میں دھارمک سرگرمیاں جاری ہیں، مجھے یاد نہیں ہے کہ ہندوستان میں کوئی سال ایسا بھی گزرا ہو جب وہاں کوئی نیا فرقہ معرضِ وجود میں نہ آیا ہو، دریا کی روانی جتنی تیز ہوتی ہے، اتنے ہی زیادہ بھنور بھی پڑتے ہیں، اتنی ہی زیادہ لہریں بھی اُٹھتی ہیں، مختلف فرقے زوال کی نشانی نہیں ہیں، فنا کی علامت نہیں ہیں، یہ زندگی کی علامت ہیں، اِن فرقوں کو ملا دیجئے، تب بھی ایک ایسا وقت آتا ہے جب ہم میں سے ہر فرد بجائے خود ایک فرقہ ہوتا ہے ہمیں اس بات پر جھگڑنے کی ضرورت نہیں!

اب اپنے ملک کو لیجئے! (میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ میں آپ کے ملک پر کوئی نکتہ چینی کروں) یہاں کا سماجی ڈھانچہ، یہاں کا سیاسی نظام اور یہاں کی ہر چیز کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کو اس زندگی کے سفر میں سہولت فراہم کی جائے، جب تک اس دھرتی پر وہ زندہ ہے تب تک بہت ہی مسرور وشاداں زندگی بسر کرسکتا ہے، اپنی سڑکوں کو دیکھئے۔ کس قدر صاف سُتھری رہتی ہیں! آپ کے شہر کِس قدر خوبصورت ہیں! اور کتنے ہی طریقوں سے ایک آدمی روپیہ کما سکتا ہے، کتنے ہی ذرائع ہیں جن سے آدمی زندگی کی مسرت حاصِل کرسکتا ہے، لیکن ایک شخص اگر یہ بات کہے کہ جناب! میں

اس درخت کے نیچے بیٹھ کر دھیان لگاؤں گا اور کوئی کام نہیں کروں گا، تو کیا وجہ ہوگی کہ اس آدمی کو جیل بھیج دیا جائے؟ کیا آپ دیکھتے ہیں کہ یہاں ایسے آدمی کے لئے قطعًا کوئی موقع نہیں ہے! اِس سوسائٹی میں صرف اسی آدمی کے لئے اپنی زندگی بسر کرنے کا موقع ہے جو سماج کے ساتھ ساتھ قدم مِلا کر چل سکتا ہے۔ جو اس زندگی کی مسرتیں لُوٹنے کے لئے دوڑ لگا سکتا ہے، نہیں تو وہ اِس سوسائٹی میں فنا ہو جائے گا۔

اب ذرا ہندوستان کی طرف پلٹ کر دیکھئے! وہاں اگر ایک آدمی یہ اِچھّا رکھتا ہے کہ وہ پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھ کر اپنی ساری زندگی ناک کی پُھننگی تاکتے تاکتے بتا دے تو ہر شخص اس سے یہی کہے گا کہ "جا اپنا کام کر، بھگوان تیری سہائتا کریں" اُسے اپنی زبان سے کوئی بات کہنے کی ضرورت نہیں! کوئی آدمی اُسے تھوڑے سے کپڑے لاکر دیدے گا، باقی سب کچھ ٹھیک ہے، اس کا کام چل گیا، لیکن کوئی شخص اگر یہ کہتا ہے کہ وہ تو اس زندگی کا تھوڑا سا مزہ لوٹے گا تو پھر اُسے کوئی مدد نہیں ملے گی، اس پر سب دروازے بند رہیں گے،

میں کہتا ہوں کہ دونوں ملکوں کے آدرش نامناسب ہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر یہاں ایک شخص تنہا بیٹھ کر اپنی ناک کی پُھننگی کو تاکنا چاہتا ہے تو کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق ایسا نہ کرے، یا اسے ایسا کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ یہاں کیوں ہر شخص صرف اُسی کام کو جائز اور مناسب سمجھتا ہے جو سماج کی اکثریت کرتی ہے؟ اس کے جواز کے لئے کوئی معقول دلیل، میری سمجھ میں نہیں آتی!

نہ ہی میری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ ہندوستان میں کیوں ایک آدمی کو اس زندگی کی لذّتیں نہ حاصل کرنا چاہئیں، اور کیوں روپیہ نہ کمانا چاہیئے، پھر بھی آپ دیکھئے کہ کس طرح لاکھوں انسان اِن دونوں منتہاؤں کو ظالمانہ طریقہ پر قبول کر لینے کے لئے مجبُور ہو گئے ہیں، یہ دھارمِک پیشواؤں کا ظلم ہے، یہ عظیم رُوحانی شخصیتوں کا ظلم ہے، یہ دانشوروں کا ظلم ہے عقلمندوں کا ظلم ہے، یاد رکھئے کہ ایک جاہل و بے خبر انسان کے ظُلم کی بہ نسبت ایک عالم اور ایک عاقِل کا ظلم بہت زیادہ طاقتور ہوا کرتا ہے، جب اہلِ عقل و دانِش اپنی رائے کو دوسرے کے سروں پر بجبر و زور مُسلّط کر دینے کا تہیّہ کرتے ہیں تو وہ قیود و بندش کے ہزاروں جال بچھا دیتے ہیں، جنھیں بے خبر اور جاہل لوگ، توڑنے کی شکتی نہیں رکھتے،

بہرحال میں کہنا چاہتا ہوں کہ یہ وہ چیز ہے جسے روکنا ہے، ختم ہونا ہے، اس کا کوئی مطلب نہیں ہے، کوئی فائدہ نہیں ہے کہ لاکھوں اور کروڑوں انسان اپنی قربانیوں کے ذریعہ رُوحانیت کی ایک قوی ہیکل شخصیت پیدا کریں، اگر ایک ایسا سماج بنانا مُمکن ہے جس میں رُوحانیت کی قوی ہیکل شخصیت بھی پیدا ہو اور باقی دوسرے لوگ بھی مسرُور و خوشحال ہوں تو یہ ایک اچھی بات ہے لیکن جبکہ لاکھوں لوگ پستی میں گر پڑیں تو یہ ناجائز اور غیر منصفانہ ہے، بہتر یہ ہے کہ ایک عظیم شخصیت پُوری دُنیا کی نجات اور بھلائی کے لئے مصیبتوں کا سارا بوجھ اُٹھائے اور اپنی قربانی پیش کرے،

ہر قوم اپنا ایک طریق کار رکھتی ہے، اور آپ اس کے دائرہ کار کے اندر رہ کر ہی کوئی کام کر سکتے ہیں، آپ کو ہر شخص سے اسی کی زبان میں بات کرنی ہوگی، مثال کے طور پر اگر آپ انگلستان یا امریکہ کے لوگوں میں دھرم کی تبلیغ کرنی چاہتے ہیں، دھرم کی تعلیم دینی چاہتے ہیں تو آپ کو یہ کام کرنے کے لئے سیاسی طریقے اختیار کرنا ہوں گے، اُنہیں دھرم کا نصاب سیاست کی زبان میں پڑھانا پڑے گا یعنی اس طرح کہ دھارمک ادارے ہوں، سوسائیٹیاں ہوں، ان میں ووٹنگ کا طریقہ رائج ہو، ووٹ کے ذریعہ صدر کا انتخاب ہوتا ہو، وغیرہ وغیرہ! مغرب کی اقوام میں چونکہ یہی طریقے رائج ہیں لہٰذا آپ کو بھی دھرم کی تعلیم دینے کی غرض سے انہی طریقوں کو اختیار کرنا ہوگا، دوسری جانب ہندوستان میں اگر آپ لوگوں کو سیاست کی تعلیم دینی چاہتے ہیں، سیاست کا نصاب پڑھانا چاہتے ہیں تو اِس کام کے لیے آپ کو دھرم کی بھاشا بولنی پڑے گی، دھارمک طریقے اختیار کرنا پڑیں گے، آپ کو کچھ اس طرح کی باتیں کہنی پڑیں گی کہ ایک شخص جو صبح سویرے اُٹھ کر اپنے گھر کی صفائی کرے گا اسے اتنا ثواب ملے گا کہ وہ سیدھا سورگ میں جائے اور اُسے بھگوان مل جائے! جب تک آپ یہ بھاشا اختیار نہیں کریں گے تب تک آپ کی بات کوئی سُنے گا نہیں! فرق صرف بھاشا کا ہے، جو کام انجام پائے گا اس کی صُورت اور اس کے اثر میں کوئی فرق نہیں ہوگا، ہر قوم کے دل کو مسخر کرنے کے لئے آپ کو اسی کی بھاشا میں بات کرنی پڑتی ہے اور یہ بالکل ٹھیک بھی ہے، ہمیں اس بارہ میں ٹھٹکنے کی ضرورت نہیں!

میں جس مسلک سے تعلّق رکھتا ہوں وہ سنیاسیوں کا مسلک ہے "سنیاسی لفظ کا مطلب ہے ــــ وہ آدمی جس نے دُنیا کو ترک کر دیا ہے۔" یہ قدیم اور بہت ہی قدیم مسلک ہے، مہاتما بدھ تک جو

---

میرا پیغام صفحہ ۷۸

یسوع مسیح سے ۵۶۰ برس پہلے گزرے ہیں اس مسلک کے حامل تھے وہ اس مسلک کے مصلحین میں سے ایک ہیں، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ مسلک اتنا قدیم ہے کہ دُنیا کی سب سے زیادہ قدیم کتاب ویدوں میں بھی اس مسلک کا حوالہ ملتا ہے، قدیم ہندوستان میں یہ عام رواج تھا کہ ہر مردوزن اپنی ضعیفی کی عمر میں سماجی زندگی کو چھوڑ دیا کرتا تھا اور صرف ایشور سے لَو لگاتا تھا اور اپنی مُکتی کے لئے تپسیا کرتا تھا ـــــ یعنی یہ کہ وہ خود کو اپنی زندگی کے اس واقعہ کے لئے تیار کرتا تھا جس کو موت کہا جاتا ہے، لہٰذا ضعیف اور بزرگ لوگ ابتدائی زمانہ میں سنیاسی بن جایا کرتے تھے، بعد میں جوان عمر لوگ بھی دُنیا کو چھوڑ کر سنیاسی بننے لگے، جوانُ العمر لوگ چونکہ سرگرم ہوتے ہیں لہٰذا وہ کسی درخت کے سایہ میں ہمہ وقت نہیں بیٹھ سکتے تھے اور آٹھوں پہر اپنی موت کا انتظار نہیں کر سکتے تھے چنانچہ وہ نکلے اور اُنہوں نے اپنے اپنے خیالات کا پرچار شروع کیا اور مختلف فرقوں کی تشکیل ہونے لگی، اسی طرح مہاتما بدھ نے بھی جو بالکل جوان آدمی تھے، اصلاح کی عظیم تحریک کا آغاز کیا تھا، اگر وہ ضعیف العمر ہوتے تو وہ بھی ایک درخت کے سایہ میں بس دھیان لگائے بیٹھے رہتے اور اسی جگہ پُرسکون موت مرجاتے!

یہ مسلک نہ تو مثل گرجا کے ہے اور نہ اس مسلک میں شامل ہونے والے لوگ مثل پادریوں کے ہوا کرتے ہیں، پجاری اور سنیاسی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ زمین آسمان کا فرق! دونوں ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہوتے ہیں، پجاری بھی سماجی زندگی کے دوسرے پیشوں کی طرح ایک پیشہ ہے اور ہندوستان میں یہ پیشہ بھی وراثتی پیشہ کی حیثیت رکھتا ہے، ایک پجاری کا بیٹا بھی پجاری ہی ہوگا جیسے ایک بڑھئی کا بیٹا بڑھئی ہوتا ہے، ایک لوہار کا بیٹا لوہار ہوا کرتا ہے، پجاری، شادی کرتا ہے، ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ پتنی کے بنا ایک آدمی کامل نہیں ہوا کرتا، لہٰذا ایک ایسے آدمی کو جس کی شادی نہ ہوئی ہو، دھارمک مراسم انجام دینے کا اہل اور حقدار نہیں سمجھا جاتا!

سنیاسی کی نہ تو کوئی املاک ہوتی ہیں نہ وہ شادی کرتا ہے، ماسوا اس کے اس مسلک کی کوئی آرگنائزیشن نہیں ہے، اگر اس مسلک میں کوئی رشتہ ہوتا ہے تو وہ صرف گورو اور چیلے کے درمیان ہوا کرتا ہے ـــــ اور یہ ہے ہندوستان کی ایک منفرد خصوصیت! گورو کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ بس ایک اُستاد ہے جس نے مجھے تعلیم دی ہے، بلکہ گورو کا مجھ پر وہ حق ہوتا ہے جو میں کبھی ادا نہیں کر سکتا، ہندوستان میں گورو اور چیلے کا رشتہ کچھ اس طرح کا ہوتا ہے جیسے

---

کوئی شخص کسی بچّہ کو گود لے لے، میرا گورو میرے لئے میرے باپ سے بھی افضل ہوگا، اس لئے کہ گورُو اور چیلے کے مُعاملہ میں ہمارا یہ خیال ہے کہ باپ نے تو صرف یہ ظاہری جسم ہی دیا ہے لیکن گورُو نے نجات اور مُکتی کی راہ دکھائی ہے، لہٰذا وہ باپ پر افضلیت رکھتا ہے، اُسی اعتبار سے ہم زندگی بھر اپنے گورُو سے پیار کرتے ہیں اور اس کا احترام کرتے ہیں، سنیاس کے مسلک میں بس یہی ایک آرگنائزیشن پائی جاتی ہے، میں اپنے چیلے بناتا ہوں، بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ گورو کم عُمر ہو اور چیلہ ضعیف العمُر! لیکن عمُر کے اس فرق کو نہیں دیکھا جاتا، گورو باپ کی حیثیت رکھتا ہے اور چیلہ بیٹے کی! بوڑھا چیلہ مجھے پتا کہہ کر مُخاطِب کرتا ہے اور میں اسے بچّہ یا بچّی کہہ کر مُخاطِب کرتا ہوں!

بہرحال میرے گورو جنہوں نے مجھے تعلیم دی۔ اپنی عمر کے اعتبار سے مجھ سے بڑے تھے اور منفرد خصائص کے حامِل تھے۔ وہ نہ تو کتاب کا کیڑا تھے نہ علوم اور حکمت و دانش کے پیچھے بھاگتے تھے، اوائل عُمر ہی میں ان میں یہ وَلولہ پیدا ہُوا کہ صداقت کی بالواسطہ جستجو ترک کردی جائے اور حقیقت کی بِلا واسطہ جستجو کی جائے، تب انہیں یہ خیال آیا کہ دوسرے مذاہب کی سچّائیوں کی بھی ایک تلاش ہونی چاہیئے، ایک کھوج ہونی چاہیئے، اس خیال سے وہ یکے بعد دیگرے تمام مذاہب اختیار کرتے رہے، اِس دوران میں وہ جو کچھ کرتے رہے تھے، اور اُن کا جو عمل رہا تھا اس کی انہوں نے مجھے بھی تعلیم دی ہے۔ اس وقت تک یکے بعد دیگرے ان مختلف مذہبی فرقوں میں سے ہر فرقہ کے پیرو کاروں کے ساتھ زندگی بسر کرو جبتک کہ اس فرقہ کے حقیقی آدرش کا تمہیں پتہ نہ چل جائے۔ چند برس تک وہ ایک مذہب میں رہتے پھر دوسرے مذہب میں شامِل ہوجاتے، جب وہ تمام مذاہب کی راہوں سے گزُر چکے تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ سب ہی دھرم اچھے ہیں، اور کسی میں بُرائی نہیں ہے، ان کے پاس کسی کے خلاف نہ کوئی اعتراض تھا نہ کوئی نکتہ چینی تھی، اُن کی یہ رائے تھی کہ سب ہی دھرم مختلف راستے ہیں جو ایک ہی منزل کی طرف جاتے ہیں، تب وہ کہا کرتے تھے کہ یہ بڑی شاندار بات ہے کہ اتنے مختلف راستے ہیں، اگر صرف ایک ہی راستہ ہوتا تو بس وہ ایک ہی طرح کے آدمی کو بھاتا! جتنے زیادہ راستے ہوں گے اِتنے ہی زیادہ امکانات ہم میں سے ہر شخص کے لئے اس بات کے ہوں گے کہ ہم سچّائی کو ڈھونڈھیں اور سچّائی کو پائیں، اگر میں ایک بھاشا کو نہیں سمجھتا تو دوسری بھاشا سمجھ سکتا ہوں اور اس بھاشا کے ذریعہ سچّائی کو پانے کی کوشش کرسکتا ہوں، اس بنا پر وہ ہر مذہب کے لئے اپنے

من میں احترام کا ایک جذبہ رکھتے تھے،

بہرحال میں جن خیالات کا پرچار کرتا ہوں، وہ انہی کے خیالات کی صدائے بازگشت ہے، ان خیالات میں میرا اپنا کچھ نہیں ہے، سوائے ان برائیوں کے جو میرے من میں پیدا ہوتی ہیں یا میرے مونہہ سے نکلتی ہیں، بس یہ برائیاں میری ہیں، میں جو قصور کرتا ہوں وہ میرا ہوتا ہے، جو برائی میرے مونہہ سے نکلتی ہے وہ میری ہوتی ہے، ورنہ جملہ خیالات جن کا میں پرچار کرتا ہوں وہ میرے گورو کے ہیں اور اُن کی صدائے بازگشت ہیں، میری زبان سے اچھائی اور نیکی کا جو لفظ بھی ادا ہوتا ہے وہ ان کی آواز کو بلند کرنے کی ایک کوشش ہوتی ہے، اُن کی سوانح حیات کا مطالعہ کیجئے جو پروفیسر میکس ملر[1] کی تصنیف ہے۔

بہرحال میں نے ان کے چرنوں میں رہ کر ان خیالات کی تعلیم پائی، میرے ساتھ کچھ دوسرے نوجوان بھی تھے! میں تو صرف بچہ تھا، اس وقت میری عمر صرف سولہ برس کی تھی، کچھ لڑکے مجھ سے بھی کم عمر تھے، کچھ کی عمر مجھ سے زیادہ تھی، ہماری کل تعداد بارہ پندرہ کے لگ بھگ تھی اور ہم سب مل کر ان عقائد و خیالات کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور پھر ہم میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس آدرش کو پھیلانا چاہیئے، اسے فروغ دینا چاہیئے اور نہ صرف یہ کہ اُسے پھیلایا جائے بلکہ اُسے عملی بنایا جائے، یعنی یہ کہ ہم اپنی عملی زندگی میں ہندوؤں کی روحانیت، بدھوں کی ہمدردی، عیسائیوں کی سرگرمی اور مسلمانوں کی اخوت کا مظاہرہ کریں، ہمیں فی الفور ایک عالمگیر مذہب کا پرچار شروع کر دینا چاہیئے اور ہم نے فیصلہ کیا، ہم یہ کام کریں گے اور اس کام میں کوئی تاخیر نہیں کریں گے۔

ہمارے گورو ضعیف آدمی تھے اور پیسہ کو کبھی ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔ جو کھانا اُنہیں کوئی پیش کرتا تھا اس میں سے تھوڑا بہت کھا کر گزارہ کر لیتے تھے، اسی طرح چند گز سوتی کپڑا لباس کے طور پر استعمال کرتے تھے، اس سے زیادہ کچھ نہیں، اُنہوں نے کبھی کوئی تحفہ یا عطیہ قبول نہیں کیا، ان شاندار نظریات کے ساتھ ہی ساتھ ان معاملوں میں وہ بڑے سخت آدمی تھے، کیونکہ یہی وہ سختی

---

[1] ۔ رام کرشن ۔ سوانح حیات اور تعلیمات! لندن میں پہلی بار ۱۸۹۶ء میں طبع ہوئی اور پھر ۱۹۵۱ء میں ادویت آشرم نے دوبارہ طبع کی ——!

---

تھی جس نے انہیں دنیا کی گرفتوں سے آزادی بخش دی تھی، ہندوستان میں آج ایک بھکشو کی ایک شہزادہ سے دوستی ہوجاتی ہے، وہ اس کے ساتھ رہتا سہتا ہے، کھاتا پیتا ہے لیکن کل وہ ایک فقیر کے ساتھ گزارہ کرنے لگتا ہے اور درخت کے سایہ میں رات گزارنے لگتا ہے، وہ سدا حرکت کرتا رہتا ہے، سدا سفر میں رہتا ہے اور سدا اس کا کسی نہ کسی سے واسطہ پڑتا رہتا ہے، اس پر یہ کہاوت صادق آتی ہے کہ بہتے پانی پر کائی نہیں جمتی! اپنی زندگی کے گزشتہ چودہ برس میں کسی بھی ایک مقام پر میں تین مہینے بھی نہیں گزار سکا ہوں، ــــ مسلسل سفر ہے ــــ مسلسل حرکت ہے! ہم سب سنیاسی ایسا ہی کرتے ہیں،

بہرحال گنتی کے چند لڑکوں نے ان نظریات کو اختیار کیا اور اُن سے تمام عملی نتائج برآمد ہونا شروع ہوگئے، عالمی دھرم! غریب کے ساتھ بے پناہ ہمدردی! بات تو یہ بہت اچھی ہے لیکن اس پر عمل کرنا چاہیئے،

تب وہ المناک دن آیا جب ہمارے گورو نے اس دُنیا سے انتقال کیا، ہم نے اُن کی خدمت کی جیسا کہ کرسکتے تھے، ہمارا کوئی دوست تو تھا نہیں، ہم چند لڑکوں کی بات کوئی کیوں سُنتا اور کیوں اس پر دھیان دیتا، ؟ کوئی بھی نہیں! کم سے کم ہندوستان میں لڑکے کسی شمار قطار میں نہیں آتے، ــــ ذرا سوچئے کہ ایک درجن لڑکے ہیں جو عوام کے بڑے بڑے ہجوم سے باتیں کرتے پھرتے ہیں، انہیں بڑے بڑے خیالات و نظریات سمجھاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اُنہوں نے ان نظریات و خیالات کا پرچار کرنے کے لئے اپنی زندگی وقف کردی ہے اور انہوں نے اُن کی عملی تبلیغ کا تہیّہ کر رکھا ہے، ہر شخص ہم پر ہنستا تھا لیکن پھر یہ ہنسی سنجیدگی سے بدلنے لگی، زبردست مخالفت ہونے لگی، تشدّد کیا جانے لگا، ہم میں سے ہر ایک کے والدین اپنے بیٹوں کو طمانچے اور تھپّڑ رسید کرنے لگے لیکن ہم کو جتنا زیادہ دبایا جانے لگا ہمارے ارادے اتنے ہی مضبُوط ہوتے گئے، ہمارا عزم اسی قدر پختہ بنتا گیا،

---

# لائحۂ عمل

تب ایک بہت ہی خوفناک وقت آیا ــــ میرے لئے خصوصیت سے ــــ اور سب کے لئے بھی! مگر میرے لئے یہ وقت ایک بدنصیبی کی صورت میں آیا، ایک طرف میری ماں تھیں، میرے بھائی تھے، میرے والد کی اس وقت مرتیو ہو چکی تھی اور ہم سب بہت مفلس تھے! اتنے مفلس کہ بس فاقے کیا کرتے تھے، پورے گھر کو میری ذات سے بڑی بڑی امیدیں تھیں، اُن کا خیال تھا کہ بس میں ہی اِن سب کا مددگار ثابت ہو سکتا ہوں، اِس وقت میں دوراہے پر کھڑا تھا، ایک طرف میری ماں تھی، میرے بھائی تھے اور یہ سوال تھا کہ میں اُنہیں بھوک میں ایڑیاں رگڑتے دیکھوں، تڑپ تڑپ کر مرتے دیکھوں، اور دوسری طرف میرے گورو کے خیالات و نظریات تھے، اور اُنہیں نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دُنیا کی بھلائی کے لئے فروغ دینا تھا اوروں کے پرچار کا کام کرنا تھا، یہ کشمکش میرے دماغ میں نہ جانے کتنے دن چلتی رہی، کتنے مہینے چلتی رہی، بعض دفعہ تو میں پانچ پانچ چھ چھ دن تک مسلسل تپسیا کرتا رہا، رات رات بھر، دن دن بھر! اُف کتنے عجیب اور کتنے تکلیف کے دن تھے وہ! ایسا لگتا تھا جیسے میں نرکھ میں پڑا ہوا اپنی زندگی بتا رہا ہوں، فطری محبت کے رشتے مجھے اپنے گھر کی طرف کھینچ رہے تھے، میں اپنے بھائیوں اور اپنی ماں کی مصیبت دیکھ نہ سکتا تھا، برداشت نہ کر سکتا تھا، دوسری طرف میرا کوئی ہمدرد نہ تھا، کوئی غمگسار نہ تھا، ایک لڑکے کے خیالات سے کون ہمدردی رکھ سکتا تھا، کون اس کا غمگسار بن سکتا تھا؟ اور پھر نظریات و خیالات بھی کیسے؟ جو بہتوں کے لئے موجبِ تکلیف تھے! کون تھا جو مجھ سے ہمدردی کرتا ــــ کوئی نہیں ــــ ماسوا ایک کے!

اس ایک کی ہمدردی میرے لئے ڈھارس کا موجب بنی! اس نے مجھے آسرا دیا، آشیرواد دیا، یہ ایک عورت کی ہمدردی تھی! ہمارا گورو ـــــ یہ عظیم یوگی ـــــ جب وہ لڑکا تھا اور وہ چھوٹی سی بچی تھی تو اُن دونوں کی شادی ہوئی تھی، جب وہ جوان ہوا اور اس میں یہ دھارک جوش پیدا ہوا تو وہ اس سے ملنے آئی، اگرچہ ان کی شادی ہوئے ایک مدّت ہو چکی تھی مگر انہوں نے ایک دوسرے کو تب ہی دیکھا تھا جب وہ بڑے ہو گئے تھے، تب اُس نے اپنی دھرم پتنی سے ـــــ سچ مانو میں تمہارا پتی ہوں، اس شریر پر تمہارا ادھیکار ہے، لیکن اس کے باوجود کہ میں نے تم سے شادی کی ہے میں ازدواجی زندگی بسر نہیں کرسکتا، پس اس بات کا فیصلہ میں تم پر چھوڑتا ہوں، جو تمہارے من میں آئے تم فیصلہ کرو" اور یہ بات سُن کر وہ رو پڑی لیکن اس نے کہا ـــــ بھگوان! تمہاری سہایتا کرے، تم پر ایشور کے کرم کی چھایا رہے، میں وہ عورت نہیں ہوں جو تمہیں نیچا دکھائے، تمہیں رُسوا کرے، میں اگر کچھ کر سکی تو وُہ تمہاری خدمت ہوگی تمہاری مدد ہوگی، تمہاری جو اچھا ہے تم اس کو پُورا کرو،

یہ عورت تھی! پتی اپنے راستہ پر چلا گیا، وہ یوگی بن گیا اور پتنی بہت دور رہ کر اس کی جس حد تک مدد کر سکتی تھی، اس کی مدد کرتی رہی، اور جب اس کا پتی رُوحانیت کا ایک عظیم سرچشمہ بن گیا تو وہ آئی اور حقیقت میں وُہی اس کی سب سے پہلے چیلی بنی اور اس نے باقی ساری زندگی اِس آدمی کے شریر کی نگہداشت، حفاظت اور اُس کی خدمت میں بسر کردی، وہ نہیں جانتا تھا کہ آیا وہ زندہ ہے یا مردہ یا کِس حالت سے گزر رہا ہے، کبھی کبھی باتیں کرتے کرتے اس پر ایسی حالت طاری ہو جاتی کہ اگر اُسے دہکتے ہوئے انگاروں پر بٹھا دیا جاتا تو اسے پتہ نہ چلتا، اسے اپنے شریر کی کوئی چنتا نہیں تھی اور وہ اپنے ظاہری پیکر کو قریب قریب بھُول چکا تھا،

بہرحال وہ خاتون ـــــ اس کی پتنی ـــــ ان لڑکوں کی ہمدرد و غمگسار بنی، لیکن وہ بڑی مجبُور تھی، وہ ہم سے بھی زیادہ غریب اور مفلس تھی، خیر چھوڑیئے اس بات کو! ہم نے عہد کیا، مجھے یقین تھا اور اتنا ہی واثق یقین تھا، جتنا مجھے اپنی زندگی کا کہ یہ نظریات فروغ پائیں گے تو ہندوستان کے لئے انقلاب آفریں ثابت ہوں گے اور ان کی وجہ سے دوسرے ملکوں اور دوسری نسلوں میں بھی اچھا زمانہ آئے گا، اچھے دِن آئیں گے اس یقین کی بدولت

یہ احساس پیدا ہوا کہ چند افراد کا مصیبت میں مبتلا ہونا اس سے بہتر ہے کہ یہ نظریات ہی اس دُنیا سے فنا ہو جائیں، اگر ایک ماں اور دو بھائی مر جائیں تو کیا ہوا؟ یہ تو ایک قربانی ہوئی! پھر انہیں مر جانے دینا چاہیئے، قربانی کے بغیر کوئی بڑا کارنامہ سرانجام نہیں پاتا، اپنے پہلو کو چیر کر اپنا دل نکالنا چاہیئے اور خون آلودہ دل کو قربان گاہ پر چڑھا دینا چاہیئے، بس سمجھ لیجئے کہ بڑا کارنامہ سرانجام پا گیا، کیا اس کے علاوہ بھی کوئی راستہ ہے؟ کوئی راستہ نہیں! میں آپ میں سے ہر ایک سے ان سب کے لئے اپیل کرتا ہوں جنہوں نے اپنی زندگی میں کوئی کارنامہ سرانجام دیا ہے!..... اُف! اس کارنامے کی کتنی گراں قیمت چُکانی پڑتی ہے! کتنی تکلیف ہوتی ہے، کتنا تشدد ہوتا ہے، کتنا ظلم سہنا پڑتا ہے اور کیسی کیسی مصیبت بھگتنی پڑتی ہے، ہر شخص کی زندگی میں اس کی کامیابی کے پیچھے مصیبتوں کی ایک قطار پوشیدہ ہوتی ہے، آپ سب اس حقیقت کو جانتے ہیں اور خوب اچھی طرح جانتے ہیں۔

اور اس طرح ہم چلتے رہے، ہم عمر لڑکوں کا یہ چھوٹا سا گروہ کام کرتا رہا۔ ہمیں اپنے گرد و پیش سے صرف ایک ہی چیز ملا کرتی تھی یعنی ٹھوکریں! صرف ٹھوکریں! ہمیں دروازے دروازے روٹی کی بھیک تک مانگنی پڑتی! ــــ اور ہمیں جھڑکیاں ملتیں، پھٹکار ملتی، سوا انکار کے اور کوئی چیز نہ ملتی ــــ کبھی کبھار روٹی کا ایک آدھ ٹکڑا بھی مل جاتا، ہمیں رہنے کے لئے ایک بوسیدہ ٹوٹا پھوٹا مکان ملا جس میں سانپوں کے رینگنے کی آواز سنائی دیتی تھی، لیکن ہم اسی گھر میں چلے گئے اس لئے کہ اس کا کرایہ کم تھا اور ہمارے لئے سستا تھا،

اس حالت میں ہمارے چند برس بیت گئے اور اس اثنا میں ہم پورے ملک میں سفر کرتے رہے اور آہستہ آہستہ اپنے مقصد کا پرچار کرنے کی کوشش کرتے رہے، دس برس کی لمبی مدت گزر گئی اور روشنی کی ایک کرن بھی نمودار نہ ہوئی، مزید دس برس بیتے! ہزاروں بار مایوسیاں ہمارے راستہ میں آئیں لیکن صرف ایک چیز ہمارا حوصلہ بڑھاتی رہی، ہماری ہمت باندھے رہی ــــ یعنی ایک دوسرے پر ہمارا بے پناہ اعتماد اور بھروسہ اور ایک دوسرے سے ہماری بے پناہ محبت! میں نے اپنے گرد ایسے مرد اور عورتیں اکٹھا کر لیں، کہ اگر میں شیطان بن جاؤں تو بھی وہ مجھ سے یہی کہیں گے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور تمہیں چھوڑ کر نہیں جائیں گے، یہ ایشور کی بڑی کرپا ہے، بڑا عطیہ ہے، خوشی میں، رنج میں، قحط میں، درد میں، قبر میں،

جنت میں، جہنم میں، جہاں کہیں بھی میں ہوں، جو شخص میرا ساتھ نہیں چھوڑتا بس وہی میرا دوست ہوتا ہے، کیا ایسی دوستی کوئی قدرتی ہوا کرتی ہے؟ ایسی دوستی کا ہونا قدرتی نہیں ہے! اس طرح کی دوستی کے ذریعہ ایک شخص نجات پا سکتا ہے مکتی حاصل کر سکتا ہے، اگر ہم ایسی محبت کر سکتے ہیں تو یہ محبت ذریعۂ نجات بن سکتی ہے، اگر آپ میں یہ اعتماد ہے تو آپ کے اندر تمام عبادتوں کا جوہر ہے، آپ کو ضرورت نہیں ہے کہ آپ کسی دیوتا کی پوجا کریں، کسی معبود کی عبادت کریں، اگر آپ میں اعتماد ہے، محبت ہے، شکتی ہے تو آپ کو دنیا میں کسی خدا کو پوجنے کی احتیاج نہیں ہے، اور یہی تو وہ خدا ہے جو ہمارے مشکلات کے تمام اوقات میں ہمارے ساتھ رہتا ہے، وہ ہم میں موجود ہوتا ہے اور ہم کو ہمالیہ سے کیپ کیمورن اور دریائے سندھ سے دریائے برہمپتر تک چلنے پھرنے اور سفر کرنے کی توفیق دیتا ہے،

لڑکوں کے اس گروپ نے سفر کرنا شروع کیا، رفتہ رفتہ ملک کے لوگ ہماری جانب توجہ کرنے لگے، لیکن اس توجہ میں نوے فی صدی استعجاب کا عنصر تھا، اس لئے کہ ہم میں بس ایک ہی نقص تھا اور وہ یہ کہ ہم لڑکے تھے، اور ہمارے ساتھ ہماری مفلسی تھی، ہماری غریبی تھی اور ہمارا اکھڑ پن تھا! جو شخص بھی اپنی زندگی میں کچھ کر کے دکھاتا ہے وہ تھوڑا سا اکھڑ بھی ہوا کرتا ہے، — میرے گورودیں! میرے گورو کی پتنی — اس معزز خاتون میں اور ایسے سب ہی لوگوں میں یہ اکھڑ پن پایا جاتا ہے، آپ کو بھی زندگی میں سدا ایسا ہی تجربہ ہوا ہوگا وہ بے تراشا ہوا الماس ہے — وہ ایسا ہیرا ہے جس پر بہت زیادہ پالش نہیں کی گئی — وہ اپنی ماہیت وحقیقت میں ایک جوہر ایک نگینہ ہے!

اور ہم میں بھی ایسا ہی اکھڑ پن آیا، ہماری پہلی بات یہ تھی کہ کوئی سمجھوتہ بازی نہیں یہ آدرش ہے اور ہمیں اس آدرش کو آگے لے جانا ہے، ہم بادشاہ سے ملتے تو بنا کسی ڈر کے اس سے اپنے من کی بات کہتے اُسے اپنا پیغام دیتے اور اگر کسی کسان سے ملتے تو اس سے بھی وہی بات کہتے، اسے بھی وہی پیغام دیتے، قدرتی طور پر ہمیں لوگوں کے استعجاب کا نشانہ بننا پڑا، ان کی حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔

مگر یاد رکھئے — یہ زندگی کا تجربہ ہے، اگر آپ دنیا کی بھلائی چاہتے ہیں، تو ساری دنیا آپ کی مخالفت پر کھڑی ہو جائے، تو بھی اس کی مخالفت آپ کو کوئی گزند نہیں پہونچا سکتی

اگر آپ مخلص ہیں اور سچ مچ بے لوث اور بے غرض ہیں تو ایشور کی شکتی آپ کے اندر موجود ہے اور اس شکتی کے مقابلہ میں دنیا کی مخالفت چکنا چور ہو جائے گی، اور یہ لڑکے سچ مچ بے غرض اور بے لوث تھے اور پورے خلوص کے ساتھ دنیا کی بھلائی چاہتے تھے، وہ بچے تھے، لہٰذا معصوم اور سادہ لوح تھے، ہمارے گرو نے کہا تھا کہ میں اپنے ایشور کے چرنوں میں صرف وہی پھول رکھنا چاہتا ہوں جنہیں کبھی کسی نے سونگھا نہ ہو، صرف وہی پھل چڑھانا چاہتا ہوں جنہیں کسی نے انگلیوں سے کبھی چھوا نہ ہو، اس عظیم شخصیت کے یہ الفاظ ہماری رگ و پے میں سرایت کر گئے تھے، اس نے ان لڑکوں کے مستقبل کو اپنی آنکھ سے دیکھا اور بس یوں سمجھئے کہ انہیں کلکتہ کی سڑکوں، بازاروں اور گلی کوچوں سے اٹھا کر جمع کر لیا، جب وہ یہ کہتے دیکھنا یہ لڑکا — یا وہ لڑکا آئندہ چل کر کیا بننے والا ہے تو لوگ ان کی یہ بات سن کر ہنسا کرتے تھے، ان کا اعتماد اٹل تھا، ناقابلِ ترمیم تھا، ماتا نے مجھے یہ دکھایا ہے، میں کمزور ہو سکتا ہوں — مگر جب وہ ایسا کہتی ہیں تو ان کی بات غلط نہیں ہو سکتی — وہ جو کہتی ہیں وہی ہونا چاہیئے۔

بس دس برس تک یہ حالات بدستور چلتے رہے، ان میں روشنی کی کوئی کرن نہیں تھی لیکن میری صحت سدا جواب دے جاتی تھی، اس بات کا ایک آدمی کے بدن پر بڑا اثر پڑتا ہے کہ ایک مرتبہ رات کو نو بجے کھانا کھا لیا، دوسری مرتبہ صبح کو آٹھ بجے کھایا اور پھر دو تین دن بنا کھانا کھائے گزر گئے — اور کھانا بھی ملا تو غریبوں جیسا رُوکھا سوکھا! کون شخص کسی فقیر کو اچھا کھانا دیا کرتا ہے اور پھر ہندستانیوں کے پاس دینے کے لئے بہت کچھ ہوتا بھی نہیں، لہٰذا زیادہ تر وقت چلتے چلتے بیت جاتا، برف پوش چوٹیوں پر چڑھتے اترتے، کبھی کبھی تو صرف ایک روٹی کی خاطر دس دس میل تک دشوار گزار پہاڑیوں پر چڑھنا پڑتا، ہمیں سوکھی روٹی کھانے کو ملتی کبھی کبھی تو بیس بیس تیس تیس دن کی رکھی ہوئی روٹیوں کے ان ٹکڑوں میں سے تھوڑے بہت ٹکڑے ہمیں دیئے جاتے جو اینٹوں کی طرح سخت ہوتے تھے، میں گھر گھر جاتا اور بس اتنا جمع کر کے لاتا جو ایک آدمی کی خوراک کے لئے کافی ہو سکتا تھا اور روٹی اتنی سخت ہوتی تھی کہ اسے کھاتے ہوئے اکثر میرے ہونٹوں سے خون نکلنے لگتا تھا اگر یہ بات کہی جائے تو بھی اس میں کوئی مبالغہ نہ ہو گا کہ ایک آدمی یہ روٹی کھا کر اپنے دانت توڑ سکتا ہے، میں ان سوکھے ٹکڑوں پر دریا سے تھوڑا سا

---

پانی لے کر چھڑک لیا کرتا تھا اور تب انہیں کھاتا تھا، اس حالت میں نہ جانے کتنے مہینے بیت گئے اور اس کا میری صحت پر اثر پڑا،

تب میرے دھیان میں آیا کہ ہندوستان کو تو میں نے آزما لیا، اب کسی دوسرے ملک میں جا کر اپنا مقدر آزماؤں جس زمانہ میں آپ کے یہاں مذاہبِ عالم کی پارلیمنٹ ہونے والی تھی اور اس میں شرکت کی غرض سے کسی کو ہندوستان سے بھیجا جانے والا تھا تو اس وقت میں فارغ تھا، میں نے کہا کہ مجھے ہی وہاں بھیج دیا جائے میرا کچھ ضائع نہ ہوگا اور اگر میں نے کچھ ضائع بھی کیا تو اس کی مجھے کوئی چنتا نہیں ہوگی، میرے لئے روپیہ کی فراہمی بہت ہی دشوار مسئلہ تھی، لیکن زبردست کوشش کرنے پر لوگوں نے میرے لئے اتنا روپیہ اکٹھا کر دیا کہ میرا کرایہ ہو جائے اور بس میں یہاں چلا آیا، ایک دو ماہ پہلے ہی چلا آیا، تاکہ میں کسی کو جانے پہچانے بغیر ہی یہاں کی سڑکوں پر گشت کرتا رہوں،

انجام کار مذاہب کی پارلیمنٹ کا آغاز ہوا اور مجھے مہربان دوستوں سے ملنے کا موقع ملا جو میری ازا بتدا تا انتہا مدد کرتے رہے، میں نے تھوڑا کام کیا، چندہ اکٹھا کیا، دو پرچے شروع کئے اور اسی طرح چلتا رہا، پھر میں انگلستان چلا گیا اور وہاں تھوڑا بہت کام کیا، ساتھ ہی ساتھ میں امریکہ میں ہندوستان کے لئے بھی کام کرتا رہا،

ہندوستان کے لئے میرا منصوبہ یہ ہے : جیسا کہ میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ وہاں ہم بھکشو کس طرح سے زندگی بسر کرتے ہیں، کس طرح گھر گھر جاتے ہیں تاکہ انہیں بغیر کسی اجرا در معاوضہ کے انہیں دھرم کا پیغام پہونچائیں اور اس خدمت کے بدلہ میں شاید روٹی کا ایک ٹکڑا تک قبول نہیں کرتے، یہی وجہ ہے کہ آپ یہ بات دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں جو سب سے زیادہ کمترین ہیں ان میں دھرم کا سب سے زیادہ جذبہ پایا جاتا ہے اور یہ ان ہی سنیاسیوں کی بدولت ہے، لیکن ایک آدمی سے اگر آپ یہ سوال کریں کہ انگریز کون ہیں، تو وہ نہیں جانتے، کون حکمراں ہے، وہ نہیں جانتے، حکومت کیا چیز ہوا کرتی ہے، انہیں اس کی خبر نہیں البتہ وہ فلسفہ جانتے ہیں، ان میں جس چیز کا فقدان ہے وہ ہے اس زمین پر بسر ہونے والی زندگی کی عملی تعلیم کا فقدان! یہ کروڑوں لوگ اس دنیا کے بعد کی زندگی کے لئے تیار

ہیں، — کیا اتنا ہی کافی ہے؟ یقینی طور پر یہ کافی نہیں! انہیں اچھی خوراک ملنی چاہیئے، ان کے جسموں پر اچھا لباس ہونا چاہیئے بڑا سوال یہ ہے کہ اُن کروڑوں نیم جاں لوگوں کے لئے کس طرح اچھی خوراک حاصل کی جائے اچھا لباس فراہم کیا جائے،

سب سے پہلے تو مجھے آپ سے یہ کہنا چاہیئے کہ ان لوگوں سے بڑی بڑی توقعات وابستہ ہیں، اس لئے کہ آپ جانتے ہیں کہ رُوئے ارض پر وہ شریف ترین انسان ہیں، یہ بھی نہیں ہے کہ وہ بُزدل ہوں، جب وہ لڑنا چاہتے ہیں تو پھر اس طرح لڑا کرتے ہیں جیسے دتیہ لڑتے ہیں، انگریزوں کے پاس جو سپاہی ہیں وہ ہندوستان کے کاشتکاروں اور کسانوں میں سے بھرتی کئے گئے ہیں، ان کے لئے موت کی کوئی اہمیت نہیں ہے، وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ بیسیوں بار وہ پہلے بھی مر چکے ہیں اور آئندہ بھی وہ بیسیوں بار مرتے رہیں گے، موت ان کے لئے بڑی حقیر شے ہے وہ کبھی پیٹھ نہیں دکھاتے وہ سادہ لوح ہیں، ان میں تصنع نہیں ہے لیکن وہ بہترین سپاہی ہیں اور بہت خوب لڑتے ہیں؛

کاشتکاری، بہر حال اُن کی قدرتی استعداد ہے، اگر آپ انہیں دھرم کی آزادی دیں تو پھر آپ انہیں لوٹ سکتے ہیں، انہیں قتل کر سکتے ہیں، ان پر محاصل کا بوجھ لاد سکتے ہیں، وہ ان تمام معاملوں میں بڑے متحمل اور بے حد شریف ثابت ہوں گے، وہ دوسروں کے مذاہب میں کوئی دخل بھی نہیں دیتے، ان کا ایک ہی زاویۂ نگاہ ہے کہ "بس ہمیں اس بات کی آزادی دیجئے کہ ہم اپنے دیوتاؤں کی پرستش کریں اور باقی جو کچھ آپ لینا چاہیں لے لیں" یہ اُن کا مزاج ہے، ان کی فطرت ہے، جب انگریزوں نے ان کے دھرم کو ہاتھ لگایا تو ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا، ۱۸۵۷ء کے غدر کی حقیقی وجہ یہی تھی — وہ یہ برداشت ہی نہیں کر سکتے کہ ان کے دھرم کو پسپا کیا جائے، مسلمانوں کی عظیم حکومتیں، محض اس بنا پر ایک دھاکہ کے ساتھ ہوا میں اُڑ گئیں کہ انہوں نے ہندوستانی عوام کے مذہبی جذبات کو چھیڑ دیا تھا؛

اس ایک بات کو چھوڑ کر، باقی وہ بہت ہی امن پسند لوگ ہیں، بہت ہی شریف ہیں، مزید یہ کہ وہ فتنوں کو راہ نہیں دیتے کیسی دُوسری تُند و تیز سرگرمی کا فقدان! ہاں بے شک انہیں ہر دوسرے ملک کے عوام پر برتری دیتا ہے، ہندوستان کے غریبوں کی زندگی میں جو شائستگی

پائی جاتی ہے آپ اس کا موازنہ اپنے یہاں کی گندی بستیوں کی زندگی سے نہیں کر سکتے، گندی بستی کا مطلب ہے غریبی اور مفلسی، لیکن غریبی اور مفلسی کا مطلب ہندوستان میں پاپ، گناہ یا غیر شائستگی ہرگز نہیں ہے، دوسرے ممالک میں ایسے مواقع ہیں کہ صرف غیر شائستہ اور سست و ناکارہ لوگ ہی غریب ہوا کرتے ہیں، جب تک کہ ایک شخص بے وقوف اور پسماندہ نہ ہو اس وقت تک اس کے مفلس اور غریب ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، غریبوں کی یہ قسم وہ ہے جو شہروں کی زندگی اور اس کی مسرتیں اور راحتیں چاہتی ہے، وہ دیہات کا رُخ بھی نہیں کرتے، ان کا یہ کہنا ہوتا ہے کہ یہاں تمام آسائشیں ہیں بس آپ ہمیں روٹی فراہم کر دیں لیکن ہندوستان میں صورتِ حال یہ نہیں ہے، وہاں غریب لوگ صبح کو سورج نکلنے سے لے کر شام کو سورج ڈوبنے تک سخت محنت کرتے ہیں اور تب جا کر ان کے ہاتھ تھوڑی سی روٹی لگتی ہے اور ان کے بچے بھوکے رہتے ہیں، یہ نہیں ہے کہ ہندوستان میں لاکھوں ٹن گیہوں پیدا نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود کسان کے مونہہ تک ایک کھیل کا اُڑکر جانا مشکل ہوتا ہے، وہ موٹے اناج پر گزارہ کرتا ہے، جسے آپ اپنے پالتو پرندوں کو بھی کھلانا پسند نہیں کریں گے۔

کوئی وجہ نہیں ہے کہ اتنے شریف لوگ، اتنی زبردست مصیبت میں مبتلا رہیں، ہم لاکھوں نیم جان انسانوں اور ہندوستان کی انحطاط پذیر عورتوں کے بارہ میں اتنا کچھ سنتے ہیں اور اتنی کچھ باتیں کرتے ہیں لیکن ہماری مدد کرنے کو کوئی نہیں آتا، ان سے کیا کہا جاتا ہے، یہ کہ "جو تم ہو، وہ نہ رہو، تو تمہاری مدد کی جا سکتی ہے تمہاری حالت بہتر ہو سکتی ہے، ہندوؤں کی مدد کرنا فضول ہے" یہ لوگ قوموں کی تاریخ نہیں جانتے، اگر یہ اپنا دھرم بدل دیں تو پھر سرے سے ہندوستان کا وجود ہی باقی نہیں رہے گا، اس لئے کہ یہ دھرم ہی ان کی قومی بنیاد ہے، اگر یہ بنیاد ہی غائب ہو جائے تو پھر بے شک کوئی بھی نہیں رہے گا جسے آپ کی مدد کی احتیاج ہو،

مزید براں ایک اور بات بھی سمجھنے کی ہے اور وہ یہ کہ آپ سچ مچ کوئی مدد کر نہیں سکتے، ہم ایک دوسرے کے لئے کیا کر سکتے ہیں؟ آپ اپنی زندگی میں نشو و نما پا رہے ہیں

"میں اپنی زندگی میں بڑھ رہا ہوں، یہ ممکن ہے کہ میں آپ کی زندگی کو دھکا مار کر آگے بڑھا دوں، یہ سمجھتے ہوئے کہ انجام کار سب ہی راستے "ادھر" کو جاتے ہیں، یہ بتدریج ارتقا رہے، کوئی بھی قومی تمدن ابھی تک مکمل و کامل نہیں ہوا ہے، ایک تمدن کو دھکا دے کر آگے بڑھائیے تو وہ اپنی منزلِ مقصود کو پہونچ جائے گا لیکن اسے بدلنے کے لئے توڑیئے نہیں، اگر ایک قوم سے اس کا دھرم، اس کے رواج و رسوم چھین لئے جائیں تو پھر اس کے پاس باقی کیا بچے گا؟ یہی چیزیں تو ایک قوم کی تشکیل کرتی ہیں،

لیکن یہاں ایک بہت ہی فاضل بدیشی شخص آتا ہے اور کہتا ہے کہ اپنے تمام نظام، تمام رواج، تمام رسوم ترک کر دو، جو ہزاروں برس سے چلے آ رہے ہیں اور ان کی جگہ میں بے ہودگیوں سے بھرا ہوا جو ساغر دے رہا ہوں اسے لو اور اسے چڑھا کر مدہوش ہو جاؤ، مسرور اور خوش ہو جاؤ، یہ سب احمقانہ باتیں ہیں؛

ہمیں ایک دوسرے کی مدد کرنی ہوگی، لیکن ہم کو مزید ایک قدم آگے جانا ہوگا، پہلی چیز یہ ہے کہ ہماری مدد میں کوئی غرض شامل نہ ہو، ہم جو مدد کریں وہ بے غرض اور بے لوث ہو، جیسا کہ میں کہہ رہا ہوں اگر آپ ویسا ہی کرنا چاہیں گے تو میں آپ کی مدد کروں گا ورنہ نہیں — کیا اس کا نام "مدد" ہے۔

اسی طرح اگر ہندو آپ کی روحانی مدد کرنا چاہتے ہیں تو کسی شرط اور کسی حد کی کوئی گنجائش نہیں، وہ مدد خالص بے لوث اور بے غرض ہوگی، میں نے مدد دی اور بات ختم ہوگئی اس کے بعد مجھے آپ سے کچھ لینا نہیں، اپنے خیالات، اپنی شکتی، الغرض جو کچھ بھی میں نے آپ کو دیا ہے، وہ دیدیا ہے، وہ میرے پاس سے جا چکا ہے، میں نے یہ چیزیں دینے کے خیال سے دی ہیں، اور اس سے زیادہ میری کوئی غرض نہیں، میں نے بارہا دیکھا ہے کہ لوگوں نے نصف دنیا کو لوٹ لیا ہے اور انہوں نے بیس ہزار ڈالر دیئے ہیں تاکہ پسماندہ لوگوں کا دھرم تبدیل کرایا جائے، لیکن کیا یہ رقم پسماندہ لوگوں کی بھلائی کے لئے دی گئی یا خود اپنی آتما کی شانتی کے لئے؟ ذرا اس بارہ میں سوچئے تو!

مزید براں جذبۂ جرم و خطا بھی کارفرما ہے، ہم لوگ اپنی آنکھیں بند رکھنے کی کوشش

کرتے ہیں لیکن ہمارے دلوں کے اندر وہ رہا کرتا ہے جو حقیقی ذات ہے، وہ کبھی فراموش نہیں کرتا، ہم کبھی اُسے نیچا نہیں دکھا سکتے، اُس کی پلک کبھی جھپکتی نہیں، جب بھی حقیقی دان کا کوئی جذبہ پیدا ہوتا ہے تو وہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ہماری رہنمائی کرتا رہتا ہے لیکن ایسا کوئی جذبہ جو غرض میں آلودہ ہو چکا ہے روزانہ اخبارات اس کی کتنی ہی اشاعت کیوں نہ کریں وہ عوام کے معیار کو بلند نہیں کرتا خواہ وہ اس کی بنا پر کتنے ہی خوش کیوں نہ ہوں اور خواہ وہ اُس کی کتنی ہی حمایت کیوں نہ کریں۔

میں اس پر فخر نہیں کر رہا ہوں، لیکن میں نے آپ کو یاد ہے کہ لڑکوں کے ایک گروپ کی کہانی بیان کی، آج ہندوستان میں کوئی گاؤں نہیں ہے، کوئی مرد نہیں ہے کوئی عورت نہیں ہے جو ان کے کام سے واقف نہ ہو اور ان کے لئے اپنے من میں شبھ کامنائیں نہ رکھتا ہو، جب بھی کہیں کوئی قحط پڑتا ہے یہ لڑکے اُس میں کود پڑتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس مصیبت سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں، یہ بات عوام کے دلوں پر اثر کرتی ہے، لوگ اس سے واقف ہو جاتے ہیں، پس آپ بھی جب چاہیں مدد کر سکتے ہیں لیکن یاد رکھئے کہ آپ کی نیت اور آپ کا ارادہ بے لوث ہو، بے غرض ہو، اگر آپ کی نیت اور ارادہ بے لوث نہیں ہے تو آپ کی امداد دوسروں کے لئے منفعت بخش و مفید ثابت نہیں ہو گی اگر امداد بے لوث ہے تو یقین رکھئے کہ آپ بے پناہ محبت اور دعائیں پائیں گے، ایشور کی آنکھ سب کچھ دیکھتی ہے اور کبھی چشم پوشی نہیں کرتی، کرم کے قانون کی آنکھ بھی ہر وقت کھلی رہتی ہے وہ بھی کبھی چشم پوشی نہیں کرتی۔

بہرحال میرا منصوبہ یہ ہے کہ ہندوستان کے ان غریب عوام تک پہونچا جائے، فرض کیجئے کہ آپ ہندوستان کے طول و عرض میں اسکول کھول رہے ہیں لیکن آپ اس کے بعد بھی ہندوستانی عوام کو تعلیم نہیں دے سکتے، آپ کیسے تعلیم دے سکتے ہیں؟ چار برس کا لڑکا تک آپ کے اسکول میں آنے کے بجائے کسی کھیت میں کام کرنے کے لئے مجبور ہے اس کے لئے کام کرنا، تعلیم حاصل کرنے کی بہ نسبت زیادہ ضروری ہے، وہ آپ کے اسکول نہیں جا سکتا، یہ ناممکن ہے، کہاوت ہے "جان ہے تو جہان ہے"، جان کا تحفظ آدمی کا پہلا جذبہ ہوتا ہے، لیکن آدمی اگر کنوئیں تک نہیں آسکتا تو خود کنوئیں کو آدمی تک جانا چاہیئے، ہمیں انہیں تعلیم دینے کے لئے دروازہ دروازہ

اور گھر گھر جانا چاہیئے، مثلاً ایک کسان کا لڑکا پڑھنے کو نہیں آسکتا تو کیوں نہ اس کے کھیت اور اس کی فیکٹری میں جایا جائے یا جہاں بھی وہ ملے وہاں اس سے ملا جائے اور اس کے ساتھ اس کا سایہ بن کر اُسے تعلیم دی جائے، سیکڑوں اور ہزاروں سنیاسی ہیں جو رُوحانیت کی سطح پر لوگوں کو تعلیم دینے کے کام میں لگے ہوئے ہیں، ان لوگوں کو کیوں دنیوی سطح پر بھی تعلیم دینے کا کام نہ کرنا چاہیئے؟ کیوں انہیں عام لوگوں کو تھوڑی سی نہ پڑھانی چاہیئے، — دُوسری چیزوں کی تعلیم نہ دینی چاہیئے، عوام کے کان بہترین طالب علم ہوا کرتے ہیں، زندگی کے بہترین اُصول ہم نے صرف کانوں سے سُن کر حاصل کئے ہیں، یہ اصول ہماری مائیں بہنیں سناتی رہی ہیں، کتابیں تو بہت بعد میں آئی ہیں، کانوں کے ذریعہ ہی ہم بہترین اُصولوں اور زندگی کی بہترین قدروں کی تعلیم حاصل کرتے ہیں، اور وہ لوگ جو مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں انہیں چاہیئے کہ وہ اس کے بعد ہی کتابوں اور تاریخ پر ہاتھ اُٹھائیں۔ سب سے پہلے ہمیں تعلیم دینے کا کام اس طرح کرنا چاہیئے۔ یہ میرا منصوبہ ہے۔

بہرحال مجھے آپ سے یہ بھی کہہ دینا چاہیئے کہ میں رہبانیت اور خانقاہی کے نظاموں کا بہت زیادہ معتقد نہیں ہوں، اس نظام میں جہاں بڑے اوصاف ہیں وہاں بڑے نقائص بھی ہیں، گھرگرہستیوں، اور تارکینِ دنیا کے درمیان قطعی طور پر ایک توازن قائم رہنا چاہیئے لیکن رہبانیت نے ہندوستان میں ساری شکتی کو جذب کرلیا ہے، ہم عظیم تر شکتی کا اظہار کرتے ہیں، سنیاسی کو شہزادوں پر برتری حاصل ہے، ہندوستان کے کسی راجہ میں یہ ہمت نہیں ہے کہ وہ کسی سنیاسی کے رُوبرُو بیٹھ جائے اور اُسے دیکھ کر کھڑا نہ ہو، وہ سنیاسی کو دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اُسے بیٹھنے کی جگہ دیتا ہے، اچھے سے اچھے اور نیک سے نیک لوگوں کے ہاتھ میں بھی اس قدر شکتی کا ہونا کوئی اچھی بات نہیں ہے، یہ بُری بات ہے، بیشک سنیاسی عوام کے پاسبان ہوتے ہیں، وہ براہمنیت اور علوم کے مابین کھڑے ہوتے ہیں، وہ ہدایت و اصلاح کا ایک مرکز ہوتے ہیں، ان کی حیثیت وہی ہوتی ہے جو یہودیوں میں انبیاء کی ہوتی ہے، انبیاء ہمیشہ توہم پرستی کی مخالفت کرتے رہے ہیں، اُنہوں نے سدا جو تعلیم دی ہے وہ پجاریت کے خلاف گئی ہے، ہندوستان میں سنیاسی یہی فریضہ انجام دیتے ہیں، لیکن اس کے باوجود اتنی زیادہ شکتی کا سنیاسیوں کے ہاتھ میں ہونا بھی ٹھیک نہیں ہے، لیکن آپ

تب ہی کوئی کام کر سکتے ہیں جب آپ کے کام میں دباؤ کا کوئی عنصر نہ ہو، پوری قوم کی زندگی رہبانیت کے نظام پر منحصر ہو گئی ہے، آپ ہندوستان میں جائیں اور دُنیا دار کی حیثیت میں کسی دھرم کا پرچار کرنا شروع کریں تو ہندو عوام پیٹھ موڑ کر چلے جائیں گے، آپ کی ایک بات بھی نہیں سُنیں گے، اگر آپ نے ترکِ دُنیا کر دیا ہے تو پھر وہ کہیں گے کہ وہ کتنا اچھا آدمی ہے اس نے دُنیا کو چھوڑ دیا ہے اور سنیاس لے لیا ہے، وہ بے حد مخلص اور سچّا آدمی ہے اور جن باتوں کی وہ ہمیں تعلیم دیتا ہے خود بھی اُن ہی پر عمل کرتا ہے، میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ رہبانیت کو زبردست شکتی حاصل ہے، ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ہم سنیاسیوں کے نظام میں مناسب اصلاح کریں، اُس کی شکل بدل کر اُسے دُوسری شکل دیں، ہندوستان میں سدا سفر کی حالت میں رہنے والے سنیاسیوں کی زندگی کی رُوپ دھارا بدلنی چاہیئے اور یہ بدلی ہُوئی رُوپ دھارا عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کر سکتی ہے۔

بہرحال ہم نے اپنے منصوبہ کا نقشہ بہت اچھی طرح کاغذ پر اتار لیا ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ میں نے نظریہ پر عمل کر کے بھی دیکھا اور عمل کے دوران میں جو نقص نظر آئے انہیں دُور کیا گیا۔

مادی سطح پر اس منصوبہ کو بروئے کار لانے میں مجھ پر کیا بات منکشف ہوئی، پہلی بات جو مجھے محسُوس ہوئی یہ ہے کہ ان سنیاسیوں کے مرکز ہونا چاہیئں جن میں ان کو طریق تعلیم بتایا جائے، مثال کے طور پر میں نے اپنے آدمیوں میں سے ایک آدمی کو کیمرہ دے کر بھیج دیا ہے وہ خود ان چیزوں کی تعلیم دیتا ہے، ہندوستان میں آپ جانتے ہیں کہ ہر شخص جاہل و بے خبر ہے اور تعلیمی مرکزوں کی انتہائی ضرُورت ہے اور اس کے لئے رُوپیہ درکار ہے، آپ کو اپنا آدرش اُس کی عملی صُورت میں پیش کرنا ہے، لیکن یہ کس طرح کیا جائے؟ میں نے چار برس تک آپکے ملک میں اور دو برس تک انگلستان میں رہ کر زبردست جدّوجہد کی ہے، زبردست محنت کی ہے اور میں ان دوستوں کا بے حد شکر گذار ہوں جنہوں نے میرے کاموں میں میری مدد کی، یہاں ان میں سے ایک دوست آپکے سامنے موجود ہیں، امریکن دوست ہیں، انگریز دوست ہیں، جو میرے ساتھ ہندوستان گئے اور اُنہوں نے بہت ہی مشکل کام کا آغاز کیا، کچھ انگریز لوگ آئے اور وہ ہمارے مسلکوں میں شامل ہوئے ایک نے تو بے حد مشقّت کی اور ہندوستان

ہی میں اس نے داعی اجل کو لبیک کہا، ایک انگریز مرد اور ایک انگریز خاتون نے جس کے پاس آمدنی کے اپنے کچھ تسلی بخش ذرائع ہیں ایک مرکز کا آغاز کیا ہے جس میں وہ بچوں کو تعلیم دیتے ہیں، میں نے جو اخبارات شروع کئے ہیں اُن میں سے ایک انہیں دے دیا ہے، دی اویکنڈ انڈیا ( THE AWAKENED INDIA ) اس کی ایک کاپی یہاں میز پر بھی موجود ہے آپ اُسے دیکھ سکتے ہیں، یہ لوگ عوام کو ہدایت کیا کرتے ہیں اور ان کی صفوں میں کام کر رہے ہیں میرا ایک اور مرکز کلکتہ میں ہے، بے شک یہ سب بڑی تحریکیں مرکز سے چلنی چاہئیں، لیکن ہمارے پاس مرکز کیا ہے؟ ہمارا مرکز ہے ایک قوم کا دِل! سارا خون دل میں آتا ہے اور دل اُسے تقسیم کرتا ہے جسم کے دُوسرے حصّوں میں! لہٰذا تمام دولت، تمام نظریات و خیالات، تمام تعلیم تمام رُوحانیت مرکز کی طرف آئے گی، خود بخود آئے گی اور پھر مرکز سے وہ پھیلے گی؛

مجھے آپ سے یہ کہتے ہوئے مسرّت ہو رہی ہے کہ میں نے ابتدا کر دی ہے، لیکن یہی کام میں مساوی طور پر عورتوں کے لئے بھی چاہتا ہوں اور میرا اصول یہ ہے کہ ہر شخص اپنی مدد آپ کرتا ہے، میری مدد کے درمیان تو فاصلے حائل ہیں، ہندوستانی عورتیں ہیں، انگریز عورتیں ہیں اور مجھے امریکن عورتوں سے بھی یہ توقع ہے کہ وہ آئیں گی اور اس کام کو اپنا لیں گی، جیسے ہی وہ یہ ذمہ داری قبول کریں گی بس میں مطمئن ہو کر بیٹھ جاؤں گا نہ مرد کی محکوم عورت ہے، نہ عورت کا محکوم مرد ہے، ہر شخص آزاد ہے، اگر کوئی بندش ہے اگر کوئی رشتہ ہے تو بس وہ محبت کا رشتہ ہے، عورتیں اپنی منزلیں آپ متعین کریں گی، اور مرد اُن کے لئے جو منزل متعین کر سکتے ہیں وہ اس منزل سے بہتر منزل متعین کر لیں گی سارے فتنے اس وجہ سے اُٹھتے ہیں کہ مرد عورتوں کے لئے اُن کی زندگی کا رُخ متعین کرنے کی ذِمّہ داری لے لیتا ہے، میں یہ بُنیادی غلطی کر کے کوئی کام کرنا نہیں چاہتا چھوٹی سی غلطی ہوتی ہے لیکن وہ بڑھتی ہی جاتی ہے اور ایک وقت آتا ہے جب اُس کی اصلاح بہت مشکل ہو جایا کرتی ہے، اگر میں نے بھی یہ غلطی کی کہ جو کام عورتوں کا ہے اس کام پر مردوں کو لگا دیا تو عورتیں پھر اس سے چھٹکارا نہ پائیں گی اور وہ ایک رواج بن کر رہ جائے گا، لیکن ایک زرین موقع میرے ہاتھ لگا ہے، میں نے آپ سے اس خاتون اور دیوی کا تذکرہ کیا ہے جو میرے پیر و مرشد گورو دیو کی دھرم پتنی ہیں،

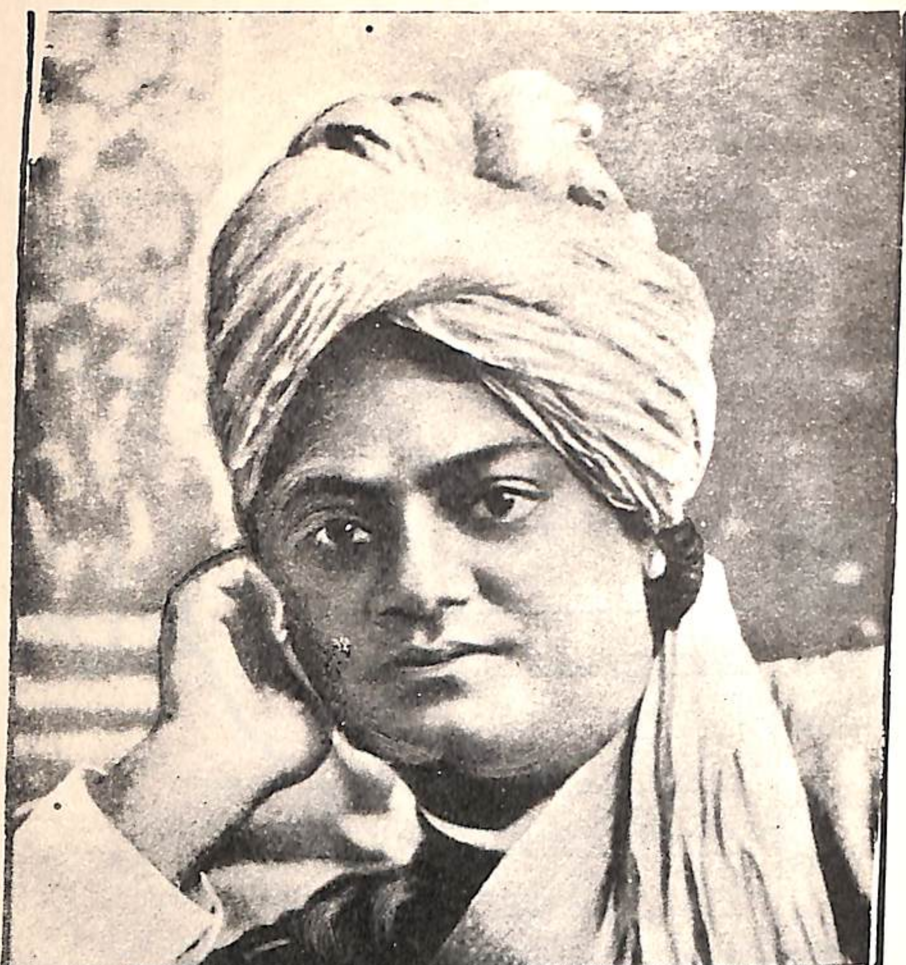
---

ہم سب ان کا بے پناہ احترام کرتے ہیں، وہ ہمیں کبھی کوئی حکم نہیں دیا کرتیں، لہٰذا کوئی خطرہ نہیں ہے،

کام کا یہ جزو پورا ہونا ہے۔



بہن نویدیتا



# غبارِ خاطر

INSPIRED TALKS

# غبارِ خاطر

صفحہ

# عشقِ الٰہی

(سوامی جی کی ایک چیلی مس ایس۔ ای۔ والڈو MISS S. E. WALDO نے یہ تقریریں نوٹ کیں۔)

(اس روز سوامی جی نے تھاؤزنڈ آئی لینڈ پارک Thousand Island Park. میں اپنے اُپدیش کا باقاعدہ آغاز کیا۔ ہم سب وہاں ایک ساتھ جمع نہیں ہوئے لیکن گوروجی جو کام کرتے تھے، ہمیشہ دِل لگا کر کرتے تھے۔ پس انہوں نے فوراً ہی ان دو تین چیلوں کو جو اُن کے ہمراہ تھے، شکشا دینی شروع کر دی۔ پہلی صبح کو جب وہ آئے تو ان کے ہاتھوں میں بائیبل تھی۔ انہوں نے یوحنا کا باب یہ کہتے ہوئے کھولا کہ چونکہ وہ سب عیسائی ہیں، اس لئے یہ مناسب ہوگا کہ میں عیسائیوں کی مقدس کتاب ہی سے اپنی تعلیم کا آغاز کروں۔)

---

"ابتدا میں نام اور کلام تھا۔ نام ایشور کے ساتھ تھا اور نام ایشور تھا۔" ہندو اسے مایا یعنی ایشور کا ظہور کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ ایشور کی طاقت ہے۔ کائنات میں جسے ہم پراکرتی کہتے ہیں، ایشور کا عکس موجود ہے۔ کلام کے دو مظاہر ہیں، عام مظاہرہ پراکرتی کا ہے اور خاص کر کرشن جی، مہاتما بدھ، حضرت موسےٰ اور شری رام کرشن جیسے عظیم اوتاروں کا جو ایشور تھے۔ حضرت عیسےٰ جو کہ مطلق کا خاص ظہور ہیں، معلوم بھی ہیں اور ممکن ادراک بھی (وہ پہچانے ہوئے ہیں اور انہیں پہچانا جا سکتا ہے) مطلق کا ادراک

نہیں کیا جا سکتا۔ ہم باپ کو نہیں جان سکتے، صرف بیٹے کو جان سکتے ہیں۔ مطلق کو ہم صرف حضرت عیسےٰ اُور انسانیت کی جھلک کے ذریعہ ہی دیکھ سکتے ہیں اور جان سکتے ہیں۔

یُوحنا کی پہلی پانچ آئتوں میں تمام تر مسیحیت کا نچوڑ ہے، ہر ایک آئت کے اندر فلسفہ کی پُوری گہرائی موجود ہے۔

مکمّل، کبھی نامکمّل نہیں ہوسکتا۔ یہ تاریکی میں ہے، لیکن اس پر تاریکی کا کوئی اثر نہیں ہے۔ ایشور کی کرپا سب کے لئے ہے، لیکن گُناہوں کا اُس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اگر ہماری آنکھ میں کوئی خرابی ہے، تو اس سے سورج میں کوئی خرابی پَیدا نہیں ہوتی، ہمیں اس میں خرابی نظر آسکتی ہے۔ ۲۹ ویں آئت میں "دُنیا کے گُناہوں کو دُور لے جاتا ہے" کا مطلب ہے کہ عیسیٰ ہمیں مکمّل بننے کا راستہ دکھائیں گے۔ ہمیں اپنی نیچر دِکھانے کیلئے ایشور عیسیٰ کی شکل میں آیا، یعنی یہ کہ ہم بھی ایشور ہیں۔ ہم ایشور کا اِنسانی رُوپ ہیں۔ لیکن اِنسانی شکل میں ایشور ہونے کے ناطے عیسیٰ اُور ہم ایک ہیں۔

معتقد تثلیث عیسیٰ کو ہم پر سرفرازی حاصل ہے۔ توحید پرست عیسیٰ محض ایک اخلاقی آدمی ہیں۔ دونوں حیثیت میں وہ ہماری اِمداد نہیں کر سکتے۔ وہ عیسیٰ جو کہ ایشور کے اُوتار ہیں اُور جنہوں نے اپنی الوہیت کو فراموش نہیں کیا ہے، وہ عیسیٰ ہماری امداد کر سکتے ہیں۔ اس صورت میں وہ نامکمّل نہیں ہیں۔ اِنسانی شکلوں میں آئے اُن ایشوروں کو خود اپنی الوہیت کا پُورا احساس ہوتا ہے، وہ پَیدائش سے ہی اس سے واقف ہوتے ہیں۔ وہ اُن اَداکاروں کی مانند ہیں جن کی اَداکاری مکمّل ہو چکی ہے لیکن جو اپنا کام مکمّل کرنے کے بعد دُوسروں کو خوشی دینے کے لئے لوٹ آتے ہیں، ان عظیم انسانوں کا دُنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ کُچھ وقت کے لئے ہماری شکلیں اور ہماری صُورتیں اختیار کرتے ہیں تاکہ ہمیں تعلیم دے سکیں۔ لیکن حقیقت میں وہ کبھی محدُود نہیں ہوتے وہ ہمیشہ آزاد رہتے ہیں۔



نیکی سچائی سے قریب ہے لیکن وہ سچائی نہیں ہے، یہ جاننے کے بعد کہ ہمیں بُرائی سے پریشان نہیں ہونا چاہیئے، ہمیں یہ سیکھنا ہے کہ ہمیں اچھائی سے بھی خوش نہیں ہونا چاہیئے۔ ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ ہم اچھائی اور بُرائی دونوں سے بالاتر ہیں۔ ہمیں دونوں کے تناسب کو جاننا چاہئے اور دیکھنا چاہیئے کہ دونوں ضروری ہیں۔ دوئیت کا نظریہ قدیم ایرانیوں[1] سے آیا۔ حقیقت میں نیکی اُور بُرائی دونوں ایک[2] ہیں اور ہمارے دماغوں میں

[1] پارسی جو حضرت زرتشت کے پیرو ہیں جن کی تعلیم تھی کہ تمام کائنات دو بنیادی اصولوں کا نتیجہ ہے۔ ایک آرمزدا اور دُوسرا اہرمن (اچھائی اُور بُرائی کے اصول) ÷

[2] کیونکہ یہ دونوں زنجیریں ہیں، مایا کی زنجیریں ÷

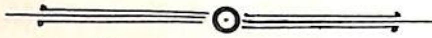
ہیں۔ جب دماغ میں خود ارادیت ہوتی ہے تو نہ بُرائی اثر کر پاتی ہے اور نہ نیکی۔ قطعی طور پر آزاد رہیئے۔ تب ان میں سے کوئی اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتی، اور ہم آزادی اور رُوحانی مسرت کا لُطف اُٹھا سکتے ہیں۔ بُرائی ایک لوہے کی زنجیر ہے اور نیکی سُنہری زنجیر۔ دونوں زنجیریں ہیں۔ آزاد رہیئے اور ہمیشہ کے لئے جان لیجئے کہ آپ کے لئے کوئی زنجیر نہیں ہے۔ لوہے کی زنجیر کی جکڑن کو ڈھیلا کرنے کے لئے سُنہری زنجیر کو مضبوطی سے پکڑیئے اور دونوں کو اُتار پھینکئے۔ بُرائی کا خار دار پودا ہمارے گوشت میں ہے۔ اسی جھاڑی میں سے دُوسرا پودا لیجئے اور پہلے کو ختم کر دیجئے۔ اس کے بعد دونوں کو پھینک دیجئے۔



دُنیا میں ہمیشہ دینے والے کی پوزیشن اختیار کیجئے۔ ہر چیز دے دیجئے لیکن صلہ کی تمنا نہ رکھیئے۔ امداد دیجئے، خدمات انجام دیجئے۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز جو آپ دے سکتے ہیں، دے دیجئے لیکن لین دین کا سودا نہ کیجئے، کوئی شرط نہ لگایئے، کوئی شرط نہیں لگائی جائے گی۔ ہمیں اپنا جو کچھ ہے وہ دے دینا چاہیئے، جس طرح ایشور ہمیں دیتا ہے۔

ایشور ہی صرف ایک دینے والا ہے، باقی تمام دُنیا کے اِنسان دُکاندار ہیں۔ ایشور کا چیک لیجئے یہ ہر کہیں کیش کرایا جا سکتا ہے۔

ایشور نا قابلِ توجیہہ ہے، ناقابلِ بیان ہے۔ وہ پریم کا نچوڑ اور رُوح ہے، وہ ہمیشہ سے ہے، لیکن اس کی تعریف کبھی نہیں ہو سکتی۔



جب ہم پریشان ہوتے ہیں اور مُصیبتیں اُٹھاتے ہیں تو دُنیا ہمیں نہایت خوفناک جگہ محسوس ہوتی ہے لیکن جس طرح کہ ہم دو کتوں کو آپس میں لڑتے ایک دُوسرے کو کاٹتے ہوئے دیکھتے ہیں بالکل اسی طرح ہمیں خود اپنے بارے میں کوئی تشویش نہیں ہوتی۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ محض ایک کھیل ہے اور اس کھیل میں اگر کبھی کبھی تھوڑی بہت تکلیف بھی پہنچے تو اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ پس ہماری تمام جد و جہد اور مصیبتیں ایشور کے نزدیک کھیل ہیں۔ یہ تمام دُنیا ایک کھیل کا میدان ہے۔ ایشور اس کھیل سے خوش ہوتا ہے۔ کسی بات سے ایشور ناراض نہیں ہوتا۔



"ماتا - زندگی کے سمندر میں میری کشتی ڈُوب رہی ہے"۔
اس فریبِ ہستی کے گردِ باد میں تعلق کا طُوفان ہر لمحہ بڑھ رہا ہے۔

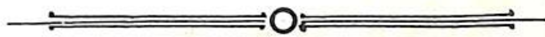
میرے احساسات بے عقل ہیں اور میرا دماغ کمزور ہے۔

مَیں اپنا اثاثہ کھو چکا ہوں اور میری کشتی ڈوبتی جا رہی ہے۔

"او، میری ماتا! مجھے بچا لے"۔

"ماتا۔ تیری روشنی سنت سادھوؤں، سالکوں اور عابدوں اور گناہ گاروں سب کے لئے ہے۔ یہ پریمیوں اور قاتلوں دونوں کے اندر ہے۔ ماتا کا ظہور سب کے اندر موجود ہے۔ جس پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کا روشنی پر کوئی اثر نہیں پڑتا، نہ ہی روشنی کو اس سے کوئی فائدہ پہنچتا ہے۔ روشنی ہمیشہ خالص روشنی رہتی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ہر جاندار کے پیچھے ماتا ہے۔ خالص پیاری اور کبھی نہ تبدیل ہونے والی ماتا۔ ماتا روشنی کی مانند ہر چیز کے اندر موجود ہے۔ ہم ماتا کو پرنام کرتے ہیں! وہ ہماری مصیبتوں میں، بھوک میں، خوشی میں، آرام میں ہمارے ساتھ ہے۔ جب مکھی شہد چوستی ہے ایشور کھاتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ ایشور ہر جگہ موجود ہے۔ عارف تعریف کرنے اور الزامات عائد کرنے سے باز رہتے ہیں۔ جان لیجئے کہ کوئی چیز آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ کس طرح؟ کیا آپ آزاد نہیں ہیں؟ کیا آپ آتما نہیں ہیں؟ ایشور ہماری زندگیوں کی زندگی ہے، ہمارے کانوں کی سماعت ہے، ہماری آنکھوں کی روشنی ہے۔

ہم ایک آدمی کی طرح دنیا میں رہتے ہیں، جس کے پیچھے ایک پولیس مین لگا ہو، اور اس کی خوبصورتی کا نظارہ کرتے ہیں۔ وہ تمام خوف جو ہم محسوس کرتے ہیں، مادہ پر یقین رکھنے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مادہ کا تمام تر وجود اس کے پیچھے موجود روح سے ہے۔ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں، ایشور ہے جو برا کرتی ہیں نظر آتا ہے۔



اتوار - 23 جون

بہادر اور مخلص بنیئے۔ اس کے بعد پوجا کا خواہ کوئی بھی راستہ آپ اختیار کریں، ایشور تک پہنچ جائیں گے۔ ایک بار زنجیر کی پہلی کڑی تھام لیجئے پوری زنجیر ہاتھ میں آجائے گی۔ پانی درخت کی جڑ میں دیا جاتا ہے (یعنی ایشور تک پہنچیے) تمام درخت سیراب ہو جاتا ہے، ایشور مل گیا تو سب کچھ مل گیا۔

ایک طرف ہی دیکھنا دنیا کی خرابی ہے۔ جس قدر زیادہ اطراف آپ دیکھنے لگیں گے، اُسی قدر زیادہ روحیں آپ کو ملیں گی اور آپ اسی قدر ان روحوں، بھگتوں اور فلاسفروں کے ذریعہ دنیا کو زیادہ دیکھ سکیں گے۔ خود اپنی فطرت کا تعین کیجئے اور اُس پر جمے رہیئے۔ مبتدیوں کے لئے نشتھا ہی ایک

طریقہ ہے لیکن بھگتی اور اخلاص سے سب کچھ مل جاتا ہے۔ چرچ اصول شکلیں یہ سب ایک چھوٹے پودے کی حفاظت کے لئے حصاروں کا کام دیتے ہیں لیکن جب پودا درخت بن جاتا ہے تو یہ سب ٹوٹ جاتے ہیں پس مختلف مذاہب بائیبل، وید اور تمام دوسری مذہبی کتابیں چھوٹے پودے کے لئے گملے کی طرح ہیں۔ یہ پودا گملے کے باہر آنا چاہیئے۔ ایک طرح سے نستھا کا مطلب پودے کو گملے میں رکھنا اور جدوجہد کرتی ہوئی روح کو اس کا راستہ دکھانا ہے۔

---

بحرِ بیکراں کو دیکھئے، لہروں کو نہیں۔ چیونٹی اور عقاب میں کوئی فرق نہ دیکھئے۔ ہر ایک حقیر آدمی نصرانی کا بھائی ہے، کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ایک بڑا ہے اور دوسرا حقیر ہے۔ ہر ایک خود اپنی جگہ پر بڑا ہے۔ ہم سب کو سورج اور تاروں کی روشنی یکساں ملتی ہے۔ روح کے لئے وقت اور جگہ کا کوئی تعین نہیں، وہ ہر جگہ ہے۔ ہر وہ منہ جس سے ایشور کی تعریف نکلتی ہے میرا منہ ہے اور ہر آنکھ جو اسے دیکھتی ہے میری آنکھ ہے۔ ہم کسی جگہ محدود نہیں ہیں، ہماری کوئی ہستی نہیں، کائنات ہمارا جسم ہے، ہم جادوگر ہیں۔ جو جادوئی چھڑی کو اِدھر اُدھر گھما رہے ہیں اور اپنی مرضی سے اپنے سامنے تماشہ کر رہے ہیں۔ ہم ایک ایسی مکڑی کی مانند ہیں جو اپنے بڑے جالے کے اندر ہو اور جو جالے کے تاروں پر چل کر اپنی مرضی کے مطابق جہاں چاہے جا سکتی ہے۔ اس وقت مکڑی کو صرف اس جگہ کا علم ہے جہاں وہ ہے، لیکن وہ ہر وقت تمام جالے سے واقف ہو سکتی ہے۔ ہم اس وقت صرف اس بات سے آگاہ ہیں کہ ہمارا جسم کہاں ہے۔ ہم صرف ایک دماغ کو استعمال کر سکتے ہیں لیکن جب ہمیں زیادہ آگاہی ہو جائے گی، ہم سب کچھ جان جائیں گے اور ہم تمام دماغوں کو استعمال کر سکیں گے۔ یہاں تک کہ ہم اب بھی اپنے ضمیر کی بیداری کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔ یہ بیداری ماورا ہے اور اعلٰے ترین بیداری میں متحرک ہے۔

ہم "ہونے" کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ "مَیں" کوئی چیز نہیں۔ یہاں تک ــــــ بالکل خالص بلور ہر چیز کو منعکس کرتا ہے لیکن ہمیشہ بلور رہتا ہے۔ جب ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ پھر کچھ کرنے کے لئے باقی نہیں رہتا۔ جسم محض کشتی بن جاتا ہے۔ اس کی پروا کیئے بغیر اسے پاکیزہ بنانے رہیئے، یہ کھوٹا نہیں بن سکتا۔

سمجھ لیجئے آپ لامحدود ہیں، پھر اس کے بعد ہر خوف مٹ جائے گا۔ ہمیشہ یہ بات کہیئے "مَیں اور میرا باپ ایک ہے۔"

---

آنے والے زمانوں میں بہت سے عیسیٰ آئیں گے۔ جس طرح انگور کی بیل پر خوشے لگتے ہیں۔ پھر کھیل ختم ہو جائے گا اور گزر جائے گا۔ جیسے کیتلی میں جب پانی اُبلتا ہے تو پہلے ایک بُلبلہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے بُلبلے پیدا ہوتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ تمام پانی اُبلنا شروع ہو جاتا ہے اور بھاپ کی طرح اُڑ جاتا ہے۔ بُدھ اور عیسیٰ دو بڑے بُلبلے ہیں، جو دُنیا نے پیدا کئے۔ موسیٰ ایک چھوٹے بُلبلے کی مانند ہیں، ان کے بعد بڑے سے بڑا بُلبلہ پیدا ہوا۔ لیکن کسی وقت یہ تمام دُنیا بُلبُلا ہو جائے گی اور ختم ہو جائے گی لیکن تخلیق ہمیشہ نئی رہے گی۔ کیتلی میں نیا پانی آتا رہے گا اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا۔

---

سوموار 24 رجون

آج کا اُپدیش نارد کی کتاب بھگتی سوتر سے شروع ہوا)

ایشور سے انتہائی پریم کرنے کا نام بھگتی ہے۔ یہ پریم حقیقت میں لافانی ہوتا ہے۔ اسے حاصل کرنے کے بعد آدمی مکمل طور پر مطمئن ہو جاتا ہے، اسے نقصان کا غم نہیں ہوتا، وہ کبھی حاسد نہیں ہوتا۔ جس کا گیان حاصل کرنے کے بعد آدمی پاگل سا بن جاتا ہے۔

میرے گورو دیو کہا کرتے تھے: "یہ دُنیا ایک بہت بڑی مجنونانہ جائے پناہ ہے۔ جہاں تمام آدمی پاگل ہیں۔ کوئی روپیہ کے لئے پاگل ہے، کوئی عورت کے لئے تو کوئی نام و نمود کے لئے اور چند ایسے ہیں جو ایشور کے دیوانے ہیں۔ مَیں ایشور کے لئے دیوانہ بننا پسند کروں گا۔ ایشور پارس ہے جو ہمیں ایک لمحہ کے اندر سونے میں تبدیل کر دیتا ہے۔ شکل باقی رہتی ہے لیکن فطرت بدل جاتی ہے۔ اِنسانی شکل باقی رہتی ہے لیکن ایک نگاہ اور ایک لمس کافی ہے۔"

"ایشور کے بارے میں سوچتے ہوئے کچھ لوگ روتے ہیں، کچھ گاتے ہیں، کچھ ہنستے ہیں، کچھ ناچتے ہیں اور کچھ عجیب و غریب قسم کی باتیں کرتے ہیں لیکن سب ایشور کے علاوہ وہ کسی اور کے بارے میں نہیں سوچتے۔"

پیغمبر پیغام پہنچاتے ہیں لیکن آدمی کے جسم میں ایشور جیسے کہ عیسیٰ، بودھ، رام، کرشن ہیں، مذہب دے سکتے ہیں۔ ہم نہ گناہ کر سکتے ہیں نہ کسی کو تکلیف پہنچا سکتے ہیں۔ ہاتھ رکھ کر تصدیق کرنا۔ یہ رُوح القدس کی طاقت ہے۔ گورو نے یہ طاقت حقیقت میں اپنے چیلوں کو منتقل کی ہے۔ "گورو شکتی کا سلسلہ" یہ حقیقی بپتسمہ[1] نام دینے کا طریقہ ہے۔ جو بے حساب زمانوں سے چلتا آ رہا ہے۔

" بھگتی کو کسی خواہش کے پورا کرنے کی غرض سے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ بھگتی سے خود تمام

---

[1] نام دینے کا طریقہ

خواہشات کی روک تھام کرنی ہے۔" نارد ان کو پریم کی علامتیں کہتا ہے۔"جب تمام خیالات، تمام الفاظ اور تمام کام ایشور کے لئے وقف کر دیئے جاتے ہیں اور جب ایشور کی یاد میں معمولی سی بھول بھی انتہائی تکلیف دہ بن جاتی ہے تو سمجھئے پریم جاگ اُٹھا ہے۔

"پریم کی یہ ایک انتہائی اعلیٰ قسم ہوتی ہے۔کیونکہ اس کے اندر صلہ کی کوئی خواہش نہیں ہوتی، جبکہ انسانی پریم میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ بدلا ملے۔"

" ایک شخص جو کہ تمام اخلاقی اور روحانی منزلوں سے گزر جاتا ہے سنیاسی کہلاتا ہے۔جب تمام رُوح ایشور میں مل جاتی ہے، جب ایشور کے اندر پناہ لے لیتے ہیں، تب ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہم کو یہ پریم حاصل ہوتا جا رہا ہے۔"

جب تک آپ کے اندر کافی طاقت نہ آجائے، مذہبی کتابوں کو مانتے رہیئے۔جب ان کے بغیر بھی کام چلانے لگ جائیں تو کتابوں سے آگے جائیے۔کتابیں ہی حرف آخر نہیں ہیں۔تصدیق ہی مذہبی سچائی کا واحد ثبوت ہے، ہر ایک کو اپنی تصدیق خود کرنی چاہیئے، کوئی بھی معلم ایسا نہیں گزرا ہے، جس نے کہا ہو کہ مَیں نے دیکھا ہے لیکن تم نہیں دیکھ سکتے۔" صرف اسی پر ایمان لانا چاہیئے جو کہتا ہو" تم بھی دیکھ سکتے ہو"۔تمام مذہبی کتابیں، تمام سچائیاں ہر زمانہ میں اور تمام دیشوں کے اندر دیکھ رہی تھیں۔کیونکہ ان سچائیوں کو دیکھا جا سکتا ہے اور ہر ایک ان کا انکشاف کر سکتا ہے۔

جب پریم کا سُورج اُفق پر اُگنا شروع ہوتا ہے ہم اپنے تمام کاموں کو ایشور کے لئے وقف کر دینا چاہتے ہیں اور جب ہم ایک لمحہ کے لئے بھی اسے بھول جاتے ہیں تو ہمیں تکلیف ہوتی ہے۔"

ایشور اور ایشور کے لئے آپ کے پریم کے درمیان کوئی رُکاوٹ باقی نہیں رہنی چاہیئے اُس سے پریم کیجئے، اُسی سے پریم کیجئے، اسی کے ساتھ پریم کیجئے، اور دنیا جو کچھ کہتی ہے وہ اس کو کہنے دیجئے۔

پریم تین قسم کا ہوتا ہے۔ایک پریم مانگ کرتا ہے لیکن خود کچھ نہیں دیتا، دُوسرا پریم لین دین کا ہوتا ہے۔پریم کی تیسری قسم وہ ہے جو بدلے میں کچھ نہیں چاہتا۔وہ پریم روشنی کے لئے پروانہ جیسا پریم ہوتا ہے۔

" پریم، عبادت، یوگ اور گیان سے اعلیٰ ترین شے ہے۔"

عبادت کی حیثیت محض عبادت کرنے والے کیلئے اسکول کے کام جیسی ہے۔اس سے دُوسروں کو کوئی نفع نہیں پہنچایا جا سکتا۔ہمیں خود اپنی مشکلات کو حل کرنا ہوگا پیغمبر ہمیں بتا سکتے ہیں کہ یہ مشکل کیسے حل ہو سکتی ہے۔جیسا سوچو گے ویسا بن جاؤ گے؟ پس اگر آپ عیسےٰ پر اپنا بوجھ ڈالیں۔تو آپ کو عیسےٰ کے بارے میں تصور کرنا ہوگا۔اس طرح آپ عیسےٰ بن جاتے ہیں اور ان سے پریم کرتے ہیں۔

"انتہائی بھگتی اور اعلےٰ ترین گیان دونوں ایک ہیں۔"

لیکن ایشور کے بارے میں نظریات سے کام نہیں چلتا۔ہمیں پریم کرنا چاہیئے اور عبادت کرنی چاہیئے۔ دنیا اور دنیا کے تمام لوازمات کو ترک کر دیجئے۔خاص طور پر اُس وقت جب "پودا" چھوٹا ہو۔ دن رات ایشور کا گیان کیجئے۔جہاں تک ممکن ہو کسی اور چیز کا دھیان نہ کیجئے۔روزمرہ کے تمام خیالات کو ایشور کے ذریعہ سوچا جا سکتا ہے۔کھایئے تو اس کیلئے کھایئے، پیجئے تو اس کیلئے پیجئے، سویئے تو اس کیلئے سویئے۔ہر چیز میں اسی کو دیکھئے۔دوسروں سے صرف ایشور کی باتیں کرنا بہت مفید ہے۔

ایشور اور اس کے عظیم ترین بچوں کی رحمت حاصل کیجئے، ایشور تک پہنچنے کے یہ دو راستے ہیں۔ روشنی کے ان بچوں کا ساتھ حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ان کے ساتھ پانچ منٹ تمام زندگی کو تبدیل کر دیں گے اور اگر آپ حقیقت میں اسکو زیادہ چاہتے ہیں تو کوئی آپ کے پاس آجائیگا۔جو ایشور سے پیار اور پریم کرتے ہیں۔ان کی موجودگی اُس جگہ کو مقدس بناتی ہے۔"یہ شان ہوتی ہے ایشور کے بچوں کی"۔ وہ ایشور ہوتے ہیں اور جب وہ بولتے ہیں تو ان کے الفاظ الہامی ہوتے ہیں۔وہ جگہ جہاں وہ ایشور کا گیان حاصل کر لیتے ہیں، مقدس بن جاتی ہے اور جو لوگ وہاں جاتے ہیں اُن کے اندر بھی جذبۂ تقدیس پیدا ہو جاتا ہے۔

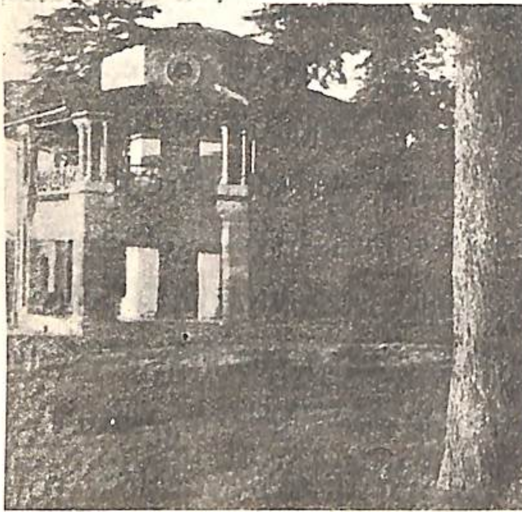
ایسے پریمیوں کے لئے ذات پات، علم، خوبصورتی، پیدائش، دولت اور پیشہ کا کوئی امتیاز نہیں رہتا کیونکہ وہ اُس کے ہوتے ہیں۔

خاص طور پر شروعات میں تمام برائیوں کو ترک کر دیجئے، دنیا داری سے بچیئے۔اس سے آپ کے ذہن کو جلا ملے گی۔"میں اور میرا" کے تمام خیالات ترک کر دیجئے۔جس کے پاس کائنات میں کچھ نہیں ہوتا اس کو ایشور مل جاتا ہے۔دنیاوی تعلقات کے تمام بندھنوں کو کاٹ دیجئے، ہستی کو ختم کیجئے اور اس بات کی تمام احتیاط کو چھوڑ دیجئے کہ آپ کیا بن رہے ہیں۔آپ جو کچھ کرینگے اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔یہ دیکھنے کے لئے مُڑ کر نہ دیکھیئے، سب کچھ ایشور کے سپرد کر دیجئے۔ایسا کرتے رہیئے اور کچھ خیال نہ کیجئے۔تمام روح کا سلسلہ ایشور کے ساتھ ملتا ہے۔روپیہ حاصل کرکے نام اور شہرت حاصل کرنے کا وقت نہیں ہے ایشور کے سوا کسی بھی چیز کے بارے میں سوچنے کا وقت نہیں ہے۔تبھی ہمارے دل میں نامحدود اور حیرت انگیز پریم کی بھاؤنا جاگے گی۔تمام خواہشات کی حیثیت بلور کے ٹکڑوں جیسی ہوتی ہے۔ایشور کا پریم ہر لمحہ بڑھتا ہے اور ہمیشہ نیا رہتا ہے، اس کا احساس کرنے ہی سے اس کا پتہ چلتا ہے۔پریم سب سے آسان ہے۔اس کو منطق کی ضرورت نہیں ہے، اس کی حیثیت فطری ہے۔ہمیں کسی مظاہرہ اور کسی ثبوت کی ضرورت نہیں پڑتی۔

دلائل سے ہم اپنے دماغوں کے ذریعہ ایک شئے کو محدود کرتے ہیں۔ ہم ایک جال پھینکتے ہیں اور کسی چیز کو پکڑ لیتے ہیں اور تب کہتے ہیں کہ ہم نے اس کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن ہم ایشور کو جال میں بھی ہرگز نہیں پکڑ سکتے۔

پریم کے ساتھ کوئی شرط نہیں ہونی چاہیئے۔ یہاں تک کہ اگر ہم غلط پریم بھی کریں تو یہ حقیقی پریم ہوتا ہے۔ طاقت ایک ہی ہوتی ہے۔ ہم جس طرح چاہیں، استعمال کر سکتے ہیں۔ شانتی اور روحانی مسرت ہی اس کی فطرت ہے۔ ایک قاتل جب اپنے بچّے کو پیار کرتا ہے تو اُسی وقت وہ تمام باتوں کو بھول جاتا ہے۔ صرف پیار کرتا ہے۔ تمام خودی اور خودداری کو ترک کر دیجئے، تمام غصّہ اور ہوس کو ترک کر دیجئے، ہر چیز ایشور کے سپرد کر دیجئے۔ "مَیں کچھ نہیں ہُوں لیکن تُو ہے"۔ ہر چیز تو فنا ہے لیکن تُو باقی رہتا ہے۔ مَیں تو ہُوں" کسی کو الزام نہ دیجئے۔ اگر مُشکلیں آتی ہیں تو سمجھ لیجئے، ایشور آپ کا امتحان لے رہا ہے اور زیادہ خوش رہیئے!

پریم وقت اور جگہ سے ماورا ہے۔ یہ کُل ہے۔



اجادت گارڈن ہاؤس الموڑہ، جہاں سوامی جی ۱۸۹۰ء میں ٹھہرے تھے

# تجزیہ نفس

منگل 25-جون

ہر ایک خوشی کے بعد غم آتا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ قریب ہو یا دُور۔ رُوح جس قدر زیادہ ترقی یافتہ ہوتی ہے اُسی قدر تیزی کے ساتھ یہ ایک دُوسرے کے بعد آتے ہیں۔ ہمیں نہ خوشی درکار ہے اور نہ تکلیف دونوں کی وجہ سے ہم اپنی اصل فطرت کو بھول جاتے ہیں۔ دونوں زنجیریں ہیں، ایک لوہے کی دُوسری سونے کی، دونوں کے پیچھے آتما آتی ہے جو نہ خوشی کو جانتی ہے اور نہ تکلیف کو، یہ کیفیات ہیں اور کیفیت تبدیل ہوتی ہی چاہیئے لیکن رُوح کی فطرت رُوحانی مسرّت اور شانتی ہے، یہ بدلتی نہیں۔ ہمیں اسکو حاصل نہیں کرنا چاہیئے، یہ ہمارے اندر ہے، ہمیں صرف گندگی کو دھوڈالنا ہے اور اس کو دیکھنا ہے۔

خود پر بھروسہ کیجیئے، اُسی وقت ہم دُنیا سے پریم کرسکتے ہیں۔ انتہائی اعلیٰ رَوّیہ اختیار کیجیئے اپنی کائناتی فطرت کو جانتے ہوئے ہمیں مکمل سکوت اور خاموشی کے ساتھ دنیا کے تمام مظاہر کو دیکھنا چاہیئے۔ یہ محض بازیچہِ اطفال ہے اور ہم اسے جانتے ہیں، پس اس سے پریشان نہیں ہوسکتا۔ اگر دماغ تعریف سے خوش ہوتا ہے تو الزام سے اسے تکلیف پہنچے گی۔ لذتِ نفس یہاں تک کہ دماغ کی تمام خوشیاں مٹ جانے والی ہیں۔ لیکن ہمارے اندر ایک سچّی اور بے تعلق خوشی موجود ہے، جس کا کسی پر انحصار نہیں ہے، یہ بالکل آزاد ہے، یہ رُوحانی مسرّت ہے۔ جتنی رُوحانی مسرّت ہمارے اندر ہوگی اُسی قدر ہم زیادہ روحانی ہونگے۔ خودی کی مسرّت ہی کا نام مذہب ہے۔

اندر کی کائنات جو کہ حقیقی ہے نامحدود طور پر باہری کائنات سے زیادہ بڑی ہے جو کہ محض

سچی کائنات کا ایک عکس ہے۔ یہ دُنیا نہ تو حقیقی ہے اُور نہ غیر حقیقی۔ یہ سچائی کا عکس ہے۔ ایک شاعر نے کہا ہے" تصوّر سچائی کا سُنہرا عکس ہوتا ہے۔"

ہم دُنیا میں پیدا ہوتے ہیں اُور پھر یہ ہمارے لئے ذلیت بن جاتی ہے۔ چیزیں اپنے طور پر مُردہ ہوتی ہیں، صرف ہم انہیں زِندگی دیتے ہیں اُور پھر بے وقوفوں کی طرح ہم ان کے چاروں طرف گھومتے ہیں اُور ان سے خوف کھانے لگتے ہیں لیکن ان مچھیرنوں کی طرح نہ بنیئے جو بازار سے گھر آتے ہوئے طُوفان میں گھر گئیں تھیں اور جنہوں نے ایک گل فروش کے گھر میں پناہ لے لی تھی۔ وہ باغ کے کنارے جہاں پُھولوں کی خوشبو ہَوا میں رچی بسی تھی۔ ایک رات ایک کمرہ میں رہیں۔ انہوں نے آرام کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکیں۔ آخر ان میں سے ایک نے تجویز کیا کہ انہیں مچھلی کی ٹوکریوں کو بھگو کر اپنے اپنے سرہانے رکھ لینا چاہیئے۔ ایسا کرنے کے بعد وہ آرام سے سو گئیں۔

دُنیا مچھلیوں کی ٹوکریوں کی طرح ہے۔ ہمیں لذّت کے لئے اس پر انحصار نہ کرنا چاہیئے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ تامس ہیں یا پابند ہیں پھر کچھ لوگ راجس یا خود پسند ہوتے ہیں۔ جو ہمیشہ "مَیں مَیں" کی بات کرتے ہیں۔ وہ بعض اوقات اچھے کام کرتے ہیں اور رُوحانی ہو جاتے ہیں۔ لیکن سب سے اعلیٰ درجہ کے ساتوک ہوتے ہیں یعنی مشاہدۂ نفس کے عادی۔ وہ لوگ جو کہ اپنی خودی میں ڈوبے رہتے ہیں۔ تامسی راجسی اور ساتوک۔ یہ تین صفات (بے حسی عمل اور روشنی) ہر ایک کے اندر ہوتی ہیں اُور مختلف اوقات میں ایک دُوسرے پر غالب آتی ہیں۔

تخلیق "کسی چیز" کو بنانے کا نام نہیں ہے، یہ توازن کو پھر سے حاصل کرنے کی جد وجہد ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے پانی بھرے مٹکے میں کارک کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تلے میں ڈال دیئے جائیں اور وہ ایک ساتھ یا الگ الگ اُوپر آنے کے لیئے اُبھریں ۔ زندگی کے ساتھ بدی ہے اور رہنی چاہیئے۔ ایک معمولی بدی زِندگی کا ذریعہ ہے۔ چھوٹا سا گناہ جو دُنیا میں ہے وہ اچھا ہے۔ کیونکہ جب توازن آجائے گا تو یہ دُنیا ختم ہو جائے گی۔ اِس لئے کہ یکسانیت اُور تباہی دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ نیکی اور بدی دُنیا کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ لیکن جب ہم اس دُنیا سے اُوپر اُٹھ جاتے ہیں ـــ تو نیکی اُور بدی دونوں سے بے نیاز ہو جاتے ہیں اور رُوحانی مسرّت حاصل کرتے ہیں۔

اس بات کا کبھی امکان نہیں ہے کہ کبھی تکلیف کے بغیر خوشی حاصل ہو، بدی کے بغیر نیکی حاصل ہو۔ کیونکہ زِندگی خود توازن کے کھو جانے کا نام ہے۔ ہمیں جو چیز درکار ہوتی ہے وہ آزادی ہے زِندگی نہیں، مسرّت اُور نیکی بھی نہیں۔ تخلیق نامحدود ہے، نہ اس کا کوئی آغاز ہے اور نہ انجام۔ یہ ایک ہلکی لہر ہے

جو نامحدود جھیل کے اندر ہمیشہ اُٹھتی رہتی ہے۔ تاہم اس کے اندر کچھ ایسی گہرائیاں ہیں، جہاں رسائی نہیں ہو سکتی۔ کچھ لہریں ایسی ہیں جہاں توازن حاصل ہو چکا ہے۔ بہر کیف لہروں کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ توازن حاصل کرنے کی جد و جہد ازلی ہے، زندگی اور موت اس حقیقت کے دو مختلف نام ہیں۔ ایک ہی سکّے کے دونوں طرف کے رُخ ہیں۔ دونوں مایا ہیں۔ ایک وقت میں زندہ رہنا اور ایک لمحہ بعد مر جانے کی جد و جہد کرنے کی ناقابلِ توجیہہ کیفیت ہی ان سے پرے سچی فطرت ہے یعنی آتما جب ہم ایک ایشور کو تسلیم کرتے ہیں تو بہ حقیقت میں خودی کو تسلیم کرنا ہوتا ہے۔ جسے ہم خود کو الگ کر کے اپنے باہر اسکی پوجا کرتے ہیں، لیکن یہ ہر وقت ہماری سچی خودی ہی رہتی ہے یعنی ایک اور صرف ایک ایشور۔

توازن حاصل کرنے کے لئے ہمیں تامس کی بجائے راجس بننا چاہیئے اور پھر ستو سے راجس کی فتح کرنا چاہیئے۔ جو کہ ایک ایسی پُرسکون خوبصورت کیفیت ہو گی، جو برابر بڑھتی رہے گی، یہاں تک کہ ہر چیز ختم ہو جائیگی مجبوریوں کو ترک کر دیجئے۔ ایک بٹیا بن جایئے، آزاد ہو جایئے۔ پھر آپ "باپ" کو اِسی طرح دیکھ سکتے ہیں، جس طرح عیسٰی نے دیکھا تھا۔ نامحدود طاقت کا نام مذہب اور ایشور ہے۔ کمزوری اور غلامی سے بچئے۔ آپ صرف ایک رُوح ہیں۔ اگر آپ آزاد ہیں تو آپ کیلئے لا فانیت ہے۔ اگر آپ آزاد ہیں تو ایک ایشور ہے۔ اگر "وہ" آزاد ہے۔

---

دُنیا میرے لئے ہے، مَیں دنیا کے نہیں ہوں۔ نیکی اور بدی ہماری غلام ہیں۔ ہم ان کے غلام نہیں ہیں۔ حیوان کی فطرت یہ ہے کہ وہ جہاں ہے وہیں رہے (ترقی کرنے کیلئے نہیں) آدمی کی فطرت یہ ہے کہ وہ نیکی کرے اور بدی سے بچے۔ ایشور کی فطرت یہ ہے کہ وہ دونوں کی ضرورت نہ سمجھئے لیکن ازلی طور پر رُوحانی مسرت سے پُر ہو۔ آیئے ہم ایشور بنیں! اپنا دل کو سمندر کی طرح وسیع کریں۔ دُنیا کے تمام ادنےٰ چیزوں سے بے نیاز ہو جائیں۔ خوشی یہاں تک کہ بُرائی کیلئے بھی پاگل بن جایئے۔ دُنیا کو اس طرح دیکھئے جس طرح ایک تصویر کو دیکھتے ہیں، پھر اسکی خوبصورتی سے لطف اُٹھایئے۔ یہ جانتے ہوئے کہ کوئی چیز آپ پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ دنیا کی نیکی کیا ہے، بچّوں کا کیچڑ میں دب گئے پا جانا۔ اس کو پُرسکون آسودہ خاطری کے ساتھ دیکھئے۔ اچھائی اور بُرائی کو ایک طرح دیکھئے۔ دونوں محض ایشور کا کھیل ہیں سب سے لطف اُٹھایئے۔

---

میرے گُرو دیو کہا کرتے تھے "سب ایشور ہے"! لیکن بُرائی سے پرہیز کرنا چاہیئے، پانی تمام پانی ہے۔ لیکن پینے کے لئے گندے پانی سے پرہیز کیا جاتا ہے۔

پورا آسمان ایشور کا دُھوپ دان ہے۔ سورج اور چاند دیئے ہیں۔ کس مندر کی ضرورت ہے؟ تمام آنکھیں تیری ہیں، تاہم تیری کوئی آنکھ نہیں ہے۔ تمام ہاتھ تیرے ہیں، تاہم تیرا کوئی ہاتھ نہیں۔

جو چیز بھی چلے لے لیجیئے، نہ اس کی تلاش کیجئے اور نہ اس سے پرہیز۔ یہ آزادی ہے جس پر کسی چیز کا اثر نہیں

ہوتا - صرف جستجو ہی نہ کیجئے بلکہ بے نیاز رہیئے - بیل کی حکایت کو یاد رکھئے - ایک مچھر ایک بیل کے سینگ پر بہت دیر تک بیٹھا رہا - آخر اس کا ضمیر پیدا ہؤا تو اس نے بیل سے کہا او بیل میں یہاں بڑی دیر سے بیٹھا ہوں، شاید میں نے تمہیں پریشان کیا ہے - مجھے افسوس ہے، میں چلا جاؤں گا - بیل نے جواب دیا، اوہ قطعاً نہیں! اپنے پورے خاندان کو لے آؤ اور میرے سینگ پر رہو تم مجھے کیا پریشان کر سکتے ہو -

---

بدھوار - 26 جون

جب ہمارے اندر خود پسندی اور نفس نہیں ہوتا تو ہمارے بہترین کام ہوتے ہیں اور ہمارا عظیم تر اثر کام کرتا ہے - تمام بڑے ذہین لوگ اس کو جانتے ہیں - ہمیں اپنے آپ کو ایک ربانی اداکار کے سپرد کر دینا چاہیئے - اور " اسے " اداکاری کرنے دینا چاہیئے، اور خود کوئی کام نہیں کرنا چاہیئے - کرشن جی کہتے ہیں، اوہ! ارجن تمام دنیا میں میرا کوئی فرض نہیں ہے قطعی طور پر ہو جایئے - بالکل غیر متعلق، صرف اس وقت آپ کوئی حقیقی کام سرانجام دے سکیں گے حقیقی طاقتوں کو کوئی آنکھ نہیں دیکھ سکتی - ہم صرف نتائج دیکھ سکتے ہیں - نفس کو نکال پھینکئے، ختم کر دیجئے، اسے بھول جایئے - ایشور کی مرضی پر خود کو چھوڑ دیجئے، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے - جتنا ہم نفس سے دور ہوتے ہیں اتنا ہی ہم ایشور ہمارے قریب آتا ہے - اس معمول " میں " کو ختم کر دیجئے - اور صرف عظیم " میں " کو باقی رہنے دیجئے -

ہمارے خیالات جیسے ہوتے ہیں ہم ویسے ہی بن جاتے ہیں - اسلئے آپ جو کچھ سوچیں احتیاط کیساتھ سوچیں - الفاظ کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے - خیالات زندہ رہتے ہیں اور دور تک سفر کرتے ہیں ہر وہ خیال، جو ہم سوچتے ہیں، اس میں ہمارے کردار کی آمیزش ہوتی ہے - یہی بات ایک مقدس اور متبرک آدمی کے لئے ہے - یہاں تک کہ اس کی گالیاں اور غصہ میں بھی اس کی اپنی محبت پارسائی کا رجحان ہوتا ہے اور وہ مفید ہوتی ہیں -

کسی شے کی خواہش نہ کیجئے، ایشور کے بارے میں سوچیے اور طلب نہ رکھیئے، یہ بے خواہشی ہے، جس سے نتائج برآمد ہوتے ہیں - بھکاری فقیر مذہب کو گھر گھر پہنچاتے ہیں، لیکن وہ سوچتے ہیں کہ وہ کچھ بھی نہیں کر رہے ہیں، وہ کسی چیز کا دعوے نہیں کرتے، غیر ارادی طور پر ان کا کام پورا ہو جاتا ہے - اگر وہ علم کے درخت کو کھانا شروع کر دیں (یعنی علم فضل بگھارنے لگیں) تو وہ خود پسند بن جائیں اور وہ تمام بھلائی کے کام جو وہ کرتے ہیں ختم ہو جائیں - جب ہم " میں " کی بات کرتے ہیں تو یہ ریاکاری ہوتی ہے اور ہم اسے ممکن الادارک کہتے ہیں، لیکن حقیقت میں یہ بیل کی طرح کھونٹے کے چاروں طرف گھومنا ہے - ایشور نے خود کو بہت خوبی کے ساتھ پوشیدہ رکھا ہے - پس جو خود کو پوشیدہ رکھتا ہے، وہ اپنا بہت سا کام انجام دیتا ہے اپنے آپ کو فتح کیجئے پھر تمام کائنات آپ کی ہے -

ستو کی کیفیت میں ہم چیزوں کو ان کی اصل فطرت کے مطابق دیکھتے ہیں - ہم شعور احساسات اور دلائل کی دنیا

سے اور ہوتے ہیں۔ وہ پتھریلی دیوار جس نے ہمیں قید کر رکھا ہے، خود پسندی کی دیوار ہے۔ ہم ہر چیز کا خود سے تعلق ظاہر کرتے ہیں، سوچتے ہیں مَیں نے یہ کیا وہ کیا اور وہ کیا۔ اس "مَیں" کو ختم کر دیجئے۔ اپنے اندر موجود اس طلسم (جادو) کو توڑ دیجئے یُوں۔ کہیئے "مَیں" نہیں لیکن "تو"۔ اس کو محسوس کیجئے اور اس پر عمل کیجئے۔ جب تک ہم خود پسندی اور نفس کی دُنیا کو نہیں چھوڑ دیتے، کبھی بھی دیوتاؤں کی دُنیا میں داخل نہیں ہو سکتے، نہ کبھی کوئی داخل ہو سکتا ہے اور نہ ہو گا۔ دُنیا کو بھول جانے کا مطلب نفس کو بھول جانا ہے۔ اس پاجی نفس کو نیست و نابُود کر دیا جانا چاہیئے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو اس سے نجات حاصل کر لیتے ہیں، سوچیئے وہ آپ کے لئے کتنا مفید کام کر رہے ہیں، وہ صرف خود کو ہی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اس جگہ جایئے جہاں لوگ آپ سے نفرت کریں۔ انہیں نفرت کرنے دیجئے۔ اس طرح آپ کا نفس نکل جائے گا اور آپ ایشور کے قریب تر ہو جائیں گے۔ بچّہ والی بندریا کی طرح جب تک ہم سے ہو سکتا ہے ہم اپنے بچّہ "دنیا" پر اپنی گرفت کو مضبوط رکھتے ہیں لیکن آخر کار جب ہم دوڑائے جاتے ہیں تو اس پر سے پاؤں رکھ کر گزر جاتے ہیں[1]۔ تب ہم ایشور کے نزدیک پہنچنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ راست بازی کی خاطر مصیبت اُٹھانا مبارک ہے۔

لذّت لاکھوں سروالے ایک سانپ کی طرح ہے۔ جس کو ہمیں اپنے پاؤوں تلے کُچل دینا چاہیئے۔ ہمیں لذّت کو ترک کر دینا چاہیئے۔ اور ثابت قدم رہنا چاہیئے۔ ہمیں نااُمیدی اور مایُوسی ملے گی۔ لیکن ہمیں ثابت قدم رہنا چاہیئے ——— دنیا ایک عفریت ہے ——— یہ ایک ایسی مملکت ہے، جہاں پر نفس کی بادشاہی ہے۔ طمع حرص اور شہرت کو ترک کر دیجئے۔ راہ خدا پر گامزن رہیئے ——— آخر کار ہم ایک مکمل یکسانیت کی حالت میں پہنچ جائیں گے۔ یہ نظریہ کہ احساسات کے اطمینان سے ہی خوشی حاصل ہوتی ہے، قطعی مادہ پرستی ہے۔ اس میں حقیقی خوشی کا ایک شائبہ بھی موجود نہیں ہے۔ وہاں جو کچھ بھی خوشی ہے وہ حقیقی روحانی مسرت کا محض ایک عکس ہے۔

جو لوگ خود کو ایشور کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ ان کو دُنیا کو زیادہ فائدہ پہنچتا ہے۔ مقابلتاً ان لوگوں کے جو خود کو ورکر کہتے ہیں۔ وہ آدمی جس نے خود کو پُورے طور پر پاک باطن کر لیا ہے مبلغین کی ایک جماعت کے مقابلہ میں زیادہ کام کرتا ہے۔ پاکیزگی اور سکوت ہی طاقت کا سرچشمہ ہے۔

سوسن کے پھول کی طرح بنیئے، ایک جگہ قائم رہیئے اور اپنی پنکھڑیوں کو پھیلا دیجئے۔ بھنورے خود بخود آجائیں گے۔ کیشپ چندر سین اور سری رام کرشن کے درمیان بڑا نمایاں فرق تھا۔ آخر الذکر نے دُنیا میں کبھی گناہ اور تکلیف کو تسلیم نہیں کیا۔ کوئی بُرائی نہیں جس کے خلاف جدوجہد کی جائے۔ اوّل الذکر ایک بڑے اخلاقیات کے مصلح اور برہمو سماج کے بانی اور لیڈر تھے۔ ۱۲ سال بعد دکنیشور کے خاموش پیغامبر نے

---

[1] جب تک بندریا محفوظ رہتی ہے اپنے بچّہ سے بہت لگاؤ رکھتی ہے۔ لیکن خطرہ کے وقت اگر ضرورت پڑے تو وہ بچّہ کو پھینک کر اس کے اُوپر پاؤں رکھ کر گزر جانے سے بھی گریز نہیں کرتی۔

نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ طاقت اُن لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے، جو خاموش رہتے ہیں، زندہ رہتے ہیں اور پریم کرتے ہیں۔ اور پھر وہ اپنے آپ کو فراموش کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگ کبھی "مجھ کو" اور "میرے لئے" نہیں کہتے۔ وہ صرف مبارک ذریعہ بن جاتے ہیں۔ ایسے لوگ ہی عیسیٰ اور بودھ کی سی مثالی زندگی بنانے والے ہوتے ہیں، وہ کسی شئے کی خواہش نہیں کرتے۔ ہر کام غیرارادی طور پر ہوتا ہے۔ وہ حقیقی محرک "جیون مکت" ہوتے ہیں۔ بالکل بے غرض۔ بے حیثیت شخصیت پورے طور پر غائب ہو جاتی ہے۔ کوئی اُمنگ نہیں رہتی۔ وہ شخصیت نہیں رہتے۔ ان کی حیثیت اصولوں کی بن جاتی ہے ؞

---



الموڑہ کی برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں، جنہیں دیکھ سوامی جی جھوم جھوم گئے۔

# پیغمبر اور اوتار

برہسپت وار ۔ 22 جون

(اس صبح کو سوامی جی ایک نئی انجیل لے کر آئے اور انہوں نے یوحنا کی کتاب کے بارے میں پھر اُپدیش شروع کیا۔)

حضرت محمد نے نبی ہونے کا دعوے کیا۔ جس کی بشارت حضرت عیسیٰ نے کی تھی ۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ کی بابت فوق الفطرت پیدائش کے دعویٰ کو ضروری نہیں سمجھا۔ اس قسم کے دعویٰ ہر زمانہ میں اور تمام ملکوں کے اندر ہوتے رہے ہیں۔ تمام عظیم انسان اپنے مقتدیوں کے لئے دعوے کرتے رہے ہیں۔

جاننا محض نسبتی اور اضافی چیز ہے۔ ہم ایشور ہو سکتے ہیں لیکن ایشور کو جان نہیں سکتے۔ علم ادنیٰ درجہ کی چیز ہے۔ آدم کو اسی وقت پھینکا گیا، جب انہیں علم ہوا۔ اس سے قبل وہ ایشور تھے، وہ حق و صداقت تھے اور ایک پاکیزگی تھے۔ ہمارے اپنے چہرے ہیں لیکن ہم ان کے عکس ہی دیکھ سکتے ہیں، اصل کو نہیں۔ ہم پریم ہیں لیکن جب ہم سوچتے ہیں تو ہمیں فریب نظر سے کام لینا پڑتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مادہ محض ایک خارجی تصور ہے۔[1]

---

[1] چونکہ جاننے والا صرف اپنے عکس کو ہی جان سکتا ہے، خود کو نہیں، اس لئے وہ خود ہمیشہ ناقابلِ فہم رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ علم و فہم جاننے والے سے ایک الگ اور نیاری شے ہے اور اس صورت میں یہ ایک خارجی تصور ہے۔ چونکہ جاننے والے کو آتما یا روح کہا جاتا ہے۔ اس لئے اس الگ تھلگ خارجی شے کو مادہ یا پرکرتی کہنا چاہیئے۔ اسی وجہ سے سوامی جی نے کہا ہے کہ مادہ صرف ایک خارجی تصور ہے۔

نورتی دنیا سے دُور ہو رہی ہے۔ ہندو دیو مالا میں آیا ہے کہ ہنس (خود ایشور) نے پہلے چار انسانوں[1] کو اشتباہ دیا کہ ظاہر کی حیثیت محض ثانوی ہے پس وہ بلا قالب کے رہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اظہار تنزل ہے کیونکہ رُوح کا اظہار صرف علم سے ہوتا ہے اور پھر علم ختم ہو جاتا ہے۔ تاہم اصول پر مادہ کا غلاف چڑھا دیا جاتا ہے۔ اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ بعد میں پردہ کے اندر چھپے ہوئے اصل کو نہیں دیکھ سکیں گے۔ ہر ایک بڑا معلم اس کو سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اوتاروں اور پیغمبروں کے آنے کا ایک سلسلہ قائم ہے جو ہمیں اصول سے روشناس کراتے ہیں اور اپنے اپنے وقت کے مطابق اسے مختلف پیرائے میں ادا کرتے ہیں۔ گرُو دیکا کہنا ہے کہ مذہب ایک ہے۔ تمام پیغمبر اس کی تعلیم دیتے ہیں۔ لیکن وہ محض اصولوں کو ایک نئی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ وہ اس کو پرانی شکل سے نکال کر نئی شکل دے کر پیش کرتے ہیں۔ جب ہم خود کو رُوپ اور رنگ سے خاص طور پر جسم سے آزاد کر لیتے ہیں، جب ہمیں جسم کی ضرورت نہیں رہتی تبھی ہم پابندی اور غلامی سے آزاد ہو پاتے ہیں۔ دائمی سلسلہ کا نام دائمی غلامی ہے۔ اسلئے روپ اور رنگ کیساتھ ترجیح دینی چاہیئے۔ ہمیں کسی بھی جسم سے آزاد ہونا چاہیئے خواہ اچھا جسم ہی کیوں نہ ہو۔ صرف ایشور کا ہی حقیقی وجود ہے۔ ایشور دو نہیں ہو سکتے۔ روح صرف ایک ہے اور وہ میں ہوں۔

اچھے کام اس لئے قیمتی ہیں کہ وہ آزادی کا ذریعہ ہیں۔ اچھے کاموں کا انہیں کرنیوالے کو فائدہ پہنچتا ہے، کسی دوسرے کو نہیں۔

گیان محض ایک تجزیہ ہے۔ جب ہم ایک ہی قسم کی بہت سی چیزوں کو دیکھتے ہیں تو ان کے خاص نام رکھ دیتے ہیں اور مطمئن ہو جاتے ہیں۔ ہم حقائق کا انکشاف کرتے ہیں لیکن کبھی "کیوں" کے متعلق نہیں سوچتے۔ ہم تاریکی کے ایک وسیع میدان میں چکر لگاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم بہت کچھ جانتے ہیں "کیوں" کا جواب اس دنیا میں نہیں مل سکتا۔ اس کے لئے ہمیں ایشور تک پہنچنا ہو گا۔ جاننے والے کو کبھی بیان نہیں کیا جا سکتا، یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے نمک کی ایک ڈلی کو سمندر میں ڈال دیں تو وہ فوراً سمندر کا جزو بن جائے گی۔

تفریق کائنات ہے، ہم رنگی و یکسانیت ایشور۔ تفریق سے بالا اُٹھ جایئے آپ زندگی اور موت پر فتح پا سکیں گے، دائمی یکسانیت حاصل کر لیں گے، ایشور میں جا ملیں گے، ایشور ہو جائیں گے۔ آزادی حاصل کیجئے خواہ اس کے لئے زندگی کی قیمت ہی ادا کیوں نہ کرنی پڑے۔ تمام زندگیاں ہماری

---

[1] چار پہلے انسان ہیں — سَنک، سنندن، سناتن اور سنت کمار۔

ہیں، بالکل اس طرح جس طرح اوراق کتاب کے ہوتے ہیں۔ ہم میں تبدیلی نہیں ہوسکتی، ہم شاید نہیں روح ہیں جس پر اثر قائم کیا جاتا ہے۔ اس طرح جس طرح کہ آنکھ پر اس حلقہ کا اثر ہوتا ہے جو جلتی لکڑی کو تیزی کے ساتھ گھمانے سے بنتا ہے۔ رُوح تمام شخصیتوں کے اتحاد کو کہتے ہیں اور چونکہ یہ آرام میسّر ہے، اس لئے یہ ابدی ہے اور ناقابلِ تبدیل ہے۔ یہ ایشور ہے آتما ہے۔ یہ زندگی نہیں ہے لیکن اس کو زندگی میں ڈھالا جاتا ہے۔ یہ مسرّت نہیں ہے مگر اس کو مسرّت میں تبدیل کیا جاتا ہے۔

---

آج دُنیا نے ایشور کو چھوڑ دیا ہے کیونکہ بظاہر نہیں معلوم ہوتا کہ وُہ دُنیا کی بھلائی کے لئے کوئی کام کر رہا ہے۔ پس وُہ کہتے ہیں، ایشور کا کیا فائدہ؟ کیا ہمیں ایشور کو محض ایک میونسپل اتھارٹی کے طور پر سمجھنا چاہیئے؟

ہم صرف یہ کر سکتے ہیں ــــ کہ تمام خواہشات کو ختم کر دیں، اختلافات اور نفرت کو ختم کر ڈالیں کم درجہ کی خودی کو ختم کر دیں اور ذہنی طور پر خودکشی کر لیں جسم اور دماغ کو پاک رکھیں اور ان کو ایشور تک پہنچنے کا واحد ذریعہ سمجھیں۔ صرف سچائی کی خاطر سچائی کو تلاش کیجئے، رُوحانی مسرّت کے لئے تلاش نہ کیجئے۔ اپنے آپ ملیگی لیکن خود اپنی طرف سے اس کی جستجو نہ کیجئے، سوائے ایشور کے اور کوئی مدّعا نہ رکھیئے۔ سچائی تک پہنچنے کی کوشش کیجئے، خواہ ایسا کرنے کے لئے جہنم سے ہی کیوں نہ گزرنا پڑے۔

---

شکروار۔ 28 جون

(دن میں تمام پارٹی تفریح و سیاحت کو گئی اور اگرچہ سوامی جی نے حسب دستور اپنے اُپدیش کا سلسلہ جاری رکھا لیکن جو کچھ انہوں نے کہا اس کو لکھا نہیں جاسکا، اس لیئے وہ حاصل نہیں ہے البتہ صبح کو ناشتہ کے وقت سوامی جی نے جو کچھ کہا وہ یہ ہے)

ہر قسم کے کھانے کے لئے اظہارِ تشکر کیجئے۔ یہ برہم ہے، اس کی عالمی صلاحیت ہماری انفرادی صلاحیت میں تبدیل ہوتی ہے اور وہ ہمیں ہمارے کاموں میں امداد کرتی ہے۔

---

سنیچروار۔ 29 جون

رُوحوں کے دیوتا کرشن جی، ارجن یا نیند کے دیوتا گُداکیش (وہ جس نے نیند پر فتح پائی ہو۔)

سے باتیں کرتے ہیں۔" دنیا کرم کی جگہ (رزم گاہ) ہے، پانچ بھائی (پارسائی کی علامت) دوسرے سو بھائیوں سے لڑتے ہیں۔ (یوں سمجھیے کہ خواہشات کے ہجوم سے جنگ کرنا پڑا۔) سب سے زیادہ بہادر بھائی ارجن (بیداری کا دیوتا) سینا پتی ہے۔ ہمیں تمام لذاتِ نفس کو ——— جو ہمیں محبوب ہوتی ہیں، انہیں ختم کرنے کے لئے جنگ کرنی پڑتی ہے۔ ہمیں تنہا رہنا ہے، ہم برہم ہیں۔ دوسرے تمام تصورات کو ایک میں ختم کر دیا جانا چاہیئے۔

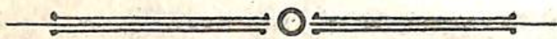
کرشن جی نے ہر کام کیا لیکن کسی تعلق کے بغیر۔ وہ دنیا میں تھے مگر دنیا کے نہیں تھے۔" تمام کام انجام دیجئے لیکن کسی تعلق کے بغیر، کام کی خاطر کام کیجئے۔ کبھی اپنے لئے کام نہ کیجئے۔"



آزادی اور موکش کا کوئی روپ رنگ نہیں ہوتا ——— یہ مٹی ہے جس سے ہم (جسم) بنائے جاتے ہیں۔ پھر یہ محدود ہے آزاد نہیں ہے پس وہ سوکھی آزادی متعلقات کی آزادی نہیں ہو سکتی۔ ایک جسم ہرگز جسم کی حیثیت سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ مَیں آزاد ہوں، یہ اُسی وقت آزاد ہو سکتا ہے جب ظاہری صورت کے تمام نظریات کو کھو بیٹھے۔۔ یہ دنیا کیا ہے، خودی کی نغمہ سرائی۔ ایک ہی سُر جو ارتعاش کی وجہ سے قابلِ سماعت بن گئی ہو۔ محض اوقات ان نغموں میں ہم آہنگی نہیں رہتی۔ لیکن یہ بھانت بھانت کی سُریں ہی دراصل ایک سرگم بناتی ہیں۔ عالمی موسیقی کا انحصار تین باتوں پر ہے، آزادی، طاقت اور ہم آہنگی۔

اگر آپ کی آزادی سے دوسرے کو تکلیف پہنچتی ہے تو آپ آزاد نہیں ہیں۔ آپ کو دوسروں کو دکھ نہیں پہنچانا چاہیئے۔

ملٹن نے کہا ہے کمزور رہنا بدبختی ہے۔" کام اور تکلیف دونوں غیر منفک طور پر ایک ہیں۔ (یہاں تک کہ اگر کوئی شخص زیادہ ہنستا ہے تو اس کو اتنی ہی زیادہ تکلیف پہنچتی ہے) صرف کام کرنا آپ کا حق ہے لیکن اس کے نتائج کا نہیں۔



بُرے خیالات مادی نظر سے بیماری کے جراثیم ہیں۔

ہر خیال ہتھوڑے کی طرح ہے، جو ہمارے جسموں کے لوہے پر متواتر ضربیں لگاتا چلا جاتا ہے۔

جیسے کسی کے خیالات ہوں، وہ ویسا ہی بن جاتا ہے۔

ہم کائنات کے تمام اچھے خیالات کے وارث ہیں بشرطیکہ ہم خود کو ان کے لئے آمادہ کریں۔

کتاب میں جو کچھ ہے، وہ ہمارے اندر موجود ہے۔ بے وقوف کیا تجھے سنائی نہیں دیتا ؟
خود تیرے دِل کے اندر دن رات یہ نغمہ گونجتا ہے۔ ست چت آنند سوہم سوہم۔ کیونکہ میں ہی ست چت، آنند ہوں۔ مَیں ایشور ہوں، مَیں ایشور ہُوں۔

ہم میں سے ہر ایک کے اندر گیان کا سرچشمہ ہے۔ ایک چیونٹی کے اندر بھی اور ایک اعلےٰ ترین فرشتہ کے اندر بھی حقیقی مذہب ایک ہے لیکن ہم شکلوں، علامتوں اور مثالوں پر جھگڑتے ہیں۔
وہ ہزار سالہ عرصہ جس میں شیطان بند رہے گا، وہ عیسیٰ کی حکومت ہوگی۔ ان تمام لوگوں کے لئے ہے جو اسے تلاش کرتے ہیں۔ ہم خود کو کھو چکے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ دنیا کھو گئی ہے۔

اس دنیا میں مکمّل طاقت عامل میں ہے لیکن عمل میں مصروف ہیں۔
اگرچہ حقیقی تکمیل اور کاملیت صرف ایک ہے تاہم اس کی بہت سی شکلیں ہو سکتی ہیں۔ جن میں تھوڑی بہت قابلیت جلوہ گر ہے۔



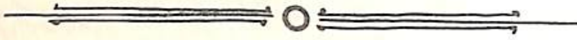
اتوار۔ 30، جون

خیالی پیکر بنائے بغیر سوچنے کی کوشش کرنا بالکل ایسے ہی ہے جیسے کہ ناممکن کو ممکن بنانے کی کوشش کرنا۔ ہم جسے ایشور کہتے ہیں وہ دُنیا کے اندر تمام نظریات کا انتہائی خلاصہ ہے۔
یہاں تک کہ خیال کے بھی دو جزو ہوتے ہیں۔ ایک سوچ اور دُوسرا الفاظ۔ ہمیں دونوں سے کام لینا چاہیئے۔ نہ کوئی تصوّریت کو ماننے والا حق پر ہے نہ مادّیت کو۔ ہمیں تصوّر اور اظہار دونوں کو لینا چاہیئے۔

تمام گیان عکس ہے، بالکل اِسی طرح جس طرح ہم آئینہ میں محض اپنی صورت کا عکس دیکھتے ہیں۔ کبھی کسی نے خود اپنے آپ یا ایشور کو نہیں دیکھا۔ لیکن ہم خود خودی ہیں۔ ہم ایشور ہیں۔
بھگوان بدھ نے فرمایا ہے کہ "نروان کو آپ اس وقت ہی پا سکتے ہیں جب آپ خود اپنے آپ سے فنا ہو جائیں۔ جب آپ کا آپ کی ادنےٰ حقیقت بالکل فنا ہو جائے گی، تب آپ اعلےٰ ترین حق و صداقت ہوں گے۔" آپ بُدھ بن جائیں گے۔

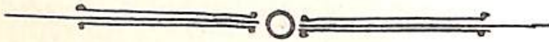
زیادہ تر لوگوں کے اندر ایشور کی روشنی سے ڈھکی ہوئی ہے۔ یہ ایک چراغ کے مانند ہے جو لوہے کے پیپے کے اندر جل رہا ہو۔ اس سے روشنی کی کوئی شعاع باہر نکل سکتی۔ بتدریج اور آہستہ آہستہ ہم پاکیزگی اور بے نفسی کے ذریعہ اس تاریکی کو کم کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ لوہے کا یہ خول شیشے کے

خول میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ شری رام کرشن لوہے کے ایک پیپے کی مانند تھے۔ جو شیشے میں بدل گیا تھا۔ جس کے ذریعہ ہم اندر کی روشنی کو دیکھ سکتے ہیں جیسی کہ وہ ہے۔ ہم سب شیشے اور آئینہ کا خول بننے یہاں تک کہ اعلیٰ سے اعلیٰ ترین روشنی بن جانے کی راہ پر ہیں۔ جب تک خول موجود ہے ہمیں مادی ذرائع سے ہی سوچنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں کوئی جلد بازی کامیاب نہیں ہو سکتی۔



بڑے بڑے اوتار اصولوں کی جیتی جاگتی مثالیں ہیں لیکن چیلے گورو کو اصول بنا دیتے ہیں اور پھر اصول کو فراموش کر دیتے ہیں۔

ساکار ایشور کے خلاف بھگوان بدھ کی مسلسل لعن طعن کا نتیجہ ہندوستان کے اندر مورتیوں کے رواج کی صورت میں نکلا۔ ویدوں میں رشیوں نے ساکار ایشور کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ وہ ہر جگہ ایشور کو دیکھتے تھے۔ لیکن ایشور کو ایک خالق اور دوست کی حیثیت سے تسلیم کرنے کا ردِ عمل مورتی پوجا کی صورت میں نکلا اور بدھ خود ایک بت بن گئے، ایسا ہی عیسیٰ کے ساتھ ہوا۔ مورتیوں کا سلسلہ لکڑی اور پتھر سے عیسیٰ اور بدھ تک ہے لیکن ہمیں مورتیوں کو رکھنا چاہیئے۔

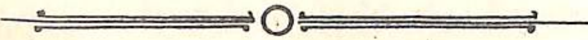


اصلاح کے لئے متعدد کوششیں ہمیشہ اصلاح کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ "تم برے ہو" یہ نہ کہیئے بلکہ یہ کہیئے "تم اچھے ہو اور بہت اچھے ہو"۔

ہر ملک کے اندر پجاری ایک برائی ہیں کیونکہ وہ مذمت کرتے ہیں اور نکتہ چینی کرتے ہیں۔ رفو کے لئے ایک دھاگہ چلانے کی بجائے دو تین دھاگے اور نکال دیتے ہیں۔ پریم کبھی مذمت نہیں کرتا۔ خواہش ایسا کرتی ہے۔ حق بجانب، قتل اور "صحیح" غصہ جیسی کوئی شے نہیں۔

اگر آپ کسی کو ایک شیر نہیں بننے دیں گے تو وہ روز کا لومڑی بن جائے گا۔ عورتیں ایک طاقت ہیں مرد عورت کو دباتا ہے، وہ لومڑی ہے لیکن اگر عورت کو زیادہ عرصہ تک نہ دبایا جائے تو وہ بھی شیر بن جائے گی۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہیئے کہ طلب حقیقی کو عقل و فہم سے متوازن رکھنا چاہیئے۔ ورنہ وہ محض جذبانیت بن کر رہ جائے گی۔



تمام خدا پرست اس بات پر متفق نہیں کہ ثبات کے پیچھے بے ثبات ہے۔ خواہ خدا کے بارے

میں ان کے تصورات جُدا جُدا ہیں۔ بدھ نے قطعی طور پر اس سے انکار کیا ہے۔ "کوئی برہم نہیں ہے، کوئی آتما نہیں ہے، کوئی روح نہیں ہے۔"

ایک کردار کے اعتبار سے بدھ کی ایک عظیم ہستی تھی۔ شائد ہی دنیا نے ایسی ہستی دیکھی ہو۔ ان کے بعد عیسیٰ کا نمبر آتا ہے لیکن جیسا کہ کتابیں لکھی گئیں بھگوان کرشن جی کی تعلیمات دنیا میں بہترین تعلیمات ہیں۔ وہ جس نے اس حیرت انگیز نظم کو لکھا ان چند روحوں میں سے ایک تھی۔ جن کی زندگیوں نے دنیا کو نشاۃ ثانیہ کی خبر دی۔ نسل انسانی ایسا ذہن پھر کبھی نہیں پائے گی جیسے ذہن نے گیتا لکھی۔

طاقت صرف ایک ہے خواہ اس کا مظاہرہ بدی کی صورت میں ہو یا نیکی کی۔ ایشور اور شیطان ایک ہی دریا کے پانی کی تعمیر ہیں جو ایک دوسرے کے مخالف قسمت میں بہتی ہیں۔



سوم وار۔ یکم جولائی

شری رام کرشن کے پتا ایک کٹر برہمن تھے جو کہ اعلےٰ ذات کے برہمنوں کے علاوہ کسی اور سے تحائف تک لینے سے انکار کر دیتے تھے، وہ کوئی کام نہ کر سکتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ مندر میں پجاری بھی نہ بن سکے، نہ وہ کتابیں فروخت کر سکے اور نہ کسی کی خدمت کر سکتے تھے جو کچھ ایشور دیتا (دان) اُسی پر گزارہ کرتے تھے۔ دان بھی وہ کسی کم درجہ کے برہمن تک سے قبول نہیں کرتے تھے۔ ہندو دھرم مندروں کے اندر نہیں ہے۔ اگر ان تمام کو مسمار بھی کر دیا جائے تو بھی ہندو دھرم پر ذرہ برابر اثر نہیں پڑے گا۔ ہر ایک شخص کو چاہیئے کہ وہ صرف ایشور اور مہاتماؤں کیلئے گھر تعمیر کرے صرف اپنے لئے گھر بنانا خود غرضی ہے۔ اسی لئے وہ مندر بناتا ہے جہاں ایشور کی پوجا ہو سکے۔

اپنے گھر کی غریبی کی وجہ سے شری رام کرشن نے لڑکپن ہی میں دیوی ماں کے مندر میں پجاری بننا منظور کر لیا جس کو پراکرتی یا کالی کہا جاتا ہے جو ایک عورت کا مجسمہ ہے جو مُردا کے پاؤں پر کھڑی ہے۔ یہ علامت ہے اس بات کی کہ جب تک مایا جال باقی رہتا ہے ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ برہم ایک اسم بے جنس ہے۔ وہ نامعلوم ہے۔ نہ اس کو معلوم کیا جا سکتا ہے لیکن اس کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس نے خود کو مایا کے پردہ میں رکھا ہے، وہ کائنات کی ماں بن جاتا ہے۔ اسی طرح کائنات کو وجود میں لاتا ہے۔ لیٹی ہوئی مورتی میں شو یا ایشور ساکت بے روح، مردہ بن کر رہ گیا ہے۔ گیانی کہتا ہے کہ میں ادویت مت کی شکتی سے بھگوان کو پالوں گا۔ لیکن دویت وادی کہتا ہے کہ میں شو پرا پتی کے لئے ماں سے پرارتھنا کروں گا جس کے پاس شو پانے کی کنجی ہے۔

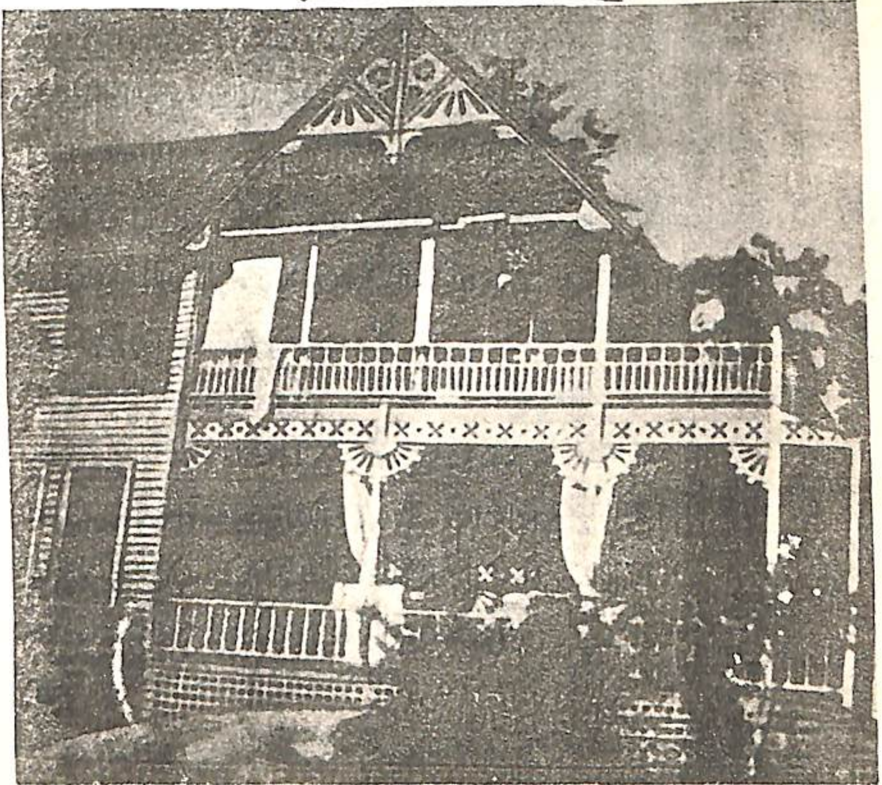
کالی ماں کی روزمرّہ کی پُوجا نے نوجوان پُجاری کے دل میں بھگتی کا ایسا جذبہ پیدا کر دیا کہ وہ مندر
میں روزانہ کی باقاعدہ پُوجا کو جاری نہ رکھ سکا۔ پس انہوں نے اپنے فرائض کو ترک کر دیا اور وہ مندر ہی کے
احاطہ میں ایک چھوٹی سی جھاڑی میں جا بیٹھے اور انہوں نے خود کو مراقبہ میں مصروف کر دیا۔ یہ جھاڑی دریائے
گنگا کے کنارے تھی۔ ایک دن گنگا کی تیز لہر ان کے پاؤں کو چُھو گئی۔ لکڑیوں کا جو حصار بنا ہوا تھا بہہ گیا۔ وہ بھیگ
گئے اور پوجا کرتے رہے اور وہیں بیٹھے رہے۔ انہوں نے اپنے جسم کی پروا نہیں کی۔ سوائے دیوی ماں کے بھگتی کے اور کوئی
وچار من میں نہ آنے دیا۔ ان کا ایک رشتہ دار دن میں ایک وقت ان کو بھوجن کراتا تھا اور ان کی دیکھ بھال کرتا تھا۔
بعد میں امداد کو ایک سنیاسن آئی انہیں ان کی 'ماں' مل گئی۔ جتنے گوروؤں کی انہیں تلاش تھی انہیں بنا کسی
جستجو کے ملتے چلے گئے۔ ہر ایک جاتی اور دان سے کوئی نہ کوئی ستھ مہاپُرش ان کے پاس پہنچا اور انہیں
برہم ودیا کی تعلیم دیتا، جسے یہ بڑے دھیان سے سنا کرتے تھے لیکن وہ پوجا صرف ماں کی کرتے۔ ان کے نزدیک ماں ہی
سب کچھ تھی ـــــ شری رام کرشن نے کبھی کسی کے خلاف سخت کلامی نہیں کی۔ ان کے اندر اس قدر شاندار رواداری موجود
تھی کہ ہر ایک فرقہ یہ محسوس کرتا تھا کہ ان کا تعلق اسی سے ہے، انہوں نے ہر ایک سے پیار کیا، ان کے نزدیک تمام
مذاہب برحق تھے، ان کے دل میں ہر ایک کے لئے جگہ تھی، وہ آزاد تھے لیکن پریم میں، سختی میں نہیں۔ نرم اور زندگی پیدا
کرتی ہے کوندتی بجلی پھیلتی ہے۔ سینٹ پالؑ نے کوندتی بجلی کی طرح یسوعؑ کا پیغام پھیلایا۔
تاہم سینٹ پال کا زمانہ اب گزر گیا، ہمیں آج کی نئی روشنیاں بننا ہے۔ ایک ایسی تنظیم کی ہمارے اندر اس
وقت بڑی ضرورت ہے جس کے اندر خودی کا توازن ہو، جب ہمیں ایسی تنظیم مل جائے گی تو وہ دنیا کا آخری مذہب ہوگی۔
پہیہ بدلنا چاہیئے اور ہمیں رکاوٹ ڈالنے کے بجائے اس سلسلہ میں امداد کرنی چاہیئے۔ مذہبی تصورات کی لہر اُٹھتی ہے
اور زوال پذیر ہوتی ہے اور چوٹی پر وقت کا پیغمبر ہوتا ہے۔ رام کرشن آج کے مذہب کی تلقین کے لئے آئے جو
تعمیری ہے تخریبی نہیں۔ انہوں نے پراکرتی سے حقائق حاصل کئے اور سائنٹیفک مذہب دیا جو کبھی نہیں کہتا کہ
"مجھ پر یقین کرو" بلکہ یہ کہتا ہے کہ "دیکھو"۔ "مَیں دیکھتا ہوں اور آپ بھی دیکھ سکتے ہیں"۔ آپ بھی ایسے ہی ذرائع
اختیار کریں، اس کے بعد آپ بھی اسی روشنی تک پہنچ جائیں گے، ایشور ہر ایک تک دیکھ سکتا ہے، سب میں ایشور کو پا
لینے میں اہلیت ہے۔ شری رام کرشن کی تعلیمات ہندومت کا نچوڑ ہیں، وہ ان کی مخصوص یا تعلیمات نہیں ہیں نہ کبھی انہوں
نے اس قسم کا دعوےٰ کیا۔ انہوں نے کبھی نام ونمود کی پروا نہیں کی۔

---

[1] بہت سے لوگوں کا کہنا ہے کہ سوامی وویکانند کی حیثیت شری رام کرشن کے سینٹ پال کی سی تھی۔

جب ان کی عمر چالیس برس کی تھی اُس وقت انہوں نے پرچار شروع کیا لیکن وہ ایسا کرنے کے لئے کبھی باہر نہیں گئے۔ لوگ خود ان سے تعلیمات حاصل کرنے ان کے پاس جاتے تھے۔ ہندو رواج کے مطابق سوامی رام کرشن کے ماں باپ نے ان کی شادی لڑکپن ہی میں پانچ برس کی ایک لڑکی سے کردی تھی جو کچھ فاصلہ پر ایک گاؤں کے اندر رہی رہی اور اس عظیم جاہ وجہد سے لاعلم رہی جو اس کا نوجوان شوہر کر رہا تھا جب وہ بالغ ہوئی تو یہ وقت تھا جب شری رام کرشن خود کو بھگتی میں جذب کر چکے تھے۔ وہ اپنے گھر سے پیدل چل کر دکشنیشور کے مندر میں پہنچی جہاں اس وقت شری رام کرشن رہتے تھے۔ جیسے ہی اس کی نظر شری رام کرشن پر پڑی، وہ سمجھ گئی کہ وہ کیا ہیں، کیونکہ وہ خود ایک عظیم رُوح تھی پوتر اور مقدس۔ اس نے شری رام کرشن کو ان کے کاموں میں امداد دی لیکن کبھی ان کو گرہست کی طرف کھینچنے کی کوشش نہیں کی۔

ہندوستان میں شری رام کرشن کی پُوجا ایک اوتار کی حیثیت میں ہوتی ہے۔ ان کے جنم دن کو دھارمک تہوار کی حیثیت سے دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔



تھاؤزینڈ آئی لینڈ پارک کا وہ مکان جہاں سوامی جی نے 1895ء میں اپدیش کیا۔

# دیوی ماں

مندر میں ایک گول مٹول پتھر کی مورتی پڑی ہوئی ہے جسے بھگت وشنو کہتا ہے، وہی وشنو جو ہر جگہ حاضر ناظر ہے
پجاری یا بھگت آتا ہے، مورتی کو ڈنڈوت پرنام کرتا ہے، اس کے آگے کچھ نذر عقیدت پیش کرتا ہے، دھوپ جلاتا
ہے۔ آرتی اتارتا ہے، اور پھر ہاتھ جوڑ کر بھگوان کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے، اس بھگت کے لئے یہ مورتی ہی بھگوان ہے
ایشور ہے، کیونکہ اس نے اسی مورتی کو ہی بھگوان کی پرتیما سمجھ لیا ہے، اپنا اشٹ بھگوان جان کر ہی بھگت مورتی کو
اشنان کراتا ہے، اس کو کپڑے پہناتا ہے اور اپنی تمام تر عقیدتوں کو مورتی کے اندر سمو دیتا ہے، جس سے یہ مورتی
"زندہ" ہو جاتی ہے۔

---

ایک فرقہ ایسا ہے جو کہتا ہے۔ صرف اچھی اور خوبصورت چیزوں کی پرستش کرنا کمزوری ہے۔ ہمیں
چاہیئے کہ ہم بری وحشت ناک چیزوں کی بھی پوجا کریں۔ یہ فرقہ[1] تبت میں آباد ہے۔ ان کے یہاں شادیاں نہیں ہوتیں
خاص ہندوستان میں کھلے طور پر یہ فرقہ موجود نہیں ہے لیکن خفیہ طور پر موجود ہے۔ کوئی بھلا آدمی اس فرقہ سے تعلق نہیں
رکھتا۔ تبت میں کمیونزم کو تین بار آزمایا گیا اور تینوں بار وہ ناکام رہا۔ وہ تپ اور ہٹ یوگ سے کام لیتے ہیں۔ لفظی طور پر
تپ کا مطلب جلانا ہے۔ یہ ایک طرح ایذا رسانی ہے۔ جس کا مقصد اپنی اعلےٰ قوتوں کو حرارت پہنچانا ہے۔ بعض اوقات کئی
لوگ طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک لگاتار اوم یا کسی دوسرے منتر کا جاپ کرتے رہتے ہیں۔ ایسے عمل سے
ایک طاقت ملتی ہے۔ جس کو آپ جس شکل میں چاہیں، تبدیل کر سکتے ہیں، خواہ روحانی خواہ مادی۔ تپ کا یہ تصور
پورے ہندو مذہب میں موجود ہے۔ ہندو یہاں تک کہتے ہیں کہ ایشور نے بھی دنیا کی کے لئے تپ کیا۔ یہ ایک ذہنی

[1] اس فرقہ کو وام مارگ کہتے ہیں۔ ایڈیٹر

آلہ ہے جس سے ہر کام ہو سکتا ہے۔ "تپ کے ذریعہ "تینوں دنیاؤں" میں کسی چیز کو بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

جو لوگ ان فرقوں کے بارے میں جن سے وہ ہمدردی نہیں رکھتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو کچھ کہتے ہیں، وہ ارادی یا غیر ارادی طور پر جھوٹے ہوتے ہیں۔ ایک فرقہ کو ماننے والا شاید ہی کسی دوسرے دوسرے فرقہ میں کوئی سچائی دیکھتا ہے۔

ایک عظیم بھگت (ہنومان) سے ایک بار جب پوچھا گیا کہ مہینے کا یہ کون سا دن ہے تو انہوں نے کہا کہ ایشور میری ابدی تاریخ ہے۔ میں کسی دوسری تاریخ کی پروا نہیں کرتا۔

---

منگل وار ۔ 2 جولائی

ماں کی حیثیت سے وشو شکتی کی پوجا شاکتس پوجا ہے۔ یہ انتہائی پیارا نام ہے، جو ہم جانتے ہیں۔ کیونکہ ماں کا تصور ہندوستان کے اندر نسوانیت کا اعلےٰ ترین تصور ہے۔ جب ایشور کی پوجا ماں کی حیثیت سے پریم کی حیثیت سے کی جاتی ہے تو ہندو اس کو "دائیں ہاتھ کا" راستہ کہتے ہیں اور یہ روحانیت کی طرف جاتا ہے۔ لیکن مادی خوشحالی کی طرف کبھی نہیں جاتا۔ جب ایشور کی پوجا اس کے قاہر ہونے کی حیثیت سے کی جاتی ہے تو "بائیں طرف کا" راستہ ہوتا ہے۔ یہ وشال مادی ترقی کی طرف جاتا ہے، بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ روحانی ترقی ہو، اور اسی کے ساتھ یہ تنزل کی طرف جاتا ہے۔ جو لوگ اس کو اختیار کرتے ہیں، نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔

ماں شکتی کا پہلا مظہر ہے، اس کی عظمت باپ کے مقابلہ میں زیادہ خیال کی جاتی ہے۔ ماں ہی سے شکتی کا تصور ملتا ہے۔ ایشور کی شکتی اور قدرت کاملہ کا اظہار ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک بچہ کو یہ یقین ہوتا ہے کہ اس کی ماں ہی شکتی شالی ہے اور وہ ہر کام کر سکتی ہے۔ دیوی ماں ہمارے اندر سوئی ہوئی کنڈلنی شکتی ہے۔ اس کی پوجا کئے بغیر ہم اپنے آپ کو نہیں جان سکتے۔ دیوی ماں ہر جگہ موجود ہے، وہ قدرت کاملہ رکھتی ہے، وہ رحیم ہے، کریم ہے، حاضر ناظر ہے۔ وہ کائنات کی کل قوت کا سرچشمہ ہے، کائنات میں ہر قوت کا مظہر ماں ہے، وہ زندگی ہے، وہ ذہانت ہے، وہ عشق و محبت ہے، وہ کائنات کے اندر ہے۔ اگرچہ اس سے الگ ہے، وہ موجود ہے، اس کو دیکھا اور جانا جا سکتا ہے (بالکل اسی طرح جس طرح پرم ہنس۔ شری رام کرشن نے اس کو دیکھا اور جانا) ماں کے تصور کو پختہ کر کے ہم ہر کام کر سکتے ہیں، وہ دعا کو بہت جلد قبول کرتی ہے۔

وہ کسی لمحہ بھی ہمارے سامنے خود کو ظاہر کر سکتی ہے۔ دیوی ماں کوئی بھی روپ اور نام دھارن کر سکتی ہے۔ ایسے کسی بھی تصور سے اس کی عبادت کر کے ہم آتما کو ساکھشتا کار کر سکتے ہیں، جس کا نہ کوئی روپ ہے نہ رنگ!

---

غبار خاطر

صفحہ ۲۸

جسم کے اندر مختلف خلیوں کا کل مجموعہ ایک ذات کہلاتا ہے لیکن ایک روح (انسان) ایک خلیے کی طرح ہے اور ان کا مجموعہ خدا ہے۔ پھر اس کے بعد جو کچھ ہے "کل" ہے۔ پُرسکون سمندر کل ہے۔ جب اس کے اندر لہریں اُٹھتی ہیں تو وہ دیوی ماں ہے، وہ زمانہ ہے، وہ فضائے بسیط ہے اور حرکت ہے۔ خدا ماں ہے اور اس کی دو خاصیتیں ہیں مشروط اور غیر مشروط۔ مشروط کی حیثیت سے وہ خدا ہے اور روح (انسان) ہے۔ غیر مشروط کی حیثیت سے وہ نامعلوم ہے اور اس کو جانا نہیں جاسکتا۔ خدا، قدرت اور روح جو کائنات کی مثلث ہیں یہی تثلیث ادویت ازم کا نظریہ ہے

بھگوان کرشن ماں کا ایک حصّہ، ایک قطرہ تھے۔ دوسرا قطرہ بدھ تھے اور تیسرا عیسیٰ۔ اگر ہم اپنی ماتاؤں کے اندر موجود ماں کی ایک چنگاری کی بھی پوجا کریں تو یہ ہمیں باعظمت بناتی ہے۔ اگر آپ عشق اور دانشوری چاہتے ہیں تو اس کی پوجا کیجئے۔



بدھوار - 3 جولائی

عام طور پر انسانی مذہب کی شروعات خوف سے ہوتی ہے۔ "خدا کا خوف فکر و ذہانت کی شروعات ہے" لیکن اس کے بعد اعلےٰ تصور آتا ہے "مکمل عشق و محبت خوف کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔" جب تک ہمیں گیان حاصل نہ ہو جائے، یہ نہ جانیں کہ ایشور کیا ہے۔ ہمارے اندر خوف کی علامتیں باقی رہتی ہیں۔ عیسیٰ نے ایک انسان کی حیثیت سے ناپاکیزگی کو دیکھا اور اس کی مذمت کی۔ لیکن خدا جو نامحدود حد تک بلند و بالا ہے، بے انصافی کو نہیں دیکھتا اور رنجیدہ نہیں ہوتا، مذمت کبھی اعلےٰ شے نہیں ہو سکتی۔ داؤد کے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے تھے، وہ خانۂ خدا تعمیر نہ کر سکا۔ [1]

ہمارے اندر جس قدر نیکی اور پاکیزگی بڑھے گی، اسی قدر زیادہ باہر ہم عشق، نیکی اور پاکیزگی کو دیکھ سکیں گے۔ دوسروں کی مذمت اور بُرائی کرنا دراصل اپنی مذمت اور بُرائی کرنا ہے۔ اپنے اندر نفس کو ہم آہنگ کیجئے (جو کہ آپ کر سکتے ہیں) نفس خود اپنے آپ کو آپ سے ہم آہنگ کرے گا۔ کسی سیال کی چھوٹی سے چھوٹی مقدار کو کسی دوسری مقدار کے ساتھ ہم آہنگ اور متوازن کرتا ہے۔ پانی کا ایک قطرہ کائنات میں توازن پیدا کر سکتا ہے۔ جو چیز ہمارے اندر نہیں ہے، اس کو ہم باہر نہیں دیکھ سکتے۔ کائنات کا ہم سے وہی تعلق ہے جو کہ ایک بڑے انجن کا چھوٹے انجن سے ہوتا ہے۔ چھوٹے انجن کے اندر کسی خرابی کو پاکر ہم جان لیتے ہیں کہ بڑے انجن میں خرابی ہے۔

دنیا کے اندر حقیقت میں ہر ایک کامیابی عشق و محبت سے حاصل ہوتی ہے۔ بُرائی اور نکتہ چینی

---

[1] بائیبل سیموئل باب XVII

غبار خاطر صفحہ 29.

سے کبھی فائدہ نہیں ہوتا۔ ہزاروں برس سے یہ بات آزمائی جاتی رہی ہے۔ مذمت اور برائی سے کبھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

ایک سچے ویدانتی کو ہر ایک کا ہمدرد اور غمگسار ہونا چاہیئے۔ وحدت وجود یا مکمل وحدت ویدانت کی اصل روح ہے۔ دویت وادی دو نظریوں کو ماننے والے قدرتی طور پر متعصب بن جاتے ہیں کیونکہ وہ اپنے ہی راستہ کو سچا سمجھتے ہیں۔ ہندوستان کے اندر وشنو لوگ جو کہ دویت وادی ہیں، انتہائی متعصب فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ شیوؤں میں دویت وادیوں کا ایک اور فرقہ ہے۔ جن میں ایک شخص گھنٹا کرن (جس کے کانوں سے گھنٹیاں بندھی تھیں) کی ایک کہانی مشہور ہے۔ وہ شیو کا اس قدر دیوانہ وار پجاری تھا کہ کسی دوسرے دیوتا کے نام تک کو سننا گوارا نہیں کرتا تھا۔ اس نے اپنے کانوں سے گھنٹیاں باندھ رکھی تھیں، تاکہ وہ بجتی رہیں اور کسی دوسرے دیوتا کا نام سنائی نہ دے سکے۔ اس کی اس قدر بھگتی دیکھ کر شو اس کو یہ اپدیش کرنا چاہتے تھے کہ شیو اور وشنو میں کوئی فرق نہیں ہے۔ چنانچہ شیو اس کے سامنے نصف شیو اور نصف وشنو بنکر آئے۔ اس وقت بھگت شیو مورتی کے سامنے دھوپ جلائے ہوئے تھا لیکن انتہا کرن کے اندر اس قدر تعصب تھا کہ جب اس نے دھوپ کے دھوئیں کو وشنو کی ناک کی طرف جاتے دیکھا تو اس کو انگلی سے بند کر دیا تاکہ وشنو خوشبو نہ سونگھ سکے۔

شیر جیسے گوشت خور جانور ایک ہی چھلانگ لگاتے ہیں پھر آرام میں پڑ جاتے ہیں لیکن غریب بیل تمام دن چلتا ہے۔ یہاں تک کہ چلنے کے دوران ہی وہ کھاتا اور سوتا ہے۔ ایک امریکی باشندہ چاول کھانے والے چینی قلی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جب تک فوجی طاقت کو غلبہ حاصل ہے، گوشت خوری جاری رہے گی۔ لیکن سائنس کی ترقی کے ساتھ جنگ و جدل کم ہو جائے گی اور اس وقت سبزی خوروں کا زمانہ ہوگا۔

---

خدا کے ساتھ عشق و محبت کرنے کے لئے ہم خود کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ذات اور نفس ذات۔ خدا نے مجھے بنایا اور میں نے خدا کو۔ ہم نے تصور میں خدا کو تخلیق کیا۔ ہم ہی ہیں، جنہوں نے اس کو اپنا آقا تسلیم کیا۔ ایشور نے ہمیں اپنا خادم نہیں بنایا۔ اگر ہم سمجھتے ہیں کہ ہم خدا کے ساتھ ہیں اور ہم اور وہ دوست ہیں تو اس سے مساوات اور آزادی ظاہر ہوتی ہے۔ جب تک آپ اس ابدی ذات سے ذرہ برابر بھی خود کو الگ رکھیں گے آپ کے اندر سے خوف دور نہیں ہو سکتا۔ کبھی ایسا احمقانہ سوال نہ کیجئے کہ اس سے دنیا کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ آپ دنیا کی فکر کیوں کرتے ہیں۔ صرف عشق و محبت کیجئے اور کسی دوسری طرف نہ دیکھئے، محبت کیجئے اور ہر قسم کی خیالی بھول بھلیوں کو بھول جائیے۔ عشق و محبت کا ایک جام پی کر بے خود بن جائیے، کہیئے "اور ایشور تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہے"۔ اور یہ کہتے ہوئے خود کو فنا کر دیجئے۔ عشق و محبت ہی خدا کا بہترین تصور ہے۔ بلی کو اپنے بچوں کو پیار کرتے دیکھ کر رک جائیے، اور دست بدعا ہو جائیے کیونکہ خدا وہاں پر ظاہر ہو چکا ہے۔ . . . . . . اس بات پر حرف بحرف یقین

کر لیجئے۔ پھر کہیئے "میں تو ہوں، میں تو ہوں"۔ کیونکہ ایشور کا ظہور (جلوہ) ہم ہر جگہ دیکھ سکتے ہیں، اس کی تلاش نہ کیجئے بلکہ دیکھئے۔ —————— "خدا کرے آپ زندہ رہیں، دُنیا کو روشنی دیں اور کائنات کی رُوح بنیں"۔



مطلق کی پوجا نہیں ہو سکتی، پس ہمیں مظاہر کی پوجا کرنی چاہیئے۔ یہ ظہور ہماری فطرت ہے، جیسے ہماری فطرت رکھتے تھے۔ وہ مسیح بن گئے۔ ہم بھی مسیح بن سکتے ہیں اور ہمیں بننا چاہیئے۔ مسیح اور بُدھ دو کیفیتوں کے نام ہیں۔ عیسیٰ اور گوتم دو شخصیتیں تھیں، جنہوں نے ان کیفیتوں کو حاصل کیا اور اس کے بعد وہ مسیح اور بُدھ بن گئے"۔ ماں اس کا اعلیٰ ترین مظہر ہے، عیسیٰ اور بُدھ کا درجہ بعد کا ہے۔ ہم خود اپنا ماحول پیدا کرتے ہیں اور پھر اسے چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آتما بے خوف اور نڈر ہے۔ اگر ہم بیرونی خدا کی پُوجا کریں تو یہ اچھا ہے۔ ہم صرف یہ نہیں جانتے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے جب ہم نفس کو پہچان جاتے ہیں تو ہماری سمجھ میں آجاتا ہے۔ عشق و محبت کا اعلےٰ ترین اظہار یگانگت ہے۔ ایک صُوفی شاعر نے کہا ہے۔

ایک وقت تھا جب میں عورت تھا اور وہ مرد
اسکے بعد بھی عشق بڑھتا رہا پھر نہ میں میں تھا نہ وہ وہ
موہوم طور پر صرف اس قدر یاد ہے کہ کبھی ہم دو تھے
لیکن ہم عشق و محبت میں کھو کر ہم ایک ہو گئے

گیان اَبدی طور پر موجود ہے اور وہ ایشور کے ساتھ ساتھ باقی ہے۔ جو شخص روحانی قوانین کو منکشف کرتا ہے وہ صاحب الہام ہے اور جو کچھ وہ کہتا ہے وہ الہام ہوتا ہے لیکن الہام بھی دائمی ہے۔ اس کو آخری نہیں سمجھا جا سکتا اور نہ اندھا بن کر اس کی پیروی کی جا سکتی ہے۔

ہندوؤں پر ان کے فاتحین برسوں سے یہ نکتہ چینی کرتے چلے آتے ہیں کہ ہندو خود اپنے دھرم پر نکتہ چینی اعتراض کرتے ہیں اور یہ چیز انہیں آزاد کرتی ہے۔ ان کے غیر ملکی حکمران کی قید و بند کو جانے بغیر ان پر حملے کرتے ہیں۔ ہندو دُنیا میں سب سے زیادہ مذہبی قوم ہیں۔ حقیقت میں ان کے ہاں کُفر کا کوئی مفہوم نہیں ہے کسی بھی ڈھنگ سے پوتر چیزوں کے بارے میں بات کرنا ان کے نزدیک خود ایک تقدیس ہے۔ نہ ہی وہ پیغمبروں اور کتابوں کا مصنوعی احترام کرتے ہیں، نہ ہی اذنی تقوی کا۔

چرچ مسیح کو اپنے مطابق بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ خود مسیح کے مطابق بننے کی کوشش نہیں کرتا۔ اسی طرح ان تحریروں کو اپنے مطالب اور مقصد کے مطابق معنی پہنائے جاتے ہیں۔ پس کتابوں پر انحصار نہیں کیا جا سکتا، اور کتابوں پر ایمان رکھنا بدترین قسم کی بُت پرستی ہے، جو ہمیں پابند زنجیر کرتی ہے۔ سائینس، مذہب

اور فلسفہ سب کی کتاب سے تصدیق کرنا ایک انتہائی خوف ناک استبداد ہے۔ یہ استبداد پروٹسٹنٹ بائیبل (Protestant Bible) کا ہے۔ عیسائی ملکوں کے اندر ہر ایک آدمی خود کو اسقف سمجھتا ہے اور اپنے سر پہ ایک کتاب رکھے ہوتا ہے اور اس کے باوجود آدمی زندہ ہے، ترقی کرتا ہے! کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انسان ہی خُدا ہے ......؟

کل کائنات میں انسان اشرف المخلوقات ہے۔ انسان سے اعلیٰ تصوّر ہم خدا کا بھی نہیں کر سکتے۔ پس ہمارا خدا انسان ہے اور انسان خدا ہے۔ جب ہم رُوحانی طور پر ترقی کرتے ہیں اور آگے نکل جاتے ہیں، اور ہم کسی اعلیٰ ترین عرفانی منزل تک پہنچ جاتے ہیں، تب ہم اپنے دماغ، اپنے جسم اور اپنے تصوّر سے بلند و بالا اُٹھ جاتے ہیں اور اس دُنیا سے ترک تعلق کر لیتے ہیں۔ جب ہم مطلق (کل) تک پہنچتے ہیں تو دنیا میں ہمارا وجود باقی نہیں رہتا۔ انسان دُنیا میں سب سے زیادہ بلند مرتبہ ہے۔ ہم جانوروں کو صرف مشابہت سے شناخت کرتے ہیں۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں اور جو کچھ محسوس کرتے ہیں، اس سے ان کا موازنہ کرتے ہیں۔

شعور اور آگاہی ہمیشہ ایک سی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی اس کا ظہور زیادہ ہوتا ہے اور کبھی کبھی کم۔ اس کا واحد ذریعہ ہمارے خود اپنے اندر ہے اور یہ وہیں سے ہی حاصل کرنی ہوتی ہے۔

---

ہر قسم کی شاعری، مصوری اور موسیقی احساس ہے۔ جس کا اظہار، الفاظ، رنگ اور آواز کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔

---

مبارک ہیں وہ لوگ جن کے گناہ بہت تیزی کے ساتھ ان پر آشکار ہو جاتے ہیں اور وہ ان کی تلافی کرتے ہیں۔ ان کا حساب کتاب بہت جلد صاف ہو جاتا ہے۔ لعنت ہو اُن لوگوں پر جن کی سزا معرض میں پڑی ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ زیادہ بڑی سزا ہے۔

جو لوگ ہم آہنگی (سمتا) حاصل کر لیتے ہیں وہ گویا خدا میں فنا اور جذب ہو جاتے ہیں۔ خودی کو خودی کے ذریعہ ہلاک کرنا تمام لذت ہے۔ اس لئے عشق و محبت ہی دستورِ حیات ہے۔ اس درجہ کو حاصل کرنا گویا خود کو انسان کامل بنانا ہے۔ لیکن جس قدر زیادہ ہم مکمل بن جاتے ہیں اُسی قدر کم (نام نہاد) کام ہم کر سکتے ہیں۔ سادھو لوگ دیکھتے اور جانتے ہیں کہ یہ دنیا بازیچہ اطفال ہے اور وہ کسی چیز کے لئے پریشان نہیں کرتے۔

ضرب لگانا آسان ہے لیکن ہاتھ کو روکنا ایک انتہائی شدید مشکل کام ہے۔ خود کو خدا کی رضا و رغبت پر چھوڑ کر دُعا مانگے او، خدا میں تیری پناہ چاہتا ہوں اور اس کے بعد انتظار کیجئے کہ وہ کیا کرتا ہے۔

---

غبارِ خاطر صفحہ ۳۲

# وصلِ خُدا

شکروار۔ 5 رجولائی

جب تک آپ ہر لمحہ تبدیلی پر آمادہ نہیں ہوں گے، آپ کبھی حق وصداقت کو نہیں دیکھ پائیں گے۔
لیکن آپ کو حق وصداقت کی تلاش کے لئے تیار اور آمادہ رہنا چاہیئے۔

چرواکون کا ہندوستان میں ایک انتہائی قدیم فرقہ ہے۔ وہ کٹر مادیت پرست تھے۔ اب وہ تقریباً ختم ہو چکے ہیں اور ان کی زیادہ تر کتابیں ضائع ہو چکی ہیں۔ ان کا دعویٰ تھا کہ روح چونکہ جسم کی پیداوار ہے۔ اسلئے رُوح اور اسکی طاقتیں جسم کے ساتھ مرجاتی ہیں۔ نیز یہ کہ اس کے بعد رُوح کی بقا کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ وہ استخراجی شعور دا آگاہی (گیان) کے منکر ہیں اور صرف شعور کے ذریعہ ادارک کو ہی تسلیم کرتے ہیں۔



سمادھی کیا ہے؟ جب انسان اور خدا ایک ہوں یا یوں کہیئے سمادھی نام ہے ہم رنگی ویکسانیت پیدا کرنے کا۔



مادیت پرستوں کا کہنا ہے کہ آزادی اور استغنا کی باتیں محض دھوکہ دہی ہے۔ نظریہ پرستوں کا کہنا ہے کہ وہ آواز جو غلامی اور بند وغم کو بیان کرتی ہے، دھوکہ ہے۔ ویدانتیوں کا کہنا ہے کہ ایک ہی وقت میں آپ آزاد بھی ہیں اور غلام بھی۔ کیونکہ آپ خاکی طور پر کبھی آزاد نہیں ہو سکتے۔ لیکن .... برخلاف اس کے آپ رُوحانی طور پر ہمیشہ ہمیشہ آزاد و بے نیاز ہیں۔
غلامی اور آزادی دونوں سے ماورا رہیئے۔

ہم شیو ہیں۔ ہم شعور سے پرے ایک لافانی شعور اور آگاہی ہیں۔ نامحدود قوت ہر ایک کی پُشت پناہ ہے۔ ماں کی پُوجا کیجئے۔ یہ طاقت آپ کو بن جائے گی۔

ہندو ایک اپنی دُعا میں کہتے ہیں۔" او مانا تو واک (فصاحت خوش بیانی) عطا کرتی ہے۔ میرے ہونٹوں پر فصاحت بنکر خود تیرا وجود آتا ہے۔"

اے وہ ماں جس کی آواز بجلی کی گرج میں ہے، میرے اندر سما جا۔ کالی تم اناوی ہو (لافنا) تیری طاقت ناقابلِ مزاحمت ہے، تو شکتی ہے تو قوت ہے۔

---

سنیچر وار۔ 6 ر جولائی

(آج ہم نے ویاس کے ویدانت سوتر پر شنکر آچاریہ کا تبصرہ سُنا۔)

ادم تت ست

شنکر آچاریہ کے قول کے مطابق کائنات کی دو صورتیں ہیں۔ ایک مَیں اور دوسری تُو۔ دونوں کے درمیان اس قدر تضاد ہے جس قدر روشنی اور تاریکی کے درمیان پس اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ کسی ایک کو دُوسری سے ماخوذ نہیں کہا جا سکتا۔ ذات کو صفات کے اُوپر رکھا گیا ہے۔ ذات ہی صرف حقیقت ہے اور دُوسری محض مظہر۔ مخالف نظریہ ناقابلِ مدافعت ہے۔ مادہ اور بیرُونی دنیا ہے لیکن رُوح ایک خاص حالت میں ہے۔ حقیقت میں وجود صرف ایک کا ہے۔

ہماری تمام دنیا کا وجود حق اور ناحق سے ہے، دونوں کا جوڑ ہے۔ سنسار (زندگی) ہمارے متضاد طاقتوں کے عمل کا نتیجہ ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح قوتوں کے متوازی الاضلاع میں کشیدگی کی حالت پائی جاتی ہے۔ دُنیا خدا ہے اور حقیقی ہے۔ لیکن یہ وہ دنیا نہیں ہے جو ہم دیکھتے ہیں۔ بالکل اس طرح جس طرح صدف (سیپی) کے اندر چاندی دِکھائی دیتی ہے لیکن حقیقت میں ہوتی نہیں۔ اسی کو ادھیاس یا ایک چیز کو دوسری چیز کے اُوپر رکھنا کہتے ہیں۔ یعنی ایک متعلقہ وجود جس کا انحصار ایک حقیقی وجود پر ہو جس طرح ہم ایک چیز کو دیکھتے ہیں، پھر اس کے بعد اس کا تصوّر کرتے ہیں کیونکہ ہمارے لئے زمانہ کا وجود ہے، مگر وہ وجود حقیقی نہیں ہے یا بعض سمجھتے ہیں یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح ہم پانی کے اندر گرمی کا تصوّر کریں، جو کہ پانی سے تعلق نہیں رکھتی پس حقیقت میں یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے چیز ہے۔ کوئی شے ایسی جگہ رکھ دی جائے، جہاں سے اس کا تعلق نہ ہو۔ ہم حقیقت کو دیکھتے ہیں، لیکن جس چیز کے ذریعہ دیکھتے ہیں، اس سے وہ مسخ ہو کر سامنے آتی ہے۔

آپ ظاہری حیثیت میں بھی خود اپنے آپ کو پہچان سکتے ہیں۔ جب ہم ایک کو دُوسری چیز سمجھنے
کی غلطی کرتے ہیں تو سامنے کی چیز کو حقیقی سمجھ لیتے ہیں۔ اَن دیکھی چیز کو ہرگز حقیقی نہیں سمجھتے۔ اس طرح
ہم باطن کو ظاہر سمجھ لیتے ہیں۔ آتما کبھی جسم نہیں بن سکتی، روح تحت الشعور رہے۔ باہری شعور اس
کے ذرائع ہیں۔ باطن کے اندر ظاہر کی طاقت متحرک ہوتی ہے جس سے کوئی شخص خود کو جان لیتا ہے کہ "میں
ہوں"۔ لیکن باطن خود اپنے ظاہر کی خودی ہے۔ رُوح باشعور کی ہرگز نہیں۔ تاہم ایک نظریہ کو آپ دوسرے
کے اُوپر لاد سکتے ہیں، جیسے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ "آسمان نیلا ہے"، تو آسمان محض خود ایک تصوّر ہے۔
ایسے سمجھنے میں علم اور لاعلمی دونوں موجود ہیں لیکن خود پر لاعلمی کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ متلازم علم اچھا ہوتا ہے کیونکہ
یہ کل علم کی طرف لے جاتا ہے لیکن نہ تو شعور کا علم نہ روح کا یہاں تک کہ نہ ویدوں کا علم سچا ہے۔ کیونکہ یہ سب علوم
متلازم علم کے دائرہ میں آتے ہیں۔ سب سے پہلے اس وہم فریب کا پردہ چاک کیجئے کہ "میں جسم ہوں" اس وقت ہم حقیقی
علم کی تلاش کر سکتے ہیں۔ آدمی کا علم صرف ایک اعلےٰ درجہ کا علم حیوان ہے۔



ویدوں کے ایک حصّہ میں کرم کانڈ اور رسومات کا بیان ہے اور دُوسرے حصّہ میں برہم ودّیا (علم
خدا) اور مذہب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس حصّہ میں وید اپنے آپ کو پہچاننے کی تعلیم دیتے ہیں اور چونکہ وہ
مکمل ہیں، اس لئے ان کا علم حقیقی علم تک پہنچنے کا علم ہے۔ مطلق کے علم کا اظہار نہ تو کسی کتاب پر ہے نہ کسی اور
چیز پر، یہ خود اپنی جگہ "کُل" ہے۔ خواہ کتنا ہی مطالعہ کریں، یہ علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ کوئی تھیوری نہیں ہے،
بلکہ یہ احساس ہے۔ شیشہ سے گرد کو صاف کیجئے، اپنے دلوں کی صفائی کیجئے۔ ایک ہی جھلک میں آپ جان جائیں
گے کہ آپ برہم ہیں۔

خدا حاضر ناظر ہے، نہ وہ پیدا ہوا نہ اس کو موت ہے، نہ اس کو کوئی تکلیف یا دُکھ ہوتا ہے،
نہ اس کو قتل کیا جا سکتا ہے اور نہ تبدیل۔ نہ وہ اچھا ہے نہ بُرا۔ سب کچھ برہم ہے۔ اگر ہم اس کو سانپ سمجھ لیں تو اس
میں غلطی ہماری ہے۔ ہم اچھے کام اس وقت سرانجام دے سکتے ہیں جب ہم خدا سے عشق و محبت کریں۔ ہمارے عشق و
محبت میں اس کی جھلک و عکس ہوتا ہے! ایک قاتل بھی خدا ہو سکتا ہے۔ آپ نے اُسے خدا سے شناسا کرانا ہے
اس کا ہاتھ تھام لیجئے اور اسے حقیقت سے روشناس کرایئے۔

رُوح کی کوئی ذات نہیں۔ یہ سمجھنا کہ اس کی کوئی ذات ہے، محض دھوکہ ہے۔ یہی صورت زندگی اور
موت کی ہے یا کسی حرکت یا علم کی ہے۔ آتما کبھی تبدیل نہیں ہوتی، نہ وہ آتی ہے اور نہ جاتی ہے۔ وہ خود اپنے
تمام تر مظاہر کی ابدی گواہ ہے لیکن ہم اسے مظاہر سے تبدیل کرتے ہیں، جو ایک ابدی دھوکہ ہے جس کی نہ ابتدا

غبار خاطر — صفحہ ۳۵

ہے نہ انتہا اور جو ہمیشہ جاری ہے، تاہم وید ہماری سطح تک اُتر کر ہمیں تعلیم دیتے ہیں کیونکہ اگر وہ اعلےٰ ترین حقیقت کو اعلےٰ ترین طریقے پر ہمیں نہ بیان کرتے تو ہم اس کو سمجھ نہیں سکتے تھے۔

بہشت کا تصوّر محض ایک توہم ہے، جو ہماری اپنی خواہش کا نتیجہ ہے اور خواہش ایک بندھن ہے، ایک تنزل ہے۔ سوائے خدا کے کسی اور چیز تک رسائی کی کوئی کوشش نہ کیجئے۔ کیونکہ اگر ہم ایسا کریں گے تو بدی دیکھنے کو ملے گی۔ کیونکہ اس طرح ہم جو کچھ دیکھتے ہیں اس پر فریب کا پردہ ڈال دیتے ہیں اور اس وقت ہمیں بدی نظر آتی ہے۔ ان دھوکوں سے آزادی حاصل کیجئے، خوش نصیب بنئے کیونکہ تمام فریبوں کے خاتمہ کا نام آزادی ہے۔

ایک طرح سے ہر انسان برہم سے واقف ہے، وہ جانتا ہے "مَیں ہوں"۔ لیکن آدمی جو کچھ ہے وہ خود نہیں سمجھتا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ہم ہیں، لیکن یہ نہیں جانتے کہ کیوں ہیں۔ تمام تر سطحی وضاحتیں جزوی طور پر سچائیاں ہیں لیکن ویدوں کا عطر اور خوشبو یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کے اندر جو آتما ہے وہ برہم ہے۔ ہر ایک جاندار پیدا ہوتا ہے، بڑھتا ہے، مرجاتا ہے، ظاہر ہوتا ہے، جاری رہتا ہے اور غائب ہوجاتا ہے۔ خود ہمارا احساس ویدوں سے بعید ہے۔ کیونکہ خود ان کا انحصار بھی اسی پر ہے۔ ابعید کا فلسفہ ہی اعلےٰ ویدانت کا فلسفہ ہے۔

یہ کہنا کہ کائنات کی کوئی ابتدا ہے تمام فلسفہ کی جڑوں پر کلہاڑا چلانا ہے۔

مایا کائنات کی شکتی ہے۔ مضمر اور متحرک۔ جب تک دیوی ماں ہمیں رہائی نہ دلائے اُس وقت تک ہم آزاد نہیں ہوسکتے۔

کائنات اس لئے ہے کہ ہم اس سے لطف دوبالا حاصل کریں لیکن کوئی چیز طلب نہ کریں۔ طلب و تمنا ایک کمزوری ہے۔ طلب و تمنا ہمیں حقیر بناتی ہے لیکن ہم راجہ کے بیٹے ہیں، بھکاری نہیں ہیں۔

اتوار۔ 7 جولائی (صبح)

نامحدود مظاہر خود کو جزو بناتے ہیں تقسیم کئے ہوئے، لیکن وہ نامحدود باقی رہتے ہیں اور اس کا ہر ایک حصّہ نامحدود ہے۔[1]

---

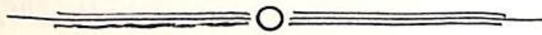
[1] نامحدود ایک ہے اس کا ثانی نہیں، اسکو دیکھا نہیں جاسکتا، نہ ظاہر ہوتا ہے، نامحدود مظاہر سے سوامی جی کا مطلب ان کائناتوں سے ہے جنہیں دیکھا جاسکتا ہے اور نہیں بھی اگرچہ یہ لامحدود شکلوں سے بنتی ہے جو اپنی فطرت کے اعتبار سے محدود ہوتی ہیں پھر بھی مجموعی طور پر یہ ہمیشہ نامحدود رہتی ہے اسلئے اس کا ہر ایک حصّہ نامحدود ہے کیونکہ اس کا کل کے ساتھ تعلق ہے۔

برہم دو شکاوں میں ایک ہی رہتا ہے۔ قابلِ تبدیل اور ناقابلِ تبدیل، قابلِ اظہار اور ناقابلِ اظہار۔ سمجھ لیجئے کہ عالم اور علم ہی ایک ہی ہیں۔ یہ کائنات عالم، علم اور جاننا کی تثلیث ہے۔ یوگی خود اپنی ہی شکتی کے ذریعہ ہی خدا کو دیکھ پاتا ہے۔

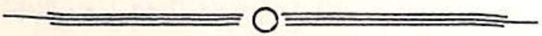
جسے ہم قسمت اور قدرت کہتے ہیں، خدا کی رضا ہے۔

جب تک حظ اٹھانے کا سلسلہ باقی رہتا ہے، غلامی باقی رہتی ہے۔ صرف ادھورا پن ہی لطف اٹھا سکتا ہے کیونکہ لطف اٹھانا خواہش کو پورا کرنا ہے۔ انسانی روح پراکرتی سے لطف اٹھاتی ہے۔ پراکرتی روح اور ایشور کے پیچھے جو حقیقت ہے، وہ برہم ہے لیکن یہ (برہم) اَن دیکھا ہے۔ جب تک ہم اس کو پہچان نہ لیں اس کو دیکھ نہیں سکتے۔ اس کو پرمتھنا یا رگڑ کے ذریعہ ہی پہچانا جا سکتا ہے کہ جس طرح ہم رگڑ سے آگ پیدا کرتے ہیں جسم لکڑی ہے 'اوم' نام پر دھیان جمانے سے اس جسم سے روشنی پیدا کرنی ہے وہ روشنی جو کہ برہم کا گیان ہے، روح کے اندر پھوٹ نکلتی ہے۔

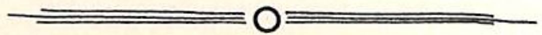
تپ کے ذریعہ اس کی جستجو کیجئے، جسم کو سیدھا رکھئے، تن کر بیٹھیئے اور اندریوں کو من میں دفن کر دیجئے۔ کرم اندریوں کے مراکز یعنی گیان اندریاں اندر ہیں اور ان کی کرم اندریاں باہر۔ ان کو من میں لیجئے اور دھارنا (یکسوئی قلب) کے ذریعہ من کو دھیان پر لگا دیجئے۔ خدا کائنات میں اسی طرح حاضر ناظر رہتا ہے، ہر جگہ موجود ہے جس طرح دودھ کے اندر مکھن موجود ہوتا ہے لیکن رگڑ سے اسکو ایک جگہ ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح دودھ کو بلوتے سے مکھن نکل آتا ہے پس دھیان سے ہی من کے اندر برہم کا احساس اور ادراک ہوتا ہے ہندوؤں کا تمام تر فلسفہ کہتا ہے کہ ایک چھٹی حس بھی ہوتی ہے۔ لاشعور اور اس کے ذریعہ سے دھیان حاصل ہوتا ہے۔



کائنات حرکت ہے۔ ظاہر ہے۔ اضافی حرکت سے ہر چیز کا خاتمہ ہو جائے گا، تب سکون و قرار آئے گا اور پھر اس کے بعد یہی سلسلہ شروع ہو جائے گا۔



جب تک آدمی کا جسم ہے، یعنی جب تک آدمی خود کو اپنے جسم کے ذریعہ پہچانتا ہے، وہ خدا کو نہیں دیکھ سکتا۔



غبارِ خاطر صفحہ ۳۷

اتوار (شام)

ہندوستان کے اندر چھ مکاتیب فلسفہ ہیں اور چونکہ وہ ویدوں پر یقین رکھتے ہیں، ان کو قدامت پرست کہا جاتا ہے۔

اُپنشدوں کے مقابلہ میں ویاس کا فلسفہ انتہائی بہترین ہے، اس نے اس کو سوتروں کی شکل میں لکھا ہے یعنی فعل اور فاعل کے بغیر الجبرائی علامتوں میں۔ اس سے اس میں اسی قدر ابہام پیدا ہوگیا ہے کہ سوتروں سے دویت مت، وششٹ ادویت اور ویدانت کا اظہار ہوتا ہے اور ان مختلف مکاتبِ فکر کے تمام بڑے بڑے شارحین "دیدہ دانستہ دروغ بیان تھے"۔ کیونکہ انہوں نے ان کی عبارت کو اپنے فلسفہ کے مطابق خاص پیرائے میں بیان کیا۔

اُپنشدوں کے اندر کسی آدمی کے کارناموں کے بارے میں مشکل ہی سے کوئی تاریخ ملے گی لیکن تمام دوسری کتابیں زیادہ تر ذاتی تاریخیں ہیں۔ وید تقریباً پورے طور پر فلسفہ سے لبریز ہیں۔ فلسفہ کے بغیر مذہب اوہام پرستی بن جاتا ہے اور فلسفہ بغیر مذہب کے خشک فلسفہ بن جاتا ہے۔

وششٹ ادویت بھی مشروط ادویت ہے۔ اس کے سب سے بڑے علمبردار رامانج تھے۔ وہ کہتے ہیں۔ "ویدوں کے دودھ کے سمندر میں سے ویاس نے فلسفہ کا یہ مکھن نکالا ہے تاکہ انسانیت کو زیادہ فائدہ پہنچایا جاسکے"۔ پھر وہ کہتے ہیں تمام اوصاف اور تمام خوبیاں خالق کائنات برہم کی ہی ہیں۔ وہ عظیم تر پرش ہے۔

مادھو آچاریہ کٹر دویت وادی تھے۔ ان کا دعوےٰ ہے کہ عورتیں تک بھی ویدوں کا مطالعہ کرسکتی ہیں۔ انہوں نے زیادہ تر پرانوں سے حوالے دیئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں برہم سے مُراد وشنو ہے شیو بالکل نہیں۔ کیونکہ وشنو کے ذریعہ ہی مکتی حاصل ہوسکتی ہے۔

---

سوم وار۔ 8 رجولائی

مادھو آچاریہ کی شرح میں دلائل سے کوئی کام نہیں لیا گیا۔ یہ سب کی سب ویدوں کے اندر کہی گئی باتوں کا ہی اظہار ہے۔

رامانج کا کہنا ہے کہ ویدوں کا مطالعہ مقدس ترین مطالعہ ہے۔ تینوں بڑی جاتیوں کے بچے شودر نہیں[1]۔ انہیں آٹھ تو برس کی عمر سے ہی مطالعہ کا آغاز کرنا چاہیئے جس کا مطلب ہے اس عمر سے انہیں گورو دھارن کرنا چاہیئے اور ویدوں کو لفظ بہ لفظ پڑھنا چاہیئے۔ مکمل لحن کے ساتھ پڑھنا چاہیئے اور تلفظ بالکل صحیح ہونا چاہیئے۔

---

[1] یہ یگیوپویت (جنیو) شوتر پہننا

---

غبارِ خاطر

جپ جاپ کا مطلب مقدّس نام کو بار بار دُہرانا ہے اس کے ذریعہ بھگت نا محدود تک پہنچ جاتا ہے۔ قربانی اور رسُومات کا سفینہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ ہمیں جس چیز کی زیادہ جاننے کی ضرورت ہے وُہ برہم ہے جو تنہا آزادی ہے۔ مُکتی کیا ہے، جہالت کا خاتمہ اور وہ اسی وقت نصیب ہوتا ہے، جب ہم برہم کو جان جاتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ ویدانت کے معنی سمجھنے کے لئے ان تمام رسُومات کو پُورا کریں، اوم کا جاپ کافی ہے۔

عدم مساوات اور فرق کو دیکھنا تمام تر مصیبتوں کی جڑ ہے اور جہالت فرق دیکھنے کی وجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسُومات کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ان کے نتیجہ میں عدم مساوات کا نظریہ فروغ پاتا ہے۔ آپ کچھ چیزوں کو ختم کرنے اور کچھ کو حاصل کرنے کے لئے رسومات انجام دیتے ہیں۔

برہم کا کوئی کرم نہیں ہے۔ آتما برہم ہے اور ہم آتما ہیں۔ اس گیان سے تمام خطائیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اسی کو سُننا ہے، چاہے ذہانت کے ذریعہ حاصل کیجئے اور انجام کار اسی کو ہی محسوس کیجئے۔ سوچ بچار سے دلیل جنم لیتی ہے اور دلیل کے ذریعہ اس گیان کو ہم اپنے اندر قائم کرتے ہیں۔ دلیل کا مطلب مسلسل سوچ بچار اور غور و فکر کے ذریعہ اس کو زندگی کا لازمی جزو بنانا ہے۔ یہ مسلسل سوچ بچار یا دھیان تیل کی دھار کی طرح ہے کہ جس پر ایک جہاز کے بعد دُوسرا جہاز تیرتا چلا جاتا ہے۔ دھیان دن رات اسی خیال میں دل کو مصروف رکھتا ہے اور آزادی حاصل کرنے میں ہمارا معاون ہوتا ہے۔ ہمیشہ سوہنگ سوہنگ پر دھیان لگائیے۔ ایسا کرنا مکتی حاصل کرنا ہے۔ اسی کا دن رات جاپ کیجئے۔ اس سے بالآخر آپ اپنے آپ کو جان جائینگے کہ خدا کی اسی مسلسل اور مکمل یاد کو بھگتی کہتے ہیں۔

تمام اچھے کاموں سے بھگتی میں بلا واسطہ امداد ملتی ہے۔ بُرے کاموں کے مقابلہ میں اچھے کام اور نیک خیالات کم فرق پیدا کرتے ہیں پس اسی طرح وہ بلا واسطہ مُکتی (نجات) کی طرف لے جاتے ہیں۔ کام کیجئے لیکن نتیجہ ایشور پر چھوڑ دیجئے۔ صرف گیان ہی ہمیں مکمل بنا سکتا ہے۔ وہ جو بھگتی کے ساتھ حق و خدا کو مانتا ہے۔ اس پر ہی حق خدا خود کو ظاہر کر دیتا ہے۔

---

ہم لیمپ کی مانند ہیں اور جسے زندگی کہتے ہیں۔ وہ ہمارا جلنا ہے۔ جب آکسیجن ختم ہو جاتی ہے تو لیمپ بجھ جاتا ہے ہم جو کچھ کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ لیمپ کو صاف رکھیں۔ زندگی ایک ماحصل اور مرکب ہے اور اسی صورت میں اس کو عناصر میں تحلیل کیا جا سکتا ہے۔

---

منگل وار - 9 رجولائی

انسان آتما کی حیثیت سے حقیقی طور پر آزاد ہے اور آدمی کی حیثیت سے مجبور اور پابند ہر جسمانی حالت سے تبدیل ہونے والا انسان کی حیثیت سے وہ ایک ایسی مشین کی مانند ہے۔ جس کے پاس آزادی کا تصور ہے لیکن یہ انسانی جسم بہترین ہے اور دماغ اعلیٰ ترین دماغ ہے۔ جب انسان آتما کی حالت تک پہنچ جاتا ہے، وہ ایک جسم اختیار کر سکتا ہے جو کہ اس کے لئے موزوں ہو۔ وہ قاعدہ قانون سے بالاتر ہوتا ہے۔ یہ ایک کلیہ ہے اور اس کو ثابت کیا جانا چاہیئے۔ ہر ایک کو خود اپنے لئے اس کو ثابت کرنا چاہیئے۔ ہم خود کو مطمئن کر سکتے ہیں لیکن دوسروں کو مطمئن نہیں کر سکتے۔ راج یوگ ہی صرف مذہب کی ایک ایسی اساس ہے۔ جس کا مظاہرہ کیا جا سکتا ہے اور صرف مجھے جو کچھ تجربہ اور اینٹھوسے حاصل ہوا ہے۔ میں اس کی ہی تلقین کرتا ہوں۔ سیب کی پوری پختگی ذات کا مشاہدہ ہے لیکن مشاہدہ ذات دلائل کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

کام سے قلب کی صفائی ہوتی ہے اور اس سے ودیا (ذہانت) حاصل ہوتی ہے۔ بدھ کہتے ہیں، انسانوں اور حیوانوں کی بھلائی کے لئے کام کرنا ہی صرف کام ہے۔ براہمنوں کا کہنا ہے کہ پوجا پاٹ اور رسومات کی ادائیگی بھی ایسے ہی کام ہیں اور اس سے باطن کی صفائی ہوتی ہے۔ شنکر آچاریہ کا دعویٰ ہے کہ تمام کام اچھے ہوں یا بُرے گیان کے خلاف نہیں۔ جن کاموں سے جہالت کی طرف میلان بڑھتا ہو گناہ ہیں براہ راست نہیں بلکہ اسباب کی حیثیت سے۔ کیونکہ ان کے نتیجہ میں تامس اور راجس بڑھتے ہیں۔ صرف ستو سے ہی ودیا آتی ہے۔ نیک کام گیان پر سے پردہ اُٹھا دیتے ہیں اور صرف گیان کے ذریعہ ہی ہم ایشور کو دیکھ سکتے ہیں۔

گیان کو کبھی تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا صرف انکشاف کیا جا سکتا ہے اور ہر ایک وہ انسان جو ایک عظیم انکشاف کرتا ہے، صاحب وجدان ہے۔ جب انکشاف محض روحانی انکشاف ہو تو ہم اسکو پیغمبر کہتے ہیں اور جب وہ مادی دنیا میں انکشاف کرتا ہے تو ہم اس کو ایک سائنس دان کہتے ہیں اور ہم زیادہ اہمیت اوّل الذکر کو دیتے ہیں اگرچہ تمام سچائیوں کا منبع ایک ہے۔

شنکر آچاریہ کہتے ہیں۔ برہم تمام تر گیان کی حقیقت اور عطر ہے۔ نیز یہ کہ عالم حصول علم اور علم جیسے تمام مظاہرات محض برہم ہی کے تصوّرات ہیں۔ رامانج ضمیر کی بیداری کو ایشور سے تعبیر کرتے ہیں۔ حقیقی توحید پرست کچھ تعبیر نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ کسی معنی میں وجود کو بھی نہیں۔ رامانج کہتے ہیں کہ اصل گیان ہی ایشور ہے۔ غیر متفرق شعور میں جب فرق پیدا ہوتا ہے تو یہ دُنیائے رنگ وبو وجود میں آتی ہے

بُدھ مت جو کہ دنیا میں انتہائی فلسفیانہ مذہب ہے۔ ہندوستان کے اندر عوام الناس اور عام لوگوں کے ذریعہ پھیلا۔ اس وقت آریوں کا کس قدر حیرت انگیز تمدن رہا ہوگا جبکہ ۲۵ سو برس قبل انہوں نے ایسے نظریات کو قبول کیا۔!

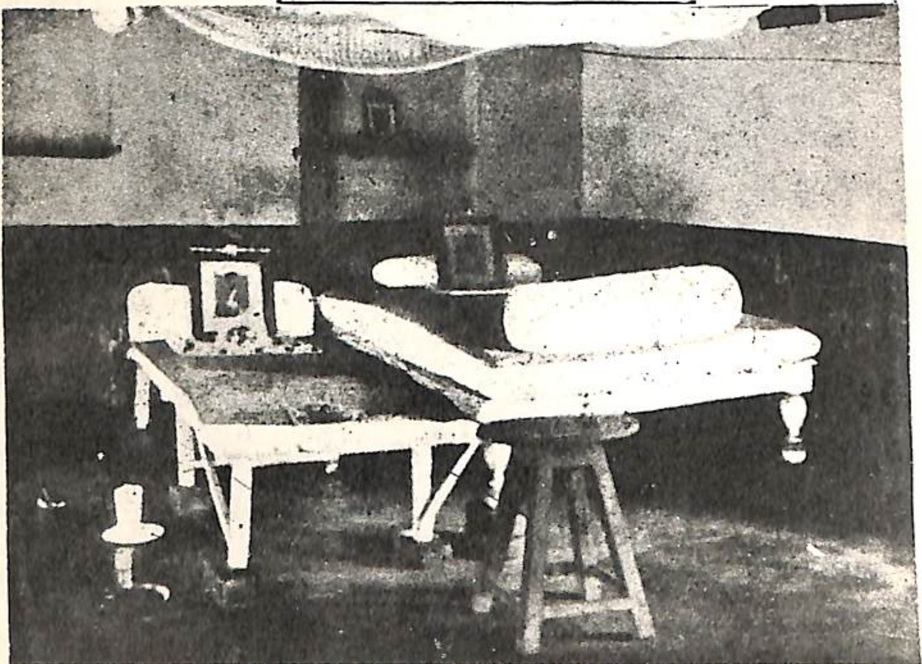
بھگوان بدھ بھارت کے تنہا ایسے فلاسفر تھے جو کہ ذات پات کو تسلیم نہیں کرتے تھے اور ان کے پیروؤں میں سے کوئی ہندوستان میں باقی نہیں رہا۔ باقی تمام فلاسفروں نے کم و بیش سماجی تعصّبوں کو فروغ دیا۔ خواہ کیسی قدر اونچی اڑان انہوں نے کی ہو لیکن ان کے اندر تھوڑی سی حرص رہی۔ میرے گورو کہا کرتے تھے کہ گِدھ آسمان میں خواہ کتنی ہی بلندی پر کیوں نہ اُڑتا ہو۔ اس کی نگاہ ہمیشہ زمین پر پڑے ہوئے بدبودار سڑے ہوئے گوشت پر لگی رہتی ہے۔

---

قدیم ہند و حیرت انگیز اسکالر تھے۔ وہ حقیقی طور پر زندہ انسائیکلوپیڈیا تھے۔ ان کا قول ہے کہ علم کتابوں میں اور پیسہ دوسرے کی جیب میں قطعی طور پر نہ تو علم ہے اور نہ پیسہ۔

شنکر آچاریہ کو بہت سے لوگ شو کا اوتار مانتے ہیں۔

---



دکشنیشور مندر میں شری رام کرشن پرم ہنس کا کمرہ

غبار خاطر

صفحہ ۴۱

# رُوحِ مذہب

بُدھ وار- 10 جولائی

ہندوستان میں ساڑھے چھ کروڑ مسلمان ہیں، ان میں سے کچھ صُوفی ہیں[1]۔ صُوفی انسان ہی کو خُدا کہتے ہیں اور انہیں کے ذریعہ یہ تصور یورپ میں پہنچا۔ ان کا کہنا ہے "مَیں ہی حق و صداقت ہوں" لیکن ان کا اصول ایک علم، علمِ سینہ ہے جو عام فہم ہے۔ حالانکہ حضرت محمدؐ اس کے قائل نہیں تھے۔

"حشیشین"[2] (باطنی فرقہ کے فدائی) کا مطلب دھوکہ سے قتل کرنا بن گیا ہے کیونکہ مسلمانوں کے ایک قدیم فرقہ کے لوگ اپنے عقائد کے مخالفین کو قتل کر دیا کرتے تھے۔

ہندو یقین کرتے ہیں کہ دُنیا میں ایشور کے دس اوتار آئیں گے، تو اب تک آ چکے ہیں اور دسواں ابھی آنا ہے۔

---

کبھی کبھی شنکر آچاریہ غلط استدلال سے کام لیا کرتے تھے تاکہ یہ ثابت کر سکیں کہ روحانی گرنتھ کے

---

[1] ہندوستان میں اسلام پر ہندوؤں کے اثر سے صوفی فرقہ پیدا ہوا۔

[2] گیارہویں صدی میں سیریا کے ایک علاقہ میں ایک مذہبی اور صوفی فرقہ پیدا ہوا۔ جو اپنے ارکان کے ہاتھوں قتل کی بڑی مقدار میں خفیہ وارداتوں کے لئے مشہور تھا۔ جو اپنے سردار کی مرضی کے مطابق قتل کیا کرتے تھے۔ اس لفظ کا مطلب افیون کھانے کے عادیوں سے ہے۔ یہ فرقہ اسی کام سے مشہور ہوا۔ کیونکہ ان لوگوں کو ان کے سردار نے اس خاص نشہ کا عادی بنا دیا تھا تاکہ وہ اسکی مرضی کے مطابق قتل کر سکیں۔

نظریات ان کے فلسفہ کی تائید کرتے ہیں۔ بدھ کسی بھی دوسرے معلم کے مقابلہ میں زیادہ جرأت مند اور بااخلاص تھے۔ انہوں نے کہا کسی کتاب پر یقین نہ کرو۔ وید سب ریاکاری ہیں۔ جہاں تک ان سے میری تائید ہوتی ہے، وہ اچھی کتاب ہے۔ کیونکہ میں خود ایک عظیم ترین کتاب ہوں۔" قربانی کرنا اور پوجا کرنا سب فضول ہے"۔ بدھ پہلے انسان تھے جنہوں نے دنیا کو ایک مکمل اخلاقی فلسفہ دیا۔ وہ بھلائی کی خاطر بھلائی اور محبت کی خاطر محبت کے قائل تھے۔

شنکر آچاریہ کا کہنا ہے۔ ایشور کو منطق سے سمجھا جانا چاہیئے کیونکہ ویدوں نے ایسا ہی کہا ہے۔ دلائل سے وجدان میں امداد ملتی ہے۔ کتابیں اور تصور پذیر دلیل یا انفرادی ادارک دونوں خدا کے ہونے کا ثبوت ہیں۔ ان کے نزدیک ویدوں کی حیثیت عالمی (وشو) گیان کے اوتار کی سی ہے۔ خدا کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے وید نازل کیئے اور ویدوں کا ثبوت یہ ہے کہ اس قدر حیرت انگیز کتابیں برہم ہی دے سکتا ہے۔ وہ ہر ایک علم کی کان ہیں جس طرح ایک آدمی ہوا میں سانس بکھیرتا ہے، اسی طرح خدا نے ان کو عطا کیا ہے۔ اس لئے ہم جانتے ہیں کہ وہ شکتی اور گیان میں نامحدود ہے، اس نے کائنات کو پیدا کیا ہے یا نہیں کیا یہ ایک پرانی بات ہے لیکن ویدوں کو نازل کرنا زیادہ اہم ہے! دنیا کو ویدوں کے ذریعہ ہی خدا کا علم ہوا۔ خدا کو معلوم کرنے کا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔

اور ویدوں کے بارے میں شنکر آچاریہ کا یہ نظریہ اس قدر عالمگیر ہے کہ ایک ہندو کہاوت میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ اگر کسی آدمی کی گائے کھو جائے تو وہ اسکو ویدوں میں تلاش کرے۔

شنکر آچاریہ نے مزید برآں تاکید کی ہے کہ رسومات کی ضروری ادائیگی گیان نہیں ہے۔ ایشور کا گیان، اخلاقی فرائض یا قربانی یا رسم یا باسم کیا سوچتے ہیں اور کیا نہیں سوچتے، ان سب سے بالاتر ہے بالکل اس طرح جس طریقہ پر درخت کے کٹے ہوئے تنے کو ایک آدمی یہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ بھوت ہے اور دوسرا اس کی اصلی حقیقت سے واقف ہوتا ہے۔

ویدانت ضروری ہے کیونکہ نہ تو ہم دلائل سے خدا کو دیکھ سکتے ہیں نہ کتابیں دکھا سکتی ہیں۔ اس کا ادارک صرف لاشعور کے ادارک ہی سے ہو سکتا ہے اور ویدانت کا فلسفہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس کو کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔ آپ کو ساکار ایشور سے اوپر اٹھنا چاہیئے اور نرآکار برہم تک پہنچنا چاہیئے۔ ایشور ہر ایک انسان کا ادارک ہے۔ اس کا ادارک کیا جانا چاہیئے۔ وہ یہ کہتا ہے "میں" برہم ہوں۔ لیکن اگرچہ ہم دن اور رات اسی کو محسوس کرتے ہیں لیکن ہم نہیں جان پاتے کہ ہم اس کو محسوس کر رہے ہیں جتنی جلد ہم سچائی کا احساس کر لیتے ہیں، اسی قدر جلد ہماری عام اذیتیں مٹ جاتی ہیں۔ پس ہمیں حق و صداقت

غبار خاطر — صفحہ ۴۳

کا گیان حاصل کرنا چاہیئے۔ وحدت (دوّیت) پر پہنچ جانے سے ادویت کا تصور باقی نہیں رہے گا لیکن گیان قربانیوں سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ تلاش سے حاصل ہوتا ہے۔ عبادت سے اور آتما کو جاننے سے حاصل ہوتا ہے۔

برہم وِدّیا یعنی برہم کو جاننا اعلےٰ ترین علم ہو گیا ہے۔ سائینس کمتر ہے۔ یہ تعلیم منڈگ اُپنشد یا کٹھ اُپنشد کی ہے۔ گیان کی دو قسمیں ہیں خاص اور ثانوی۔ ویدوں کا وہ حصّہ غیر ضروری ہے جس میں پوجا پاٹھ رسُومات اور لا مذہبی گیان سے بحث کی گئی ہے۔ ضروری وہ حصّہ ہے جس کے ذریعہ ہم مطلق (برہم) تک پہنچتے ہیں۔ یہ (مطلق) اپنی پرا کرتی ہے، سب کو پیدا کرتا ہے، تخلیق کا اور کوئی سبب نہیں ہے، کوئی چیز باہر نہیں ہے، یہ تمام ترشکتی ہے، یہی سب کچھ ہے، وہ جو کہ خود اپنے آتما کے لئے ہر قسم کی قربانی کرتا ہے، وہی صرف برہم کو جانتا ہے، احمق لوگ سوچتے ہیں کہ باہری پوجا پاٹھ ہی سب سے اُونچی چیز ہے۔ احمق سوچتے ہیں کہ کاموں سے ایشور مل جائے گا۔ صرف وہ لوگ ہی آتما تک پہنچتے ہیں جو کہ سَنّیاس (یوگیوں کا راستہ) کو انجام دیتے ہیں۔ انہیں جاننے کے لئے ایک گورو کے پاس جانا چاہیئے۔ ہر جنُد کی وہی فطرت ہوتی ہے جو کہ کل کی ہوتی ہے۔ تمام چشمے آتما سے پھوٹتے ہیں، مراقبہ تیر ہے اور جستجوئے خُدا کرنے والی رُوح کمان ہے جو کہ تیر کو اس کے اصل نشانے آتما تک پہنچاتی ہے۔ محدود کی حیثیت سے ہم نامحدود کی تعریف کبھی نہیں کر سکتے لیکن ہم نامحدود ہیں اسکو جاننے کے بعد ہمیں کسی سے دلیل بازی کی ضرورت نہیں۔

رُوحانی علم (برہم ودّیا) کو بھگتی دھیان اور نفس کُشی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ صرف حق و صداقت کی فتح ہوتی ہے باطل کی نہیں" حق و صداقت کے ذریعہ ہی برہم تک راستہ ملتا ہے"۔

---

برہسپت وار۔ 11 جولائی

ماں کے پیار کے بنا کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا۔ کوئی شئے پوری طرح طبعی نہیں نہ ہی پوری طرح مابعد طبیعیاتی ہے۔ ایک دوسرے کے لئے پہلے سے قیاس کرتی ہے اور دُوسرے کی وضاحت کرتی ہے۔ تمام ماہرین اخلاق متفق ہیں کہ دکھائی دینے والی اس کائنات کی بنیاد ہے۔ ان کے درمیان اس بنیاد کی نوعیّت اور فطرت کے بارے میں اختلاف رائے ہے، مادہ پرست کہتے ہیں کہ کوئی بنیاد نہیں ہے۔

تمام مذاہب میں پہلے سے قیاس کی صورت بالکل وہی ہے۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، بدھ یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو لا مذہب ہوتے ہیں۔ جب اپنے جسم سے ماورا ہوتے ہیں تو انہیں ایک جیسا تجربہ ہوتا ہے۔

---

غبار خاطر صفحہ ۴۴

حضرت عیسیٰ کی وفات کے 25 برس بعد ہندوستان میں اپوسٹل تھامس (Apostle Thomas)
نے دُنیا کے پاکیزہ ترین عیسائیوں کو پھیلایا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جبکہ اینگلوسکیسن (Anglo
Saxon) (برطانیہ اور یورپ کے لوگوں سے مُراد) غیر متمدن تھے اپنے جسموں پر رنگ لگاتے تھے
اور غاروں میں رہتے تھے کبھی ہندوستان میں عیسائیوں کی تعداد تین کروڑ تھی مگر اب ایک کروڑ رہ گئی ہے۔

عیسائیت کی تبلیغ ہمیشہ تلوار کے بل پر کی گئی۔ حیرت کی بات ہے کہ ایک انتہائی شریف رُوح کے
پیروؤں نے اس قدر قتل عام کیا۔ بدھ مت، اسلام اور عیسائیت تبلیغی مذاہب ہیں۔ تین پرانے
مذہب یعنی ہندوازم، یہودی ازم اور زرتشت اِزم تبلیغی مذاہب نہیں ہیں۔ بھگوان بدھ کبھی تبدیلی مذہب
پر کسی کو مجبور نہیں کرتے تھے لیکن انہوں نے شریفانہ طریقہ پر دنیا کے تین چوتھائی حصہ کو بدھ بنا لیا۔

بدھ مت کے ماننے والے انتہائی منطقی ناستک تھے حقیقت میں آپ لامذہبیت (مذہب
سے انکار) اور توحید پرستی کے درمیان کسی جگہ رُک نہیں سکتے۔ بدھ لوگ اپنے قطعی منطقی ماحصل کا پرچار کرتے
ہوئے ذہنی طور پر انتہائی تباہ کن تھے۔ ادویت مت کے پیروؤں نے بھی اپنے نظریہ منطقی نتیجہ نکالا تھا اور کل
تک پہنچ گئے تھے یعنی اصل رُوح کو دیکھ لیا تھا جس سے تمام مظاہر عالم کی تخلیق کا سلسلہ جاری ہے۔ بدھ اور
ادویت وادی دونوں میں ساتھ ہی ساتھ مشابہت بھی ہے اور مخالفت بھی۔ ان میں سے کسی ایک احساس کو
غلط ہونا چاہیئے۔ حقیقت پرست حقیقت کی نشان دہی کرتے ہیں اور پوری دُنیا میں یہی کشمکش جاری ہے۔
یہی رسہ کشی ہو رہی ہے۔

حقیقت پرست پوچھتے ہیں۔ ناستکوں کو ایشور کا تصور ہی کس طرح ہو سکتا ہے؟ گردش کرنے
والی روشنی طرح ایک دائرہ کی صورت میں ظاہر ہو سکتی ہے؟ ایک ساکن لفظ ہی سے حرکت کا علم ہو سکتا ہے۔
اس فریب کی توضیح نہیں کر سکتے کہ کوئی بنیاد ہے، نہ ہی کوئی نظریہ پرست اس بات کی وضاحت کر سکتا ہے۔
کہ ایک سے انیک کس طرح بن سکتے ہیں۔ لاشعور ہی اس کی وضاحت کر سکتا ہے۔ ہمیں لاشعور تک اُٹھنا چاہیئے
جو کہ ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جو شعوری تصوّرات سے پرے ہے۔ نظریہ پرست مابعد الطبیعیاتی شکتی کو
مزید ذریعے کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں، وہ کل کا تجربہ کر سکتا ہے، وویکانند جیسا آدمی خود کو کل میں
جذب کر سکتا ہے اور پھر آدمی بن کر واپس آ سکتا ہے۔ ان کے نزدیک اس طرح مسئلہ حل ہو گیا اور
ثانوی طور پر دُوسروں کے لئے بھی حل ہو گیا کیونکہ وہ دوسروں کو بھی راستہ دکھا سکتے ہیں۔ پس مذہب
وہاں سے شروع ہوتا ہے، جہاں فلسفہ کی حد ختم ہوتی ہے۔ جو اس وقت ہمارے نزدیک لاشعور ہے۔
وہی دُنیا کی بھلائی ہو گا اور آئندہ آنے والے زمانہ کے تمام لوگوں کا شعور ہوگا۔ اس لئے دنیا میں مذہب

ایک اعلیٰ ترین کام ہے اور چونکہ آدمی کو لاشعوری طور پر اس کا احساس ہوتا ہے۔ اس لئے اس . . . . .
کے اندر ہر دور ہر زمانہ میں مذہب کا تصوّر رہا ہے۔

مذہب نے جو دودھ دینے والی ایک عظیم گائے ہے، بڑے جھٹکے دیئے ہیں لیکن کوئی پرواہ نہیں، یہ دودھ کی بڑی مقدار دے دیتی ہے۔ دودھ دوہنے والا اس گائے کی لاتوں کی پرواہ نہیں کرتا جو کہ زیادہ دودھ دیتی ہے۔
مذہب ایک عظیم ترین بچّہ ہے جس نے ابھی جنم لیا ہے۔ یہ ایک عظیم چاند ہے جس کو ابھی طلوع ہونا ہے ہمیں اس کی نشوونما کرنی چاہیئے اور آخر میں یہ دیوپیکر ہو جائے گا۔ خواہش کے درجہ اور گیان کے درجہ میں جنگ ہوئی اور جیسے ہی آخر الذکر کو شکست ہونے کو تھی۔ وہ فوراً مہاراتی اپنیشد سے باہم آغوش ہو گیا اور پھر اس کے ایک بچّہ پیدا ہوا۔ ادارک یعنی گیان جس نے اس کو کامیاب اور قائم بنایا۔ [1]

عشق و محبت اور پریم کے اندر ارادہ کی تمام قوّت ارادی ہوتی ہے۔ یہ قوّت بغیر کسی کوشش کے آجاتی ہے۔ جیسے کہ ایک مرد ایک عورت پہ فریفتہ ہو جاتا ہے۔

بھگتی کا راستہ قدرتی اور خوشگوار ہے۔ فلسفہ ایک پہاڑی ندی کو اپنی طاقت کے ساتھ اُلٹا بہانا چاہتا ہے۔ یہ عاجلانہ طریقہ ہے لیکن بہت مشکل ہے منطق و فلسفہ کا کہنا ہے۔ ہر چیز کو تحقیق کرو۔ بھگتی کہتی ہے۔ ہر دلیل اور منطق کو ندی میں بہادو اور باطنی طور پر ہتھیار ڈال دو۔ یہ طویل راستہ ہے لیکن آسان اور خوشگوار۔

"تُو ہمیشہ کے لئے مَیں ہوں۔ اس لئے جو کام بھی مَیں کرتا ہوں، وہ سب تیرے کام ہیں، میں یا میرا کچھ نہیں ہے۔"

" اے پیارے ایشور، میرے پاس تُجھے جاننے کے لئے نہ دماغ ہے نہ علم، نہ یوگ کرنے کے لئے وقت۔ مَیں خود کو تیرے حوالے کرتا ہوں، تو ہی میرا جسم ہے، تو ہی میری رُوح ہے"۔

رُوح اور خدا کے درمیان کوئی غلط نظریہ اور کسی قسم کی جہالت سایہ راہ نہیں ہوسکی۔ خدا ہے یا نہیں تمام تر عشق و محبت کے ساتھ اسی خدا کی تلاش جاری رکھیئے۔ تلاش میں ہی مر جانا اچھا ہے بمقابلہ اس کے کہ کُتے کی طرح سڑے ہوئے گوشت کو تلاش کیا جائے۔ انتہائی اعلےٰ تصوّر کو اختیار کیجئے اور خود کو اس بلندی تک پہنچایئے۔ موت یقینی ہوتی ہے کسی عظیم مقصد کے لئے زندگی کو بخ دینے کے لئے یہ احساس کافی ہے۔
عشق و محبت سے بغیر کسی تردد کے فلسفہ تک پہنچ جائے گا اور پھر گیان کے بعد پرا بھگتی آتی ہے۔

(انتہائی اعلےٰ بھگتی)

---

[1] پر بودھ چندرا ادوے نامی سنسکرت میں لکھے گئے ویدانتی ڈرامے سے)

عقل و منطق نکتہ چینی کرتی ہے اور ہر چیز کے بارے میں ایک بڑا بتنگڑ بنا دیتی ہے لیکن عشق و محبت کا کہنا ہے، خدا اپنی اصل حقیقت مجھ پر منکشف کر دے گا اور میں جیسا ہوں مجھے قبول کرے گا۔۔۔۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ قبولیت بارگاہِ الٰہی کے دو ہی راستے ہیں، ایک ہے عدل و انصاف کا، دوسرا ہے فضل و کرم کا۔ عدل و انصاف کی راہ پر جو گامزن ہیں وہ ساری زندگی طہارتوں میں مستغرق رہتے ہیں اور اپنے اعمال اور اپنے کردار کے بل بوتے پر شرفِ قبولیت پانے کے آرزومند رہتے ہیں۔ لیکن دوسرے لوگ جن کا مسلک فضل و کرم ہے، اپنی پاکبازی اور نیک نفسی پر ہرگز ہرگز نہیں اتراتے اور نہ ہی اس پر شرفِ قبولیت پانے کے دعوے دار ہوتے ہیں۔ بلکہ ان کا نظریہ حیات تو یہ ہے کہ ہم جیسے ہیں اس کے ہیں۔ اچھے ہیں تو بھی اس کے ہیں، اور برے ہیں تو بھی اس کے ہیں، ہم ہر حال میں اس کے فضل و کرم کے امیدوار اور طالب ہیں۔

اس موقع پر مجھے فارسی کی ایک نظم یاد آگئی ہے جس میں حضرت رابعہ بصریؒ کے متعلق ایک واقعہ انتہائی دلپذیر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

یہ واقعہ اس طرح سے ہے:۔

ایک دن رابعہ بصری بیماری کی حالت میں اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھیں کہ اس وقت کے مومن مولانا جن کا اسم گرامی ملک حسن بصری تھا اور جنہیں صاحب دانش کہا جاتا ہے، ان کی بیمار پرسی کے لئے آئے۔

حضرت حسن بصری نے کہا:۔ "آپ کے نزدیک رضا اور صبر کے مقام میں کیا فرق ہے؟"

رابعہ بولیں:۔ "رضا کا امیدوار خدا سے فضل و کرم مانگتا ہے۔ صبر کرنے والا اپنے گوشۂ دل میں ایک قسم کا تکبر رکھتا ہے۔ اور جب اسے مطلوبہ ثمر نہیں ملتا تو صبر کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔" آپ نے حضرت حسن سے کہا کہ "آپ کے نزدیک دونوں میں سے کس کا درجہ اونچا ہے؟"

حضرت حسن بولے:۔ "صبر کرنے والے کا!"

رابعہ بولیں:۔ "صبر تو حیوان بھی کر لیتے ہیں۔ انسان کا مقام تو اس سے اونچا ہے۔ اور وہ ہے رضا کا، فضل و کرم کا مقام"۔

---

شکروار۔ 12 جولائی

"دیاس کا جو تھا سوتر آتما ہے جو سب کا مقصد ہے"۔

ایشور کو ویدانت کے ذریعہ جانا جا سکتا ہے۔ تمام وید اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں وہ تخلیق عالم کی وجہ ہے، خالق ہے، پالنے والا اور مارنے والا ہے) ایشور، برہم، وشنو اور مہیش کی تریمورتی کا نام ہے۔ ایک

---

غبار خاطر صفحہ ۴۷

چیلا اپنے گورو سے کہتا ہے ۔" آپ ہمارے باپ ہیں، جو کہ ہمیں تاریک بحرِ جہالت کے دوسرے کنارے پر پہنچانے کے لئے ہیں"۔

ویاآپ کو برہم کو نہیں دکھا سکتے، آپ خود برہم ہیں، وہ صرف آپ کو اس پردہ کو ہٹانے میں مدد کر سکتے ہیں، جو کہ آپ کی آنکھوں سے سچائی کو چھپائے ہوئے ہے۔ پہلا پردہ جس کو ختم کرنا ہے، جہالت کا ہے اور جب یہ پردہ ہٹ جاتا ہے، تو تمام گُناہ ختم ہو جاتے ہیں۔ دُوسرا پردہ خواہش کا ہے، جب یہ مٹ جاتا ہے تو خود غرضی ختم ہو جاتی ہے اور تمام اذیتیں اور کوفتیں مٹ جاتی ہیں۔ جہالت کا یہ پردہ اُس وقت اُٹھ سکتا ہے جب مَیں یہ جان لوں کہ ایشورا اور مَیں ایک ہوں۔ دوسرے الفاظ میں خود اپنے آپ کو پہچانیئے کیونکہ خود شناسی ہی خُداشناسی ہے۔ آتما کو پہچانیئے لیکن اِنسان کے محدود ذرائع کے ساتھ نہیں، جسم کے ساتھ اپنی تمام وابستگی کو ختم کر دیجیئے تو تمام دَرد مٹ جائیں گے شفا کا یہی راز ہے، دُنیا ایک طلِسم فریب ہے، اس فریب کا پردہ چاک کیجیئے اور تمامتر اذیتوں سے نجات حاصل کیجئے۔

نجات حاصل کرنے کے لئے ہمیں بدی سے گُزر کر نیکی تک، پہنچنا ہے پھر دونوں کو ہی ختم کر دینا ہے تامس کو راجس کے ذریعہ فتح ہوتی ہے اور پھر دونوں کو ستو میں فنا ہو جانا ہے۔ اس کے بعد تینوں حالتوں سے پرے اُٹھنا ہے۔ یعنی تریگُن اتیت ہونا ہے۔ ایک ایسی حالت میں پہنچ جائیے کہ جہاں ہر سانس عبادت ہوتا ہے

جب کبھی آپ دوسرے انسان کی باتوں سے کچھ سیکھیں (ہر علم سیکھئے) تو یہ سمجھ کر سیکھئے کہ آپ کو پچھلی زندگی کا تجربہ ہے کیونکہ تجربہ ہی اصل اُستاد ہوتا ہے۔

اپنی تمام قوتوں کے ساتھ نئی مصیبت آتی ہے، اس لئے خواہش کو ختم کر دیجیئے۔ کسی خواہش کو رکھنا ایسا ہی ہے جس طرح شہد کی مکھیوں کے چھتّہ کو لکڑی سے چھیڑنا ۔ دہرا گیا ہے۔ صرف یہ معلوم کرنا کہ خواہشات ہیں جو کھانڈ چڑھی زہر کی گولیاں ہیں ۔

شنکر آچاریہ کہتے ہیں۔ نفس ایشور نہیں ہے "تت توم اسمی"، "آہم برہم اسمی"۔ (یعنی "تُو ہی تُو ہے "مَیں ہی برہم ہوں") جب ایک شخص کو اس کا احساس ہو جاتا ہے۔ اس کے دل کی تمام گرہیں کُھل جاتی ہیں، اور تمام تشکیک و شبہات بہہ جاتے ہیں۔ بے خوفی اُس وقت تک ممکن نہیں۔ جب تک کہ ہمارے اُوپر ایشور کا تصور بھی مسلط ہے۔ ہمیں خود خدا بننا چاہیئے جو الگ ہے۔ ہمیشہ الگ رہے گا۔ اگر آپ خدا سے کوئی الگ ہیں تو آپ کسی صورت میں اصلِ خدا نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح خدا آپ سے الگ ہے تو اس کا آپ کے ساتھ وصل کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ کو کسی صفت کی وجہ سے وصل خدا نصیب ہے۔ جب صِفت ختم ہو گی تو وصل بھی ختم ہو جائے گی۔ وصل اَبدی ہے اور صِفت صرف پردہ کو ہٹانے میں ہماری امداد کرتی ہے۔ ہم آزاد ہیں۔ ہمیں یہ بات

---

غبارِ خاطر صفحہ ۴۸

محسوس کرنی چاہیئے جس کو خودی برگزیدہ کرتی ہے کا مطلب ہے ہم خودی ہیں اور خود کو برگزیدہ کرتے ہیں۔

کیا دیکھنے کا انحصار خود ہماری اپنی کوششوں پر ہے یا کسی باہری شے پر ہے ؟ اس کا انحصار نہیں پر ہے ہماری کوششوں ہی سے دھول صاف ہوتی ہے، آئینہ تبدیل نہیں ہوتا، نہ کوئی جاننے والا ہے نہ جانا جا رہا ہے اور نہ جانا ہوا ہے۔ وہ جو جانتا ہے کہ وہ نہیں جان سکتا اسکو جانتا ہے۔ جو شخص صرف منطق میں اُلجھا ہوا ہے وہ کچھ بھی نہیں جانتا یہ نظریہ کہ ہم قید ہیں محض ایک فریب نظر ہے۔

مذہب کا تعلق اس دُنیا سے نہیں ہے، اس کا تعلق صفائی قلب اور طہارت باطن سے ہے اور دُنیا میں اس کی کوششیں ثانوی ہیں۔ آزادی کو آتما کی پرا کرتی سے جُدا نہیں کیا جا سکتا یہ ہمیشہ پاک مکمل اور ناقابلِ تبدیل رہتی ہے۔ اس آتما کو آپ کبھی جان نہیں سکتے۔ ہم آتما کے بارے میں کبھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔ نیتی ! نیتی ! وہ یہ بھی نہیں، یہ بھی نہیں۔ شنکر آچاریہ کہتے ہیں" برہم وہ ہے جس کو ہم رُوح اور تصور کی کسی قوت سے بھی ظاہر نہیں کر سکتے"!



کائنات خیال اور نظریہ ہے اور وید اس نظریہ کے الفاظ ہیں۔ ہم اس پوری کائنات کی تخلیق اور عدم تخلیق کر سکتے ہیں۔ الفاظ کو بار بار دُہرانے سے اَن دیکھا تخیل سامنے آجاتا ہے اور نتیجہ میں ہم اس کو دیکھ پاتے ہیں۔ یہ دعوے کرمیوں کے ایک خاص فرقہ کا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہم میں سے ہر ایک خالق ہے۔ الفاظ کی ادائیگی سے ان کے مطابق خیال پیدا ہو جائے گا اور نتیجہ میں وہ قابلِ مشاہدہ بن جائیگا۔ خیال الفاظ کی قوت ہے، الفاظ سے خیال کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ قول ہندوؤں کے اس فرقہ کا ہے جو میمانسا کو ماننے والے ہیں۔



سینچر وار - 13 رجولائی

ہر وہ چیز جس سے ہم واقف نہیں مرکب ہے اور تمام شعوری علم تجربہ کے ذریعہ ہی آتا ہے۔ یہ سمجھنا کہ باطن سادہ مفرد اور آزاد ہے، ایک فریب ہے۔ فلسفہ کتابیں پڑھنے سے نہیں آتا۔ جس قدر زیادہ کتابیں آپ پڑھیں گے اُسی قدر ذہن میں اُلجھاؤ آئے گا۔ بعض فلاسفروں کا نظریہ یہ ہے کہ باطن سادہ ہوتا ہے اس لئے انہوں نے آزاد قوتِ ارادی کو ماننا شروع کر دیا۔ نفسیات ذہن کا تجزیہ کرتی ہے اور ثابت کرتی ہے کہ باطن مرکب ہے اور ہر مرکب کا باہر کی کسی شے کے ساتھ تعلق ہوتا ہے، اس لیئے ارادہ کے ساتھ باہری عناصر کا ہونا لازمی ہے۔ یہاں تک کہ آدمی جب تک بھوک نہ ہو، کھا بھی نہیں سکتا۔ ارادہ خواہش کا نتیجہ ہوتا ہے لیکن ہر شخص محسوس کرتا ہے کہ ہم آزاد ہیں۔

ناستک کہتے ہیں کہ یہ نظریہ باطل ہے کہ پھر اس دُنیا کو کیسے ثابت کیا جائے ؟ اس کا ثبوت محض یہ ہے کہ ہم اس کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح ہم آزادی کو محسوس کرتے ہیں۔ اگر کائناتی مطابقت

اس دُنیا کی تصدیق آتی ہے تو اس کو مصدقہ آزادی سمجھنا چاہیئے لیکن آزادی صرف عزم اور ارادہ کا نام ہی نہیں ہے۔ آدمی کا آزادی میں آئینی اعتقاد دلائل پر مبنی ہے۔ آزاد قوّتِ ارادی کے نظریہ سے ہر لمحہ یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ آدمی غلامی کے خلاف جد و جہد کر رہا ہے۔ آزاد صرف ایک ہو سکتا ہے۔ غیر مشروط اور نامحدود اور لامحدود۔ اب انسان کے ذہن میں صرف آزادی کی یاد باقی ہے اور وہ آزادی حاصل کرنے کی کوشش میں ہے۔

دُنیا میں ہر چیز ایک جگہ کو پُورا کرنے کی جد و جہد میں مصروف ہے۔ اپنے ذریعہ اور صرف اپنے حقیقی فیصلے سے آتما تک واپس پہنچنے کے لئے کوشاں ہے۔ خوشی کی تلاش کا مطلب توازن قائم کرنے اور توازن کو بحال کرنے سے ہے۔ محکوم قوّتِ ارادی کی آزادی حاصل کرنے کی جد و جہد کا نام اخلاقیات ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم اکمابیّت سے آئے ہیں۔

---

فرض کا تصوّر رُوح کو جُھلسانے والی دُکھ کے سُورج کی دوپہر کی دُھوپ ہے۔" اے راجہ! امرت کے ایک قطرہ کو پی لے اور لافانی مسرّت حاصل کر لے"۔ اور یہ امرت مُتّسو چتنا ہے کہ مَیں کچھ کرنے والا نہیں!

بغیر ردِعمل کے عمل کو ہونے دیجیئے۔ عمل خوشگوار ہوتا ہے، تکلیف صرف ردِعمل میں ہوتی ہے۔ بچّہ اپنا ہاتھ آگ کے شعلوں پر رکھتا ہے۔ یہ خوشگوار عمل ہے لیکن اس کا ردِعمل ہوتا ہے اور جلنے سے دُکھ ہوتا ہے۔ اگر ہم اس ردِّعمل پر قابُو پا لیں تو پھر ہم کسی چیز سے خوف زدہ نہیں ہو سکتے۔ دِل و دماغ پر قابو حاصل کیجیئے اور اس کو سارے ریکارڈ کو پڑھنے دیجئے۔ شاہد بنیئے لیکن ردِّعمل ظاہر نہ کیجیئے، اس وقت آپ مسرّت حاصل کر سکتے ہیں جس لمحہ ہم خود کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں، وہی لمحہ خوشگوار ترین ہوتا ہے۔ خود اپنی آزاد قوتِ ارادی کے ساتھ کام کیجیئے، ہمارا کوئی فرض نہیں ہے، یہ دنیا بالکل ایک کھیل کے اکھاڑہ کی طرح ہے جس میں ہمیں کھیلنا ہے۔ ہماری زندگی ایک اَبدی آرام ہے۔

خوف زدہ نہ ہونا زندگی کا کل راز ہے۔ تمہارا کیا بنے گا، یہ خوف نہ کیجیئے کسی پر بھروسہ نہ رکھیئے۔ جب آپ تمام سہاروں کو چھوڑ دیں گے تو اُسی وقت آزاد ہوں گے کیونکہ اب آپ کے دِل میں کسی اور کی سمائی ہو ہی نہیں سکتی۔

---

اپنے حق کی خاطر بھی ہر قسم کی جنگ غلط ہے۔ حالانکہ جارحیت کی لڑائی سے یہ افضل ہے۔ یہاں کوئی غصّہ منصفانہ نہیں ہوتا کیونکہ غصّہ اور خفگی تمام چیزوں کے درمیان یکسانیت کو تسلیم نہ کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔

---

غبارِ خاطر
صفحہ ۵۰

انوار - 14 رجولائی

ہندوستان میں فلسفہ کا مطلب ہے کہ جس کے ذریعہ خدا کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یعنی مذہب کا استدلال یہیں کوئی ہندو مذہب اور فلسفہ کے درمیان رابطہ کی بات نہیں کہے گا۔

فلسفہ کے طریق کار کے تین ادوار ہیں بنیاد کلیہ اور خلاصہ۔ اعلےٰ ترین خلاصہ جس کے بارے میں تمام متفق ہیں "ایک" ہے۔ مذہب میں ہمارے نزدیک سب سے پہلے علامتیں اور شکلیں ہیں۔ پھر دیو مالا اور آخر میں فلسفہ۔ پہلی دو چیزیں فرضی ہیں اور آخری فلسفہ تمام چیزوں کی بنیاد نہیں ہے اور دوسری کل تک پہنچنے کے لئے جدوجہد کی منزلیں ہیں۔

مغربی دنیا میں مذہب کا نظریہ ہے کہ بغیر نیوٹیسٹامنٹ (              ) انجیل اور مسیح کے کوئی مذہب نہیں ہو سکتا۔ ایسا ہی اعتقاد موسیٰ کے بارے میں یہودیوں کا ہے۔ کیونکہ ان مذاہب کا انحصار صرف دیو مالاؤں پر ہے۔ حقیقی اور اعلیٰ ترین مذہب دیو مالاؤں سے بالاتر ہوتا ہے وہ کبھی ان پر منحصر نہیں ہوتا۔ جدید سائینس نے حقیقت میں مذہب کی چیزوں کو مضبوط کیا ہے۔ یہ کہ تمام کائنات ایک ہے اور سائینس سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے۔ مابعد الطبعیات کے ماہرین جس چیز کو وجود کہتے ہیں۔ ماہرین اجسام اسکو مادہ کہتے ہیں لیکن دونوں کے درمیان کوئی حقیقی اختلاف نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں ایک ہیں۔ اگرچہ ایک ایٹم کو نہ تو دیکھا جا سکتا ہے نہ اس کے بارے میں خیال کیا جا سکتا ہے۔ تاہم اس کے اندر پوری کائنات کی جوت اور صلاحیت ہوتی ہے۔ بالکل ایسی بات آتما کے بارے میں ویدانتی کہتے ہیں۔ تمام فرقے حقیقت میں اسی ایک بات کی تلقین کرتے ہیں، صرف ان کے الفاظ مختلف ہیں۔

ویدانت اور سائینس جدید۔ دونوں ارتقائے ذات کو فرض کرتے ہیں۔ ذات کے اندر خود تمام اسباب موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ایک کمہار برتن بناتا ہے، کمہار بنیادی سبب ہے۔ مٹی جس سے برتن بنتا ہے، مادی سبب ہے اور چاک سبب ذریعہ ہے لیکن آتما تینوں میں موجود ہے۔ آتما اظہار کا سبب بھی ہے۔ ویدانتی کہتے ہیں کہ یہ کائنات حقیقی نہیں ہے بلکہ محض عکس ہے۔ پراکرتی ایشور ہے، جو محض جہالت کا پمہ تو ہے۔



شیاطین تاریکی کی مشین ہیں اور فرشتے روشنی کی۔ دونوں مشینیں ہیں۔ صرف آدمی ہی تنہا زندہ ہے مشینوں کو

[1] چونکہ زمانہ خلا اور اسباب میں موجود تمام کائنات روح اور یادداشت سے ماورا نہیں ہے خود کو غور و فکر احساسات اور رضامندی کی حیثیت سے ظاہر کرلیتی ہے۔ اسلئے تمام تر خلا زمانہ اسباب اس کے اندر ہونے چاہئیں۔ اسی لئے روح ہر جگہ موجود اور کائناتی روح کا جزو ہے۔

غبار خاطر

صفحہ ۵۱

توڑ ڈالئے اور توازن قائم کیجئے [ط] ۔ پھر آدمی آزاد ہو جائے گا۔ صرف یہی دُنیا ہے کہ جس میں ہم نروان حاصل کر سکتے ہیں۔

" خودی کس کو منتخب کرتی ہے"، حق وصداقت ہے ، انتخاب حق وصداقت ہے لیکن اس کو اسی کے دائرہ میں رکھیئے

. یہ ایک خارجی اور ہلاکت کُن اصول کی غلام خوفناک ہے۔

---

سوم وار۔ 15 ر جولائی

جہاں کہیں ایک سے زیادہ شوہروں کا رواج ہے، جیسا کہ تبت میں ہے۔ عورتیں مردوں کے مقابلہ میں جسمانی طور پر توانا ہوتی ہیں۔ جب انگریز وہاں جاتے ہیں۔ یہ عورتیں قیاص آدمیوں کو پہاڑوں پر لے جاتی ہیں۔

مالابار کے علاقہ میں اگرچہ ایک سے زیادہ شوہروں کا رواج نہیں ہے تاہم عورتیں وہاں ہر کام میں پیش پیش نظر آتی ہیں۔ مگر ہر جگہ نہایت پاکیزگی اور صفائی ملے گی۔ وہاں حصول علم کا بہت شوق ہے۔ جب میں خود اس علاقہ میں گیا تو مجھے بہت سی ایسی عورتیں ملیں، جو سنسکرت میں بات چیت کر سکتی تھیں۔ باقی ہندوستان میں کروڑوں عورتیں ہیں جن میں ایک عورت بھی سنسکرت نہیں بول سکتی۔ اقتدار سے ترقی ملتی ہے اور غلامی سے زوال۔ یہی وجہ تھی کہ مالابار کو نہ تو انگریزوں نے فتح کیا اور نہ مسلمانوں نے۔

دراوڑوں کا تعلق وسط ایشیا کی غیر آریائی نسل سے تھا اور ان میں سے جو لوگ جنوبی ہندوستان میں تھے، وہ انتہائی مہذب تھے۔ ان میں عورتوں کا مرتبہ مردوں سے زیادہ تھا۔ بعد میں وہ منقسم ہو گئے، کچھ مصر چلے گئے اور کچھ بابل۔ باقیماندہ ہندوستان میں رہے۔

---

## شنکر آچاریہ کا بھاشیہ

منگل وار۔ 16 ر جولائی

پوجا اور قربانی کی وجہ غیر مرئی سبب ہے جس کے نتیجہ میں ایسے نتائج نکلتے ہیں جنہیں دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن نجات حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے ہمیں سننا چاہیئے، سوچنا اور دلائل سے کام لینا چاہیئے اور پھر برہما پر دھیان جمانا چاہیئے۔

کرم کا نتیجہ اور گیان کا پھل دو مختلف چیزیں ہیں۔ "کرو" اور "نہ کرو" تمام تر اخلاقیات کی بنیاد ہے لیکن

---

[ط] یہ معلوم کیجئے کہ آپ کے اور مشین کے درمیان تعلق وہی ہے جو ایک کارکن اور اس کے کام کے اوزار کا ہے۔ خود اپنے کو کبھی اوزار نہ سمجھیئے۔

حقیقت میں وہ جسم اور رُوح کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ تمام مسرت اور تمام رنج کا تعلق شعور کے ساتھ ہے اور جسم ان کو محسوس کرنے کے لئے ہے جس قدر اُونچے درجہ کا جسم ہوگا۔ اُسی قدر بڑے معیار کی صفت ہوگی۔ یہ کیفیت برہم تک چلتی ہے۔ لیکن سب جسم رکھتے ہیں۔ جب تک جسم ہے خوشی اور تکلیف محسوس ہوگی۔ صرف وہی ان سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ جو جسم سے نجات حاصل کرلے۔ شنکر آچاریہ نے کہا ہے آتما کا جسم نہیں ہے۔

کوئی قانون آپ کو نجات نہیں دِلا سکتا۔ آپ مُکت ہیں کوئی شے آپ کو نجات نہیں دے سکتی اگر آپ کو نجات پہلے ہی سے حاصل ہو۔ آتما خود روشنی ہے، جو تر ھٹے ہے بسبب اور اثر وہاں تک نہیں پہنچ سکتے اور جسم سے اور مادیت سے۔ یہ دُوری ہی نجات ہے، اس سے پرے جو کچھ تھا یا ہے یا ہوگا۔ صرف برہم ہے۔ ایک اثر کے طور پر نجات کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ یہ مرکب ہوگی اور اسی حیثیت میں اس کے ساتھ غلامی کی آلائشیں شامل ہوں گی۔ یہ ایک حقیقی جزو ہے جس کو حاصل نہیں کرنا ہے بلکہ یہ رُوح کی حقیقی فطرت ہے۔

تاہم کرم اور پُوجا پردے کو ہٹانے کے لئے اور غلامی اور فریب کو دُور کرنے کے لئے ضروری ہیں، وہ ہمیں آزادی نہیں دیتی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم اپنی کوششوں کے بغیر اپنی آنکھوں کو نہیں کھول سکتے اور نہیں دیکھ سکتے کہ ہم کیا ہیں۔ شنکر آچاریہ نے مزید کہا ہے کہ اُدوتیت ویدانت میں ویدوں کا نچوڑ ہے۔ لیکن دوسرے وید بھی بہت ضروری ہیں، کیونکہ وہ کرم اور پُوجا کی تعلیم دیتے ہیں اور ان کے ذریعہ بہت سے لوگ ایشور تک پہنچ سکتے ہیں۔ کرم اور پُوجا کے نتائج وہی ہیں جو اَدویت کے ہیں۔

کتابوں سے ایشور کا علم نہیں ہو سکتا۔ لیکن وہ جہالت کو مٹا دیتی ہیں۔ ان کا عمل منفی ہوتا ہے۔ کتابوں پر انحصار کرنا اور اس کے ساتھ نجات کے لئے راستہ کھولنا شنکر آچاریہ کی عظیم کامیابی ہے لیکن آخر کار یہ بال کی کھال اُتارنا ہے۔ پہلے آدمی کی بنیاد مضبوط بنایئے۔ پھر اس کو بتدریج اُونچا اُٹھایئے۔ یہ مختلف مذاہب کی کوشش ہے۔ اس سے ان کے وجود کی وضاحت ہوتی ہے اور اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک ترقی کے کسی نہ کسی مرحلے کے لئے کیوں موزوں ہے۔ کتابوں سے جہالت اور لاعلمی کو دُور کرنے میں مدد ملتی ہے۔ ان کا فرض اس جہالت کو دُور کرنا ہے۔ جو آگہی پر چھائی ہوئی ہے۔ حق و صداقت ہی باطل کو دُور کرتی ہے آپ مُکت ہیں اور آپ کو کچھ نہیں بنایا جا سکتا۔ جب تک آپ ایک مذہب کے حامل نہیں، آپ ایشور تک نہیں پہنچ سکتے۔ " وہ جو یہ سمجھتا ہے کہ وہ کچھ جانتا ہے، کچھ نہیں جانتا۔" جاننے والے کو کون جان سکتا ہے؟ وجود میں دو ابدی حقائق ہوتے ہیں ایک ایشور اور دُوسری

غبار خاطر صفحہ ۵۳

کائنات۔ ادّل الذکر نا قابلِ تبدیل ہے اور دُوسرا تغیّر پذیر۔ دُنیا کا وجود ابدی ہے۔ جہاں آپ کی رُوح تبدیلی کی مقدار کو جذب نہیں کر سکتی تو آپ سے ابدیّت کہتے ہیں ......"

آپ اس بڑے پتھر کو دیکھتے ہیں۔ دونوں کو ایک ساتھ نہیں، تاہم دونوں ایک ہیں۔

---

کیا آپ ایک لمحہ کے لئے بھی خود کو ساکن کر سکتے ہیں؟ لوگیوں کا کہنا ہے، آپ ایسا کر سکتے ہیں۔

---

خود کو کمزور سمجھنا سب سے بڑا گناہ ہے، کوئی بھی آپ سے بڑا نہیں ہے۔ آپ برہم ہیں اس کا احساس کیجئے۔ ہر چیز کو قوت آپ نے عطا کی ہے۔ ہم سورج ستاروں اور کائنات سے اُونچے ہیں، آدمی کو بتا یئے کہ وہ خود ایشور ہے، بدی سے انکار کر دیجئے، کھڑے ہو جایئے اور کہیئے میں مالک ہوں، سب کا مالک ہوں۔ یہ زنجیریں پیٹیریاں ہمیں نے بنائی ہیں اور صرف ہم ہی ان کو توڑ سکتے ہیں۔

کوئی عمل آپ کو نجات نہیں دِلا سکتا، صرف آگہی سے آپ نجات حاصل کر سکتے ہیں، آگہی نا قابلِ مزاحمت ہے، رُوح اسکو نہ حاصل کر سکتی ہے نہ ردّ کر سکتی ہے۔ جب آگہی آتی ہے تو رُوح اسکو قبول کر لیتی ہے۔ پس آگہی رُوح کا کام نہیں ہے۔ صرف اس کا اظہار روح میں ہوتا ہے۔

کرم اور پُوجا کا مقصد آپ کو آپ کی اصل فطرت کی طرف واپس لانا ہے۔ یہ ایک مکمل فریب ہے۔ آپ جسم ہیں۔ پس اس جسم کے اندر رہتے ہوئے بھی ہم نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ جسم اور خودی کے درمیان کوئی اشتراک نہیں ہے۔ حقیقی کو غیر حقیقی سمجھنا دھوکہ ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

---

بدھ وار۔ 17 رجولائی

رامانج کائنات کو چِت، اَچِت اور ایشور، آدمی، پراکرتی اور ایشور، شعور، تحت الشعور اور لاشعور میں تقسیم کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف شنکر آچاریہ کا کہنا ہے کہ چِت جو روح ہے۔ بالکل ایسی ہی ہے، جیسا کہ ایشور۔ ایشور سچائی ہے، آگہی ہے اور نامحدودیت ہے۔ یہ حدشناسیاں نہیں ہیں۔ ایشور کے بارے میں کوئی بھی نظریہ حدشناسی ہے اور اس کے بارے میں جو کچھ کہا جا سکتا ہے۔ وہ ہے "اوم تت ست"۔

شنکر آچاریہ مزید سوال کرتے ہیں، کیا آپ وجود کو کسی چیز سے علیحدہ دیکھ سکتے ہیں؟ دونوں ظاہر چیزوں میں فرق کہاں ہے؟ اکملیت کے مفہوم میں تہیں کیونکہ اس میں تو سب آجاتے ہیں۔

---

غبارِ خاطر صفحہ ۵۴

ہمیں تسلسل میں ادارک کرنا ہے۔ یہ آگہی حاصل کرنا ہے کہ کوئی چیز کیا ہے۔ ہمیں کوئی چیز ایسی کبھی حاصل کرتی ہے جو ہے نہیں۔ اختلاف حافظہ کے اندر ہوتا ہے اور حافظہ کے اندر جو کچھ موجود ہوتا ہے اسی کے مطابق ہوتا ہے۔ اختلاف یا فرق کسی چیز کی فطرت میں نہیں ہوتا۔ یہ دماغ میں ہوتا ہے۔ جس چیز میں باہر ہم رنگی ہوتی ہے۔ اندر (دماغ کے اندر) فرق ہوتا ہے۔ پس "کثرت" کا تصور دماغ کی پیداوار ہے۔

جب تفریق کے اجزا الگ الگ ہوتے ہیں تو اقسام بن جاتے ہیں لیکن ایک مجتمع شکل میں وحدت ہوتے ہیں۔ ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ تفریق کیا ہے۔ ہم چیزوں کے بارے میں جو کچھ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں، وہ پاکیزہ اور سادہ وجود "ہست" ہے۔ باقی سب کچھ ہمارے اپنے اندر ہے۔ کسی چیز کے بارے میں اُن کا ہونا ہمارے نزدیک مثبت ثبوت ہے۔ تمام تفریق حقیقت میں "ثانوی" حقیقت ہے۔ جیسے رسی کے گھیرے میں سانپ۔ کیونکہ سانپ ایک خاص حقیقت رکھتا ہے۔ اس میں کوئی چیز دکھائی دیتی ہے اگرچہ اس کے بارے میں وہم کرلیا گیا، اور جب اس کے بارے میں علم منفی ہوجاتا ہے تو سانپ کے بارے میں مثبت ہوجاتا ہے۔ اسی طرح اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اس حقیقت کے کہ آپ صرف ایک چیز کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ ثابت نہیں ہوتا کہ دوسری کا وجود نہیں ہے۔ کائنات کا تصور ایشور کے تصور پر ایک پردہ ہے، ایک رکاوٹ ہے، اس کو ہٹانا ہے لیکن اس رکاوٹ کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

شنکر آچاریہ مزید کہتے ہیں کہ ادارک وجود کا آخری ثبوت ہے۔ یہ خود آگہی اور خود درخشندگی ہے کیونکہ شعور سے ماورا جانے کے لئے اس کے بعد بھی ادراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ ادراک شعور سے آزاد ہوتا ہے۔ تمام ذرائع خودشناسی کے لیے وقف کر دیجئے۔

ادراک کا کوئی عمل بھی غیر شعوری نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ضمیر کی بیداری اور ادراک کی فطرت ہے۔ وجود اور ادراک دونوں ایک چیز ہیں۔ دو ایسی الگ الگ چیزیں نہیں ہیں جو کہ ایک دوسرے کے ساتھ مل گئی ہیں۔ وہ جس کو سبب کی ضرورت نہیں نامحدود ہے۔ پس ادراک خود آخری ثبوت ہے، یہ ابدی ہے۔ یہ ہمیشہ باطنی ہوتا ہے۔ ادراک کا خود اپنا ایک ادراک کرنے والا ہوتا ہے۔ ادراک روح کے اندر نہیں ہوتا بلکہ وہ کو لاتا ہے۔ یہ مطلق ہے۔ تنہا گیا ، پس ادراک حقیقت میں آتما ہے۔ ادراک خود ادراک کرتا ہے لیکن آتما گیاتی نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ آگہی کی وجہ سے ایک جاننے والا ایسا بن جاتا ہے لیکن شنکر آچاریہ کہتے ہیں یہ آتما "میں" نہیں ہے۔ کیونکہ شعور کی یہ بیداری میں ہوں۔ (آہم) آتما میں نہیں ہوتی۔ ہم آتما کا محض عکس ہیں اور آتما اور برہم ایک ہیں۔

جب آپ مطلق کے بارے میں سوچتے یا بات کرتے ہیں تو آپ کو تمام نسبتی دلائل سے کام لینا پڑتا ہے

---

غبار خاطر صفحہ ۵۵

یوگ میں ادراک اور احساس ایک ہوتے ہیں۔ وشسشٹ ادویت جس کے سب سے بڑے معلم رامانج تھے، کے نزدیک ان کا ملاپ جزوی ہے اور اَدویت کی طرف ایک قدم ہے۔ وشسشٹ کا مطلب تفریق ہے۔ پراکرتی دنیا کی فطرت ہے اور یہ تغیر پذیر ہے۔ متلون نظریات جن کا اظہار متلون الفاظ میں ہو کبھی مطلق کو ثابت نہیں کر سکتے۔ محض اس طریقہ پر کسی ایسی چیز تک پہنچ سکتے ہیں جو منفی ہو، کچھ خاص اقسام تک پہنچ سکتے ہیں خود برہم تک نہیں۔ باقی وصل تک پہنچ سکتے ہیں جو کہ اعلیٰ ترین نچوڑ ہے لیکن نسبت کے عدم وجود تک نہیں۔



ویروار۔ 8/ رجولائی

[آج کا درس زیادہ تر سانکھیہ فلسفہ کے نتائج کے خلاف
شنکر آچاریہ کے دلائل کے بارے میں تھا۔]

فلسفۂ سانکھیہ کے ماننے والوں کا کہنا ہے کہ خود آگہی مرکب ہے اور اس سے پرے آخری تجزیہ ہمیں 'پرش' شاہد کا پتہ دیتا ہے۔ لیکن پرش بہت سے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک ایک پرش ہے۔ اس کے برعکس اَدویت کا کہنا ہے کہ پرش صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ وہ پرش نہ خود آگاہ ہو سکتا ہے نہ غیر خود آگاہ نہ وہ کوئی حد شناس رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ آگہی کبھی نہیں اور وہ کائنات یا کسی اور شے کا سبب نہیں بن سکتا۔ وید کہتے ہیں: "ابتدا میں صرف ایشور تھا جس کا کوئی شریک اور ثانی نہیں ہے"۔

آگہی کے ساتھ ستو کی موجودگی سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ ستو آگہی کا سبب ہے۔ اس کے برعکس آدمی کے اندر پہلے سے جو کچھ موجود ہے، ستو اس سے مبادلت طلب کرتا ہے، جیسے کہ آگ لوہے کے ٹکڑے کو جو کہ انگاروں پر رکھا ہوا تھا، اس کے اندر داخل ہو کر نہیں بلکہ باہر سے اپنے شعلوں سے اسکو گرم کر دیتی ہے۔
شنکر آچاریہ کہتے ہیں، گیان بندھن نہیں ہے، کیونکہ یہ ایشور کا سبھاؤ ہے، خواہ پوشیدہ خواہ ظاہر، دنیا ہمیشہ سے ہے۔ پس ایک اَیاہی ظاہر کا وجود ہے۔

گیان، شکتی، کریا (علم قوت اور حرکت) ایشور ہے۔ وہ کسی شکل و صورت کا محتاج نہیں۔ کیونکہ صرف ایک محدود نہ کو نامحدود گیان کے حصوں کیلئے ایک رکاوٹ کی حیثیت سے شکل کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں کوئی "محرک روح" نہیں ہے، صرف ایک آتما ہے۔ جیو (انفرادی روح) اس جسم کی بیدار حکمران ہے جس کے اندر زندگی کے پانچ اصول آکر متحد ہو جاتے ہیں، تاہم وہ جیو بھی آتما ہے۔ کیونکہ کل آتما ہے۔ آپ اس کے بارے میں جو کچھ سوچتے ہیں وہ آپ کا فریب ہے۔ یہ فریب جیو کے اندر نہیں ہے۔ آپ ایشور ہیں اور اس کے علاوہ جو اور کچھ سوچتے ہیں وہ باطل ہے۔ آپ کو بھگوان کرشن کی صورت میں بھی خود اپنی ہی پوجا کرنی ہوگی۔ کرشن جی کا

کرشن جی کی حیثیت میں نہیں، صرف خود شناسی اور خود پرستی سے ہی نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہاں تک کہ ساکار ایشور ہے لیکن وہ ظاہری خودی ہے شنکر آچاریہ کا قول ہے۔ اپنی حقیقت کو تلاش کرنے کے لئے انتہائی انہماک بھگتی کہلاتا ہے۔

ایشور تک پہنچنے کے لئے ہم جو راستے اختیار کرتے ہیں، وہ سیچے ہیں یہ بالکل اسی طرح ہے۔ جس طرح ہم قطب ستارے (دھرو) کی تلاش کے وقت اس کے آس پاس کے ستاروں سے نشان دہی کرتے ہوئے اسے تلاش کریں۔

---

بھگوت گیتا ویدوں پر بہترین سند ہے۔

---

شکروار - 19 رجولائی

اگر میں "آپ" کہتا ہوں تو مجھے اس ایشور کے بارے میں بولنے کا حق ہو جاتا ہے۔ جو ہمارا محافظ ہے۔ جب میں دوسرے کو دیکھتا ہوں تو مجھے تمام نتائج کو بھگتتے ہوئے خود کو تیسرا تصور کر لینا چاہیئے جو کہ مطمح نظر ہے۔ اور ہمارے درمیان موجود ہے۔ یہ مثلث کا سرا ہے۔ کہر برف بنتا ہے، اس کے بعد پانی اور پھر گنگا لیکن جب یہ کہر ہی ہوتا ہے تو کوئی گنگا نہیں ہوتی۔ جب یہ پانی ہوتا ہے تو ہمیں اس کے اندر کوئی کہر دکھائی نہیں دیتا۔ تخلیق یا تبدیلی کا ارادہ کے ساتھ اٹوٹ تعلق ہے۔ جب تک ہم سمجھتے ہیں کہ یہ دنیا حرکت میں ہے۔ اس وقت تک ہمیں فرض کر لینا چاہیئے کہ اس کے پیچھے ارادہ کارفرما ہے۔ مادی سائینس ثابت کرتی ہے کہ شعور فریب کلی ہے اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے، جیسا کہ ہم اسے دیکھتے، سنتے اور محسوس کرتے ہیں یا سیکھتے ہیں۔ خاص ارتعاش، خاص نتائج پیدا کرتا ہے، جو ہمارے شعور پہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہم صرف نسبتی خصوصیات سے واقف ہیں۔

حق و صداقت کے لئے سنسکرت میں "ست" کا لفظ آتا ہے۔ ہمارے موجودہ نقطۂ نظر کے مطابق یہ دنیا ہمیں اپنے ارادہ اور ضمیر کے مطابق نظر آتی ہے۔ ساکار ایشور کا اپنے لئے اس قدر وجود ہے۔ جس قدر ہمارے لئے ہمارا اپنا اس سے زیادہ نہیں۔ ایشور کو بھی ایک شکل میں بالکل اسی طرح دیکھا جا سکتا ہے۔ جس طرح ہم دکھائی دیتے ہیں۔ ایک آدمی کی حیثیت سے ہمارا کوئی ایشور ہونا چاہیئے لیکن ایک ایشور کی حیثیت سے ہمیں کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے۔ شری رام کرشن نے ہمیشہ دیوی ماں کو اپنے سامنے دیکھا۔ دیوی ماں انہیں اپنے ارد گرد دوسری چیزوں کے مقابلہ میں زیادہ حقیقی روپ میں ہمیشہ

دکھائی دیتی تھی۔ لیکن سمادھی کے اندر سوائے اپنے آپ کے اور کوئی نہیں ہوتا۔ ساکار البشعور قریب سے قریب تر آتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اوجھل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد نہ ساکار البشعور کی حیثیت باقی رہتی ہے نہ "میں" کی سب کچھ خود ہی اس میں فنا او رجذب ہو جاتا ہے۔

شعور کی بیداری اور خود آگہی ایک غلامی ہے۔ ترتیب کے دلائل کا دعوےٰ ہے کہ ذہانت کو شکل پر فوقیت حاصل ہے۔ لیکن اگر خود ذہانت کسی چیز کا سبب بن جائے تو اپنے طور پر یہ خود معلول بن جاتی ہے اور یہی مایا ہے۔ البشعور ہمیں بناتا ہے اور ہم البشعور کو بناتے ہیں اور یہی مایا ہے۔ رُوح جسم کی خالق ہے اور جسم رُوح کا۔ انڈے سے مرغی پیدا ہوتی ہے اور مرغی سے انڈا۔ درخت سے تخم ہوتا ہے اور تخم سے درخت۔ دُنیا میں نہ تو پورے طور پر ہم رنگی ہے اور نہ پورے طور پر تفریق۔ انسان آزاد ہے اور اس کو دونوں صورتوں سے اُوپر اُٹھنا چاہیئے۔ دونوں اپنی جگہ پہ درست ہیں۔ لیکن حق و صداقت تک پہنچنے کے لیئے ہر حالت میں ہمیں ان تمام وجُودوں سے جن کے بارے ہمیں علم ہے فائق ہونا چاہیئے۔ جیو کی کوئی حقیقی انفرادیت نہیں ہے۔ بظاہر یہ مرکب ہے لیکن اس کے عناصر الگ الگ بکھر جائیں گے۔

عنصری کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا، اور دُنیا دیہی بچائی ہے۔ نجات لافانیت اور عرفان ہے۔ اس پر فریب انفرادیت کو باقی رکھنے کی تمام کوششیں باری ہیں اور اس انفرادیت کو ختم کرنے کی تمام کوششیں

خواہ یہ کوشش ارادی طور پہ یا غیر ارادی طور پر۔ تمام اخلاقیات کی بنیاد علیحٰدگی پسندی اور جھوٹی انفرادیت کی جاپ پر ہے۔ کیونکہ یہی تمام گُناہوں کی جڑ ہے۔ اخلاق کا وجود سب سے پہلے ہے بعد میں مذہب اس کی توضیح کرتا ہے۔ رسُومات پہلے ہوتی ہیں اور دیومالا ان کی وضاحت کے لیئے ہوتی ہے۔

جب واقعات پیش آرہے ہوتے ہیں تو وہ عقل و منطق کی بجائے کسی ایسے اعلےٰ دستورِ حیات کے مرہون منت ہوتے ہیں جو انہیں سمجھنے کی کوشش سے وجود میں آتا ہے۔ دلیل کوئی مقصدی قوّت نہیں ہے، یہ بعد میں جگالی کرتا ہے۔ دلیل انسانی عمل کی تاریخ داں ہوئی ہے۔

بھگوان بُدھ ایک عظیم ویدانتی تھے (کیونکہ بُدھمت فی الحقیقت ویدانت کی محض ایک شاخ ہے) شنکر آچاریہ کو بھی ایک دَرپردہ بُدھ کہا جاتا ہے۔ بھگوان بُدھ نے ویدانت کا تجزیہ کیا اور شنکر آچاریہ نے امتزاج پیدا کیا۔ بھگوان بدھ کسی چیز کے سامنے نہیں جُھکے۔ نہ تو وید کے سامنے، نہ ذات پات، نہ پنڈتوں پجاریوں اور نہ رسم و رواج کے سامنے۔ جہاں تک دلائل نے انکی ہمرکابی کی، وہاں تک وہ بخوبی کیساتھ عقل و دلیل سے کام لیتے گئے۔ ایسی بے خوفانہ تلاشِ حق و صداقت اور ہر ایک جاندار کیلیئے ایسی بے پناہ محبّت دنیا میں کبھی نہیں دیکھی گئی۔ بھگوان بدھ مذہبی دُنیا کے واشنگٹن تھے۔ انہوں نے ایک تخت و تاج کو فتح کر کے دنیا کے حوالے کر دیا بالکل اسی طرح جارج واشنگٹن امریکی غلام کیلیے نے کیا ہے۔

---

غبارِ خاطر

# حاجتِ مُرشد

سنیچروار۔ 20 جولائی

ادراک ہی صرف حقیقی آگہی اور مذہب ہے۔ اگر ہم اس کے بارے میں صدیوں تک باتیں کرتے رہیں تو اس طرح ہم خود شناس نہیں ہو سکیں گے۔ نظریات اور مادیت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے حق تو یہ ہے کہ مادّہ پرست زیادہ حقیقت پسند انسان ہوتا ہے۔ ہرایک قدم جو میں روشنی میں اُٹھاتا ہوں ہمیشہ کے لئے میرا ہے جب آپ ایک ملک میں جاتے ہیں اور اس کو دیکھتے ہیں تو وہ آپ کا مُلک ہے، ہم میں سے ہر ایک کو خود شناس بننا ہے مُعلّم تو صرف راستہ بتا سکتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ ہمیں خوراک بہم پہنچا سکتے ہیں لیکن اس خوراک کو کھانا، ہضم کرنا اور اس سے توانائی حاصل کرنا ہمارا کام ہے۔ دلائل سے کبھی ایشور کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ منطقی دلائل سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

اپنے سے باہر ایشور کو پانا ناممکن ہے۔ ہماری رُوح کے اندر وہ تمام تقدیس موجود ہے جو کہ ہمارے باہر ہے۔ ہم عظیم ترین مندر ہیں۔ باہر جو نظر آتا ہے وہ محض اس چیز کا جس کو ہم اپنے اندر دیکھتے ہیں پھیکا ملمع ہے۔

روحانی طاقتوں کا ایک جگہ اجتماع ہی واحد ذریعہ ہے جس کی مدد سے ہم ایشور کو دیکھ سکتے ہیں، اگر آپ ایک روح (اپنی روح) کو جان گئے تو ماضی، حال اور مستقبل کی تمام روحوں کو جان گئے۔ ارادہ روح کی طاقتوں کو مجتمع کرتا ہے۔ کچھ خاص چیزیں اس ارادہ کو اُبھارتی اور اس پر کنٹرول کرتی ہیں جیسے عشق و محبّت اور معرفت، بالکل اسی طرح جیسے ہم سانس لیتے ہیں۔ رُوحانی طاقتوں کا اجتماع ایک چراغ کی مانند ہے جس کی ضیاباری سے رُوح کا ظاہر گوشہ منور ہو جاتا ہے۔

---

غبارِ خاطر صفحہ ۵۹

کوئی ایک طریقہ سب کو راس نہیں آسکتا۔مختلف طریقے ایک دوسرے کے بعد اُٹھائے جانے والے قدم نہیں ہیں۔رسومات ادنیٰ درجہ کی چیزیں ہیں۔ان کے بعد ساکار ایشور ہے اور پھر خدائے باطن۔ بعض حالتوں میں مدارج ارتقا کی ضرورت پڑتی ہے لیکن بہت سی حالتوں میں صرف ایک ہی طریقہ کافی رہتا ہے۔ہر ایک آدمی سے یہ کہنا انتہائی بے وقوفی کی بات ہوگی کہ آپ کو "گیان" تک پہونچنے سے قبل کرم اور بھگتی کی راہوں سے گزرنا ہوگا۔

اس وقت تک اپنی دلیل وفکر کی راہ پر گامزن رہیئے جب تک کہ آپ کسی اعلیٰ منزل تک نہ پہنچ جائیں۔ اعلیٰ منزل کے بارے میں آپ کو خود بخود یقین ہو جائے گا کیونکہ وہاں دلیل کا کوئی دخل نہیں ہوگا۔خود آگہی کے بعد وجدان (سمادھی) کی منزل آتی ہے۔لیکن غلطی سے مجنونانہ وجد کو حقیقی شئے نہ سمجھیئے۔غلط طور پر اس کو وجدان سمجھ لینا ایک خوفناک بات ہے۔وجدان کا کوئی ظاہری معیار نہیں ہے۔ہم اُسے صرف اپنے اندر محسوس کر لیتے ہیں۔ہمارے مدارج ارتقا میں غلطی نہیں ہوسکتی۔دلیل اس راہ میں کام آتی ہے۔مذہب تمام تر دلائل سے ماوراء ہے لیکن دلیل ہی کے ذریعہ ہمیں اس تک رہنمائی ملتی ہے عقل حیوانی برف کے مانند ہے۔دلیل پانی اور وجدان کی حیثیت کُہر کی ہے ایک چیز دوسری کے بعد آتی ہے۔ہر چیز لاشعور، شعور، ذہانت مادّہ جسم اور رُوح کے ابدی سلسلہ میں گُندھی ہے اور ہمیں یوں معلوم ہوتا ہے کہ زنجیر ایک خاص کڑی سے رُجوع ہوئی ہے ہمیں پہلے اس کو پکڑنا چاہیئے دونوں طرف کے دلائل میں وزن ہے اور دونوں طرف کے دلائل سچّے ہیں۔ہمیں دونوں سے ماوراء ہونا چاہیئے۔اور ایک ایسے مقام تک پہنچنا چاہیئے جہاں نہ ایک کا دخل ہو نہ دوسرے کی رسائی یہ سلسلہ مایا کا ہے۔

مذہب دلیل سے بالاتر ہے یہ فطری قوتوں سے بالاتر قوت کا نتیجہ ہے۔ایمان اعتقاد نہیں ہوتا۔ یہ کُل کو جذب کرتا ہے ایک روشنی ہے سب سے پہلے سُنیئے پھر دلائل سے کام لیجئے اور وہ تمام تر معلومات حاصل کیجئے جو دلائل ذریعہ آتما کے بارے میں حاصل ہوسکتی ہیں اس کے بارے میں دلائل کا سیلاب بہا دیجئے پھر جو کچھ باقی رہ جائے اُسے اُٹھا لیجئے۔اگر کچھ باقی نہ بچے تو خدا کا شکر بجا لائیے کہ آپ اوہام پرستی سے بچ گئے۔جب آپ کو پختہ یقین ہو جائے کہ آتما کو کوئی چیز بہا کر نہیں لے جاسکتی اور نیز یہ کہ یہ ہر امتحان سے گزر کر باقی رہتی ہے تو اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیجئے اور دوسروں کو اس کی

---

غبارِ خاطر　　　　صفحہ ۶۰

تلقین کیجیے۔ سچائی جزُوی نہیں ہوسکتی یہ سب کے لئے ہے۔ نتیجہ کے طور پر مکمل سکون اور سکوت میں اس کی طرف دھیان کیجیے۔ اپنی رُوحانی قوتوں کو اس پر جمع کر دیجیے اور خود کو اس میں شامل کرکے ایک ہو جایئے۔ پھر کسی تقریر کی ضرورت نہیں رہے گی۔ خاموشی سچائی کو لے کر چلے گی۔ باتوں میں اپنی طاقت کو ضائع نہ کیجیے بلکہ خاموشی کے ساتھ دھیان کیجیے۔ باہری دُنیا کو اپنے دھیان میں مخل نہ ہونے دیجیے جب آپ کی رُوح اعلیٰ ترین حالت میں ہوتی ہے تو آپ کو اس کا علم نہیں ہوتا۔ خاموشی میں طاقت کو جذب کر لیجیے اور رُوحانیت کا بارود بن جایئے۔ ایک بھکاری کیا دے سکتا ہے؟ صرف ایک راجہ ہی دے سکتا ہے اور وہ راجہ اس وقت کہلا سکتا ہے جب وہ خود کسی کے آگے ہاتھ پھیلائے ہوئے نہ ہو۔

دولت ایشور کی ہے خود کو اس کا نگراں سمجھیے اس کے ساتھ کوئی تعلق خاطر نہ پیدا کیجیے۔ بس نام و نمود اور دولت کو جانے دیجیے کیونکہ یہ خوفناک بندھن ہیں۔ آزادی کے حیرت ناک ماحول کا احساس کیجیے۔ آپ آزاد ہیں آزاد، آزاد میں تقدس ہوں میں آزاد ہوں۔ میں نامحدود ہوں۔ میری رُوح کا نہ کوئی آغاز ہے نہ انجام۔ میں خود ہوں میں ہی خدا ہوں۔

## اتوار 21 جولائی (پتنجلی مہارشی کا یوگ سُوتر)

یوگ کا مطلب ہے چت[1] ورتیوں (مَن کی لہروں) کو منتشر ہونے سے روکنا ہے رُوح احساسات اور حواس، عمل اور ردِ عمل سے مرکب ہے۔ آتما کا ایک سوکشم سَریر (لطیف جسم) ہوتا ہے جس کے ذریعہ یہ ستھول سَریر (جسم کثیف) میں کام کرتی ہے۔ ویدانت کہتا ہے کہ چت کے پیچھے بھی آتما ہی کارفرما ہے۔ یہ دوسری دونوں صفات کو تسلیم تو کرتا ہے لیکن فوقیت تیسری ہی کو دیتا ہے جو ابدی ہے قطعی ہے اور ذاتِ باری ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ ع

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب    موت کیا ہے انہیں اجزاء کا پریشاں ہونا

اور وصل وہ ہے جہاں انسان ذاتِ باری کو دیکھ لیتا ہے۔ جہاں کسی قسم کا کوئی اضطرار نہیں ہے، اور جہاں مکمل استحکام و سکون ہے۔

ہر ایک لہر کے پیچھے پورا سمندر ہوتا ہے لہروں کی حیثیت مظاہر جیسی ہے۔ لہریں کچھ بڑی ہوتی ہیں

---

[1] دل کے چار پہلو ہیں۔ (۱) مَن (۲) چیت (۳) بدھی اور (۴) اہنکار۔

---

غبارِ خاطر    صفحہ ۶۱

کچھ چھوٹی لیکن وہ سب اپنی ماہیت کے اعتبار سے سمندر ہوتی ہیں تاہم لہروں کی صورت میں ان
کی حیثیت فرد کی ہوتی ہے، جب لہریں پُرسکون ہوتی ہیں تو تمام ایک ہوتی ہیں۔ مہارشی پتنجلی کہتے
ہیں" یہ ایک تماشہ ہے لیکن جس کا تماشائی نظر نہیں آتا جب رُوح سرگرم کار ہوتی ہے تو آتما اس میں
جذب ہو جاتی ہے۔ پُرانی شکلوں کے سلسلہ وار جلد جلد اعادہ کو حافظہ کہتے ہیں۔ لاتعلق رہیئے۔ علم
ہی قوت ہے۔ ایک کا حصول دوسرے کا ذریعہ حصول ہے۔ علم سے آپ مادّی دُنیا تک کو فنا کر سکتے ہیں
جب آپ یزدانی طور پر کسی ایک شئے کے مختلف پرتو کے متعلق کچھ سوچ سکتے ہیں تو پھر آپ کو یہ قوت بھی
مل سکتی ہے کہ آپ جب چاہیں اس شئے کا تصور تک آپ کے ذہن سے فنا ہو جائے

جو لوگ تیار ہوتے ہیں وہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں اور چھ ماہ کے اندر یوگی بن سکتے ہیں
کم ترقی یافتہ کئی سال لے سکتے ہیں اور کوئی بھی شخص وفادارانہ کاموں اور ہر چیز کو ترک کر دینے اور خود کو
عمل کے لئے وقف کر دینے سے بارہ سال میں منزلِ مقصود پر پہنچ سکتا ہے۔ اِن ذہنی ورزشوں کے بغیر بھی
آپ بھگتی کے ذریعہ بھی اس منزل پر پہنچ سکتے ہیں لیکن یہ بہت سُست اور لمبا راستہ ہے۔

ایشور آتما ہے جتنا کہ رُوح دیکھتی اور محسوس کرتی ہے۔ اس کا اعلیٰ ترین نام اوم ہے۔ بس
اس کو دُہرایئے۔ اس پر دھیان حق ہے اور اس کی تمام تر حیرت انگیز فطرت اور خصوصیت کے بارے
میں سوچیے۔ مسلسل اوم کا جاپ سچّی بھگتی اور اصل عبادت ہے اوم کوئی لفظ نہیں ہے بلکہ خود
ایشور ہے۔

مذہب آپ سے کوئی نئی بات نہیں کہتا، یہ صرف رکاوٹوں کو دُور کرتا ہے تاکہ آپ خود
کو دیکھ سکیں۔ بنیادی پہلی بڑی رکاوٹ ہے، ایک صحت مند جسم بہترین ذریعہ ہے۔ افسردگی تقریباً
ایک ناقابلِ عبور رکاوٹ ہے۔ اگر آپ ایک بار برھم کو جان لیں تو نہ آپ افسردہ ہو سکتے ہیں نہ مشتبہ
نہ غلط نظریات کا شکار ہو سکتے ہیں اور نہ ہی دوسری رکاوٹیں آپ کے پاؤں میں زنجیر ڈال سکتی
ہیں۔ پران نازک ترین طاقتوں کا نام ہے جو حرکت کا ذریعہ ہیں۔ پران دس قسم کے ہیں پانچ مخفی
ہیں اور پانچ ظاہری۔ ایک عظیم لہر اوپر کو جاتی ہے اور ایک نیچے کو آتی ہے۔ پرانایام کا مطلب
سانس کے ذریعہ پرانوں پر کنٹرول کرنا ہے۔ سانس ایندھن ہے اور پران بھاپ اور جسم انجن،
پرانایام کے تین حصے ہوتے ہیں۔ پورک (اندر سانس لینا)، کمبھک (سانس کو روکنا)، ریچک

سانس کو خارج کرنا)

گورو کے ذریعہ ہی یزدانی شعور آپ تک پہنچتا ہے ہر شخص پڑھا سکتا ہے لیکن ششیہ (چیلے)
تک رُوحانیت گُورو کے ذریعہ ہی پہنچنی چاہیئے اور صرف گورو کی تعلیم دینی بارآور ہوگی۔ گورو اور
ششیہ کے درمیان بھائی چارہ کا تعلق ہوتا ہے اور ہندوستان میں فی الواقع اس کو درجہ آئین
حاصل ہے۔ گورو ششیہ کو وہی منتر دے دیتا ہے جو اس نے اپنے پیش روؤں سے حاصل کیا ہوا
ہوتا ہے۔ گورو کے بغیر کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ گورو بِن گت نہیں۔ بلکہ حقیقت میں گورو کے بغیر (بخت خطرہ)
ہوتا ہے۔ عام طور پر گورو کے بغیر یوگ کے ان طریقوں پر عمل کرتا ہے انسان حرص و ہوا کا شکار
ہو جاتا ہے لیکن گورو دھارن کرنے سے شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو ہر ایک اِشٹ، کا ایک منتر ہے۔
عبادت کرنے والے کے نزدیک اِشٹ کا ایک تصور ہوتا ہے اور منتر تو محض اس کا ذریعہ اظہار ہوتا
ہے۔ جاپ کا مقصد تمام تر یکسوئیِ قلب کو اس تصور میں فنا ہونا ہوتا ہے پُوجا کا یہ طریقہ
ہندوستان بھر میں تمام قسم کے دھارمک فرقوں میں رائج ہے

## منگل وار۔ 23 جولائی (بھگوت گیتا، کرم یوگ)

کرم کے ذریعہ آزادی حاصل کرنے کے لئے خود کو کرم میں شامل کر دیجئے، کوئی خواہش نہ رکھیے،
کسی کرم پھل کی توقع نہ کیجئے۔ ایسے کرم سے ہی مُکتی ملتی ہے۔ ایسا کرم ہی سچا گیان دیتا ہے جو مُکتی دینے
والا ہوتا ہے سا کام کرم بندھن ہے اور نشکام کرم مُکتی ودتا کام سے نہ تو لذتِ نفس حاصل ہوتی ہے
اور نہ ہی اولیّت یہ روح اور جسم ہے جو کام کرتے ہیں، "میں" نہیں مسلسل خود کو یہ بات جتاتے رہیئے
اور اس کو محسوس کیجئے۔ یہ جاننے کی کوشش نہ کیجئے کہ آپ کرم کر رہے ہیں۔

تمام کرم اس طرح کیجئے کہ گویا آپ عبادت کر رہے ہیں یا ایشور کے آگے کچھ ارپن کر رہے ہیں۔ دُنیا
میں رہیئے لیکن دُنیا کے ہو کر نہیں۔ کنول کے پھُول کی طرح رہیئے کہ جو کیچڑ میں رہنے کے باوجود داغدار نہیں
ہوتا اور ہمیشہ پاک و صاف رہتا ہے۔ کوئی آپ سے بُرا سلوک کرتا ہے اس بات کو فراموش کرکے اپنے عشق
و محبت کی دولت سب پر لُٹاتے چلیئے جس طرح ایک اندھا رنگ کو نہیں دیکھ سکتا۔ اِسی طرح ہم کسی بُرائی
کو نہیں دیکھ سکتے جب تک وہ ہمارے اپنے اندر موجود نہ ہو۔ ہم جو کچھ باہر دیکھتے ہیں اس کا موازنہ اس شے،

سے کرتے ہیں جو ہمارے اندر موجود ہوتی ہے اور پھر اسی کے مطابق کوئی فیصلہ کرتے ہیں۔ اگر ہم پاک و صاف ہیں تو ہم گندگی، ناپاکیزگی کو نہیں دیکھ سکتے اس کا وجود ہوسکتا ہے لیکن ہمارے لئے نہیں۔ ہر مرد عورت اور بچے کے اندر صرف ایشور کو ہی دیکھئے اپنے اندر کی روشنی انتر جوت کے ذریعہ اس کو دیکھئے اور اس کو دیکھنے کے بعد ہم کسی اور شئے کو نہیں دیکھ سکتے۔ اس دُنیا کی خواہش نہ کیجئے۔ کیونکہ آپ جس چیز کی خواہش کرتے ہیں وہی آپ کو ملتی ہے۔ ایشور اور صرف ایشور کی جستجو کیجئے۔ جتنا زیادہ مال وزر ہوگا اُسی قدر زیادہ قید ہوگی اور اسی قدر زیادہ خوف ہوگا۔ ہم ایک چیونٹی کے مقابلہ میں کتنے زیادہ خوف زدہ اور مصیبت زدہ ہوتے ہیں! ان تمام چیزوں کو ختم کیجئے اور ایشور تک پہنچئے۔ صانع قدرت، سرشٹی کا گیان حاصل کیجئے اور اس کی بنائی ہوئی کائنات ہی میں نہ کھو جائیے۔ مَیں ہی کرم آتا ہوں اور میں ہی کرم ہوں"۔ وہ جو کہ ہوس اور غصہ کے طوفان پر قابو حاصل کر لیتا ہے بڑا یوگی ہوتا ہے۔"

صرف ریاضت اور ترکِ تعلق سے ہی ہم نفس پر فتح حاصل کر سکتے ہیں۔ ہمارے ہندو بزرگوں نے بیٹھ کر ایشور اور اخلاقیات کے بارے میں سوچا تھا ہمارے پاس بھی دماغ ہے اور ہم بھی سوچ سکتے ہیں لیکن فائدہ حاصل کرنے کی عاجلانہ کوشش سے اس بات کا احتمال ہے کہ جو کچھ ہم نے پایا تھا ہم ان کو پھر نہ کھو بیٹھیں۔

جسم کے اندر خود ایسی شکتی موجود ہے جو اس کا علاج کرتی ہے اور کئی چیزوں سے علاج کی یہ شکتی اپنا کام کرنے لگتی ہے جیسے ذہنی حالت۔ یا دوائیں یا کسرتیں، جس وقت تک ہم جسمانی تکلیف میں مبتلا رہتے ہیں اس وقت تک ہمیں دواؤں اور ڈاکٹروں کی امداد کی حاجت ہوتی ہے۔ جب تک ہم اعصاب کو غلامی سے چھٹکارا نہیں دلاتے ہم ان کی ضرورت کو ختم نہیں کر سکتے۔

بے خبر دماغ بھی ہے لیکن یہ شعور کی بیداری اور خود آگہی سے نیچے ہے اور انسان کے جسمانی نظام کا ایک حصّہ ہے۔ فلسفہ دماغ کے بارے میں ایک اندازہ ہے۔ مذہب کی بنیاد حواس خمسہ پر قابو پانے کے علم پر ہے اور اس کا مقصد علمِ الٰہی حاصل کرنا اور خدا کو دیکھنا ہے۔ لاشعور دماغ کے تعلق میں جو چیز آتی ہے حقیقت ہوتی ہے۔ آپتا وہ ہوتے ہیں جنہیں مذہب کی حس ہوتی ہے۔ ثبوت یہ ہے کہ

---

غبار خاطر صفحہ ۶۴

اگر آپ ان کے طریقوں کی پیروی کریں تو آپ ہی دیکھ سکیں گے۔ ہر سائنس کے لئے اس کے خاص علم طریقوں اور آلات کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک ہیئت دان آپ کو باورچی خانہ کے برتنوں اور توے چولھے سے کہکشاں کو نہیں دکھا سکتا اس کو ایک دوربین کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس اسی طرح مذہب کے عظیم حقائق کو جاننے کے لئے ان لوگوں کے طریقوں پر عمل کرنا چاہیئے جنہوں نے خدا کو دیکھا اور پایا جتنا بڑا علم ہوگا اُسی قدر عظیم اس کے حصول کے ذرائع ہوں گے۔ دُنیا میں ہمارے آنے سے پہلے ایشور نے دُنیا سے نکلنے کے ذرائع مہیا کر دیئے تھے۔ بعض ذرائع کو دریافت کرنا ہے۔ لیکن طریقوں کے بارے میں لڑائی نہ کیجئے۔ اور وہ طریقہ اختیار کیجئے جو آپ اپنے لئے موزوں سمجھتے ہوں۔ آم کھایئے۔ اور گٹھلیوں سے کام نہ رکھیئے۔ مسیح کو دیکھئے اور اس کے بعد ہی آپ مسیحی ہو سکتے ہیں۔ باقی سب فضول باتیں ہیں اور باتیں جس قدر کم کی جائیں بہتر ہے۔

پیغام پیغمبر سُناتا ہے اور خدا اسے بتاتا ہے پیغمبر پیغام کو اور مندر خدا کو نہیں بناتا۔

اِس وقت تک ریاضت وعبادت کرتے رہیئے جب تک کہ ایشور کا نور آپ کے چہرہ پر نہ دمکنے لگ جائے۔ جیسا کہ شویت کیتو کے چہرہ پر جھلکتا تھا۔

اندازہ کے خلاف اندازہ کرنے کا نتیجہ لڑائی ہے لیکن آپ نے جو کچھ دیکھا ہے اگر آپ اس کی بات کریں تو کوئی مزاحمت نہ کرے گا۔ سینٹ پال کی زندگی میں پریتی حاصل ہونے پر ہی انقلاب آیا تھا۔

منگل وار شام (دوپہر کے کھانے کے بعد) تھوڑی دیر بات چیت ہوئی بات چیت کے دوران سوامی جی نے کہا تھا) فریب سے فریب جنم لیتا ہے۔ فریب خود ہی پیدا ہوتا ہے اور خود اپنے آپ فنا ہو جاتا ہے' وہی مایا ہے' وہ تمام نام نہاد علم جس کی بنیاد مایا پر ہے۔ بُرائی کا چکر ہے اور وقت پر یہ علم خود اپنے آپ تباہ ہو جاتا ہے۔ فریب آتما کو چھو نہیں سکتا۔ اس لئے اس کی فکر نہ کیجئے۔ جب ہم اسی کو پکڑ لیتے ہیں ہمارا مایا کے ساتھ تعلق جُڑ جاتا ہے وہ ہم پر قابو پا لیتی ہے اس کو نظر انداز نہ کر دیجئے' صرف شاہد کی حیثیت سے رہیئے۔ اسی صورت میں آپ بغیر کسی مداخلت کے تصویر کائنات کی حمد وثنا کر سکیں گے

## بُدھوار 24 جولائی

یوگ کے عمل سے جو طاقتیں حاصل ہوتی ہیں وہ مکمل یوگی کے لئے رکاوٹ نہیں بنتی۔ لیکن ایک

مبتدی کے لئے وہ رُوکاوٹیں بن جاتی ہیں۔ اُن کی مشق سے انھیں جو مسرت اور جوش حاصل ہوتا ہے
اس کی وجہ سے یہ روکاوٹیں اس کے لئے پیدا ہوتی ہیں۔ سدھیوں کی طاقتیں عمل میں کامیابی کی
علامتیں تھیں ان کو مختلف ذرائع سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً بار بار منتر جپنے سے، یوگ کے عمل
سے، مراقبہ اور برت رکھنے سے یہاں تک کہ جڑی بوٹیوں اور دواؤں کے استعمال سے بھی، وہ یوگی جو کہ
حاصل شدہ طاقتوں کے اندر تمام دلچسپیوں پر قابو پالیتا ہے اور جو اپنے عمل سے پیدا شدہ تمام
نیکیوں سے ترکِ تعلق کرلیتا ہے وہ "نیکیوں کے بادلوں" میں داخل ہوجاتا ہے (سمادھی کی ایک
کیفیت کا نام ہے) اور وہ اپنے تقدس کو اسی طرح عام کرتا ہے جس طریقہ پر بادل بارش کرتا ہے۔

عبادت کے کئی ذرائع ہوسکتے ہیں۔ یکسوئیِ قلب ایک ذریعہ ہے۔

رُوح کو آتما سے معرفت حاصل ہے لیکن یہ خود روشن ضمیری سے بہرہ ور نہیں ہوتی۔ آتما
کسی چیز کا سبب نہیں بن سکتی یہ کس طرح ہوسکتا ہے؟ کس طرح پُرش خود کو پراکرتی کے ساتھ جوڑ
سکتا ہے؟ وہ نہیں کرسکتا۔ یہ کہنا کہ ایسا کرسکتا ہے محض پُرفریب تصور ہے۔

* * * * * * * * * * * * *

دلی رحم اور ترس کھاتے ہوئے امداد کرنا سیکھئے۔ اور اس احساس کے بغیر امداد کرنا سیکھئے
کہ کوئی غیر ہے۔ دوست اور دشمن سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرنا سیکھئے۔ تب جب آپ ایسا کرنے
لگیں گے تو کوئی خواہش باقی نہیں رہے گی اور منزلِ مقصود ہاتھ آجائے گی۔

بے تعلقی کے کلہاڑے سے خواہشات کے بڑکے پیڑ کو کاٹ دیجئے۔ یہ بالکل ختم ہوجائے گا۔ "یہ سب
دھوکہ ہے" وہ جس کی افسردگی اور توہم ختم ہوگیا وہ جس نے بے تعلقی سے پیدا ہونے والی برائیوں کو جیت
لیا ہے۔ صرف وہ آزاد مُکت ہے۔"

ذاتی طور کسی سے عشق کرنا قید ہے۔ سب کے ساتھ یکساں طور پر محبت کیجئے پھر تمام خواہشات
دفن ہوجائیں گی۔

وقت جو ہر شئے کو فنا کرجانے والا ہے آتا ہے دوسری ہر چیز فنا ہوجاتی ہے۔ زمین کو ترقی
دینے اور تتلی پر رنگ ریزی کرنے کا کیا فائدہ؟ آخر کار ان سب چیزوں کو فنا ہوجانا ہے۔ پن چکی
کا سفید چوہا نہ بنئے جو کہ ہمیشہ کام کرتا ہے لیکن کسی چیز کو حاصل نہیں کرتا ہر ایک خواہش میں برائی

پنہاں ہوتی ہے خواہ وہ خواہش اچھی ہو یا بُری یہ بالکل اُسی طرح ہے جیسے ایک کُتا گوشت کے ایک ٹکڑے کی طرف جھپٹے اور گوشت کا ٹکڑا اُس کی دسترس سے دُور رہے اور آخر وہ کُتا ہلکان ہو کر مرجاتا ہے۔ اس کُتّے کی طرح نہ بنیئے۔ ہر قسم کی خواہش کو ختم کردیجئے۔

• پرماتما مایا کے حکمراں ہونے کی حیثیت سے ایشور کہلاتا ہے اور مایا کے زیرِاثر پرماتما کا نام جیوآتما ہے۔ مایا تمام مظاہر کا مجموعہ ہے اور یہ آخرکار ختم ہو جائے گی۔

یہ دُنیا پراکرتی مایا ہے یہ حقیقت نہیں، ایشور کی پراکرتی ہے جو ہم مایا کے اندر دیکھتے ہیں۔ کسی چیز کے بارے میں دلیل و منطق سے کام لینا مایا ہے یہ پوچھنا کہ مایا کیوں آئی ایک بےکار سوال ہے کیونکہ اس سوال کا جواب مایا میں کبھی نہیں دیا جاسکتا اور مایا سے اُوپر اُٹھنے پر اس سوال کو کون پوچھے گا؟ "کیوں" بدی کی پیداوار ہے، "بدی کیوں" کی نہیں اور یہ بدی ہے جو کیوں کا سوال کرتی ہے۔ فریب فریب کو ختم کرتا ہے۔ دلیل خود چونکہ اس کی بنیاد تضاد پر ہے۔ ایک دائرہ ہے اور خود کو ختم کردیتا ہے اور اندری سُکھ آتمک وسُکھ کا ایک نشان ہے۔ لیکن یہ سب اندری سُکھ آتما سے ہی ملتا ہے۔ جہالت ایشور کے نُور کی پرچھائیں ہے جو دکھائی دیتی ہے لیکن خود اس میں کچھ نہیں ہے جب تک ابر پر سُورج کی روشنی نہیں پڑتی وہ دکھائی نہیں دیتا۔

چار مسافر تھے جو ایک اونچی دیوار کے قریب پہنچے پہلا بدقت تمام اُچھل کر دیوار پر پہنچا اور پیچھے دیکھے بغیر دوسری طرف کود گیا۔ دوسرا دیوار پر پہنچا اور ادھر اُدھر دیکھنے کے بعد مسرت کا نعرہ لگا کر کُود گیا۔ جب تیسرے کی باری آئی تو وہ دیوار پر پہنچا اس نے اسی طرف کو دیکھا جہاں اس کے ساتھی پہنچے تھے اور قہقہہ لگا کر اسی طرف کُود گیا چوتھا یہ بتانے کے لئے واپس ہوگیا کہ اس کے ساتھیوں کو کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ پرے کچھ ہے۔ ان لوگوں کے قہقہوں کی صدائے بازگشت ہے جو مایا کی دیوار کو پھلانگ گئے۔

✻ ✻ ✻ ✻ ✻ ✻ ✻ ✻

خود کو کُل سے الگ کرنے اور اس کو کچھ خصوصیتیں دینے سے ہمیں ایشور ملتا ہے۔ یہ کائنات کی ایک حقیقت ہے جو ہمیں اپنی رُوح میں دکھائی دیتی ہے بشیطانیت عذاب دیتا ہے جو کہ ایک توہم پرست کی رُوح میں دکھائی دیتا ہے۔

---

غبارِ خاطر صفحہ ۶۷

## منگل وار- 25 جولائی (مہارشی پتنجلی کا یوگ سوتر)

چیزیں عمل میں لائی جاسکتی ہیں۔ عمل میں لائے جانے کا سبب ہوسکتی ہیں اور ان پر اظہار پسندیدگی کیا جاسکتا ہے۔" اور ہم پر اُن کا اثر تقریباً یکساں ہوتا ہے۔

مکمّل پرہیزگاری (زُہد) عظیم ذہنی اور رُوحانی طاقت عطا کرتی ہے۔ برہم چاری کو جنسی طور پر خیالات الفاظ اور عمل کے اعتبار سے پاک وصاف ہونا چاہیئے جسم پرش چھوڑ دیجئے۔ اِس کے بارے میں شعور کو جہاں تک مُمکن ہوسکے ختم کردیجئے۔

آسن اس طرح لگایئے جس پر آپ تن کر آسانی کے ساتھ بیٹھ سکیں اس آسن پر بیٹھ کر مسلسل ریاضت سے کام لیجئے۔ اپنے دھیان کو ایشور پر جمایئے وہ آپ پر ظاہر ہو جائے گا۔

کسی ایک چیز کی طرف مسلسل توجہ کا نام دھیان ہے۔ جب رُکے ہوئے ساکن پانی میں ایک پتھر پھینکا جاتا ہے تو بہت سی لہریں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہر ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی ان میں تعلق پیدا ہوتا ہے کیونکہ لہر سے لہر بنتی ہے۔ یہی کیفیت ہمارے دِلوں کی ہے۔ صرف ہمارے اندر عمل غیر شعوری طور پر ہوتا ہے لیکن یوگی کے اندر یہ شعوری ہوتا ہے۔ ہماری حیثیت جالے کے اندر ایک مکڑی کی ہے یوگ پر عمل سے مکڑی کی طرح کسی بھی تار سے گزر جاتے ہیں۔ غیر یوگی ایک جگہ پڑے رہنے کے لئے مجبور ہیں۔

* * * * * * * *

دوسرے کو نقصان پہنچانا قید پیدا کرنا اور سچائی کو چھپانا ہے منفی نیکیاں کافی نہیں ہیں ہمیں مایا پر فتح پانی ہے اس کے بعد وہ ہمارے پیچھے لگ جائے گی۔ ہم اُسی وقت چیزوں کے مستحق ہیں جب وہ ہمیں اپنی طرف کھینچنا چھوڑ دیں۔ جب حقیقی اور سچے طور پر قید ختم ہو جاتی ہے تمام چیزیں ہمیں حاصل ہوتی ہیں صرف وہی لوگ جو کوئی خواہش نہیں کرتے مالک کائنات ہوتے ہیں اور کسی ایسی ہی روح کی شرن چاہیئے جو غلامی کے بندھنوں کو توڑ چکی ہو اور ایسی رُوح اپنی دَیا درشٹی سے آپ کو مکت کردے گی اس سے بھی کہیں اچھا ہے کہ آپ ایشور کی شرن لیجئے۔ لیکن ایسی شرن لینا انتہائی مشکل کام ہے، صدیوں کے بعد ایک آدمی ہوتا ہے جو حقیقت میں ایسا کرتا ہے، کسی چیز کو محسوس نہ کیجئے کسی نہ جانیئے کچھ نہ کیجئے کچھ نہ رکھیئے، ہر چیز ایشور پر چھوڑ دیجئے اور کہیئے۔ "تیری رضا و رغبت ہی

---

میرے لئے سب کچھ ہے ہم صرف اس قید کے خواب میں سے گزر رہے ہیں، بیدار ہو جایئے۔ یہ طلسم خواب ٹوٹ جائے گا۔ ایشور کی شرن لیجئے۔ اسی طرح ہم مایا کے ریگستان کو عبور کر سکتے ہیں" یہ خیال دِل سے نکال دے کہ چیزوں پر تیرا اختیار ہے سنیاسی اپنے نفس پر قابو رکھتا ہے ـــــــ اوم تت ست اوم!"

یہ ہمارا استحقاق ہے کہ ہمیں دانی بننے کی اجازت دی گئی ہے کیونکہ صرف اسی طریقہ پر ہم بڑھ سکتے ہیں غریب آدمی اسی وجہ سے غریب ہے کہ ہم اس کی امداد کر سکیں۔ دینے والے کو چاہیئے کہ وہ گھٹنوں کے بل جھک جائے اور کہے شکریہ۔ لینے والے کو چاہیئے کہ وہ کھڑا رہے اور دینے کی اجازت دے۔ ہر شخص کے پیچھے ایشور ہوتا ہے اسی کو دیکھئے۔ جب ہم برائیوں سے محفوظ ہو جائیں گے تو یہ دنیا ہمارے نزدیک ختم ہو جائے گی۔ کیونکہ اس کا ظاہر صرف اس غلطی سے ہماری گلو خلاصی کے لئے ہی ہے۔ یہ سوچنا کہ وہاں کچھ خامی ہے خامی کو جنم دیتا ہے۔ وصف اور طاقت کے نظریات ہی صرف اس بیماری کا علاج ہیں۔ جتنی بھی آپ بھلائی کر سکتے ہیں وہ کریں کچھ برائی اس میں ہو سکتی ہے لیکن ذاتی نتائج کی پرواکئے بغیر بھلائی کے تمام کام کیجئے۔ تمام پھل ایشور پر چھوڑ دیجئے، پھر اس کے بعد نہ تو آپ پر بھلائی کا کوئی اثر ہوگا اور نہ برائی کا۔

کرم کرنے کا نام مذہب نہیں ہے لیکن صحیح طور پر کرم کرنے سے آزادی ملتی ہے حقیقت میں تمام تر رحم تاریکی ہے۔ کیونکہ رحم کس پر کیا جائے۔ کیا آپ ایشور پر رحم کر سکتے ہیں؟ اور کیا اس کے علاوہ بھی کوئی اور چیز ہے جس پر آپ رحم کرنا ہے۔ ایشور کا شکر ادا کیجئے کہ اس نے آپ کو آپ کی ترقی میں امداد دینے کے لئے یہ دنیا بطور اخلاقی ورزش گاہ کے طور پر بخشی ہے۔ کبھی یہ نہ سوچئے کہ آپ دنیا کی کوئی مدد کر سکتے ہیں جو آپ کو برا کہتا ہے اس کا شکریہ ادا کیجئے کیونکہ وہ آپ کو آئینہ دکھاتا ہے کہ اس میں آپ اپنی برائی کو دیکھ سکیں۔ ساتھ ہی آپ کو ایک قوتِ برداشت عطا ہوئی ہے پس اس کا شکریہ ادا کیجئے بغیر ورزش کے طاقت نہیں ملتی۔ اسی طرح بغیر آئینہ کے ہم اپنی صورت کو نہیں دیکھ سکتے۔

غیر شائستہ تصور کی حیثیت بالکل وہی ہے جو غیر شائستہ عمل کی ہے۔ ایسی خواہشات جن پر کنٹرول حاصل ہو چکا ہو۔ اعلیٰ ترین نتائج کی حامل ہوتی ہیں جنسی طاقت کو روحانی طاقت

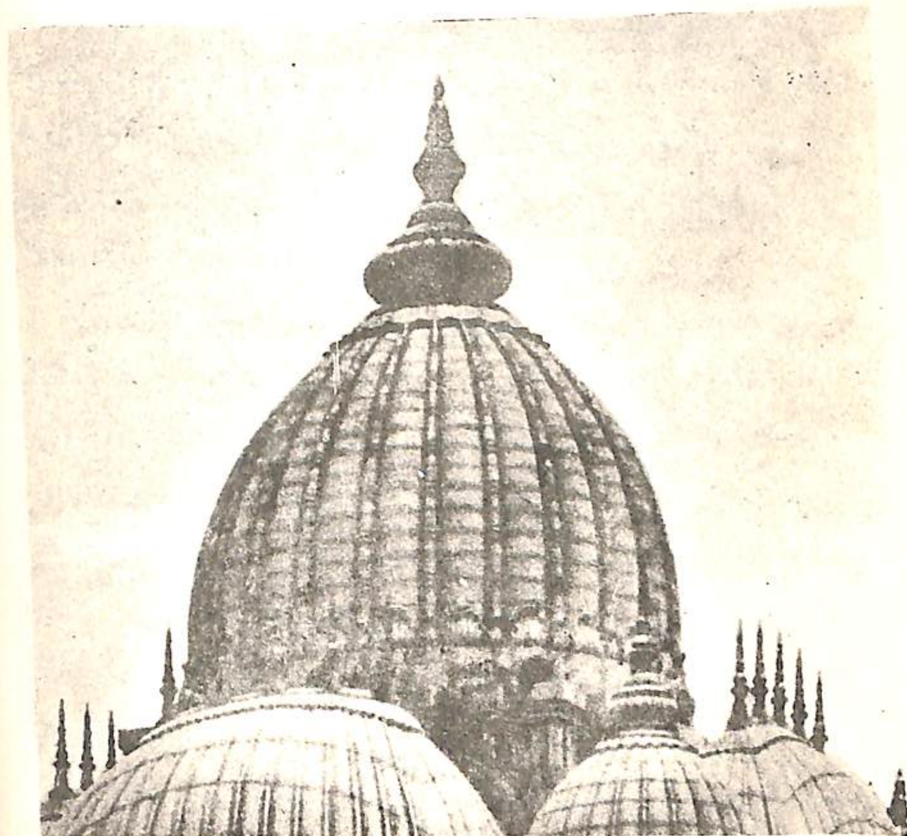
---

غبارِ خاطر صفحہ ۹۹

میں تبدیل کر دیجئے۔ لیکن نامرد نہ بنیئے کیونکہ ایسا کرنا طاقت و توانائی سے ہاتھ دھو بیٹھنا ہے جس قدر مضبوط یہ طاقت ہوگی۔ اسی قدر زیادہ اس سے کام لیا جا سکتا ہے۔ پانی کی صرف طاقت بہترین بجلی پیدا کرتی ہے۔

آج ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ جاننا ہے کہ خدا ہے نیز یہ کہ ہم اس کو یہاں اور ابھی دیکھ اور محسوس کر سکتے ہیں۔ شکاگو کے ایک پروفیسر کا کہنا ہے "اس دُنیا کی خبر گیری کیجئے ایشور باقی کی خبر گیری کرے گا"۔ کیا بے وقوفی کی بات ہے اگر آپ دُنیا کی خبر گیری کریں گے تو پھر ایک ایسے ایشور کی کیا ضرورت باقی رہ جائے گی جو دوسروں کی خبر گیری کرتا ہو۔

---



شری رام کرشن مندر، بیلور مٹھ کا کلس

# اُپنشدوں کا نچوڑ

## شکروار 26 جولائی (برہدارنیک اُپنشد)

تمام چیزوں کے ساتھ اپنے کیلئے اور اپنے ذریعہ محبّت کیجئے یہ اُپدیش تھا جو مہرشی یاگیہ ولکیہ نے اپنی رفیقہ حیات میتری کو دیا تھا آتما کے ذریعہ ہمیں ہر چیز کا علم ہوتا ہے، آتما کبھی آگاہی کا پرتو نہیں ہوسکتی نہ ہی گیانی گیان ہوسکتا ہے۔ وہ جو جانتا ہے، آتما ہے وہ خود دستور و آئین ہے وہ اس بات سے واقف ہے کہ وہ ہی کائنات ہے وہی اس کا خالق ہے۔

* * * * * *

قدیم دیومالاؤں کو دوام بخشنے کیلئے اُنہیں دُوسری مثالوں کے ساتھ بیان کرنے اور اُنہیں بہُت زیادہ اہمیّت دینے سے توہّم پرستی آتی ہے اور حقیقت میں یہ ایک کمزوری ہے حق و صداقت کو کسی چیز کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا جانا چاہیئے۔ حق و صداقت کی تعلیم دیجئے اور کسی توہّم کیلئے کوئی گنجائش نہ رکھیئے نہ ہی حق و صداقت کو بیان کرتے ہوئے سُننے والے کی سطح پر کھینچ کر لائیے۔

* * * * * * * * *

## سینچروار ۔27۔ جولائی ۔ (کٹھ اُپنشد)

علم خودشناسی صرف اسی سے سیکھئے جو اُس کو جانتا ہو اور خود شناس ہو دوسرے سبھی سکھانے والے محض باتونی ہوتے ہیں۔ خدا اصل خُدا نیکی بدی سے مستقبل اور ماضی سے اور دوسرے ہر قسم کے تضاد سے ماورا ہے ایک بے عیب شخص خودی کو جانتا ہے اسکے اندر بے پناہ ابدی سکون آجاتا ہے۔

---

بعض باتیں کرنے دلائل دینے کتابیں پڑھنے اور ذہنی پروازیں کرنے بلکہ خود دیدبن جانے سے خود شناسی کا گیان حاصل نہیں ہوسکتا۔

ہمارے اندر دو چیزیں ہیں ایشوری رُوح پرما تما۔ انسانی رُوح آتما۔ عارف اس بات سے واقف ہے کہ آخر الذکر ہے مگر محض ایک سایہ اور یہ کہ اوّل الذکر ہی صرف حقیقی سورج ہے۔

جب تک ہم شعور کو رُوح کے ساتھ ہم آہنگ نہ کریں ہماری آنکھ کان، ناک وغیرہ کام نہیں کرسکتے۔ باہر کی اندریوں کو ہم اندر کی اندریوں کے ذریعہ ہی استعمال میں لاتے ہیں۔ حواس کو باہر نہ جانے دیجئے۔ تب آپ جسم اور باہری دُنیا کی تمام قیدوں سے نجات حاصل کرلیں گے۔

یہ انتہائی پُر اسرار چیز جس کو ہم یہاں بیرونی اشیاء کی حیثیت سے دیکھتے ہیں مرنے والے اپنے عقائد کے مُطابق دوزخ اور جہنّم کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ یہاں اور اس کے بعد ، دو خواب ہیں، آخر الذکر کا تصوّر پہلے کا مرہونِ منّت ہے۔ دونوں سے نجات حاصل کیجئے۔ خُدا ہر جگہ موجُود ہے حاضر و ناظر ہے۔ وہی حال ہے وہی مستقبل ہے۔ پرکرتی۔ شریر اور من مرجاتے ہیں۔ لیکن ہم نہیں مرتے۔ نہ ہم مرتے ہیں نہ پیدا ہوتے ہیں۔ سوامی وویکا نند کے نام کا جو انسان آپ کے سامنے ہے وہ پیدا بھی ہوا تھا اس لئے مرے گا بھی لیکن جو اصل سوامی وویکا نند ہے وہ نہ پیدا ہوا تھا نہ مرے گا۔ یہ ابدی اور نا قابل تبدیلی حقیقت ہے۔

دل و دماغ کی طاقت کو خواہ ہم پانچ شعوروں میں تقسیم کریں یا ایک ہی سمجھیں اس کی طاقت وہی رہتی ہے۔ ایک اندھا آدمی کہتا ہے ہر چیز میں صدائے بازگشت ہوتی ہے۔ میں تالی بجاتا ہوں اور اس کی صدائے بازگشت کو سُن کر اپنے آس پاس کی تمام چیزوں کے بارے میں بتا سکتا ہوں۔ پس کہُر میں ایک اندھا آدمی حفاظت کے ساتھ آنکھوں والے کی رہنمائی کرسکتا ہے اسکے لئے کہُر یا تاریکی کوئی فرق پیدا نہیں کرتی۔

دماغ کو قابُو میں کیجئے۔ احساسات کو ختم کر دیجئے۔ تب آپ ایک یُوگی بن جائیں گے اس کے بعد مکمل سکُون آئے گا۔ سُننے۔ دیکھنے۔ سونگھنے اور ذائقہ لینے سے اِنکار کر دیجئے۔ بیرونی اندریوں سے تمام آتمک شکتی کھینچ لیجئے۔ آپ مسلسل غیر شعوری طور پر بھی عمل کرتے ہیں اس لئے آپ اِس کو شعوری طور پر کرنا سیکھئے۔ من اپنی مرضی کے مُطابق احساسات سے کام لے سکتا ہے۔ اس بُنیادی وہم سے نجات حاصل کیجئے کہ آپ اُس جسم کے ذریعہ ہی سب کچھ کرسکتے ہیں ورنہ ہم کچھ نہیں۔ خود اپنے دِلوں میں جھانکئے اور اپنے دِلوں کے اندر ہی سے اپنشدوں کے امرت رس کو حاصل کیجئے۔ آپ عظیم ترین کتاب ہیں نہ ایسی

---

غبارِ خاطر صفحہ ۷۲

کتاب کبھی لکھی گئی اور نہ آئندہ لکھی جائے گی۔ آپ ہر شے کے نا محدود امین ہیں، جب تک اندر کا معلم انکشاف نہ کرے تب تک تمام باہری تعلیمات بے اثر رہتی ہیں۔ کتابیں پڑھنے کا مزا تو تب ہے کہ آپ کے دِل کی کتاب کھُل جائے۔

خواہش ایک بے حِس و حرکت چھوٹی سی آواز ہے اور حقیقی حکمران جو کرو" یا نہ کرو" کہتا ہے۔ خواہشات ہمیں مجبور بنا دیتی ہیں۔ جہالت ہمیں بندھنوں میں باندھ دیتی ہے اور علم ہمیں اُن سے آزاد کرتا ہے۔ ارادہ کو ہزاروں طریقوں سے مضبوط بنایا جا سکتا ہے ہر طریقہ ایک یوگ ہے لیکن باقاعدہ یوگ سے ہی منزل بہت جلد ملتی ہے بھگتی کرم راج اور گیان یوگ زیادہ موثر ثابت ہوتے ہیں فلسفہ ریاضت، عبادت اور مراقبہ سب طاقتوں کو اپنائیے بادبان کھول دیجئے۔ اور اس ندی کو پار کرنے کیلئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیجئے جتنی جلدی آپ یہ کر سکیں

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

بپتسمہ خارجی پاکیزگی کیلئے دیا جاتا ہے اصل مقصد باطنی طہارت سے ہے اس کی ابتدا بدھ دھرم سے ہوئی۔

عشائے ربانی (مقدس روٹی) غیر تہذیب یافتہ قبائل کی پرانی رسم کی یادگار ہے کبھی کبھی وہ اپنے سرداروں تک کو قتل کر دیا کرتے تھے اور اُن کا گوشت کھا جاتے تھے تاکہ اُن کے سرداروں کے اندر جو خوبیاں تھیں وہ اُن کو نصیب ہو سکیں اور اُن کا یقین تھا کہ جو خصوصیات اُن کے سرداروں کو بہادر اور دانشور بناتی ہیں اس طرح اُن کے اندر آجائیں گی اور بجائے ایک آدمی کے پورا قبیلہ بہادر اور دانشور بن جائے گا۔ اِنسانی قربانی کا تصور یہودیوں میں بھی تھا اور موسیٰ کے عذاب سے بار بار خوف دلانے کے باوجود وہ اس رسم سے چمٹے رہے۔ عیسیٰ انتہائی شریف النفس اور پیکرِ محبت تھے لیکن یہودیوں کے اعتقادات کے ساتھ میل پیدا کرنے کے لئے اُنھوں نے انسانی قربانی کے تصور کا کفارہ بکرے کی قربانی دینے کی رسم ڈالی۔ لیکن اس ظالمانہ تصور کی وجہ سے عیسائیت مسیح کی تعلیمات اور مسیح سے دور ہو گئی اور اس کے اندر انتقام لینے اور جنگ و جدل کرنے کا جذبہ ترقی کر گیا۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

کہتے یہ کام میں نے اپنا سو دھرم سمجھ کر کیا فرض جان کر نہیں اور پھر جو چاہئے کیجئے۔

---

غبارِ خاطر صفحہ ۷۳

فتح صرف حق کی ہوتی ہے۔ جھوٹ کی نہیں۔ حق پر قائم رہیئے۔ آپ کو خدا مل جائے گا۔

* * * * * * * *

شروع زمانہ ہی سے ہندوستان میں برہمن ذات کے لوگ خود کو ہر ایک قانون سے ماوراء سمجھتے رہے ہیں کیونکہ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ دیوتا ہیں وہ عزیب ہیں۔ لیکن ان کی کمزوری یہ ہے کہ وہ اقتدار کے بھوکے ہیں۔ یہاں تقریباً چھ کروڑ لوگ ہیں جو بھلے ہیں اور نیک ہیں وہ صاحب جائیداد نہیں اور وہ جو کچھ ہیں ویسے ہی ہیں۔ کیونکہ پیدا ہونے کے بعد ہی سے اُنہیں یہ سکھایا جاتا ہے کہ وہ ہر قانون اور ہر سزا سے بلند ہیں وہ اپنے آپ کو دوسری بار پیدا ہونے والے اور خدا کے بیٹے تصور کرتے ہیں۔

## اتوار۔ 28۔ جولائی کراُودھوت گیتا یا دتاتریہ مہرشی بھگوت گیتا[1]

"تمام آگہی کا انحصار من کی شانتی پر ہے"۔ "وہ جس نے کائنات بنائی ہے اور سچائی ہے وہ جو میری آتما ہے میں اس کے لئے نمسکار کروں"؟

"آتما کو اپنی فطرت کی حقیقت سے جان لینا ہی گیان بھی ہے اور یوگ بھی" "میں وہ ہوں"۔ اس حقیقت میں ذرّہ برابر بھی شک نہیں ہے"۔

"کوئی خیال کوئی لفظ کوئی کام میرے لئے بندھن پیدا نہیں کرتا، میں تمام احساسات سے پرے ہوں۔ میں ہی گیان ہوں میں ہی آنند ہوں"۔

یہاں نہ کوئی وجود ہے۔ عدم وجود جو کچھ ہے آتما ہے نسبتوں کے تمام تصورات کو ہلا ڈالیئے تمام توہم پرستی کو ہٹا ڈالیئے۔ ذات پات پیدائش اور دیوی دیوتاؤں کے تمام تصورات کو ختم کر دیجیئے۔ ہونے اور بننے کی بات کیوں؟ دویت اور ادویت کے متعلق یہ بحث و مباحثہ کیوں؟ اور آپ دو اور ایک کی بات کرتے ہیں بس شٹی ایشور اور صرف ایشور ہے۔ خود کو پاکیزہ بنانے کے لئے یوگ کی بات نہ کیجیئے۔ آپ اپنی فطرت سے پاکیزہ ہیں۔ کوئی آپ کو تعلیم نہیں فرما سکتا۔

اِس طرح کے آدمی جنہوں نے یہ شلوک لکھے ہیں درحقیقت وہ لوگ ہیں جنہوں نے مذہب کو زندہ رکھا ہے اور جنہوں نے ایشور کو پایا ہے وہ کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتے۔ جسم کی کسی تکلیف کو محسوس نہیں کرتے

[1] دتاتریہ مہرشی اترے اور انسوئیا کے بیٹے تھے، اور انہیں برھما وشنو اور مہیش کا اوتار کہا جاتا ہے۔

# حاصل کلام

## اتوار۔ 14۔ اگست

"انجان جس کی پوجا کرتا ہے اس کو میں تیری طرف تلقین کرتا ہوں"۔ یہ ایک اور تنہا ایشور تمام رازوں کا محرم راز ہے جو ایک ہے ہم اس کو ہر جگہ دیکھتے ہیں۔ سب اپنی خودی سے آگاہ ہیں۔ سب جانتے ہیں "میں ہوں"۔ یہاں تک کہ جانور بھی۔ جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ خودی کی خارجی سطح ہے۔ بچوں کو یہ سمجھائیے کیونکہ وہ اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ ہر مذہب نے ارادی اور غیر ارادی طور پر خودی کی پرستش کی ہے۔ کیونکہ اسکے علاوہ کچھ اور ہے ہی نہیں۔

زندگی کے ساتھ یہ مکروہ وفاداری جیسا کہ ہم یہاں اس کو سمجھتے ہیں تمام برائیوں کا سرچشمہ ہے یہ تمام اس عیاری و مکاری کا سبب ہے۔ یہ دولت کو ایک دیوی بنا دیتا ہے اور تمام برائیاں اور فرق اسی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر آپ کسی کے ساتھ وفادار نہ رہیں۔ یہاں تک کہ زندگی کے ساتھ بھی نہیں تب کوئی خوف باقی نہیں رہے گا جو اس دُنیائے رنگ و بو میں کھو جاتا ہے وہ بار بار پیدا ہوتا ہے اور بار بار مرتا ہے۔ ہمارے لئے دُنیا کے اندر کوئی جسمانی یا ذہنی موت نہیں ہو سکتی بشرطیکہ ہم یہ محسوس کریں کہ سب ایک ہے۔ تمام جسم میرے ہیں پس یہاں تک کہ یہ جسم ابدی ہے کیونکہ درخت جانور۔ سورج۔ چاند یعنی کائنات کی ہر شئے، میرے جسم کے اندر ہے تب یہ مر کیسے سکتا ہے۔ ہر دماغ اور ہر خیال میرا ہے تب موت کیسے آسکتی ہے۔ خودی نہ کبھی پیدا ہوتی ہے نہ مرتی ہے۔ اگر ہم اس کو محسوس کریں تو تمام خوف ختم ہو جائیں گے۔ "میں ہوں"، میں جانتا ہوں۔ میں محبت کرتا ہوں ان پر کبھی شک

---

غبار خاطر

صفحہ ۸۵

نہ کیجئے۔ یہاں کوئی بھوک نہیں ہے۔ کیونکہ جو کوئی بھی کھاتا ہے سمجھ لیجئے کہ میں ہی کھاتا ہوں جیسے جسم سے ایک بال جھڑنے پر ہم مطلقاً یہ نہیں سوچتے کہ ہم مرگئے ہیں تو پھر ایک جسم کے مرنے سے ہم کیسے فنا ہوسکتے ہیں کیونکہ ایک جسم کا مرنا ایک بال کے جھڑنے کے مترادف ہے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

لاشعور ایشور ہے وہ تقریر خیال اور شعور کی بیداری سے بالاتر ہے۔ تین درجات ہوسکتے ہیں۔ ظلم (تاسی)، انانیت (راجی) اور تقدیس (ستو) جن لوگوں نے اعلیٰ درجہ کی حالت حاصل کرلی ہے وہ قطعی طور پر حیاتِ جاوداں کو حاصل کرچکے ہیں ان کے لئے فرض مرجاتا ہے وہ صرف محبت کرتے ہیں اور مقناطیس کی طرح دوسروں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ یہی نجات ہے آپ پھر اخلاقی کام نہیں کرتے۔ لیکن جو کچھ آپ کرتے ہیں وہ اخلاقی ہوتا ہے۔ برھمو دیتا (ایشور کو جاننے والا) تمام دیوی دیوتاؤں سے افضل ہے۔ فرشتے عیسٰی کی خدمت کرنے اس وقت آئے جب اُنہوں نے فریب کا پردہ چاک کردیا تھا اور اعلان کیا تھا " شیطان پیچھے ہٹ جا! ۔ برھم دیتا کسی کی امداد کا محتاج نہیں ہوتا۔ کیونکہ پوری کائنات اس کے سامنے گھٹنوں کے بل جھکتی ہے۔ اس کی ہر خواہش پوری ہوتی ہے۔ اُس کی رُوح دوسروں کو پاکیزہ بناتی ہے۔ اس لئے اگر آپ ایشور کو پانا چاہتے ہیں تو برھم ونیا کی پُوجا کیجئے۔ جب ایشور کے تین عطیات ہمارے پاس ہیں ایک انسانی جسم، آزادی حاصل کرنے کی شدید خواہش اور راستے دکھانے کے لئے ایک عظیم روح کی اعانت تب لازمی طور پر ہم نجات حاصل کرسکیں گے۔ مُکتی آگے بڑھ کر ہمارے قدموں کو بوسہ دے گی۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

جسم کی ہمیشہ کے لئے موت واقع ہوجانا نروان ہے یہ منفی پہلو ہے اور کہتا ہے۔ "میں یہ نہیں ہوں یہ نہیں ہوں" ویدانت ایک قدم اور آگے اٹھاتا ہے اور مثبت پہلو پر زور دیتا ہے۔ مُکتی یا نجات میں ست چت آنند ہوں۔ میں ہی وہ ہوں سوہنگ سوہنگ یہی ویدانت ہے۔ محرابِ رُوحانیت کا بنیادی پتھر۔

شمالی بُدھ ازم کے وارثوں کی بڑی اکثریت مُکتی پر یقین رکھتی ہے وہ حقیقت میں ویدانتی

---

ہیں صرف لنکا کے بُدھ نروان کو فنا مانتے ہیں۔

کوئی یقین اور اہنکار "میں" کو نہیں مٹا سکتا۔ یقین سے جو کچھ ملتا ہے وہ بے اعتقادی کے ساتھ جو متلازم ہوتا ہے سب فریب ہے کوئی شئے آتما کو نہیں پڑھاتی۔ مَیں خود اپنے آپ کو پرنام کرتا ہوں۔ میں جو ترے ہوں میں خود کو پرنام کرتا ہوں۔ میں ہی برہم ہوں" جسم ایک تاریک کمرہ ہے جس کے اندر ہم داخل ہوتے ہیں یہ روشن ہو جاتا ہے۔ زندہ ہو جاتا ہے۔ روشنی کو کبھی کوئی چیز متاثر نہیں کرتی۔ اس کو برباد نہیں کیا جا سکتا اس کو ڈھکا جا سکتا ہے لیکن مٹایا نہیں جا سکتا۔

اِس زمانہ میں ایشور کی پُوجا ماں کے طور پر ہونی چاہیئے کیونکہ ماں ایک نامحدود شکتی ہے۔ اس سے ہمارے اندر پاکیزگی پیدا ہوگی اور یہاں امریکہ میں بے پناہ طاقت پیدا ہو جائے گی۔ یہاں نہ تو مندر ہیں جو پستی کی طرف لے جائیں نہ غریب ملکوں کی طرح یہاں لوگ مصیبت میں ہیں۔ عورتیں ابتدائے کائنات سے غم اُٹھاتی رہی ہیں اس لئے کہ ان کے اندر نامحدود قوتِ برداشت اور بے پناہ استقلال دیکھتا ہے اور پھر وہ ایک راسخ العقیدہ رہتی ہیں۔ اسی وجہ سے اس نے توہماتی مذاہب تک کی اعانت کی ہے۔ اور ہر ایک ملک کے اندر پجاریوں کی حمایت کی ہے اور یہی صفت انہیں نجات دلائے گی۔ ہمیں ویدانتی بننا ہوگا۔ اور زندگی کے اس عظیم نظریہ کے سانچہ میں ڈھالنا ہوگا۔ عوام کو اُسے اختیار کرنا چاہیئے اور صرف آزاد امریکہ میں ایسا ہو سکتا ہے ہندوستان میں بُدھ، شنکر اور دوسرے اوتاروں نے انفرادی طور پر ویدانت کے نظریہ کو عملی جامہ پہنایا لیکن دستورِ عوام کی تہ میں اس نئے زمانہ میں عوام کو ویدانت کے مطابق زندگی گذارنی چاہیئے اور ایسا صرف عورتوں کے ذریعہ ہی ہوگا۔

پیّاری اور خوب صورت ماں کو اپنے خانۂ دل میں تمامتر عقیدت و احترام کے ساتھ بسا لو۔"

سُوائے زبان کے ہر چیز کو پھینک دو، زبان کو باقی رکھو تاکہ وہ" ماں! ماں" کا جاپ کر سکے"۔

دل کے اندر کسی بڑے خیال کو جگہ نہ دو۔ اے میرے دل! میں اور صرف تو ماں ہی کے جلوہ میں گم رہیں اور دیکھتے رہیں۔

ماں تم اس ظاہری دُنیا سے بہت پرے ہو۔ تم میری زندگی کا چاند ہو۔ تم میری زندگی

---

غبارِ خاطر صفحہ ۷۷

کی زندگی ہو، میری رُوح کی رُوح'

## اتوار شام

جس طرح رُوح کے ہاتھ میں جسم ایک آلہ ہے۔ اِسی طرح آتما کے ہاتھ میں رُوح ایک آلہ ہے۔ مادّہ باہر کی تحریک ہے اور رُوح اندر کی۔ تمام تبدیلیاں شروع ہوتی ہیں اور بروقت ختم ہو جاتی ہیں۔ اگر آتما فانی ہے تو اس کو مکمل ہونا چاہیئے اگر مکمل ہے تو نا محدود ہونا چاہیئے اس کو صرف ایک ہونا چاہیئے کیونکہ نا محدود دو نہیں ہو سکتے۔ بس آتما اور خودی کو ایک ہی ہونا چاہیئے۔ اگرچہ یہ مختلف معلوم ہوتی ہیں فی الحقیقت یہ صرف ایک ہے۔ اگر کوئی شخص سُورج کی طرف چلتا ہے تو ہر قدم کے بعد اُسے ایک نیا سُورج نظر آئے گا تاہم سُورج وہی ہے جو تھا۔

اسی تمام اتحاد کی بُنیاد ہے جیسے ہی بنیاد ہل جاتی ہے نتیجہ میں تکمیل ہو جاتی۔ یہ اگر تمام رنگوں کو ملا کر یک جا کر دیا جائے تو مصوری ختم ہو جائے گی۔ مکمل یکسانیت ہی سکون ہے ہم مختلف مظاہر کو ایک وجود سے تعبیر کرتے ہیں۔ تاؤ مذہب کے سامنے والے (یہ مذہب چینی حکیم لاؤ زے نے شروع کیا) کنفوشش بدھ۔ ہندو۔ یہودی۔ مُسلمان۔ عیسائی اور زرتشتی تمام اس سُنہری اُصول کی تلقین کرتے ہیں اور تقریباً ایک جیسے الفاظ میں توجیہ کرتے ہیں۔ لیکن ہندوؤں نے اس کو منطقی ڈھنگ پر پیش کیا ہے کیونکہ وہ دلیل سے واقف ہیں۔ آدمی کو دوسروں سے پیار کرنا چاہیئے کیونکہ دوسرے اس کے اپنے ہیں۔ یہاں صرف ایک ہے باقی صرف خدا ہے۔

دُنیا بھر کے تمام بڑے مذہبی پیشواؤں میں سے صرف حکیم لاؤتزے Laotze, بدھ اور عیسٰی نے سُنہرے اُصولوں کو درجۂ کمال تک پہنچایا اور کہا اپنے دشمنوں کے ساتھ Buddha, بھلائی کر دان لوگوں سے بھی پیار کرو جو تم سے نفرت کرتے ہیں۔

اُصول موجود ہے ہم محض اُس کو دریافت کرتے ہیں۔ مذہب کا انحصار محض احساس پر ہے۔ اُصول طریقے تو ہوتے ہیں۔ مذہب نہیں ہوتے۔ تمام مذاہب ایک ہی مذہب کے اطلاق کے مختلف طریقے ہیں جو مختلف قوموں نے اپنی اپنی ضرورتوں کے مطابق اختیار کر لئے۔ نظریات کا نتیجہ صرف جنگ ہے۔ اس طرح ایشور کا نام جس کا کام اَمن پھیلانا ہے نصف دُنیا کے خون خرابہ کا باعث

---

غبار خاطر صفحہ ۷۸

بنا ہے۔ خدا ہی سے سوال کیجئے کہ وہ کیا ہے جب تک وہ جواب نہ دے وہ نہیں ہے وہ خدا ہی کیا جو آپ کے سوال کا جواب نہ دے۔ ہر مذہب یہی تلقین کرتا ہے کہ خدا ہر ایک کی سنتا ہے اور میرے سوال کا جواب دیتا ہے۔ کچھ اپنے کے لئے بھی رکھیئے ورنہ آپ کس طرح جان سکتے ہیں کہ دوسروں نے کیا کہا تھا پرانی توہم پرستی سے منہ موڑ لیجئے۔ نئی سچائیوں کو قبول کرنے کے لئے تیار رہئے۔ بے وقوف ہیں وہ لوگ جو ایک کنوئیں سے جوان کے پرکھوں نے کھودا تھا سڑا ہوا پانی پیتے ہیں اور دوسرے کنوئیں کا صاف پانی اس لئے نہیں پیتے کہ ان کنوؤں کو دوسروں نے کھودا ہے۔ جب تک ہم خود کو ایشور جان نہیں لیتے ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہر آدمی اپنی فطرت کے اعتبار سے مکمل ہے۔ پیغمبروں نے اس اکملیت کو برقرار رکھا ہے۔ لیکن یہ ہمارے اندر بھی موجود ہے ہم کس طرح یہ سمجھ سکتے ہیں کہ موسیٰ نے اس کو دیکھا جب تک کہ ہم بھی خود اس کو نہ دیکھ لیں۔ اگر ایشور کسی تک پہنچا ہے تو وہ مجھ تک بھی پہنچے گا میں براہ راست ایشور تک پہنچوں گا۔ اُسے مجھ سے باتیں کرنے دیجئے۔ میں بنیادی طور پر اعتقاد نہیں لا سکتا یہ اخلاقیات ہے اور کفر کا کلمہ ہے۔ اگر دو ہزار سال قبل ایشور سعودی عرب کے صحرا میں ایک شخص سے بات کر سکتا ہے تو آج مجھ سے بھی کر سکتا ہے ورنہ میں کس طرح جان سکتا ہوں کہ وہ مرا نہیں زندہ ہے؟ آپ جس طرح بھی ایشور کے پاس پہنچ سکتے ہیں پہنچئے، پہنچئے ضرور۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے آپ دوسروں کو دھکا نہ دیجئے۔

جو لوگ جانتے ہیں انہیں جاہلوں پر رحم کھانا چاہیئے۔ وہ آدمی جو خدا کو جان چکا ہے ایک چیونٹی تک کی خاطر اپنا جسم قربان کرنے کو تیار ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جسم کچھ بھی نہیں ہے۔

## سوموار۔ 5 اگست

سوال یہ ہے کیا اعلیٰ درجات تک پہنچنے کے لئے تمام نچلے درجات سے گزرنا ضروری ہے یا ایک دم چھلانگ لگائی جا سکتی ہے؟ ایک امریکی لڑکا ۲۵ برس میں وہ کچھ حاصل کر لیتا ہے جس کو حاصل کرنے میں اس کے پرکھوں نے سینکڑوں برس لگائے۔ موجودہ دور کا ہندو بیس سال میں وہ حاصل کر لیتا ہے جس کو اس کے پرکھوں نے آٹھ ہزار برس میں حاصل کیا۔ جسمانی طور پر مرد کا نطفہ رحم کے اندر جا کر بچہ بنتا ہے یہ جدید سائنس کی معلومات ہیں۔ ویدانت اس سے بھی آگے کی بات کہتا ہے ہمیں نہ صرف ماضی کی انسانیت کی زندگی گزارنی ہوتی ہے۔ بلکہ ہم مستقبل کی انسانیت کی زندگی علیٰحدہ

گزارتے ہیں جو شخص پہلی قسم کی زندگی گزارتا ہے۔ تعلیم یافتہ ہوتا ہے اور جو بعد کی وہ جیون مُکت ہے ہمیشہ کے لئے آزاد ہے۔

وقت صرف ہمارے خیالات کو ناپنے کا آلہ ہے اور خیالات ناقابل تصور حد تک تیز رفتار ہوتے ہیں۔ آگے کی زندگی کو جس رفتار سے ہم گزارتے ہیں اس کی کوئی حد نہیں ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ مستقبل کی زندگی گزارنے میں کتنا وقت لگے گا ہو سکتا ہے ایک سیکنڈ یا پچاس زندگیوں کے برابر درحقیقت اس کا انحصار خواہش کی شدت پر ہے اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ طالب علم کی ضرورتوں کے مطابق تعلیمات میں تبدیلی کی جائے۔ ایمان کی حرارت سب کے لئے ہے حتیٰ کہ وہ برف کے یخ بستہ ٹکڑے دل تک کو پگھلا کر رکھ دے گی۔ ایک شخص کے سامنے سچائیوں کا دیوان کھول کر رکھ دیجئے وہ فوراً اپنی ضرورت کے مطابق حاصل کر لے گا۔ ماضی کی زندگی نے ہماری ذہنیتوں کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ طالب علم کو اس کی ذہنیت کے مطابق دیجئے۔ روحانی، عقلی، پرہیزگارانہ یا عملی کسی ایک شعبۂ تعلیم کو بنیاد بنائیے۔ لیکن اس کے ساتھ دوسری تعلیمات بھی دیجئے۔ عقل کا محبت کے ساتھ توازن ہونا چاہیئے اور روحانی فطرت کا قدرت کے ساتھ، عمل کو ہر طریقہ کا ایک جزو ہونا چاہیئے۔ ہر شخص کو اس سطح سے آگے بڑھائیے۔ جہاں وہ ہے، مذہبی تعلیمات ہمیشہ تعمیری ہونی چاہئیں، تخریبی نہیں۔

ہر رجحان ماضی کی عکاسی کرتا ہے۔ اس خط یا قطر کی نشان دہی کرتا ہے جس کے ساتھ اس آدمی کو گزرنا ہوگا۔ ہر قطر کا مرکز ایک ہی ہوتا ہے۔ کسی فریق کو بھی پریشان کرنے کی کوشش نہ کیجئے ایسا کرنا اُستاد اور طالب علم دونوں کو پیچھے دھکیلنا ہے جب آپ گیان کی تعلیم دیں تو آپ کو لازماً گیانی ہونا چاہیئے۔ حقیقی طور پر ذہن کی اس سطح سے تعلیم شروع کیجئے جس سطح پر طالب علم سمجھ سکتا ہے۔ ہر یوگ میں یہی صورت اختیار کرنی چاہیئے۔ ہر ایک صلاحیت کو ترقی دیجئے اور سمجھیئے کہ بس ایک شخص کے اندر وہی ایک صلاحیت ہے۔ یعنی تیزی کے ساتھ فراخ حوصلگی پیدا کیجئے۔ لیکن اس کی قیمت پر نہیں۔ ہم نا محدود ہیں۔ ہماری کوئی حد نہیں ہے۔ ہم اسی قدر شدید ہو سکتے ہیں جس قدر ایک انتہائی پرہیزگار مسلمان اور اتنے وسیع ہو سکتے ہیں جتنا ایک انتہائی درجہ کا مادہ پرست۔

اسے کرنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ ایک ظاہری شئے کی طرف ذہن کو یکجا کیا جائے بلکہ خود ذہن کو ترقی دینا اور اس کو قابو میں رکھنا ہے تب آپ جس طرف چاہے اس کا رُخ پھیر سکتے

ہیں اس طرح آپ فراخی اور شدّت کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ گیان کو اس طرح محسوس کیجئے کہ بس وہی سب کچھ ہے اور پھر اس کو بھگتی راج یا کرم یوگ سے کیجئے۔ لہروں کو سمندر کے اندر مل جانے دیجئے اِس کے بعد آپ اپنی مرضی کے مطابق لہریں پیدا کر سکتے ہیں اپنے دماغ کی جھیل کو قابو میں رکھیئے ورنہ آپ دوسرے کے ذہن کی جھیل کو سمجھ نہیں سکیں گے۔

سچّا گورو وہ ہے جو اپنی تمام شکتی کو چیلے کے ذہن میں بھر دیتا ہے۔ جب تک ہم حقیقی طور پر ہمدرد نہ ہوں تعلیم نہیں دے سکتے اس خیال کو ترک کر دیجئے کہ آدمی ذمہ دار مخلوق ہے۔ صرف مکمل اِنسان ہی ذمہ دار ہوتے ہیں۔ ناواقف انسان دھوکہ کھانے کے بعد بھی سمجھ دار نہیں ہو پاتا۔ ان کے ساتھ محبت کا اظہار کیجئے اور اس بیماری کی تشخیص کیجئے جس کی وجہ سے اس نے دُنیا کو غلط رنگ میں دیکھنا شروع کیا۔ اس کے بعد علاج میں اُن کی مدد کیجئے اور انہیں راہِ راست پر ڈالئے ہمیشہ یاد رکھیئے کہ جو لوگ آزاد ہیں وہی آزاد ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ باقی تمام غلام ہیں اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اُس کے لئے ذمہ دار نہیں ہیں۔ ارادہ ارادہ کی حیثیت سے معلوم ہے۔ پانی جب تک ہمالیہ کے اوپر پگھلتا ہے آزاد ہوتا ہے پھر دریا میں جاتا ہے وہ کناروں کا پابند ہے۔ تاہم ابتدائی قوتِ رفتار برقرار رہتی ہے جو اسے سمندر میں لے جاتی ہے اور وہ پھر آزادی حاصل کر لیتا ہے سب سے پہلے آدمی کا زوال ہے اور پھر رست خیزی۔ کوئی ایک ذرہ بھی سکون سے نہیں رہ سکتا جب تک کہ وہ آزادی حاصل نہ کرلے۔

کچھ تصورات ایسے ہیں جن سے غلامی کو توڑنے میں امداد ملتی ہے۔ پوری کائنات ایک تصویر ہے لیکن تصورات کا ایک سیٹ دوسرے سیٹ کا علاج کرتا ہے وہ جو ہم سے یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں گناہ غم اور موت ہے خوفناک تصورات ہیں۔ لیکن دوسرے تصورات ہمیشہ یہ بتاتے ہیں میں پاک ہوں۔ ایشور کا وجود ہے۔ یہاں کوئی دُکھ نہیں ہے۔ یہ تصورات اچھے ہوئے ہیں اور ان سے دوسروں کی غلامی کو ختم کرنے میں معاونت ملتی ہے۔ انتہائی اعلیٰ تصور جو کہ زنجیر کی تمام کڑیوں کو توڑ سکتا ہے، سا کار ایشور کا ہے۔

"اُوم تت ست" ہی صرف مایا سے بالاتر ہے۔ لیکن ایشور کا وجود ابدی ہے۔ جب تک نیاگرا فال باقی رہے گا ( Niagara Falls ) اس کی رنگا رنگی باقی رہے گی لیکن پانی مسلسل

---

غبارِ خاطر صفحہ ۸۱

ڈور بہتا رہتا ہے ۔ جھرنے کائنات ہیں ۔ اور ان کی رنگارنگی ساکار ایشور دونوں ابدی ہیں ۔ اگر دُنیا کا وجود رہتا ہے تو ایشور کا بھی وجود رہے گا ۔ ایشور نے کائنات کو پیدا کیا ۔ اور کائنات نے ایشور کو دونوں ابدی ہیں ۔ مایا نہ تو وجود ہے اور نہ عدم وجود ۔ آبشار شاگرد اور اس کی رنگارنگی دونوں لافانی ہیں ۔ مایا کے اندر ہر جسم کو دیکھا جا سکتا ہے ۔ ایرانی اور عیسائی مایا کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں اور ان کو ایشور اور شیطان کے نام سے پکارتے ہیں ۔ ویدانت مایا کو ایک سمجھتا ہے اور اس سے بالاتر وحدت کو برہم کو تسلیم کرتا ہے ۔



# نفس کُشی

بُدھوار - 1ے جولائی

لوتھر ( Luther ) نے نفس کُشی کو ختم کرکے اور اس کے بجائے اخلاقی تلقین دے کر مذہب کے تابوت میں کیل نصب کی - ماہرینِ اخلاق اور مادّہ پرست اخلاقیات کے حامل ہو سکتے ہیں لیکن جو لوگ صرف ایشور پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک مذہب ہی سب کچھ ہے -

گنُاہ گار عظیم رُوح کے تقدس کی قیمت ادا کرتا ہے کسی بھی گنُاہ گار کو اسی طرح دیکھئے - بالکل اسی طرح جس طرح ایک غریب مالدار آدمی کے آرام و آسائش کی قیمت ادا کرتا ہے - رُوحانی دُنیا میں بھی بالکل ایسی ہی بات ہے - ہندوستان میں عوام کو جو خوفناک تنزل ہوا وہ میرابائی اور رہا تما بُدھ جیسی عظیم رُوحوں کی پیدائش کی قیمت تھی - [1]

* * * * * *

گیتا میں بھگوان کرشن نے کہا ہے کہ پوترکی پوترتا میں ہی ہوتا ہوں، میں ہی جڑ ہوں، ہر شخص مجھے خود اپنے طریقہ پر پُوجا کرتا ہے لیکن سب کچھ میں ہی ہوں ، ہر کام میں کرتا ہوں - آپ محض اس کا سبب بنتے ہیں"۔ زیادہ باتیں نہ کیجئے بلکہ اس آتما کے درشن کیجئے اپنی روح کو پہنچانیئے تبھی آپ گیانی کہلا سکتے ہیں ۔

---

[1] بالکل اسی طرح جس طرح دشمن کے حملہ پر سو فوجیوں میں سے نوے اس لئے مَرجاتے ہیں کہ باقی کے دس زندہ رہیں اور نصرت یاب ہوں، ایک ایسے بلند پایہ سماج میں جو اونچے آدرش رکھتا ہو - ایسی عظیم روحیں پیدا ہوئی ہیں لیکن عوام چونکہ ان نظریات پر کاربند ہونے میں ناکام رہتے ہیں اس لئے انہیں تنزل کا مُنہ دیکھنا پڑتا ہے -

---

غبارِ خاطر صفحہ ۸۳

یہ سچا گیان ہے باقی سب کچھ جہالت ہے ۔جس کو جاننا چاہیئے وہ برھم ہے وہی سب کچھ ہے ۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ستو خوشی اور گیان کی جستجو پیدا کرتا ہے ۔ راجس خواہشات کے ذریعہ بندھن پیدا کرتا ہے اور اس طرح غلط تصورات اور نفس پرستی اور کاہلی کے ذریعہ قید وگرفت پیدا کرتا ہے ۔ آخرالذکر دونوں کیفیتوں کو ستو سے فتح کیجیئے اور پھر اس کے بعد اپنا سب کچھ ایشور پر چھوڑ دیجیئے اور مُکت و آزاد ہو جایئے ۔

بھگتی یوگ کمانے والا یوگی برھم کو بہت جلد پالیتا ہے اور مذکورہ تینوں گنوں سے بلند و بالا ہو جاتا ہے ۔یعنی تیرے گُن اتیت ہو جاتا ہے ۔ (گیتا بارہواں ادھیائے)

اِرادہ، ضمیر، شعور، خواہش، جذبات، یہ سب چیزیں مل کر اس شئے کو بناتی ہیں جس کو ہم انتا کرن کہتے ہیں ۔

سب سے پہلے جسم ہے ۔ دوسرے ذہن جو کہ غلطی سے خود کو جسم ہی اپنا آپ سمجھ بیٹھتا ہے یعنی ایشور مایا میں آجاتا ہے تیسری آتما ہے جو ہمیشہ پاک اور ہمیشہ آزاد رہتا ہے ۔اگر ہم الگ الگ دیکھیں تو یہ پراکرتی ہے اور مجموعی طور پر دیکھیں تو تمام پراکرتی ختم ہو جاتی ہے ۔ یہاں تک کہ یاد بھی باقی نہیں رہتی پراکرتی فانی، ابدی طور پر فانی ہے اور آتما لا فانی ۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ہر قسم کی توقعات چھوڑ دیجیئے ۔ یہ اعلیٰ ترین کیفیت ہوتی ہے ۔ اُمید کس چیز کے لئے کی جائے، اُمید کے بندھنوں کو توڑ ڈالیئے ۔ خود اپنے آپ پر انحصار کیجیئے ۔ پُرسکون رہیئے ۔ آپ کیا کرتے ہیں اس کی پروا نہ کیجیئے سب کچھ ایشور پر چھوڑ دیجیئے ۔لیکن اس کے بارے میں ریاکاری سے کام نہ لیجیئے ۔

خود اپنے نفس پر انحصار کرنے کے لئے سنسکرت میں سواستھ کا لفظ آتا ہے ۔ ہندوستان میں اس لفظ کا استعمال ان معنوں میں ہوتا ہے کیا آپ ٹھیک ہیں ؟ کیا آپ خوش ہیں ؟ "میں نے ایک چیز دیکھی" جب ہندو اس بات کو کہیں گے تو اس طرح کہیں گے کہ میں نے ایک پدارتھ دیکھا ۔ یہاں تک کہ یہ کائنات خود ایک پدارتھ ہے ۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

اگر ایک آدمی کا جسم مکمل ہو تو ٹیکنیکل اعتبار سے وہ بالکل ٹھیک کام کرتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

---

غبارِ خاطر صفحہ ۵۴

. . . . . کیونکہ یہ بالکل خالص ہے۔ ماضی کا چکّر جو کہ جسم اپنے کو آگے بڑھاتا ہے بالکل اچھا ہے کیونکہ تمام غلط رجحانات فنا ہو چکے ہوتے ہیں۔

* * * * * * * *

وہ دن حقیقت میں بُرا دن ہوتا ہے جب ہم ایشور کو یاد نہیں کرتے، وہ دن بے کیف سا دن ہوتا ہے۔ صرف ذاتِ باری ایشور کو یاد کرنا ہی سچّی بھگتی ہے کسی اور سے عشق کرنا خواہ وہ کتنی ہی بڑی ہستی کیوں نہ ہو بھگتی نہیں کہلا سکتا۔ ذات باری سے مراد ایشور سے ہے جس کے تصور کو آپ قرب میں بدل کر ساکار ایشور (یا ذاتی خُدا) Personal God. کہتے ہیں جس نے اس کائنات کو بنایا جس میں یہ باقی رہتی ہے اور جس کی طرف یہ فنا ہو جاتی ہے۔ وہ ایشور ہے انادی پوتر وشُدھ دیاندھان، رحیم وکریم قادرِ مطلق، سروشکتی مان ذات واحدِ عظیم، سب پیغمبروں کی تعلیم، وہ خدا اور ایشور جو خود اپنی ذات سے ایک ناقابلِ توضیح عشق و محبت ہے۔

انسان اپنے دماغ سے ایشور کو تخلیق نہیں کرتا بلکہ وہ صرف اپنی صلاحیتوں کی روشنی میں ایشور کو صرف دیکھتا ہے اور اس کے نزدیک جو صفات اعلیٰ ترین ہوتی ہیں وہ ان کو ایشور کے کے ساتھ منسوب کر دیتا ہے۔ یہ ایک صفت تمام تر ایشور ہے۔ اور ایک صفت کے ذریعہ کل کی یہ تعریف مابعد الطبیعاتی طور پر ذاتی ایشور کی وضاحت ہے۔ ایشور کی کوئی شکل نہیں ہے تاہم وہ تمام شکلیں رکھتا ہے اس کی کوئی قسم نہیں لیکن وہ تمام اقسام رکھتا ہے۔ انسانوں کی حیثیت سے ہمیں وجود کی تثلیث کو دیکھنا ہے۔ پرماتما۔ آتما۔ اور پرکرتی۔ اس کے علاوہ ہم اور کچھ کر بھی نہیں سکتے۔

لیکن بھگتوں کے لئے یہ تمام فلسفیانہ نکتے محض فضول باتیں ہیں بھگت دلیل منطق کی پروا نہیں کرتا، وہ دلائل نہیں دیتا، وہ احساس کرتا ہے اور اس کو ادراک ہو جاتا ہے۔ خود کو وہ ایشور کے کے پوتر پریم میں کھو دینا چاہتا ہے۔ ایسے بھگت بھی ہوتے ہیں جن کے نزدیک یہ کیفیت حاصل کرنا نجات حاصل کرنے کے مقابلہ میں زیادہ پُرکیف ہے جو کہتے ہیں کہ میں مٹھاس بننا نہیں چاہتا۔ میں میٹھے کا ذائقہ چکھنا چاہتا ہوں۔ میں پریم کرنا اور اپنے محبوب کے ساتھ لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔

---

غبارِ خاطر صفحہ ۸۵

بھگتی یوگ میں سب سے پہلی ضرورت اس بات کی ہے کہ ایمانداری اور پوری شدّت کے ساتھ خدا کی جستجو کی جائے۔ لیکن ستم تو یہ ہے کہ ہم اور سب کچھ تو جانتے ہیں لیکن طالبِ حق نہیں ہوتے۔ کیونکہ ہماری معمولی خواہشات اس ظاہری دُنیا سے پُوری ہو جاتی ہیں۔ جب تک ہماری ضرورتیں طبیعیاتی کائنات کی حدود کے اندر ہیں ہمیں ایشور کی کوئی حاجت محسوس ہی نہیں ہوتی۔ ایشور کی حاجت اسی وقت محسوس کی جاتی ہے جب ہم پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں اور جب ہمیں یہاں ہر چیز کے بارے میں مایوسی اور دل پرورشتگی کا سامنا ہوتا ہے۔ تب ہم ایشور کی جستجو کرتے ہیں۔

بھگتی تخریبی نہیں ہوتی۔ یہ اس بات کی تعلیم دیتی ہے کہ ہمیں اپنی تمام تر صلاحیتوں کو فنا نہیں کرنا بلکہ ذریعہ نجات بنانا ہے۔ ہمیں ان تمام صلاحیتوں کا رُخ خدا کی طرف مُوڑ دینا چاہیئے اور اس تمام کائنات عشق و محبت کو خدا کے لئے دفن کر دینا ہوگا جس کو ہم اب تک دُنیا کی چندروزہ لذتوں کے لئے لُٹائے جا رہے تھے۔

بھگتی کا نظریہ آپ کے مذہب کے مغربی نظریہ سے مختلف ہے، اس بھگتی میں خوف کے عناصر کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ نہ کسی کو اس کے ذریعہ خوش کیا جاتا ہے نہ مہربان، ایسے بھگت بھی ہیں جو کہ ایشور کو خود اپنا بچّہ سمجھ کر اس کی پُوجا کرتے ہیں تاکہ تحیّر اور تعظیم کا احساس بھی باقی نہ رہے۔ سچّے پریم میں خوف نہیں ہوسکتا، جب تک تھوڑا بہت خوف باقی رہتا ہے۔ بھگتی کی ابتدا ہی نہیں ہو پاتی۔ بھگتی کے اندر ایشور سے مانگنے اور اس کے ساتھ سودا بازی کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ایشور سے کوئی شئے طلب کرنے کا نظریہ بھگتی کی بے حُرمتی ہے، وہ محبت اور مال کے لئے یہاں تک کہ جنت میں جانے کے لئے بھی دست برآری نہیں ہوتا۔ جو شخص ایشور سے عشق و محبت کرنا چاہتا ہے۔ بھگت بننا چاہتا ہے اس کو چاہیئے کہ تمام خواہشات کو بالائے طاق رکھ دے اور پھر اس کے مندر میں داخل ہو وہ جو عبادت گاہ کے اندر جانا چاہتا ہے اُسے چاہیئے کہ وہ ہر قسم کی سودے بازی کو ختم کردے اور پھر اسکے بعد دروازے کے اندر داخل ہو۔ یہ قیمت چکا کر ضرورت کی چیز حاصل کرنا نہیں ہے۔ آپ ہر چیز حاصل کرتے ہیں لیکن یہ کم درجہ کا عامیانہ اور بھکاریوں کا مذہب ہوتا ہے حقیقت میں وہ شخص بے وقوف ہے جو گنگا کے کنارے رہتا ہے۔ اور پانی کے لئے کنارے پر کنُواں کھودتا ہے۔ حقیقت میں وہ انسان سراسر احمق ہے جو جواہرات کی کان میں پہنچنے کے بعد بھی کانچ کے ٹکڑے تلاش کرلیتا ہے

دولت اور صحت کے لئے اور مادّی خوش حالی کے لئے یہ پرارتھنا بھگتی نہیں ہے۔ یہ کرم کی کمترین شکلیں ہیں۔ بھگتی کا درجہ بہت اعلیٰ اور ارفع ہے۔ ہم بادشاہوں کے بادشاہ کے سامنے جانے کی کوشش کررہے ہیں پھر بھلا ہم وہاں بھکاریوں کا لباس زیب تن کیوں کریں۔ اگر ہم کسی شہنشاہ کے دربار میں جانا چاہیں تو کیا ہمیں بھکاریوں کے لباس میں جانے دیا جائے گا؟ یقینی طور پر نہیں ... دروازہ سے بھگا دیں گے یہ شہنشاہوں کا شہنشاہ ہے ہم کبھی اس کے سامنے بھکاریوں کے لباس میں نہیں جا سکتے۔ سودا بازوں کو جانے کی وہاں کبھی اجازت نہیں ہوگی۔ وہاں لین دین پر کوئی سودے بازی نہیں ہوگی۔ کیا آپ نے بائبل کے اندر نہیں پڑھا ہے کہ عیسیٰ نے گرجا سے سودا بازی کرنے والوں کو باہر نکال دیا تھا۔

پس یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ بھگتی کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ بھگت جنّت کی اور ایسی ہی تمام خواہشات کو ختم کردے۔ ایسی جنت بالکل اسی زمین کی طرح ہوگی۔ اس سے تھوڑی سی بہتر۔ عیسائیوں کے نقطۂ نگاہ سے جنت ایسی جگہ ہے جہاں انسان زیادہ لطف اُٹھا سکیں گے وہ ایشور کس طرح ہوسکتی ہے، جنت میں جانے کی یہ تمام تر خواہشات لطف اُٹھانے کی خواہش ہے۔ اس خواہش کو ترک کرنا ہوگا۔ بھگت کا عشق انتہائی سچا ہونا چاہیئے بے لوث ہونا چاہیئے اس کو یہاں اور یہاں کے بعد کے لئے کوئی طلب نہیں رکھنی چاہیئے
مسرت، دُکھ اور نفع، نقصان کی ہر ایک خواہش کو ترک کر دیجئے۔ رات دن ایشور کی پُوجا کیجئے، کوئی ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہونے دیجئے۔

تمام خیالات کو ترک کر دیجئے۔ تمام تر توجہ دن رات پوجا پر صرف کردیجئے۔ اِس طرح دن اور رات پُوجے جایئے بعدؔ وہ خود کو ظاہر کردے گا اور بھگت کو اپنا احساس کرادے گا۔

## برہسپت وار-1-اگست

حقیقی گُورُو مرشد وہ ہے جس کے ذریعہ ہم پر رُوحانیت کا نزول ہوتا ہے، وہ ایک ذریعہ ہے کہ جس کے ذریعہ ہم تک روحانیت کی برقی رو پہنچتی ہے۔ ایک کڑی ہے جو رُوحانی دُنیا کے ساتھ ہمارا تعلق جوڑتی ہے۔ لیکن کسی ایک شخصیت میں زیادہ انحصار اور اعتقاد رکھنا۔ ایسا رُجحان ہے جو کمزوری پیدا

---

غبارِ خاطر
صفحہ ۸۷

کرتا ہے اور بُت پرستی کو جنم دیتا ہے لیکن گورو اور پیرو مُرشد کے ساتھ کی گئی محبت تیزی کے ساتھ عروج پر پہنچاتی ہے، وہ باطنی مُرشد کے ساتھ ہمارا تعلق قائم کردیتی ہے۔ اگر آپ کے گورو مُرشد کے اندر حقیقی سچائی ہے تو اس کا ہاتھ پکڑلیجئے۔ یہی گورو بھگتی آپ کو تیزی کے ساتھ بامِ عروج پر پہنچا دے گی۔

سٹری رام کرشن ایک بچے کی طرح پاک وصاف تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں دولت کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ہر قسم کی ہوس وہوا اُن کے لئے قطعی طور پر مرچکی تھی۔ دھارمک گوروؤں کے پاس جسمانی ورزش سیکھنے کے لئے نہ جایئے۔ اپنی تمام ترصلاحیتوں کو روحانیت کی طرف لگا دیجئے۔ سٹری رام کرشن پرم ہنس کی ذات کوئی آسمانی نہیں تھی وہ مجسّم خدا بن چکے تھے۔ حقیقت میں وہ گناہ کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ان کی گیان پاک ترین تھیں۔ ایسے چند پرم ہنسوں کی پاکیزگی کی وجہ سے ہی دُنیا زِندہ اور سلامت ہے۔ اگر وہ اپنی رحمت کا ہاتھ کھینچ لیں اور دُنیا کو چھوڑ دیں تو دنیا پارہ پارہ ہوجائے۔ وہ محض اپنے وجود سے ہی کُل عالم کی بھلائی کرتے ہیں وہ صرف خدا کو جانتے ہی نہیں بلکہ خود خدا ہوتے ہیں۔

※ ※ ※ ※ ※ ※

کتابیں باطنی روشنی کی تلقین کرتی ہیں اور اس کے حصول کا طریقہ بتاتی ہیں۔ لیکن ہم ان کتابوں کو اسی وقت ٹھیک طور پر سمجھ سکتے ہیں جب ہم نے خود آگہی حاصل کرلی ہو۔ اگر آپ کو یہ روشن ضمیری حاصل ہوچکی ہو تو کتابوں کو بالائے طاق رکھ دیجئے اور اپنے اندر دیکھئے۔ آپ کے اندر سب کچھ موجود ہے لیکن جتنا کتابوں میں ہے اس سے ہزار ہا گُنا زیادہ ہے۔ خود اپنے اندر سے اعتماد کو ختم نہ کیجئے۔ اسی طرح آپ اس کائنات میں رہ کر کام کرسکتے ہیں۔ آپ کے اندر جو طاقت ہے اس کو کمزور نہ کیجئے۔

اگر مذہب اور زندگی کے انحصار کا تعلق کتابوں اور پیغمبروں پر خواہ وہ کوئی ہوں ہوتا تو تمام پیغمبر اور کتابیں ختم ہوچکی ہوتیں! مذہب ہمارے اندر ہے خود کو معلوم کرنے کے لئے ہم خود اپنی مدد جس قدر کرسکتے ہیں پیغمبر اور کتابیں نہیں کرسکتیں اور ان کے بغیر بھی ہم اپنے اندر تمام سچائی کو تلاش کرسکتے ہیں تاہم کتابوں اور پیغمبروں کا احترام کیجئے لیکن ان کے غلام بن کر نہیں اور اپنے گورو پیرومُرشد کو ایشور سمجھ کر پُوجیے، لیکن اس کی اندھی تقلید نہ کیجئے۔ آپ جس قدر عشق ومحبت کرسکتے ہیں گورو کے ساتھ کیجئے۔ کوئی اندھی تقلید ہمیں نہیں بچاسکتی۔ اپنی نجات کی راہ خود آپ کو تلاش کرنی ہے۔ صرف ایک ایشور کا تصوّر قائم رکھیں اور وہ تصور یہ ہے کہ میرا ایک ہی سہارا خدا ہے۔

---

غبارِ خاطر — صفحہ ۸۸

آزادی اور اعلیٰ ترین عشق و محبت لازم و ملزوم ہیں۔ کوئی چیز بھی قید نہیں بن سکتی ہم ایشور کو کچھ نہیں دے سکتے۔ ایشور سب کچھ ہمیں دیتا ہے وہ گوردؤں کا گورو ہے یہ سمجھنے کے بعد ہم محسوس کریں گے کہ وہ ہماری روحوں کی رُوح ہے۔ ہماری اپنی رُوح ہے۔ اگر ہم اُسے پیار کرتے ہیں تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے وہ ہماری روحوں کی روح ہے۔ اس کے علاوہ ہم اور کس چیز کو پیار کر سکتے ہیں؟ ہمیں اسی نور تجلی کا نُور بن جانا چاہیئے۔ ہم اسی آگ کا ایک شعلہ بن جانا چاہتے ہیں۔ جب آپ ہر ایک میں صرف ایشور کو دیکھ رہے ہیں تو پھر آپ نیکی کس سے کر سکتے ہیں؟ آپ ایشور سے نیکی کریں گے۔ تمام شبہات ختم ہو جاتے ہیں۔ تمام تریک رنگی آجاتی ہے۔ اگر آپ کوئی نیکی کر سکتے ہیں تو وہ خود اپنے ساتھ کیجئے اور سمجھ کر کیجئے کہ جس کے لئے نیکی کی جارہی ہے وہ اعلیٰ دار فع ہے آپ دوسروں کی خدمت کرتے ہیں کیونکہ آپ اس سے کمتر ہوتے ہیں اس لئے نہیں کرتے کہ وہ کمتر ہیں اور آپ اعلیٰ ہیں۔ گلاب کے پھول کی طرح مہکیئے۔ کیونکہ مہکنا اس کی فطرت ہے۔ قطعی غیر شعوری طور پر وہ خوشبو لٹاتا ہے۔

راجہ رام موہن رائے جو کہ ایک عظیم ہند و مصلح تھے بے غرضانہ کام کی ایک حیرت انگیز مثال ہیں انہوں نے اپنی ساری زندگی ہندوستان کی خدمت میں صرف کر دی۔ ان کی وجہ ہی سے ہندوستان میں ستی کی رسم ختم ہوئی۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ صرف انگریزوں کی وجہ ہی سے یہ رسم ختم ہوئی ہے۔ لیکن یہ راجہ رام موہن رائے تھے جنہوں نے اس رواج کے خلاف ایجی ٹیشن شروع کیا اور اس رسم کو دبانے کے لئے حکومت کی امداد حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے، جب تک اُنہوں نے تحریک شروع نہیں کی تھی۔ انگریزوں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ انہوں نے ایک اہم مذہبی سماج قائم کیا جس کو برھمو سماج کہا جاتا ہے اور ایک یونیورسٹی قائم کرنے کے لئے ایک کروڑ ڈالر کے برابر روپیہ دیئے۔ اس کے بعد وہ بے تعلق ہو گئے اور لوگوں کے سپرد کر دیا۔ انہوں نے اپنی نام و نمود اور اپنے لئے فائدہ کی پرواہ نہیں کی۔

## ویر وار (شام)

اس دنیا میں مظاہر کے اٹوٹ سلسلے ہیں۔ یہ ساری دُنیا رنگ و بُو کی دُنیا ہے اور ہر ایک جلوہ ریز منظر میں وہی ایک موجزن ہے۔ مظاہر کے یہ سلسلے ابدی ہیں۔ انفرادی روحیں ان سے نکل جاتی ہیں۔ لیکن ابدی طور پر واقعات خود کو دُہراتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایک شخص کے ماضی اور مستقبل کو پڑھ

لیا جاتا ہے کیونکہ حقیقت میں یہ سب یہاں موجود ہیں۔ جب رُوح کا تعلق ایک خاص زنجیر سے ہوتا ہے تو اس کو اس زنجیر کے خاص تجربات سے گزرنا پڑتا ہے۔ رُوح ایک سلسلہ سے دوسرے سے سلسلے میں چلی جاتی ہے اور کسی سلسلہ سے برھم کو پالینے کے بعد وہ مُکت ہوجاتی ہے۔ ایک زنجیر کی خاص کڑی کو پکڑ لیا جائے اور اس پر قبضہ کو مضبوط رکھا جائے تو پُوری زنجیر ہاتھ میں آجاتی ہے اور پڑھ لی جاتی ہے یہ قوت آسانی کے ساتھ حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کی کوئی حقیقی قیمت نہیں ہے اور اس پر عمل کرنا اپنی روحانی قوتوں کو ضائع کرنا ہے۔ ان چیزوں کے پیچھے نہ پڑیئے۔ صرف اسی ذات باری کی پُوجا کیجئے۔

## شکروار۔ 2۔ اگست

نشٹھا (یقین وایمان) ہی وصلِ خُدا کی ضمانت ہوتی ہے۔ تمام پھُولوں سے رَس نچوڑ لیجئے اور بیٹھ جائیے۔ اور سب کے ساتھ دوستی رکھیئے۔ سب کا ادب کیجئے اور سب سے کہیئے۔ ہاں بھائی۔ ہاں بھائی۔ لیکن اپنے طریقہ پر سختی کے ساتھ کاربند رہیئے۔ دوسرے کی پوزیشن کو حاصل کر لینا حقیقت میں بڑے اعلیٰ درجہ کی بات ہے۔ اگر میں ہی سب کچھ ہوں تو میں اپنے بھائی کے ساتھ حقیقت اور سرگرمی کے ساتھ ہمدردی کیوں نہیں کرسکتا۔ اور اسے اس کی آنکھوں سے کیوں نہیں دیکھ سکتا۔ اگر میں کمزور ہوں تو مجھے نشتھا پر کاربند رہنا چاہیئے لیکن اگر میں طاقتور ہوں تو میں دوسروں کے نظریات کے ساتھ قطعی ہمدردی ظاہر کرسکتا ہوں۔

پُرانا نظریہ تھا کہ ایک ہی نظریہ کی نشوونما کیجئے اور باقی نظریات کو فنا کر دیجئے۔ لیکن جدید طریقہ مختلف نظریوں میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ ایک تیسرا طریقہ یہ ہے کہ دل ودماغ کو ترقی دی جائے اور اس پر قابو رکھا جائے۔ یہ خود کو سچے معنوں میں ترقی دینا ہے۔ یکسوئی قلب حاصل کیجئے اور پھر اس کا چاہے جس مقصد کے لئے استعمال کیجئے۔ اِس طرح آپ کچھ کھوئیں گے نہیں بلکہ سب کچھ حاصل کرلیں گے وہ جو "کُل" کو حاصل کرلیتا ہے اس کے پاس "کُل" کے تمام اجزاء کو بھی پالیتا ہے۔ دویت بھی ادویت میں شامل ہے۔

"ایک نظر میں نے پہلے اس کو دیکھا اور ایک نظر اس نے مجھے دیکھا"
"آنکھیں چار ہوئیں کچھ میری آنکھوں نے کہا اور کچھ اس کی آنکھوں نے کہا"، اور روحوں میں یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا کہ آخر کار دونوں روحیں حقیقی طور پر متحد ہوگئیں۔ اور ایک بن گئیں۔

سمادھی کی دو قسمیں ہیں ۔ میں اپنے آپ کی طرف ہمہ تن متوجہ ہوتا ہوں ۔ پھر میں اپنی ساری کسی دوسری چیز سے پیوست کر دیتا ہوں ۔ اور اس طرح ظاہر اور باطن کے درمیان اتحاد قائم ہو جاتا ہے ۔

آپ کو اس قابل ہونا چاہیئے کہ آپ ہر ایک چیز کے ساتھ پُورے طور پر خود کو ہم خیال بنا سکیں اور پھر فوراً ہی اعلیٰ وحدت پرستی کی طرف واپس چھلانگ لگا سکیں ۔ خود کو اکملیت تک پہنچانے کے بعد آپ رضا کارانہ طور پر خود کو محدود کر لیں اور ہر ایک عمل میں پُوری شکتی حاصل کریں خواہ کچھ وقت کے لیے آپ دویت وادی میں جائیں اور ادویت وادی کو بھُول جائیں ۔ لیکن جب چاہیں اس کو پھر حاصل کر لیں ۔

* * * * * * *

سبب و علت تمام مایا ہے ۔ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں اس کا حقیقت سے تعلق نہیں ہوتا ۔ بالکل اس طرح جس طرح بچوں کو سُنائی جانے والی پریوں کی کہانیوں میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی ۔ حقیقت میں علت اور سبب جیسی کوئی چیز نہیں ہے ۔ اگر آپ چاہیں تو ذہانت سے کام نہ لیتے ہوئے تمثیلات (ایک مضمون کے پردہ میں دوسرے مضمون کا بیان) کو ان کے بارے میں کوئی سوال کیئے بغیر سُن سکتے ہیں ۔ تشبیہات اور خوب صورت نظموں کے ساتھ عشق و محبت کو بڑھایئے اور پھر تمام دیو مالاؤں سے شاعری اور انشاء پردازی سمجھ کر لُطف اٹھایئے ۔ دیو مالاؤں کے بارے میں تاریخ اور دلائل سے بحث نہ کیجیئے انہیں اپنے دماغ سے ایک کرنٹ (لہر) کی طرح گزرنے دیجیئے ۔ آنکھوں کے سامنے ایک قندیل کی طرح روشن ہونے دیجیئے ۔ یہ سوال نہ کیجیئے کہ قندیل کو کون پکڑے ہوئے ہے ۔ سلسلہ آپ کے ہاتھ آجائے گا اور آپ کے دماغ پر سچائی کی تلچھٹ باقی رہے گی ۔

تمام دیو مالاؤں کے مصنفوں نے جو دیکھا اور سُنا وہ تشبیہات اور استعاروں میں لکھا ہے اُنہوں نے دل آویز تصویر کشی کی ہے ۔ ان کا موضوع جاننے کی کوشش نہ کیجیئے ۔ اس طرح تصویر تباہ ہو جائے گی جس طرح وہ ہیں اُنہیں اسی طرح پڑھیئے ۔ اور اپنے آپ پر اثر انداز ہونے دیجیئے ۔ ان کا جو اثر ہو صرف اسی سے ان کو پرکھیئے اور ان کے اندر جو اچھائی ہے اس کو حاصل کیجیئے ۔

* * * * * * *

سب کچھ آپ کا عزم ہے ۔ یہی عزم آپ کی عبادت کو رنگِ قبولیت عطا کرتا ہے یہ صرف ہر ایک دماغ

---

نعبادِ خاطر صفحہ ۹۱

کے اندر مختلف مذہبی تصورات کے پردہ میں ظاہر ہوتا ہے ہم اُسے بُدھ، عیسیٰ، کرشن، موسیٰ، اللہ، اگنی کہہ سکتے ہیں لیکن یہ صرف خودی ہے "میں" ہے۔

تصورات بڑھتے ہیں لیکن جو تمثیلات انہیں پیش کرتی ہیں اُن کی کوئی تاریخی حقیقت نہیں ہوتی۔ ہو سکتا ہے کہ موسیٰ کے مشاہدات ہمارے اپنے مشاہدات کے مقابلہ میں غلط ہوں کیونکہ ہم زیادہ علم و شعور رکھتے ہیں اور اس بات کا امکان کم ہے کہ ہم فرشتوں سے دھوکہ کھا سکیں۔

جب تک ہم خود اپنی کتاب کو نہ کھولیں ہمارے لئے کتابیں بیکار ہیں۔ ہمارے نزدیک دوسری کتابیں اس وقت اچھی ہو سکتی ہیں جب وہ ہماری اپنی کتاب سے میل کھاتی ہوں۔ طاقتور ہی طاقت کی تعریف کرتا ہے ہاتھی ہی شیر کو خاطر میں لاتا ہے چوہے کو نہیں۔ ہم عیسیٰ کو کس طرح سمجھ سکتے ہیں جب تک ہم ان کے مساوی نہ ہوں۔ دو روٹیوں سے پانچہزار کا پیٹ بھرنا ایک خواب کی بات ہے نہ پانچ روٹیوں سے دو کا پیٹ بھرا جا سکتا ہے نہ تو دونوں میں سے کوئی حقیقت ہے اور نہ دونوں میں سے ایک کا دوسرے پر اثر پڑتا ہے۔ صرف آن بان والا ہی آن بان والے کو سراہتا ہے۔ صرف خدا ہی ایشور کو مان سکتا ہے خواب صرف خواب دیکھنے والا ہے اس کی اور کوئی بنیاد نہیں ہے۔ خواب اور خواب دیکھنے والا الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ "میں وہ ہوں" میں وہ ہوں" "سوہنگ سوہنگ" موسیقی کائنات کا بنیادی سُر میں طلسم ہے دوسرے تمام سُر بُرے تو نہیں ہوتے لیکن وہ اصلی نغمہ، یزدانی نغمہ پیدا نہیں کر سکتے۔ ہم ہی زندہ کتابیں ہیں۔ کتابیں کیا ہیں وہی الفاظ جو ہم نے لکھے۔ ہر شئے مجسم خدا ہے۔ مجسم مسیح ہے۔ ہر چیز کو ایسا سمجھ کر دیکھئے۔ آدمی کو پڑھیئے وہ شاعر کائنات خدا کی ایک شاہ کار نظم ہے۔ ہم ہی وہ روشنی ہیں جس نے تمام بائیبلوں کو اور مسیحوں اور بدھوں کو منور کیا۔ ہماری اس تجلّی کے بغیر وہ ہمارے نزدیک مُردہ ہوتے ہیں۔

اپنے آپ پر بھروسہ کیجئے۔ خود اعتمادی پیدا کیجئے۔

مُردہ کچھ بھی نہیں کر پاتا۔ ہمیں اپنے جسموں کو مُردہ نہ بنانا چاہیئے اور خود کو جسم سمجھنا چھوڑ دینا چاہیئے

## سنیچر وار۔ 3۔ اگست

وہ افراد جو اپنی اس زندگی میں ہی نجات حاصل کر لیتے ہیں۔ گویا ان کی ایک زندگی ہزاروں برس کی ہوتی ہے وہ اپنے وقت سے ہزاروں برس آگے ہوتے ہیں لیکن عوام وہ تو محض رینگ سکتے ہیں۔ عیسیٰ

---

غبارِ خاطر — صفحہ ۹۲

اور بدھ ایسی روحیں اپنے زمانہ سے ہزاروں برس آگے تھیں۔

* * * * * *

ایک زمانہ میں ایک ہندو مہارانی تھی' اس کی بڑی خواہش یہ تھی کہ اس کے بچّے اس زندگی ہی میں نجات حاصل کرلیں۔ اس نے خود ان کی پرورش شروع کی۔ اور وہ انھیں سُلاتے وقت ہمیشہ ایک ہی لوری سُنائی تھی "تت توَم رسی" ان میں تین سنیاسی بن گئے۔ لیکن چوتھے کو تربیت کے لئے کسی اور جگہ لے جایا گیا۔ جب وہ گھر چھوڑ کر جا رہا تھا تو ماں نے اس کو پرچہ دیا اور ہدایت کی جب وہ جوان ہو جائے تو اس کو کھول کر پڑھے اس پرچہ کے اندر لکھا تھا "صرف خدا ہی حق و صداقت ہے صرف ایشور ہی ست ہے" اور باقی سب جھوٹ اور کفر ہے۔ آتما نہ تو کبھی قتل کرتی ہے نہ قتل ہوتی ہے یا تو ساری عمر اکیلے رہو یا پھر سادھو سنتوں کی سیوا کرتے رہو"۔

جب نوجوان شہزادہ نے اس عبارت کو پڑھا تو اس نے فوراً دُنیا کو ترک کر دیا اور سنیاسی بن گیا۔ اور تارک الدنیا بن گیا۔

دُنیا کو چھوڑ دیجئے۔ ترکِ علائق کرلیجئے۔ اب ہماری حیثیت ان کتوں کی ہے جو رسوئی گھر میں پھیلے ہوئے ہیں گوشت کے ٹکڑے کو کھا رہے ہیں اور ساتھ میں اِدھر اُدھر دیکھ رہے ہیں کہ مبادا کسی بھی لمحہ کوئی اندر آکر انہیں باہر نہ نکال دے اس کے برعکس راجہ بنیئے۔ اور خود کو دُنیا کا حاکم سمجھئے۔ یہ بات آپ کو اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک آپ ترکِ علائق نہ کریں۔ اور دُنیا کی کوئی جکڑ باقی نہ رہے اگر آپ جسمانی طور پر ترکِ علائق نہیں کرسکتے تو ذہنی طور پر کیجئے۔ چیزوں کے ساتھ اپنے لگاؤ کو ختم کر دیجئے۔ ویراگیہ اختیار کیجئے۔ یہی حقیقی قربانی ہے۔ اس کے بغیر رُوحانیت حاصل کرنا ناممکن ہے۔ کوئی خواہش نہ کیجئے۔ کیونکہ جس چیز کی بھی خواہش ہوگی وہ شے مل جائے گی۔ اور اس سے خوفناک محکومی آتی ہے۔ ایسا کرنے سے ہماری کیفیت اسی انسان جیسی ہو جائے گی جس نے تین وردان مانگے تھے اور ایک وردان کے بدلے اس کے جسم پر جگہ بہ جگہ ناک لگ گئے تھے[1]۔

جب تک ہم مستغنی نہیں ہو جاتے ــــ آزادی حاصل نہیں کر سکتے ــــ

[1] ایک بار ایک غریب آدمی ایک خاص دیوتا کو منانے میں کامیاب ہو گیا۔ دیوتا نے اس کو اس کے طلب کرنے پر تین وردان دیئے اور ساتھ ہی پھینکنے کے لئے تین پانسے دیئے اور وہ آدمی بہت خوش ہوا اور اس نے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

. . . . . . . . . کیونکہ ہم خود ہی اپنی حفاظت کر سکتے ہیں کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔

یہ احساس کرنا سیکھئے کہ آپ خود دوسروں کے اندر ہیں یہ کہ سب ایک ہیں۔ تمام بے وقوفیوں کو ختم کر دیجئے۔ اچھے ہوں یا بُرے اپنے اعمال پر خاک ڈالئے۔ ان کے بارے میں دوبارہ نہ سوچئے جو کچھ ہو گیا وہ ہو گیا۔ توہم پرستی کو ختم کر دیجئے اگر موت کا مقابلہ بھی ہو تو بھی کوئی کمزوری نہ دکھایئے کف افسوس نہ ملئے۔ ماضی کے کاموں پر غمزدہ نہ ہویئے۔ اور نہ اچھے کاموں کو یاد کیجئے۔ آزاد ہو جایئے۔ کمزور خوف زدہ اور جاہل آتما کو کبھی نہیں جان سکتا۔ کرنی کا پھل ملے گا۔ آپ اسے روک نہیں سکتے۔ اور اس کا مقابلہ کیجئے لیکن اس بات کی احتیاط کیجئے کہ آپ سے پھر دوبارہ ایسے کام سرزد نہ ہوں۔ تمام بوجھ ایشور پر ڈال دیجئے۔ اچھے کاموں کا بھی اور بُرے کاموں کا بھی، ایسا نہ کیجئے کہ اچھے کام خود رکھیں اور بُرے ایشور کے سپرد کر دیں۔ ایشور صرف ان لوگوں کی امداد کرتا ہے جو خود اپنی مدد نہیں کر پاتے۔

خواہشات کے جام کو پینے سے دُنیا پاگل بن جاتی ہے۔ دن اور رات کبھی ایک ساتھ نہیں آسکتے۔ اسی طرح خواہشات اور ایشور کبھی ایک جگہ نہیں مل سکتے۔ خواہشات کو ترک کر دینا ہوگا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

(بقیہ حاشیہ) اپنی بیوی کو یہ خبر جا کر سُنائی۔ بیوی نے اس سے فوراً کہا کہ وہ پہلا پانسہ دولت کے لئے پھینکے۔ لیکن اس نے کہا کہ ہماری دونوں کی ناکیں بہت بدنما ہیں لوگ ہنستے ہیں ہمیں خوب صورت ناکوں کے لئے پہلا پانسہ پھینکنا چاہیئے۔ لیکن بیوی چاہتی تھی کہ پہلا دولت کے لئے پھینکا جائے۔ پس اس نے شوہر کا ہاتھ پکڑ لیا جو کہ پانسہ پھینکنے والا تھا۔ شوہر نے جلدی سے ہاتھ چھڑا کر یہ کہتے ہوئے پانسہ پھینک دیا کہ ہمارے دونوں کے خوب صورت ناکیں لگ جائیں۔ سوائے ناکوں کے اور کچھ نہیں۔ ایک دم دونوں کے جسم خوب صورت ناکوں سے ڈھک گئے۔ اس سے تنگ آکر انہوں نے اتفاق کیا کہ دوسرا پانسہ ان ناکوں کو ختم کرنے کے لئے پھینکا جائے۔ لیکن اس بار ان کی اپنی چھوٹی بدنما ناکیں بھی غائب ہو گئیں۔ اب ایک پانسہ باقی تھا۔ ناکیں غائب ہو جانے سے وہ اور بھی بدصورت معلوم ہوتے تھے۔ وہ اور خوب صورت ناکیں مانگنا چاہتے تھے لیکن وہ ڈرتے تھے کہ خوب صورت ناکیں لگ جانے پر لوگ ان سے پوچھا کریں گے اور جب لوگوں کو معلوم ہوگا تو اہمیں اور بے وقوف سمجھا جائے گا اور کہا جائے گا کہ وہ وردان پا کر بھی اپنے حالات کو درست نہیں کر سکے پس انہوں نے فیصلہ کیا کہ اپنی اصلی ناکوں کو واپس مانگا جائے۔ اور اس کے مطابق ہی تیسرا پانسہ پھینکا گیا۔

رٹی روٹی چلانے اور کمانے کھانے میں بڑا فرق ہے۔ پانی پانی چلانے اور پانی پینے میں بڑا فرق ہے۔ پس صرف ایشور ایشور کہہ کر ہم اس کو نہیں جان سکتے۔ ہمیں اس کے حصول کے لئے کوشش کرنی چاہیئے۔ اور ریاضت و عبادت کرنی چاہیئے۔

لہر جب تک سمندر میں نہیں گرتی لامحدود نہیں ہوتی۔ لہر لہر ہی رہتی ہے۔ محدود اور لیکن سمندر میں گرنے سے یہ سمندر بن جاتی ہے۔ قطرہ دریا بن جاتا ہے۔ خود کو لہر نہ سمجھئے اور آزاد ہو جایئے۔

مخصوص تصورات کو ایک نظام کے تحت ترتیب دینا حقیقی فلسفہ ہے۔ جہاں پر دلیل و منطق ختم ہوتی ہے۔ وہاں سے مذہب شروع ہوتا ہے۔ وجدان دلیل کے مقابلہ میں کہیں زیادہ بلند ہے لیکن اس کی تردید نہیں ہونی چاہیئے۔ وجدان چمکدار روشنی ہے جو صبح و شام روشن ہے۔ کسی کام کے کرنے کا ارادہ ضروری نہیں کہ وجدان ہو۔

* * * * * * * * *

مایا میں ترقی ایک چکر ہے جو آپ کو بالآخر نقطۂ آغاز تک ہی لے جا سکتا ہے۔ آغاز تعلیم اس وقت ہوتا ہے جب آپ کا صدق و ایمان یکجا ہو جائے۔ تعلیم یہ ہے کہ تمام علم آپ کو آ جائے۔ ریاضت خدا نیک روحوں کی خدمت اور ان سے عشق و محبت یکسوئی قلب مراقبہ اور مجاہدہ بے لوث خدمتِ خلق۔ یہ ہیں وہ طریقے جن کے ذریعہ آپ اِس مایا جال کو توڑ سکتے ہیں۔ لیکن اولیں ضرورت اِس بات کی ہے کہ آپ آزاد ہونے کا مصمم ارادہ کر لیں۔ روشنی کی وہ کرن جو تاریکیوں کو چیر کر دُور کرے گی۔ ہمارے اپنے اندر موجود ہے۔ یہ گیان ہے جو ہماری فطرت ہے۔ یہاں کوئی پیدائشی حق نہیں ہے ہم کبھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔ ہمیں صرف اُن بادلوں کو ہٹانا ہے جو اس پر چھائے ہوئے ہیں۔

عرش و فرش سے لُطف حاصل کرنے کی تمام خواہشات کو ترک کر دیجئے۔ حواس خمسہ قابو کیجئے دل و دماغ کو قابو میں رکھیئے ہر مصیبت کو خندہ پیشانی سے برداشت کیجئے کہ جیسے یہ تکلیف آپ کو نہ ہو۔ نجات کے علاوہ اور کسی چیز کے بارے میں نہ سوچیئے مُرشد گورو میں اعتقاد رکھیئے۔ اس کی تعلیمات میں یقین رکھیئے اور اس ایمان میں اعتماد رکھیئے کہ آپ کو آزاد ہونا ہے۔ کچھ بھی ہوتا رہے "سوہنگ سوہنگ" کا جاپ کیجئے۔ یہاں تک کہ کھاتے پیتے چلتے اور دُکھ میں ہر وقت اسی منتر کا جاپ کرتے رہیئے اپنے دلوں میں اس حقیقت کو جاگزیں کرتے چلے جایئے کہ دُنیائے رنگ و بُو میں جو ہم دیکھ رہے ہیں بے ثبات ہے۔ "میں ہی وہ ہوں"

---

غبارِ خاطر صفحہ ۹۵

میں نہی وہ ہوں"۔ روشنی کوندی نہیں کہ طلسم خواب ٹوٹا نہیں۔ رات دن یہ خیال رکھیئے کہ یہ دُنیا بے ثبات ہے فانی ہے۔ باقی صرف خدا ہے۔ وصلِ خدا اور نجات حاصل کرنے کی شدید ترین خواہش دل میں بیدار کیجیے۔

تمام دوست اور عزیز "خشک کنوؤں" کی مانند ہیں ہم ان میں گر جاتے ہیں اور فرض اور غلامی کے ایسے خواب دیکھنا شروع کر دیتے ہیں جن کا کوئی اختتام نہیں ہوگا۔ دوسروں کی امداد کرکے فریب پیدا نہ کیجیے یہ بڑ کے درخت کی طرح ہے جو پھلتا ہی رہتا ہے۔ اگر آپ ایک دویت کو ماننے والے ہیں تو پھر کیا آپ احمق ہیں جو خدا کی امداد کریں گے۔ اگر آپ ادویت مت کو مانتے ہیں تو پھر آپ کو جاننا چاہیئے کہ آپ ہی خدا ہیں پھر فرض کہاں؟ آپ کے لیے اپنے شوہر بچے اور دوستوں کا کوئی فرض نہیں ہے۔ حالات کو اس طرح دیکھیے جس طرح وہ رونما ہوتے ہیں۔ پرُسکون طریقے پر پڑے رہیئے۔ اگر آپ کا جسم تیرتا ہے تو تیرنے دیجیے۔ لہر اٹھتی ہے تو اُس کے ساتھ اُٹھیے۔ لہر گرتی ہے تو اس کے ساتھ گر جائیے جسم کو مر جانے دیجیے۔ جسم کا نظریہ محض ایک گھسے پٹے فرضی قصہ جیسا ہے۔ پرُسکون رہیئے اور سمجھ لیجئے کہ آپ ہی الیشور ہیں۔

حال صرف وجود ہے۔ یہاں تک کہ فکر و خیال میں بھی ماضی یا مستقبل نہیں ہیں کیونکہ جب آپ ان کے بارے میں سوچتے ہیں تو گویا ان کو حال اور مستقبل کر دیتے ہیں ہر شئے کو ترک کر دیجیے وہ جہاں جاہیں جائیں۔ یہ دُنیا محض ایک فریب ہے دُنیا کو اس کی اجازت نہ دیجیے کہ وہ آپ کو پھر دھوکہ دے۔ اگر جسم کہیں چلا گیا ہے تو اس کو جانے دیجیے اس کی فکر نہ کیجیے کہ جسم کہاں ہے۔ ذمہ داری کا یہ جابرانہ نظام ایک خوفناک لہر ہے جو دُنیا کو کھائے جا رہا ہے۔

آرام اور سکون کے لئے اجازت کا انتظار نہ کیجیے۔ یہیں پر آرام اور سکون لینا کیوں نہیں شروع کر دیتے؟ عالمِ بالا کا انتظار کیوں؟ یہیں دیدار کیجیے یہ لُطف و سرور یہیں حاصل کیجیے۔ عالم بالا میں شادمانی نہیں ہوتی۔ نہ ہی جبر وغیرہ کی بات ہوتی ہے۔ یہیں پر الیشور کے ساتھ کیوں نہیں مل جاتے؟ سنیاسی کا بھگوا لباس آزادی کا نشان ہے۔ دُنیا کا بھکاریوں جیسا لباس چھوڑ دیجیے۔ اور آزادی کے پرچم یعنی بھگوے لباس کو پہن لیجیے۔

---

# ہندو دھرم کی مُشترک بُنیادیں

یہی [1] وہ سرزمین ہے جو متبرک و مقدس آریہ ورت کے اندر بھی متبرک ترین مقام قرار پانے کا مستحق ہے۔ یہ برہم ورت" ہے اور ہمارے عظیم ترین رہنما منو نے اِس سرزمین کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ وہ سرزمین ہے جہاں سے روحانیت کی ایک عظیم الشان لہر اٹھی تھی اور ہاں جیسا کہ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے وہ وقت ابھی آنا ہے جب اِس لہر کو ساری دُنیا پر چھا جانا ہے۔ اس سرزمین سے اس کے بڑے پاٹدار دریاؤں کی طرح روحانیت کے دھارے اُبلے اور یہ اُبلتے ہوئے دھارے ایک دوسرے سے ملتے گئے یہاں تک کہ انھوں نے ساری دُنیا کا سفر کر ڈالا اور اپنی روانی کی گرجدار آواز سے اپنے کو ساری دُنیا پر ظاہر کر دیا۔ یہ وہ سرزمین ہے جس نے ہندوستان میں داخل ہونے والے تمام حملہ آوروں کے ہاتھوں پرسوز زخم کھائے ہیں اور تمام حملہ آور اُسے روندتے ہوئے گزرے ہیں۔ یہ صفت شجاعت رکھنے والی وہ سرزمین ہے جس پر بیرونی حملہ آور آریہ ورت میں داخل ہونے سے پہلے اپنی بربریت کے گل کھلاتے رہے ہیں، یہ وہ سرزمین ہے جس نے ہر مصیبت سہی ہے ہر ظلم برداشت کیا ہے لیکن اس کے باوجود اپنی شوکت و شان کو برقرار رکھا اور اپنی زندگی کی شکتی کو کبھی مٹنے نہ دیا یہی وہ سرزمین ہے جس نے ماضی قریب میں شریف النفس نانک کو جنم دیا جس نے دُنیا بھر کو محبّت کا پیغام دیا پریم کی لوری سنائی۔ یہاں اس کے دل کا دوار کھلا جس میں پوری دُنیا کے سما جائے

---

[1] لاہور پہنچنے پر سوامی جی کا، آریہ سماج اور سناتن دھرم سبھا دونوں کے لیڈروں نے شاندار سواگت کیا، لاہور میں مختصر قیام کے دوران سوامی جی نے تین لیکچر دئے جن میں سے پہلے لیکچر کا عنوان تھا "ہندو دھرم کی مشترک بنیادیں" دوسرے لیکچر کا موضوع تھا "بھکتی" اور تیسرا وہ معروف و مشہور لیکچر ہے جس کا عنوان ہے "ویدانت" اپنے پہلے لیکچر میں سوامی جی نے جو فرمایا اسکا مفہوم و مطلب درج ذیل ہے۔ 'سرزمین' سے مراد 'پنجاب' ہے۔

کی جگہ موجود ہے، یہیں اُس نے نہ صرف ہندو، بلکہ مسلمانوں کو بھی اپنے گلے سے لگانے کے لئے پیار کی بانہیں
پھیلائیں، یہی وہ سرزمین ہے جہاں صفتِ شجاعت رکھنے والی ہماری شاندار قوم کے متاخرین میں وہ عظیم المرتبت
سپاہی پیدا ہوا جس نے دھرم کی حفاظت اور اپنے وطنی بھائیوں کی مدافعت کے راستہ میں اپنا خون پسینہ کی
طرح بہا دیا اور اس واقعہ کے باوجود یہ بہادر انسان اپنا خون بہاتا رہا کہ جن لوگوں کی خاطر اس نے اپنے
خون کو پسینہ بنا ڈالا انفرادہ اُسے چھوڑ بیٹھے تھے اور انھوں نے اس کے ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا، یہ
بہادر شیر، جس کے دل میں زخم لگا تھا جب بیں پڑ رہا اور یاروں کی بے مہریوں کے عالم میں اس دنیائے فانی
سے کوچ کر گیا لیکن مرتے مرتے بھی اس کے ہونٹوں سے اپنے وطن کے خلاف ایک بات نہ نکلی اور اُس نے اپنے وطن کی
بے مہریوں پر اپنی زبان سے شکایت کا ایک لفظ تک نہ کہا۔

پانچ دریاؤں کی اس قدیم و مقدس سرزمین کے فرزندو! میں یہاں آپ کے سامنے آپ کو درس دینے
کے لئے ایک معلّم کی حیثیت سے نہیں کھڑا ہوا ہوں اس لئے کہ خود میرا علم بہت مختصر ہے اور خود میری معلومات
بہت کم ہیں، میری حیثیت یہاں اس وقت ایک ایسے آدمی کی ہے جو مشرق کا رہنے والا ہے اور پیار کا وہ
سندیسہ لایا ہے جو اس ملک کے مشرقی خطہ میں آباد لوگوں نے اپنے اُن بھائیوں کو بھیجا ہے جو اس دیس کے
مغربی خطے میں آباد ہیں۔ میں یہاں آپ کے سامنے پیار اور مبارکباد کے اس سندیسے کے الفاظ دُہرانے کے لئے کھڑا
ہوا ہوں، میں یہاں وہ فرق نہیں ڈھونڈھ رہا ہوں جو ہمارے درمیان موجود ہے، بلکہ میں اس مرکزِ خیال
کی جستجو میں ہوں جس مرکزِ خیال پر پہنچ کر ہم ایک ہو سکتے ہیں، اور ہم میں مفاہمت۔ ہم آہنگی، اور ایکتا پیدا
ہو سکتی ہے، میں یہاں یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ہم کس بنیاد پر پہنچ کر سدا کے لئے بھائیوں کی طرح رہ سکتے
ہیں۔ اور کس طرح اس آواز کی بڑھتی ہوئی گونج طاقتور سے طاقتور ہو سکتی ہے جو ہمیشہ سے پکار رہی ہے
اور ہمیشہ پکارتی رہے گی، یہاں میں اس امر کی کوشش کر رہا ہوں کہ بجائے تخریب کے کچھ تعمیری کام تجویز کروں
اعتراض اور نکتہ چینی کا زمانہ بیت چکا ہے، اب تعمیری کام کرنے کا وقت آیا ہے، کبھی دُنیا کو نکتہ چینی کی بھی
ضرورت ہوتی ہے، بہت سخت نکتہ چینی کی، لیکن اس کا ایک وقت ہوتا ہے، تھوڑا اور بہت تھوڑا وقت،
نکتہ چینی، ایک عارضی چیز ہے لیکن جو کام سدا جاری رہتا ہے وہ تعمیر و ترقّی کا کام ہے، تخریب اور نکتہ چینی
سدا جاری رہنے والی چیز نہیں ہوا کرتی، لگ بھگ سو برس سے ہمارے ملک میں نکتہ چینی کا ایک سیلاب اُمنڈ
رہا ہے اور اس سیلاب کے دوران میں مغربی سائنس کو یہ پورا موقع ملا ہے کہ وہ تمام سیاہ داغوں اور کالے
دھبّوں کو نمایاں کر دے، نتیجہ یہ ہے کہ کسی دوسری چیز کی بہ نسبت جو شے سب سے زیادہ نمایاں ہو کر ہمارے
سامنے آئی ہے وہ یہی تاریک گوشے ہیں اور یہی اندھیرے سوراخ ہیں، قدرتی طور پر ہمارے دیس میں ہر طرف سے

وہ دانشمند کافی تعداد میں اُٹھے جن کے دل انصاف و صداقت کے پرستار اور اپنے وطن کی محبت سے معمور و لبریز
تھے، اُنھیں اپنے بھگوان سے بے پناہ پیار تھا، اپنے دھرم سے بے پناہ عشق تھا اور چونکہ یہ محترم اور معزز شخصیتیں بیحد
حساس تھیں اور اُن کے دلوں میں محبت و اخلاص کا جذبہ بیحد گہرا تھا اس لئے ہر وہ چیز اُن کی سخت و شدید نکتہ چینی کا
موجب بن گئی جو اُن کے خیال میں غلط تھی اور ان کی نظر میں ٹھیک نہیں تھی ماضی کی اُن عظیم شخصیتوں پر اُن محترم آتماؤں پر
بھگوان اپنی کرپا کرے کہ انھوں نے بہت اچھے کام کئے ہیں، بہت شاندار کارنامے انجام دئے ہیں، لیکن عصرِ حاضر کی آواز
بھی ہمارے کانوں تک پہنچ رہی ہے اور ہم سے جو کچھ کہہ رہی ہے وہ بہت کافی ہے، نکتہ چینی، عیب جوئی ہوئی اور بہت
ہوئی، اب وقت آیا ہے کہ ہم از سرِ نو ایک عمارت بنانے کے لئے اپنی تمام پاکیزہ شکتی کو ایک جگہ جمع کریں، ایک مرکز پر لائیں
اور اس کے ذریعہ اپنی قوم کو ارتقاء کی راہ پر آگے لے چلیں اور وہ سفر شروع کریں جس کو روکے ہوئے صدیاں بیت گئی
ہیں، مکان کی صفائی ہو چکی ہے، اب اُسے پھر سے آباد ہونے دیجئے، راستہ صاف، ہموار اور کشادہ ہو چکا ہے، اے
آریہ کے بیٹو! آؤ اور اس صاف و ہموار راستہ پر آگے کی طرف چلنے کے لئے قدم بڑھاؤ۔

معزز حضرات! یہی وہ غرض و غایت ہے جو مجھے آپ کے سامنے کھینچ لائی ہے اور میں ابتدا ہی میں یہ اعلان
کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا تعلق نہ کسی فرقہ سے ہے نہ کسی پارٹی سے ہے، میرے لئے سب ہی فرقے اور سب ہی پارٹیاں
قابلِ احترام ہیں، دوم میں ان سب سے بے حد پیار رکھتا ہوں اور اپنی ساری عمر اُن میں اچھائیاں اور سچائیاں
ڈھونڈھنے کی کوشش کرتا رہا ہوں، لہٰذا میں آج رات آپ کے سامنے صرف وہ نکات پیش کرنا چاہتا ہوں جن پر
ہم سب متفق الرائے ہیں اور صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ آیا ہم سب ایک سمجھوتہ کی کوئی بنیاد تلاش کر سکتے ہیں؟
یہ صورتِ واقعہ اگر ایشور کی کرپا سے پیدا ہو سکتی ہے تو یہ صورتِ واقعہ پیدا کرنے کی ہمیں ذمہ داری قبول
کرنی چاہیئے اور اس خیال کو عمل سے بدلنے کی ایک کوشش کرنی چاہیئے، ہم ہندو ہیں، میں یہ لفظ "ہندو"
قطعی طور پر کسی بُرے مفہوم میں استعمال نہیں کر رہا ہوں اور نہ میں اُن لوگوں سے متفق ہوں جو یہ سوچتے ہیں کہ
اس لفظ کے اندر بُرے معنی پوشیدہ ہیں، قدیم زمانہ میں جو لوگ دریائے سندھ کے دوسرے کنارے کی طرف
آباد تھے اُنھیں ہندو کہا جاتا تھا اور اس لفظ کا اتنا ہی مطلب تھا اور اتنے ہی معنی تھے، آج ایسے بہت سے
لوگ جو ہم سے نفرت کرتے ہیں اس لفظ کو چاہے جتنے بھی بُرے معنی پہنا دیں لیکن آپ جانتے ہیں کہ ناموں کا کوئی
مطلب نہیں ہوتا یہ بات ہم پر منحصر ہے کہ چاہے ہم اُن تمام چیزوں کا نام ہندو رکھ لیں جو ہمیں شاندار دکھائی دیتی
ہیں، جن میں روحانیت نظر آتی ہے، چاہے ہم اُن تمام چیزوں کو ہندو کہنے لگیں جو زوال اور گراوٹ کی نشانیاں
ہیں، بیکار اور فضول چیزیں ہیں، اگر اس زمانہ میں لفظ "ہندو" کا کوئی بُرا مطلب لیا جاتا ہے تو آپ اس
کی پرواہ نہ کریں بلکہ اپنے عمل سے یہ ظاہر کرنے کے لئے خود کو تیار رکھیں کہ دنیا کی کسی بھی زبان میں لفظ "ہندو"

سے بہتر اور شاندار لفظ نہ تو موجود ہے نہ کبھی اس سے زیادہ عظیم الشان لفظ وضع ہوا ہے' یہ میری زندگی کے اصولوں میں سے ایک اصول ہے کہ میں اپنے آبا و اجداد کے نام پر شرمندہ نہیں ہوا کرتا' مجھے اپنی ذات پر گھمنڈ ہے میں اپنے آپ پر فخر کرتا ہوں اور اِس دُنیا میں جو لوگ سب سے زیادہ مغرور پیدا ہوئے ہیں اُن میں سے ایک میں بھی ہوں لیکن آپ سے میں بڑی صفائی کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے اس غرور کی وجہ میری وراثت ہے' میرے آبا و اجداد ہیں' میں نے جتنا جتنا تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اور جتنا جتنا عہد رفتہ کی طرف پلٹ کر دیکھا ہے مجھ میں اتنا ہی اتنا گھمنڈ پیدا ہوا ہے اور مجھے اتنی ہی اتنی شکتی' ہمت اور جرأت ملی ہے کہ میں اس خاک سے اٹھوں اور دُنیا کے سامنے وہ عظیم الشان نظام پیش کروں جو ہمارے آبا و اجداد اپنی وراثت میں ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں' اے قدیم آریوں کے بیٹو! آپ بھی بھگوان کی کرپا سے یہی فخر رکھتے ہیں اور آپ بھی اس بات پر گھمنڈ کر سکتے ہیں کہ آپ کی رگوں میں بھی آپ کے آبا و اجداد کا وہی خون دوڑ رہا ہے اور یہی خون آپ کی زندگی میں بروئے کار ہے اور آپ اس خون کو دنیا کی فلاح و نجات کے کام میں لگا سکتے ہیں۔

اپنی قومی زندگی کی مشترک بنیاد ڈھونڈھنے کی کوشش کرنے سے پہلے ایک بات ہمیں یاد رکھنی چاہیئے' اور وہ یہ کہ جس طرح ہر شخص میں انفرادیت ہوتی ہے اسی طرح ہر قوم میں بھی انفرادیت ہوا کرتی ہے جس طرح ایک آدمی اپنی بعض خصوصیات میں دوسرے آدمی سے مختلف ہوتا ہے اسی طرح ایک قوم بھی اپنے بعض خصائص میں دوسری قوم سے بھی مختلف ہوا کرتی ہے' اور جس طرح ایک بشر کو اس کے ماضی کے کرم کے اعتبار سے قدرت کے اس کارخانے میں بعض مقاصد کی تکمیل کا آلہ بننا ہوتا ہے اسی طرح ایک قوم کے لئے بھی ایک متعین مقصد ہوا کرتا ہے جسے وہ پورا کرتی ہے' وہ ایک مشن رکھتی ہے اور اس مشن کو قائم رکھتی ہے' اس کے پاس ایک پیغام ہوا کرتا ہے اور وہ دنیا کو یہ پیغام سناتی ہے' لہٰذا ہمیں ابتدا ہی میں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہماری اپنی نسل کا کیا مشن ہے وہ کونسا متعین مقصد ہے جسے ہماری نسل کو پورا کرنا ہے' اور ہم نے تمام نسلوں کی یک جہتی کے لئے کونسا آہنگ دیا ہے' اپنے بچپن میں ہم اپنے ملک میں یہ کہانیاں سُنا کرتے ہیں کہ بعض سانپوں کے سروں پر تاج ہوا کرتا ہے' اور سانپ کے ساتھ ایک شخص کوئی بھی برتاؤ کرے لیکن جب تک کہ اس کے سر پر تاج ہے اُسے مارا نہیں جا سکتا یہاں ہم یہ قصے سنتے ہیں کہ دیو اور جنوں کی جان چھوٹی چھوٹی چڑیوں کے اندر ہوا کرتی ہے اور جب تک یہ چڑیاں محفوظ رہتی ہیں دُنیا میں کوئی طاقت نہیں ہے جو اِن دیو اور جنوں کو مار سکے' آپ چاہیں تو اِن دیو اور جنوں کے ٹکڑے اُڑا دیں لیکن جب تک کہ اُن کی جان چڑیوں کے اندر محفوظ ہے' اس وقت تک وہ ہلاک نہیں ہو سکتے' بالکل یہی بات قوموں کی زندگی پر بھی صادق آتی ہے' ہر قوم کی زندگی کا ایک مرکز ہوتا ہے اور یہ مرکز اس نسل کی قومیت کے اندر نہاں ہوا کرتا ہے' جب تک اس مرکز کو ہاتھ نہ لگایا جائے اس وقت تک ایک قوم ہلاک نہیں

ہوا کرتی، اس روشنی میں ہم تاریخ کے اُس حیرتناک عمل کو بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں جس کی دُنیا بھر میں کوئی دوسری نظیر نہیں ہے، ہماری اس مقدس سرزمین پر وحشی حملہ آوروں کی لہروں پر لہریں آتی رہیں، سیکڑوں برس تک اللہ اکبر نعرہ یہاں کی فضاؤں میں گونجتا رہا اور کوئی ہندو ایسا نہ تھا جو یہ جانتا ہو کہ کس لمحہ اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ دُنیا کی تمام تاریخی سرزمینوں کو اس سے زیادہ ادبار اور اس سے زیادہ تکلیف دہ اور تباہ کن حالات کا سامنا نہیں ہوا لیکن اس کے باوجود ہماری قوم بدستور کھڑی ہے اور اگر ضروری ہو تو وہ بار بار مشکلات کا سامنا کرنے کے لئے کمربستہ بھی ہے، تیار بھی ہے، یہی نہیں کہ اس میں اب طاقت کی نشانیاں نظر آرہی ہیں بلکہ اس میں وسعت پذیر زندگی کے آثار بھی دکھائی دے رہے ہیں،

آج ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے خیالات و نظریات صرف ہندوستان کی سرحدوں ہی کے اندر محدود نہیں ہیں، بلکہ یہ ہماری سرحدوں سے باہر نکل کر اب آگے بڑھ رہے ہیں، دوسری قوموں کے ادب میں داخل ہو رہے ہیں، دوسری قوموں میں اپنا مقام پا رہے ہیں اور بعض جگہوں پر تو ہمارے خیالات و نظریات نے غالب حیثیت حاصل کر لی ہے، مزید برآں اس حقیقت کا تجزیہ کرتے ہوئے ہم یہ بات بھی دیکھتے ہیں کہ دُنیا کی مجموعی ترقی میں ہندوستان نے سب سے زیادہ حصّہ ادا کیا ہے اور ہندوستانی فکر و ذہن پر سب سے زیادہ اثر مرتب کرنے والی جو چیز ہے وہ ہمارا فلسفہ ہے، ہماری روحانیت ہے اور دوسری اقوام کی طرح ہمارے آباواجداد نے بھی بہت سے کام انجام دئے ہیں، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، ان کارناموں میں سے ان کا سب سے پہلا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے فطرت و کائنات کے اسرار کی کھوج کی اور اس نسل کے عظیم دماغوں نے اپنے غور و فکر کے نتیجہ میں وہ حیرتناک کرشمے دکھائے جن پر ساری دُنیا ہمیشہ فخر کرتی رہے گی لیکن انھوں نے اعلیٰ کے لئے ادنیٰ کو ترک کر دیا اور ویدوں میں یہ تعلیم دی گئی کہ سائنس عظیم تر شے ہے جو اس ذات کا عرفان دیتی ہے جو غیر متغیر ہے اور کبھی بدلتی نہیں، فطرت، انقلابات و تغیرات، حیات و موت اور رنج و ادبار کے اسباب و علل کا علم بہت بڑی چیز ہے، بہت ہی عظیم چیز ہے لیکن غیر متغیر ذات کا عرفان سب سے بڑا علم ہے، یہ تمام علوم کا سرچشمہ ہے، یہی وہ ذات ہے جہاں کرم ہے، رحمت ہے، امن و امان ہے، حیات جاودانی ہے، اکملیت ہے، کمال اور شرف ہے اور یہی وہ ذات ہے جہاں پہنچکر تمام ادبار ختم ہو جاتے ہیں، تمام مصیبتیں اور کلفتیں فنا ہو جاتی ہیں، بہرحال اگر وہ چاہتے تو ان علوم کی بھی کھوج کر سکتے تھے جو انسان کو صرف روٹی، کپڑا اور طاقت فراہم کرتے ہیں، وہ علوم بھی انھیں معلوم ہونے جو کمزور پر طاقتور کو غلبہ پانے کی ترغیب دیتے ہیں لیکن تمام تعریفیں اُس ایشور کے لئے ہیں جس نے ہمارے آباواجداد کو علوم کے دوسرے روشن ترین پہلو کی آگہی دی جو تمام علوم کا رحمت آفریں پہلو ہے اور یہی وہ پہلو ہے جو ہمارا

قومی وصف بن گیا اور یہ وصف ہزاروں برس سے باپ سے بیٹے میں منتقل ہوتا ہوا ہم تک پہنچا ہے۔ یہ وصف ہمارے خون کی بوند بوند میں گھل گیا ہے ہماری فطرت میں شامل ہے، اور یہی وہ وصف ہے جس نے دھرم کا نام اختیار کیا اور جس نے تمام ہندوؤں کو ایک کر دیا، یہ ہمارا قومی وصف ہے اور اس وصف کو ہاتھ نہیں لگایا جا سکتا، وحشی حملہ آوروں کی تلواریں، آگ اور خون کی بارشیں، وحشی حملہ آوروں کے ساتھ آنے والے وحشی ادیان، اس جوہر کو ہاتھ نہیں لگا سکے اور ان میں سے کسی میں بھی یہ شکتی نہیں تھی کہ وہ اس چڑیا کو ہلاک کر دیتی جس کے دل کے اندر ہمارے قومی وصف کا جوہر پوشیدہ تھا، یہ جوہر ہی ہماری نسل کی توانائی ہے اور جب تک یہ جوہر موجود ہے اس وقت تک اس سرزمین پر کوئی طاقت نہیں ہے جو ہماری نسل کو فنا کر سکے، ہمیں ہلاک کر ڈالے، تمام ادبار کی گھٹائیں ہمارے سروں پر سے گزر جائیں گی، ہمیں کوئی گزند نہ پہنچے گا اور ہم آگ کے شعلوں کے اندر سے بالکل اسی طرح محفوظ و مامون نکل آئیں گے جس طرح بھگت پرہلاد آگ کے شعلوں سے باہر نکل آئے تھے، جب تک ہم میں روحانیت کا یہ عظیم ورثہ بطور وصف و جوہر موجود ہے اس وقت تک ہم کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا، جس ہندو میں روحانیت نہیں ہے میں اسے ہندو نہیں کہوں گا، دوسرے ملکوں میں یہ بات ہو سکتی ہے کہ ایک آدمی پہلے سیاسی ہو اور پھر کسی حد تک مذہبی ہو، لیکن ہمارے یہاں ہماری زندگی کا پہلا فرض یہ ہے کہ ہم پہلے مذہبی ہوں اور پھر اگر وقت و مہلت ملے تو ہم دوسرے کام کریں، یہ بات اپنے ذہن میں حاضر رکھیے تو آپ اس مقصد کو زیادہ اچھے طریقے سے سمجھ سکیں گے کہ قومی فلاح و بہبود کے لئے ہم زمانہ حال میں بھی اپنی نسل کی تمام روحانی شکتیوں کو مجتمع کرنے کی ضرورت کن وجوہ سے محسوس کر رہے ہیں، جس طرح ماضی میں ہم نے اپنی نسل کی تمام روحانی شکتیوں کو مجتمع کیا تھا اسی طرح آج بھی ہمیں اپنی تمام روحانی شکتیوں کو جمع کرنا ہے، ہندوستان میں قومی ایکتا ان روحانی شکتیوں کی شیرازہ بندی ثابت ہونی چاہیئے جو ادھر ادھر بکھری پڑی ہیں، ہندوستان میں ایک قوم کی تشکیل ان لوگوں کے اتحاد پر مبنی ہونی چاہیئے جن کے دل کی دھڑکنوں میں روحانیت کا ایک ہی آہنگ پایا جاتا ہے۔

اس ملک میں بہت سے فرقے ہیں اور مستقبل میں ان فرقوں کی تعداد میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے، اس لئے کہ ہمارے دھرم کی یہ خوبی ہے کہ اس نے اپنے بنیادی اصولوں میں بھی بڑی چھوٹ اور بڑی آزادی دے رکھی ہے، ان اصولوں کی اگرچہ اتنی زیادہ تفسیریں اور تعبیریں ہو چکی ہیں اور یہ سب تفصیلات ان ہی اصولوں سے ماخوذ ہیں جو فطرت کی طرح غیر فانی اور آسمانوں کی طرح وسیع اور غیر محدود ہیں، لیکن اس کے باوجود تفسیروں اور تعبیروں کا عمل جاری ہے، اس لئے یہاں ان گنت فرقے تو ہونا ہی چاہئیں لیکن جو چیز نہ ہونا چاہیئے وہ ہے ان فرقوں کے درمیان آپس کی لڑائی، آپس کے جھگڑے، فرقے ہیں تو ہوں لیکن فرقہ بندی کی ضرورت نہیں

ہے، فرقہ بندی کے لئے یہ دُنیا کوئی اچھی جگہ ثابت نہیں ہوگی، بے شک فرقوں کے بغیر دُنیا نہیں چل سکتی لیکن فرقہ بندی ہوگی تو دُنیا جہنم بن جائے گی، ظاہر ہے کہ چند نفوس پر مشتمل ایک چھوٹا سا گروہ اس ساری شکتی کا انتظام کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا جو اس دُنیا میں غیر محدود مقدار میں پائی جاتی ہے، اس سے ہی یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ہم تقسیم کار کے لئے کس قدر مجبور ہیں، اور جب بھی تقسیم کار ہوگی تو قدرتی طور پر مختلف طبقات معرض وجود میں آجائیں گے، روحانی شکتی کے استعمال کے لئے مختلف فرقے ہونے دیجئے لیکن یہ بات بتائیے کہ ان مختلف فرقوں کے درمیان لڑائی اور جھگڑے ہونے کی کیا ضرورت ہے جبکہ ہماری قدیم کتابوں میں یہ بات بہت ہی صاف الفاظ میں کہی گئی ہے کہ یہ فرق جو نظر آتا ہے وہ ظاہری ہے، اور اس فرق کے باوجود ان سب میں اتحاد اور یک جہتی کا ایک خوبصورت رشتہ موجود ہے، ہماری انتہائی قدیم کتابوں میں یہ بات کہی گئی ہے۔

एकं सद्विप्रा बहुधा वदन्ति —

کہ ایشور ایک ہے لیکن اس کو مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ ناموں کا اختلاف اس کی ذات وحدہٗ لاشریک کے بارے میں کوئی مغالطہ اور کوئی فتنہ پیدا کرنے کی وجہ کیوں بنے؟ حیرت ہے کہ ہم اپنی مادّی دُنیا میں ایک ہی شخص کو مختلف ناموں سے پکارتے ہیں، کوئی کچھ کہہ کر پکارتا ہے، کوئی کچھ نام پکار کر آواز دیتا ہے، پیالہ کی جتنی ترنگیں، اتنے ہی اس ذات کے نام، انیک ترنگیں، انیک نام۔ اَن گِنت ترنگیں، اَن گِنت نام۔ یا یُوں کہیئے جتنی ترنگیں اتنے نام۔ گیتا اور اُپنشدوں میں اسی حقیقت کو بار بار دُہراتے ہُوئے کہا گیا ہے کہ آپ چاہے کسی نام سے پکارو، یا کسی نام سے اس کی پُوجا کرو، آپس میں فساد کا سوال ہی کیوں اُٹھے۔ لڑائی تو تب ہو جب اس ایشور کی بجائے کسی اور کی پُوجا کی جا رہی ہو۔ یا اس ایشور کی بجائے کسی اور کی حمد و ثنا میں گیت الاپے جا رہے ہوں۔ ہندو دھرم کی اسی بنیادی یگانگت کی ہی نشان دہی کرتے ہُوئے گیتا کہتی ہے کہ:۔

"ایکنگ سدھ پرا بہودھا ودنتی"

"وہ کہ جو موجود ہے صرف ایک ہے اور یوگی اس ذات کو مختلف ناموں سے پکارتے ہیں" اگر ان مختلف طبقات میں یہی کشمکش رہتی ہے، اگر مختلف فرقوں میں یہی لڑائی جھگڑے رہتے ہیں اور اگر ہندوستان کی سرزمین پر ان کے درمیان یہی نفرت اور حسد رہتا ہے جس پر ہمیشہ ہی تمام فرقوں کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے تو ان باتوں پر ہم سب کو شرم آنی چاہیئے جو اپنے آپ کو اپنے عظیم المرتبت آباؤ اجداد کا ورثہ دار کہتے ہیں۔

ہم چاہے وشنو کے ماننے والے ہوں، چاہے شیو اور گنپتی کے پجاری ہوں، ہم چاہے قدیم ویدانتی ہوں چاہے جدید ویدانتی ہوں، ہم چاہے قدیم کٹّر پن رکھنے والے فرقوں سے تعلق رکھتے ہوں یا جدید اصلاح پسند

فرقوں سے متعلق ہوں، لیکن میرا خیال ہے کہ چند موٹے موٹے اصول ہیں جن پر ہم سب ایک ہیں اور جو شخص بھی خود کو ہندو کہتا ہے، وہ ان اصولوں میں عقیدہ رکھتا ہے، بے شک ان اصولوں کی تعبیرات میں فرق ہے، تشریحات میں فرق ہے، اور یہ فرق ہونا بھی چاہیئے، اور اس فرق کو جاری رکھنے کی اجازت بھی دینا چاہیئے، اس لئے کہ ہمارا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ہم دوسروں کو اپنے ساتھ باندھ کے رکھیں، یہ ایک پاپ ہوگا کہ ہم دوسروں کو اس بات پر مجبور کریں کہ زندگی کے جو طریقے ہم نے اختیار کئے ہیں وہ بھی انہی طریقوں کو اختیار کرے اور جو عقیدہ ہم رکھتے ہیں وہ بھی وہی عقیدہ رکھے، یہاں جتنے لوگ موجود ہیں شاید وہ سب اس بات سے اتفاق رکھتے ہوں گے کہ ہم سب کا یہ یقین ہے کہ ویدوں میں دھرم کے غیر فانی رموز کی تعلیم دی گئی ہے، ہم سب کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ یہ مقدس ادب ایشور کی ذات کی طرح ازلی اور ابدی ہے، یعنی یہ کہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، اس مقدس ادب کے سامنے جب بھی ہم کھڑے ہوں تو ہمارے سب دھارمک اختلافات اور تمام دھارمک جھگڑے ختم ہو جانا چاہئیں، اس لئے کہ ہم سب اس بات پر بھی متفق الرائے ہیں کہ یہی مقدس ادب وہ آخری عدالت ہے جو ہمارے تمام دھارمک اختلافات کی اپیلوں کا آخری اور قطعی فیصلہ صادر کرتی ہے، وید کیا ہیں؟ اس بارے میں بھی ہمارے مختلف نقطہ ہائے نگاہ ہو سکتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ ایک فرقہ ویدوں کے ایک جزو کو دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ مقدس مانتا ہو، لیکن جب تک ہم یہ کہتے ہیں کہ ویدوں میں ہم سب بھائی ہیں جو ہماری تمام نیکیوں، اچھائیوں اور پاکیزگی کا غیر فانی سرچشمہ ہیں، اس وقت تک اس بات سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کہ کون فرقہ ویدوں کے ایک جزو کو اور کون فرقہ ویدوں کے دوسرے جزو کو زیادہ مقدس مانتا ہے، اگر ہم سب اس بات میں عقیدہ رکھتے ہیں تو پھر سب سے پہلے اس اصول کو ملک کے طول و عرض میں پھیلانا چاہیئے، اس کی تبلیغ و اشاعت کرنی چاہیئے، اگر ہم سب ویدوں میں سچا اعتقاد رکھتے ہیں تو پھر ویدوں کو وہ ممتاز مقام لینے دیجئے، جس کے ہمیشہ ہی سے وہ مستحق ہیں، دوسری چیز جس میں ہم سب پورا اعتقاد رکھتے ہیں وہ ایشور کی ذات ہے، جو اس کائنات کی خالق ہے، اور ساری کائنات پر قدرت کاملہ رکھتی ہے، اور اس کی یہ شکتی اس تحیر خیز عمل میں جسے کائنات کہا جاتا ہے بروئے کار رہتی ہے، کبھی یہ شکتی، اپنے مرکز کی طرف پلٹتی ہے اور کبھی اپنے مرکز سے اس کائنات کی طرف واپس آتی ہے، ایشور سے متعلق ہمارے تصورات میں بھی ایک فرق ہو سکتا ہے، ایک اختلاف ہو سکتا ہے، ایک شخص ایسے ایشور میں عقیدہ رکھ سکتا ہے جو بشری صورت رکھتا ہو، دوسرا شخص کسی ایسے ایشور کو مان سکتا ہے جس کی ذات کا ایک روپ تو ہو، لیکن یہ روپ غیر بشری ہو، بشری نہ ہو، مزید برآں کوئی شخص ایسے ایشور کو مان سکتا ہے جو قطعی طور پر غیر مجسّم ہو اور ایشور کے یہ سب معتقدین اپنے اپنے اعتقاد کے حق میں ویدوں ہی سے جواز کے دلائل لا سکتے ہیں، لیکن یہ بات تو

سب ہی میں مشترک ہے کہ وہ ایشور میں عقیدہ رکھتے ہیں اور وہ شخص خود کو ہندو کہلانے کا مستحق نہیں ہے جو طاقت کے اس عظیم سرچشمہ میں عقیدہ نہیں رکھتا جس نے یہ ساری کائنات پیدا کی ہے اور جو ہر چیز کو زندگی دیتا ہے، اگر صورت واقعہ یہی ہے تو پھر ہمیں پورے ملک میں اس نظریہ کی تبلیغ کرنی چاہیئے، ایشور سے متعلق آپ جو تصور بھی رکھتے ہوں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور نہ اس سوال پر لڑائی جھگڑا کرنے کی ضرورت ہے آپ کو تو صرف ایشور میں یقین رکھنے کی تعلیم دینی چاہیئے اور اس سے زیادہ ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے، ایک تصور دوسرے تصور سے بہتر ہو سکتا ہے لیکن ایک بات آپ یاد رکھیں کہ ایشور سے متعلق جو تصورات ہیں ان میں سے کوئی بھی تصور برا نہیں ہے، ایک تصور اچھا ہے دوسرا بہتر ہے، تیسرا بہت بہتر ہے، اگر ان تصورات کے بارہ میں کوئی بات کہی جائے گی تو بس ان الفاظ میں کہی جائے گی ہمارے دھرم کی کسی شق میں لفظ "برا"، کبھی داخل نہیں ہوتا، لہٰذا جو لوگ بھی ایشور کا نام پھیلاتے ہیں چاہے وہ ایشور کے بارہ میں کوئی بھی تصور کرتے ہوں میں پرارتھنا کرتا ہوں کہ ایشور ان پر اپنی کرپا رکھیں، ایشور کا جتنا نام پھیلایا جائے گا، اس نسل کے لئے اتنا ہی اچھا ہوگا، ہمیں اپنے بچوں میں ایشور کا یقین پیدا کرنا چاہیئے ایشور کا نام غریب ترین اور کمتر ین گھروں کے اندر داخل کرنا چاہیئے، ساتھ ہی ساتھ اعلیٰ ترین اور امیر ترین لوگوں میں بھی ایشور کی بھگتی پیدا کرنی چاہیئے، اور ایشور نام کی روشنی سے سارے دیس کو جگمگا دینا چاہیئے۔

تیسری بات جو میں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ دنیا کی دوسری اقوام کی طرح ہم یہ بات نہیں مانتے کہ یہ دنیا چند ہزار برس پہلے معرض وجود میں آئی تھی اور ایک دن آئے گا جب یہ دنیا برباد ہو جائیگی نہ ہی ہم یہ بات مانتے ہیں کہ اس دنیا کے ساتھ انسان بھی بغیر کسی مقصد کے پیدا ہو گیا ہے، یعنی اس کی تخلیق کا کوئی مقصد نہیں ہے، میری رائے میں یہ ایک اور مرکزی خیال ہے جس پر ہم سب متفق ہو سکتے ہیں، ہمارا عقیدہ ہے کہ فطرت کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا ہے، اور اس کائنات کے مادی ظواہر محض وقفوں کے لئے اپنی لطیف حالت میں منتقل ہو جاتے ہیں اور کچھ وقفوں تک اس حالت میں رہ کر پھر اپنے مادی ظواہر میں پلٹ آیا کرتے ہیں، اور یہی وہ عمل در عمل ہے جسے ہم فطرت کہتے ہیں، یہ لہر جیسی حرکت ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی، مزید برآں تمام ہندو یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ بشر صرف مادی پیکر ہی نہیں ہے، اس کے ایک مادی پیکر کے اندر دوسرا لطیف پیکر بھی ہے یعنی دماغ لیکن اس لطیف پیکر سے بھی زیادہ کوئی عظیم چیز ہے، جو پیکر انسان کے اندر موجود ہے، اور یہ آتما ہے، میں نے اس پیکر کو دماغ سے زیادہ لطیف تر کہا ہے، اس لئے کہ جسم کے تغیر کے ساتھ عقل بھی بدلتی جاتی ہے، لیکن تغیر سے ماورا کوئی چیز ہے جو آتما کہلاتی ہے، میں اس لفظ کا کسی بھی زبان میں کوئی ترجمہ نہیں کر سکتا اس لئے کہ جو ترجمہ بھی کیا جائے گا وہ اپنی معنویت کے اعتبار سے اس لفظ کا صحیح مترادف نہیں ہو سکتا

اور ہمیشہ ہی غلط ہوگا، آتما کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا ہے، اسے کبھی فنا نہیں ہے، ہمارا یہ تصور دنیا کی دوسری اقوام کے تصور سے قطعاً مختلف اور جداگانہ ہے کہ یہ آتما ایک کے بعد دوسرے جسم میں قیام و مقام کرتی رہتی ہے اور جب تک چاہتی ہے ایک جسم سے اپنی وابستگی باقی رکھتی ہے اور پھر اسے چھوڑ کر آزاد ہو جاتی ہے، نہ وہ جنم لیتی ہے نہ وہ فنا ہوتی ہے، میں اس مقام پر نظریہ فنائے جہاں (بے ثباتیٔ حیات) اور آتما کی ابدیت کے اس نظریہ کا حوالہ دے رہا ہوں جس کی ہمارے شاستروں میں ہمیں تعلیم دی گئی ہے، ایشور اور آتما کے ربط و تعلق کے مسئلہ میں اختلافات ہو سکتے ہیں، ایک فرقہ کے عقیدہ کے مطابق یہ ایشور سے قطعی مختلف شئے ہو سکتی ہے، ایک دوسرے فرقہ کے عقیدہ کے مطابق اسے غیر فانی پرکاش کی ایک کرن کہا جا سکتا ہے، کسی اور فرقے کے خیال کے مطابق آتما کو اس غیر فانی اور غیر محدود اور غیر مجسم ذات سے جوڑا جا سکتا ہے جس کو ایشور کہتے ہیں اور یہ کہ آتما چونکہ خلق نہیں ہوتی ہے لہٰذا وہ فنا بھی نہیں ہوگی اور یہ کہ وہ مختلف اجسام سے گزرتی ہی رہے گی یہاں تک کہ وہ ایک بشر میں پہنچ کر اکملیت حاصل کرلے، اس بات سے ہم سب ہی لوگ اتفاق رکھتے ہیں، اس کے بعد وہ چیز آتی ہے جو روحانیت کی حقیقی دنیا کی سب سے زیادہ عظیم الشان دریافت ہے، آپ میں سے کچھ لوگ جو مغربی خیالات کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں شاید جانتے ہوں گے کہ جو کچھ مشرقیت ہے، اور جو کچھ مغربیت ہے، اس میں ایک انقلاب آفریں فرق دکھائی دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں جتنے لوگ ہیں وہ چاہے وشنو کے ماننے والے ہوں، چاہے شکتی کے پجاری ہوں، چاہے بدھ ہوں، چاہے جینی ہوں اس بارہ میں ہم خیال ہیں کہ آتما پاک اور کامل ہوتی ہے اور اس کی قدرت و رحمت غیر محدود ہوتی ہے، صرف نظریہ خیر و شر کے معتقد یہ خیال رکھتے ہیں کہ آتما اپنے برے اعمال میں جو اس نے ماضی میں کئے ہوئے ہیں محصور رہتی ہے اور پھر ایشور کی کرپا سے اس کے اس حصار کا دروازہ کھلتا ہے اور پھر وہ اپنی اکملیت ظاہر کرتی ہے، لیکن میںیوں کے خیال کے مطابق حصار آتما کا یہ عقیدہ بھی جزوی طور پر غلط معلوم ہوتا ہے، ان کا کہنا ہے کہ یہ مایا کی نقاب ہوتی ہے جو ہمارے اس خیال کا موجب بنتی ہے کہ آتما نے اپنی پوری شکتی کھو دی ہے حالانکہ واقعہ یہ ہوتا ہے کہ آتما کی شکتی پورے طور پر ظہور کے کار ہوتی ہے، بہر حال کیسا ہی اختلاف ہو سکتا ہے لیکن مشرقیت و مغربیت میں ایک ایسا بنیادی فرق ہے جو کبھی دور نہیں ہو سکتا مشرقی آتما میں جھانکتے ہیں، باطن میں اچھائی اور نیکی کی روشنی ڈھونڈتے ہیں، چنانچہ پوجا کرتے وقت ہم بھی اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور اپنے من کے اندر ایشور کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن مغربی محض ظواہر میں اپنے خدا کو ڈھونڈتے ہیں اور آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر اپنے خدا کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، مغربی باشندوں کے لئے اسی وجہ سے ان کی مذہبی کتابیں اکتسابی حیثیت رکھتی ہیں، جبکہ ہماری مقدس کتابیں ہمارے لئے الہامی حیثیت رکھتی ہیں، جس طرح سانس آتی ہے،

اسی طرح ایشور نے ہمارے سنتوں، سادھوؤں، رشیوں اور خدا رسیدہ پیشواؤں کے دلوں پر الہام کیا اور یوگ شاستروں کی صورت میں اس الہام اور ایشوری بانی کا پھوارہ اُبل پڑا ہے۔

یہ سوچنے اور سمجھنے کا ایک عظیم نکتہ ہے، میرے دوستو اور میرے بھائیو! مجھے کہنے دیجئے کہ ہمیں مستقبل میں اسی ایک عظیم اور اہم نکتہ ہی پر انحصار کرنا پڑے گا۔ میں اس بارے میں خود تو قطعی طور پر مطمئن ہو چکا ہوں مگر آپ سے خوشامد کرتا ہوں کہ آپ بھی اس ایک حقیقت کو سمجھیں کہ اس آدمی سے کوئی نیکی برآمد نہیں ہو سکتی جو رات دن اس خیال میں غلطاں رہا کرتا ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں ہے، اگر ایک شخص رات دن یہ سوچتا رہا کہ وہ مصیبت زدہ ہے، پسماندہ ہے، اور بے حقیقت ہے، تو پھر وہ بے حقیقت ہی بن کر رہ جاتا ہے، اور اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ ہاں ہاں میں ہوں میں ہوں تو پھر آپ کا وجود ایک حقیقت کے طور پر قائم ہوگا اور اگر آپ یہ کہیں کہ میرا کوئی وجود نہیں ہے اور آپ دن رات یہی سوچتے رہیں کہ میرا کوئی وجود نہیں ہے، تو پھر بالیقین آپ کا وجود نہیں رہے گا، یہ ایک بڑی حقیقت ہے جسے آپ کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے، ہم سب ایشور کے بچے ہیں، ہم سب اس پرکاش کی کرنیں ہیں جو غیر فانی ہے، اس لئے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہماری کوئی قدر نہ ہو اور ہمارا وجود کوئی وجود نہ ہو، ہم سب کچھ ہیں، سب کچھ کرنے کو تیار ہیں، سب کچھ کر سکتے ہیں اور آدمی کو سب کچھ کرنا ہی چاہیئے، ہمارے آباؤ اجداد میں یہی خود اعتمادی تھی اور ان کی یہ خود اعتمادی وہ طاقت تھی جو انھیں تمدن کے راستہ پر آگے کی طرف بڑھاتی ہی چلی گئی، میرے الفاظ پر غور کیجئے کہ اگر ہم میں گراوٹ آ رہی ہے اگر ہم میں نقائص و عیوب پیدا ہو گئے ہیں تو یہ نقائص اور یہ گراوٹ اسی دن سے پیدا ہوئی ہے جس دن سے ہم نے اپنی خود اعتمادی کی طاقت کو کھو یا ہے، ایک شخص جب اپنی خود اعتمادی کھو دیتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ ایشور پر بھی اُسے کوئی بھروسہ نہیں ہے، کیا آپ اس قدرت کاملہ پر عقیدہ رکھتے ہیں جو آپ کے اندر اور آپ کے ذریعہ سے بروئے کار رہتی ہے، اگر آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ ذات وحدت الوجود ایک ایک ذرّہ کے اندر موجود ہے آپ کے جسم آپ کی عقل اور آپ کی روح کے اندر موجود ہے، تو پھر کس طرح ایک شخص مایوس ہو سکتا ہے اور دل چھوڑ کر بیٹھ سکتا ہے، میں پانی کا ایک بلبلہ ہو سکتا ہوں اور آپ ایک اونچے پہاڑ کی لہر ہو سکتے ہیں، مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میں بھی اسی سرچشمہ حیات ابدی اور قلزم طاقت و روحانیت ازلی کا ایک قطرہ ہوں جس سے آپ بھی ایک تعلق رکھتے ہیں، میں بھی اپنے جنم سے اس غیر فانی حیات کے سمندر میں شامل ہوں اور یہ میری بھی زندگی کی ایک حقیقت ہے کہ میں بھی اس غیر فانی طاقت سے ویسا ہی تعلق رکھتا ہوں جیسا تعلق آپ ایک اونچا پہاڑ ہونے کی حیثیت میں اس سے قائم رکھ سکتے ہیں، لہٰذا میرے بھائیو! یہ سلامتی اور شرافت کا وہ عظیم آدرش ہے جس کا ہی ہمیں

اپنے بچوں کو تعلیم دینی چاہیئے جس لمحہ وہ جنم لیں، آپ کو انھیں "ادویت ازم" Advaitism پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے، "دویت ازم" Dvaitism کی تعلیم دینے کی احتیاج نہیں ہے، آپ انھیں کوئی ازم نہ پڑھائیں لیکن براۓ مہربانی اس مشترک ازم کی انھیں ضرور تعلیم دیجئے، جو سارے ملک میں مشترک ہے اور یہ ازم روحانیت کا وہ شاندار آدرش ہے جو آتما کو کامل بناتا ہے اور جس آدرش میں تمام فرقے بالعموم پختہ عقیدہ رکھتے ہیں، جیسا کہ ہمارے معروف فلسفی کپیلا نے کہا ہے کہ اگر ابتدا ہی میں پاکیزگی ان کا مزاج نہیں بنی تو آگے چل کر کسی کی آتما کبھی پاکیزگی حاصل نہیں کر سکتی، اس لئے کہ فطرت ہی ایک چیز کو کامل بناتی ہے اور جب تک فطرت ہی ایک چیز کو کامل نہ بنائے اس وقت تک اس چیز کا کامل بننا ممکن نہیں ہوتا اگر ایک چیز فطرت کی مدد کے بغیر کامل بن بھی جائے تو بھی اس کا کمال آگے چل کر باقی نہیں رہے گا، اگر نقص کسی آدمی کی فطرت میں شامل ہے تو وہ آدمی ہمیشہ ہی ناقص رہے گا خواہ چند لمحوں کے لئے وہ کامل بن جائے اور اکملیت حاصل کرلے پھر بھی اس کا نقص باقی رہے گا، اور ایک وقت آئے گا کہ اس کا یہ کمال دھل کر رہ جائے گا اور اس کی فطرت کا نقص دوبارہ دکھائی دینے لگے گا لہٰذا ہمارے تمام فلسفیوں کا یہ قول ہے کہ نیکی ہماری فطرت ہے، اکملیت ہماری فطرت ہے، پاکیزگی ہماری فطرت ہے، بدی، نقص، اور نجاست ہماری فطرت میں شامل نہیں ہے، اس عظیم یوگی کی شاندار مثال کو ہمیشہ یاد رکھیے جس نے مرتے وقت زندگی بھر کے تمام شاندار کارناموں اور شاندار خیالات کو اپنے دماغ میں یاد کرنے کی کوشش کی تھی، اس مثال میں آپ محسوس کریں گے کہ اس نے اپنی کمزوریوں اور اپنی حماقتوں کو یاد نہیں کیا تھا، حماقتیں بھی ہوا ہی کرتی ہیں، کمزوریاں بھی ہونی ہی چاہئیں، لیکن اپنی اصل فطرت کو ہمیشہ یاد رکھیئے کہ یہی تمام کمزوریوں کا واحد علاج ہے، تمام حماقتوں کا واحد علاج ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ چند نکات ہیں جو ہندوستان کے مختلف دھارمک فرقوں کے مابین مشترک حیثیت رکھتے ہیں، اور شاید مستقبل میں اس مشترک پلیٹ فارم پر قدیم و جدید، نیز قدامت پسند و آزاد خیال دھارمک لوگ ایک دوسرے سے دوستی کا ہاتھ ملا سکیں گے اس کے علاوہ بھی ایک دوسری چیز ہے جو ہمیں یاد رکھنا چاہیئے اور مجھے افسوس ہے کہ ہم لیا اوقات اس چیز کو بھول جاتے ہیں، یعنی یہ کہ ہندوستان میں دھرم کا مطلب ہے "انوبھوتی" اس مطلب سے کم کوئی چیز نہیں ہے آپ ایک آدرش کو مانیئے اور ایک نظریہ میں عقیدہ رکھیئے تو بس آپ محفوظ ہیں اور سب کچھ ٹھیک ہے، اس آدرش اور نظریہ کی ہمیں کوئی تعلیم نہیں دی جاسکتی اس لئے کہ اس کا بھی تو ایک عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس آدرش اور نظریہ کی تعلیم

صفحہ ۱۰۸

نہیں دی جاسکتی، آپ جو کچھ بنتے ہیں اپنے آپ بنتے ہیں، بھگوان کی کرپا سے یا اپنی محنت سے آپ جو کچھ بن گئے ہیں بس وہی ٹھیک ہے، مگر چند آدرشوں یا چند نظریوں کو بس مان لینا ہی کافی نہیں ہوا کرتا، آپ کے لئے اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے، ہندوستان میں روحانیت کے افق سے جس لفظ کی گرجدار آواز سُنائی دی ہے وہ لفظ ہے "انو بھوتی" اور وہ کتابیں صرف ہماری ہیں جن میں بار بار اعلان کیا گیا ہے کہ "ایشور لائق دید ہے" یہ الفاظ بےحد جرأت مندانہ ہیں مگر اپنی معنویت میں صحیح اور سچے ہیں، دھرم وہ چیز ہے جس کی انو بھوتی ہونی چاہیئے، دھرم کی باتیں صرف سُن لینے ہی سے کام نہیں چلتا یہ وہ علم نہیں ہے جسے سُن سُنا کر طوطے کی طرح رٹ لیا جائے! نہ ہی یہ عقل و خرد کا کوئی خلاصہ ہے، لیکن دھرم کو ہمارے اندر سما جانا چاہیئے، ایشور کے وجود کا بہت بڑا ثبوت صرف یہی نہیں ہے کہ ہماری عقل اس کی موجودگی کا اقرار کرتی ہے بلکہ اس کے وجود کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ آنکھوں سے دیکھا گیا ہے، عہد قدیم میں بھی اور عہد جدید میں بھی! ہم آتما میں عقیدہ رکھتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ ہماری عقل اس کی موجودگی کی دلیل پیش کرتی ہے بلکہ اس بنا پر عقیدہ رکھتے ہیں کہ ماضی میں بھی ہندوستان میں ہزاروں لوگ گزرے ہیں جنھوں نے اپنی آتما کی انو بھوتی کی ہے، حال میں بھی ہزاروں لوگوں کو اپنی آتما کی انو بھوتی ہوئی ہے اور مستقبل میں بھی ہزاروں لوگ اپنی آتما کی "انو بھوتی" کریں گے، اور ایک آدمی اس وقت تک نجات حاصل نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ ایشور کا پرکاش دیکھ نہ لے اور اپنی آتما کی انو بھوتی نہ کرلے، لہٰذا ہمیں سب باتوں سے قطع نظر صرف یہی ایک بات سمجھنے دیجیئے اور جیسے جیسے ہم یہ بات سمجھتے جائیں گے ویسے ویسے ہندوستان سے فرقہ بندیاں ختم ہوتی جائیں گی اس لئے کہ صرف وہی آدمی دھارمک ہوگا جو ایشور اور اپنی آتما کی انو بھوتی رکھتا ہوگا۔ اس کے اندر کی سب گرہیں کھل چکی ہوں گی، اس کے اندر سب وسوسے یقین سے بدل چکے ہوں گے اور اس نے چونکہ قریب سے قریب تر اور بعید سے بعید تر رہنے والی ذات کا پرکاش دیکھ لیا ہوگا لہٰذا وہ اپنے عمل کے انجام سے بے نیاز ہو چکا ہوگا، اسے اپنی خدمت کے کسی پھل کی ضرورت نہیں رہی ہوگی، ہاں یہ بھی سچ ہے کہ ہم بسا اوقات دھرم کی صداقت کے مسئلہ پر بچوں جیسی باتیں کرنے لگتے ہیں، عظیم روحانی انو بھوتی کے میدان میں اپنی عقل کے گھوڑے دوڑانے لگتے ہیں اور اس طرح فرقہ بندیاں معرض وجود میں آتی ہیں اور فرقہ بندیوں کے معرض وجود میں آتے ہی لڑائی جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں، اگر ہم ایکبار یہ حقیقت سمجھ لیں کہ بس یہ انو بھوتی ہی اصل دھرم ہے تو پھر ہم اپنے دلوں کے اندر جھانک کر دیکھنے کے عادی ہو جائیں گے اور یہ سوچنے لگیں گے کہ ہم کو کس حد تک دھرم کے حقائق کی انو بھوتی حاصل ہوتی ہے تب ہم سمجھیں گے کہ ہم خود اندھیرے میں الجھے ہوئے ہیں اور دوسروں کو بھی اسی اندھیرے میں گھسیٹ رہے ہیں، یہ سمجھ آتے ہی ہم میں سے یہ فرقہ بندیاں بھی ختم ہو جائیں گی یہ لڑائی جھگڑے بھی ختم ہو جائیں گے، فرقہ بندی کی

بنیاد پر لڑائی لڑنے والے کسی آدمی سے پوچھیے کہ تم نے کبھی بھگوان کا درشن بھی کیا ہے؟ تم نے کبھی اپنی آتما کو بھی دیکھا ہے، اگر نہیں تو پھر تم کو کیا حق پہونچتا ہے کہ تم ایشور کا نام اچھالتے پھرو تم خود بھی اندھیرے میں چل رہے ہو اور میری بھی اسی اندھیرے کے اندر رہنمائی کر رہے ہو، گویا ایک اندھا دوسرے اندھے کو راستہ دکھا رہا ہے، اس طرح ظاہر ہے کہ دونوں ہی ایک گڑھے میں جا پڑیں گے!

لہٰذا دوسروں کی غلطیاں اور خامیاں ڈھونڈھنے سے پہلے آپ کو خوب غور و خوض کرنا چاہیئے انہیں انوبھوتی کے اپنے راستہ پر چلنے دیجیے، اس لئے کہ وہ بھی اپنے دلوں کے اندر سچائی کی روشنی ڈھونڈھنے کی جد و جہد کر رہے ہیں اور جب بھی وہ صداقت کو اپنی عریاں آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو پھر وہ اس نعمت کو پالیں گے جس کی گواہی ہندوستان میں ایک ایک ذرہ دیتا ہے، ہر وہ شخص دیتا ہے جس نے صداقت کی انوبھوتی کی ہے، پھر اس کے دل سے صرف محبت ہی کے الفاظ برآمد ہوں گے، اس لئے کہ ایشور نے اس دل کو چھو لیا ہوگا اور ایشور کی ذات بجائے خود محبت کا جوہر ہے، اس وقت تمام فرقہ وارانہ جھگڑے ختم ہو جائیں گے، اور ہم یہ سمجھنے کی پوزیشن میں ہوں گے کہ لفظ "ہندو" کا مطلب پریم اور صرف پریم ہے اور ہر وہ شخص جو خود کو ہندو کہتا ہے اس بات کا مستحق ہے کہ اُسے اپنے دل میں بٹھایا جائے اور اُسے اپنے گلے سے لگایا جائے، میرا مطلب سمجھئے کہ آپ اس وقت اور صرف اس وقت ہندو کہلانے کے مستحق ہیں جب آپ کا نام آتے ہی شکتی کی ایک لہر تعاش آفریں لہر دوڑ جائے آپ اس وقت اور بس اسی وقت ہندو کہلانے کے مستحق ہیں جبکہ ہر آدمی آپ کا عزیز قریب بن جائے، چاہے وہ کسی بھی ملک کا رہنے والا ہو اور چاہے وہ کوئی بھی زبان بولنے والا ہو، آپ اس وقت اور بس اسی وقت ہندو کہلانے کے مستحق ہیں جب ایک شخص آپ کے پاس آئے اور آپ سے یہ کہے کہ وہ مصیبت زدہ ہے تو آپ اپنے دل میں اس کے لئے وہی دُکھ اور وہی ہمدردی محسوس کریں جو آپ اپنے کسی مصیبت زدہ بیٹے کے لئے محسوس کر سکتے ہیں، آپ اس وقت اور بس اسی وقت ہندو کہلانے کے مستحق ہیں جب ہر آدمی کے لئے قربانی دینے کو تیار رہیں اور اس راستہ میں اپنے اس عظیم رہنما کی پیروی کریں جس کی مثال میں نے اپنے اس لیکچر کی ابتدا میں آپ کے سامنے پیش کی ہے، یہ آپ کے عظیم رہنما گورو گوبند سنگھ ہیں جو ہر وقت اور ہر شخص کے لئے قربانی دینے کو تیار رہے، اس ملک سے حملہ آوروں کو نکال باہر کرنا، ان کی اجارہ جیت کے خلاف جنگ لڑتے رہنا، ہندو دھرم کی مدافعت کے لئے اپنا خون بہاتے رہنا اور میدانِ جنگ میں اپنے بیٹوں کو خاک و خون میں تڑپتے ہوئے دیکھنا، یہ ہے اس عظیم رہنما کی ناقابل فراموش قربانیوں کی ایک مثال جس کو ان لوگوں نے بھی بعد میں بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا جن کے لئے اس نے اپنا خون بہایا تھا جو اس کے قریب ترین تھے اور اس کے لئے عزیز ترین تھے، وہ جنگ کے میدان سے کنارہ کش ہو کر ایک زخمی شیر کی طرح

جنوبی ہندوستان میں پڑے پڑے ہلاک ہو گیا لیکن اس کی زبان سے اپنے ملک کے ان ناسپاس گزاروں کے خلاف کبھی بھی مذمت یا شکایت کا ایک لفظ نہ نکلا جنھوں نے اسے تن تنہا چھوڑ دیا تھا اور اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا' میری بات سمجھیے! اگر آپ اپنے وطن کا بھلا چاہتے ہیں تو آپ میں سے ہر ایک گورو گوبند سنگھ بننا چاہیئے' آپ اپنے اہلئے وطن میں ہزاروں خامیاں' ہزاروں نقائص اور ہزاروں عیب پا سکتے ہیں لیکن ذرا اس بات پر بھی غور کیجئے کہ ان کی رگوں میں دوڑنے والا خون'' ہندو خون'' ہے' وہ پہلے دیوتا ہیں جن کی آپ کو پرستش کرنی ہے' اگر وہ کوئی ایسا کام کرتے ہیں جن سے آپ کے جذبات زخمی ہوتے ہیں' اگر وہ آپ کے لئے اپنی زبان سے ایسے الفاظ نکالتے ہیں جو دشنام کی تعریف میں آتے ہیں تو بھی ان الفاظ کے بدلہ میں آپ انھیں محبت کے الفاظ سے یاد کیجئے اور انھیں محبت کا پیغام سنائیے! اگر وہ آپ کو نکال باہر کریں' آپ کا ساتھ چھوڑ دیں اور آپ کو گورو گوبند سنگھ جیسے شیر کی طرح تنہائی کی حالت میں مرنے کے لئے مجبور کر دیں تو بھی آپ کے سامنے ایک مثال ہو گی' گورو گوبند سنگھ کی مثال جس پر ہندو جاتی ہمیشہ فخر کرے گی' اس طرح کا آدرش ہمیشہ ہی آپ کے سامنے رہنا چاہیئے' جتنی بھی خلیجیں ہیں ان سب کو پاٹ دیجئے' اپنے گرد و پیش محبت کی ایک لہر دوڑا دیجئے!

ہندوستان کے نشاۃ ثانیہ کی جو باتیں چل رہی ہیں انھیں چلنے دیجئے لیکن مجھے ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جو اپنی زندگی بھر کام کرتا رہا ہے' یا کم سے کم کام کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے' اپنے سامنے یہ بات کہنے کی اجازت دیجئے کہ جب تک آپ میں روحانیت نہیں ہے تب تک ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ ممکن نہیں! صرف ہندوستان ہی کی نشاۃ ثانیہ نہیں بلکہ پوری دنیا کی فلاح و ترقی بھی روحانیت ہی پر منحصر ہے' چنانچہ میں آپ سے بڑی صفائی سے کہنا چاہتا ہوں کہ مغربی تمدن کی بنیادیں بھی دکھائی دے رہی ہیں اس لئے کہ کوئی بھی عمارت چاہے وہ کتنی ہی شاندار کیوں نہ ہو اگر مادیت کی ریتلی بنیاد پر تعمیر کی جائے گی تو ایک دن وہ زمین پر آ رہے گی' بالکل ہی تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گی' دنیا کی تاریخ ہماری گواہ ہے' یکے بعد دیگرے ان گنت قوموں نے مادیت کی بنیاد پر نہ جانے کتنے عظیم الشان تمدنوں کی تعمیر کی اور انسان مادہ پرست بنا چنانچہ مغربی زبان میں یہ کہاوت ہے کہ آدمی اپنا بھوت چھوڑ جاتا ہے اور ہماری زبان میں یہ کہاوت ہے کہ آدمی بس اپنا جسم چھوڑ جاتا ہے' مغرب کا آدمی پہلے خاک کا پیکر ہے اور اس کے بعد آتما کا درجہ آتا ہے' لیکن ہمارے لئے پہلے آتما کا درجہ ہے اور پھر شریر کا درجہ آتا ہے' ان دو باتوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے اس طرح کے جتنے بھی تمدن دنیا میں مادیت کی ریتلی بنیاد پر تعمیر ہوئے ہیں وہ یکے بعد دیگرے فنا

ہوتے رہے ہیں، مٹتے رہے ہیں، برباد ہوتے رہے ہیں، اُن کی عمر بہت مختصر ثابت ہوئی ہے اور وہ صفحۂ ہستی سے ناپید ہو گئے ہیں لیکن ہندوستان کا تمدن اور ان قوموں کے تمدن آج تک باقی ہیں جنھوں نے ہندوستان کی بتائی اور سکھائی ہوئی بنیادوں پر اپنے تمدن کی تعمیر کی ہے جیسے چین اور جاپان کا تمدن جس میں نشاۃ ثانیہ کے آثار بھی اب نظر آ رہے ہیں، ان کی زندگی فونکس Phoenix, کی صورت ہے کہ ہزار بار مٹی لیکن جتنی بار مٹی اتنی ہی بار زیادہ شاندار طریقے سے ابھر آئی، لیکن مادی تمدن ایکبار گرتا ہے تو پھر کبھی نہیں اٹھتا، اس کی عمارت منہدم ہوتے ہی چکنا چور ہو جاتی ہے، بس ذرا صبر کے ساتھ انتظار کیجیے، مستقبل کے نتائج ہماری نگاہوں سے مخفی نہیں ہیں۔

نہ عجلت کیجیے، نہ کسی شخص کی نقل اتاریئے، یہ دوسرا درس ہے جو ہمیں یاد رکھنا چاہیئے، نقالی تمدن نہیں ہوا کرتی، میں اگر ایک راجہ کا لباس پہن لوں تو کیا وہ لباس مجھے راجہ بنا دے گا؟ شیر کی کھال اوڑھ کر کوئی گدھا شیر نہیں بن جاتا۔ نقالی اور بزدلانہ نقالی سے کوئی ترقی نہیں کیا کرتا، بلکہ یہ ایک طرح کے تنزل کی نشانی ہوا کرتی ہے، جب ایک شخص اپنی ہی ذات سے نفرت کرنا شروع کر دیتا ہے تو یہ مقام اس کے تنزل کی آخری حد ہوتی ہے اور اس کے بعد وہ فنا ہو جایا کرتا ہے، ایک شخص کو جب اپنے آباد اجداد کے نام پر شرم آنے لگتی ہے تو یہ اس کی ہلاکت آفریں پستی کی آخری حد ہوتی ہے، میں ہندو ہوں اور مجھے فخر ہے کہ میں ہندو ہوں، مجھے اپنے آباد اجداد کے نام پر کوئی ندامت نہیں ہوتی بلکہ فخر ہوا کرتا ہے، کسی کی نقل نہ اتاریئے، برائے مہربانی کسی کی نقالی نہ فرمائیے! جب کسی کے ہاتھ کے تلے آپ دب جاتے ہیں تو اپنی انفرادیت اور اپنی آزادی کھو دیتے ہیں، کوئی بھی کام چاہے وہ روحانی کام ہو اگر آپ دوسروں کے زیر ہدایت انجام دیتے ہیں تو اپنی بصیرت، قوت فکر اور قوت فیصلہ کو کھو دیتے ہیں اور اپنی انفرادیت سے محروم ہو جاتے ہیں، آپ جو کرنا چاہتے ہیں اپنی عقل سے کیجیے، اپنی محنت سے کیجیے، دوسروں کی نقالی نہ کیجیے، لیکن دوسروں میں جو اچھائیاں ہیں اُن اچھائیوں کو ضرور اختیار کر لیجیے، دوسروں سے ہم بہت کچھ سیکھا ہی کرتے ہیں، آپ زمین میں ایک بیج ڈالتے ہیں تو بیج پہ من بھر مٹی ڈال دیتے ہیں، ہوا اور پانی سے وہ اپنی غذا حاصل کرتا ہے، پھر یہ بیج پھوٹتا ہے، پودا نکلتا ہے اور پھر ایک تناور درخت بنتا ہے، لیکن یہ درخت نہ مٹی بنتا ہے نہ ہوا بنتا ہے نہ پانی ہوا کرتا ہے، یہ بیج اپنے فطری عمل سے تناور درخت بنتا ہے، دوسرے اسے جو کچھ دیتے ہیں ان چیزوں کو وہ اپنے اندر جذب کر لیتا ہے لیکن ان چیزوں کو اپنے اندر جذب کرنے کی بنا پر وہ اپنی فطرت نہیں بدل دیتا، یہی پوزیشن آپ کی بھی ہونی چاہیئے، ہم دوسروں سے بہت سی اچھی چیزیں سیکھتے ہیں اور جو لوگ کوئی چیز نہیں سیکھتے وہ فطرتاً مردہ ہوا کرتے ہیں، ہمارے منو نے ہمیں یہی تعلیم دی ہے کہ:-

आददीत परां विद्यां प्रयत्नादवरादपि । अन्त्यादपि परं धर्मं स्त्रीरत्नं दुष्कुलादपि-

صفحہ ۱۱۲
غبار خاطر

"ایک عورت کا زیور چاہے وہ نیچ ہی کیوں نہ ہو اپنی پتنی کے لئے لیجیئے! ایک کمتر آدمی کی چاہے وہ چنڈال ہی کیوں نہ ہو خدمت کر کے اعلیٰ علم حاصل کیجئے اور خدمت کے ذریعہ عظمت و نجات پائیے" ہر چیز جو اچھی ہو دوسروں سے سیکھ لیجئے! لیکن اسے اپنے ڈھنگ سے اختیار کیجئے اور اپنے اندر جذب کر لیجئے، دوسروں کی نقالی نہ لیجئے، ہندوستانی طرز زندگی سے نہ ڈول جائیے، ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے ذہن میں یہ خیال نہ آنے دیجئے کہ دوسروں کی طرح کھانا، دوسروں کی طرح پہنیا، اور دوسروں کی طرح رہنا سہنا ہندوستان کے حق میں بہتر ہوگا، آپ جانتے ہیں کہ چند برسوں کی پرانی عادت کو چھوڑنے میں کتنی دشواری ہوا کرتی ہے، ایشور ہی جانتا ہے کہ کتنے ہزار برس سے ہم اپنی قومی زندگی کے ایک خاص راستہ پر چل رہے ہیں، ہزاروں برس سے جو لہر پھیلتے پھیلتے ایک سمندر بن چکی ہے وہ کیا پھر ہمالیہ پہاڑ کی برف پوش چوٹیوں کی جانب اچانک پلٹ سکتی ہے؟ یہ ممکن نہیں ہے! اس طرح کی کوئی کوشش ہوگی تو اس کا نتیجہ ہزیمت و شکست ہی کی صورت میں نکلے گا۔ لہٰذا قومی دھارے کے بہاؤ کے لئے راستہ چھوڑ دیجئے، اس کا راستہ مت روکئے، ورنہ وہ اپنے کناروں کو اپنی طاقت سے توڑ کر ابل پڑے گا، اس دھارے کے بہاؤ کی راہ روکنے کے لئے جو رکاوٹیں کھڑی کی گئی ہیں ان کو راستے سے ہٹا لیجئے، جب آپ اس دریا کے بہاؤ کا راستہ صاف رکھیں گے تو قوم کا کیریکٹر تعمیر ہوتا جائے گا اور قوم ترقی کرتی چلی جائے گی،

ہندوستان میں روحانی کام کرنے کے لئے یہ چند تجویزیں ہیں جنھیں میں عاجزی کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں کچھ اور اہم مسئلے بھی ہیں جنھیں میں وقت کی کمی کی وجہ سے آج رات آپ کے سامنے پیش نہیں کر رہا ہوں، مثال کے طور پر جات پات کا سوال ہے، جو بہت ہی دلچسپ ہے، میں اپنی زندگی بھر اس مسئلہ کے داخلی و خارجی پہلوؤں کا مطالعہ کرتا رہا ہوں، میں نے ہندوستان کے ہر صوبہ میں اس مسئلہ کا مشاہدہ کیا ہے، میں ملک کے ہر حصہ میں قریب قریب ہر جاتی کے لوگوں سے ملتا رہا ہوں اور اس کی اہمیت و خصوصیت محسوس کر کے میں خود اپنے ذہن میں بہت زیادہ متحیر ہوتا ہوں، بہت دنوں تک میرے سامنے کوئی روشنی نہ آسکی لیکن کچھ دنوں سے میں اس کی اہمیت و خصوصیت کو سمجھنے لگا ہوں، اس کے علاوہ دوسرا بڑا مسئلہ ہے جو کھانے پینے سے تعلق رکھتا ہے، بے شک یہ مسئلہ بھی کافی اہم ہے اور کافی بڑا سوال ہے، ہم اسے بیکار سی بات سمجھا کرتے ہیں لیکن یہ بیکار سوال نہیں ہے، میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ ہم کھانے پینے کے بارہ میں جتنی زیادہ ضد اور جتنی زیادہ احتیاط کرتے ہیں وہ ہمارے شاستروں کی منشا کے خلاف ہے، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم کھانے پینے میں آمیزش کا مناسب لحاظ نہیں رکھا کرتے، در اصل ہماری صحیح اسپرٹ ضائع ہو گئی ہے؟

مزید مسئلے بھی ہیں جو میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں اور یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ مسئلے کس طرح حل کئے جا سکتے ہیں، لیکن بدقسمتی سے یہ میٹنگ بہت دیر بعد اپنے ٹھیک ڈھنگ پر آئی اور میں نہیں چاہتا کہ آپ کو مزید تاخیر کی زحمت دی جائے، لہٰذا میں کسی دوسری صحبت میں جات پات اور دیگر مسئلوں پر اظہار خیال کروں گا،

اب میں چند الفاظ اور کہہ کر اپنے اس لیکچر کو ختم کرنا چاہتا ہوں، ہندوستان میں ایک مدت سے دھرم پر جمود طاری ہے، ہم جو کچھ چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ دھرم میں عمل کی تحریک پیدا کی جائے، میں دھرم کو ہر آدمی کی زندگی میں داخل کرنا چاہتا ہوں، جس کی طرح دھرم کو شاہوں کے محلوں کے اندر بھی داخل ہونا چاہیئے اور غریب ترین لوگوں کے گھروں میں بھی داخل ہونا چاہیئے، دھرم جو مشترک ورثہ ہے، جو ساری دنیا میں ہر نسل کا پیدائشی حق ہے، غریب سے غریب آدمی کے گھر تک آزادی کے ساتھ پہنچنا چاہیئے، ہندوستان میں دھرم کو اس آسانی کے ساتھ ہر آدمی تک پہونچنا چاہیئے جس آسانی کے ساتھ ایشور کی بنائی ہوئی یہ ہوا پہونچتی ہے اور یہ وہ طریق کار ہے جو ہم ہندوستان میں اختیار کرنا چاہتے ہیں، لیکن اس طریق کار کو اختیار کرتے ہوئے اختلافات پر جھگڑنا نہیں چاہیئے، جن باتوں پر ہمیں اتفاق ہے اور ہم سب جن باتوں پر متفق ہو سکتے ہیں صرف انہی باتوں کی تبلیغ ہونی چاہیئے، اور اختلافات کو چھوڑ دینا چاہیئے کہ ان کا علاج اپنے آپ ہو جائے گا، جیسا کہ میں ہندوستانی عوام سے بار بار کہتا رہا ہوں کہ ایک کمرہ میں اگر صدیوں کا چھایا ہوا اندھیرا ہو اور ہم اس کے اندر جا کر یہ چلّانا شروع کر دیں کہ یہاں بڑا اندھیرا ہے، بڑا اندھیرا ہے تو کیا ہمارے اس طرح چیخنے چلّانے سے یہ اندھیرا بھاگ جائے گا؟ روشنی لائیے تب ہی اندھیرا جائے گا!! انسانوں کی اصلاح کا بھی یہی ایک رمز ہے، انھیں اونچی باتیں بتائیے۔ پہلے آدمی پر اعتماد رکھیئے، اس میں اعتقاد پیدا کیجئے، بات اس یقین کی حد سے کیوں شروع کی جائے کہ آدمی میں گراوٹ آگئی ہے اور وہ پستی میں گر چکا ہے، آدمی میں مجھے جو اعتقاد ہے اس اعتقاد میں مجھے کبھی ناکامی نہیں ہوئی ہے، بدترین سے بدترین آدمی کے معاملہ میں بھی میرے اعتقاد کو کبھی کوئی ٹھیس نہیں لگی ہے، جہاں کہیں بھی میں نے آدمی میں اعتماد رکھا میں نے محسوس کیا کہ اس اعتماد کے اثرات چاہے پہلے پہلے بہت روشن نہ آئے ہوں لیکن آگے چل کر اس کا نتیجہ بہت ہی شاندار اور حوصلہ افزا ہوا کرتا ہے، آدمی میں اعتماد رکھیئے، چاہے وہ تعلیم یافتہ ہو، چاہے جاہل اور بے خبر ہو، آدمی میں اعتماد رکھیئے، چاہے وہ صورت سے فرشتہ دکھائی دیتا ہو چاہے شیطان کی سیرت رکھتا ہو، پہلے آدمی میں اعتماد رکھیئے اور یہ اعتماد رکھ کر سوچیئے کہ اگر اس میں خامیاں ہیں، اگر وہ

غلطیاں کرتا ہے، اگر وہ اپنے برتاؤ میں خراب ہے تو ان تمام باتوں کا سرچشمہ اس کی اصل فطرت نہیں ہے بلکہ یہ باتیں اس بنا پر اس میں پیدا ہو گئی ہیں کہ اس میں اعلیٰ آدرش کی کمی ہے، اگر ایک آدمی جھوٹ کے راستہ پر جاتا ہے تو صرف اس لئے کہ وہ سچائی کا راستہ پا نہیں سکا! اس لئے جھوٹ کی اصلاح کا واحد طریقہ یہ ہے کہ وہ چیز پیش کر دی جائے جو سچ ہے، اسے سچ اور جھوٹ کا موازنہ کرنے کا موقع دیجئے! آپ کا کام صرف اتنا ہے کہ آپ اسے سچ بتا دیں، باقی کام وہ خود کرے گا، اُسے اپنے ذہن میں اس بات کا مقابلہ کرنے کا موقع دیجئے کہ خود اس کے اندر کیا چیز موجود ہے، اگر آپ اُسے سچ کی آگہی دیں گے تو جھوٹ خود بخود غائب ہو جائے گا، جب روشنی آئے گی....

تو اندھیرا کس طرح باقی رہ سکے گا! اگر آپ ملک کی روحانی اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو اس کا یہی سیدھا سا ایک طریقہ ہے، اس کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ لڑائی جھگڑا کیا جائے اور لوگوں سے یہ بات کہی جائے کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ خراب باتیں ہیں، ان کے سامنے اچھائی کو رکھ دیجئے اور دیکھئے کہ وہ کتنے اشتیاق سے سچائی کو اختیار کر لیتے ہیں، دیکھئے تو کہ جو سچائی ہے وہ کبھی فنا نہیں ہوتی، اور انسان میں ہمیشہ زندہ رہتی ہے وہ ان تمام چیزوں کی طرف شوق سے ہاتھ بڑھاتا ہے جو سچائی سے تعلق رکھتی ہیں، عظمت و شان سے تعلق رکھتی ہیں، وہ ہمیں نیکی کی توفیق دے جو اس کائنات کا خالق ہے، مالک و مختار ہے، حافظ و نگہبان ہے وہ ہمیں نیکی اور بھلائی کی توفیق دے جس نے ہمارے آباد اجداد کو پیدا کیا ہے اور جو ہماری نسل کا محافظ ہے، اس کو چاہے وشنو کے نام سے پکاریئے، چاہے شیو کے نام سے پکاریئے، چاہے شکتی یا گنپتی کے نام سے یاد کیجئے، چاہے اس کی پوجا سرگُن کی حیثیت سے کیجئے، چاہے نرگُن کی حیثیت میں کیجئے، چاہے اسے مجسّم مانیئے، چاہے غیر مجسّم مانیئے، وہ ہمیں نیکی اور بھلائی کی توفیق دے، جس کی ذات کا ہمارے آبا و اجداد کو عرفان حاصل تھا، اور جو اسے ان الفاظ میں خطاب کرتے تھے۔

एकं सद्विप्रा बहुधा वदन्ति—

وہ جو موجود ہے ایک ہے، وہ ہمیں نیکی اور بھلائی کی توفیق دے جسے یوگی اور درویش مختلف ناموں سے پکارتے ہیں، اور جو ہمارے اندر اپنی تمام رحمتوں اور نعمتوں کے ساتھ موجود ہے، وہ ہمیں توفیق دے کہ ہم دوسروں کی محبت کے ساتھ خدمت کریں، سچائی سے بے پناہ پیار رکھیں اور ہم میں اپنی ذاتی شہرت کا کوئی جذبہ پیدا نہ ہو، وہ ہمیں توفیق دے کہ ہم اپنے ذاتی فائدے اور ذاتی وقار کی سطح سے بلند ہو کر ہندوستان کی روحانی نشاۃ ثانیہ کے اس عظیم کام میں خود کو شریک کر سکیں!

---

# حضرت یسوع مسیح

سمندر[1] میں ایک لہر اٹھتی ہے اور پھر سمندر ہی میں کھو جاتی ہے، پھر ایک اور لہر اٹھتی ہے، شاید پہلی سے بھی بڑی لہر، لیکن وہ بھی گر پڑتی ہے، اور گرتی ہے تو پھر اٹھنے ہی کے لئے گرتی ہے۔ اور یہ لہریں آگے کی طرف بڑھتی ہی جاتی ہیں، واقعات کی رفتار میں بھی ہمیں اسی طرح کا اتار چڑھاؤ دکھائی دیتا ہے، اور ہم بالعموم عروج کے لئے اٹھتے ہیں اور زوال کو بھلا دیتے ہیں، لیکن عروج و زوال ہیں دونوں ضروری! اتار چڑھاؤ اپنی اپنی جگہ مساوی حیثیت اور مساوی اہمیت حاصل ہے، یہ عروج و زوال اس کائنات کا ایک مزاج ہے، ایک فطرت ہے چاہے ہمارے خیالات کی دنیا ہو، چاہے سوسائٹی میں ہمارے روابط و تعلقات کی دنیا ہو یا روحانیت سے تعلق رکھنے والے امور و مسائل کی دنیا ہو، لیکن عروج و زوال کا یہ عمل یکساں طور پر جاری ہے، کبھی اتار آتا ہے تو کبھی چڑھاؤ! کبھی ایک چیز اٹھتی ہے تو کبھی گرتی ہے، چنانچہ واقعات کی رفتار میں مرنجاں مرنج آدرش آگے بڑھتے ہیں اور جیسا کہ ہوا کرتا ہے وہ ماضی کی کشتی کو ڈبو دیتے ہیں اور اپنا مقام متعین و محفوظ کرتے ہوئے طاقت اکٹھا کرتے ہیں تاکہ ایکبار پھر عروج حاصل کریں اور ایکبار پھر اونچا اٹھیں،

قوموں کی تاریخ میں بھی ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا ہے، وہ عظیم آتما، وہ پیغمبر، جس کے سوانح اور تعلیمات کا ہمیں پھر آج تیسرے پہر مطالعہ کرنا ہے، اپنی نسل کی تاریخ کے اس عہد میں آیا تھا جس عہد کو زوال کا نام دیا جا سکتا ہے، گراوٹ کے دور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، ہمارے پاس اس کی تعلیمات اور اس کی سوانح سے متعلق جو ریکارڈ ہے وہ اتنا مختصر اور اتنا منتشر ہے کہ ہم اس کے کارناموں کی بہت ہی تھوڑی سی جھلک

---

[1] لاس اینجلز کیلیفورنیا میں ایک تقریر ۱۹۰۰ ۔

دیکھ سکتے ہیں' لہٰذا یہ بات بڑی آسانی سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر اس عظیم رہنما کے کارناموں' اس کے اقوال اور اس کی زندگی کے واقعات کو لکھا جائے تو ساری دنیا اس دفتر سے لبریز ہو جاتی' اس کے اقتدار کے تین برس گویا اس کی عمر کا خلاصہ اور تتمہ ہیں لیکن اس خلاصہ کی موشگافیاں کرنے میں انیس سو برس کی مدت لگ چکی ہے اور کون جانتا ہے کہ ابھی اور کتنی مدت لگے گی' میں اور آپ جیسے چھوٹے لوگ تو بس بچی کھچی شکستی کے حقیر ذرات کی حیثیت رکھتے ہیں' چند منٹوں' چند گھنٹوں' یا زیادہ سے زیادہ چند برسوں میں شکستی کے یہ حقیر ذرے بھی ہمارے اندر سے خارج ہو جاتے ہیں اور پھر ہم فنا کی گود میں جا پڑتے ہیں' لیکن ذرا اس قوی ہیکر انسان کو دیکھئے جو صدیوں پہلے آیا تھا لیکن اپنے پیچھے وہ اس دُنیا میں جو شکستی چھوڑ گیا ہے وہ ابھی تک اپنی پوری مقدار میں صرف بھی نہیں ہو سکی ہے' وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں اور اضافہ ہو رہا ہے کمی نہیں ہو رہی ہے'

آپ یسوع مسیح کی زندگی میں جو کچھ دیکھتے ہیں وہ پورے ماضی کی زندگی ہے' ایک طرح سے ہر آدمی کی زندگی' ماضی کی زندگی ہوا کرتی ہے اسے یہ زندگی وراثت کے ذریعہ ملتی ہے' گرد و پیش کے ذریعہ ملتی ہے' تعلیم کے ذریعہ ملتی ہے اور خود اس کے اپنے وجدان کے ذریعہ ملتی ہے' ایک طرح سے پوری دنیا کا ماضی ہر آدمی کی روح پر چھایا رہتا ہے' غیر محدود ماضی کے ایک تاثر اور ایک نتیجہ کے سوا ہماری حقیقت کیا ہے' زمانہ حال میں ہماری حقیقت کیا ہے' زمانہ کے ازلی دھارے میں اٹھتی ہوئی ان موجوں کے سوا ہم کیا حیثیت رکھتے ہیں جو کبھی آگے بڑھ جاتی ہیں کبھی پیچھے ہٹ آتی ہیں اور جنھیں کبھی چین میسر نہیں آتا لیکن میں اور آپ بہت حقیر چیز ہیں' تب ہی ہم وقت کے دھارے میں محض ایک حباب کی حیثیت رکھتے ہیں' وقت کے سمندر میں ہمیشہ بڑی بڑی امواج طوفان خیز اٹھتی ہیں' مجھے اور آپ کو تو ماضی کی زندگی کا تھوڑا ہی تھوڑا سا حصہ میسّر آیا ہے لیکن بعض قومی پیکر پورے ماضی کی زندگی کو اپنے اندر سما لیتے ہیں اور مستقبل کے ستاروں کو فلک سے توڑنے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہیں یہ وہ نشانیاں ہیں جو یہاں وہاں لگا دی گئی ہیں تاکہ انسانیت کا کارواں انھیں دیکھتا ہوا اپنے راستہ پر آگے بڑھتا ہی چلا جائے ان میں سے بعض پیکر اتنے قوی ہوتے ہیں کہ وہ دنیا کی پوری زمین کو اپنے سایہ سے ڈھانپ لیتے ہیں وہ جاودانی ہوا کرتے ہیں اور کبھی فنا نہیں ہوتے ! جیسا کہ اس پیغمبر کا قول ہے کہ "کسی انسان نے کسی بھی زمانے میں خدا کو نہیں دیکھا لیکن وہ دیکھا گیا ہے تو اپنے بیٹے کے ذریعہ !" اور یہ سچ ہی ہے ؟ اگر خدا کو دیکھا جائے گا تو سوا اس کے بیٹے کے اور کہاں دیکھا جائے گا؟ یہ حقیقت ہے کہ میں اور آپ' ہم میں سے غریب ترین اور پست ترین تک میں خدا کا جلوہ ہے اور یہاں تک کہ خدا کا جلوہ اس سے دکھائی بھی دیتا ہے '

روشنی کی لہریں تو ہر جگہ موجود ہیں ـــــــ وحدت الوجود ـــــــ لیکن ہم کو اس لیمپ کی روشنی حاصل کرنے سے پہلے اسے روشنی دینی پڑتی ہے، انبیاء اور اوتار جن میں خدا کی جلوہ آرائی ہوا کرتی ہے وہ عظیم چراغ ہوا کرتے ہیں جن کی روشنی جب تک ذہن پر نہیں آتی اس وقت تک کائنات کو خدا کا دیدار میسّر نہیں آتا،

ہم سب جانتے ہیں کہ خدا موجود ہے، لیکن اس کے باوجود ہم اُسے دیکھ نہیں سکتے، اُسے پہچان نہیں سکتے ان عظیم پیغمبروں میں سے کسی ایک کو لے لیجئے، اس کے کیریکٹر کو ان صفات سے ملا کر دیکھئے جو آپ نے خدا کے لئے مقرر کر رکھی ہیں، آپ دیکھیں گے کہ آپ کے آدرش کی کسوٹی پر آپ کا خدا پورا نہیں اترتا اور آپ کے پیغمبر کا کیریکٹر آپ کے آدرش سے بھی آگے ہی نکل جاتا ہے، بات یہ ہے کہ آپ ان صفات کے ماسوا جن کی عملی طور پر آپ کے انوبھوتی ہوئی ہے، خدا کی دوسری صفات متعین ہی نہیں کر سکتے نہ ان مثالوں سے آگے نکل سکتے ہیں جو آپ کے پیش نگاہ موجود ہوتی ہیں اس لئے کیا معبود کی حیثیت میں ان کی پرستش کرنا غلط ہے؟ کیا ان اوتاروں کو سجدہ کرنا اور یہ سمجھ کر ان کی پرستش کرنا گناہ ہے کہ اس دنیا میں بس وہی صفاتِ الٰہیہ کے حامل ہیں اگر حقیقتاً وہ خدا کے متعلق ہمارے تمام تصورات سے بالاتر صفات کے حامل ہوں تو پھر ان کی پرستش کرنے میں نقصان کیا ہے، ہرج کیا ہے؟ نہ صرف یہ کہ اس میں کوئی ہرج نہیں ہے بلکہ پرستش کرنے کا یہی ممکنہ اور مثبت طریقہ ہے، آپ جتنی چاہیں کوشش کر دیکھیں لیکن جب تک آپ انسان ہیں اور انسانوں کی دنیا میں رہتے ہیں اس وقت تک آپ کا دھرم بھی انسانی ہی ہے اور آپ کا خدا بھی انسانی ہی ہے، اور ایسا ہی ہونا چاہیئے، کوئی شخص عملی طور پر ایسا کر سکتا ہے کہ ایک تصوراتی چیز کو اختیار کرنے کی غرض سے جسے وہ سمجھنے سے بھی قاصر ہے اس چیز کو ترک کر دے جو حقیقت میں موجود ہو، یہ بہت ہی مشکل بات ہے جب تک کوئی قطعی اور واضح طریق کار اختیار نہ کیا جائے اس وقت تک ایسا ہونا بہت دشوار ہوتا ہے کہ آدمی موجود و زندہ چیزوں کو چھوڑ کر اُن چیزوں کی طرف مائل ہو جائے جو محض تصوراتی وجود رکھتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ تمام ملکوں میں اور تمام زمانوں میں اوتاروں کی پرستش کی جاتی رہی ہے،

اب ہم یہودیوں کے اوتار حضرت یسوع مسیح کی زندگی کا تھوڑا سا مطالعہ کر رہے ہیں، جب حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے تھے تو اس وقت یہودی اس حالت میں تھے جسے میں دو لہروں کے درمیانی وقفہ کی حالت سے تعبیر کر سکتا ہوں، ایک لہر اس حالت سے تعلق رکھتی تھی جسے کٹر پن اور قدامت پسندی سے تعبیر کرنا چاہیئے، دوسری لہر انسان کے اس تھکے ہوئے دماغ کی حالت سے تعلق رکھتی تھی جو آگے بڑھنے کے لئے پیش قدمی کرنے کی بجائے بس ان چیزوں پر قناعت کر کے بیٹھ جاتا ہے جو اس کے پاس پہلے ہی سے موجود ہوتی ہیں، وہ اپنے اثاثہ کی دیکھ بھال کرتا ہے اور کسی دوسری طرف کوئی توجہ نہیں کرتا، یہ جمود کی حالت ہوتی ہے، اس میں قنوطیت

ہوتی ہے وہ بجائے عمل کے ایک طرح کے ادبار کی حالت ہوتی ہے" آپ غور کریں! میں کسی کو کوئی آدرش نہیں دے رہا ہوں، اس صورت واقعہ کی بنا پر کوئی الزام عائد نہیں کر رہا ہوں، ہم اس پر نکتہ چینی کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے ـــــ اس لئے کہ اگر یہ زوال نہ ہوا ہوتا تو وہ عروج ناممکن ہوتا جو حضرت یسوع مسیح کی وجہ سے ممکن ہوا، مجوسی اور پارسی غیر مخلص ہو سکتے ہیں، وہ ایسے اقدام کر سکتے ہیں جو انہیں نہ کرنا چاہئیں، وہ اپنے جنون میں اندھے اور پاگل ہو سکتے ہیں مگر وہ کچھ بھی رہے ہوں حضرت عیسیٰ کے مصائب کا اصل سبب یہی حقائق ہیں جن کی جانب میں نے اشارہ کیا ہے، ایک طرف پارسی و مجوسی حرکت و عمل کی بے پناہ قوت رکھتے تھے جبکہ دوسری طرف حضرت عیسیٰ کی طاقتور عقل اپنا عمل دکھا رہی تھی،

نظریات و خیالات کی صورت گری، مذہب کے روزمرہ کے معمولات، اوراد و وظائف اور اعمال بسا اوقات، تمسخر کی وجہ بن جاتے ہیں، اور ان کا مذاق اڑایا جانے لگتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کے اندر ایک شکتی ہوا کرتی ہے، بسا اوقات ہم آگے کی طرف چھلانگ لگاتے ہوئے اپنی شکتی کی بڑی مقدار ضائع کر دیتے ہیں، مزید برآں یہ واقعہ بھی ہے کہ ایک آزاد خیال آدمی کی بہ نسبت ایک کٹر اور متعصب آدمی میں زیادہ طاقت ہوتی ہے؛ اسے ایک کٹر اور متعصب آدمی کا بڑا وصف اور بڑا جوہر سمجھنا چاہیئے کہ وہ اپنی شکتی کی بہت بڑی مقدار کو محفوظ رکھتا ہے، اور اس میں شکتی کا یہ ذخیرہ موجود رہتا ہے جیسا کہ افراد کے ساتھ ہوتا ہے ایسا ہی قوموں کے ساتھ بھی ہوا کرتا ہے، یعنی یہ کہ شکتی کو بٹور کر اس کا ذخیرہ کر لیا جائے، بیرونی دشمنوں نے جو چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے اس شکتی کو ایک حلقہ کے اندر بند کر دیا تھا، رومیوں نے اسے چاروں طرف سے دبا کر ایک مرکز پر جمع کر دیا تھا، عقل و فراست کی دنیا کے ہیلنی رجحانات نے اسے اپنے زور سے دبا یا تھا، ایران، ہندوستان اور اسکندریہ سے اٹھنے والی لہروں نے اُسے جسمانی، ذہنی اور اخلاقی طور پر دبا دیا تھا ـــــ اور اس دباؤ کو ایک نسل انگیز کرنے کو کھڑی ہوئی تھی جس نے اپنی وراثت میں بے پناہ شکتی پائی تھی اور یہ وہ نسل تھی جس کی اولاد میں آج بھی یہ شکتی موجود ہے اور ختم نہیں ہوئی ہے، چنانچہ یہ نسل مجبور ہو گئی کہ وہ اپنی تمام شکتیوں کو بیت المقدس یعنی کعبہ دل کے ایک مرکز پر لا کر جمع کر دے، لیکن طاقت جب جمع کی جاتی ہے تو اس کا مجموعہ یا شیرازہ بندھا نہیں رہتا، اس مجموعہ میں سے شکتی صرف بھی ہوتی ہے اور وہ وسعت پذیر بھی ہوا کرتا ہے، دنیا کی کسی بھی طاقت کو ایک چھوٹی سی تنگ جگہ میں تادیر بند کر کے نہیں رکھا جا سکتا، اس کے پھیلاؤ اور وسعت پذیری کو روکنے کے لئے تادیر مٹھی کی طرح بند کر کے رکھا جائے، ایسا نہیں ہوتا، ایسا نہیں ہو سکتا!

یہودی نسل میں شکتی کا جو ذخیرہ دبا ہوا تھا اسے دوسرے وقت مسیحیت کے عروج میں اپنے اظہار اور پھیلاؤ کا موقع ملا، شکتی کے دھارے مل جل کر ایک دھارا بن گئے، اور اس دھارے میں دوسرے

چھوٹے چھوٹے دھارے بھی آہستہ آہستہ ملتے گئے اور کشتی کا ایک منڈتا ہوا دریا بہہ نکلا جس کی سطح پر ہمیں یسوع مسیح کے عمل و کردار کا ابھرا ہوا نقش دکھائی دیتا ہے پس ہر پیغمبر اپنے عہد کی ایک تخلیق ہوا کرتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنی نسل کے ماضی کی تخلیق ہوا کرتا ہے اور وہ خود مستقبل کا خالق ہوتا ہے، ماضی کا تاثر سبب ہے حال کا اور موجب ہے مستقبل کا، ایک پیغمبر اس حیثیت میں کھڑا ہوتا ہے، اس میں اپنی نسل کی تمام اچھائیاں تمام اوصاف اور تمام عظمتیں سمٹ کر مجسم ہو جاتی ہیں، اور صدیوں سے اس کی نسل جس مقصد حیات کو حاصل کرنے کی جدوجہد کرتی ہوتی ہے اس کا مفہوم اس کی اپنی زندگی بن جاتی ہے اور وہ نہ صرف اپنی قوم بلکہ دُنیا کی دوسری بے شمار قوموں کے مستقبل کا بھی ایک محرک بن جاتا ہے،

آپ کو ایک اور بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیئے اور وہ یہ کہ میں نے اس عظیم پیغمبر کو جس نظر سے دیکھا ہے وہ مشرق کی نظر ہے، بہت دفعہ آپ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ یہ عظیم پیغمبر ایک مشرقی تھا آپ کی طرف سے اس کی تصویروں میں نیلی آنکھیں اور سنہرے بال پینٹ کرنے کی تمام کوششوں کے باوجود یہ عظیم پیغمبر مشرقی تھا اور مشرقی رہے گا، اس کا تبسم، اس کے خیالات، اس کی انجیل، اور اس کی زندگی میں نظر آنے والے تمام مناظر اور مقامات، خود اس کا برتاؤ، اس کے ساتھی، بھوک اور مفلسی کی نشانیاں اور آثار زبان حال سے مشرق کا تذکرہ کرتے ہیں، مشرق کا نیلا آسمان، بے پناہ گرمی، آگ برساتا ہوا سورج، زبردست ریگستان، پیاسے انسان اور پیاسے جانور، کنویں پانی بھرنے کے لئے، مردوں اور عورتوں کی قطاریں، اُن کے سروں پر رکھے ہوئے خالی ظروف، مویشیوں کے گلے، کسان، کھیت، پن چکیاں اور چکیاں، یہ سب چیزیں جو اس عظیم پیغمبر کی زندگی میں جابجا دکھائی دیتی ہیں، آپ کو مشرق سے روشناس کراتی ہیں، یہ وہ سب چیزیں ہیں جو آج بھی ایشیا میں دیکھنے کے لائق ہیں اور عام طور پر دکھائی دیتی ہیں،

ایشیا کی آواز، ہمیشہ ہی دھرم کی آواز ثابت ہوئی ہے اور یورپ کی آواز ہے سیاست کی آواز، اس میں سے ہر ایک آواز اپنی گونج کے لئے وسیع تر فضا رکھتی ہے، یورپ کی آواز قدیم یونان کی آواز ہے، یونان بس اپنی ہی سوسائٹی کو سوسائٹی سمجھتا تھا اور ماسوا اس کے جو سوسائٹی تھی اُسے وہ بربریت قرار دیتا تھا، متمدن نہیں سمجھتا تھا، سوا یونان کے کسی کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں تھا، یونانیوں کا ہر عمل درست، ہر قول صحیح، وہ جو کچھ کریں، وہ سب ٹھیک ورنہ دنیا کی ہر بات غلط، ہر چیز غلط، اور اس قابل کہ اُسے فنا کر دیا جائے پوری دُنیا بس یونانیت

ہی کے لئے رہنے اور بسنے کا ایک ٹھکانہ تھی، وہ خیال و تصور سے بہت دور رہتے تھے، انھیں خوابوں کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں تھا، ان کی شاعری تک عملی تھی خیالی نہیں تھی، ان کے دیوی دیوتا نہ صرف یہ کہ ذی حیات تھے، بلکہ قطعی طور پر بشر تھے، اور وہ بھی ہو بہو وہی جذبات رکھتے تھے جو ہمارے اور آپ کے ہیں، ہر خوبصورت چیز سے یونان عشق کرتا ہے، مگر یہ بات یاد رکھئیے کہ جس حسن سے یونان پیار کرتا ہے وہ ظاہری حسن ہے، مثلاً کوہساروں کی برفپوش چوٹیوں کا حسن، پھولوں کا حسن، نقش و نگار کا حسن، اور انسان کی صورت کا حسن —— مزید برآں یہ بات بھی یاد رکھئیے جو کچھ بھی بنتے بنتے یورپیئنازم بن گیا ہے یونان ہی اس کا معلّم ہے اور یورپ یونان ہی کی صدائے بازگشت ہے،

ایشیا میں ایک اور قسم بھی موجود ہے، اس عظیم اور وسیع بر اعظم کو اپنے خیال میں لائیے جس کے کوہساروں کی چوٹیاں گھٹاؤں سے پرے آسمانوں سے باتیں کرتی ہیں، جس کے لق و دق ریگستان میں پانی کی ایک بوند تک میسّر نہیں آتی، گھاس کی ایک پتی تک نہیں ملتی، لیکن اسی کے ساتھ اس میں بے شمار گھنے جنگل بھی ہیں جن میں سے عظیم الشان دریا گزرتے ہیں جو سمندروں میں جا ملتے ہیں ان تمام چیزوں سے بننے والے ایک ماحول کے درمیان حسن و جمال سے مشرق کی محبت ایک دوسری سمت میں اپنی کرشمہ سازی کا مظاہرہ کرتی ہے، یہاں وہ ظاہر کو نہیں دیکھتی باطن کے پردوں کے اندر جھانکتی ہے، اس میں یونان اور بربری تشنگی سے ملتی جلتی وقار و اقتدار کی ایک پیاس بھی ہے، نیچر کی ایک تشنگی بھی ہے لیکن اسی کے ساتھ مشرق کا یہ ذوق جمال خود کو ایک وسیع ترین دائرہ میں پھیلاتا ہے، ایشیا میں آج بھی حسب و نسب، رنگ و نسل اور زبان کی بنیاد پر قومیں نہیں بنا کرتیں، یہاں جو قومیں بنتی ہیں وہ ادیان کی بنیاد پر بنتی ہیں اور مذہب ہی وہ چیز ہے جو قوم کی تشکیل کرتا ہے، ہم سب عیسائی ہیں، ہم سب مسلمان ہیں، ہم سب ہندو ہیں، یا ہم سب بدھ ہیں، ایک بدھ خواہ چینی باشندہ ہو، خواہ ایرانی باشندہ ہو، لیکن وہ سوچتا ہے کہ دھرم کے ناطے وہ ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور وطن کے فرق کا کوئی مطلب نہیں ہے، دھرم ہی انسانی یکجہتی کا ایک رشتہ ہے، مزید برآں، محض اسی وجہ سے مشرق کے لوگ اپنے جنم سے تخیل پسند ہوتے ہیں آبشاروں کا ترنم، طائروں کی موسیقی، چاند، سورج، ستاروں اور ساری دنیا کا حسن بہت مسرت بخش ہے، لیکن مشرقی ذہن کے لئے یہ سارا حسن بہت کافی نہیں ہے، وہ موجودات کے اس حسن و جمال سے آگے جاتا ہے، حسن و جمال کا جو ذخیرہ اس کی نگاہوں کے سامنے موجود ہے وہ اس کے خیال کے مطابق

بہت حقیر ہے اس کی کوئی قدر نہیں ہے کوئی قیمت نہیں ہے، مشرق چونکہ ہزاروں برس سے نسل انسانی کا گہوارہ بنا ہوا ہے اور مقدرات کے جملہ اتار چڑھاؤ عروج و زوال نشیب و فراز یہاں نظر آتے رہے ہیں، سلطنتیں بنتی رہی ہیں، بگڑتی رہی ہیں، انسانی اقتدار کا رعب دبدبہ کبھی بیکسی سے اور کبھی بیکسی جاہ و جلال سے بدلتی رہی ہے، دولت چلتی پھرتی دھوپ کی طرح آتی جاتی رہی ہے، علم و اقتدار میں شمشیر زنی کی نوبتیں آتی رہی ہیں لہٰذا یہ مشرق ہی ہے جو اقلیم علم اور اقلیم اقتدار کی معرکہ آرائیوں کا میدان بنا ہے، اس وجہ سے اگر مشرق دنیا کی ان چیزوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھے اور اس چیز کی طلب و خواہش رکھے جو غیر متغیر ہو، غیر فانی ہو، تو اس پر کوئی حیرت نہ ہونی چاہیے ایک مشرقی پیغمبر ان نظریات اور ان خیالات پر کبھی اصرار کرنے کی کوشش نہیں کرتا، جہاں تک انبیاء کا تعلق ہے آپ کو یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ سوا ایک کے باقی سب پیغمبر مشرقی تھے۔

پس ہم اس قدیم پیغمبر کی زندگی میں سب سے پہلے جو بات دیکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ ——— "یہ زندگی نہیں، بلکہ اس سے کوئی بالاتر چیز ہے ———" اور مشرق کے ایک سچے فرزند کی طرح وہ اس قول پر عمل پیرا دکھائی دیتا ہے، آپ مغرب کے لوگ اپنے شعبوں میں ——— مثال کے طور پر فوجی امور اور سیاسی امور اسی طرح کے دیگر کاموں میں بہت زیادہ عملی واقع ہوئے ہیں اور شاید مشرقی لوگ زندگی کے اور شعبوں میں اتنے زیادہ عملی نہیں ہیں لیکن وہ دھرم کے کاموں میں بہت زیادہ عملی ہوتے ہیں، اگر کوئی شخص ایک فلسفہ پیش کرتا ہے تو آپ دوسرے ہی دن دیکھیں گے کہ ہزاروں لوگوں نے اپنی زندگی میں عملی طور پر اس کے اثر و نفوذ کے لئے جدوجہد شروع کر دی ہے، اگر ایک شخص یہ بات کہتا ہے کہ ایک پاؤں پر کھڑے رہنے سے آپ کو سورگ مل جائے گا۔ بھگتی مل جائے گی تو دوسرے ہی دن اُسے پانچ سو آدمی مل جائیں گے جو بھگتی کی خواہش میں ایک پاؤں پر کھڑے ہوں گے، آپ اسے مضحکہ خیز کہہ سکتے ہیں، لیکن یاد رکھیئے کہ اس کے نیچے اس کا فلسفہ ہے اس کے عمل کی زبردست طاقت نہاں ہے، مغرب میں بھگتی حاصل کرنے کے طریقوں کا مطلب ہے ——— عقلی کلابازی، فکری شعبدہ گری، اور ظاہر ہے کہ اس مطلب کو زندگی میں عمل کی ایک لہر سے نہیں بدلا جا سکتا مغرب میں ایک بانوئی کو سب سے بڑا معلّم اور سب سے بڑا استادِ روحانیت سمجھ لیا جاتا ہے،

پس حضرت یسوع مسیح پہلے درجہ میں مشرق کے سچے فرزند کی طرح ہمیں زبردست عملی انسان دکھائی دیتے ہیں، وہ نہ تو اس فانی دنیا میں کوئی عقیدہ رکھتے ہیں نہ اس سے متعلق چیزوں پر ان میں کوئی اعتماد اور بھروسہ ہے، دھرم کو بطور ضابطہ ظلم استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہے، جیسا کہ مغرب میں ان دنوں فیشن ہو گیا ہے، دھرم کو ربڑ کی طرح کھینچنے کی ضرورت نہیں ہے وہ کھنچے گا نہیں، ربڑ بھی ایک حد تک کھنچ سکتا ہے اور اس حد سے زیادہ نہیں کھنچ سکتا، مذہب کو عہد حاضر کے جھوٹے جذبۂ وقار کے سانچے میں نہ ڈھالئے ہمیں مذہب کے

معاملہ میں امین و دیانت دار ثابت ہونا چاہیئے' اگر ہم اس آدرش کو اپنا نہیں سکتے' اس پر چل نہیں سکتے' تو ہمیں اپنی کمزوری کا اقرار کرنا چاہیئے' لیکن اس آدرش کو کھینچ کر نیچے لانا چاہیئے نہ اسے گرانا چاہیئے مغرب کے لوگ حضرت یسوع مسیح کی زندگی سے متعلق جو تفصیلات بیان کرتے ہیں' اس سے ایک شخص کے دل پر چوٹ لگتی ہے' میں نہیں جانتا کہ وہ کیا تھے اور کیا نہیں تھے' اگر ایک شخص انہیں بہت بڑا سیاستداں اور مدبر قرار دیتا ہے تو دوسرا شخص انہیں بہت بڑا جنرل بناتا ہے' تیسرا یہ بات کہتا ہے کہ وہ زبردست محب وطن انسان تھے ایسی ہی مزید باتیں کہی جاتی ہیں' لیکن ان سب مفروضات کے لئے کیا مقدس کتابوں میں کوئی اشارہ ملتا ہے؟ اس عظیم پیغمبر کے سوانح پر اگر کوئی تبصرہ سب سے اچھا ہو سکتا ہے تو وہ خود اس کی اپنی زندگی ہے' لومڑیاں اپنے بلوں میں رہتی ہیں' پرندوں کے اپنے گھونسلے ہوتے ہیں' لیکن آدم کا بیٹا نہیں جانتا کہ اسے اپنا سر کس آستانے پر جھکانا چاہیئے' یہی وہ چیز ہے جسے حضرت یسوع مسیح نے مکتی کا واحد راستہ قرار دیا ہے' ہم کو قطعی طور پر اقرار کرنا چاہیئے کہ ہم یہ عمل اختیار نہیں کر سکتے' ہم میں اب بھی "میرا اور اپنا" کا اشتیاق باقی ہے' ہم جائیداد روپیہ اور دولت کے طلبگار ہیں' وائے ہو ہم پر! ہم کو کھل کر اقرار کرنا چاہیئے' اور عالم انسانیت کے اس عظیم معلّم کو شرمندہ نہ کرنا چاہیئے' اس کا کوئی خاندانی رشتہ نہ تھا' کوئی گھر بار نہیں تھا' کیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ ایسے آدمی میں دنیوی خواہشات ہو سکتی ہیں؟ کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ یہ پیکر نورانی ——— جو آدمی نہیں اپنے آپ میں بھگوان تھا' اس زمین پر جانوروں کو اپنا بھائی بتانے کی غرض سے آیا تھا یا وہ مویشیوں کا بھائی بننا چاہتا تھا' اس کے باوجود اس کی تعلیمات میں ایسی باتوں کی تبلیغ کی جاتی ہے' اس میں کوئی جنسی خواہش نہیں تھی' وہ ایک آتما تھی' وہ کچھ نہیں تھا ——— بس ایک آتما ——— صرف ایک آتما! اور ایک جسم کے اندر رہ کر یہ آتما انسانیت کی فلاح و ترقی کے لئے عمل پیرا تھی' اور اپنے پیکر سے اس آتما کا بس اتنا ہی تعلق تھا' آتما کی کوئی جنس نہیں ہوتی بے پیکر آتما کا حیوان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا' کوئی رشتہ نہیں ہوتا' یہ وہ نظریہ ہے جو ہماری عقل سے ماوراء ہے' جسے سمجھنے سے ہم قاصر ہیں' سمجھئے یا نہ سمجھئے لیکن اس نظریہ کو ذہن نشین رکھیئے' اور اقرار کیجئے کہ یہ نظریہ ہے تو ہمارا ہی لیکن ہم اس کی سطح تک نہیں پہونچ سکے' اس پر عمل نہیں کر سکے' وہ اپنی زندگی میں کوئی دوسرا مقصد نہیں رکھتا تھا' اس کا سوا اس خیال کے کوئی دوسرا خیال نہیں تھا کہ وہ ایک آتما ہے ——— ایک بے پیکر آتما! جو کسی رشتہ میں بندھ نہیں سکتی' جس پر کوئی حد قائم نہیں کی جا سکتی' اور نہ صرف یہ بلکہ اس نے اپنے شاندار مشاہدہ کے ذریعہ یہ حقیقت پائی تھی کہ ہر مرد و زن میں چاہے وہ یہودی ہو چاہے جنٹائل' چاہے غریب ہو چاہے امیر' چاہے پرہیزگار ہو چاہے گناہ گار' خود اس کی آتما جیسی ایک غیر فانی آتما پائی جاتی

ہے' لہٰذا اس کی زندگی میں جو کام دکھائی دیتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ ہر شخص سے یہ اپیل کرتا ہے کہ اپنی آتما کا احساس کرو' اپنے نفس کو پہچانو' اس وہم و قیاس میں مبتلا نہ رہو کہ تم پست و حقیر ہو' تم مفلس و غریب ہو' یہ مت سوچو کہ تم کچل ڈالے جاؤ گے' تم پر ظلم کے پہاڑ توڑے جائیں گے' گویا کہ تم غلام ہو' بلکہ اس کے برعکس یہ سوچو کہ تمہارے اندر کوئی شے ہے جو کبھی کچل نہیں سکتی' جس پر کبھی کوئی ظلم ہو نہیں سکتا' جو کبھی کسی مصیبت میں مبتلا نہیں ہوتی اور جس کو کبھی موت نہیں آتی' تم سب خدا کے فرزند ہو' غیر فانی روح! اس نے اعلان کیا ——— تمہارے اندر خدا کی سلطنت قائم ہے' خدا کے اقتدار کا سکہ چلتا ہے' باپ اور بیٹے میں کوئی فرق نہیں ہے' دونوں ایک ہیں' جرأت کر کے کھڑے ہو اور کہو کہ نہ صرف میں خدا کا بیٹا ہوں بلکہ میں اور میرا باپ ایک ہی ہیں' یہ تھے یسوع مسیح جو یہ تعلیم دیتے تھے' انھوں نے کبھی اس دنیا اور اس زندگی کی کوئی بات نہیں کی' انھوں نے سوا اس کے اس دنیا سے کوئی واسطہ نہیں رکھا کہ وہ دنیا کو اٹھا کر آگے کی طرف اسے دھکا دینا چاہتے تھے تاکہ وہ بڑھے اور یہاں تک بلند ہو کہ پوری دنیا خدا کے غیر فانی نور میں ڈوب جائے' ہر شخص کو اپنے نفس کا عرفان حاصل ہو جائے' موت غائب ہو جائے اور مصائب فنا ہو جائیں'

ہم وہ مختلف کہانیاں پڑھتے ہیں جو اُن کے بارہ میں لکھی گئی ہیں' ہم ان علما کو جانتے ہیں' ان کی تصانیف سے واقف ہیں' اعلیٰ اور معیاری تنقیدات کا بھی ہم نے مطالعہ کیا ہے' اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ یہ سب کچھ وسیع تر مطالعہ کے بعد ہی معرض وجود میں آیا ہے' ہم یہ بحث کرنا نہیں چاہتے کہ نئی انجیل (نیو ٹسٹامنٹ) میں کتنی سچائی ہے'

یہ بحث بھی ہمارا مقصود نہیں ہے کہ حضرت یسوع مسیح کی سوانح حیات کس حد تک تاریخی اہمیت کی حامل ہو سکتی ہے' اس بات کی بھی چنداں کوئی اہمیت نہیں ہے کہ نئی بائبل یسوع مسیح کی ولادت کے پانچ سو برس بعد لکھا گیا' نہ ہی اس بات کی کوئی اہمیت ہے کہ ان کی سوانح حیات کس حد تک صحیح ہے اور ان کی عمر کے واقعات میں کتنی سچائی ہے' بلکہ اس سب کے پس پردہ کوئی چیز ہے' کوئی ایسی چیز ہے جس کی ہم نقل اتارنا چاہتے ہیں' جھوٹ بول کر آپ ایک سچ کی نقل اتارنا چاہتے ہیں' اور جو سچ ہے وہ ایک حقیقت ہے' جس چیز کا کوئی وجود ہی نہ ہو' آپ اس کی نقل تو اتار ہی نہیں سکتے' آپ اُس چیز کی بھی کوئی نقل نہیں اُتار سکتے جس کو آپ نے کبھی محسوس نہ کیا ہو' جس کا آپ کو کبھی کوئی ادراک نہ ہوا ہو' بے شک کوئی مرکز حیات ہونا چاہیئے' ایک زبردست طاقت کو بروئے کار آنا چاہیئے' ایک زبردست روحانی شکتی کو عمل پیرا ہونا چاہیئے' اور یہی وہ شکتی ہے جس کے بارہ میں ہم گفتگو کر رہے ہیں' یہ شکتی موجود

ہوتی ہے تو ہم کسی بھی عالم کی نکتہ چینی سے نہیں ڈرتے، اگر میں ایک مشرقی کی حیثیت سے یسوع مسیح کی پرستش کرنا چاہوں گا تو پھر میرے لئے ایک ہی راستہ ہوگا کہ میں ان کی پرستش کروں تو بس معبود کی حیثیت میں، کسی دوسری حیثیت میں نہیں! کیا آپ کے خیال میں ہمیں ان کی پرستش بحیثیت معبود کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے؟ اگر ہم ان کو اپنی سطح تک کھینچ لائیں اور ایک بڑے آدمی کی حیثیت میں ان کی تھوڑی سی عزت اور تھوڑا سا احترام کرنے لگیں تو پھر ہمیں قطعی طور پر ان کی پرستش نہ کرنی چاہیئے، آخر کس وجہ سے ان کی پرستش کی جانی چاہیئے، ہماری الہامی کتابوں میں کہا گیا ہے کہ اُن نور کے پیکروں کی جن میں نور آلہٰی بروئے کار ہوتا ہے جو خود نور مجسم ہوتے ہیں، اس طرح پرستش کی جانی چاہیئے کہ گویا من تو شدی تو من شدی،

لہٰذا آپ دیکھتے ہیں کہ آدمی صرف تین طریقوں سے خدا کا ادراک کرتا ہے، ایک خام عقل کا غیر تعلیم یافتہ انسان، خدا کا ادراک اس طریقہ سے کرتا ہے کہ دور بہت دور کہیں جنت کے کسی مقام پر، ایک زرین تخت بچھا ہوا ہے جس پر خدا بہت بڑے جج کی حیثیت سے متمکن ہے، یہ اچھا ادراک ہے، اس لئے کہ اس میں کوئی بُری بات نہیں ہے، آپ کو ہمیشہ یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیئے کہ انسانیت، باطل سے حق کی طرف سفر نہیں کرتی، بلکہ حق سے حق کی طرف سفر کیا کرتی ہے، ہو سکتا ہے کہ آپ اسے زیادہ بہتر سمجھیں کہ انسانیت پست معیار کے حق سے بلند معیار کے حق کی طرف سفر کرتی ہے لیکن انسانیت باطل سے حق کی طرف سفر نہیں کرتی، فرض کر لیجئے کہ آپ زمین سے ایک سیدھا خط ڈال کر سورج کی طرف سفر شروع کرتے ہیں یہاں سے سورج کا حجم بہت چھوٹا دکھائی دیتا ہے، فرض کر لیجئے کہ آپ نے دس لاکھ میل کا سفر طے کر لیا تو اب آپ جس مقام پر ہوں گے وہاں سے سورج کا حجم زیادہ بڑا نظر آئے گا، جیسے جیسے آپ آگے بڑھتے جائیں گے، سورج کا حجم بھی بڑا ہوتا جائے گا، اب فرض کر لیجئے کہ مختلف زاویوں سے آپ نے ایک ہی سورج کے بیس ہزار فوٹو کھینچ اتار لئے ہیں، تو کیا یہ سب فوٹو ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوں گے، یقینی طور پر مختلف ہوں گے، لیکن کیا آپ انکار کر سکتے ہیں کہ یہ سب فوٹو ایک ہی سورج کے نہیں ہیں! پس مذاہب کی تمام اقسام غیر فانی نور یا ایشور تک پہنچنے کے لئے انسانی سفر کے لئے مختلف مدارج اور مختلف منزلوں کی حیثیت رکھتی ہیں کچھ اقسام ایسی ہیں جو نچلی منزل کے مشاہدہ سے تعلق رکھتی ہیں، کچھ اقسام ایسی ہیں جو اونچی منزل کے مشاہدہ سے تعلق رکھتی ہیں، کل اتنا ہی فرق ہے جو مختلف مذاہب میں نظر آتا ہے، سوا اس کے اور کوئی فرق نہیں ہے بس ساری دنیا میں بے عقل انسانوں کے مذاہب و عقائد اس بات پر مبنی ہیں کہ خدا

اس کائنات سے باہر ہے، وہ جنت میں رہتا ہے، اور اسی جگہ سے وہ دنیا پر حکومت کرتا ہے، بُرے لوگوں کو سزا دیتا ہے اور اچھے لوگوں کو جزا دیتا ہے، لیکن اس کے برعکس ایک شخص جو روحانی اعتبار سے ترقی یافتہ ہوتا ہے خدا کا ادراک وحدت الوجود کی منزل سے شروع کرتا ہے وہ سوچتا ہے کہ خدا اس کائنات کے ذرے ذرے کے اندر موجود ہے یعنی یہ کہ خالق مجھ میں نہاں ہے اور میں تم میں نہاں ہوں اور اس وقت جبکہ یہودیوں نے اس عظیم پیغمبر سے مناظرہ کیا تو اس نے کہا کہ شاید وہ یہود ایک ہے اور اس بات کو یہودیوں نے یہ سمجھا کہ وہ عظمت الٰہی کے منافی ہے اور کفر کے درجہ میں ہے لیکن اس عظیم پیغمبر کا اس بات سے اصل مفہوم کیا تھا؟ قدیم پیغمبروں نے جس مفہوم کو پیش کیا تھا، اس عظیم پیغمبر کا اصل مفہوم بھی وہی تھا یعنی یہ کہ تم سب اوتار ہو اور عظیم تر کی اولاد ہو، آپ ان تینوں درجوں کی تعلیم پر غور کریں، آپ غور کریں گے کہ آپ کے لئے پہلے درجہ سے تعلیم کا شروع کرنا اور آخری درجہ پر ختم کرنا زیادہ آسان ہو گا،

پیغمبر راستہ دکھانے کے لئے آیا تھا، یہ کہ آتما کی کوئی صورت نہیں ہے اور یہ کہ فلسفہ کے مشکل مسئلوں کے ذریعہ آپ آتما کی شناخت نہیں کر سکتے، اچھا ہے کہ آپ کو کوئی علم حاصل نہ ہو، بہتر ہے کہ آپ اپنی زندگی میں کسی کتاب کا مطالعہ نہ کریں، مکتی کے لئے اس میں سے کسی شئے کی ضرورت نہیں ہے، نہ دولت، نہ عزت، نہ اقتدار، نہ علم لیکن مکتی کے لئے جس واحد چیز کی ضرورت ہے، وہ ہے تزکیہ نفس! ایشوران پر اپنی کرپا کرے جو صاف دل اور روشن ضمیر رکھتے ہیں، جن کا نفس پاک ہے، سوا اس کے مکتی کا کوئی دوسرا راستہ ہو نہیں سکتا، بائبل کی زبان میں یہ روح بھی خدا ہی ہے جو خدا ہی سے ملتی ہے، قرآن نے اسے "امر ربی" قرار دیا ہے، کیا امر ربی یا روح الٰہی کبھی بھی ایسا ہو سکتا ہے کہ خالص نہ ہو، اور اس میں کسی طرح کی نجاست کی آمیزش پائی جائے؟ لیکن افسوس صد افسوس کہ ایسا ہوا کرتا ہے کہ اس پر زمانہ کے گرد و غبار، ہمارے اچھے اور بُرے اعمال کذب و صداقت کے افعال اور جہل و بے خبری کا ایک غلاف چڑھ جاتا ہے، لہٰذا ایک ہی بات ضروری ہے کہ گرد و غبار اور میل کچیل کے اس غلاف کو آتما پر سے اتارا جائے اور اُسے پھر روشن و چمکدار بنایا جائے، اس لئے کہ جن کے نفس پاک ہوتے ہیں جن کی آتما صاف ہوتی ہے، بس وہی ایشور کا دیدار کر سکتے ہیں اور ایشوران پر اپنی کرپا کرتا ہے، جنت تو خود تمہارے اندر نہاں ہے، تم خدا کو پانے کے لئے کدھر جاتے ہو؟ جبکہ وہ خود تمہارے اندر موجود ہے، وہ تو تمہارا اپنا ہے اور تم اس چیز کو اپنا کس طرح بنا سکتے ہو جو تمہاری اپنی نہیں ہے، تم خود لافانی ہو اور لافانی خالق کی اولاد ہو، یہ ہے یسوع مسیح کی تعلیم!

دوسری تعلیم ہے مکتی اور اسی پر تمام دیگر مذاہب کی بنیاد بھی منحصر ہے، آپ اپنی روح کو کس طرح صاف اور خالص بناتے ہیں؟ کس طرح اپنے نفس کا تزکیہ کر سکتے ہیں؟ صرف مکتی کے ذریعہ! ایک دولتمند جوان آدمی

صفحہ ۱۲۶

غبار خاطر

حضرت یسوع مسیح سے پوچھا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے کہ میں جاودانی بن جاؤں اور اس عظیم پیغمبر نے اسے یہ جواب دیا تھا کہ تم کو بس ایک چیز کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ حق کے راستے پر چلو، تمہارے پاس جو مال و متاع ہے اُسے بیچ ڈالو اور اپنی ساری دولت غریبوں کو بانٹ دو، تم کو اس کے بدلے جنت کے خزائن مل جائیں گے اس کے نام کا پرچم اٹھاؤ اور میری پیروی کرو تم کو عمر جاودانی مل جائے گی، پیغمبر کی یہ بات سُن کر اس نوجوان کو بڑی مایوسی ہوئی اس لئے کہ وہ بہت بڑی دولت کا مالک تھا اور وہ یہ ساری دولت چھوڑنے کو تیار نہ تھا، ہم سب بھی کم و بیش ویسے ہی ہیں جیسا وہ نوجوان تھا، رات دن ہمارے کانوں میں وہ آواز گونجا کرتی ہے، اپنے عیش و مسرت اور اپنی دنیاداری کے لمحات کے درمیان ہمیں ایسا لگتا ہے کہ ہم سب کچھ بھول چکے ہیں، سب کچھ فراموش کر بیٹھے ہیں، پھر یہ لمحات بیت جاتے ہیں اور ہمارے کانوں میں وہی آواز پھر گونج اٹھتی ہے "اپنا سب کچھ بیچ دے اور میرے پیچھے آ" "جو شخص اپنی جان کو عزیز رکھے گا وہ اپنی زندگی سے محروم ہو جائے گا اور جو شخص اپنی جان کو میرے لئے قربان کر دے گا وہ حیات جاودانی پالے گا" ہماری تمام کمزوریوں کے درمیان وہ آواز ایک وقت آتا ہے کہ پھر ہمارے کانوں میں گونج اٹھتی ہے "تیرے پاس جو کچھ بھی ہے غریبوں کو بانٹ دے اور تو میرے ساتھ آ" یہ اس عظیم پیغمبر کی تعلیمات میں سے ایک تعلیم ہے اور یہ تعلیم دنیا میں جتنے بھی پیغمبر آئے ہیں ان سب نے یکساں طور پر دی ہے یعنی ——— مکتی کی تعلیم! مکتی کا مقصد کیا ہے، اس کا مطلب و مفہوم کیا ہے؟ اخلاق کی دنیا میں صرف ایک ہی آدرش ہے اور وہ یہ کہ آدمی کو بے غرض و بے لوث ہونا چاہیئے! آدمی کو غرض سے بے نیاز ہونا چاہیئے، یہ آدرش ہے قطعی "بے غرضی" اور جب ایک آدمی قطعاً بے غرض ہوتا ہے تو اس کے رخسار پر اگر ایک طمانچہ مارا جائے تو وہ از خود اپنا دوسرا رخسار بھی پیش کر دیتا ہے، جب کوئی شخص کسی کا کوٹ چھین لیتا ہے تو وہ اپنی قمیص خود ہی اتار کر دے دیتا ہے،

آدرش کے معیار کو پستی کی طرف گھسیٹ کر لانے کی بجائے ہمیں حتی الامکان بہتر سے بہتر کام کرنا چاہیئے آدرش یہ ہے کہ جب ایک آدمی بے نفس ہو، اس کے پاس اس کی کوئی ملکیت نہ ہو، کوئی چیز نہ ہو جسے وہ "میرا" اور اپنا کہہ سکتا ہو تو پھر اس بے نفس انسان کے اندر خود ایشور آجاتا ہے، یہ بے نفس انسان خود ہی بھگوان بن جاتا ہے اور اس کا اپنا نفس یا تو مغلوب ہو جاتا ہے یا کچل کر فنا ہو جاتا ہے، ایسا انسان ایک مثالی انسان ہوا کرتا ہے، ہم ابھی اس منزل تک پہونچ نہیں سکتے لیکن ہمیں اس آدرش کو اختیار کرنے کی کوشش تو کرنی ہی چاہیئے، آہستہ آہستہ اس آدرش کی منزل تک پہنچ جانے کے لئے کوشش کرنی چاہیئے، ہو سکتا ہے کہ ہم لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اس منزل تک پہنچ ہی جائیں؟ دقت کا

---

غبارِ خاطر صفحہ ۱۲۷

کوئی تعین نہیں ہو سکتا ہے کہ کل اور ہو سکتا ہے کہ ایک ہزار برس کی مدت گذر جانے کے بعد دنیا کے انسان اس بلند آدرش تک پہونچیں لیکن یہ وہ آدرش ہے جس کی منزل پر انسان کو ایک نہ ایک دن تو پہونچنا ہی ہے اس لئے کہ انسان کی خلقت کی آخری منزل یہی ہے اور آخری راستہ بھی یہی ہے، بے نفسی بجائے خود مکتی ہے، گویا اللہ بس باقی ہوس!

ایک بات اور ہے! انسانوں کو ہدایت کی راہ دکھانے والے تمام رہبر و ہادی بے نفس تھے، بے لوث تھے! فرض کیجئے کہ حضرت یسوع مسیح کے پاس جبکہ وہ سچائی کی تعلیم دے رہے تھے تو ایک آیا اور اس نے کہا آپ جو ہدایت کرتے ہیں وہ بہت خوب ہے، مجھے یقین ہے کہ یہی نجات کا صحیح راستہ بھی ہے، میں آپ کی پیروی کے لئے تیار ہوں آپ کی تعلیمات پر عمل کرنا چاہتا ہوں لیکن میں آپ کو خدائے قدوس کا اکلوتا بیٹا مان کر آپ کی پرستش کرنے کو رضامند نہیں ہوں، اس کے جواب میں حضرت یسوع مسیح نے کیا کہا ہوگا؟ یہی کہ اچھا بھائی! تم میرے بتائے ہوئے آدرش کو مانو، میری تعلیمات پر عمل کرو اور اپنے راستے پر آگے جاؤ! تم میری تعلیمات کا سہرا میرے سر باندھو یا نہ باندھو مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہے، میں نہ تو کوئی دکاندار ہوں نہ دھرم کی کوئی تجارت کرتا ہوں، میں صرف سچائی کی تعلیم دیتا ہوں اور سچائی کسی کی ملکیت نہیں ہے کوئی بھی شخص سچائی کو اپنے حق میں مخصوص نہیں کرا سکتا، سچائی کا نام خدا ہے بس سچائی کو اپناؤ اور اپنے راستے پر چلتے چلے جاؤ! لیکن اس کے برعکس حضرت یسوع مسیح کے ماننے والے کیا بات کہتے ہیں! وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر کی تعلیم پر عمل کرو یا نہ کرو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن حضرت یسوع مسیح نے جو تعلیم دی ہے اور کارنامے انجام دیتے ہیں ان کا سہرا ان کے سر ضرور باندھو! اگر ایسا کروگے تو تم راہ نجات پا جاؤ گے ورنہ نہیں! یہی وجہ ہے کہ اس عظیم پیغمبر کی تمام تعلیمات روبتنزل ہیں اور ان کی واحد شخصیت ہر قسم کی جد وجہد اور ہر قسم کی لڑائی کا موجب بن گئی ہے، جو لوگ حضرت یسوع مسیح کے نام پر اختلافات پیدا کرتے ہیں لڑائی جھگڑوں کی داغ بیل ڈالتے ہیں وہ شاید جانتے نہیں کہ اپنے عمل سے وہ اس عظیم ہستی کو ندامت اور پشیمانی میں مبتلا کر رہے ہیں جو اُن کے اعزاز اور ان کے مرتبہ کی طلبگار نہ تھی، اگر دنیا میں کوئی آدمی ہو جو اسے بھول بیٹھا ہو تو خود حضرت یسوع مسیح کو اس بات کی کیا پرواہ ہوگی کہا غم ہو سکتا ہے؟ وہ تو صرف اپنا پیغام پہونچانے آئے تھے اور انھوں نے یہ پیغام پہونچا دیا ہے، اگر انہیں ستر ہزار بار زندگی ملے تو وہ ان سب زندگیوں کو دنیا کے غریب ترین انسانوں کے لئے تج دیں گے، اگر ایسا نہ ہو انسانوں

---

صفحہ ۱۲۸

غبار خاطر

کی خاطر ان پر کروڑوں بار ظلم کیا جائے اور اگر یہ شرط بھی جائے کہ ان پسماندہ انسانوں کی نجات صرف اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اپنی زندگی کی قربانی دیں تو انھیں اپنی زندگی کی قربانی پیش کرنے میں کبھی کوئی تامل نہیں ہوگا۔ اور وہ یہ سارا کام بڑے سکون، بڑی خاموشی اور کسی شہرت کی تمنّا کے بغیر انجام دیں گے، جن لوگوں کے لئے وہ اپنی جان کی قربانی دینے کو تیار رہیں گے، چاہے ان میں سے ایک آدمی بھی اُن کا نام نہ جانتا ہو، لیکن انھیں اس بات کی کوئی فکر نہیں ہوگی، کوئی پرواہ نہیں ہوگی، اور وہ خاموشی اور استقلال کے ساتھ اپنی قربانی پیش کردیں گے، لیکن اس کے برعکس حضرت یسوع مسیح کے ماننے والے کیا کہتے ہیں؟ بس یہ کہ آپ قطعی طور پر نیک نفس اور نیک نفس انسان بن سکتے ہیں، بشرطیکہ آپ ہمارے پیغمبر کے سر اس کی عظیم تعلیمات کا سہرا باندھیں، اس کے بغیر آپ کو نجات کا راستہ میسّر نہیں آسکتا؟ لیکن ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے! یہ جہالت کی باتیں ہیں لیکن ان توہم آمیز باتوں کی جڑ کیا ہے، صرف یہ خیال کہ ایشور اپنی تجلی صرف ایک ہی بار ظاہر کرتا ہے لیکن یہ خیال قطعی طور پر غلط ہے اس لئے کہ ایشور تو خود آپ کے اندر بھی اپنی تجلی کو ظاہر کر رہا ہے وہ تو آپ کے اندر بھی موجود ہے، پوری کائنات میں یہ دستور ہے کہ جو اس وقت ہے اُسے اب سے پہلے بھی ہونا چاہیے اور مستقبل میں بھی ہونا چاہیے، کائنات میں کوئی چیز نہیں ہے جو کسی قانون کی پابند نہ ہو، اس کا یہ مطلب ہے کہ فطرت کا یہ عمل جو اس وقت ہے وہ اس سے پہلے بھی تھا اور آئندہ بھی رہے گا جو عمل جاری ہے، وہ پہلے بھی جاری تھا اب بھی جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔

ایشور کے اوتاروں سے متعلق ہندوستان کے لوگ یہی عقیدہ رکھتے ہیں، اُن اوتاروں میں سے ایک عظیم اوتار شری کرشن نے جن کے مشہور و معروف اُپدیش "بھگوت گیتا" کے نام سے آپ کے زیر مطالعہ بھی آئے ہوں گے، اپنے اپدیش میں کہا ہے "ہر چند میں جنم نہیں لیتا، ہر چند میری فطرت غیر متغیر ہے، اور ہر چند میں کائنات کا خالق ہوں پھر بھی اپنی مشیت اور اپنی بیر کرتی کے تحت میں ایک پیکر ذی حیات میں اپنی مایا سے اپنا سروپ دکھاتا ہوں، جب بھی نیکیاں ختم ہو جاتی ہیں اور بدی پھیل جاتی ہے تو میں ایک پیکر میں خود کو ظاہر کرتا ہوں، تاکہ نیکی کا تحفظ کیا جائے، بدی کو فنا کیا جائے اور دھرم کو قائم کر دیا جائے، میں ہر عہد میں اس مقصد کے لئے خود کو خاکی پیکروں میں ظاہر کرتا رہا ہوں" جب بھی دنیا مائل بہ پستی ہوتی ہے تو ایشور اُسے آگے بڑھانے اور اُسے اونچا اٹھانے کے لئے خود کو ظاہر کیا کرتا ہے ایشور کے ظہور کے لئے نہ وقت کا کوئی تعین ہے نہ مقام کی کوئی قید ہے، وقتاً فوقتاً اور مقام بہ مقام ایسا ہی ہوتا رہا ہے ایک دوسرے مقام پر شری کرشن نے یہ بات ان الفاظ میں کہی ہے کہ جہاں کہیں بھی تجھے ایسی آتما دکھائی دے جس میں بے پناہ شکتی ہو اور جو انسانیت کے عروج کے لئے بے لوث

جدوجہد کر رہی ہو تو سمجھ لے کہ میں نے اسے اپنی شکتی اور اپنی قدرت دے کر جنم دیا ہے اور اس پر میں خود طاری ہو کر برسرِ کار آیا ہوں!

پس ہمیں نہ صرف حضرت یسوع مسیح، بلکہ ان سب لوگوں کو جو اُن سے پہلے آئے، جو اُن کے بعد آئے اور جو ابھی آنے والے ہیں، ایشور کا اوتار ماننا چاہیئے، یہ سب ایک ایشور کے سروپ ہیں، اور ہماری پرستش آزاد و غیر محدود ہے، یہ سب سروپ پاک اور بے نفس تھے، انھوں نے ہمارے لئے، ہم غریب انسانوں کے لئے جدوجہد کی اور ہمارے لئے اپنی زندگیاں تج دیں، ان سب میں سے ہر ایک نے اور ان سب نے ہم میں سے ہر ایک کے لئے اور ہم سب کے لئے جدوجہد کی، ہمارے گناہوں کی انھوں نے سزا بھگتی، اور ہماری اصلاح کی، اور وہ سب بھی جو مستقبل میں آنے والے ہیں ہمارے کام آئیں گے اور بے نفسی کے ساتھ ہماری خدمت کریں گے،

ایک معنی میں تو آپ سب بھی نبی اور پیغمبر ہیں، آپ میں سے ہر شخص ایک اوتار ہے اس لئے کہ آپ کے کاندھے پر بھی دنیا کا بوجھ رکھا ہوا ہے، کیا آپ نے کوئی مرد یا عورت ایسی دیکھی ہے جو صبر و استقلال کے ساتھ اپنی چھوٹی سی زندگی کا بوجھ اپنے کاندھے پر نہ اٹھائے ہوئے ہو، عظیم پیغمبر بہت ہی قوی ہیکل تھے اس کے کاندھوں پر تو پورے کرۂ ارض کا بوجھ رکھا ہوا تھا، اُن کے مقابل اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہم بالکل یالشتیئے دکھائی دیتے ہیں، لیکن اپنے چھوٹے چھوٹے حلقوں میں اپنے چھوٹے چھوٹے گھروں میں ہم بھی وہی کام انجام دے رہے ہیں جو دنیا کے وسیع تر حلقوں میں ان پیغمبروں نے انجام دیا ہے جو بڑے اور عظیم تھے، کوئی بھی انسان اتنا بُرا نہیں اتنا بیکار نہیں کہ وہ اپنا فرض انجام نہ دے لیکن اپنی تمام خطاؤں، اپنے تمام بُرے خیالات اور بُرے اعمال کے باوجود ہم میں کسی نہ کسی جگہ روشنی کا ایک نکتہ ضرور ہوتا ہے، کسی نہ کسی جگہ ایک سنہرا رشتہ جس سے ہم ہمیشہ ایشور سے بندھے رہتے ہیں، ہمارے اندر لازمی طور پر موجود رہتا ہے، اور یقین کیجئے کہ جس لمحہ بھی یہ رشتہ ٹوٹتا ہے ہم فنا ہو جاتے ہیں، لیکن چونکہ ہمیں فنا ہے نہیں لہٰذا ہم کتنے ہی پست کیوں نہ ہوں کتنے ہی نیچ کیوں نہ ہوں لیکن ہمارے اندر کہاندر کسی نہ کسی جگہ روشنی کا ایک نکتہ قائم رہتا ہے اور ہم اس کے ذریعہ اپنے ایشور سے ایک رشتہ قائم رکھتے ہیں،

بلا امتیاز نسل و ذات ہم ماضی کے تمام پیغمبروں اور اوتاروں کو پرنام کرتے ہیں، جن کی تعلیمات اور سیرت ہمیں ورثہ کے طور پر ملی ہے، بلا امتیاز نسل و رنگ ہم ان تمام خدا نما مرد و زن کو پرنام کرتے ہیں جو انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں اور انسانیت کے مددگار بن رہے ہیں، ——— ہم مستقبل میں آنے والے اُن تمام زندہ اوتاروں کو پرنام کرتے ہیں جو ہماری اولاد کی بے لوث خدمت کریں گے اور بے نفسی کے ساتھ انسانیت کے مددگار بنیں گے

---




CONVERSATIONS AND DIALOGUES

# نشاطِ رُوح

صفحہ

# زندگی اور موت

(1)

اپنے چند نوجوان دوستوں کے ہمراہ جو مختلف کالجوں میں پڑھ رہے تھے، ایک روز میں سوامی جی کے درشن کرنے کے لئے بیلور مٹھ پہنچا۔ ہم ان کے ساتھ حلقہ بنا کر بیٹھ گئے۔ مختلف موضوعات پر گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔ جیسے ہی سوامی جی سے کوئی سوال پوچھا جاتا تھا وہ فی الفور اس کا نہایت جامع جواب دیتے جاتے تھے۔ اچانک انہوں نے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا: آپ سب یورپین فلسفہ کے مختلف مکاتیب اور طبیعیات کا مطالعہ کر رہے ہیں اور دنیا کی مختلف

---

مختلف صحبتوں میں، سوامی وویکانند جی سے ان کے مختلف شِشوں (مریدوں) کی جو گفتگو ہوئی، اسے ان شِشوں نے رسالہ اُدبودھن میں مختلف مضامین کی صورت میں شائع کیا تھا۔ ان صحبتوں میں سوامی جی سے کتنے ہی سوالات کئے گئے جن کے سوامی جی نے بصیرت افروز جوابات دیئے۔ انہیں اب صحبت درویش کے نام سے کتابی شکل میں پیشِ خدمت کیا جاتا ہے۔

سوامی جی کے ان خیالات کا آغاز شری سریندر ناتھ داس گپتا کے مضمون سے ہوتا ہے۔

ایڈیٹر

قوموں اور ملکوں کے بارے میں نئے نئے حقائق کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ زندگی کے حقائق میں عظیم ترین حقیقت کیا ہے؟۔

ہم سوامی جی کے اس سوال کے بارے میں غور و فکر میں مبتلا ہو گئے۔ لیکن ہم سمجھ نہیں پائے کہ سوامی جی کی اس سے مراد کیا تھی۔ چونکہ ہم میں سے کسی نے جواب نہیں دیا اس لئے سوامی جی نے خود اپنے مخصوص روح پرور لب و لہجہ میں بہ آواز بلند کہا: میں آپ کو بتاتا ہوں، ہم سب کو ایک روز واصل حق ہونا ہے۔ اس حقیقت کو ہمیشہ کے لئے ذہن نشین کر لیجئے۔ اس سے آپ کے اندر نئی زندگی کی حرارت پیدا ہوگی۔ صرف تبھی آپ کے اندر سے تنگ ظرفی ختم ہوگی اور آپ کے اعمال میں عملیت آئے گی آپ کی روح اور جسم میں نیا حوصلہ پیدا ہوگا اور وہ لوگ جو آپ کے رابطہ میں آئیں گے وہ بھی محسوس کریں گے کہ فی الواقع انہیں آپ سے روحانی فیضان حاصل ہوا ہے۔

اس کے بعد میرے اور سوامی جی کے درمیان یہ گفتگو ہوئی۔

میں: لیکن سوامی جی کیا موت کے تصور سے روح پژمردہ نہیں ہو جائے گی اور کیا دل پر مایوسی غلبہ حاصل نہیں کرے گی؟

سوامی جی: یقیناً ایسا ہوگا۔ ابتدا میں دل شکستگی پیدا ہوگی اور مایوسی اور اداسی دماغ میں گھر کرے گی۔ لیکن ثابت قدم رہئے اور اس دور افسردگی کو گذر جانے دیجئے اور پھر آپ محسوس کریں گے کہ دل کے اندر نئی توانائی پیدا ہو گئی ہے۔ موت کا مسلسل تصور آپ کو ایک نئی زندگی عطا کرے گا، اس کہاوت کی حقیقت کو کہ یہ تمام دنیا مایا جال ہے، ہر لحظ آپ کی چشم بصیرت کے سامنے لاکر آپ کو زیادہ سے زیادہ غور و فکر کا حامل بنائے گا۔ انتظار کیجئے! دنوں مہینوں اور برسوں کو گذر جانے دیجئے، آپ محسوس کریں گے کہ آپ کے اندر شیر جیسی روح بیدار ہو رہی ہے آپ محسوس کریں گے کہ آپ کی معمولی سی طاقت عظیم تر توانائی میں تبدیل ہو گئی ہے ہمیشہ موت کے تصور کو قائم رکھئے آپ محسوس کریں گے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کا ایک ایک لفظ حقیقت ہے۔ اس سے زیادہ میں الفاظ میں اور کس طرح وضاحت کروں!۔

میرے ایک دوست نے سرگوشی کے انداز میں سوامی جی کی تعریف کی۔

سوامی جی: میری تعریف نہ کیجئے۔ ہماری اس دنیا میں تعریف اور ملامت کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ یہ آدمی کو چکرا دیتی ہیں جیسے کہ جھولا جھولتے وقت ہوتا ہے۔ مجھے بہت کافی داد و تحسین مل چکی ہے، مجھ پر ملامت کی بوچھاریں بھی کافی پڑی ہیں لیکن ان کے بارے میں

سوچنے سے کیا فائدہ! ہر شخص کو اپنا کام کرنے دیجئے۔ بے نیاز رہئے جب واصل حق ہونے کا وقت آئے گا تو میرے، آپ کے اور دوسروں کے لئے تعریف اور ملامت میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ ہم یہاں اپنا اپنا فرض بجالانے کے لئے آئے ہیں۔ مرنے کے بعد سب کچھ یہیں چھوڑ جانا ہے۔

میں: ہم کس قدر بے حقیقت ہیں سوامی جی۔

سوامی جی: سچ ہے! آپ نے بالکل درست کہا۔ کروڑہا کروڑ نظام ہائے شمسی کی اس نامحدود کائنات کے بارے میں سوچئے۔ غور کیجئے کس بے پایاں اور نامحدود طاقت سے یہ چل رہے ہیں گویا کہ عالم الغیب کے قدموں کو چھو لینا چاہتے ہوں، اور اس کے مقابلہ میں ہم کس قدر بے حقیقت ہیں۔ اس صورت میں اس بات کی گنجائش کہاں ہے کہ ہم سفلہ پن اور رذالت کے چکر میں پڑیں۔ آپس کی دشمنی اور فرقہ بندی سے ہمیں یہاں کیا ملتا ہے؟ میری نصیحت مانئے اپنے کالجوں سے واپسی کے بعد اپنا تمام تر وقت دوسروں کی خدمت کے لئے صرف کیجئے۔ آپ میرا یقین کریں اس طرح آپ کو اس سے کہیں زیادہ عظیم مسرت حاصل ہوگی جتنی مسرت اور خوشی آپ کو قاروں کا خزانہ ملنے پر حاصل ہو سکتی ہے۔ جیسے جیسے آپ کے اندر دوسروں کی خدمت کا جذبہ فروغ پاتا جائے گا ویسے ویسے ہی آپ گیان اور آگہی کے راستے پر آگے بڑھتے رہیں گے۔

میں: لیکن ہم بہت غریب ہیں سوامی جی۔

سوامی جی: غریبی کے بارے میں اپنے تصورات ختم کر دیجئے۔ آپ کس حیثیت سے غریب ہیں؟ کیا آپ اس لئے رنجیدہ ہیں کہ آپ کے پاس دو گھوڑوں کی بگھی اور اشاروں پر ناچنے والے نوکر چاکروں کی فوج نہیں ہے؟ اس سے کیا ہوتا ہے؟ آپ اس حقیقت سے واقف نہیں کہ اگر آپ تہِ دل سے دوسروں کی خدمت کے کام میں دن رات جٹ جائیں تو زندگی میں آپ کے لئے کوئی شے بھی ناممکن نہیں رہے گی! اور آپ دیکھیں گے، حیات بعد الممات کا منظر آپ کے سامنے ہے۔ موت کا پردہ ہٹ چکا ہے اور آپ حیران کن اقلیم حیات جاودانی کے مالک ہیں۔

میں: اوہ سوامی جی! آپ کے قدموں میں بیٹھ کر اور آپ کی حیات بخش گفتگو سنکر ہمیں کس قدر فیض حاصل ہوا ہے؟۔

سوامی جی: آپ غور کریں میں ان تمام برسوں میں ہندوستان بھر میں گھوما پھرا ہوں۔ مجھے پُرخلوص شفقت سے لبریز دل رکھنے والی ایسی بہت سی شخصیتیں ملی ہیں کہ جن کے قدموں میں بیٹھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے توانائی کی ایک عظیم رو میرے دل میں دوڑ رہی ہے۔ یہ چند الفاظ جو

میں نے آپ سے کہے اسی روح کی طاقت سے زبان تک آئے ہیں کہ جو مجھے ان کی صحبت میں نصیب ہوئی۔ یہ خیال نہ کیجئے کہ میں خود کوئی بڑی ہستی ہوں۔

میں: لیکن سوامی جی ہم آپ کو ایک ایسا انسان سمجھتے ہیں جس کو خدا کا عرفان حاصل ہو چکا ہو، جس نے خدا کو پا لیا ہو، ایشور کے درشن کر لئے ہوں۔

جیسے ہی میں نے یہ الفاظ کہے اُن کی پُرشکوہ آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے (اوہ، وہ نظارہ جو میں نے دیکھا ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے ہے) اور انہوں نے شفقت سے بھرے انتہائی شیریں اور دلپذیر لب ولہجہ میں کہا: ان ہی مقدس قدموں میں بیٹھ کر گیانی تکمیلِ آگہی کی جستجو کرتے ہیں، انہی مقدس قدموں میں عاشقوں کے عشق ومحبت کو شرف قبولیت حاصل ہوتا ہے۔ اوہ بتائیے پھر مرد اور عورتیں ان مقدس قدموں کے سوا پناہ لینے اور کہاں جائیں!۔

ایک لمحہ بعد انہوں نے پھر کہا: افسوس کس قدر احمقانہ بات ہے کہ انسان اس دنیا میں ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے جھگڑنے میں اپنی عمریں گذار دیتے ہیں لیکن اس طریقہ پر وہ کب تک رہ سکتے ہیں؟ شامِ زندگی کے آتے ہی انہیں گھر واپس آنا ہے، ماں کے شفقت بھرے بازوؤں میں پناہ لینا ہے

(II)

صبح سویرے میں سوامی جی کے پاس پہنچا وہ اس وقت کلکتہ میں بلرام بابو کے مکان واقع ۵، رام کانتا بوس سٹریٹ پر قیام فرما تھے۔ تمام کمرہ سامعین سے بھرا ہوا تھا اور سوامی جی فرما رہے تھے۔ "ہمیں شردھا کی ضرورت ہے ہمیں اپنے آپ پر اعتماد کی ضرورت ہے۔ توانائی ہی زندگی ہے اور کمزوری موت کی علامت ہے۔ ہم آتما ہیں۔ لافانی، آزاد، خالص اور فطرتاً خالص آتما۔ کیا کبھی ہم گناہ کر سکتے ہیں؟ ناممکن!۔ اس طرح کے اعتقاد کی ضرورت ہے، ایسے اعتقاد سے ہمارے اندر انسان جنم لیتے ہیں، بھگوان پیدا ہوتے ہیں۔ شردھا کے اسی تصور کو کھو دینے کا نتیجہ ہے کہ دیش برباد ہو گیا ہے۔

سوال: یہ شردھا ہمارے اندر سے کیوں ختم ہوئی؟

سوامی جی: ہمیں بچپن ہی سے منفی تعلیم ملتی رہی ہے۔ ہم نے نہ صرف یہ سیکھا ہے کہ ہم بے حیثیت

---

یہ مضمون شری سریندر ناتھ سین کی پرائیویٹ ڈائری سے اخذ کیا گیا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں اعتماد وایمان کا فقدان کیا رنجدہ نتائج پیدا کر رہا ہے۔

---

ہیں مشکل ہی سے ہمیں یہ سمجھنے دیا گیا ہے کہ کبھی ہمارے ملک کے اندر بھی بڑے آدمی ہوئے تھے۔ کوئی مثبت
تعلیم ہمیں نہیں دی گئی۔ ہم یہاں تک بھی نہیں جانتے کہ ملتھ پاؤں کا استعمال کیا ہے۔ انگریزوں کے بزرگوں کے
متعلق تمام حقائق اور معلومات ہمیں ازبر ہیں لیکن افسوس اپنے بزرگوں کے بارے میں ہم بے نیاز ہیں۔ ہم
نے صرف ناتوانی سیکھی ہے۔ ایک مفتوح قوم ہونے کے سبب ہم یقین کر بیٹھے ہیں کہ ہم کمزور اور
ناتواں ہیں کسی معاملہ میں بھی ہم آزاد نہیں ہیں۔ پس اس صورت میں شردھا کے ختم ہو جانے کے علاوہ
اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔ حقیقی شردھا کا تصور ایک بار پھر ہمارے اندر ابھرنا چاہئے ہمارے اندر جذبۂ خود
اعتمادی پھر سے بیدار ہونا چاہئے۔ ہم صرف اسی صورت میں ان تمام مسائل کو حل کر سکتے ہیں جو کہ
ہمارے ملک کو درپیش ہیں۔

سوال: ایسا کس طرح ہو سکتا ہے۔ ان تمام ان گنت برائیوں کا علاج صرف شردھا کس
طرح ہو سکتی ہے جو کہ ہمارے سماج میں گھر کر چکی ہیں۔ علاوہ ازیں دیش کے اندر اور بہت سی
شدید خرابیاں پائی جاتی ہیں جنہیں دور کرنے کے لئے انڈین نیشنل کانگرس اور دوسری
محب وطن جماعتیں سخت جدو جہد کر رہی ہیں حکومت برطانیہ کے ساتھ رجوع کر رہی ہیں۔ اس سے
زیادہ اچھے ڈھنگ پر ہم اپنی ضرورتوں کو اور کس طرح پیش کر سکتے ہیں؟ اس معاملہ کا شردھا
سے کیا تعلق ہے؟

سوامی جی: مجھے بتائیے وہ ضروریات کس کی ہیں؟ آپ کی یا حکومت کی؟ اگر آپ کی
ہیں تو کیا حکومت انہیں آپ کے لئے پورا کرے گی؟ یا خود آپ اپنے لئے اپنی ضرورتوں کو
پورا کریں گے؟۔

سوال: لیکن یہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ رعایا کی ضرورتوں کو پورا کرے۔ اگر ہم ہر
چیز کے لئے بادشاہ کی طرف نہ دیکھیں تو پھر کس طرف دیکھیں؟

سوامی جی: ایک بھکاری کی ضرورتیں کبھی پوری نہیں ہوتیں۔ فرض کیجئے حکومت
آپ کی تمام ضرورتوں کو پورا کر دیتی ہے۔ وہ انسان کہاں ہیں جو طلب کردہ چیزوں کو محفوظ رکھ
سکیں۔ پس سب سے پہلے انسان تیار کیجئے۔ ہمیں انسانوں کی ضرورت ہے اور جب تک صدق و ایمان
نہ ہو انسان کس طرح تیار ہو سکتے ہیں؟۔

سوال: لیکن سوامی جی مہاراج! اکثریت کا نظریہ یہ نہیں ہے۔

سوامی جی: آپ جسے اکثریت کہتے ہیں وہ محض احمقوں اور عام سطح کی ذہنیت کے

صفحہ ۷

افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ ہر جگہ ایسے لوگ معدودے چند ہی ہوتے ہیں جن کے اندر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ایسا ذہن رسا رکھنے والے معدودے چند افراد ہی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر چیز میں رہنمائی کرتے ہیں۔ اکثریت ان کی پیروی کرتی ہے اور یہ اچھا ہی ہے کیونکہ جب وہ ان رہنماؤں کے نقش قدم پر چلتے ہیں تو ہر کام ٹھیک ہوتا ہے۔ وہ لوگ احمق ہیں جو سمجھتے ہیں کہ کسی کے سامنے ان کا سر تسلیم خم نہیں ہو سکتا۔ ایسے لوگ خود اپنے فیصلوں پر عمل پیرا ہو کر اپنی تباہی کا موجب بنتے ہیں۔ آپ سماجی اصلاحات کی بات کرتے ہیں۔ لیکن آپ نے کیا کیا ہے؟ سماجی اصلاحات سے آپ کی مراد یا تو بیواؤں کی شادیوں سے ہے یا خواتین کی آزادی اور اسی قسم کی کسی اور بات سے ہے۔ کیا آپ کی مراد ان چیزوں سے نہیں ہے؟ اور پھر ان کا دائرہ بھی محض چند ذاتوں تک محدود کر دیا جاتا ہے۔ بلاشبہ اس قسم کے منصوبے کا کچھ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے لیکن کیا یہ اصلاح ہے یا محض خود غرضی کی ایک شکل ——— کسی نہ کسی طرح اپنے گھر کی صفائی کر لو، اسے صاف ستھرا رکھو خواہ دوسرے بد سے بدتر ہو جائیں؟

سوال: کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قطعی طور پر سماجی اصلاحات کی ضرورت نہیں ہے؟۔

سوامی جی: یہ کس نے کہا! بہر حال ان کی ضرورت ہے۔ آپ جسے اصلاح کہتے ہیں اس کا تعلق بڑی حد تک عوام سے نہیں ہے۔ آپ بیواؤں کی شادیوں اور عورتوں کی آزادی وغیرہ کے لئے فکرمند ہیں ان کے یہاں یہ باتیں پہلے ہی سے موجود ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے وہ ان چیزوں کو سماجی اصلاح کا نام نہیں دے سکتے۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ شردھا کے فقدان سے ہمارے اندر یہ تمام خرابیاں پیدا ہوتی جا رہی ہیں۔ میرا طریق علاج یہ ہے کہ بیماری کو دبانے کے بجائے اس کی اصل جڑ ہی کو اکھاڑ پھینکا جائے۔ اصلاحات ہم بہت سے طریقوں پر کر سکتے ہیں کون احمق ہے جو اس سے انکار کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستان کے اندر مختلف ذات برادریوں کے درمیان شادیوں کی بہتر وجہ موجود ہے ایسی شادیاں نہ ہونے کی وجہ سے قوم روز بروز کمزور ہوتی جا رہی ہے۔

چونکہ اس روز سورج گرہن تھا، اس شخص نے جو یہ تمام سوالات کر رہا تھا سوامی جی کو پرنام کیا اور یہ کہتے ہوئے اٹھ کر چلا گیا" اب مجھے اشنان کے لئے گنگا جی جانا چاہئے لیکن میں پھر کسی روز آؤں گا"

III

اتوار ۲۳ جنوری ۱۸۹۸ء

اس شام باغ بازار میں بلرام بابو کے مکان پر رام کرشن مشن کی ہفتہ وار میٹنگ تھی۔ سوامی توریانند، سوامی یوگانند، سوامی پرمانند اور دوسرے لوگ مٹھ سے تشریف لائے ہوئے تھے۔ سوامی جی برآمدہ میں مشرق کی سمت بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ حصہ اس وقت لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ شمالی برآمدہ اور شمالی برآمدہ کے دوسرے حصوں میں بھی بڑی تعداد میں لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن یہ اس روز کی کوئی خصوصیت نہیں تھی جب تک سوامی جی کلکتہ میں قیام پذیر ہوتے تھے ہر روز ان کے دربار میں حاضری کا یہی عالم ہوا کرتا تھا۔

جو لوگ اس وقت سبھا میں موجود تھے ان میں سے بہت سے لوگوں نے سن رکھا تھا کہ سوامی جی بہت اچھا گاتے ہیں۔ ماسٹر مہاشہ نے یہ جان کر کہ سوامی جی بہت اچھا گاتے ہیں اپنے قریب بیٹھے ہوئے چند دوسرے اشخاص سے سرگوشی کے انداز میں کہا کہ وہ سوامی جی سے گانے کی درخواست کریں لیکن سوامی جی نے ان کی نیت کو تاڑ لیا اور خوش طبعی کے ساتھ پوچھنے لگے ماسٹر مہاشہ! آپ لوگ کیا سرگوشیاں کر رہے ہیں؟ جو کچھ کہنا ہے زور سے کہئے۔ ماسٹر مہاشہ کی درخواست پر سوامی جی نے خوش الحانی کے ساتھ یہ بھجن گایا جس کا مفہوم یہ تھا۔

"اے ماں شیاما! تیری کرپا اور شفقت ہم پر سدا بنی رہے
تو اپنی شفقت کا ہاتھ ہمیشہ سر پر رکھے
تیرے دل میں میری جگہ بنی رہے۔"

ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے دنیا کے تار جھنجھنا اٹھے ہوں۔ بھجن ختم کرنے کے بعد انہوں نے ماسٹر مہاشہ سے کہا: "کہئے آپ کی آرزو پوری ہوگئی؟ لیکن اب میں مزید کچھ نہیں گاؤں گا کیونکہ اس کی کیفیت مجھ پر بے خودی طاری کر دے گی اور پھر مغربی ملکوں کے اندر دن رات

---

یہ مضمون شری سریندر ناتھ سین کی پرائیویٹ ڈائری سے اخذ کیا گیا ہے
اس میں سوامی جی نے گیان یوگ اور بھگتی یوگ کی تشریح کرتے ہوئے بتایا ہے
کہ دونوں کی منزل ایک ہے۔

---

تقریریں کرتے کرتے میری آواز خراب ہوگئی ہے اور آواز میں بڑی حد تک لرزہ پیدا ہو گیا ہے۔"

اس کے بعد سوامی جی نے اپنے ایک برہمچاری شیشہ سے کہا کہ وہ مکتی کی اصل کیفیت کے موضوع پر تقریر کرے۔ حکم ملنے پر برہمچاری نے تقریر کی۔ اس کے بعد کچھ دوسرے اصحاب نے بھی اظہار خیال کیا۔ پھر سوامی جی نے تقریر کے موضوع پر مباحثہ کی دعوت دی اور اپنے ایک گرہستی شیشہ سے کہا کہ وہ اس مباحثہ کا آغاز کرے۔ لیکن آخر الذکر نے ادویت اور گیان کے حق میں دلائل دیئے اور دویت کو کم درجہ کی شے قرار دینے کی کوشش کی۔ اس پر سامعین میں سے ایک شخص نے احتجاج کیا چونکہ دونوں فریقین نے اپنے اپنے نظریات کو ثابت کرنے کے لئے دلائل دیئے تھے اس نے ایک دلچسپ لفظی بحث چھڑ گئی۔ سوامی جی کچھ دیر تک خاموش بیٹھے ہوئے اس بحث کو سنتے رہے۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ دونوں حریف مشتعل ہو رہے ہیں تو انہوں نے دونوں کو مندرجہ ذیل الفاظ کہہ کر خاموش کر دیا۔

سوامی جی: آپ لوگ دلائل دیتے ہوئے مشتعل ہو کر تمام لطف کیوں کرکرا کر رہے ہیں۔ شری رام کرشن کہا کرتے تھے کہ خالص گیان اور خالص بھگتی دونوں ایک ہی ہیں۔ بھگتی کے اصول کے مطابق خدا کو تمام تر عشق و محبت قرار دیا گیا ہے۔ کوئی شخص یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ "میں اس سے عشق و محبت کرتا ہوں" کیونکہ وہ تمام تر عشق و محبت ہے اس کے باہر عشق و محبت نہیں ہے۔ آپ کے دل میں اس کے لئے جو عشق و محبت ہے وہ بھی خود وہی ہے۔ بالکل اسی طرح سے اگر کوئی شخص اپنے دل میں اس کے لئے رغبت اور التفات محسوس کرتا ہے تو یہ رغبت اور التفات بھی خود خدا ہی ہے۔ چور چوری کرتا ہے، طوائف اپنے جسم کو فروخت کرتی ہے، ماں اپنے بچہ کو پیار کرتی ہے، ان میں سے ہر ایک عمل میں وہ خود موجود ہے۔ ایشور ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ گیان کے مطابق بھی ایک شخص خدا کو ہر جگہ پاتا ہے۔ گیان اور بھگتی کے درمیان یہی ہم رنگی موجود ہے۔ جب کوئی شخص عرفان الٰہی (بھاؤ) کے اعلیٰ ترین تصور میں مستغرق ہوتا ہے یا سمادھی کی حالت میں ہوتا ہے تو دویت کا تصور ختم ہو جاتا ہے اور بھگت اور بھگوان کے درمیان سے دوئی کا تصور مٹ جاتا ہے۔ بھگتی سے متعلق شاستروں میں ایشور کے ساتھ تعلق کی پانچ راہیں متعین کی گئی ہیں جن پر چل کر ایک شخص عرفان الٰہی حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن ان میں ایک اور طریقہ کا بخوبی اضافہ ہو سکتا ہے یعنی مراقبہ کا طریقہ جس میں بھگت اور خدا کے درمیان کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ پس ادویت مت پر یقین رکھنے والے بھگت بھی بھگت کہلائے جا سکتے ہیں لیکن خصوصی نہیں۔ جب تک ہم مایا

میں رہیں گے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ دویت کا تصور باقی رہے گا، مایا کیا ہے؛ ماحول، وقت اور اسباب یا نام اور روپ۔ جب کوئی مایا سے نجات حاصل کر لیتا ہے تو یک رنگی محسوس ہوتی ہے اور تب وہ نہ تو ادویت کا ماننے والا ہوتا ہے نہ دویت کا۔ اس کے نزدیک تمام کائنات خدا ہوتی ہے۔ آپ کو ایک بھگت اور ایک گیانی کے درمیان جو فرق نظر آتا ہے وہ محض ابتدائی نوعیت کا ہے۔ ایک خدا کو اپنے سے باہر دیکھتا ہے اور دوسرا اپنے اندر۔ لیکن ایک نکتہ اور ہے۔ شری رام کرشن کہا کرتے تھے بھگتی کی ایک اور قسم بھی ہے جس کو پرا بھگتی کہا جاتا ہے یعنی ادویت کا شعور حاصل کرنے اور مکتی پانے کے بعد عشق خدا میں فنا ہو جانا۔ بظاہر یہ بات غیر معمولی ہوتی ہے اور یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسا شخص جو مکت ہو چکا ہے وہ بھگتی کے جذبہ کو برقرار رکھنے کا خواہش مند کیوں رہے؛ اس کا جواب یہ ہے کہ مکت اور آزاد ہر قسم کے قانون سے بالاتر ہوتا ہے۔ اس کے معاملہ میں کسی قانون کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا اور اس لئے اس کے بارے میں کوئی سوال نہیں اٹھایا جا سکتا۔ یہ ان کی مرضی ہے کہ مکت ہونے کے بعد بھی بھگتی کا لطف اٹھاتے رہیں۔

سوال: بچہ کے ساتھ ماں کے پیار کے پیچھے خدا ہو سکتا ہے، یہ نظریہ حیران کن ہے کہ چوروں کی چوری اور طوائفوں کی ان کی گناہ کرنے کی فطری عادتوں کے پیچھے بھی خدا ہوتا ہے! اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح خدا تمام تر نیکیوں اور نیک اعمال کے لئے ذمہ دار ہے اسی طرح وہ بُرے کاموں کے لئے بھی ذمہ دار ہے۔

سوامی جی: احساس اور ادراک کی اعلیٰ ترین منزل پر ضمیر بیدا ہوتا ہے۔ اس وقت ایک شخص کو عشق و محبت اور کشش کی ہر ایک صورت میں خدا ہی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ لیکن اپنے لئے دیکھنے اور محسوس کرنے کے نظریہ کی یہ کیفیت ایک شخص کو اس کی حقیقی زندگی ہی میں حاصل ہو جاتی ہے۔

سوال: لیکن اس کے باوجود یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ خدا گناہ کے پیچھے بھی ہوتا ہے۔

سوامی جی: اگر آپ غور کریں تو حقیقت میں کوئی ایک چیز نہ تو اچھی ہوتی ہے نہ بری۔ یہ محض روایتی اصطلاحات ہیں۔ ایک ہی چیز کو ہم ایک وقت میں اچھا کہتے ہیں اور اسی چیز کو دوسرے وقت میں برا۔ کیونکہ اس کا انحصار اس چیز کے طریق استعمال پر ہے۔ مثال کے طور پر چراغ کو لے لیجئے اس کے جلنے کے سبب سے جو روشنی پیدا ہوتی ہے اس میں ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں اور بہت سے مفید کام کر سکتے ہیں۔ روشنی کے استعمال کا یہ ایک طریقہ ہوا لیکن

اگر آپ اس پر اپنی انگلیاں رکھ دیں تو وہ جل جائیں گی۔ چراغ کے استعمال کا یہ دوسرا طریقہ ہے۔ ہمیں یہ بات جان لینی چاہئے کہ ہر چیز اچھی یا بری اس کے طریق استعمال کے مطابق ہوا کرتی ہے۔ بالکل اسی طرح نیکی اور بدی کا معاملہ ہے۔ موٹے طور پر کہنا چاہئے کہ جسم اور دماغ کے مناسب استعمال کا نام نیکی ہے اور ان کا غلط استعمال اور انہیں ضائع کرنا بدی کہلاتا ہے۔

اس پر یکچے بعد دیگرے سوالات کئے گئے۔ سوامی جی نے ہر ایک سوال کا تسلی بخش طور پر جواب دیا۔ ایک شخص نے کہا کہ یہ تصور کہ جسمانی ملاپ کے پیچھے بھی خدا کارفرما ہوتا ہے، خواہ فی الواقع سچا ہو یا نہ ہو لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تصور میں شاعرانہ نازک خیالی موجود ہے۔

سوامی جی: میرے محترم یہ شاعرانہ نازک خیالی نہیں ہے۔ کوئی بھی شخص گیان حاصل کرنے کے بعد خود اپنا ادراک کر سکتا ہے۔

اس اعتراض کے بارے میں سوامی جی نے اور جو کچھ کہا اسے سنکر میں نے یہ مطلب اخذ کیا مادہ اور روح بظاہر دو مختلف چیزیں دکھائی دیتی ہیں لیکن حقیقت میں وہ ایک ہی جوہر کی دو مختلف شکلیں ہیں۔ بالکل اسی طرح جن مختلف قوتوں سے ہم واقف ہیں خواہ ان کا تعلق مادی دنیا سے ہو یا عالم بالا سے، محض ایک ہی طاقت کے اظہار کی مختلف شکلیں ہیں۔ جس چیز میں ہمیں روح کی قوت کا مظاہرہ کم دکھائی دیتا ہے تو اسے ہم مادہ کہتے ہیں اور جہاں اس کا اظہار زیادہ ہوتا ہے اسے ذی روح۔ لیکن کوئی ایسی شے نہیں ہے جو تمام اوقات اور تمام حالات میں کلی طور پر مادہ ہو۔ وہی چیز جو مادی دنیا میں خوبصورت اور پرکشش دکھائی دیتی ہے احساس کے اعلیٰ ترین روحانی مدارج میں عشق و محبت کی حیثیت سے زیادہ لطیف اور زیادہ دلکش معلوم ہوتی ہے۔

سوال: انفرادی استعمال سے متعلق یہ فرق بھی کیوں ہے۔ آخر آدمی کے اندر اس کی کسی طاقت کے اچھے اور برے استعمال کا یہ رجحان ہی کیوں ہوتا ہے؟

سوامی جی: ایک شخص کے پچھلے کرموں کے پھل کے طور پر یہ رجحان پیدا ہوتا ہے۔ تاہم یہ خود ہر شخص کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے کہ وہ اپنے احساسات پر قابو رکھے اور ان کو غلط سمت میں نہ جانے دے۔

سوال: اگر یہ ہمارے کرموں کا پھل ہے تو اس کی کوئی ابتدا بھی ہوگی تو پھر ابتدائی

میں ہمارے رجحانات اچھے اور برے کیوں تھے؟

سوامی جی: آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ ابتدا ہے۔ سرشٹی (کائنات) کا کوئی آغاز نہیں ہے۔ یہ ویدوں کا عقیدہ ہے جیسے خدا کی ہستی ہے یہ کائنات بھی ہے۔

سوال: بہت خوب جناب! یہ مایا کیوں ہے اور یہ کہاں سے آئی؟

سوامی جی: خدا کے بارے میں کیوں کا استعمال ایک غلطی ہے۔ ہم صرف اسی کے بارے میں اس قسم کا سوال کر سکتے ہیں جو طلب رکھتا ہو یا نامکمل ہو، اس کے بارے میں جو کوئی طلب نہیں رکھتا اور جو ایک "کل" ہے، کیوں لگا کر کوئی سوال نہیں کیا جا سکتا۔ مایا کہاں سے آئی ایسا کوئی سوال نہیں پوچھا جانا چاہئے۔ مایا کیا ہے خدا، زمانہ اور اسباب۔ آپ اور میں ہر ایک اس مایا کے اندر ہے اور آپ پوچھ رہے ہیں کہ مایا سے پرے کیا ہے۔ آپ مایا کے اندر رہتے ہوئے یہ بات کیوں کر جان سکتے ہیں۔

اس کے بعد اور بہت سے سوالات کئے گئے اور گفتگو کا موضوع بدل گیا اور مل، ہملٹن، ہربرٹ، سپینسر کے فلسفوں پر گفتگو ہونے لگی اور سوامی جی نے ان مفکرین کے فلسفوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ سب لوگ مطمئن نظر آتے تھے۔ ہر شخص کو اس بات پر حیرانی تھی کہ مغربی فلسفہ پر اس درجہ عبور رکھتے ہیں کہ ہر ایک سوال کا فوری جواب دیتے جا رہے ہیں۔

بعد ازاں مختلف موضوعات پر مختصر سے تبادلۂ خیال کے بعد سبھا برخاست ہو گئی۔



ڈولینڈ ... لینڈ پارک جہاں سوامی جی نے "نخبار خاطر" ایڈریس کیا۔

# مہاپربھوچیتنیہ

(IV)

سوموار ۲۴ جنوری ۱۸۹۸ء

وہی شریف آدمی جس نے گذشتہ اتوار کو سوامی جی سے سوالات کئے تھے، پھر آیا۔ اس نے مختلف ذاتوں اور فرقوں کے درمیان شادیوں کے موضوع کو چھیڑا اور سوامی جی سے پوچھا" مختلف قوموں کے درمیان شادیوں کو کس طرح رواج دیا جائے؟"

سوامی جی: میں ان اقوام کے ساتھ جو خارجی مذاہب کی پیرو ہیں شادیوں کے لئے مشورہ نہیں دیتا۔ کم سے کم اس وقت اس قسم کی شادیوں سے سوسائٹی اور سماج میں رخنہ پیدا ہوگا اور یہ بات فتنہ و فساد کا سبب بن جائے گی۔ میں جن شادیوں کے بارے میں مشورہ دیتا ہوں وہ ایک ہی مذہب کو ماننے والوں کے درمیان ہونی چاہئیں۔

سوال: اس صورت میں بھی الجھاؤ اور پیچیدگی پیدا ہوگی۔ فرض کیجئے کہ میری ایک لڑکی ہے جو کہ بنگال میں پیدا ہوئی اور یہیں وہ پلی بڑھی اور میں نے ایک مراٹھی یا ایک مدراسی

---

یہ مضمون بھی شری سریندر ناتھ سین کی پرائیویٹ ڈائری سے لیا گیا ہے جس میں انہوں نے ایک ورن کے مختلف طبقوں کے درمیان شادیوں کے متعلق اظہار کیا ہے

---

کے ساتھ اس کی شادی کر دی تو نہ تو شوہر بیوی کی زبان کو سمجھ سکے گا اور نہ بیوی شوہر کی زبان کو، پھر ان کی انفرادی جبلّتوں اور رسوم و رواج میں بہت بڑا فرق ہے۔ اس قسم کی شادیوں میں یہ مشکلات پیش آئیں گی اور پھر جہاں تک سوسائٹی اور سماج کا تعلق ہے وہ درہم وبرہم ہو جائیگی۔

سوامی جی: وہ وقت ابھی بہت دور ہے جب اس قسم کی شادیاں عام طور پر ممکن ہوں گی، علاوہ ازیں ایک دم اس حد تک آگے بڑھ جانا قرینِ انصاف نہ ہوگا۔ کام کرنے کا ایک راز یہ ہے کہ اس طرح آگے بڑھا جائے کہ اس کی کم سے کم مخالفت ہو۔ پس سب سے پہلے ہمیں ایک ہی ذات کے لوگوں کے درمیان آپسی شادیوں کو رواج دینا چاہیئے۔ مثال کے طور پر بنگال کے کایستھوں کو لیجئے۔ انکے مختلف فرقے ہیں۔ جیسے اتر راہی، دکشن راہی، بن گج، وغیرہ وغیرہ۔ ان فرقوں میں ایک دوسرے کے یہاں شادیاں نہیں ہوتیں۔ اب اتر راہی اور دکشن راہی فرقوں کے درمیان شادیاں ہوتی چاہئیں اور اگر فی الحال یہ بات ممکن نہیں ہے تو دکشن راہی اور بن گج فرقوں کے درمیان ایسی شادیوں کو رواج دیا چاہیئے۔ اس طرح ہم اس چیز کو ترقی دیں گے جو پہلے ہی سے موجود ہے اور جس پر عمل کرنا ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہے، اصلاحات کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پورے سماج کو درہم وبرہم کر دیا جائے۔

سوال: بہت خوب! آپ درست فرماتے ہیں ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ لیکن اس کی افادیت کیا ہے؟۔

سوامی جی: کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ہمارے سماج کے اندر ایک ذات کے مختلف فرقوں میں صدیوں سے یہ رواج چلا آرہا ہے کہ ایک فرقہ کے اندر ہی ایسی شادیاں ہوتی ہیں، اس کے نتیجہ میں آج جو نازک حالت پیدا ہوگئی ہے اس کا مطلب حقیقت میں چچیرے اور ممیرے بھائی بہنوں اور قریبی عزیزوں کے درمیان ازدواجی تعلقات کا قیام ہے۔ اور کس طرح اس مخصوص وجہ سے ہماری نسل جسمانی طور پر کمزور ہوتی جارہی ہے اور نتیجہ میں ہر قسم کے امراض اور برائیاں اس کے اندر گھر کرتی جارہی ہیں۔ افراد کی ایک محدود تعداد کے حلقہ کے اندر ہو جزن خون فاسد ہوتا جارہا ہے۔ اس طرح نوزائیدہ بچوں میں پیدائش کے بعد ہی سے ان کے والدین کے خاندانی امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ پس اس طرح پیدا ہونے والے بچوں کے اندر کسی بیماری کے جرثوموں کا مقابلہ کرنے کی بہت کم صلاحیت باقی رہتی ہے جو انہیں ہمیشہ مالِ غنیمت سمجھتے ہیں، ہم اپنی نسل کے اندر شادیوں کے دائرہ کو وسیع کر کے ہی نیا اور مختلف قسم کا خون لا سکتے ہیں تاکہ وہ ہماری

بہت سی آج کی بیماریوں اور ایسی ہی دوسری خرابیوں سے خودکو محفوظ رکھ سکے۔

سوال: مہاراج جی! کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ کم عمری کی شادی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟۔

سوامی جی: بنگال میں تعلیم یافتہ طبقہ کے اندر اپنے لڑکوں کی کم عمری میں شادیاں کرنے کا رواج بتدریج کم ہورہا ہے۔ لڑکیوں کی شادیاں بھی اب پہلے کے مقابلہ میں ایک دو سال بعد ہوتی ہیں۔ لیکن ایسا مالی ضرورت سے مجبور ہوکر کیا جارہا ہے۔ اس کی وجہ خواہ کچھ بھی ہو لڑکیوں کی شادیاں اور زیادہ عمر میں کی جانی چاہئیں۔ لیکن ایک غریب باپ کیا کرے؟ جیسے ہی لڑکی تھوڑی بڑی ہوتی ہے ماں سے لیکر رشتہ دار عورتوں تک ہر ایک عورت یہاں تک کہ پڑوسی عورتیں بھی یہ تقاضہ شروع کر دیتی ہیں کہ باپ کو لڑکی کے لئے بر تلاش کرنا چاہئے۔ اور جب تک وہ ایسا کر نہیں لیتا اس کو آرام سے نہیں بیٹھنے دیتیں۔ اور آپ کے مذہبی بگلا بھگتوں کے بارے میں تو جس قدر کم کہا جائے اسی قدر بہتر ہے۔ اس زمانہ میں کوئی ان کی پروا نہیں کرتا ہے تاہم اس کے باوجود ابھی وہ خود کو راہ نما تصور کئے ہوئے ہیں۔ حکومت نے ( Age of Consent Bill ) پاس کیا جس کے تحت بارہ برس کی لڑکی کے ساتھ شادی ممنوع قرار دیدی گئی اور خلاف ورزی کرنے والے کو سزا تجویز کی گئی اور فوراً ہی آپ کے مذہب کے ان نام نہاد پیشواؤں نے اس کے خلاف شدید شور وغل مچانا شروع کر دیا اور یہ نعرہ لگانا شروع کر دیا: "افسوس ہمارا دھرم مٹایا جارہا ہے"۔ گویا کہ ایک بارہ تیرہ برس کی لڑکی کو ماں بنا دینا ہی مذہب ہے! پس قدرتی طور پر حکومت کے ارباب اقتدار حیرت اور استعجاب کے ساتھ یہ سوچتے ہیں۔ ان کا مذہب کیا ہے! اور یہ لوگ سیاسی ایجی ٹیشن چلاتے ہیں اور سیاسی حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں!

سوال: تب آپ کے خیال میں مردوں اور عورتوں دونوں کی شادیاں بڑی عمر میں ہونی چاہئیں۔

سوامی جی: یقینی طور پر۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ان کو تعلیم دی جانی چاہیئے ورنہ دوسری صورت میں غلط کاریاں اور کورپشن پھوٹ پڑے گا۔ تعلیم سے میری مراد وہ تعلیم نہیں ہے جو کہ آجکل دی جارہی ہے بلکہ مثبت قسم کی تعلیم سے ہے۔ بعض کتابیں پڑھنے سے یہ مقصد پورا نہیں ہوگا۔ ہم ایسی تعلیم چاہتے ہیں جس سے کردار کی تعمیر ہوتی ہے، دماغ کی قوت میں اضافہ

ہوتا ہے ذہانت بڑھتی ہے اور جسے حاصل کر کے ہر شخص خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاتا ہے۔

سوال: ہمیں بہت سے طریقوں سے اپنی خواتین کی اصلاح کرنی ہے۔

سوامی جی: اس قسم کی تعلیم حاصل کر کے خواتین اپنے مسائل کو خود حل کر لیں گی۔ انہیں ہمیشہ یہ بتایا گیا ہے کہ وہ بے بس ہیں ان کی زندگی کا انحصار دوسروں پر ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ جب بھی انہیں کوئی پریشانی لاحق ہوتی ہے یا کسی خطرہ کا سامنا ہوتا ہے تو وہ رونا شروع کر دیتی ہیں۔ دوسری چیزوں کے علاوہ جو انہیں حاصل کرنی چاہئیں ان کے اندر حوصلہ اور بہادری کا جذبہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس زمانہ میں ان کے لئے یہ بات بھی ضروری ہو گئی ہے کہ وہ خود اپنا دفاع کرنا سیکھیں۔ سوچئے جھانسی کی رانی کس قدر عظیم تھی۔

سوال: آپ کا مشورہ قطعی نیا ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ اس طریقہ پر ہمیں اپنی خواتین کو تربیت دینے کے لئے ایک عرصہ درکار ہوگا۔

سوامی جی: کچھ بھی ہو ہمیں بھرپور کوشش کرنی ہے۔ ہمیں صرف انہیں کو تعلیم نہیں دینی ہے بلکہ خود کو بھی تعلیم دینی ہے۔ محض بچے پیدا کرنے ہی سے ایک شخص باپ نہیں بن جاتا۔ اس کے کاندھوں پر اور بہت سی عظیم ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جن کو اسے پورا کرنا ہوتا ہے۔ شروع میں ہم اپنی عورتوں کو بتائیں کہ عصمت و عفت کیا ہے۔ ہماری ہندو خواتین پاک دامنی کا مفہوم بخوبی سمجھتی ہیں کیونکہ یہ ان کی میراث ہے۔ سب سے پہلے ہمیں ان کے اندر اس کا تصور پیدا کرنا چاہیئے تاکہ اس کی قوت سے وہ ایک مضبوط کردار کی تعمیر کر سکیں اور اپنی زندگی کے کسی مرحلہ میں، خواہ وہ شادی شدہ ہوں یا اپنی مرضی سے غیر شادی شدہ رہنا پسند کریں قطعی خوف زدہ نہ ہوں۔ یہاں تک کہ اپنی عصمت و عفت کو ہاتھ سے جانے دینے کے مقابلے میں اپنی جانوں کو قربان کرنے کو ترجیح دیں۔ ایک شخص اپنے نظریہ کی خاطر خواہ وہ نظریہ کیسا ہی کیوں نہ ہو اپنی جان تک قربان کر دے، کیا یہ کم بہادری ہے؟ موجودہ دور کے تقاضوں کے پیش نظر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنی کچھ عورتوں کو نفس کشی کے نظریہ کی تربیت دیں تاکہ وہ پاک دامنی کی اس قوت سے جو کہ پیدائشی طور پر انہیں ان کے بزرگوں سے ورثہ میں ملا ہے جرأت حاصل کر کے عمر بھر کنوارا رہنے کا اقرار صالح کر سکیں۔ اسی کے ساتھ انہیں مختلف دوسرے علوم کی تعلیم دی جانی چاہیئے اور ایسی چیزیں سکھائی جانی چاہئیں جو نہ صرف ان کے لئے بلکہ دوسروں کے لئے بھی مفید ہوں۔ ان کی افادیت کو جاننے کے بعد وہ نہ صرف ان چیزوں اور علوم کو سیکھیں گی بلکہ ایسا

کرنے سے انہیں خوشی حاصل ہوگی۔ ہماری مادر وطن کو اپنی ترقی اور خوشحالی کے لئے اپنے ایسے چند بچوں کی ضرورت ہے جو کہ خالص روح والے برہم چاریہ اور برہم چارنیں بن سکیں۔

سوال: اس سے کس طرح مادر وطن کی ترقی اور خوشحالی میں امداد مل سکتی ہے؟

سوامی جی: جب یہ مثالی زندگی گذاریں گے اور لوگوں کے گناہوں کے سامنے قومی نظریات پر کاربند رہنے کا مظاہرہ کریں گے تو اس سے خیالات اور جذبات میں ایک طوفان آجائے گا۔ اس وقت معاملات کیا ہیں ؟ کسی نہ کسی طرح والدین کو اپنی لڑکی کی شادی نو دس برس کی عمر میں کردینی ہوتی ہے! اور اگر تیرہ برس کی عمر میں لڑکی ماں بن جائے تو پورا خاندان کس طرح خوشیاں مناتا ہے۔ اگر ایسے تصورات کو بدل دیا جائے تبھی اس پرانی شردھا کے لوٹ آنے کی کچھ توقع ہوسکتی ہے۔ اور ان لوگوں کی تو بات ہی کیا ہے جو متذکرہ بالا طریقہ پر برہم چاریہ بنیں گے ذرا سوچئے کہ ان کو خود پر کتنا اعتماد ہوگا اور بھلائی کی کس قدر شکتی ان کے اندر ہوگی۔

جو صاحب سوال کر رہے تھے وہ اب جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے سوامی جی کو پرنام کیا۔ سوامی جی نے ان سے کہا کہ وہ گاہ بگاہ آتے رہا کریں۔ ان صاحب نے جواب دیا یقیناً میں آیا کروں گا۔ میں نے آپ کی صحبت میں بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ میں نے آپ سے بہت سی نئی باتیں سنی ہیں جو اس سے قبل میں نے کہیں نہیں سنیں۔ میں بھی اپنے گھر روانہ ہوگیا کیونکہ اس وقت رات کے کھانے کا وقت ہوچکا تھا۔

V

سوموار ۲۴ جنوری ۱۸۹۸ء

دوپہر بعد میں پھر سوامی جی کے پاس پہنچا۔ میں نے دیکھا بہت سے لوگ سوامی جی کے اردگرد جمع تھے۔ موضوع بحث تھا مدھر بھاؤ یا شوہر کی حیثیت سے خدا کی پوجا۔ جیسا کہ شری چیتنیہ مہا پربھو کے کچھ پیروؤں میں اس کا رواج ہے، سوامی جی بھی کبھی کبھار چٹکلے سنا دیتے تھے

---

یہ مضمون بھی شری سریندر ناتھ سین کی پرائیویٹ ڈائری سے اخذ کیا گیا ہے جس میں مدھر بھاؤ، پریم اور نام کیرتن کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے

---

جنہیں سنکر سب لوگ ہنس پڑتے تھے کہ ایک شخص نے کہا۔ آخر شری چیتنیہ کے طرز عمل میں ایسی کیا بات ہے کہ اس طریقہ پر اس کا مذاق اڑایا جائے؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ مہارشی نہیں تھے اور کیا انہوں نے بنی نوع انسان کی بھلائی کے لئے کوئی کام نہیں کیا؟

سوامی جی: مذاق کون اڑاتا ہے؟ میرے محترم! کیا میں آپ کا مذاق اڑاؤں؟ آپ کو اس میں تضحیک کا پہلو نظر آتا ہے، کیا آپ کو نظر آتا ہے؟ لیکن آپ کو میری تمام تر زندگی کی وہ جدوجہد نظر نہیں آتی کہ جس کے ذریعہ میں نے اپنی زندگی کو ترک ہوائے نفس اور ترک دنیا کے ان کے جوش انگیز تصور کے مطابق ڈھالا ہے۔ آپ میری ان کوششوں کو نہیں دیکھتے جو میں ان کے نظریات کو زیادہ سے زیادہ عوام تک پہنچانے کے لئے کر رہا ہوں۔ شری چیتنیہ نفس کشی کے ایک عظیم علمبردار تھے۔ ان کے یہاں عورت یا نفسانی خواہش کا کوئی تصور نہیں تھا لیکن بعد کے آنے والے زمانہ میں ان کے چیلوں نے لاشعوری طور پر عورت کو ان کے تصور میں شامل کر دیا اور پورے تصور کو وحشت ناک خلط مبحث میں ڈالدیا۔ شری چیتنیہ نے اپنی حیات میں عشق و محبت کے جس فلسفہ کو اختیار کیا وہ قطعی طور پر بے غرضانہ تھا اس میں ہوائے نفس کو کوئی دخل نہیں تھا۔ لاجنس عشق و محبت عوام کے بس کا روگ نہیں ہے۔ لیکن بعد کو ہونے والے ویشنو گوروؤں نے بجائے اس کے کہ وہ بھگوان کی زندگی میں نفس کشی کے پہلو پر سب سے پہلے اور خاص طور پر زور دیتے، انہوں نے عام لوگوں کے اندر عشق و محبت کے ان کے تصور کو پھیلایا اور اس کی تلقین پر اپنا تمام تر جوش صرف کر دیا، اور نتیجہ یہ نکلا کہ عام لوگ عشق الہٰی کے نظریہ کو تو نہ سمجھ سکے بلکہ قدرتی طور پر عورت اور مرد کے درمیان بدترین پریم کی شکل پیدا ہوگئی۔

سوال: لیکن جناب انہوں نے سب کو یہاں تک کہ چنڈالوں تک کو بھگوان ہری کے نام کی تلقین کی۔ پس عام آدمیوں کو اس پر کوئی حق کیوں نہیں ہے؟۔

سوامی جی: میں تعلیم کی بات نہیں کر رہا ہوں بلکہ ان کے عشق و محبت کے عظیم تصور "رادھا پریم"[1] کی بات کر رہا ہوں کہ جس میں وہ رادھا میں اپنی انفرادیت کو گم کر کے رات دن بیخود رہتے تھے۔

سوال: ایسا عام لوگ کیوں نہیں کر سکتے؟

---

[1] رادھا کا سری کرشن جی کے ساتھ جو عشق الہٰی تھا۔

سوامی جی: اس قوم پر نگاہ ڈالیۓ اور دیکھئے کہ ایسی کوشش کا نتیجہ کیا نکلا ہے۔ اس عشق و محبت کی تعلیم کے نتیجہ میں پوری قوم بوالہوس بن گئی ہے۔ عورتوں کی نسل بن گئی ہے۔ پورا اڑیسہ بزدلوں کی آماجگاہ میں تبدیل ہوگیا ہے۔ بنگال گذشتہ چار سو برس میں رادھا پریم کے پیچھے دوڑنے کے بعد مردانگی کے تمام جوہروں کو کھو چکا ہے۔ لوگ صرف چیخنے اور چلانے کے مطلب کے رہ گئے ہیں اور یہ ان کی قومی خصلت بن گئی ہے۔ ان کے ادب کو پڑھئے جو ایک قوم کے افکار اور نظریات کا آئینہ دار ہوا کرتا ہے۔ بنگالی ادب کی تان ان چار سو برسوں میں آہ و نالہ پر کیوں ٹوٹتی ہے؟ بنگالی ادب میں کوئی ایسی نظم تخلیق نہیں کی گئی کہ جو حقیقی دلیرانہ جذبات کی مظہر ہو!۔

سوال: تب اس پریم و عشق و محبت کے صحیح معنوں میں مستحق کون لوگ ہیں؟۔

سوامی جی: جب تک دل میں ہوائے نفس یا نفسانی خواہشات کا معمولی سا شائبہ بھی باقی ہے عشق و محبت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ عشق الٰہی کا حق صرف ان لوگوں کو پہنچتا ہے جو نفس کشی کرتے ہیں۔ انسانوں میں مہا پربھو چیتنیہ اعلیٰ ترین انسان تھے۔ مجسم خدا تھے۔

اگر عوام کو عشق و محبت کے اعلیٰ ترین تصور کی ترغیب دی جائے تو بالواسطہ طور پر یہ دنیاوی عشق و محبت کی صورت اختیار کرلے گا کہ جو انسانی دل پر غالب ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر کوئی کسی کو خدا کی بیوی یا محبوبہ تصور کرتے ہوئے عشق الٰہی کا مراقبہ کرے تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ مراقبہ کرنے والا زیادہ تر خود اپنی بیوی کے بارے میں ہی سوچتا رہے گا اور اس کا نتیجہ جو کچھ بھی نکل سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔

سوال: اس کا مطلب یہ ہوا کہ گھر گرہستی والوں کے لئے عشق و محبت کی راہ پر چل کر عرفان الٰہی حاصل کرنا اور خود کو اس کی بیوی تصور کرتے ہوئے شوہر کی حیثیت سے خدا کی پرستش کرنا ناممکن ہے۔

سوامی جی: کچھ مستثنیات ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عام حیثیت کے گھر گرہست کے لئے یہ ناممکن ہے اور پھر دوسرے طریقوں کو چھوڑ کر اس پیچیدہ طریقہ کو اختیار ہی کیوں کیا جائے۔ کیا عشق الٰہی کے اس "مدھر" تصور کے علاوہ اور راستے نہیں ہیں کہ جن سے خدا کی پرستش کی جائے؟ چار دوسرے طریقوں پر عمل کیوں نہیں کرتے! اور صدق دلی کے ساتھ خدا کے تصور میں کیوں نہیں ڈوب جاتے۔ سب سے پہلے اپنے دلوں کو کشادہ کیجئے اس کے بعد تمام مرحلے

خود بخود طے ہونے لگیں گے۔ لیکن ایک بات یقینی طور پر سمجھ لیجئے کہ جب تک دلوں کے اندر نفسانی خواہشات کی ایک رمق بھی موجود ہے، جذبہ عشق ومحبت پیدا نہیں ہو سکتا۔ سب سے پہلے آپ نفس امّارہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ آپ کہیں گے یہ کس طرح ممکن ہے۔ میں ایک گھر گرہست ہوں، احمقانہ بات ہے۔ چونکہ ایک شخص گھر گرہست ہے، اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ نفس پرستی کا پتلا ہے یا وہ اپنی تمام زندگی ازدواجی تعلقات کی زندگی گذارتا ہے اور بایں ہمہ کس قدر نازیبا ہے کہ ایک شخص مدھر پریم کے تصور پر عمل کرنے کے لئے خود کو ایک عورت تصور کرے۔!

سوال: مہاراج! آپ نے درست فرمایا ہے کہ نام کیرتن میں پربھو کے ساتھ لو لگانا اور اس کے نام کو جپنا ایک بہترین عمل ہے اور اس لو لگانے والے کو بہترین روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ آپ کے شاشتروں میں یہ طریقہ ہے اور شری چیتنیہ نے بھی لوگوں کو ایشور کی طرف رغبت دلانے کے لئے اس طریقہ کو اپنایا تھا۔ جب ڈھولک بجتی ہے تو دل احساس مسرت سے اس درجہ تڑپ جاتا ہے کہ انسان ناچے بغیر نہیں رہ سکتا۔

سوامی جی: یہ بالکل صحیح ہے لیکن یہ نہ سمجھیئے کہ کیرتن کا مطلب محض ناچنا ہے۔ اس کا مطلب خدا کی عظمت کے گن گانا ہے۔ خواہ ایسا کرنے کے لئے کوئی طریقہ بھی آپ استعمال کریں کیرتن میں جذبات شدید ہو جاتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وشنوؤں کا یہ طریقہ اچھا ہے اور پرکشش بھی ہے لیکن اس پر عمل میں خطرات بھی مضمر ہیں جن سے آپ کو خود اپنے آپ کو محفوظ رکھنا ہے۔ خطرات اس کے رد عمل میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ایک طرف اس سے احساسات بہت شدید ہو جاتے ہیں آنکھیں زار و نزار بہہ نکلتی ہیں اور سر بے خودی کی کیفیت میں جھومنے لگتے ہیں۔ دوسری طرف جیسے ہی کیرتن ختم ہوتا ہے احساسات اور جذبات کا طوفان اسی تیزی کے ساتھ بیٹھ جاتا ہے کہ جس تیزی کے ساتھ یہ چڑھا تھا۔ سمندر میں جس قدر تیزی کے ساتھ لہر اٹھتی ہے اسی قدر تیزی کے ساتھ وہ بیٹھ جاتی ہے۔ ایسے حالات میں ایک شخص کے لئے مشکل ہوتا ہے کہ وہ رد عمل سے خود کو محفوظ رکھ سکے جب تک کہ وہ اس کے لئے مناسب شعور نہ رکھتا ہو۔ ایک شخص کا نفس پرستی کے عامیہ میلان کی طرف بہہ جانا عین ممکن ہے۔ میں نے بالکل اسی قسم کے نظارے امریکہ میں دیکھے ہیں . . . . . بہت سے لوگ چرچ جاتے ہیں بھگتی کے ساتھ عبادت کرتے ہیں اور گہرے جذبات کے ساتھ خدا

کی حمد وثنا کرتے ہیں یہاں تک کہ جب بائیبل کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو زار وقطار رونے لگتے ہیں۔ لیکن جیسے وہ پھر چرچ کے باہر آتے ہیں تو ان پر سخت ردعمل ہوتا ہے اور وہ نفسانی خواہشات کا شکار ہو جاتے ہیں۔

سوال: تب جناب آپ ہی ہمیں بتائیں کہ شری چیتنیہ نے ہمیں جن نظریات کی تعلیم دی ہے ان میں سے کس نظریہ کو ہم اختیار کریں اور کون سا نظریہ ہمارے لئے موزوں ہے، تاکہ ہم غلط راہ پر نہ پڑ جائیں۔

سوامی جی: بھگتی کے ساتھ جس میں گیان کا امتزاج ہو خدا کی پرستش کیجیئے۔ علاوہ ازیں اپنے اندر شری چیتنیہ جیسا دل اور تمام مخلوق کے ساتھ ان جیسی محبت اور خدا کے لئے ان جیسے شدید جذبات پیدا کیجیئے اور ان کی نفس کشی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیجئے۔

سوال کنندہ نے اس مرحلہ پر ہاتھ جوڑ کر سوامی جی کو پرنام کیا اور کہا "جناب میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔ اب میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ آپ درست فرماتے ہیں۔ مزاحیہ انداز میں وشنوؤں کے مدھر پریم کے بارے میں آپ کی باتیں پہلے میری سمجھ میں نہیں آئی تھیں تاہم میں اپنے عمل کے لئے معذرت خواہ ہوں۔"

سوامی جی: آپ غور کریں کہ اگر ہمیں نکتہ چینی ہی کرنی ہے تو یہ اچھا ہے کہ نکتہ چینی خدا یا خدارسیدہ بزرگوں پر کی جائے۔ اگر آپ مجھے برا بھلا کہیں گے تو ہو سکتا ہے میں آپ سے ناراض ہو جاؤں اگر میں آپ کو برا بھلا کہوں تو آپ مجھ سے بدلہ لینے کی کوشش کریں گے۔ کیا یہ بات درست نہیں ہے؟ لیکن خدا اور خدارسیدہ بزرگ برائی کا جواب برائی سے نہیں دیا کرتے۔

اس کے بعد وہ شخص سوامی جی کے چرن چھونے کے بعد وہاں سے چلا گیا۔ میں پہلے بھی تذکرہ کر چکا ہوں کہ سوامی جی کے کلکتہ کے زمانۂ قیام میں اس قسم کے اجتماعات روزانہ ہی رہا کرتے تھے۔ صبح سویرے سے لے کر رات کے آٹھ نو بجے تک ہر وقت لوگ ان کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ قدرتی طور پر اس وجہ سے ان کے کھانے کے اوقات میں کافی خلل پڑتا تھا پس بہت سے سوامی جی کے پریمی چاہتے تھے کہ یہ صورت حال ختم ہو۔ انہوں نے سوامی جی سے درخواست کی کہ وہ صرف مقررہ اوقات ہی میں لوگوں سے ملاقاتیں کیا کریں۔ لیکن سوامی جی

نے جو کہ ایک درد مند دل رکھتے تھے اور دوسروں کو زیادہ سے زیادہ سہارا دینے کی کوشش کرتے تھے اور مذہب کے لئے لوگوں کے اندر پیاس کو دیکھ کر بے تاب ہوجایا کرتے تھے۔ . . . . .

کسی ایسی درخواست کو منظور نہیں کیا۔ حالانکہ ان کی صحت اچھی نہیں تھی۔ ان کا یہی جواب ہوتا تھا۔ "وہ اپنے گھروں سے چل کر، پریشانی اٹھا کر یہاں آتے ہیں تو کیا میں جو یہاں بیٹھا ہوں صرف اپنی صحت کے خیال سے ان کے ساتھ چند باتیں بھی نہ کروں؟"

چار بجے کے قریب عام بات چیت ختم ہوئی اور مجمع برخاست ہوگیا۔ صرف چند لوگ بیٹھے رہے جن کے ساتھ سوامی جی مختلف موضوعات پر جیسے انگلینڈ اور امریکہ وغیرہ گفتگو فرماتے رہے۔ بات چیت کے دوران انہوں نے کہا۔

"انگلینڈ سے اپنی واپسی کے وقت میں نے ایک عجیب وغریب خواب دیکھا۔ جب ہمارا جہاز بحر روم سے گذر رہا تھا تو ایک روز سوتے ہوئے میں نے خواب دیکھا کہ ایک بزرگ صورت معمر آدمی جو بظاہر رشی معلوم ہوتا تھا میرے سامنے کھڑا ہوا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کیا تم ہمارے احیا کو عمل میں لانے کے لئے آئے ہو؟ میں تھیراپونیٹی کے قدیم راہبوں میں سے ایک ہوں جن کا سلسلۂ نسب ہندوستان کے قدیم رشیوں سے ملتا ہے۔ ہم نے جن حقائق اور نظریات کی تعلیم دی ان کو عیسائیوں نے مسیح کی تعلیمات قرار دے رکھا ہے۔ لیکن جہاں تک اس تعلیم کا تعلق ہے مسیح کے نام کا کوئی شخص پیدا نہیں ہوا جس نے یہ تعلیم دی۔ یہاں پر آثار قدیمہ کی کھدائی کے بعد بہت سے ایسے ثبوت ملیں گے جن سے اس حقیقت کی تصدیق ہو جائے گی۔ میں نے پوچھا جن ثبوتوں اور یادگاروں کے بارے میں آپ کہہ رہے ہیں وہ کس جگہ کی کھدائی کے بعد دستیاب ہو سکتی ہیں۔ اس بزرگ صورت شخص نے ترکی کے قرب وجوار کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے فوراً بعد میری آنکھ کھل گئی اور میں تیزی کے ساتھ جہاز کے عرشہ پر گیا جہاں میں نے جہاز کے کپتان سے پوچھا ہمارا جہاز اس وقت کس علاقہ سے گذر رہا ہے۔ کپتان نے کہا کہ "ہم اس وقت ترکی اور یونان کے علاقوں سے گذر رہے ہیں۔"

کون جانتا ہے کہ یہ محض ایک خواب تھا یا القا؟



# تقلیدِ درویش

VI

ہمارا مکان سوامی جی کے مکان کے قریب تھا اور چونکہ ہم شہر کے ایک ہی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اس لئے میں اکثر ان کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ بچپن ہی سے مجھے ان کے ساتھ ایک خاص لگاؤ تھا اور میں سنجیدگی کے ساتھ یہ یقین رکھتا تھا کہ وہ ایک بڑا آدمی بنیں گے۔ جب وہ سنیاسی ہوگئے تو ہم نے سوچا کہ ہم نے ایک ایسے آدمی کے لئے امتیازی ترقی کی توقعات وابستہ کی تھیں وہ سب ضائع ہوگئیں۔

---

یہ مضمون شری پریہ ناتھ سنہا نے لکھا ہے۔ اس میں سوامی جی نے مختلف مسائل اور معاملات پر اظہار خیال کیا۔ آپ نے ہندوستان میں قحط کے مسائل اور بے لوث کارکنوں اور مشرق اور مغرب کے فرق، ستو کیا ہے "تامس کیا ہے" دریوزہ گروں کی قوم۔ موالادونی پالیسی۔ آدمی سے اس کے نقائص براہ راست بیان کیجئے لیکن اس کی اچھائیوں کا دوسروں کے سامنے تذکرہ کیجئے۔ ہر شخص وویکانند بن سکتا ہے۔ غیر مغلوب برہم چاریہ قوت کا راز ہے سمادھی اور کام کے بارے میں حسب ذیل باتیں فرمائیں۔

---

بعدازاں جب وہ امریکہ گئے اور میں نے اخبارات میں ان کی ان تقریروں سے متعلق رپورٹیں پڑھیں جو انہوں نے شکاگو کی مذہبی پارلیمنٹ اور امریکہ کے دوسرے مقامات پر کی تھیں تو مجھے خیال ہوا کہ آگ کو کپڑے سے ڈھانک کر دبایا نہیں جا سکتا۔ سوامی جی کے اندر جو آگ تھی وہ اب شعلوں میں تبدیل ہو چکی تھی۔ کلی اتنے برسوں کے بعد کھل کر پھول بن چکی تھی۔

ایک مدت کے بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ ہندوستان واپس آگئے ہیں اور مدراس میں شعلہ نوا تقریریں کر رہے ہیں۔ میں نے ان تقریروں کو پڑھا۔ میں حیران تھا کہ ہندو مذہب کے اندر اس قدر اعلیٰ وارفع صداقتیں موجود ہیں اور یہ کہ ان کو اس قدر وضاحت کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے۔ کیا ہی غیر معمولی قوت ان کے اندر ہے! کیا وہ ایک انسان ہیں یا خدا؟

جب سوامی جی کلکتہ آئے تو وہاں عظیم جوش وخروش پھیل گیا۔ کوسی پور میں گنگا کے کنارے واقع (Sil's garden-house, شل کی کوٹھی) تک ہم ان کے پیچھے پیچھے گئے۔ چند روز بعد انہوں نے راجہ رادھا کانتا دیو کے مکان پر استقبالیہ کا جواب دیتے ہوئے عوام کے ایک عظیم اجتماع سے روح پرور خطاب کیا۔ اہالیانِ کلکتہ نے ان کی تقریر پہلی بار سنی شہر بھر میں ان کے تذکرے عام ہو گئے۔ لیکن ان حقائق کا علم سبھی کو ہے۔

ان کے کلکتہ آنے کے بعد میں اس بات کا بہت آرزومند تھا کہ ان کے ساتھ تنہائی میں ملاقات کروں اور بے تکلفی کے ساتھ ان سے بات چیت کروں۔ جیسے کہ ہم دونوں بچپن میں بات چیت کیا کرتے تھے۔ لیکن ان کے گرد ہمیشہ معلومات حاصل کرنے کے خواہش مندوں کا مجمع لگا رہتا تھا اور مسلسل بات چیت کا سلسلہ جاری رہا کرتا تھا۔ پس مجھے ایک عرصہ تک تنہائی میں ان کے ساتھ بات چیت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ایک روز ہم گنگا کے کنارے واقع باغ میں چہل قدمی کے لئے چلے گئے۔ انہوں نے ایک دم اس طرح بات چیت شروع کر دی جس طرح وہ اپنے بچپن میں مجھ سے باتیں کیا کرتے تھے۔ ابھی ہمارے درمیان صرف چند باتیں ہی ہوئی تھیں کہ لوگ انہیں بلانے کے لئے بار بار آنے لگے اور انہیں اطلاع دینے لگے کہ چند اصحاب تشریف لائے ہیں اور ان سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ آخر کار وہ قدرے ناراض ہو گئے اور انہیں بلانے کے لئے آنے والے پیغامبر سے کہا "مجھے تھوڑی سی مہلت دو میرے بیٹے! مجھے اپنے بچپن کے اس ساتھی کے ساتھ چند باتیں کرنے دو۔ تھوڑی دیر کے لئے مجھے کھلی ہوا

---

میں رہنے دو۔ جو لوگ آئے ہیں جا کر ان کا خیر مقدم کرو اور ان سے کہو کہ وہ تشریف رکھیں۔ انہیں تمباکو پیش کرو اور درخواست کرو کہ وہ تھوڑی دیر توقف کریں"۔

جب ہم پھر تنہا رہ گئے تو میں نے ان سے پوچھا۔ سوامی جی آپ ایک سادھو ہیں۔ یہاں کلکتہ میں آپ کے استقبال کے سلسلے میں چندہ جمع ہوا۔ اس ملک کے اندر قحط کے پیش نظر میرا خیال تھا کہ آپ کلکتہ میں اپنی آمد سے قبل تار کے ذریعہ اطلاع دیں گے کہ "میرے استقبال پر ایک پیسہ بھی صرف نہ کریں بلکہ پوری رقم کو قحط ریلیف فنڈ میں دیدیں"۔ لیکن میں نے دیکھا کہ آپ نے اس قسم کا اقدام نہیں کیا۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟۔

سوامی جی: میں ایسا کیوں کرتا۔! بلکہ اس کے برعکس میری خواہش تھی کہ عظیم جوش و خروش پیدا کیا جانا چاہئے۔ کیا آپ نہیں سمجھتے کہ کسی اس قسم کے اقدام کے بغیر لوگ شری رام کرشن کی طرف کھنچ کر کیسے آ سکتے تھے اور کیسے ان کے اندر شری رام کرشن کے نام پر جوش پیدا کیا جا سکتا تھا؟ کیا یہ استقبال ذاتی طور پر میرے لئے ہوا ہے یا کیا اس سے ان کے نام کو شہرت نہیں ملی۔ دیکھ لیجئے کہ لوگوں کے اندر ان کے بارے میں واقفیت حاصل کرنے کے لئے کس قدر تڑپ پیدا ہو گئی ہے!۔ اب لوگ انہیں آہستہ آہستہ جان جائیں گے کیا یہ بات ملک کے مفاد میں نہیں ہے؟ جو ذات ملک کی فلاح و بہبود کے لئے وجود میں آئی تھی اگر لوگ اسے نہیں جانیں گے تو ان کا بھلا کس طرح ہو گا؟ لوگ جب سمجھ جائیں گے کہ حقیقت میں ان کی ہستی کیا تھی تو پھر حقیقی مرد اور حقیقی عورتیں پیدا ہوں گی اور جب یہاں ایسے لوگ ہوں گے تو پھر ملک سے قحط وغیرہ کو دور کرنے میں کتنا وقت لگے گا؟ اسی لئے میں نے کہا کہ اس کے برعکس میری خواہش تھی کہ کلکتہ میں شور اور ہنگامہ ہوتا کہ لوگ سوامی رام کرشن مشن پر یقین کرنے کی طرف مائل ہو سکیں ورنہ میری خاطر اس قدر تزک و احتشام برپا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ مجھے اس قسم کی باتوں کی کیا ضرورت ہے؟ کیا اب میں اس کے مقابلہ میں کوئی بڑا آدمی بن گیا ہوں جب میں تمہارے مکان پر تمہارے ساتھ کھیلا کرتا تھا؟۔ میں جو پہلے تھا وہی اب بھی ہوں۔ آپ بتائیں کیا آپ نے میرے اندر کوئی تبدیلی محسوس کی؟۔

اگرچہ میں نے جواب دیا۔ نہیں! میں نے آپ کے اندر کوئی خاص تبدیلی محسوس نہیں کی۔ تاہم میں نے اپنے دل میں سوچا۔ "اب آپ حقیقت میں ایک خدا بن گئے ہیں"!۔

سوامی جی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ہمارے ملک میں آئے دن قحط

آتے رہتے ہیں اور اب ہم ان کی وجہ سے جھلس کر رہ گئے ہیں۔ کیا آپ نے کسی دوسرے ملک کے اندر بھی قحط کی اس قدر شدید تباہ کاریاں دیکھی ہیں۔؟ نہیں۔ کیوں کہ ان ملکوں کے اندر 'مرد' بستے ہیں۔ جب کہ ہمارے ملک میں مردوں کی حیثیت مردہ بدست زندہ کی ہے۔ بالکل جامد و ساکن۔ سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ لوگ شری رام کرشن کی تعلیمات کو پڑھنے کے بعد مفاد پرستی کو ترک کرنا سیکھیں حقیقی طور پر ان کا اتباع کریں۔ اسی وقت بار بار کی قحط سالی کو روکنے کی ان کی کوششوں کے اندر حقیقی جذبہ پیدا ہوگا۔ آپ دیکھیں گے کہ میں اس طرف بھی وقتاً فوقتاً اپنی کوششوں سے کام لوں گا۔

میں خود: یہ بہتر رہے گا۔ میرا خیال ہے کہ اس صورت میں آپ یہاں بہت سی تقریریں کریں گے ورنہ ان کے نام کی اشاعت کس طرح ہوگی۔

سوامی جی: کیا احمقانہ بات ہے اس قسم کی کسی کوشش کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا ان کے نام کی اشاعت کے سلسلہ میں کوئی کوشش باقی اٹھا رکھی گئی ہے؟ اس سلسلہ میں بہت کچھ کام ہو چکا ہے۔ تقریروں کا اس ملک کے اندر کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلے گا۔ ہمارے تعلیم یافتہ اہل وطن زیادہ سے زیادہ انہیں سنیں گے مسرور ہوں گے اور تالیاں بجا کر کہیں گے "بہت خوب" پھر اس کے بعد سب کچھ ختم۔ اس کے بعد وہ گھروں کو پہنچنے کے بعد وہ سب کچھ بھول جائیں گے جو انہوں نے سنا تھا۔ ایک زنگ خوردہ لوہے کے ٹکڑے پر ہتھوڑے بجانے سے کیا فائدہ؟ یہ ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ سب سے پہلے اس کو گرم کیا جانا چاہئے تب ہی اس کو ہتھوڑے کی مدد سے جس شکل کا چاہیں ڈھال سکتے ہیں۔ لوگوں کے سامنے تابناک اور زندہ مثال پیش کئے بغیر ہمارے ملک کے اندر بیداری نہیں آسکتی۔ ہم کچھ ایسے نوجوانوں کو چاہتے ہیں جو ہر شے سے کنارہ کشی کر لیں اور ملک کی خاطر اپنی جانوں کو قربان کر سکیں سب سے پہلے ہمیں ان کی زندگیوں کو سنوارنا چاہئے اس کے بعد ہی حقیقی کام متوقع ہو سکتا ہے۔

میں خود: سوامی جی مجھے ہمیشہ یہ بات پریشان کرتی رہی ہے کہ ہمارے ملک کے لوگ تو خود اپنے مذہب کو نہ سمجھ پانے کی وجہ سے دوسرے مذاہب مثلاً عیسائیت اور اسلام وغیرہ اختیار کر رہے ہیں اور آپ بجائے اس کے کہ ان کے درمیان مذہب کی تبلیغ کرتے ہندو مت کی اشاعت کے لئے انگلینڈ اور امریکہ چلے گئے۔

سوامی جی: کیا آپ نہیں دیکھتے کہ حالات تبدیل ہو گئے ہیں۔ کیا ہمارے ملک کے

---

لوگوں میں وہ صلاحیت باقی رہ گئی ہے جس سے وہ سچے مذہب کے پابند رہیں اور اس پر عمل کریں؟
آپ کے اندر محض یہ صلاحیت باقی رہ گئی ہے کہ اپنے ساتوک ہونے پر فخر کرتے رہیں۔ ایک
وقت تھا جب وہ ساتوک تھے اس میں کوئی شک نہیں ہے تاہم اب وہ بہت نیچے گر گئے
ہیں رستو سے گر کر آدمی سر کے بل نیچے آتا ہے اور تامس بن جاتا ہے۔ ہندوستان کے
لوگوں کے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایک ایسے آدمی کے اندر ستو کا ایک
شائبہ بھی ہو سکتا ہے جو ایک بند کمرہ میں ہری اوم جپتا ہو جس کا کوئی اپنا وجود نہ ہو اور جو
اس وقت جب کہ اس کی نگاہوں کے سامنے مسلسل بے انصافی ہو رہی ہو اور دوسروں کے
ساتھ تشدد کا برتاؤ کیا جارہا ہو، خاموش اور بے تعلق رہے؟ اس کے اندر ستو قسم کی کوئی چیز نہیں
ہو سکتی، وہ محض تاریک تامس میں چھپا ہوا ہوتا ہے۔ ایک ملک کے ایسے لوگ کس طرح مذہب
پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں جنہیں پیٹ بھر کھانے کے لئے بھی نہ ملتا ہو؟ ایک ملک کے لوگ
ترک علائق کس طرح کر سکتے ہیں جن کی بھوگ کے لئے خواہش بھی پوری نہیں ہونے پاتی۔
اس وجہ سے سب سے پہلے ان طریقوں اور ذرائع کو تلاش کیجئے جن کے سبب کھانے کو کافی
روٹی مل سکے اور تھوڑے بہت آرام کے ساتھ زندگی گذارنے کے لئے آسائشیں فراہم ہوسکیں
اس کے بعد ہی بتدریج حقیقی ویراگیہ آئے گا اور وہ زندگی میں مذہب کی ضرورت کا احساس
کرنے کے لئے آمادہ اور موزوں ہوں گے۔ انگلینڈ اور امریکہ کے لوگ راجس سے کس قدر سرشار
ہیں! وہ ہر قسم کے دنیاوی عیش و آرام سے شکم سیر ہو گئے ہیں مزید براں عیسائیت اعتقاد اور توہم
پرستی کا مذہب ہونے کی وجہ سے وہی حیثیت رکھتا ہے جو کہ پرانوں کا ہمارا مذہب رکھتا ہے۔ تعلیم
اور کلچر کے فروغ کے سبب مغرب کے لوگوں کو اس میں سکون نہیں ملتا۔ ان کی موجودہ پوزیشن
ایسی ہے کہ ایک سہارا ملنے پر وہ ستو تک پہنچ سکتے ہیں۔ تب پھر اس زمانہ میں کیا آپ چیتھڑوں
میں پٹے ہوئے ایک سنیاسی کی باتوں پر کان دھریں گے یا ایک سفید فام (مغربی شخص) کی
باتوں کو قبول کریں گے کہ جو آپکے پاس آپ کے مذہب کے بارے میں تلقین کے لئے آئے۔

میں خود: بالکل درست ہے سوامی جی! شری این این گھوش[1] نے بھی بالکل ایسی
ہی بات کہی تھی۔

---

[1] کلکتہ کے ایک معروف بیرسٹر جرنلسٹ اور ماہر تعلیم۔

سوامی جی: جی ہاں! جب مناسب تربیت پانے اور روشنی حاصل کرنے کے بعد میرے مغربی چیلے بڑی تعداد میں یہاں آئیں گے اور آپ سے کہیں گے: "آپ یہ سب کیا کر رہے ہیں؟ آپ کے اندر اعتقاد کا فقدان کیوں ہے؟ آپ کی رسمیں مذہب طریقے رواج اور اخلاق کمتر کیوں ہے؟ ہم تو آپ کے مذہب کو ایک اعلیٰ ترین مذہب سمجھتے ہیں"! تب آپ دیکھیں گے کہ بڑی تعداد میں ہمارے با اثر اور بڑے لوگ ان کی باتوں کو توجہ کے ساتھ سنیں گے اور اس طرح وہ اس ملک کی بہترین بھلائی کر سکیں گے۔ ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہ کیجئے کہ وہ آپ کو مذہب کی تعلیم دینے کے لئے آئیں گے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ عملی سائنس وغیرہ کے معاملہ میں آپ کے گورو ہوں گے جن کا تعلق مادی حالت کو سنوارنے سے ہے اور ہمارے ملک کے لوگ مذہب کے ہر معاملہ میں ان کے گورو ہوں گے۔ مذہب کے حلقہ میں گورو اور چیلے کا یہ تعلق ہندوستان اور باقی دنیا کے درمیان ہمیشہ رہے گا۔

میں: ایسا کس طرح ہو سکتا ہے سوامی جی؟ اس نفرت کے پیش نظر جو ان کے دلوں میں ہمارے لئے ہے بہ ظاہر یہ بات اغلب نہیں معلوم ہوتی کہ وہ ایک خالص بے غرضانہ طریقہ پر ہمارے لئے کچھ بھلائی کریں گے۔

سوامی جی: کچھ اسباب ہیں جن کی وجہ سے وہ ہم سے نفرت کرتے ہیں اور ایسا کرنے کے لئے وہ خود کو صحیح قرار دے سکتے ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہم ایک مفتوح قوم ہیں۔ مزید برآں دنیا میں دریوزہ گروں کی کوئی اور قوم ایسی نہیں ہے جیسے ہم ہیں۔ عوام جن کی اکثریت نیچ ذاتوں کی ہے، صدیوں سے اعلیٰ ذات کے لوگوں کے جبر و استبداد کا شکار رہے ہیں اور ان کے ہر قدم پر انہیں ٹھوکروں اور لاتوں سے نوازا جاتا رہا ہے۔ ان کے اندر مردانگی ختم ہو گئی ہے اور وہ پیشہ ور بھکاریوں کی طرح بن گئے ہیں اور وہ لوگ جو ان سے ذرا ایک درجہ اوپر ہیں انگریزی کے چند الفاظ پڑھ لکھ کر اپنے ہاتھوں میں درخواستیں لیکر سرکاری دفتروں کی آستاں بوسی کرتے نظر آتے ہیں۔ بیس تیس روپے کی ایک جگہ خالی ہوتی ہے تو بی اے اور ایم اے پاس پانچسو آدمی اس کے لئے درخواستیں دیتے ہیں۔ اور میرے عزیز! ان درخواستوں میں کس قدر عجیب وغریب عبارت لکھی جاتی ہے! "جناب میرے گھر میں کھانے کے لئے کچھ نہیں ہے، میرے بیوی بچے بھوکوں مر رہے ہیں، میں انتہائی عاجزی کے ساتھ آپ کی منت وسماجت کرتا ہوں کہ آپ مجھے میرے اور بچوں کے لئے روٹی کا ذریعہ مہیا فرما دیں ورنہ ہم بھوکوں مر جائیں گے۔"

پھر جب وہ ملازم ہو جاتے ہیں تو اپنی تمام عزت کو خاک میں ملا دیتے ہیں اور بدترین قسم کی غلامی اختیار کر لیتے ہیں۔ عوام کی اس قسم کی حالت ہے۔ آپ کے اندر جو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سرکردہ لوگ ہیں وہ سوسائٹیاں بناتے ہیں اور چیخ چیخ کر دہائی دیتے ہیں! "افسوس ہندوستان تباہ ہو رہا ہے۔ اے انگریز حکمرانو ہمارے ملک کے لوگوں کو اعلیٰ سرکاری عہدے دو ہمیں قحط سے نجات دلاؤ" وغیرہ وغیرہ۔ اور اس طرح "دو" "دو" چلا کر دن رات آسمان سر پر اٹھائے رہتے ہیں۔ ان کی تقریر کا ماحصل یہ ہوتا ہے کہ اے انگریزو" ہمیں اور زیادہ دو" میرے عزیزو! وہ تمہیں اور زیادہ کیا دے سکتے ہیں۔ انہوں نے ریلیں دی ہیں ڈاک و تار کے محکمے دیئے ہیں ملک کو عمدہ ایڈمنسٹریشن دیا ہے چوروں اور لٹیروں کو بالکل ختم کر دیا ہے اور سائنس کی تعلیم دی ہے، اور زیادہ وہ کیا دیں؟ قطعی بے غرضی کے ساتھ کوئی دوسروں کو کیا دیتا ہے؟ جناب انہوں نے آپ کو اتنا کچھ دیا ہے۔ کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ بدلے میں آپ نے ان کو کیا دیا ہے؟۔

میں: ہم کیا دے سکتے ہیں؟ ہم ٹیکس ادا کرتے ہیں۔

سوامی جی: واقعی آپ ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ کیا آپ انہیں اپنی مرضی سے ٹیکس دیتے ہیں یا وہ زبردستی وصول کرتے ہیں کیونکہ وہ ملک کے اندر امن قائم رکھتے ہیں؟ اطمینان کے ساتھ مجھے بتایئے وہ آپ کے لئے جو کچھ کرتے ہیں بدلے میں آپ انہیں کیا دیتے ہیں؟ آپ کو بھی انہیں کوئی ایسی چیز دینی چاہئے جو ان کے پاس نہیں ہے۔ آپ انگلینڈ جاتے ہیں تو وہ بھی بھکاریوں کی صورت میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے۔ کچھ لوگ محض اس لئے جاتے ہیں کہ وہاں مغربی مذہب کی تعریف میں کچھ تقریریں کریں اور پھر واپس لوٹ آئیں۔ فی الواقع کیا کامیابی ہے!۔ آپ کے پاس کوئی چیز انہیں دینے کے لئے کیوں نہیں ہے۔ آپ کے پاس ایک ناقابلِ اندازہ خزانہ ہے جو آپ انہیں دے سکتے ہیں۔ انہیں اپنا مذہب دیجئے اپنا فلسفہ دیجئے۔! آپ دنیا کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ دنیا میں جہاں کہیں کوئی اعلیٰ نظریہ پایا جاتا ہے اسی کا منبع ہندوستان ہے۔ ماقبل تاریخ زمانہ ہی سے ہندوستان انسانی سماج کے تابناک نظریات کا سرچشمہ رہا ہے اس نے خود اعلیٰ نظریات کو جنم دیا ہے اور انہیں آزادی کے ساتھ تمام دنیا کے کونے کونے میں پہنچایا ہے۔ آج انگریز ہندوستان میں ہیں تاکہ ان اعلیٰ نظریات کو حاصل کریں ویدانت کے فلسفہ کو سمجھیں اور اس ابدی مذہب کے گہرے رازوں کو پالیں کہ

جو آپ کا ہے۔ آپ ان سے جو کچھ لیتے ہیں اس کے بدلے میں ان بیش قیمت ہیروں کو انہیں دیدیں۔ خدا مجھے ان کے ملک میں اس لئے لے گیا کہ میں بھکاری کی ذلت کو ختم کروں جو کہ انہوں نے ہمارے ملک سے منسوب کر رکھی ہے۔ صرف مانگنے کے مقصد سے انگلینڈ جانا مناسب نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ ہمیں کو خیرات کیوں دیں؟ کیا کوئی شخص ہمیشہ ایسا کرتا ہے؟ فقیروں کی طرح ہاتھ پھیلا کر بھیک لینا قانون فطرت نہیں ہے۔ قانون فطرت یہ ہے کہ کچھ لو اور کچھ دو، کوئی شخص طبقہ یا قوم جو اس قانون پر عمل نہیں کرتی کبھی سرسبز نہیں ہوتی۔ ہمیں لازماً اس پر عمل کرنا چاہیئے۔ یہی وجہ تھی کہ میں امریکہ گیا۔ اب وہاں کے عوام میں مذہب کے لئے تڑپ اس قدر شدید ہے کہ میرے جیسے ہزار افراد بھی وہاں جاکر کام کر سکتے ہیں۔ ان کے پاس جو دولت ہے وہ ایک طویل عرصہ سے آپ کو دے رہے ہیں۔ اب وقت ہے کہ آپ اپنے بیش قیمت سرمایہ میں ان کو شریک بنائیں اور آپ دیکھیں گے کہ کس طرح ان کا احساسِ نفرت آپ کے لئے اعتقاد احترام اور توقیر میں تبدیل ہوتا ہے اور کس طرح وہ بغیر کہے سنے آپ کے ملک کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ وہ ایک بہادر قوم ہیں اگر ان کے ساتھ نیکی کی جائے تو وہ اس کو کبھی فراموش نہیں کریں گے۔

میں: اچھا سوامی جی، مغربی ممالک کے اندر آپ نے اپنی تقریروں میں ہمارے امتیازی جوہروں اور خوبیوں کے بارے میں بڑی فصاحت اور بلاغت سے کام لیا اور مذہب کے کے ساتھ ہمارے دلی تعلق اور میلان کو ثابت کرنے کے لئے انتہائی قابل یقین ثبوت پیش کئے لیکن اب آپ کہتے ہیں کہ ہم تمام تر تامس بن گئے ہیں اور ایک ہی وقت میں آپ ہمیں دنیا کے لئے رشیوں کے ابدی مذہب کے معلموں کی سند دے رہے ہیں، ایسا کس طرح ہے؟۔

سوامی جی: کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں ملک ملک جاکر آپ کی خرابیوں کو عوام کے سامنے تفصیل کے ساتھ بیان کرتا پھروں؟ کیا مجھے ان کے سامنے اس کے برعکس ان خوبیوں کا تذکرہ نہیں کرنا چاہیئے کہ جن کی وجہ سے آپ ایک قوم کہلاتے ہیں؟ ہمیشہ یہ بات اچھی ہوتی ہے کہ ایک شخص کو اس کے نقائص کے بارے میں دُو بدُو کہا جائے اور دوستانہ انداز میں اس کو یقین دلایا جائے کہ اس میں یہ خرابیاں ہیں تاکہ وہ اپنی اصلاح کر سکے۔ لیکن آپ کو دوسروں کے سامنے اس کی خوبیاں گنانی چاہئیں۔ شری رام کرشن کہا کرتے تھے کہ اگر آپ ایک برے آدمی سے بار بار یہ کہیں کہ وہ اچھا آدمی ہے تو ایک وقت آئے گا کہ وہ اچھا آدمی

---

تشت ۃ ندرج۔ صفحہ ۳۱

بن جائے گا۔ اسی طرح ایک اچھا آدمی بھی برا بن سکتا ہے اگر اسے مسلسل برا کہا جاتا رہے۔ مغربی ملکوں میں میں نے وہاں کے لوگوں کو ان کی کمزوریوں سے بہت کافی آگاہ کیا۔ اس بات کو ذہن میں رکھئے کہ میرے یورپ جانے کا زمانہ کیا تھا۔ وہ تمام لوگ جو ہمارے ملک سے وہاں گئے، انہوں نے وہاں کے عوام کی تعریف کر کے ان کی خوبیوں کو بیان کر کے انہیں خوش کرنے کی کوشش کی اور ان سے ہماری صرف برائیاں کیں۔ نتیجہ میں اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ انہیں ہم سے نفرت ہوگئی۔ اسی وجہ سے میں نے ان کے سامنے آپ کی خوبیاں بیان کیں اور انہیں ان کی خرابیوں اور گناہوں سے آگاہ کیا بالکل اسی طرح جس طرح یہاں میں آپ کو کمزوریاں گنا رہا ہوں اور ان کی خوبیاں بیان کر رہا ہوں، خواہ آپ کتنے ہی تامس کیوں نہ بن گئے ہوں قدیم رشیوں کی کچھ نہ کچھ صفت خواہ وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو بلاشبہ اب بھی آپ کے اندر موجود ہے۔ کم سے کم اس کا خاکہ باقی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک شخص فوراً ہی مذہب کے ایک معلم کی حیثیت اختیار کر کے اس کی اشاعت کے لئے مغربی ملکوں میں چلا جائے۔ سب سے پہلے اس شخص کو کو اپنی زندگی مذہب کے سانچے میں ڈھالنی چاہیئے، نفس کشی میں ماہر ہونا چاہیئے اور اس کو بغیر مغلوب ہوئے برہم چاریہ کا پالن کرنا چاہیئے۔ تامس آپ کے اندر داخل ہو چکا ہے ــــ اس سے کیا ہے ؟۔ کیا تامس کو تباہ نہیں کیا جا سکتا ؟ اس کو ایک لمحہ سے بھی کم وقت میں ختم کیا جا سکتا ہے۔ بھگوان شری رام کرشن اسی تامس کو تباہ کرنے کے لئے ہمارے درمیان آئے تھے۔

میں: لیکن سوامی جی آپ کے علاوہ اور کون امنگ پیدا کر سکتا ہے ؟۔

سوامی جی: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میرے مرنے کے بعد کوئی اور وویکا نند پیدا نہیں ہوگا! ابھی تھوڑی دیر قبل نوجوانوں کی جس پارٹی نے میرے سامنے موسیقی کا پروگرام پیش کیا تھا، اور جنہیں آپ سب منشیات کا عادی ہونے کے سبب ذلیل وحقیر سمجھتے ہیں اور جن کو بے مصرف انسان سمجھا جاتا ہے اگر خدا چاہے تو ان میں سے ہر ایک نوجوان ایک وویکا نند بن سکتا ہے۔ وویکانندوں کی کوئی کمی نہیں ہوگی بشرطیکہ دنیا ان کی ضرورت کو محسوس کرے۔ ہزاروں لاکھوں وویکا نند ظاہر ہو جائیں گے۔ کہاں سے؟ یہ کون جانتا ہے !۔

یقین جانئے کہ میں نے جو کچھ بھی کام کیا ہے وہ وویکا نند کا کام نہیں ہے بلکہ اس کا کام ہے، یہ خدا کا اپنا کام ہے !۔ اگر ایک گورنر جنرل ریٹائر ہوتا ہے تو یقینی طور پر شہنشاہ اس کی جگہ دوسرا مقرر کرتا ہے۔ خواہ آپ تامس کا کتنا ہی شکار کیوں نہ ہوں یاد رکھیئے جب آپ خدا کے ساتھ دل سے تعلق

قائم کرلیں گے تامس کا کوئی وجود باقی نہیں رہےگا۔ اب اس کا بہترین موقع ہے کیونکہ بعض کائنات کا طباع آچکا ہے اس کا نام لیکر اگر آپ کام شروع کر دیں تو وہ آپ کو واسطہ بنا کر ہر کام کو خود ہی مکمل کر دے گا۔ تامس خود اعلیٰ ترین ستّو میں تبدیل ہوجائے گا۔

میں: خواہ آپ کچھ بھی کہیں مجھے ان الفاظ پر یقین نہیں آسکتا۔ فلسفہ کو بیان کرنے کی جیسی خطیبانہ قدرت آپ کے اندر ہے کس میں ایسی قدرت ہوسکتی ہے۔

سوامی جی: آپ نہیں جانتے۔ یہ قدرت اور صلاحیت خود بخود آجائے گی۔ جو شخص بارہ سال کے عرصہ تک مکمل طور پر برہم چاریہ رہے اور خدا کے عرفان ہی کو اپنا منشائے زندگی بنائے رکھے اس کے اندر یہ طاقت پیدا ہوجاتی ہے۔ میں نے خود اس قسم کے برہمچریہ پر عمل کیا ہے اور اس کے نتیجہ میں وہ پردہ جو کہ میرے دماغ پر پڑا ہوا تھا ہٹ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے فلسفہ جیسے لطیف موضوع پر تقریر کرنے سے پہلے سوچنے اور خود کو تیار کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ فرض کیجئے مجھے کل کہیں تقریر کرنی ہے تو آج رات وہ سب کچھ تصویروں کی طرح میری آنکھوں سے گذر جائے گا کہ جو کچھ مجھے کہنا ہے۔ بس اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میرے اندر ہی کوئی قطعی قوت نہیں ہے جو بھی بارہ برس تک خود کو مکمل طور پر برہم چاریہ بنائے رکھے گا اس کے اندر ہی یہ قوت پیدا ہوجائے گی۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو آپ کے اندر بھی یہ قوت پیدا ہوجائے گی۔ ہمارے شاستروں میں ایسی کوئی بات نہیں کہی گئی ہے کہ صرف فلاں فلاں قسم کے لوگوں کو یہ قوت حاصل ہوسکتی ہے دوسرے لوگوں کو نہیں۔

میں: سوامی جی کیا آپ کو یاد ہے کہ آپ کے سنیاسی بننے سے قبل ایک روز ہم کے مکان پر بیٹھے ہوئے تھے اور آپ ہم لوگوں کو سمادھی کی عجیب وغریب کیفیت کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے اور جب میں نے یہ کہتے ہوئے کہ "اس کالی یگ میں سمادھی ممکن نہیں ہے"، آپ کے الفاظ پر شک وشبہ کا اظہار کیا تھا تو آپ نے پرزور الفاظ میں کہا تھا "کیا تم سمادھی دینا چاہتے ہو یا خود سمادھی میں بیٹھنا چاہتے ہو؟ میں نے خود سمادھی حاصل کرلی ہے اور میں تمہیں سمادھی سے روشناس کرا سکتا ہوں۔" آپ نے بات ختم بھی نہیں کی تھی کہ ایک اجنبی وہاں آگیا تھا اور ہم نے اس مسئلہ پر اور آگے بات چیت نہیں کی تھی۔

سوامی جی: جی ہاں مجھے وہ واقعہ یاد ہے۔"

بعد میں جب میں نے ان پر زور دیا کہ وہ مجھے سمادھی حاصل کرائیں تو انہوں نے

---

صفحہ ۳۳

نشاطِ روح

کہا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ مسلسل تقریریں کرنے اور کئی برس تک مسلسل جد وجہد کرنے کے بعد راجس کی کیفیت میرے اوپر بہت زیادہ غالب آگئی ہے۔ پھر بھی اب میرے اندر وہ طاقت پوشیدہ طور پر موجود ہے۔ اگر میں تمام کام چھوڑ کر ہمالیہ کی طرف رخ کر لوں اور کچھ عرصہ تک تنہائی میں مراقبہ کروں تو میرے اندر وہ قوت پھر ظاہر ہو جائے گی۔

## VII

جولائی 1898ء[1] کی ایک شام تھی، شری بلبیر مکرجی کے خانہ باغ واقع بیلور کے مٹھ میں سوامی جی اپنے سب چیلوں کے ساتھ گیان دھیان میں لگے تھے، مراقبہ ختم ہونے پر سوامی جی باہر آئے اور ایک کمرہ میں بیٹھے، ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور سخت بارش ہو رہی تھی، لہٰذا انہوں نے دروازہ بند کر لیا اور طنبورہ اٹھا کر گانا شروع کیا، گانا ختم ہونے پر موسیقی کے متعلق ایک لمبی بات چیت شروع ہو گئی، سوامی شوانند نے ان سے پوچھا۔ "مغربی موسیقی کیسی لگتی ہے؟"

سوامی جی:۔ اوہ! یہ بہت ہی بھلی اور سندر ہے، اس کا آہنگ بہت ہی مکمل ہے اور ہم آہنگ کی یہ کاملیت کبھی نہیں پا سکے، لہٰذا ہمارے آہنگ سے ناآشنا کانوں پر مغربی موسیقی بار گزرتی ہے ہم اسے ناپسند کرتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ موسیقار گیدڑوں کے غول کی طرح شور مچا رہے ہیں، پہلے پہلے میں بھی اسی قسم کا تاثر رکھتا تھا، لیکن جب میں نے مغربی موسیقی کو توجہ کے ساتھ سننا شروع کیا اور اس کا غور سے مطالعہ کیا تو میں جیسے جیسے اسے زیادہ سے زیادہ سمجھتا گیا۔ اور بالآخر اس کے محاسن کی تعریف کرنے لگا، کسی بھی آرٹ ہو اس کا یہی معاملہ ہے، چمکدار رنگوں سے بنے ہوئے مصوری کے ایک شاہکار کو دیکھ کر ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اس کی حقیقی خوبصورتی کس جگہ ہے؟ مزید برآں جب تک نگاہ ایک حد تک حاوی اور تربیت یافتہ نہ ہو، ہم اس کے خدوخال، نقش و نگار اور مصور کی فراست کو بھی نہیں سمجھ سکتے جو اس شاہکار کے اندر بروئے کار رہی ہے، حقیقی موسیقی جو ہمارے پاس ہے وہ کیرتن میں ہے، دھرپد میں ہے، باقی موسیقی مسلم موسیقی سے خلط ملط ہو کر خراب ہو گئی ہے، کیا آپکے خیال میں تپ گیتوں کے ہلکے اور

---

[1] یہ مضمون شری پریہ ناتھ سنہا کا تحریر کردہ ہے، اس میں انہوں نے سوامی وویکانند جی کے ساتھ اپنی اس ملاقات کا حال قلمبند کیا ہے۔ جس میں سوامی جی نے مغربی موسیقی کے متعلق اپنے تاثرات بیان کیے ہیں قابل ذکر بات یہ ہے کہ شری پریہ ناتھ سنہا اپنے دوسرے دوستوں کے ساتھ سوامی جی کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں سب نے طے کیا کہ سوامی جی سے پرانایام کے بارے میں سوالات دریافت کیے جائیں سوامی جی کے پاس پہنچ کر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں تب سوامی جی نے بنا کسی کے کہنے کے از خود پرانایام کے متعلق اپدیش شروع کر دیا۔ جسے سن کر سب حیرت زدہ رہ گئے

چھوٹے سُروں کو ناک سے نکال کر گانا اور ایک سُر سے دوسرے سُر پر اس طرح گرنا جیسے بجلی گرتی ہے۔ موسیقی کی دُنیا میں کوئی اچھی چیز ہوتی ہے؟ ہرگز نہیں، اگر ایک سُر کی پوری پوری ادائیگی نہ ہو تو موسیقی کا سارا فن برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔ مصوّری میں، آپ اگر اپنی تصویر کو نیچر سے قریب تر رکھ کر زیادہ سے زیادہ خوبصورت اور فنی اعتبار سے آرٹسٹک بنانا چاہیں گے تو یہ اچھا ہی ہوگا، بُرا نہیں ہوگا، اس طرح موسیقی میں اگر آپ فن کو قائم رکھتے ہوئے اپنی اہلیت و استعداد کی جتنی بھی مقدار صرف کریں گے وہ کانوں کے لئے باعثِ مسرّت ثابت ہوگی، مسلمان جب ہندوستان آئے تو انہوں نے مختلف راگ اور راگنیاں استعمال کرنا شروع کیں لیکن انہوں نے ٹپ گیتوں کے آرٹ کو اپنے رنگ میں رنگ کر موسیقی کے سارے فن ہی کو برباد کر ڈالا"۔

سوال:۔ "کیوں مہاراج! آپ میں موسیقی سے کس کو پیار نہیں ہوتا؟"

سوامی جی:۔ "بعضوں کو کرکٹ کی گیند کی آواز بھلی لگتی ہے، سنتھالوں کا خیال ہے کہ ان کی موسیقی سب سے اچھی ہے آپ شاید یہ نہیں سمجھ سکے کہ جب ایک سُر تیزی سے دوسرے سُر کی جگہ لیتا ہے تو نہ صرف یہ کہ موسیقی کی ساری لطافت ختم ہو جاتی ہے بلکہ حقیقتاً آہنگ میں بے ترتیبی اور انتشار پیدا ہو جاتا ہے کیا سات سُروں کی ترتیب اور جوڑوں ہی سے موسیقی کے مختلف آہنگ جنم نہیں لیتے جنہیں راگ اور راگنیاں کہا جاتا ہے؟ اب اگر ٹپ میں ایک شخص پورے راگ میں ارتعاش پیدا کر کے ایک نیا آہنگ پیدا کرتا ہے اور اس کی آواز پنجم میں بھی منتہا تک پہنچتی ہے تو آپ ہی بتایئے کہ وہ راگ پر کس طرح اپنا قابو قائم رکھ سکتا ہے؟ مزید برآں اگر ایک شخص محض اثر آفرینی کے لئے سُروں کو اس طرح خلط ملط کرنے لگے تو پھر موسیقی کی ساری شاعرانہ لطافت برباد ہو کر رہ جاتی ہے، ملک میں جب سے ٹپ کا چلن ختم ہوا ہے تب سے گیت گانے کا اصل مقصد ہی فوت ہو گیا ہے، بہرحال تھیٹروں کی ترقی ہونے کی بنا پر اب ایسا لگتا ہے کہ حقیقی آرٹ میں پھر تھوڑی تھوڑی زندگی آنے لگی ہے، لیکن دوسری جانب راگ اور راگنیوں کی کوئی پروا نہیں کی جا رہی ہے اور پہلے ان کا جو خیال رکھا جاتا تھا اب وہ خیال نہیں رکھا جاتا۔

چنانچہ وہ لوگ جو دھرپد گانے کے قدیم فن کے ماہر ہیں جب ٹپ گیتوں کو گاتے ہوئے سنتے ہیں تو انہیں بڑا دکھ ہوتا ہے لیکن ہماری موسیقی میں آہنگ اور آواز کا اتار چڑھاؤ بہت ہی خوب ہے، ہماری موسیقی میں آواز کے اتار چڑھاؤ کا جو نظام ہے، فرانسیسیوں نے اس کا انکشاف کیا اور سب سے پہلے انہوں نے اس کی خوبی کا اعتراف کیا، اور اسے اختیار کر کے خود اپنی موسیقی میں رائج کیا، فرانسیسی جب یہ کام کر چکے تو پھر پورے یورپ میں اس کا چلن شروع ہو گیا، اور یورپ والے اس کے ماسٹر ہو گئے"۔

سوال:۔ "مہاراج! ان کی موسیقی میں عسکرانہ آہنگ کا غلبہ نظر آتا ہے جب کہ ہماری موسیقی میں اس چیز کا سرے ہی سے فقدان ہے"

سوامی جی:۔ "نہیں! ایسا نہیں ہے عسکرانہ آہنگ ہماری موسیقی میں بھی ہے، فوجی موسیقی میں سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہے آہنگ کی یکجہتی! افسوس کہ ہمارے یہاں اس کا فقدان ہے لہٰذا ہماری موسیقی کا عسکرانہ آہنگ نمایاں نہیں ہوتا اور محسوس نہیں کیا جاتا، ہماری موسیقی بتدریج ترقی کر رہی تھی لیکن جب مسلمان آئے تو انہوں نے اس پر اس طرح سے اپنا قبضہ جمایا کہ موسیقی کے درخت کی نشو و نما رک گئی، مغربی موسیقی زیادہ ترقی یافتہ ہے، ان کی موسیقی میں سوز و گداز بھی ہے

شجاعت آفرینی اور جوش بھی ہے اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیئے، ہمارے قدیم سازوں میں مزید کوئی ترقی نہیں ہوئی ہے۔

سوال:۔ "وہ کون سے راگ اور راگنیاں ہیں جن میں عسکرانہ آہنگ پایا جاتا ہے؟"

سوامی جی:۔ "ہر راگ کو عسکری بنایا جا سکتا ہے بشرطیکہ آواز اور سازوں کے آہنگ کو عسکری نقطۂ نگاہ کے تحت ترتیب دیا جائے۔ بہت سی راگنیوں میں بھی عسکریت پیدا کی جا سکتی ہے۔"

رات کے کھانے کا وقت آ گیا تھا، لہٰذا یہ بات چیت یہاں ختم ہو گئی، کھانے کے بعد سوامی جی نے پوچھا کہ رات کو ان مہمانوں کے سونے اور آرام کرنے کا کیا انتظام کیا گیا ہے جو مٹھ میں کلکتہ سے آئے ہوئے تھے، یہ انتظام دیکھ کر سوامی جی رات کو سونے کے لئے اپنی خوابگاہ میں چلے گئے

## VIII

نئے مٹھ کو بنے قریب قریب دو برس ہو چکے تھے اور سب ہی سوامی اس میں رہنے لگے تھے، تب میں اپنے گورو کے درشن کرنے کی غرض سے ایک دن صبح کو وہاں پہنچا، مجھے دیکھ کر سوامی جی مسکرائے اور میری خیریت پوچھنے کے بعد بولے:۔

"آج تو آپ یہیں قیام کریں گے نا؟"

"ضرور!" میں نے جواب دیا اور ادھر اُدھر کی باتیں کر کے میں نے پوچھا:۔ "مہاراج! ہمارے بچوں کی تعلیم کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

سوامی جی:۔ " गुरुगृहवासः یعنی گورو کے گھر ہی رہائش اختیار کی جائے۔ تعلیم کا یہ نظام بہترین نظام ہے کہ شاگرد اپنے مدرس اور معلم کے ساتھ اس کی رہائش اور جائے سکونت پر ہی رہے۔ اس سے بہتر کوئی دوسرا طریقۂ تعلیم نہیں ہو سکتا، دوسرے سب نظام ناقص ہیں، اصلاح طلب ہیں اور ان سے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ لیکن اس کے برعکس "گورو گرہ واس" نظام لاجواب اور آزمودہ ہے"۔

سوال:۔ "کیسے؟"

سوامی جی:۔ "قدیم زمانہ کی طرح! لیکن اس تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ جدید مغربی سائنس کی تعلیم بھی شامل ہونی چاہیئے! یہ دونوں ضروری ہیں"۔

---

ذیل کا مضمون شری پریہ ناتھ سنہا کا مرہون منت ہے۔ اس مضمون میں سوامی جی نے "گورو کے قدموں میں رہ کر زندگی بسر کرنے کے قدیم طریقہ کے علاوہ ایشیائی اور یورپین آرٹ ۔ آرٹ اور ادبیت کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔

سوال :- "کیوں! کیا یونیورسٹی کے موجودہ نظامِ تعلیم میں کوئی نقص پایا جاتا ہے"؟

سوامی جی :- "ہزار عیبوں کا ایک عیب یہی ہے کہ وہ کلرک پیدا کرنے والی ایک مشین ہے۔ اگر یہ مقدر کی بات ہوتی تو بھی میں صبر کرتا! لیکن یہ مقدر کی بات تو ہے نہیں، ذرا دیکھیے تو، کتنے لوگ ہیں جو شردھا اور اعتقاد سے محروم و بیگانہ ہیں، وہ اصرار کرتے ہیں کہ گیتا محض دنیوی کتاب ہے، اور وید ماضی کے زنگ کھائے ہوئے گیتوں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے، ہندوستان سے باہر کی اقوام اور دوسری چیزوں کے بارے میں تو وہ بال کی کھال اتارا کرتے ہیں لیکن اپنے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتے، یہاں تک کہ ساتویں پیڑھی سے آگے وہ اپنے آباؤ اجداد کے نام سے بھی واقف نہیں، چودھویں پیڑھی کے بارے میں کچھ جاننے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا"!

سوال :- "مگر اس میں کیا ہوتا ہے؟ بھلے ہی وہ اپنے آباؤ اجداد کا نام نہ جانتے ہوں"۔

"سوامی جی :- "ایسا مت سوچیے! ایک قوم جس کی تاریخ نہیں ہے اس کا اس دنیا میں کوئی اثاثہ نہیں ہے، کیا آپ یقین کرتے ہیں کہ ایک شخص جو اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ وہ اونچے خاندان کا فرد ہے اور اس احساس پر وہ فخر بھی کرتا ہے کسی وقت بھی کوئی بری بات کرنے کو آمادہ ہو سکتا ہے اور خود برا بن سکتا ہے، وہ کس طرح برا آدمی بن سکتا ہے؟ جو اعتماد و یقین اس کے اندر موجود ہے وہ اس کے عمل و اقدام پر اس حد تک گرفت رکھتا ہے کہ وہ کسی برائی کا ارتکاب کرنے کی بجائے خودکشی کر کے مرجانا پسند کرے گا، اسی طرح ایک قوم کی تاریخ ایک قوم کو اپنے عمل میں محتاط بنائے رکھتی ہے اور اس کو پستی میں گرنے سے روکتی ہے، ہاں میں جانتا ہوں کہ آپ یہ بات ضرور کہیں گے کہ "ہمارے پاس ایسی کوئی تاریخ نہیں ہے" ان لوگوں کے خیال کے مطابق جو اس زاویۂ نگاہ سے سوچا کرتے ہیں بے شک ایسی کوئی تاریخ موجود نہیں ہے نہ ہی ان لوگوں کے خیال کے مطابق ہماری کوئی تاریخ ہے جو بڑی یونیورسٹی کے طالب علم ہیں اور ایسی ہی بات وہ لوگ بھی کہتے ہیں جو عجلت کے عالم میں مغرب کا سفر کر آئے ہیں، یہاں آکر انہوں نے انگریزی وضع قطع اختیار کر لی ہے اور اس بات پر اصرار کرنا شروع کر دیا ہے کہ "ہمارے پاس کچھ نہیں ہے اور ہم لوگ وحشی رہے ہیں"۔ بے شک ہمارے پاس بالکل ہی ایسی تاریخ نہیں ہے جیسی دوسرے ممالک کے پاس موجود ہے، فرض کیجیے ہم چاول کھاتے ہیں اور یورپین نہیں کھاتے محض اس وجہ سے کیا آپ یہ سوچیں گے کہ وہ سب کے سب تو پھر فاقہ کر کے مر گئے ہوں گے یا پھر آپ انہیں گردن زدنی قرار دیں گے؟ جو چیزیں وہ حاصل کر سکتے ہیں یا اپنے ملک میں پیدا کر سکتے ہیں۔ انہوں نے ان چیزوں پہ خوب اچھی طرح گزارہ کیا۔ اور یہ چیزیں ان کے مزاج کے مطابق ٹھیک ثابت ہوئیں، اسی طرح ہماری تاریخ بھی ہمارے لیے بالکل ایسی ہی ہے جیسی ہمارے مزاج کے مطابق ہونی چاہیے، کیا آنکھیں بند کر کے محض یہ شور مچانے سے ہماری تاریخ صفحۂ ہستی سے نابود ہو جائے گی کہ افسوس ہماری کوئی تاریخ نہیں ہے، جن لوگوں کے پاس دیکھنے کے لیے آنکھیں ہیں انہیں یہاں ایک چمک دار تاریخ دکھائی دیتی ہے اور وہ جانتے ہیں کہ اسی تاریخ کی قوت سے ہماری قوم ابھی تک زندہ ہے اور اس میں زندگی کے آثار موجود ہیں۔ لیکن اس تاریخ کو دوبارہ لکھا جانا ہے اس کو اس طریقے سے دوبارہ بیان کرنا ہے کہ موجودہ زمانہ میں مغربی تعلیم کی وجہ سے سوچنے سمجھنے کے جو طریقے ہیں، ہماری تاریخ ان کی مطابقت کرے"۔

سوال :- "یہ کس طرح ہو سکتا ہے"؟

سوامی جی:- "یہ بہت طویل موضوع ہے، بہر حال اختصاراً یُوں سمجھئے کہ گرُو کے ساتھ رہائش کا قدیم طریقہ اور تعلیم دینے کے ایسے ہی طریقوں کی ضرورت ہے۔ ہمیں جو چیزیں چاہئیں وہ یہ ہیں کہ ہم ویدانت کے ساتھ ہی ساتھ مغربی سائنس کی تعلیم بھی حاصل کریں برہمچاری موقف ہماری رہنمائی کرے اور ہم میں سے ہر ایک میں شردھا اور اعتقاد ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمیں تعلیم کے اس طریقہ کو قطعاً منسوخ کر دینا چاہیئے جو اس بے وقوف آدمی کی خود فریبی کا آئینہ دار ہے جو ایک گدھے کو اس خیال سے پڑھایا کرتا تھا کہ وہ گھوڑا بن جائے گا۔"!

سوال:- "آپ کا کیا مطلب ہے"؟

سوامی جی:- "دیکھئے! کوئی کسی کو پڑھا نہیں سکتا! معلّم یہ سوچ کر سب کچھ خراب کر ڈالتا ہے کہ وہ کسی کو پڑھا رہا ہے۔ ایسا ہی ویدانت میں کہا گیا ہے۔ ویدانت کا کہنا ہے کہ تمام علم آدمی کے اندر موجود ہے — ایک لڑکے کے اندر بھی سارا علم موجود ہے — ضرورت محض اتنی ہے کہ اسے بیدار کر دیا جائے۔ معلّم کا صرف اتنا ہی کام ہے کہ وہ اسے جگا دے! ہمیں اپنے لڑکوں کے لئے صرف اتنا کام کرنا ہے کہ ان میں اپنے پاؤں، اپنے ہاتھ، اپنی آنکھیں اور اپنے کان استعمال کرنے کے لئے اپنی عقل سے ٹھیک ٹھیک ڈھنگ پر کام لینے کا طریقہ آ جائے، اس کے بعد سب کچھ آسان ہے! لیکن محور ہے "دھرم"۔ دھرم کی مثال ایسی ہے جیسے چاول، باقی دوسری چیزیں دال کی حیثیت رکھتی ہیں، صرف دال کھانے سے بھی بدہضمی ہو جاتی ہے اور صرف چاول کھانے سے بھی! ہمارے سکولوں کے ماسٹر لڑکوں کو مختلف مضامین رٹا کر انہیں محض طوطا بنا رہے ہیں، ایک اعتبار سے آپ کو وائسرائے کی اس تجویز کا شکر گزار ہونا چاہیئے جو انہوں نے یونیورسٹی کی تعلیم میں اصلاح کرنے کی غرض سے پیش کی ہے اور جس کا یہ مطلب ہے کہ اعلیٰ تعلیم عملی طور پر منسوخ کر دی جائے۔[1] ملک کو کم سے کم سانس لینے کا تھوڑا سا موقع تو مل ہی جائے گا! کیا خوبی ہے! کیا اچھائی ہے! لڑکوں کو گریجویٹ کرانے کے متعلق یہ شور و غل سا اور پھر ٹھنڈا پڑ جاتا! اور اس سب کے بعد کیا ہوتا، صرف یہ کہ جو دھرم اور جو رواج ان کے ہیں وہ سب خراب ہیں اور جو اہلِ مغرب کے ہیں وہ سب اچھے اور بہت اچھے ہیں۔ بہر طور وہ بھیڑیئے کو اپنے دروازے پر نہیں بٹھا سکتے! اعلیٰ تعلیم باقی رہے یا ختم ہو جائے اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اگر لوگوں کو تھوڑی سی فنی تعلیم مل جائے تو یہ زیادہ اچھا ہوگا، اس کے ذریعہ سے وہ کوئی کام کر سکیں گے، اپنی روزی کما سکیں گے، بجائے اس کے کہ وہ نوکریوں کی تلاش میں جوتیاں چٹخاتے پھریں اور در در یہ آوازیں دیں کہ ہمیں نوکری چاہیئے، ہمیں ملازمت درکار ہے۔

سوال:- ہاں، مارواڑی بڑے ہوشیار ہیں! اس لئے کہ انہوں نے ملازمت کا پیشہ اختیار نہیں کیا، بلکہ وہ تجارت میں لگ گئے!

---

[1] لارڈ کرزن نے ایسے اقدامات کئے تھے کہ یونیورسٹی کی تعلیم کا معیار اتنا اونچا اور اتنا گراں ہو جائے کہ درمیانی طبقہ کے لڑکوں کے لئے یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنے کا کوئی امکان ہی نہ رہے!

---

سوامی جی: "بے وقوفی! حماقت! وہ ملک کے لئے بربادی لانے والے راستہ پر چل رہے ہیں، انہیں اپنے مفادات کا ذرا سا بھی خیال نہیں! آپ بہت اچھے ہیں اس لئے کہ آپ کے دل میں ہنرمندوں اور کاریگروں کے لئے ہمدردی کا جذبہ موجود ہے۔ وہ روپیہ جو یہ لوگ اپنی تجارتوں میں لگاتے ہیں اور جس کا بہت کم نفع پاتے ہیں، اگر یورپین سوداگروں کی جیب میں بطور نفع بھرنے کی بجائے چند فیکٹریوں اور ورکشاپوں میں لگایا جانے لگے تو نہ صرف یہ کہ اس کا پورے ملک کو زیادہ فائدہ پہنچے گا بلکہ خود ان کے نفع کی مقدار بھی اضافہ ہو جائے گا۔ یہ صرف کاہل لوگ ہیں جو ملازمت کی طرف نظر تک اٹھا کر نہیں دیکھتے، آزادی کا جذبہ ان کے گوشت پوست میں سرایت کئے ہوئے ہے ان سے ذرا نوکری کی بات کر کے دیکھئے پھر دیکھئے کہ کیا ہوتا ہے؟"

سوال: "بہت اچھا مہاراج! اعلٰے تعلیم ختم ہو جانے کی صورت میں کیا ملک کے لوگ پہلے ہی کی طرح بیل بن کر نہیں رہ جائیں گے؟"

سوامی جی: "کیسی بے وقوفی کی بات ہے! کیا شیر کبھی بھی گیدڑ بن سکتا ہے؟ آپ کا مطلب کیا ہے؟ کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ اس سرزمین کے فرزند جو پراچین کال سے ساری دنیا کو علم کی دولت بانٹ رہی ہے محض اس بنا پر بیل کی طرح بے وقوف بن کر رہ جائیں گے کہ لارڈ کرزن نے اعلٰے تعلیم منسوخ کر دی ہے؟"

سوال: "ذرا سوچئے تو کہ ہمارے ملک کے لوگ انگریزوں کی آمد سے پہلے کیسے تھے اور اب کیسے ہو گئے ہیں؟"

سوامی جی: "کیا اعلیٰ تعلیم کا مقصد صرف اتنا ہے کہ مادی سائنسوں کی تعلیم حاصل کر لی جائے۔ اور روزمرہ کی ہر چیز کے استعمال میں مشینری کام میں لائی جانے لگے؟ اعلٰے تعلیم اس مقصد کے لئے استعمال ہونی چاہیئے کہ زندگی کے مسئلوں کو کس طرح حل کیا جائے؟ اور یہی وہ خیال ہے جو عصرِ نو کی متمدن دنیا کے ذہن میں پرورش پا رہا ہے لیکن ہمارے ملک میں ہزاروں برس پہلے اس مسئلہ کا حل ڈھونڈا جا چکا ہے۔"

سوال: "مگر آپ کا تو ویدانت ہی معدوم ہو جانے کے قریب ہے!"

سوامی جی: "ہو سکتا ہے کہ ایسا ہی ہو! گردشِ زمانہ سے وقتاً فوقتاً ایسا لگتا ہے کہ ویدانت کی روشنی معدوم ہو رہی ہے اور جب کبھی ایسا ہوتا ہے تو ایشور پیکرِ انسانی میں وجود کو ظاہر کرتا ہے اور بھگوان دھرم کے اندر ایسی زندگی اور شکتی بھر دیتا ہے کہ وہ ایک عرصہ تک پوری توانائی کے ساتھ آگے کی طرف بڑھتا رہتا ہے، یہ زندگی اور شکتی دھرم میں پھر آ گئی ہے۔"

سوال: "مہاراج! اس کا کیا ثبوت ہے کہ ہندوستان نے باقی دنیا کو علم دیا ہے؟"

سوامی جی: "خود تاریخ بجائے خود اس واقعہ کا ایک ثبوت پیش کرتی ہے آتما کو بالیدگی دینے والے تمام نظریات اور علوم کی جملہ شاخیں جو دنیا میں موجود ہیں تحقیق و تفتیش کرنے پر پتہ چلا ہے کہ ان کی جڑ ہندوستان ہی کی سرزمین میں پھیلی ہے۔"

سوامی جی نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ اس موضوع پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی، اس وقت ان کی صحت بہت خراب تھی، اور گرمی کی وجہ سے وہ بار بار پانی پی رہے تھے۔ آخر میں انہوں نے کہا: "پیارے سنگھی! میرے لئے تھوڑا سا برف کا ٹھنڈا پانی لا دیجئے! میں ہر چیز وضاحت کے ساتھ بیان کروں گا"! برف کا پانی پی کر وہ تر و تازہ ہو گئے اور انہوں نے پھر

بولنا شروع کیا:۔

سوامی جی: "آپ جانتے ہیں کہ ہمیں کس چیز کی ضرورت ہے؟ بلاشبہ اُتھرو سے قطعی آزاد ہو کر ہمیں علم کی تمام شاخوں کا جو ہماری اپنی ہیں مطالعہ کرنا چاہیئے اس کے ساتھ ہمیں انگریزی زبان اور مغربی سائنس کا مطالعہ کرنا چاہیئے ہمیں فنی تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہم صنعتوں کو ترقی دیں۔ اور ہمارے لوگ ملازمتوں کی تلاش میں مارے مارے پھرنے کی بجائے اپنی روزی اپنے آپ کمائیں اور مصیبت کے وقت کے لئے کچھ بچا کر بھی رکھیں"۔

"سوال: "آپ ایک دن تول سسٹم کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے، یعنی سنسکرت بورڈنگ سکول کے متعلق! وہ کیا بات تھی؟"

سوامی جی: "اپنشدوں کی حکایتیں کیا آپ نے نہیں پڑھی ہیں؟ میں ایک حکایت سناتا ہوں، ستیہ کام ایک برہمچاری کی طرح اپنے گورو کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے گئے، گورو نے انہیں اپنی کچھ گائیں دیں اور انہیں جنگل میں بھیج دیا، کئی مہینے گزر گئے اور جب ستیہ کام نے یہ دیکھا کہ گائیوں کی تعداد دوگنی ہو گئی ہے تو انہوں نے اپنے گورو کے پاس واپس آنے کی سوچی، راستہ میں جب کہ وہ واپس آ رہے تھے تو بیلوں میں سے ایک بیل نے اور دوسرے جانوروں نے انہیں عملی طور پر جنسیت کے دائرے سے آگاہ کر دیا اور اعلیٰ تر براہمن کے طور طریق اور کردار و عمل کا انہیں پتہ چل گیا، جب چیلہ واپس آیا تو گورو نے ایک ہی نظر میں تاڑ لیا کہ چیلے کو اعلیٰ تر برہمن کا گیان پراپت ہو گیا ہے، اس حکایت کا اخلاقی مقصد یہ تعلیم دینا ہے کہ حقیقی تعلیم فطرت سے متواتر ربط و ضبط رکھنے ہی سے حاصل ہوتی ہے۔[1]

علم اس طرح حاصل کرنا چاہیئے، ورنہ ایک پنڈت کے تول میں (سنسکرت بورڈنگ سکول) تعلیم حاصل کرنے سے آپ زندگی بھر لنگور ہی بنے رہیں گے، ایک شخص کو لڑکپن کی عمر ہی سے ایک ایسے شخص کے ساتھ رہنا سہنا چاہیئے جس کا کردار انگارہ کی طرح روشن ہو اور جو اعلیٰ ترین تعلیم کی خود ایک مثال ہو، اس بات کو پڑھ لینے سے کہ جھوٹ بولنا پاپ ہے کوئی فائدہ نہیں ہر لڑکے کو تربیت دینی چاہیئے کہ وہ برہمچاری بنے، تب ہی اس میں شردھا اور اعتقاد پیدا ہو گا، ورنہ جس آدمی میں شردھا نہیں ہے وہ کیوں جھوٹ نہ بولے گا؟ ہمارے دیس میں سدا وہی لوگ تعلیم دیا کرتے ہیں جنہیں مکتی حاصل ہو جاتی ہے، بعد میں پنڈتوں نے علم پر اپنی اجارہ داری مسلط کر دی اور علم کو اپنے لوگوں تک محدود کر لیا جس کی وجہ سے ملک تباہی کے غار کے قریب آ گیا، جب تک کہ درس و تدریس تیاگیوں کے ذمہ تھی تب تک ملک میں ترقی کرنے کے تمام امکانات موجود تھے"۔

سوال: "مہاراج! آپ کا مفہوم کیا ہے؟ دوسرے ممالک میں سنیاسی نہیں ہیں پھر بھی ان کے علم کے سامنے ہندوستان ان کا پانی بھر رہا ہے"۔

سوامی جی: "میرے عزیز! بے وقوفی کی باتیں نہ کیجئے میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے سنیئے! اگر ہندوستان کے فرزندوں کی

---

[1] چھاندوگیہ اپنشد۔ 2 . ix . iv . iv

تعلیم دینے کی ذمّہ داری دوبارہ تیاگیوں کے کندھے پر نہ رکھی گئی تو ہندوستان کو دوسروں کے جوتے سدا کے لئے اپنے سر پہ اُٹھانے پڑیں گے، کیا آپ نہیں جانتے کہ کس طرح ایک بے پڑھا لکھا لڑکا جسے مکتی حاصل تھی، ماضی میں بڑے بڑے پنڈتوں کا رہنما بن گیا تھا؟

ایک مرتبہ دکشنیشور مندر کے برہمن نے جو پوجا کرایا کرتا تھا، شری کرشن جی کی مورتی کی ایک ٹانگ توڑ دی تھی، اس واقعہ کے سلسلہ میں بڑے بڑے پنڈت اپنی رائے دینے کے لئے وہاں جمع ہوئے اور انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ شاستروں کے مطابق شکستہ مورتی کی پوجا نہیں کی جا سکتی، اور پوجا کے لئے نئی مورتی کا ہونا ضروری ہے، چنانچہ ایک ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوا، بالآخر شری رام کرشن (پرم ہنس) کو بلایا گیا۔ انہوں نے پورا قصہ سن کر کہا: "ایک شخص اگر لنگڑا ہو جائے تو کیا اس کی پتنی اسے محض اس بنا پر چھوڑ دے گی کہ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے؟" اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ تمام پنڈت یہ سن کر دم بخود رہ گئے اور جن زبانوں سے وہ شاستروں کے حوالے دے رہے تھے، وہ سب کی سب ایک سیدھا سا جملہ سن کر حیرت و استعجاب کی وجہ سے ساکت و خاموش ہو گئیں، جو کچھ آپ کہتے ہیں اگر وہی درست تھے تو پھر شری رام کرشن کو اس زمین پر آنے کی کیا وجہ تھی؟ اور انہوں نے کس وجہ سے اس بات پر اتنا سختی سے اصرار کیا کہ لوگ کتاب کا کیڑا نہ بنیں! ئی زندگی کی وہ شکتی جو شری کرشن اپنے ساتھ لائے تھے، درس و تدریس کے اندر بروئے کار آنی ہے اور تب ہی حقیقی کام شروع ہو گا!"

سوال: "مگر کرنے سے کہنا آسان ہے؟"

سوامی جی: "اگر یہ کام آسان ہی ہوتا تو شری رام کرشن کے آنے کی کیا ضرورت ہوتی؟ اب آپ کے کرنے کا جو کام ہے وہ یہ ہے کہ ہر قصبے، ہر شہر اور ہر گاؤں میں ایک مٹھ قائم کیجئے، کیا آپ کر سکتے ہیں؟ کچھ نہ کچھ تو ضرور ہی کیجئے! وسطی کلکتہ میں ایک بڑا مٹھ شروع کیجئے! ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ سادھو اس مرکز کا سربراہ ہونا چاہیئے، جس کے زیر نگرانی پریکٹیکل سائنس اور آرٹس کے شعبے ہونا چاہئیں اور ایک ماہر علوم سنیاسی ان شعبوں کا انچارج ہونا چاہیئے!"

سوال: "ایسے سادھو آپ کو ملیں گے کہاں؟"

سوامی جی: "ہم انہیں بنائیں گے یہی وجہ ہے کہ میں ہمیشہ یہ بات کہتا ہوں کہ ہمیں کچھ ایسے نوجوانوں کی ضرورت ہے جن کے دلوں میں حب الوطنی اور مکتی کی آگ بھری ہو کوئی بھی شخص ایک چیز کو کم سے کم وقت میں اس طرح مکمل نہیں کر سکتا جس طرح تیاگی کر سکتے ہیں۔"

دیر تک خاموش رہنے کے بعد سوامی جی نے کہا: "سنگھی! کتنا ہی کام ہے جو ہمارے ملک میں کرنے کے لئے پڑا ہوا ہے اور کتنی ہی چیزیں ہونے کو باقی ہیں جن کی ہمارے تمہارے جیسے ہزاروں لوگوں کو ضرورت ہے محض باتیں کرنے سے کیا ہو گا؟ دیکھو کہ ملک کتنی زبردست مصیبت میں مبتلا ہے اس لئے اب تو کچھ کرنا ہی چاہیئے! آپ بھی کچھ کریں! ہمارے پاس ایک بھی ایسی کتاب نہیں ہے جو چھوٹے بچّوں کے پڑھنے کے لئے اچھی اور مناسب ہو۔"

سوال: "کیوں! لڑکوں کے لئے ایشور چندر ودیا ساگر کی ایسی بہت سی کتابیں موجود ہیں!"

جیسے ہی میں نے یہ بات کہی، سوامی جی کا ایک قہقہہ نکل گیا اور وہ ہنستے ہوئے بولے: "ہاں! ان میں آپ پڑھتے ہیں کہ

"ایشور نراکار چیتنیہ سروپ" (خدا کی کوئی صورت نہیں ہے اور وہ خالص علم کا جوہر ہے) "سبل اتی سبلو دھر بالک" (بل بہت اچھا لڑکا ہے) اور ایسی ہی بہت سی دوسری باتیں! صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے، ہمیں کچھ ایسی کتابیں بنگالی اور انگریزی میں بھی مرتب کرنی چاہئیں جو راماین، مہابھارت اور اپنشدوں کی حکایتوں پر مشتمل ہوں! ان کتابوں کی زبان بہت سہل اور بہت سلیس ہونی چاہئے، اور یہ کتابیں لڑکوں کو پڑھنے کی غرض سے دینی چاہئیں!

اب قریب قریب گیارہ بج رہے تھے، اچانک آسمان پر بادل آ گئے اور ٹھنڈی ہوا چلنے لگی، بارش کا امکان دیکھ کر سوامی جی بہت مسرور ہوئے اور یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے کہ "سنگھی آؤ ذرا گنگا کے کنارے سیر کریں"! ہم سیر کے لئے گئے اور سوامی جی کالی داس کے میگھ دوت کے بہت سے خوبصورت اشعار گنگناتے رہے، لیکن لگاتار ان کے ذہن میں ایک ہی خیال کی لہر دوڑ رہی تھی اور وہ خیال تھا ہندوستان کی بھلائی کا! انہوں نے ایک دم مجھے خطاب کیا اور کہا: "دیکھئے! سنگھی کیا آپ ایک کام کر سکتے ہیں، کیا کچھ عرصہ کے لئے آپ ہمارے لڑکوں کی شادیاں روک سکتے ہیں؟"

میں نے کہا— "مہاراج یہ بات تو سوچی بھی نہیں جا سکتی! جب کہ بابوؤں کی طرف سے شادی کو ارزاں سے ارزاں بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔"

سوامی جی:— "اس معاملہ میں اپنی عقل کو نہ کھپائیے! وقت کی رفتار کو کون روک سکتا ہے، اس طرح کے تمام ایجی ٹیشنوں کی آواز ایک خلا میں جا کر گم ہو جائے گی، شادیاں جتنی گراں ہوں گی ملک کے لئے اتنا ہی فائدہ ہو گا، شادی میں اتنی عجلت کرنے کی آخر وجہ کیا ہے؟ جلدی جلدی امتحانات پاس کئے اور فوراً ہی شادی کر ڈالی! آخر کیوں؟ بارات دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید کوئی بھی کنوارا نہ رہا ہو، جس کی شادی نہ ہو گئی ہو! لیکن جب دوسرا برس آتا ہے تو پھر شادیوں کا ایسا ہی موسم شروع ہو جاتا ہے۔"

تھوڑا سا خاموش رہ کر سوامی جی پھر بولے:— "اگر مجھے کچھ غیر شادی شدہ گریجویٹ ملیں تو میں انہیں جاپان بھیجنے کی کوشش کر سکتا ہوں اور وہاں ان کے لئے فنی تعلیم حاصل کرنے کے انتظامات کرا سکتا ہوں، تاکہ واپس آ کر وہ اپنے علم کا ہندوستان کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائیں! یہ کیسی اچھی بات ہے!"

سوال:— "کیوں مہاراج! کیا بجائے انگلستان کے جاپان جانا ہمارے لئے بہتر ہو گا؟"

سوامی جی:— "یقیناً! میرے خیال میں اگر ہمارے دولتمند اور تعلیم یافتہ لوگ ایک بار جاپان کو دیکھ آئیں تو ان کی آنکھیں کھل جائیں گی۔"

سوال:— "یہ کیسے مہاراج؟"

سوامی جی:— "جاپان میں آپ دیکھیں گے کہ علم ہضم ہو گیا ہے، لوگوں کو علم کی وہ بدہضمی نہیں ہوئی ہے جو ہمارے ملک میں ہو جایا کرتی ہے، انہوں نے ہر چیز یورپینوں سے سیکھی ہے لیکن اس کے باوجود وہ ہمہ تن اور ہمہ وقت جاپانی ہیں، یورپین نہیں بن گئے ہیں، ہمارے یہاں مغربیت کی نقل اتارنے کا شوق خطرناک مالیخولیا بن کر رہ گیا ہے اور طاعون کی وبا کی طرح پھیلتا جا

رہا ہے"۔

مَیں نے کہا: "مہاراج! مَیں نے کچھ جاپانی پینٹنگس دیکھی ہیں ان کے آرٹ کی تعریف کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا ان کی تخیل نقل سے ماوریٰ نظر آتی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ جیسے ان کی تخلیں خود ان کی اپنی ہیں"۔

سوامی جی: "بالکل ٹھیک! ایسی ہی بات ہے! اپنے آرٹ کی بنا پر وہ بحیثیت قوم بہت اعلیٰ ہیں۔ کیا وہ بھی ہماری ہی طرح ایشیائی نہیں ہیں؟ اگرچہ ہم نے اپنی ہر چیز ضائع کر دی ہے پھر بھی ہمارے پاس جو کچھ باقی ہے وہ بھی بہت کچھ ہے کچھ کم نہیں ہے ایشیا کی روح میں آرٹ سرائیت کئے ہوئے ہے۔ ایشیائی ہر وہ چیز استعمال کرتے ہیں جس میں کوئی آرٹ ہوتا ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ ہمارے لئے یہ آرٹ ہمارے دھرم کا ایک جزو ہے؟ ہمارے یہاں اس عورت کی کتنی تعریف کی جاتی ہے جو خاص خاص مواقع پر چاول کی پیٹھی سے فرش اور دیواروں پر خوبصورت نقش و نگار بناتی ہے۔ خود شری رام کرشن کتنے بڑے آرٹسٹ تھے!"

سوال: "انگریزی آرٹ بھی بہت اچھا ہے — کیا نہیں ہے؟"

سوامی جی: "آپ بھی کیسے بے وقوف آدمی ہیں! لیکن آپ کا بھی کیا قصور ہے۔ جب کہ غور و فکر کرنے کا ایسا ہی طریقہ رائج ہو گیا ہے افسوس! ہمارا ملک کس پستی میں جا پڑا ہے! لوگ اپنے سونے کو پیتل کہنے لگے ہیں اور ہر دیشیوں کے پیتل کو سونے سے تعبیر کرنے لگے ہیں۔ بے شک جدید تعلیم کا یہی ایک جادو ہے! آپ کو سمجھنا چاہیئے کہ جب سے یورپینوں کا ایشیائیوں سے ربط و ضبط قائم ہوا ہے تب ہی سے وہ اپنی زندگی کو آرٹ سے روشناس کرنے کی کوشش کر رہے ہیں"۔

مَیں نے کہا: "مہاراج! اگر دوسرے لوگ آپ کی یہ باتیں سنیں گے تو وہ اس سے یہ نتیجہ اخذ کریں گے کہ آپ نے بس تاریک ہی پہلو کا مشاہدہ کیا ہے"۔

سوامی جی: "قدرتی طور پر وہ لوگ جو بھیڑیں رینگتے ہیں کیا اس کے علاوہ اور کچھ سوچ سکتے ہیں؟ میری کیسی خواہش ہے کہ میں انہیں ہر چیز کو اپنی نظروں سے دکھا سکوں! ذرا ان کی عمارتوں کی طرف دیکھئے۔ اسب کی سب عمومی! اور سب کی سب بے مقصد! حکومت کی ان بڑی بڑی عمارتوں کو دیکھئے۔ کیا انہیں باہر سے دیکھ کر یہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کس مقصد کے تحت تعمیر ہوئی ہیں؟ آپ نہیں بتا سکتے! اس لئے کہ ان میں کوئی علامت نہیں ہے۔ اب مغربی باشندوں کے لباس کو لیجئے! کلف سے اکڑے ہوئے کوٹ! بالکل سیدھی پتلون! جسم پر قطعاً چست! ہمارے نقطۂ نظر سے اس لباس کو بہت ہی مشکل سے شائستہ لباس کہا جا سکتا ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے؟ اور پھر یہ بتائیے کہ اس لباس میں کونسا حسن پایا جاتا ہے؟ اب آپ اپنے وطن کی عمارتوں کو دیکھئے۔ آپ ہر عمارت کو باہر سے دیکھتے ہی بتا دیں گے کہ وہ کس مقصد کے لئے تعمیر کی گئی ہے اور ان کی تعمیر میں کتنا آرٹ موجود ہے۔ ان کا پانی پینے کا ظرف ہے گلاس اور ہمارا ہے دھات کی بنی ہوئی "گھاٹی"۔ ان دونوں میں سے کس میں زیادہ آرٹ پایا جاتا ہے؟ کیا آپ نے ہمارے دیہات میں کسانوں کے گھر دیکھے ہیں؟"

مَیں نے کہا: "جی ہاں! مَیں نے دیکھے ہیں!"

سوامی جی: "آپ نے ان میں کیا دیکھا ہے؟"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں کیا کہوں، بہر حال میں نے جواب دیا: "مہاراج، وہ بہت صاف ستھرے رہتے ہیں، روزانہ ان کے فرش اور ان کی دیواروں پر پالش کیا جاتا ہے!"

سوامی جی: "کیا آپ نے ان کے کھلیان دیکھے ہیں؟ جن میں وہ دھان رکھا کرتے ہیں، ان کھلیانوں میں کتنا آرٹ پایا جاتا ہے، ان کی مٹی کی دیواروں پر بھی کتنے ہی اقسام کے نقش و نگار بنائے جاتے ہیں، اگر آپ مغرب کے نچلے طبقات کو جا کر دیکھیں گے تو آپ کو ایک ہی نظر میں سارا فرق دکھائی دے جائے گا، ان کا موقف ہے شے کا استعمال! اور ہمارا موقف ہے آرٹ! مغربی باشندے یہ دیکھتے ہیں کہ ایک چیز کس کس طرح استعمال میں لائی جا سکتی ہے جب کہ ہم ہر چیز میں آرٹ تلاش کرتے ہیں! مغربی تعلیم کی بدولت لوگوں نے اپنے گھروں میں گلاسوں کا استعمال شروع کر دیا ہے اور اپنی خوبصورت اور خوشنما گھاٹیوں کا استعمال ترک کر دیا ہے، چنانچہ ہم پر بھی شے کا استعمال تمسخر کی حد تک چھا گیا ہے، اب جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ایک شے کی افادیت اور آرٹ میں امتزاج پیدا کیا جائے، جاپان نے یہ کام بڑی تیزی سے کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس نے برق رفتار ترقی کی ہے اور نوبت بہ ایں جا رسید کہ جاپانی خوبیوں کے استاد بن گئے!"

سوال: "مہاراج، دنیا کی کونسی قوم سب سے بہتر لباس پہنتی ہے؟"

سوامی جی: "آریہ سب سے بہتر لباس پہنا کرتے تھے، یورپین تک اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ان کا لباس سب سے اچھا تھا، ان کی پوشاک بہت ہی خوشنما ہوتی تھی، بہت سی قوموں کے بادشاہوں کا جو لباس ہے وہ درحقیقت آریوں ہی کے لباس کی ایک نقل ہے — وہاں بھی انہیں رواج میں رکھنے کی ایسی ہی کوشش کی گئی اور ان کے جو شاہی لباس ہیں ان میں ان کے قومی لباس کی وضع کا بین فرق دکھائی دیتا ہے،

عزیزم سنگھی! آپ انگریزی وضع کی قمیضیں پہننے کی عادت ترک کر دیجئے!"

سوال: "کیوں مہاراج؟"

سوامی جی: "صرف اس لئے کہ مغربی باشندے انہیں بنیان کے طور پر استعمال کرتے ہیں، وہ انہیں دکھائی دینے والی پوشاک کے طور پر استعمال نہیں کرتے، بنگالی لوگ انہیں اس طرح استعمال کر کے کیسی غلطی کرتے ہیں؟ گویا کہ ہر طرح کا لباس استعمال کیا جا سکتا ہے اور ہر چیز بطور لباس پہنی جا سکتی ہے، گویا لباس پہننے کا کوئی سکھایا ہوا ضابطہ نہیں ہے، کوئی قانون نہیں ہے گویا لباس کی کوئی قدیم وضع نہیں ہے جو استعمال کی جائے، نچلے طبقات کے ہاتھ کا کھانا کھا لینے پر تو ہمارے لوگ برادری سے خارج کر دیے جاتے ہیں، اگر یہی ضابطہ ناشائستہ لباس پہننے پر بھی نافذ کر دیا جائے تو یہ بہت ہی اچھا ہوگا، آپ اپنی وضع کا اور اپنے طریقے کا کوئی لباس کیوں استعمال نہیں کر سکتے، انگریزی وضع کی قمیض اور کوٹ پہننے میں کونسی عقلمندی ہے؟

اب بارش شروع ہو چکی تھی اور رات کے کھانے کی گھنٹی بج رہی تھی، لہٰذا ہم دوسروں کے ساتھ پرساد لینے کو چلے گئے، کھانا کھاتے ہوئے سوامی جی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا:- "کھانا تھوڑی مقدار میں ضرورت بھر کھانا چاہیئے، چاول کی زیادہ مقدار کھا کر پیٹ کو بھر لینے سے سستی آتی ہے"۔ اس کے تھوڑی دیر بعد انہوں نے کہا:- "جاپانیوں کو دیکھیئے وہ گھٹے ہوئے مٹر کے شوربے سے دن میں دو یا تین بار چاول کھاتے ہیں، کھانا کھانے کی باریاں چاہے کتنی ہی ہوں لیکن ایک تندرست و توانا جاپانی ایک باری میں کھانے کی کم سے کم مقدار استعمال کرتا ہے، جاپانیوں میں جو کھاتے پیتے لوگ ہیں وہ روزانہ گوشت کھاتے ہیں، مگر ہم لوگ ہیں کہ دن میں دو بار کھاتے ہیں اور اپنا پیٹ حلق تک بھر لیتے ہیں جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ہماری ساری شکتی ہماری خوراک کو ہضم کرنے میں صرف ہو جاتی ہے"

سوال:- "کیا ہم جیسے غریب بنگالیوں کے لئے گوشت کھانا ممکن ہو سکتا ہے؟"

سوامی جی:- "کیوں نہیں؟ آپ تھوڑی مقدار میں تو ضرور ہی کھا سکتے ہیں، ایک دن میں نصف پونڈ گوشت کا استعمال بہت کافی ہے، اصل خرابی ہے سستی و کاہلی! جو ہماری غریبی کی بنیادی وجہ ہے فرض کر لیجیئے کہ کسی فرم کا مینیجر ناراض ہو کر کسی کی تنخواہ میں کمی کر دیتا ہے یا ایک گھرانے کے تین یا چار کمانے والے بیٹوں میں سے ایک بیٹا اچانک مر جاتا ہے تو اس وقت وہ کیا کرتے ہیں؟ فوراً ہی بچوں کے دودھ کی مقدار میں کمی کر دی جاتی ہے یا ایک وقت کھا کر گزارہ کیا جاتا ہے، صبح کو تھوڑے سے چاول کھا لیئے یا رات کو!"

سوال:- "ان حالات میں وہ اس کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں؟"

سوامی جی:- "وہ اپنی خوراک کے معیار کو قائم رکھنے کے لئے اپنی محنت کو کیوں کام میں نہیں لاتے، اور کیوں زیادہ روپیہ نہیں کماتے، لیکن وہ ایسا نہیں کرتے! وہ ملاقاتوں کی جگہ پر جا کر بیٹھ جاتے ہیں اور گپ شپ میں گھنٹوں بتا دیتے ہیں، کاش وہ یہ سمجھ سکتے کہ وہ کس طرح اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں!"



شری رام کرشن مٹھ مدراس

# گورو کرپا

IX

ایک[1] مرتبہ جب سوامی جی کلکتہ میں بلا رام باسو مرحوم کے مکان میں قیام پذیر تھے تو میں ان سے ملنے گیا۔ جاپان اور امریکہ کے متعلق طویل بات چیت کے بعد میں نے سوامی جی سے پوچھا کہ "مغرب میں آپ کے کتنے بھگت ہیں؟"

سوامی جی:- "بہت کافی تعداد ہے ان کی!"

سوال:- "دو یا تین ہزار؟"

سوامی جی:- "ہو سکتا ہے کہ اس سے زیادہ ہوں۔"

سوال:- "کیا آپ نے ان سب کو منتر پڑھنا بتایا ہے۔"

سوامی جی:- "ہاں!"

سوال:- "کیا آپ نے انہیں پرنو (اوم) جپنے کی بھی اجازت دی ہے۔"

سوامی جی:- "ہاں!"

سوال:- "آپ نے یہ کیسے کیا مہاراج؟ کہا تو یہ جاتا ہے کہ ماسوا براہمن کے پرنو (اوم) جپنے کا کسی کو ادھیکار نہیں ہے شودروں کو تو بالکل ہی ادھیکار نہیں ہے۔ مزید برآں مغربی باشندے تو شودر بھی نہیں ہیں وہ تو ملیچھ ہیں۔"

---

[1] یہ مضمون شری پریہ ناتھ سنہا کا مرہونِ منت ہے۔ اس مضمون میں سوامی جی نے جن عنوانات پر اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ ان میں جاتی اور گن کے مطابق چار ذاتوں کا فرق مغرب میں براہمن اور کشتری نیز بنگال میں کل گورو سسٹم وغیرہ کے عنوانات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

سوال:۔ "آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں نے جن کو ہدایت دی ہے وہ براہمن نہیں ہیں؟"

یہی:۔ "ہندوستان کے باہر دیوتاؤں اور ملیچھوں کے ملکوں میں آپ کو براہمن کہاں سے مل سکتے ہیں؟"

سوامی جی:۔ "میرے تمام بھگت براہمن ہیں۔ میں ان الفاظ کی سچائی کا اقرار کرتا ہوں کہ سوائے براہمنوں کے پرنوؤ (اوم) جپنے کا کسی کو کوئی ادھیکار نہیں ہے لیکن ایک براہمن کا بیٹا ہمیشہ ہی براہمن ہو یہ ضروری نہیں ہے۔ اگرچہ اس کے براہمن ہونے کا بڑا امکان موجود ہوتا ہے پھر بھی ہو سکتا ہے کہ وہ براہمن نہ ہو۔ کیا آپ نے یہ نہیں سنا کہ باغ بازار کے اگھور چکرورتی کا بھتیجہ بھنگی بن گیا تھا۔ اور اس نے جو جاتی اختیار کر لی تھی، سچ مچ اس جاتی کا نیچ کام کرنے لگا تھا، کیا وہ براہمن کا بیٹا نہیں تھا؟

براہمن جاتی اور براہمنی اوصاف، یہ دو مختلف باتیں ہیں۔ ہندوستان میں ایک شخص اپنی جاتی سے براہمن ہوتا ہے لیکن مغرب میں ایک شخص اپنے براہمنی اوصاف کی بنا پر براہمن ہوا کرتا ہے۔ چونکہ تین گن ہیں۔ ست، رج اور تم۔ لہٰذا یہ تین گن ہی ظاہر کرتے ہیں کہ ایک شخص آیا براہمن ہے، کشتری، ویش یا شودر ہے۔ براہمن اور کشتری بنانے والے اوصاف ہمارے ملک سے غائب ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن مغرب کے باشندے کشتری کے اوصاف کی منزل تک پہنچ گئے ہیں، جس کے بعد وہ براہمنیت کے اوصاف کی جانب قدم بڑھائیں گے اور بہت سے تو براہمنیت کے مستحق بن بھی چکے ہیں۔"

سوال:۔ "تو آپ ان لوگوں کو براہمن کہتے ہیں جو اپنی فطرت سے سادک ہیں؟"

سوامی جی:۔ "بے شک ایسا ہی ہے! چونکہ ست، رج اور تم گن (اوصاف) ہیں اور ان گنوں ہی سے ایک یا دوسرا، کم و بیش ہر شخص میں ہوا کرتا ہے لہٰذا ایک براہمن، کشتری، ویش یا شودر بنانے والے اوصاف ہر شخص میں جنم سے ہوا کرتے ہیں، لیکن وقتاً فوقتاً ان گنوں میں سے ایک یا دوسرے کے خصائص آدمی میں مختلف درجوں کی نسبت سے غلبہ پاتے ہیں اور وہ اس میں برشتے کا رہتے ہیں۔ اب ایک آدمی کو اس کی مختلف شکلوں میں دیکھئے۔ مثال کے طور پر جس وقت وہ اجرتاً کسی دوسرے کی خدمت کرتا ہے تو وہ شودر ہوتا ہے، جب وہ ایک شے کو نفع حاصل کرنے کی غرض سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتا ہے تو وہ ویش ہوتا ہے، جب وہ بدی کے خلاف راستی کے لئے لڑتا ہے تو اس میں کشتری کے اوصاف عود کر آتے ہیں اور جب ایشور میں دھیان دیتا ہے یا اپنے وقت کا بیشتر حصہ ایشور کا ذکر کرنے میں گزارتا ہے تو وہ براہمن ہوتا ہے۔ قدرتاً یہ بات ہر آدمی کے لئے ممکن ہے کہ وہ ایک سے دوسری ذات بدلتا رہے، ورنہ وشوامتر براہمن کس طرح بنے اور پرشورام کشتری کیونکر ہوئے؟"

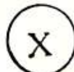
سوال:۔ "آپ کا یہ کہنا لگتا تو ٹھیک ہی ہے لیکن ہمارے پنڈت اور ہمارے کل گورو ہمیں کس وجہ سے اس چیز کی تعلیم نہیں دیتے؟"

سوامی جی:۔ "یہ ہمارے دیس کی بڑی برائیوں میں سے ایک ہے، لیکن اب اس برائی کو ختم کر دینا چاہیئے۔" اس مرحلہ پر سوامی جی نے مغربی باشندوں کے جذبۂ عمل کی بڑی تعریف کی اور انہوں نے بتایا کہ کس طرح اس وقت بھی انہوں نے جذبۂ عمل کو باقی رکھا جب کہ انہوں نے دھرم کو بھی اختیار کر لیا تھا۔

---

ہیں:۔ "درشت ہے لہٰذا پچ! میں نے سُنا ہے کہ جب وہ دھرم پر عمل کرتے ہیں تو ان کی رُوحانی اور جسمانی شکتی بڑی تیزی سے ترقی کرنے لگتی ہے، پچھلے دنوں سوامی شرد ھانند نے مجھے ایک خط دکھایا تھا جو ان کے مغربی بھگتوں میں سے کسی ایک کا تھا، اُس نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ ساد ھنوں پر عمل کرنے سے صرف چار مہینے کے اندر اس کی رُوحانی شکتی نے کس تیزی سے ترقی کر لی ہے۔"

سوامی جی:۔ "تو اب آپ کو یقین آگیا! کیا آپ نے سمجھا کہ آیا مغرب میں براہمن ہیں یا نہیں ہیں یہاں بھی براہمن ہیں لیکن وہ اپنی بے رحمی و سفاکی کے ذریعہ مُلک کو تباہی کے غار کے قریب لا رہے ہیں اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کے اوصاف و خصائص آہستہ آہستہ غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ گورو اپنے بھگت کو ایک منتر بتاتا ہے لیکن اس کے لئے اب یہ کام ایک کاروبار بن گیا ہے مزید برآں آج کل گورو اور بھگت میں تعلقات بھی کیسے عجیب ہوتے ہیں؟ اتفاقاً گورو کے گھر میں کھانے کو کچھ نہ ہو اور اس کی پتنی یہ خبر دیتے ہوئے کہ گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہے یہ کہے کہ اپنے بھگتوں کے پاس پھر جائیے ورنہ دن بھر ان پانسوں کو اچھالتے رہنا ہمیں فاقہ کشی سے نہیں بچائے گا، یہ سن کر براہمن یہ جواب دیگا کہ اچھا! مجھے کل صبح یاد دلانا میں نے سنا ہے کہ میرا فلاں فلاں بھگت آج کل بہت خوش نصیبی کے دن گزار رہا ہے۔ اور پھر بہت دنوں سے میں نے اسے دیکھا بھی نہیں ہے، یہ ہے کل گورو و سسٹم۔ جو آجکل بنگال میں رائج ہے، مغرب میں پجاری نے خود کو اس حد تک نیچے نہیں گرا لیا ہے، وہاں کا پجاری اب بھی آپ کے پجاری کی بہ نسبت بہت بہتر ہے۔"



بھگت:۔ "سوامی جی آپ کس وجہ سے اس مُلک میں لیکچر نہیں دیا کرتے آپ نے تو یورپ اور امریکہ میں اپنے لیکچروں سے ایک ہلچل سی ڈال رکھی تھی لیکن وہاں سے واپس آکر آپ نے یہاں چپ سادھ لی ہے۔"[1]

سوامی جی:۔ "اس مُلک میں پہلے کھیت کی زمین تیار کرنی چاہیئے، تب اس میں اگر کوئی بیج ڈالا جائیگا تو اس سے پودا اُگے گا، مغرب میں زمین تیار ہے یورپ اور امریکہ کی زمین بڑی زرخیز ہے اور اس قابل ہے کہ اس میں تخم ریزی کی جائے، وہاں وہ بھوگ کی انتہائی منزل تک پہنچ چکے ہیں، بھوگ میں پوری طرح ڈوب جانے کے باوجود ان کے ذہنوں میں

---

[1] یہ مضمون سوامی جی کے ایک بھگت کی ڈائری کا ایک ورق ہے جو شرت چندر چکرورتی سے سوامی جی کی ہونے والی بات چیت پر مبنی ہے، اس میں سوامی جی نے بتایا ہے کہ ہندوستان میں لیکچر بازی کی نہیں، کام کرنے کی ضرورت ہے غریبی ہندوستان کا بڑا مسئلہ ہے نوجوان سنیاسیوں کو رُوحانی اور سیکولر معلّم نیز عوام میں کام کرنے والے کارکنوں کی حیثیت سے تربیت دینے کی ضرورت ہے، نوجوان لوگوں کو دوسروں کی بے لوث خدمت انجام دینے کی ترغیب دینی چاہیئے۔

ایک بے چینی ہے اور ان ہر قسم کی مسرتوں کی فراوانی کے بعد بھی وہ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ جیسے اب بھی کسی چیز کی کمی ہے اور وہ چیز انہیں دستیاب نہیں ہوتی ہے۔ اس ملک میں آپ کے پاس نہ بھوگ ہے نہ یوگ ہے، یہاں لیکچروں کا کیا فائدہ؟ ہندوستان جیسے ملک میں جو بیماریوں کا گہوارہ ہو، مصیبتوں کا پالنا اور تھرتھوں کی جنم بھومی ہو۔ لیکچر دینے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، فاقہ کشی کی وجہ سے لوگوں کا جسم بھی نحیف و ناتواں ہے اور دماغ بھی کمزور ہے۔"

بھگت: "یہ کیسے؟ کیا آپ یہ نہیں کہتے ہیں۔ کہ ہمارے ملک کے لوگ دھرم کو جتنا سمجھتے ہیں اتنا کسی بھی ملک کے لوگ نہیں سمجھتے، تب آپ کے ولولہ آفریں خیالات کس وجہ سے اس ملک میں نشو و نما نہیں پائیں گے؟ اور کیوں ایک شاداب فصل پیدا نہیں ہوگی؟"

سوامی جی: "پہلے یہ سمجھئے کہ دھرم کا مطلب کیا ہے؟ پہلی چیز جس کی ضرورت ہے یہ ہے کہ کرم کی پرستش کی جائے۔ ایہ کرم ہے جو اوتار ہے، مجسّم بھگوان ہے جب تک آپ اس بات کا یقین نہیں کریں گے اس وقت تک دھرم کے متعلق آپ کے الفاظ کا کوئی بھی یقین نہیں کرے گا۔ ہندوستان اس خیال ہی سے بے چین ہے کہ وہ کس طرح فاقہ کشی کے اس بھوت کا سامنا کرے؟ ملک کے بہترین وسائل کو بدیشیوں نے چوس چوس کر کھا ڈالا ہے، اشیائے تجارت کی بماہد بے روک ٹوک جاری ہے پھر بے انتہا حسد جو غلاموں کی خصلت ہوا کرتا ہے، یہی وہ چیزیں ہیں جنہوں نے ہندوستان کی بنیاد کو کھوکھلا کر ڈالا ہے۔ جن لوگوں کو آپ دھرم کی تعلیم دینا چاہتے ہیں۔ سب سے پہلے ان میں سے یہ تشویش دور کیجئے کہ وہ کس طرح زندہ رہیں سب سے پہلے بھوک اور فاقہ کشی کی لعنت ختم کیجئے! ورنہ لیکچروں اور ایسی ہی دوسری چیزوں کا کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا!"

بھگت: "پھر اس لعنت کو ختم کرنے کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟"

سوامی جی: "اوّلاً ایسے نوجوانوں کی ضرورت ہے جن کا دل مکتی کے جذبہ سے معمور ہو۔ یعنی وہ لوگ جو دوسروں کے لئے اپنی زندگی قربان کر دینے کو تیار ہوں اس مقصد کے پیش نظر میں ایک مٹھ قائم کروں گا جس میں نوجوان سنیاسیوں کو تربیت دی جائے گی۔ اور یہ تربیت یافتہ سنیاسی لوگوں کو حقائق و شواہد کے ذریعہ ان کی حالت کا احساس دلائیں گے اور انہیں ان کی فلاح و بہبود کے طریقوں کی آگہی دیں گے اس کے ساتھ ساتھ وہ انہیں دھرم کی سچائیوں کو بھی صاف صاف اور سیدھی سہل زبان میں بتائیں گے ہمارے ملک کے عوام لوی ایتھن ( Leviathan. ) کی طرح غفلت کی نیند سوئے ہوئے ہیں۔ یونیورسٹی کے موجودہ نظام تعلیم کے ذریعہ جو تعلیم دی جا رہی ہے۔ وہ صرف ایک یا دو فی صد عوام تک پہنچتی ہے، لیکن اس میں بیچارے عوام کا کوئی قصور نہیں ہے۔ کالج سے نکلتے نکلتے وہ کئی کئی بچوں کے باپ بن چکے ہوتے ہیں چنانچہ کسی نہ کسی طرح ایک کلرک کی نوکری حاصل کر لیتے یا زیادہ سے زیادہ ایک ڈپٹی مجسٹریٹ بن جاتے ہیں۔ یہ ہے انتہائی تعلیم! ان کے ساتھ گھر گرہستی کا بوجھ ہوتا ہے اور اپنے پیٹ پر یہ بوجھ لادکر انہیں کوئی بڑا کام کرنے یا کوئی بڑی بات سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملتی، خود اپنی ہی ضرورتیں اور خواہشیں پوری کرنے کے لئے جب ان کے پاس کوئی سادھن نہیں ہوتا تو ان سے اس کی کیا توقع کی جا سکتی ہے

کہ وہ دوسروں کے لئے کوئی کام کریں گے۔ اور ان کی بے لوث خدمت انجام دیں گے"!

بھگت:۔ "تو کیا ہمارے لئے کوئی چارہ کار نہیں ہے"؟

سوامی جی:۔ "ہے اور ضرور ہے! یہ دھرتی اس دھرم کا مسکن ہے جو لازوال ہے۔ بے شبہ یہ ملک گراوٹ میں مبتلا ہے لیکن یقینی طور پر وہ دوبارہ اونچا اٹھے گا اور دنیا کے دوسرے ممالک کے دوش بدوش آئے گا، بگولا جتنا گہرا خلا بناتا ہے وہ اتنے ہی زور سے اتنا ہی اونچا اٹھتا ہے"۔

بھگت:۔ "ہندوستان کس طریقہ سے دوبارہ اونچا اٹھے گا"؟

سوامی جی:۔ "کیا آپ کو نظر نہیں آتا؟ مشرق میں طلوع سحر کے آثار پہلے ہی نمودار ہو چکے ہیں، بس تھوڑی ہی دیر میں سورج بھی دکھائی دینے والا ہے۔ آپ سب کو گاڑی کا پہیہ چلانے کے لئے اپنے بازوؤں کا زور لگا دینا چاہیئے"۔ میرا سفر نامہ میرا سنسار" سوچتے رہنے سے کام نہیں چلے گا، ساری دنیا کو اپنا بنا لینا کونسی بڑی بات ہے؟ فی الحال آپ کا فرض یہ ہے کہ آپ ملک کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ میں جائیں، گاؤں گاؤں کا دورہ کریں اور لوگوں کو سمجھائیں، ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنے کا زمانہ بیت چکا ہے، انہیں ان کی حقیقی حالت سے آگاہ کیجئے اور ان سے کہیئے کہ میرے بھائی بیدار ہو، جاگو! آپ کتنی دیر تک سوتے رہیں گے؟ انہیں جا کر بتائیے کہ وہ اپنی حالت کو کس طرح بہتر بنا سکتے ہیں؟ انہیں شاستروں کی بنیادی سچائیوں کی آگہی دیجئے انہیں سہل اور مقبول راستہ پر آنے کی دعوت دیجئے، اب تک برہمن دھرم کے اجارہ دار اور ٹھیکہ دار بنے بیٹھے رہے لیکن اب چونکہ وہ وقت کی رفتار کا مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں لہٰذا ایسا اقدام کیجئے کہ یہ دھرم پورے ملک میں ایک ایک شخص تک پھیل جائے، لوگوں کے ذہن میں یہ بات اتار دیجئے کہ دھرم پر انہیں بھی اتنا ہی ادھیکار ہے جتنا ادھیکار کسی برہمن کو ہو سکتا ہے ان الہامی منتروں کی سب کو تعلیم دیجئے، پست ترین چنڈالوں تک کو ان کی تعلیم دیجئے، انہیں صاف اور سادہ زبان میں ان کی ضروریات زندگی بھی بتائیے، زراعت اور تجارت وغیرہ کے نکات کو سمجھائیے! اگر آپ یہ نہیں کر سکتے تو افسوس صد افسوس آپ کی تعلیم پر! آپ کے کلچر پر، افسوس صد افسوس اس بات پر کہ آپ ویدوں اور ویدانت کا مطالعہ فرمایا کرتے ہیں"!

بھگت:۔ "لیکن ہم میں یہ شکتی ہے کہاں؟ سوامی جی! اگر مجھ میں اس شکتی کا سوواں حصہ بھی ہو تو بھی میں اپنے آپ پر فخر کروں"!

سوامی جی:۔ "کیسی بے وقوفی کی بات ہے۔ یہ شکتی اور یہ چیزیں تو اپنے آپ آ جاتی ہیں، آپ اپنے کو کام میں جٹائیں پھر آپ محسوس کریں گے کہ آپ میں اتنی بے پناہ شکتی آ رہی ہے کہ آپ اس کے متحمل نہیں ہیں۔ دوسروں کی ذراسی خدمت بھی اس اندرونی طاقت کو بیدار کر دیتی ہے، دوسروں کی بھلائی کی ذراسی بات سوچنے ہی سے ایک آدمی کے دل میں شیر جیسی طاقت آ جاتی ہے، میں نے آپ سب سے ہمیشہ ہی اتنا زیادہ پیار کیا ہے لیکن میری آرزو ہے کہ آپ سب دوسروں کی خدمت کرتے کرتے مر جائیں ۔۔۔ میں آپ کو اس طرح مرتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوں گا، رنجیدہ نہیں ہوگا"!

---

بھگت:۔ "پھر ان کا کیا بنے گا جو مجھ پر انحصار رکھتے ہیں؟"

سوامی جی:۔ "اگر آپ دوسروں کے لئے اپنی جان کی قربانی دینے کو تیار ہوں گے تو ایشور لازمی طور پر آپ کے متعلقین کی کفالت کے لئے دوسرے ذرائع پیدا کر دے گا۔ کیا آپ نے گیتا (VI . 40) میں شری کرشن کے یہ الفاظ نہیں پڑھے ہیں:

न हि कल्याणकृत्कश्चित् दुर्गतिं तात गच्छति

"میرے عزیز! ایک بھلائی کرنے والا شخص بھلائی کرتا ہے، اُس کے پاس تاسف نہیں آتا ہے۔"

بھگت:۔ "مہاراج! میری سمجھ میں آگیا۔"

سوامی جی:۔ "لازمی چیز ہے تزکیۂ نفس! اس کے بغیر آپ دوسروں کی خدمت میں اپنا پورا من نہیں لگا سکتے۔ جو شخص مکتی پا لیتا ہے وہ سب کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے اور خود کو سب کی خدمت کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ کیا ہمارا ویدانت ہمیں یہ تعلیم نہیں دیتا کہ ہم سب کو ایک ہی نظر سے دیکھا کریں، پھر اس خیال کی کوئی گنجائش کہاں ہے کہ آپ اپنی پتنی اور اپنے بچوں کو دوسروں پر زیادہ ترجیح دیں اور ان کو دوسروں سے زیادہ اپنا سمجھیں! اگر آپ کے دروازے پر نارائن بذاتِ خود ایک غریب فقیر کی صورت میں ہو، جو فاقہ کشی سے دم توڑتا ہو، تو کیا اس کو کچھ دینے کی بجائے آپ محض اپنی پتنی اور اپنے بچوں کی نفسانی خواہشات کا پیٹ مرغن غذاؤں سے بھرتے رہیں گے؟ کیوں کیا یہ حیوانیت اور درندگی نہیں ہے؟"

بھگت:۔ "دوسروں کی خدمت کے لئے اکثر کافی روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے یہ روپیہ کہاں سے دستیاب ہو سکتا ہے۔"

سوامی جی:۔ "آپ میں جتنی شکتی ہوگی، اتنا روپیہ کیوں نہیں ملے گا؟ فرض کر لیجئے کہ آپ کسی کو اس کی خواہش کے مطابق روپیہ نہیں دے سکتے تو کیا آپ اس کے کان میں چند اچھے الفاظ بھی نہیں پھونک سکتے اور چند اچھی باتیں بھی نہیں بتا سکتے، کیا اس کے لئے بھی روپیہ کی ضرورت ہے؟"

بھگت:۔ "مہاراج، یہ تو میں کر سکتا ہوں۔"

سوامی جی:۔ "صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ میں کر سکتا ہوں۔ مجھے اپنے عمل کے ذریعہ اس بات کا ثبوت دیجئے کہ آپ کر سکتے ہیں اور تب ہی میں یہ سمجھوں گا کہ میرے پاس آپ کے آنے کا کوئی فائدہ ہوا ہے۔ اٹھئے اور گاڑی کے پہیے کو حرکت دینے کے لئے اپنے کندھے کا زور لگا دیجئے — یہ زندگی ہے کتنے دنوں کی! چونکہ آپ دنیا میں آئے ہیں لہٰذا اپنے پیچھے اپنی یاد کے کچھ نشانات چھوڑ جائیے، ورنہ آپ میں اور درختوں اور پتھروں میں فرق کیا ہوگا؟ اور وہ بھی منصۂ شہود پر آتے ہیں اور فنا ہو جاتے ہیں، اگر آپ بھی ان کی طرح جینا اور مرنا چاہتے ہیں تو یہ آپ کی مرضی! اپنے عمل کے ذریعہ مجھے بتلائیے کہ آپ نے ویدانت کے مطالعہ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کیا ہے، جائیے اور سب کو جا کر یہ بتائیے کہ آپ میں سے ہر ایک میں لازوال شکتی کا ذخیرہ موجود ہے جس کو بروئے کار لانے کی کوشش کرنی چاہیئے، آپ انفرادی مکتی حاصل

---

نشاطِ روح صفحہ ۵۱

کر کے کریں گے کیا؟ اپنے دل، دماغ اپنی روح کو کام میں جُٹا دیجئے، میں نے خود اپنے کو کام کے لئے وقف کر رکھا ہے

بھگت نے ان ولولہ انگیز الفاظ کو سانس روک کر غور سے سنا! اور سوامی جی نے اسی جوش و خروش اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا۔

سوامی جی:۔ سب سے پہلے زمین کو تیار کیجئے اور پھر اس دنیا میں دھرم پر لیکچر دینے والے ہزاروں وویکانند پیدا ہو جائیں گے اس بارے میں آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیا آپ نہیں سمجھتے کہ میں کیونکر یتیم خانے کھول رہا ہوں اور کیوں سیلاب کے مصیبت زدگان کی امداد کا کام کر رہا ہوں؟ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ایک برطانوی خاتون بہن نویدیتا (Nivedita.) کس خوش اسلوبی سے ہندوستانیوں کی خدمت کا کام انجام دینا سیکھ گئی ہیں، یہاں تک کہ وہ ادنیٰ سے ادنیٰ کام تک کرتی ہیں اور انہیں کوئی تامل نہیں ہوتا، جہاں کہیں بھی طاعون کی وبا پھوٹ پڑے، قحط پھیل جائے یا جہاں کہیں بھی لوگ مصیبت و پریشانی میں مبتلا ہوں آپ سب وہاں جائیں زیادہ سے زیادہ یہی تو ہو سکتا ہے کہ آپ اس کوشش میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں اور مر جائیں، آپ جیسے کتنے لوگ ہر روز کیڑوں مکوڑوں کی طرح پیدا ہوتے اور مر جاتے ہیں، اتنی وسیع و عریض دنیا میں اس طرح مرنے جینے والوں سے کوئی فرق نہیں پڑا کرتا۔ موت برحق ہے لیکن مرنے کے لئے اپنے سامنے اونچا آدرش رکھنا چاہیئے۔ اور بہتر موت یہ ہے کہ آدمی کی زندگی میں اس کے سامنے اونچا آدرش رہے، اس خیال کا گھر گھر جا کر پرچار کیجئے، اس طرح آپ خود اپنا بھی بھلا کریں گے اور ساتھ ہی ساتھ ملک کا بھی بھلا کریں گے ہمارے ملک کے مستقبل کی تمام آشائیں آپ پر منحصر ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر انتہائی دکھ ہوتا ہے کہ آپ بے عملی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، خود کو کام میں لگا دیجئے۔ کام کے لئے اپنے کو وقف کر دیجئے مت بھولئے کہ موت کا وقت روز بروز قریب تر آتا جا رہا ہے، ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر نہ بیٹھئے یہ نہ سوچئے کہ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے اور وقت آنے پر کام اپنے آپ ہو جایا کرتا ہے۔ یاد رکھئے کہ کوئی بھی کام اس طرح نہیں ہوا کرتا۔"

## XI

بھگت:۔ "سوامی جی! براہ مہربانی بتائیے کہ گیان اور بھگتی میں کس طرح مطابقت پیدا کی جا سکتی ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ گیان کے راستہ پر چلنے والے (بھگت) شنکر کے نام پر اپنے کان بند کر لیتے ہیں، مزید براں علم کے راستے پر چلنے والے (گیان) بھگتوں کو جب ایشور کے نام پر انکے بیں روتے ہوئے یا دیوانہ وار گاتے اور ناچتے ہوئے دیکھتے ہیں تو انہیں مجنوں کے نام سے یاد کرتے ہیں۔"

سوامی جی:۔ بات یہ ہے کہ یہ سارا تصادم اور ٹکراؤ گیان اور بھگتی کے ابتدائی درجوں کی چیز ہے کیا آپ نے شِو[1] کے شیطانوں اور

---

[1] ایک مرتبہ شِو اور رام میں لڑائی ہوئی، شِو رام کے گورو تھے، اور رام شِو کے گورو تھے۔ وہ لڑے اور لڑائی کے بعد پھر ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ لیکن شِو کے شیطانوں اور رام کے بندروں کے درمیان لڑائی جھگڑا ختم ہونے میں نہیں آتا۔ ان کی جنگ چلی جا رہی ہے۔

رام کے بندروں کے بارے میں شری رام کرشن کی حکایت نہیں سنی ہے"؟

بھگت: "جی ہاں سنی تو ہے!"

سوامی جی: "لیکن اعلےٰ بھگتی اور گیان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اعلےٰ بھگتی پریم کی صورت میں ایشور کی ذات کا ادراک ہے اگر آپ ہر جگہ اور ہر چیز میں ایشور کا محبت آفرین جمال دیکھتے ہیں تو پھر آپ کس طرح دوسروں سے نفرت کر سکتے ہیں یا انہیں کوئی گزند پہنچا سکتے ہیں، اگر ذرا سی بھی نفسانی خواہش ہے تو محبت کا یہ ادراک کبھی آ نہیں سکتا۔ یہی وہ چیز ہے جس کو شری رام کرشن "کرم کنچن" سے آدمی کی وابستگی قرار دیتے تھے، محبت کا کامل ادراک ہونے پر آدمی کو اپنے تن بدن تک کا ہوش نہیں رہا کرتا اسی طرح اعلیٰ گیان سے ہے وحدت الوجود کا کامل ادراک، جب تک انا (اہم) کا احساس ہے تب تک یہ ادراک بھی میسر نہیں آسکتا!"

بھگت: "تو پھر کیا آپ پریم اور علم کو ایک ہی چیز تعبیر کریں گے"؟

سوامی جی: "قطعاً ایسا ہی ہے! ایک شخص جب تک کامل نہیں ہو جاتا، اس وقت تک اسے پریم کا کامل ادراک نہیں ہو سکتا، کیا ویدانت میں یہ نہیں کہا گیا کہ براہمن "ست چت آنند" ہے گویا "حیات (زندگی)، علم اور راحت" کا جوہر!

بھگت: "جی ہاں مہاراج!"

سوامی جی: "ست چت آنند" کی اصطلاح کا مطلب ہے ــــ ست یعنی حیات! چت یعنی آگہی یا علم آنند یعنی راحت، گویا محبت جیسی ایک ہی شے (براہمن) کے ست سے متعلق بھگت اور گیانی کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے گیانی ایشور کے علم و آگہی کے پہلو پر زیادہ اصرار کرتا ہے اور زیادہ زور دیتا ہے جب کہ بھگت "آنند" یا پریم کے پہلو کو پیش نظر رکھتا ہے اور محض اسی پہلو پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے لیکن جیسے ہی "چت" کے پہلو کا ادراک ہوتا ہے ویسے ہی "آنند" کا بھی ادراک ہو جاتا ہے اس لئے کہ "چت" اپنی نوعیت میں "آنند" ہی سے مشابہ ایک چیز ہے"۔

بھگت: "پھر ہندوستان میں اس قدر فرقہ بندی کیوں پائی جاتی ہے اور کیوں گیان اور بھگتی کے سوال پر اتنا اختلاف کیا جاتا ہے"۔

سوامی جی: "بات یہ ہے کہ سارے لڑائی جھگڑے ابتدائی مدارج اور ابتدائی خیالات سے تعلق رکھتے ہیں یعنی ان خیالات سے جو حقیقی گیان یا بھگتی پانے کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں آپ کے خیال میں کونسی چیز بہتر اور اعلیٰ ہے مقصد ــــ یا حصول مقصد کا ذریعہ؟ یقینی طور پر حصول مقصد کا ذریعہ اصل مقصد سے کبھی بلند تر نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ ایک مقصد کو حاصل کرنے کے ذرائع لوگوں کی ذہنی حالت اور مزاجی کیفیت کے اعتبار سے متعدد اور مختلف ہو سکتے ہیں۔

گیان، پوجا، ہون اور مالا جپنا، یہ اور ایسی ہی اور سب چیزیں دھرم کے اعضا ہیں وہ خود اصل مقصد نہیں ہیں بلکہ حصول مقصد کا ذریعہ ہیں، اصل مقصد ہے "براہمن" کا کامل ادراک یا "پریم بھگتی" اگر آپ ذرا سا گہرائی میں غور کریں تو آپ سمجھیں گے کہ وہ کس چیز کے لئے جھگڑ رہے ہیں؟ ایک کہتا ہے کہ "اگر تم مشرق کی طرف منہ کر کے ایشور کی پوجا کرو گے تو تم اس کے پاس پہنچ جاؤ گے"، دوسرا

کہتا ہے — "نہیں تم کو مغرب کی طرف منہ کر کے اس کی پوجا کرنی چاہیئے اور تب ہی تم اس کو دیکھ سکو گے"۔ شاید صدیوں پہلے کوئی مشرق کی طرف منہ کر کے پوجا کے لیے بیٹھا ہوگا اور اس نے ایشور سے لَو لگائی ہوگی، اس کو اپنے گیان کے دوران میں ایشور کا پرکاش دکھائی دیا ہوگا۔ تب ہی سے اس کے پیرو کاروں نے یہ بات کہنی شروع کر دی ہوگی کہ جب تک مشرق کی طرف منہ کر کے نہ بیٹھا جائے اُس وقت تک ایشور نہیں مل سکتا۔ دوسرا فریق آگے بڑھتا ہے اور تجسّس کے ساتھ پوچھتا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، فلاں فلاں شخص نے تو ایشور کا درشن تب پایا تھا جب وہ مغرب کی طرف منہ کر کے بیٹھا تھا، اور یہ بات ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی، اس طور پر یہ سب فرقے معرضِ وجود میں آئے ہیں، کوئی شخص ہو سکتا ہے جس نے ایشور کے نام "ہری" کا جاپ کیا ہوگا اور اس سے اُسے عرفان حاصل ہوا ہوگا، چنانچہ مذہبی شاستر میں یہ شلوک آ گیا ہے

हरेर्नाम हरेर्नाम हरेर्नामैव केवलम् ।
कलौ नास्त्येव नास्त्येव नास्त्येव गतिरन्यथा ॥

"ایشور کا نام ہری، ایشور کا نام ہے ہری، ایشور کا نام ہے صرف ہری! یقینی طور پر کلی کے اس یُگ میں سوائے اس کے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے — دوسرا راستہ نہیں ہے — ہرگز ہرگز دوسرا راستہ نہیں ہے"۔

فرض کیجیئے کہ اسی طرح کسی دوسرے شخص کو یہ کاملیت ایشور کا نام جپنے سے حاصل ہو گئی اور اس نے جو مسلک اختیار کیا وہ اس کے پیرو کاروں میں پھیلتا رہا، لیکن ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ دوسرے تمام مذاہب اور عبادتوں کے مختلف طریقوں کا اصل مقصد کیا ہے اور کس منزل کی طرف وہ رہنمائی کرتے ہیں؟ منزل مقصود ہے — شردھا! سنسکرت کے لفظ "شردھا" کا کسی اور زبان میں کوئی مترادف یا نعم البدل موجود نہیں ہے، اُپنشد کا قول ہے کہ شردھا پجیکیتا کے دل کے اندر موجود ہے۔ ایکاگرتا لفظ بھی "شردھا" کی پوری پوری معنویت کو ظاہر نہیں کرتا۔ البتہ لفظ ایکاگر نشٹھا کسی حد تک لفظ شردھا کے معنی ظاہر کرتا ہے۔ اگر آپ ایک حقیقت اور ایک سچائی کا پورے غور اور پوری توجہ سے یقین کریں تو آپ محسوس کریں گے کہ آپ کا دماغ ایکتا یا وحدت کی سمت میں آگے بڑھ رہا ہے یعنی آپ "ست" "چت" "آنند" کی منزل کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں، گیان یا بھگتی کے موضوع پر جو کتابیں ہیں ان میں خصوصی طور پر لوگوں کو یہ صلاح دی گئی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں یہ یا ایسی ہی دوسری نشٹھاؤں کو اختیار کریں اور انہیں اپنا بنا لیں، صدیاں گزرنے پر ان عظیم سچائیوں کے متعلق ان میں گراوٹ آئی اور رفتہ رفتہ انہوں نے دیش اچاروں یا ملک کے مروّجہ رواجوں کی شکل اختیار کر لی، یہ صرف ہندوستان ہی میں نہیں ہوا، بلکہ ہر قوم اور دنیا کے ہر سماج میں ایسا ہی ہوا ہے، عوام میں چونکہ قوّتِ تمیز کا فقدان ہوا کرتا ہے لہٰذا وہ ان چیزوں کو بنیاد بنا کر آپس میں جھگڑنے لگتے ہیں، ان کی نظر کے سامنے سے اصل مقصد ہٹ جاتا ہے اور پھر فرقہ بندیاں، جھگڑے اور لڑائیاں شروع ہو جاتی ہیں جو ابھی تک جاری، ساری ہیں"۔

بھگت:- "پھر کھوئی ہوئی عظمت بحال کرنے کا کیا طریقہ ہے، سوامی جی؟"

---

نشاطِ روح صفحہ ۵۴۲

سوامی جی:۔ "یہ کہ سچی شردھا جو ماضی میں تھی اسے دوبارہ واپس لایا جائے، جڑوں کے آس پاس سے جھاڑ جھنکار کو ہٹانا اور صاف کرنا ہے، وقت اور مقام کے فرق کے ساتھ ہر عقیدہ میں اور ہر مسلک میں، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ سچائی موجود ہے لیکن اس پر بہت سی بیکار اور ناکارہ چیزیں چھا گئی ہیں اور ان میں سچائی چھپ کر رہ گئی ہے اس لئے جھاڑ جھنکار کی صفائی ضروری ہے، تاکہ صفائی کے لازوال اصولوں کو عوام کے سامنے رکھا جائے اور صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہمارے دھرم اور ہمارے ملک کو فائدہ پہنچے گا!"

بھگت:۔ "مگر یہ کس طرح اثر پذیر ہوگا؟"

سوامی جی:۔ "کیوں؟ سب سے پہلے ہمیں عظیم پیشواؤں کے طریقۂ عبادت کو رائج کرنا ہوگا، یعنی شری رام چندر، شری کرشن، مہاویر اور شری رام کرشن اور دوسرے عظیم المرتبت رکھنے والی شخصیتوں، مہاپرشوں نے جن سچائیوں کا ادراک کیا ہے، انہیں عوام کے سامنے آدرش کے طور پر پیش کیا جائے، جس پر وہ عمل کریں کیا آپ اس ملک میں شری رام چندر اور مہاویر کی عبادت کو واپس لا سکتے ہیں؟ وقتی طور پر شری کرشن کی زندگی کے اس پہلو کو الگ رکھیئے جو بندرابن سے تعلق رکھتا ہے لیکن ان کی عبادت کو طول و عرض میں پھیلا دیجئے جو گیتا کے الفاظ میں شیر کی طرح گرجتی ہوئی ہمارے دلوں میں کھب جائے شکتی۔ یعنی دیوی کی بھگتی کو اپنے روزمرہ کے معمولات میں شامل کر لیجئے!"

بھگت:۔ "تو کیا پھر بندرابن کی گوپیوں کے ساتھ شری کرشن کا اوتار جیسا پیار کرنا ٹھیک نہیں تھا۔"

سوامی جی:۔ "موجودہ ماحول میں آپ کے لئے وہی پرستش مفید اور بہتر نہیں ہے۔ بانسری بجانے سے ملک میں توانائی پیدا نہیں ہوگی۔ اب ہمیں ایک ہیرو کے مثالی کردار کی ضرورت ہے، ہماری رگ رگ میں راجس کی شکتی امڈتے ہوئے دھارے کی طرح دوڑنی چاہیئے۔ ہمیں اس مثالی ہیرو کی ضرورت ہے جو مکتی سے مسلح ہو اور جس کے ہاتھ میں تلوار ہو، ہمیں اب جہادِ زندگانی میں ایک بہادر جنگجو سپاہی کی سپرٹ چاہیئے ہے! ہمیں ان مسرور و شادماں عاشقوں کی ضرورت نہیں ہے جو زندگی کو نشاط افروز چمن تصور کرتے ہیں۔"

بھگت:۔ "کیا محبت کا وہ راستہ غلط تھا جو گوپیوں کے آدرش میں دکھایا گیا ہے۔"

سوامی جی:۔ "یہ بات کون کہتا ہے ۔ میں تو نہیں کہتا! وہ پرستش کی انتہائی اعلیٰ قسم ہے یعنی سادھنا! اس زمانہ میں جب کہ عیش و عشرت اور دولت و زر سے اتنی گہری وابستگی ہے، بہت ہی کم لوگ ہیں جو اتنے بلند تر آدرش تک پہنچنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔"

بھگت:۔ "تب کیا وہ لوگ صحیح راستہ پر نہیں چل رہے ہیں۔ جو ایشور کی پرستش پتی یا پریمی یا محبوب کے طور پر کر رہے ہیں۔"

سوامی جی:۔ "میں وثوق سے کہتا ہوں۔ نہیں! ان میں بعض قابلِ احترام مستثنیات ہو سکتی ہیں۔ لیکن یاد رکھیئے

کہ ان کا بڑا حصہ تامسک فطرت کے گہرے اندھیرے میں مبتلا ہے' ان میں سے بیشتر خصوصی کمزوریوں اور برائیوں سے متاثر ہیں' ملک کو اونچا اٹھنا چاہیئے' مہاویر کی پرستش رائج ہونی چاہیئے' شکتی پوجا ہمارا روز کا معمول ہونا چاہیئے' شری رام چندر کی ہر گھر میں پوجا ہونی چاہیئے۔ اسی میں آپ کی فلاح ہے' اسی میں ملک کی بھلائی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔"

بھگت :۔ "لیکن میں نے سنا ہے کہ پرم ہنس شری رام کرشن ایشور نام کی مالا بہت جپا کرتے تھے۔"

سوامی جی :۔ "ہاں یہ ٹھیک ہے' لیکن ان کی بات دوسری تھی' عام آدمیوں سے ان کا کیا موازنہ کیا جا سکتا ہے؟ انہوں نے اپنی زندگی میں دھرم کے تمام مختلف آدرشوں پر عمل کیا تھا' یہ ظاہر کرنے کے لیئے کہ ہر راستہ ایک ہی سچائی کی طرف جاتا ہے' ہم میں سے کوئی بھی انہیں پوری طرح نہیں سمجھا! یہی وجہ ہے کہ میں ان کے بارے میں یہاں وہاں بیان کرتے ہوئے گھبراتا ہوں' اپنی فضیلت سے بس وہ خود ہی آگاہ تھے' ان کا جسم تو اگرچہ عام انسان جیسا تھا لیکن باقی ہر چیز جس کا ان سے تعلق تھا' وہ دوسروں کی ہر چیز سے قطعاً مختلف تھی۔"

بھگت :۔ "کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ آیا آپ کے ایمان و عقیدہ میں وہ ایک اوتار تھے؟"

سوامی جی :۔ "پہلے مجھے یہ بتایئے کہ اوتار سے آپ کی مراد کیا ہے؟"

بھگت :۔ "میرا مطلب ہے کہ جیسے شری رام چندر' شری کرشن' شری گورانگ' بدھ اور مسیح اور دوسرے اوتار تھے کیا وہ بھی انہی جیسے ایک اوتار تھے؟"

سوامی جی :۔ "آپ نے ابھی جن کے نام لیئے ہیں میں بھگوان شری رام کرشن کو ان سے بھی بلند و برتر تصور کرتا ہوں' عقیدہ کی کیا بات ہے! یہ تو بہت چھوٹی سی بات ہے۔ بہر حال اس موضوع کو اب ختم کر دیجیئے۔ مزید کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھیئے!"

تھوڑی دیر خاموش رہ کر سوامی جی نے پھر کہا:" سماج اور وقت کی ضرورت کے مطابق دھرم کو دوبارہ قائم کرنے کے لیئے مہاپرش آیا کرتے ہیں۔ آپ انہیں کچھ بھی کہہ لیجیئے۔ مہاپرش یا اوتار! اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا' ان میں سے ہر ایک نے اپنی زندگی میں آدرش کا انکشاف کیا' تب رفتہ رفتہ ان کے آدرش کی ساخت کو بدلا گیا۔ لوگوں نے بدل ڈالا! انجام کار فرقوں نے جنم لیا اور یہ فرقے پھیلتے گئے' وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان فرقوں میں گراوٹ آتی ہے اور پھر ایسے ہی ریفارمر دوبارہ آتے ہیں۔ یہ ایک قانون ہے جو دریا کے دھارے کی طرح جاری ہے اور کبھی اس میں کوئی رکاوٹ یا خلا پیدا نہیں ہوا ہے۔"

بھگت :۔ "آپ اس بات کا پرچار کیوں نہیں کرتے کہ شری رام کرشن ایک اوتار تھے' آپ کے پاس شکتی بھی ہے' قوتِ گفتار بھی ہے اور ہر وہ چیز ہے جس کی اس پرچار کے لیئے ضرورت ہو سکتی ہے۔"

سوامی جی :۔ "میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میں انہیں بہت تھوڑا سمجھ پایا ہوں' میں انہیں اتنا عظیم پاتا ہوں کہ

جب کبھی ان کے بارے میں کچھ کہنے کو ہوتا ہوں تو یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ مبادا میں حقیقت کے اظہار میں بھٹک نہ جاؤں، ان کی عظمت نظر انداز نہ ہو جائے، مجھے یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں میری تھوڑی سی شکتی جواب دے جائے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اپنی عقل و بصیرت کے مطابق ان کی جو تصویر پیش کروں وہ ان کی شایانِ شان نہ ہو۔"

بھگت: "مگر بہت سے لوگ یہ پرچار کرتے ہیں کہ وہ ایک اوتار تھے۔"

سوامی جی: "اگر ان کی ایسی ہی خواہش ہے تو انہیں کرنے دیجئے! انہوں نے شری رام کرشن کو جیسا سمجھا ہے اسی کی روشنی میں وہ ایسا کر رہے ہیں۔ اگر آپ نے بھی انہیں سمجھ لیا ہے تو آپ بھی ایسا ہی پرچار کر سکتے ہیں۔"

بھگت: "شری رام کرشن کو سمجھنا تو درکنار، میں تو ابھی تک آپ ہی کو نہیں سمجھ پایا ہوں۔ اگر میں آپ کی عظمت کو تھوڑا سا بھی پہچان سکا تو میں اس کو اپنی زندگی کی خوش نصیبی تصور کروں گا۔"

XII

ذیل کے مضمون میں سوامی جی نے جن باتوں کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ انسان کو نڈر ہونا چاہئے، نیز یہ کہ ہمیشہ ہی یہ سوچنا چاہئے کہ "میں برہم ہوں"۔ اور برہم پد کو پانے کا واحد طریقہ ہے وویک اور ویراگیہ۔

بھگت: "سوامی جی! براہِ مہربانی بتائیے کہ اگر ایک برہم ہی واحد حقیقت ہے تو پھر اس دنیا میں یہ سارا اختلاف کیوں موجود ہے؟"

سوامی جی: "کیا آپ نے عملِ حیات کے زاویہ نگاہ سے اس سوال پر غور نہیں کیا ہے؟ جہاں سے زندگی کی عمل پذیری شروع ہوتی ہے۔ اگر وہاں اختلاف کے پردوں کے اندر کوئی جھانک کر دیکھے گا تو اسے عالمِ کثرت میں وحدت کی جڑ دکھائی دے گی، اگر آپ سختی سے اس وحدت کو ذہن نشین کر لیں تو پھر مجھے بتلائیے کہ آپ کس زاویۂ نگاہ سے اس فرق و اختلاف کو دیکھ سکیں گے جو عالمِ کثرت میں دکھائی دیتا ہے۔"

بھگت: "سچ ہے مہاراج! اگر میرا وجود وحدت کے اندر ہے تو پھر میں "کیوں" کا سوال کس طرح اٹھا سکتا ہوں، جب میں یہ اختلاف دیکھتا ہوں تو اس کی بنیاد پر یہ سوال اٹھاتا ہوں!"

سوامی جی: "بہت اچھا! عملِ حیات کے اختلاف کے ذریعہ وحدت کی جستجو کو شاستروں میں نیائے کی منطق کا نام دیا گیا ہے یعنی بالواسطہ طریقہ سے دلیل لانے کا عمل۔ گویا پہلے یہ فرض کیجئے کہ کوئی شے ہے جو موجود نہیں ہے پھر دلیل کے ذریعہ یہ ظاہر کیجئے کہ جو نہیں ہے وہ ہے! آپ اس طریقہ کے بارے میں بات چیت کر رہے ہیں جس میں مجاز کو بطورِ حقیقت فرض کر کے حقیقت تک پہنچا جاتا ہے۔

بھگت: "میرے خیال میں موجودات اپنے شاہد آپ ہیں لہٰذا حقیقت ہیں لیکن دوسری جانب اس کے برعکس جو
محسوس ہوتا ہے یا دکھائی دیتا ہے وہ مجاز ہے حقیقت نہیں ہے۔"

سوامی جی: "لیکن ویدوں میں کہا گیا ہے "بس ایک دوسرے کے بغیر" اور اگر حقیقت کی آغوش میں بس "ایک" ہے
جو موجود ہے یعنی برہم" تو پھر سارا فرق و اختلاف ایک دھوکا ہے مجھے یقین ہے کہ آپ ویدوں میں عقیدہ رکھتے ہیں۔"

بھگت: "جی ہاں میں اپنے لیے ویدوں کو اعلیٰ ترین سند کے طور پر تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن مباحثہ کے دوران میں
اگر ایک شخص ویدوں کو اعلیٰ ترین سند کے طور پر تسلیم نہ کرے تو اس صورت میں اسے دوسرے طریقوں سے سمجھانا ہوگا۔"

سوامی جی: "ایسا بھی ہو سکتا ہے، غور کیجئے کہ ایک ایسا وقت آتا ہے جب وہ شے غائب ہو جاتی ہے جسے
آپ اختلاف کہتے ہیں اس وقت ہم اختلاف کا شائبہ بھی محسوس نہیں کر سکتے ہیں خود میں نے اپنی زندگی میں اس حالت کا
تجربہ کیا ہے۔"

بھگت: "آپ نے یہ تجربہ کب کیا ہے؟"

سوامی جی: "دکشنیشور مندر کے باغ میں ایک دن شری رام کرشن نے میرے دل پر اپنی توجہ جما دی تو سب سے
پہلے میں نے دیکھا کہ مکانات ۔ کمرے ۔ دروازے ۔ کھڑکیاں برآمدے ۔ درخت، سورج، چاند ۔ اور سب کچھ
بحر میں اڑا جا رہا ہے ۔ سب کچھ چکنا چور ہو کر ذرات کی شکل میں بدل گیا ہے ۔ اور پھر یہ سارے ذرات آکاش میں فنا
ہو گئے اور اس کے بعد آکاش بھی غائب ہو گیا ہے اور اس کے بعد میری انا بھی ندارد ہو گئی ہے اور اس کے
بعد میں نے کیا دیکھا وہ عقل کی گرفت سے باہر ہے پہلے تو میں خوف زدہ ہو گیا۔ اور پھر اس حال سے اپنی پہلی سی حالت
میں واپس لوٹا، اور میں نے دیکھا کہ ہر چیز ظاہر ہوتی جا رہی ہے، مکانات، دروازے، کھڑکیاں، برآمدے
اور دوسری ساری چیزیں! دوسری مرتبہ مجھ پر ایسا ہی حال اس وقت طاری ہوا جب کہ میں امریکہ میں ایک جھیل کے
کنارے بیٹھا ہوا تھا۔"

بھگت: "دماغی انتشار کی بنا پر ایسا حال طاری ہو جائے کیا ایسا نہیں ہو سکتا؟ پھر ایک ایسی حالت کے
ادراک سے کونسی مسرت حاصل ہو سکتی ہے یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

سوامی جی: "دماغی انتشار؟ آپ اسے دماغی انتشار کس طرح کہہ سکتے ہیں؟ یہ حالت نہ تو کسی بیماری کے
نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے نہ کسی نشہ آور چیز کی کیفیت کا نتیجہ ہوتی ہے نہ حبس دم کے مختلف طریقوں سے تیار یا پیدا
ہوتی ہے، بلکہ یہ حالت صرف اس آدمی پر طاری ہوتی ہے جو پوری صحت اور پوری عقل کا حامل ہوتا ہے۔
مزید برآں یہ حالت ویدوں سے بھی پوری پوری مطابقت رکھتی ہے۔ اور اس کا ویدوں میں بھی ذکر آیا ہے۔
ماضی کے عظیم رشیوں اور آچاریوں نے اس حالت کے ادراک کے متعلق جو الفاظ کہے ہیں ان سے بھی ان کی مطابقت

ہوتی ہے، بہر حال کیا آپ مجھے ایک ایسا آدمی تصوّر کرتے ہیں جس کے دماغ میں خلل آگیا ہو؟" (سوامی جی مسکرانے لگے

بھگت: "اوہ! جی نہیں! میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے شاستروں میں جب کہ وحدت کے اس ادراک کے متعلق سینکڑوں شلوک موجود ہیں جب کہ آپ بھی یہ بات کہتے ہیں کہ یہ ادراک براہِ راست بالکل اسی طرح حاصل کیا جاسکتا ہے جیسے کوئی شخص درخت سے پھل توڑ لے اور جب کہ خود آپ نے اپنی زندگی میں اس ادراک کا تجربہ کیا ہے اور وہ ویدوں اور دوسرے شاستروں کے الفاظ کے عین مطابق ہے تو پھر میں یہ کہنے کی جرأت کس طرح کرسکتا ہوں کہ یہ سب غلط ہے۔ شری شنکر آچاریہ نے بھی اس حالت کا ادراک کرتے ہوئے کہا ہے "کائنات کہاں کھو گئی" وغیرہ وغیرہ۔!

سوامی جی: "تو پھر سمجھئے کہ وحدت کے اس علم کو شاستروں میں "برہم گیان" سے تعبیر کیا گیا ہے، اس کو پہچان کر ایک شخص ہر قسم کے خوف اور ڈر سے نجات پا جاتا ہے، اسے فنا اور بقا کا کوئی خدشہ نہیں رہتا، ایک بار یہ نعمت حاصل ہو جائے تو پھر اس دنیا کے رنج و راحت سے کوئی آدمی مغلوب نہیں ہوا کرتا، وہ لوگ اس نعمت سے اس وقت تک بہرہ ور نہیں ہو سکتے جب تک وہ حرص و ہوس میں مبتلا ہوتے ہیں۔"

بھگت: "اگر ایسا ہے اور اگر ہم حقیقت میں اعلیٰ تر برہم کا جوہر ہیں تو پھر ہم کیوں اس نعمت کو حاصل کرنے کے لئے اپنی شکتی بروئے کار نہیں لاتے؟ ہم کس وجہ سے دولت اور حرص و ہوس کے حقیر جذبات میں مبتلا ہو کر خود کو بار بار موت کے منہ میں ڈال لیتے ہیں؟"

سوامی جی: "آپ کا شاید یہ مطلب ہے کہ آدمی اس نعمت کو پانے کی خواہش نہیں رکھتا اگر آپ غور کریں گے تو آپ کو یہ بات دکھائی دے گی کہ ہر شخص جو کچھ کر رہا ہے وہ اس توقع میں کر رہا ہے کہ اسے یہ نعمت حاصل ہو جائے گی بات صرف اتنی ہے کہ ہر آدمی کو اس کی آگاہی نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اس کو سمجھ نہیں سکتا۔ یہ نعمت سب میں موجود ہے۔ برہم سے لے کر گھاس کی ادنیٰ سی پتّی تک میں اس نعمت کا وجود ہے، آپ بھی وہی برہم ہیں۔ مجھ میں کوئی کمی نہیں ہے، اسی لمحہ آپ اس بات کا ادراک کر سکتے ہیں۔ جبکہ آپ سچائی اور قطعیت کے ساتھ ایسا ہی سوچیں! محض اتنی سی بات کی ضرورت ہے کہ آپ بلا واسطہ دھیان دیں، اپنی پتنی کی جگہ آپ ذمہ داری قبول کرتے ہیں اور اس کی خاطر اتنی مشقت کرتے ہیں تو یہ ذمہ داری اور مشقت بھی اپنے نتیجہ میں اسی مقصد کو ظاہر کرتی ہے۔ کہ آپ انجام کار برہمن کی اعلیٰ تر نعمت حاصل کریں۔ بار بار تکلیف و آلام میں مبتلا ہونے اور غم و اندوہ کی چوٹیں کھانے سے آدمی کی نگاہ بالآخر اس کی اپنی حقیقی فطرت کی طرف موڑے گی۔ اور وہ اپنے باطن کا نظارہ کرے گا، دل کے اندر نعمت کی اس خواہش کی موجودگی کی بناء پر آدمی یکے بعد دیگرے ضربات سہتا ہے اور اس کی نظر اس کے باطن کی طرف موڑتی ہے، بلا استثناء ہر شخص کے لئے یقینی طور پر ایک ایسا وقت آتا ہے جب وہ اپنے باطن کا نظارہ کرتا ہے۔ کوئی اسی زندگی میں اپنے نفس کو دیکھ لیتا ہے اور کوئی ہزار بار جنم لینے کے بعد اپنے باطن کا نظارہ کرتا ہے۔"

بھگت: "یہ سب کچھ گرو اور ایشور کی کرپا پر منحصر ہے۔"

---

سوامی جی:- "ایشور کے کرم کی ہَوا ہمیشہ ہمیشہ چلتی رہتی ہے، آپ اپنی کشتی کے بادبان کھول لیں۔ جب بھی آپ کوئی کام کریں تو اپنے دِل کی پوری توجّہ کے ساتھ کریں۔ رات دِن بس ایک ہی بات سوچتے رہیئے کہ مَیں "سَت چِت آنند" کا جوہر ہُوں، مجھے ڈر کس کا ہے؟ مجھے تشویش کِس بات کی ہے؟ یہ جسم، یہ دماغ اور یہ دانش و فراست سَب کچھ فنا ہو جانے والے ہیں اور "وہ" جو اِن سب سے ماورا ہے "وہ" "مَیں" ہُوں۔"

بھگت:- "وقتاً فوقتاً ایسے خیالات ایک لمحہ کے لیئے آتے ہیں۔ اور پھر غائب ہو جاتے ہیں اور اِس کے بعد ہر قسم کی فضول باتوں پر دھیان دینے لگتا ہُوں۔"

سوامی جی:- "ابتدائی دَور میں ایسا ہوا کرتا ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ آدمی اِس پر غلبہ پا لیتا ہے۔ مگر ابتدا ہی سے دماغی یکسُوئی کی ضرورت ہوتی ہے، ہمیشہ ایک ہی بات سوچیئے۔ "مَیں اَزل سے پاک ذات ہُوں، مَیں اَزل سے عالم ہُوں، مَیں اَزل سے آزاد ہُوں، مَیں کوئی بُری بات کیسے کر سکتا ہوں؟ کیا مَیں عام آدمیوں کی طرح دولت اور حرص و ہَوس میں مبتلا ہو کر خود کو بے وقوف بنا سکتا ہوں؟" ایسے خیالات سے اپنے دماغ کو تقویت دیجئے! اِس کا یقینی طور پر آپ کو فائدہ پہنچے گا۔"

بھگت:- "تھوڑی دیر کے لئے تو دماغ میں طاقت آجاتی ہے لیکن پھر مَیں یہ سوچنے لگتا ہُوں کہ اگر ڈپٹی مجسٹریٹ کے امتحان میں بیٹھ جاؤں تو اس سے مجھے دَولت، عِزّت اور شہرت مِلے گی اور مَیں اچھی اور خوشحال زندگی بسر کروں گا۔"

سوامی جی:- "جَب بھی ایسے خیالات دماغ میں آنے لگیں تو آپ اپنے دِل کے اندر حقیقت و مجاز کے درمیان فرق کر کے دیکھیں۔ کیا آپ نے ویدانت کا مطالعہ نہیں کیا ہے؟ سوتے وقت بھی آپ وِویک کی یہ تلوار اپنے سرہانے رکھیں، تاکہ دُوئی کا خیال آپ کے خواب میں بھی نہ آ سکے۔ اس تشکی کو بُھوئے کا لانے سے بتدریج مکتی آئے گی اور تَب آپ دیکھیں گے کہ سورگ کے کواڑ آپ پر کُھل گئے ہیں۔"

بھگت:- "سوامی جی! اگر ایسی بات ہے تو پھر بھگتی سے متعلق کتابوں میں یہ بات کیسے کہی گئی ہے کہ بہت زیادہ مکتی ہمدردی اور مہربانی کے جذبات کو فنا کر ڈالتی ہے۔"

سوامی جی:- "جن کتابوں میں اِس طرح کی چیزیں لکھی ہوئی ہیں انہیں اُٹھا کر پھینک دیجئے! مکتی کے بغیر دولت اور خواہشاتِ نفسانی سے اِس طرح منہ پھیرے بغیر جس طرح آدمی گندگی کی طرف سے منہ پھیر لیتا ہے اور حواسِ خمسہ کو آگ لگائے بغیر ایک شخص کو سَو بار جنم لے کر بھی نجات حاصل نہیں ہو سکتی -न सिध्यति

ब्रह्मशतान्तरेऽपि— ایشور نام جپنا، دھیان لگانا، پرستش کرنا، یگیہ اور ہَون کرنا، یہ سَب چیزیں محض مکتی حاصل کرنے کے لیئے ہوتی ہیں۔ جن لوگوں کو مکتی حاصل نہیں ہوتی وہ ان لوگوں سے مشابہ ہوتے ہیں جو لنگر پڑی ہوئی کشتی میں بیٹھ کر پتوار چلایا کرتے ہیں۔

न प्रजया धनेन त्यागेनैके अमृतत्वमानशुः — آدمی نہ نسب سے امر ہوتا ہے نہ دولت سے امر ہوتا ہے صرف مکتی

---

سے امر ہوا کرتا ہے۔" (کیولیہ اپنشد-۳)

بھگت: "کیا دولت اور ہوس یا خواہشاتِ نفسانی کا ترک ہی ہر بات کے لئے کافی ہوگا؟"

سوامی جی: "ان دونوں چیزوں کو چھوڑ کر بھی مکتی کے راستہ میں دوسری رکاوٹیں ملیں گی۔ مثال کے طور پر ناموری اور شہرت! غیر معمولی شکتی رکھنے والے معدودے چند افراد ہی اس معاملہ میں اپنا توازن قائم رکھ پاتے ہیں۔ جب ان کی تعریف و توصیف کی جاتی ہے تو ان میں رفتہ رفتہ مختلف خواہشوں کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے۔ محض اسی وجہ سے یوگیوں کی تین چوتھائی تعداد مزید ترقی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ کون ہے جو اس سے سوا جانتا ہے۔ کہ میں اس مٹھ کے قیام اور دوسری چیزوں کے لئے دوبارہ واپس آسکتا ہوں۔"

بھگت: "اگر آپ ایسی باتیں کریں گے تو ہم تو پھر کہیں کے نہ رہیں گے!"

सवामी जी: "خوف کیا ہے؟ अमीरमीरमी:— نڈر رہو، نڈر رہو، نڈر رہو"

آپ نے ناگ مہاشہ کو دیکھا ہے۔۔۔ ایک گھر گرہست کی زندگی گزارتے ہوئے بھی وہ کیسا ہے۔ وہ ایک سنیاسی سے بھی افضل ہے! یہ غیر معمولی مثال ہے! میں نے اس جیسے لوگ شاذ و نادر ہی دیکھے ہیں۔ اگر کوئی شخص گھر گرہست ہونا چاہتا ہے تو اس کو ناگ مہاشہ جیسا ہونا چاہیئے۔ وہ مشرقی بنگال کے افق روحانیت پر ایک ستارہ کی طرح چمکتا ہے۔ ملک کے اس حصّہ کے لوگوں سے کہیئے کہ وہ اس سے اکثر ملتے جلتے رہا کریں۔ اسی میں ان کی بھلائی ہے۔"

بھگت: "ایسا لگتا ہے کہ شری رام کرشن کے الہامی ڈرامہ میں جو اس زمین پر سٹیج ہو رہا ہے۔ ناگ مہاشہ زندہ انسانیت کا کردار انجام دے رہے ہیں۔"

سوامی جی: "قطعاً ایسا ہی ہے۔ اس میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ میں ان سے ملنے کے لئے جانے کی خواہش رکھتا ہوں۔ کیا آپ میرے ساتھ چلیں گے؟ بارش کے پانی سے بھرے ہوئے کھیت مجھے بہت ہی بھلے لگتے ہیں۔ کیا آپ انہیں لکھیں گے کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

بھگت: "ضرور لکھوں گا! وہ جب بھی آپ کی کوئی بات سنتے ہیں تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے اور یہ بات کہتے ہیں کہ اگر آپ کے پاؤں کی ذرا سی دھول بھی وہاں آجائے تو پورا مشرقی بنگال ایک مقدس تیرتھ بن جائے گا!"

سوامی جی: "کیا آپ کو معلوم ہے کہ شری رام کرشن ناگ مہاشہ کو بھڑکتا ہوا شعلہ کہا کرتے تھے۔"

بھگت: "جی ہاں، میں نے سنا ہے۔"

سوامی جی کے کہنے پر بھگت نے تھوڑا سا پرساد لیا اور وہ رات گئے کلکتہ کے لئے روانہ ہو گیا۔ بے خوفی اور نڈرتا کے متعلق سوامی جی نے اپنی زبانِ مبارک سے جو پیغام دیا تھا۔ وہ اس کے بارے میں گہری توجہ سے غور کر رہا تھا اور اس کے ذہن میں ایک عظیم رہنما کے یہ الفاظ گونج رہے تھے۔ "میں آزاد ہوں ۔۔۔ میں آزاد ہوں۔"

---

XIII

سوامی جی نے ذیل کے مضمون میں ان عنوانات پر اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ کام کنچن سے مکتی — ایشور کی رحمت برستی ہے۔ وہ لوگ جو ایشور کی معرفت کے لیے جد و جہد کرتے ہیں — غیر مشروط کرم اور برہمن ایک ہی چیز ہے۔

بھگت: "سوامی جی! شری رام کرشن کہا کرتے تھے کہ ایک شخص جب تک کام کنچن سے مکتی نہ پالے اس وقت تک وہ دھرم کو سمجھنے کی راہ پر بہت آگے تک قدم نہیں بڑھا سکتا۔ اگر ایسا ہے تو پھر ان لوگوں کا کیا بنے گا جو گھر گرہست ہیں؟ اس لیے کہ ان کے ذہن میں دولت اور خواہشات نفسانی جیسی چیزیں سمائی رہتی ہیں۔"

سوامی جی: "آدمی چاہے سنیاسی ہو چاہے گھر گرہست ہو، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ جب تک اس کا دماغ دولت کی حرص اور خواہشات نفسانی سے پاک نہیں ہوگا۔ اس وقت تک وہ ایشور کی جانب توجہ نہیں کر سکتا، ایک بات یاد رکھیے کہ جب تک آدمی کا دماغ ان چیزوں کی گرفت میں رہتا ہے، اس وقت تک سچا گیان، سچا استقلال اور سچا ایقان (شردھا) حاصل نہیں ہو سکتا۔"

بھگت: "تو پھر گھر گرہست تو کہیں کے بھی نہیں رہے۔ ان کو کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے؟"

سوامی جی: "ایک ہی طریقہ ہے — یعنی یہ کہ بڑی نفسانی خواہشات کو ترک کر دیا جائے اور چھوٹی خواہشات کو تسکین دی جائے۔ مکتی کے بغیر ایشور کا گیان حاصل نہیں ہو سکتا۔

"यदि ब्रह्मा स्वयं वदेत् — چاہے وہ خود ہی برہما کیوں نہ ہو۔"

بھگت: "جیسے ہی ایک آدمی سادھو بنتا ہے کیا ویسے ہی وہ چیزوں سے مکت ہو جایا کرتا ہے۔"

سوامی جی: "سنیاسی مکتی کے لیے خود کو تیار رکھنے کی کم سے کم جد و جہد ضرور کرتے رہتے ہیں، جب کہ گھر گرہست کی مثال اس آدمی جیسی ہے جو لنگر انداز کشتی میں بیٹھ کر اپنی پتوار چلاتا رہے، کیا نفسانی خواہشات کبھی ختم بھی ہوتی ہیں؟

भूय एवाभिवर्धते — "یہ ہمیشہ ہمیشہ بڑھتی ہی رہتی ہیں —"

(بھگوت گیتا ۱۴/ ۱۹ × ۱۹)

بھگت: "کیوں؟ حصول مسرت کے لیے حواس خمسہ کو مدت مدید تک استعمال کرنے کے بعد کیا دنیا سے بیزاری کا دور نہیں آتا؟"

سوامی جی: "کتنوں پر یہ دور آتا ہے؟ دماغ اور حواس خمسہ عشرت و نشاط کے عادی ہو جاتے ہیں اور ان پر ان چیزوں کا ایک دائمی اثر چھا جاتا ہے، مکتی اور صرف مکتی، معرفت اور گیان کا واحد راز ہے — مول منتر ہے!"

بھگت: "لیکن کتابوں میں یہ باتیں بھی لکھی ہوئی ملتی ہیں۔ کہ ایک شخص کا اپنی بیوی اور اپنے بچوں کے ساتھ گزارہ کرتے ہوئے پانچ حواسوں پر قابو قائم رکھنا بھی تپسیا ہے۔

गृहेषु पञ्चेन्द्रियनिग्रहस्तपः — جو اپنی خواہشات نفسانی پر قابو رکھتا ہے اور اپنے

گھر بار کے ساتھ رہتا ہے، وہ بھی ویسا ہی ہے جیسے کوئی شخص تپسیا کے لئے جنگل میں رہنے لگے اور دنیا سے منہ موڑ لے۔"

निवृत्तरागस्य गृहं तपोवनम्—

سوامی جی: "بے شک وہ لوگ قابلِ تعریف ہیں جو اپنے مکان میں اپنے خاندان کے ساتھ رہتے ہوئے کرم کبھن کو ترک کر سکتے ہیں۔ لیکن ایسا کام کتنے لوگ کر سکتے ہیں؟"

بھگت: "مگر پھر سنیاسیوں کے متعلق کیا خیال ہے؟ کیا وہ دولت کی حرص اور خواہشات سے قطعاً مبرّا ہوتے ہیں؟"

سوامی جی: "جیسا کہ میں نے ابھی کہا سنیاسی مکتی کے راستے پر ہوتے ہیں کم سے کم وہ اس مقصد کو حاصل کرنے کی جدوجہد ضرور کرتے ہیں لیکن گھر گرہست کو اس خطرہ کا بھی پتہ نہیں ہوتا جو دولت کی ہوس اور خواہشات نفسانی کی راہ سے آتا ہے۔ وہ اپنے نفس کو پہچاننے کی کوئی کوشش تک نہیں کرتے اور پھر ان کے دماغ میں یہ خیال تک نہیں آتا کہ انہیں ان چیزوں سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔"

بھگت: "مگر بہت سے لوگ کوشش ضرور کرتے ہیں۔"

سوامی جی: "اوہ! ہاں! جو لوگ یہ کوشش کر رہے ہیں وہ یقینی طور پر ایک دن مکتی پالیں گے۔ لیکن جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ "ابھی جلدی کیا ہے، وقت آئے گا تو میں کر لوں گا" ان سے مکتی یقینی طور پر بہت دور ہے ایک ہیرو کے الفاظ یہ ہوا کرتے ہیں کہ "سچائی کا ادراک مجھے اسی لمحہ ہونا چاہیئے۔" ایسے ہیرو ہر لمحہ مکتی کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اور الہامی یہ بات کہتی ہے

جس وقت بھی آپکا دل دنیا کی رعنائیوں سے بھر جائے اسی لمحہ آپ دنیا سے کنارہ کش ہو کر ایک سادھو کی زندگی اختیار کر لیں۔"

بھگت: "لیکن کیا شری رام کرشن نے یہ بات نہیں کہی تھی کہ یہ تمام وابستگیاں ایشور کی کرپا سے از خود اس وقت ختم ہو جاتی ہیں، جب کوئی شخص ایشور کی پرستش کرتا ہے۔"

سوامی جی: "ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ایشور کی مرضی سے یہ ساری وابستگیاں ختم ہو جاتی ہیں لیکن ضرورت اس کی ہے کہ ایشور کا یہ کرم پانے سے پہلے آدمی اپنے نفس کا تزکیہ کرے — اس کا خیال، اس کے الفاظ اور اس کا عمل پاک ہوئے، تب ہی اس پر ایشور کے کرم کی بارش ہوگی۔"

بھگت: "اگر ایک شخص کو اپنے خیال، اپنے الفاظ اور اپنے عمل پر قابو حاصل ہو۔ تو پھر ایشور کے کرم کی ضرورت ہی کیا ہے، تب تو وہ خود اپنی شکتی کو بروئے کار لا کر روحانیت کی راہ پر آگے بڑھتا چلا جائے گا۔"

سوامی جی: "ایشور اس پر بڑا مہربان ہوتا ہے جسے وہ دیکھتا ہے کہ دل و جان سے مکتی حاصل کرنے کی جدوجہد کر رہا ہے،

---

لیکن آپ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں اور کوئی جدو جہد نہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ایشور کی مہربانی اور کرم کا ہاتھ آپ تک نہیں آئے گا۔"

بھگت:- "ہر آدمی نیکی کرنے کا خواہشمند ہُوا کرتا ہے۔ لیکن بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر اس کا دماغ بدی کی طرف ملتفت ہو جایا کرتا ہے کیا ہر آدمی یہ نہیں چاہتا کہ وُہ نیک بنے کامل بنے اور ایشور کو پہچانے"؟

سوامی جی:- "آپ یہ بات سمجھئے کہ جو شخص یہ خواہش رکھتا ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ وُہ شخص پہلے ہی سے مکتی کے لئے جدو جہد کر رہا ہے اور جب تک یہ جدو جہد جاری رہے گی ایشور اس پر مہربانی کرتا رہے گا۔"

بھگت:- "اوتاروں کی تاریخ میں ہمیں ایسے بہت سے لوگ دکھائی دیتے ہیں جنہوں نے بڑی پریشانی کی زندگی بسر کی ہے پھر بھی اُنہوں نے کسی تکلیف اور سادھنا کے بغیر ایشور کا گیان حاصل کر لیا۔ انہیں یہ گیان کیسے حاصل ہوا"؟

"سوامی جی:- "ہاں! لیکن انہیں مستقل طور پر ایک زبردست بے چینی رہی ہے عیش مسلسل نے ان کی طبیعت مائل فریاد کر دی سکون اور امن کی طلب ان کے دل کی پرت پرت میں سمائی اور اُنہوں نے اپنے دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا کہ سکون نفس کے بغیر یہ زندگی ایک لمحہ کے لئے بھی قابل برداشت نہیں ہے چنانچہ ان پر ایشور نے مہربانی کی ان میں تامس سے ستو و تک یہ تبدیلی براہ راست پیدا ہو گئی۔"

بھگت:- "تب وہ کوئی بھی راستہ ہو، لیکن وہ کہہ سکتے ہیں کہ اُنہوں نے اس طرح ایشور کا سچّا گیان حاصل کر لیا ہے۔"

سوامی جی:- "ہاں کیوں نہیں؟ لیکن ایک مکان میں اس کے دروازے سے داخل ہونا کیا اس سے بہتر نہیں ہے کہ اس میں اس کی نالیوں کے ذریعہ سے داخل ہونے کی کوشش کی جائے"؟

بھگت:- "بے شک یہ صحیح ہے! تو پھر یہ بات قطعی طور پر طے ہو گئی کہ صرف ایشور کے کرم اور اس کی مہربانی ہی کے ذریعہ اسے پہچانا جا سکتا ہے اور اس کا گیان حاصل کیا جا سکتا ہے۔"

سوامی جی:- "ہاں ایشور کے کرم سے ایک شخص اس کا گیان حاصل کر سکتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ تھوڑے لوگ ہی ایسا کرتے ہیں۔"

بھگت:- "مجھے ایسا لگتا ہے کہ جو لوگ خواہشات نفسانی اور دولت کی حرص و ہوس کو چھوڑ کر اپنی شکتی کو بروئے کار لاتے ہیں وہ ایشور کا گیان حاصل کرنے کے لئے اپنی مدد آپ کے اصول پر عمل کرتے ہیں اور وہ لوگ جو ایشور کا نام لیتے ہیں اور اسی کے کرم اور اسی کی مہربانی پر انحصار کرتے ہیں ان کو دنیا سے مکتی دلانے میں ایشور ان کی مدد کرتا ہے اور وُہ اپنی قدرت سے انہیں گیان کی اعلےٰ منزل تک پہنچاتا ہے۔"

سوامی جی:- "یہ سچ ہے یہ دونوں مختلف نقطہ ہائے نگاہ ہیں پہلا نقطۂ نگاہ جِنئی کا ہے اور دوسرا بھگتوں کا! لیکن مکتی ان دونوں ہی نقطہ ہائے نگاہ کی اصل کُنجی ہے۔"

---

بھگت:۔ "اس میں کیا شبہ ہے؟ لیکن شری گریش چندر گھوش[1] نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ایشور کی مہربانی کے لیے کوئی شرط نہیں ہوتی، اس کے لیے کوئی قانون یا کوئی ضابطہ نہیں ہے، اگر کوئی ضابطہ، کوئی قانون یا کوئی شرط ہو تو پھر اسے مہربانی نہیں کہا جا سکتا، ایشور کی کرپا اور مہربانی کو تمام قوانین فطرت سے ماورا ہونا چاہیئے۔"

سوامی جی:۔ "لیکن گریش چندر نے جس سطح سے متعلق یہ بات کہی ہے، اس سطح سے بلندی پر کوئی اعلٰے قانون یقینی طور پر برسرکار ہونا چاہیئے، جس کا ہمیں کوئی علم نہیں، بہ الفاظ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ارتقا کے بلند ترین مدارج سے تعلق رکھتے ہیں، جہاں نہ تعلق مقام ہے نہ قید وقت ہے، لیکن جب ہم ان مدارج میں پہنچیں تو پھر ایشور کی مہربانی کس پہ ہوگی، اگر وہاں سبب و مسبّب کا کوئی قانون موجود نہ ہو، وہاں معبود و عابد، گیانی اور وہ شئے، جس کا گیان کیا گیا ہو، عارف اور وہ ذات، جس کی معرفت حاصل کی گئی ہو سب ایک ہوگا۔۔ اسی کو جوہر یا برہم کہا جاتا ہے اور یہی وہ قانون وحدت ہے جو عالم کثرت میں جاری ہے۔"

بھگت:۔ "سوامی جی! آپ کی یہ باتیں سن کر میں سارے فلسفے اور دھرم (دید مل اور ویدانت) کے جوہر کو سمجھ گیا ہوں، مجھے ایسا لگتا ہے کہ اب تک میں ایسے عالم میں زندگی بسر کر رہا تھا جس میں الفاظ ہی الفاظ تھے، معنی نہیں تھے۔


ویدانت سوسائٹی شمالی کیلی فورنیا کا مندر جو ۱۹۰۵ء کو بنا تھا

[1] بنگالی سٹیج ڈرامہ کے مشہور اداکار اور شری رام کرشن پرم ہنس کے زبردست بھگت۔

# سوال و جواب

سوال: میں یہ جاننا پسند کروں گا کہ اس وقت ہندوستان میں فہم و فراست، عقل و منطق کے میدان میں کیا کیا سرگرمیاں ہو رہی ہیں؟ وہاں روحانیت کے بارے میں سوالات پر کس حد تک بحث و تمحیص کی جاتی ہے؟

جواب: جیساکہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، ہندوستانیوں کی اکثریت دویت پسند ہے اور بہت کم لوگ ادویت وادی ہیں۔ ادویت وادی اقلیت میں ہیں۔ ان میں بحث و تمحیص کا سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ مایا اور جیو! جب میں اس ملک (امریکہ) میں آیا، میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ امریکہ کے محنت کش اور مزدور بھی ملک کی سیاسی صورت حالات سے باخبر تھے۔ انہیں پتہ تھا کہ فلاں سیاسی عقیدہ کن اصولوں پر قائم ہے اور فلاں سیاسی عقیدہ کی کیا بنیادیں ہیں۔ انہیں یہ بھی پتہ تھا کہ اس ملک میں کیا کیا سیاسی تحریکیں چل رہی ہیں اور ان کے لیڈر کون کون سے لوگ ہیں۔ لیکن جب میں نے ان سے مذہب و ایمان کے متعلق سوالات کئے، ان سے پوچھا کہ آپ گرجا گھر کیوں جاتے ہیں؟ عیسائیوں کے فلاں فلاں فرقے کے اصول کیا کیا ہیں؟ تو ان لوگوں سے کوئی جواب

---

سوامی وویکا نند نے ۲۵ مارچ ۱۸۹۶ء کو امریکہ کی مشہور و معروف یونیورسٹی ہارورڈ یونیورسٹی کی گریجوایٹ فلاسفیکل سوسائٹی میں ویدانت فلاسفی پر جو تقریر کی، یہ سوال و جواب اس کے اختتام پر ہوئے۔

نہ بن پڑا۔ انہوں نے کہا: "ہم گرجا گھر جاتے ہیں اور بس، ہمیں یہ پتہ نہیں کہ گرجا گھر جانے سے کیا فائدہ ہوتا ہے اور مذہب کا اصول وعقیدہ کیا ہے"۔

لیکن ہندوستان میں صورت حالات بالکل مختلف ہے۔ آپ کسی دورافتادہ گاؤں کے کسان اور کاشتکار سے جاکر پوچھئے، آپ کے ملک پر راج کون کرتا ہے، برسراقتدار کون ہے تو یہ کسان اور کاشتکار کہے گا۔ میں نہیں جانتا کہ راجہ کون ہے اور کون سی پارٹی برسراقتدار ہے۔ مجھے تو صرف اتنا معلوم ہے کہ میں اتنے روپے ٹیکس دیتا ہوں۔ اتنی ہی سیاسیات سے ان کی دلچسپی اور رغبت ہے! لیکن اگر ان سے دریافت کیا جائے کہ آپ کا مذہب وایمان کیا ہے؟ جواب ملے گا ہم دو ویت وادی ہیں یہی نہیں! ان سے سوال کر دیکھئے وہ آپ کو بتائیں گے کہ جیو اور مایا میں کیا فرق وامتیاز ہے۔ اَن پڑھ سے اَن پڑھ شخص بھی جو علم وتعلیم سے بے بہرہ ہو سادھوؤں اور سنتوں سے جیو اور مایا اور روحانیت مذہب کے متعلق بہت سی جانکاری حاصل کر لیتا ہے اور آپ کے اس سوال پر بحث وتمحیص بھی کر سکتا ہے۔ ہندوستان میں تو لوگ دن بھر کی محنت ومشقت کے بعد چوپال پر یا مندر میں اکھٹے ہو کر مذہب وروحانیت کے ایسے سوالات پر بھی غور وخوض کرتے رہتے ہیں۔

سوال: ہندوؤں کے نزدیک دقیانوسی کے کیا معنی ہیں؟۔

جواب: عصر جدید میں دقیانوسی ہونے سے مراد ہے اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، شادی غمی پر خاص رواجوں اور رسومات کی اندھا دھند تقلید کرنا اور ذات پات کے بندھنوں کو نبھانا۔ ایک ہندو اس ضابطہ کو پورا کرنے کے بعد خواہ کسی مکتب فکر کو اپنا لے، یہ اس کی مرضی ہے۔ ہندوستان میں چرچ اس طرح کبھی منظم نہیں ہوا جس طرح آپ کے ہاں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دقیانوسی کے متعلق بھی کوئی ناطق رائے نہیں دی جا سکتی کہ فلاں فلاں اصول کو ماننا دقیانوسی ہے۔ یوں کہہ لیں کہ وہ لوگ جو سناتنی کہلاتے ہیں، ایک طرح سے دقیانوسی ہوتے ہیں یا دوسرے الفاظ میں ویدوں کو ماننا ہی دقیانوسی ہے، لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ ویدوں کو ماننے والے دو ویت وادی یا دقیانوسی نہیں ہوتے بلکہ ایسے لوگ اکثر وہ ہوتے ہیں جو ویدوں کی بہ نسبت پرانوں پر زیادہ ایمان وعقیدہ رکھتے ہوں۔

سوال: آپ کی ہندو فلسفی کا یونانیوں کی سٹوائک ( Stoic ) فلاسفی پر کیا اثر پڑا؟۔

جواب: غالباً یہ اثر سکندر کی فوجوں کی وساطت سے پڑا ہوگا۔ یہ باور کرنے کے لئے

---

صفحہ ۶۷

بھی وجہ موجود ہے کہ یونان کے دانشور پائیتھاگورس ( Pythagoras ) اور اس کے ہم فکر دانشوروں پر بھارت کے سانکھیہ شاستروں کا گہرا اثر پڑا۔ ہمارے نزدیک سانکھیہ فلسفہ کے ذریعہ ویدوں کے فلسفہ کو ہم آہنگ بنانے کی پہلی قابل قدر کوشش کی گئی تھی۔ ویدوں میں بھی کپل رشی کے نام کا جنہوں نے سانکھیہ فلسفہ کو جنم دیا، ذکر موجود ہے۔

ऋषि कपिलं प्रसूतं यस्तमग्रे —

"مہرشی کپل آدی مہرشی ہیں۔ جنہوں نے گیان کو نیا روپ، نیا رنگ اور نیا نکھار دیا۔"

سوال: سانکھیہ فلسفہ کا مغربی سائنس سے کیا تضاد ہے"؟

جواب: تضاد کہاں ہے؟ میں تو کہوں گا کہ سانکھیہ فلسفہ اور مغربی سائنس ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ آکاش اور پرانوں کے متعلق ہماری تھیوری وہی ہے جو آپ کی فلاسفی ہے۔ ارتقاءِ حیات کا جو نظریہ آپ کے فلسفہ کی بنیاد ہے، وہی یقین اور عقیدہ ہمارے یوگیوں کا ہے اور یہی سانکھیہ درشن کی بنیاد ہیں۔ مثلاً مہرشی پتنجلی نے اسی اصول ارتقائے حیات کا ذکر کرتے ہوئے مختلف عناصر کی شکل وصورت تبدیل ہونے کا ذکر کیا ہے۔ ان کا ایک شلوک ہے

जात्यन्तरपरिणामः प्रकृत्यापूरात्

اس کا مطلب وہی کچھ ہے جو آپ کی جدید سائنس کہتی ہے۔ فرق صرف تشریح و وضاحت کا ہے۔ ان کے نزدیک یہ تبدیلی روحانی ہوتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اصول ارتقائے حیات میں یہی روحانیت کارفرما ہے۔ ان کا قول ہے کہ کسان نے جب کسی کھیت کو پانی دینا ہوتا ہے وہ محض پانی کی نہر پر منہ پر رکھے گئے ڈھکنے کو کھول دیتا ہے۔ اس ڈھکنے نے پانی کو کھیتوں سے دور کر رکھا تھا۔ ڈھکنا کھول دیا، کھیتوں کو پانی ملنا شروع ہو گیا۔

निमित्तमप्रयोजकं प्रकृतीनां वरणभेदस्तु ततः क्षेत्रिकवत्—

اسی طرح ہر انسان کی روح، روح بسیط، لامحدود ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جن زنجیروں نے اس جکڑ رکھا ہے، جن قیدوں نے اسے باندھ رکھا ہے، انسان انہیں ہٹا دے۔ روح کے پردوں کو اتار پھینکے۔ جونہی انسان ان خرمستیوں اور ان نفس پرستیوں سے اپنے آپ کو آزاد کر لیتا ہے اس کی روح، اس کی آتما اپنے نکھار اور اپنی چمک دمک اس پر ظاہر کر دیتی ہے۔ یہی اصول ارتقائے حیات ہے۔ ہمارے ان فلاسفروں کا کہنا ہے کہ انسان اور حیوان میں فرق صرف یہ ہے کہ حیوان کی روح ان پابندیوں اور قیدوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ جونہی یہ روح اس قید و بند

سے رہائی پالیتی ہے، انسان کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہی نہیں، انسان ترقی کرتا ہوا روحانی منزلیں طے کرتا ہوا، خدا بن جاتا ہے۔ بندہ مولا بن جاتا ہے۔ جیو ایشور بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں ہمارا نئی تھیوریوں سے لڑنے جھگڑنے یا ان سے متنفر ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ اور پھر سانکھیہ درشن میں ادراک کے متعلق جو نظریہ ہے، وہی نظریہ جدید ترین فزیالوجی (physiology.) میں موجود ہے۔

سوال: لیکن آپ کا طریقہ دوسرا ہے۔

جواب: ہاں! ہمارا دعویٰ ہے کہ یک سوئیِ قلب، من کی ایکاگرتا سے سب علم و فضل حاصل ہو سکتا ہے۔ خارجی سائنس میں یکسوئی قلب کا مطلب ہے، دل کی تمام تر قوت اور توجہ کو باہر لگانا لیکن علم باطن میں اس کا مطلب ہے، پھیلے ہوئے خیالات کو اکٹھا کرنا، سمیٹنا اور اپنے دل کو اپنے اوپر، اپنے اندر مرکوز کرنا۔ ہم اسے یوگ ودیا بھی کہتے ہیں اور دھیان یوگ بھی۔

سوال: کیا دھیان یوگ میں ان اصولوں کی بنیادی سچائیاں آشکار ہوتی ہیں؟

جواب: یوگی اس سلسلے میں بہت لمبے چوڑے دعوے کرتے ہیں۔ ان کا قول تو یہ ہے کہ دھیان یوگ کی بدولت نہ صرف ان اصولوں کی بلکہ دنیا کے تمام اصولوں کی سچائی آشکار ہوجاتی ہے اور اندر اور باہر کی دنیا کی ہر حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے۔

سوال: ادویت وادی علم کائنات کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟

جواب: ادویت وادی تو کہیں گے کہ علم کائنات اور دوسرے سب علم محض مایا ہیں محض مجازی دنیا کی پیداوار ہیں۔ جن کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں۔ لیکن جب تک ہم جسم اور حواس کی گرفت و قید میں ہیں تب تک ہمیں لازمی طور پر ان مختلف مظاہر کو دیکھیں گے۔ ان کے نزدیک یہ سب مظاہر ایک خاص ربط و ضبط سے ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن وہ اس ربط و ضبط کو بھی قید و بند تصور کرتے ہیں۔ اس لئے ان کا دعویٰ ہے کہ مکتی اور نجات کے لئے انسان کو ان سے اوپر اٹھنا ہوگا۔

سوال: کیا ادویت وادی دویت وادیوں کے خلاف نہیں؟

جواب: اپنشدوں کی فلاسفی کسی خاص قرینہ سے سجائی ہوئی فلاسفی نہیں۔ اس لئے ہمارے دانشوران کے مطالعہ کے بعد ایسے نتائج اخذ کر لیتے ہیں جو ان کے بنیادی نظریات کے ساتھ مطابقت رکھتے ہوں۔ اپنشدوں کو ان دانشوروں نے ہمیشہ ہمیشہ سے اسی رنگ میں دیکھا ہے

اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اپنشدوں میں مختلف قسم کے فکر و ذہن کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس لئے میں تو یہ کہتا ہوں کہ اودیت وادی ودیت وادیوں کے خلاف نہیں ہیں، یہ تو اپنے اپنے فہم و ادراک کی بات ہے۔ یہ تین بنیادی روحانی اقدامات میں سے ایک اقدام کے مترادف ہے۔ مکمل مذہب تو ان تینوں اقدامات پر مشتمل ہے۔ ابتدا دویت مت سے ہے لیکن جب انسان اوپر اٹھتا ہے، اونچا جاتا ہے تب وہ ادویت وادی ہوجاتا ہے۔ اور پھر ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں پہنچکر نہ دویت رہتا ہے نہ ادویت۔ ظاہر ہے کہ تینوں اقدامات سے ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ ایک ہی منزل کی طرف جانے کے لئے تین درجے ہیں۔

سوال: مایا یعنی جہالت کا وجود ہی کیوں قائم ہے؟

جواب: 'کیوں' کا میں کیا جواب دوں؟ ایسے سوالات بھی ایک خاص حد تک ہی دماغ میں اٹھتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ "کیوں" کا سوال بھی مایا میں رہ کر ہی پوچھا جا سکتا ہے۔ جب تک مایا ہے، یہ سوال ہے۔ مایا سے پردے اٹھنے پر یہ سوال کہاں رہتا ہے؟ وہاں پہنچ کر تو یہ سوال خود بخود حل ہوجاتا ہے۔ سوال کا وجود ہی قائم نہیں رہتا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہتا۔

سوال: کیا ذاتی خدا یعنی ساکار ایشور کا تصور اور نظریہ بھی مایا کی پیداوار نہیں؟

جواب: ہاں ہے! لیکن ذاتی خدا اور ساکار ایشور بھی تو وہی ایشور ہے جو مایا کی آنکھ سے دیکھا جاتا ہے۔ قوانین قدرت کی قید و بند میں جکڑی ہوئی آتما ہی پرماتما کی انش ہے۔ جو آتما اس قید و بند سے آزاد ہے وہ ایشور کہلاتی ہے۔ ذاتی خدا اور ساکار ایشور کے متعلق آپ کو کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔ یوں سمجھئے کہ ایک انسان سورج کی طرف سفر شروع کرتا ہے۔ ابتدائے سفر میں سورج بہت چھوٹا ہوگا۔ لیکن جوں جوں منزلیں طے کرتا ہوا انسان سورج کے قریب پہنچتا چلا جائے گا، توں توں سورج کی شکل و صورت بڑھتی ہی جائے گی۔ سورج تک پہنچنے تک اس نے سورج کی جتنی صورتیں دیکھیں وہ سب حقیقی ہونے کے باوجود مکمل نہیں ہوتیں۔ روحانی سفر میں انسان کو ایسی ہی منزلوں میں سے گذرنا پڑتا ہے۔ وہ اُس ایک خدائے پاک کی مختلف صورتیں دیکھتا ہے لیکن یہ صورتیں حقیقی ہونے کے باوجود صورت کامل نہیں رکھتیں۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز ہرگز یہ نہیں کہ یہ شکلیں اور یہ صورتیں غلط اور بے بنیاد ہیں۔

سوال: وہ کون سا سادھن اور طریقہ ہے جس کی بدولت ہم پرماتما کو جان سکتے ہیں؟

جواب: ہمارے ہاں اس کے دو طریقے بتائے جاتے ہیں۔ ایک طریقہ منفی طریقہ ہے

دوسرا مثبت طریقہ ہے۔ طریقہ مثبت وہی ہے جس پر ساری دنیا عمل پیرا ہے۔ محبت و پیار کا طریقہ۔ اپنے اس دائرہ عشق و محبت کو پھیلاتے چلے جائیے، آپ ایشور تک پہنچ جائیں گے عشق و محبت کا یہ راستہ ہمیں عشق و محبت کے مخزن تک لے جائے گا، پرماتما تک لے جائے گا۔

دوسرا طریقہ منفی طریقہ ہے جسے "نیتی نیتی" کہتے ہیں۔ دل میں جتنے بھی خیالات اٹھتے ہیں ان سب کو فنا کرتے چلے جائیے، اسے کئی لوگ وچارتپ یا وچار سادھنا بھی کہتے ہیں۔ جو جو خیالات اٹھتے ہیں انہیں باطل تصور کرتے ہوئے مٹاتے چلئے بالآخر دل دماغ کی موت ہوجائے گی۔ عقل و دلیل گم ہوجائے گی۔ خیالات کی لہریں مرجانے سے روح پرسکون ہوجائے گی، شانت ہوجائے گی اسے جیتے جی مرجانا بھی کہتے ہیں، اسے خود کو فنا کرنا بھی کہا جاتا ہے۔ اس فنا کے بعد ہی بقا کی صورت دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہم اس حالت کو سمادھی کہتے ہیں۔ دھیان سے سمادھی مل جاتی ہے۔

سوال: آپ کا مطلب یہ ہے کہ خیال کو ہستی میں فنا کر دیا جائے۔

جواب: نہیں! خیال کو ہستی میں فنا کرنا نہیں بلکہ ہستی کو خیال میں فنا کرنا ہے۔ اس فنا کی صورت میں یہ دنیا فنا ہو جاتی ہے اور صرف 'میں' باقی رہ جاتا ہے۔ صرف میری ہستی ہی باقی رہتی ہے باقی سب کچھ فنا ہو جاتا ہے۔

سوال: جرمنی کے بعض فلاسفروں کا خیال ہے کہ ہندوستان میں جو بھگتی یوگ ہے، یہ دراصل مغرب کے اثر کی پیداوار ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: میں اس دعوے کو باطل اور بے بنیاد سمجھتا ہوں۔ اور یہ دعویٰ محض ایک خیال وجنون ہے۔ ہندوستان میں بھگتی اور طرح کی ہے، مغرب میں بھگتی اور طرح کی ہے۔ دونوں میں میل کہاں؟ ہماری بھگتی کا لب لباب اور بنیادی نقطہ یہ ہے کہ انسان ہر قسم کے خوف و اندیشہ سے نجات پالے۔ ہر خوف کو دل سے باہر نکال کر صرف ایشور سے پیار کرنا اور اس سے محبت کرنا لیکن مغرب میں بھگتی کے ساتھ خوف ملا جلا رہتا ہے۔ خوف میں بھگتی کیسی؟ سادھنا کیسی؟ دھیان کیسا؟ بھگتی کے ہوتے ہوئے تو خوف کی بجائے ذات باری سے جذبہ عشق و محبت سے پھوٹتے رہتے ہیں۔ سرتاپا پیکر محبت بن جانے سے ہی بھگتی نصیب خاطر ہوتی ہے۔ اور پھر مغربی فلاسفروں کا یہ دعویٰ اس لئے بھی باطل ہے کہ بھگتی کا اولین ذکر اپنشدوں میں آیا ہے اور یہ اپنشد عیسائیوں کی بائیبل سے کئی گنا زیادہ قدیم اور پرانے گرنتھ ہیں۔ یہی نہیں سنگھتا، ویدمنتروں میں بھی بھگتی کی تعریف ملتی ہے۔ لفظ بھگتی مغرب کی پیداوار ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لفظ کو شردھا نے جنم دیا ہے جس سے

---

اہل مغرب غیر آشنا ہیں۔

سوال: عیسائیت کے متعلق ہندوستانی فکر و نظر کیا کہتی ہے؟

جواب: عیسائیت کو ہم بہت اچھا سمجھتے ہیں۔ ہم اس میں ویدانت کو جلوہ فرما دیکھتے ہیں۔ ہندوستان میں روحانیت کے متعلق ہمارا بالکل انوکھا اور نرالا نظریہ ہے۔ فرض کیجئے کہ میرا ایک بیٹا ہے، مجھے اس کو کسی مذہب اور رواج کی تعلیم نہیں دینی چاہئے میں تو اسے صرف پرانایام سکھاؤں گا یا ایک آدھ منتر کا جاپ کرنا سکھادوں گا اور یہ منتر بھی سیدھا سادا منتر ہوگا جس میں کہا جائے گا: "میں اس مالکِ دوجہان کی عبادت وریاضت کرتا ہوں اور اسی سے دعا کرتا ہوں کہ وہ دل کو منور کر دے اور مجھے گیان پرکاش دے۔" ایسی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مختلف فلاسفروں اور مختلف روحانی معلموں کے خیالات سنے گا۔ اور تب ان میں سے کسی ایک مہاپرش ــــ مردِ کامل کو پسند کرے گا جو اس کے خیال میں اس کے نظریات کو زیادہ اپیل کرنے والا ہوگا۔ یہ معلم اس کا گورو اور پیرو مرشد بن جائے گا اور وہ اس گورو کا شیشیہ بن جائے گا۔ ایسا شیشیہ اپنے گورو سے کہے گا: "آپ جس فلاسفی کی تعلیم دیتے ہیں، وہ میرے نزدیک بہترین فلاسفی ہے۔ مہربانی کرکے مجھے اس فلاسفی کی تعلیم دیجئے۔"

ہمارے ہاں بنیادی بات یہ ہے کہ روحانیت میں کون سی مخصوص راہ اپنائی جائے۔ اس کے انتخاب کے بارے میں قطعی اختیارات آپ کو ہی حاصل اور نصیب ہونے چاہئیں یہ آپ کی مرضی ہے کہ آپ کس راستے کو پسند کرتے ہیں۔ ہم کسی پر اپنا فیصلہ نہیں ٹھونستے بلکہ ہر ایک کو اس بات کی مکمل آزادی دیتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں میرا نظریہ آپ کا نظریہ نہیں ہو سکتا، آپ کے نظریہ سے میں اتفاق نہیں کر سکتا۔ ہر ایک کو اپنا راستہ خود منتخب کرنا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ اس آزادی کی بدولت میری لڑکی کا فلسفہ حیات کچھ اور ہو، میرے بیٹے کا مکتب فکر کچھ اور، اور میرا کچھ اور۔ ہر ایک اپنا اپنا اشٹ ہوگا ہر ایک کا راستہ جدا جدا ہوگا۔ میرا اشٹ کیا ہے، یہ میں اپنے تک رکھوں گا۔ روحانیت کیا ہے؟ عابد و معبود کا رشتہ، یہ ناطہ بھگت اور بھگوان کے درمیان ہوتا ہے۔ اس میں کسی دوسرے کے دخل کی کیا بات ہے؟ دوسروں کو اس سے متعلق کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ دوسروں کا راستہ کیا ہونا چاہئے، اس کا انتخاب اور فیصلہ انہیں خود کرنا ہوگا۔ اس لئے ہم ہندوستان میں صرف عام فلسفہ حیات اور زندگی کے عام طریقوں کی ہی تعلیم دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر میں ایک ٹانگ کے سہارے کھڑا ہو سکتا ہوں تو مجھے دوسروں کو یہ تلقین ہرگز نہیں

---

ہندوستان میں نئے دور میں ہندوستان کے لوگ اب اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دے رہے۔

جواب: مغرب میں جس علم کو اب ہپناٹزم کہتے ہیں وہ ایک حقیقی علم کا جزو و عنصر ہے ہندو اس علم کو ایک دوسرے نام سے پکارتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ پر مایا کا جادو پہلے ہی چل چکا ہے یعنی آپ پر پہلے ہی ہپناٹزم کا اثر ہو چکا ہے اب آپ کا کام اس طلسم کو توڑ کر اپنے آپ کو اس جادو کے چنگل سے آزاد کرانا ہے "سورج میں جس کی چمک ہے، چاند میں جس کا حسن ہے، ستاروں میں جس کی چشمک ہے، بجلی میں جس کی روشنی لہراتی ہے اور آگ میں جس کی حرارت ہے وہ ایک آتما سے ہے۔ اس کی چمک سے سورج چمکتا ہے، چاند میں اس کا حسن ہے، ستاروں میں اس کی چشمک ہے، بجلی میں اس کی روشنی لہراتی ہے، آگ میں اس کی حرارت ہے"۔ کٹھ اپنشد کا یہ شلوک آتما کے بارے میں ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ آتما جاگتی ہے تو ساری کائنات جاگ اٹھتی ہے۔ اس کو پہچاننا، اس کو جاننا اور کیا ہے۔ روح پر پڑے ہوئے مایا کے طلسم کو توڑنا۔ ہم تو کہتے ہیں کہ وہ مذہب اور دھرم جو اس سچائی کو نظرانداز کرتے ہوئے دوسری باتوں کے حقیقی ہونے کی تعلیم دیتا ہے وہ ہپناٹزم کے سوا اور کچھ نہیں۔ صرف ادویت وادی ہی مایا کے اس علم ہوش ربا میں نہیں پھنستا۔ ادویت وادی ہی کا نظریہ حیات ہے جو اسے یہ بات ذہن نشین کراتا ہے کہ ہر قسم کی دویت واد اپنے ساتھ ہپناٹزم اور فریب لاتا ہے۔ لیکن ادویت وادی کہتا ہے کہ اس جادو، اس فریب کا پردہ چاک کر دو، تم جسم نہیں، تم جسم سے اوپر اٹھو۔ ادویت وادی یہاں تک کہتا ہے کہ ویدوں کو بھی بالائے طاق رکھ دو، ساکار ایشور ذاتی خدا کو پرے کر دو، ساری دنیا کو پرے کر دو، اپنے اس جسم اور دل و دماغ کو پرے ہٹا دو اور پھر کچھ کرنا کرانا باقی نہ رہ جائے ہپناٹزم سے بچنے کا یہی واحد طریقہ ہے۔ یہ ہپناٹزم دور کرنے کا طریقہ ہے۔ اس حالت کو، اس مقام اور اس منزل کو پا لیجئے جس مقام پر پہنچ کر انسان پکار اٹھتا ہے "میں نہ نیکی ہوں، نہ بدی ہوں، نہ رنج ہوں، نہ راحت ہوں، مجھے نہ ویدوں کی پرواہ ہے، نہ مجھے پوجا پاٹھ کے کسی طریقہ کی قید ہے، مجھے نہ کھانے کی ضرورت ہے، نہ پینے کی، میں ہی ست، چپ آنند ہوں۔ ست، چت آنند، میں ہی سب کچھ ہوں۔ میں ہی پرماتما ہوں، میں ہی ایشور ہوں، سوہنگ، سوہنگ"۔

اس جادو اور اس فریب کو جان لیجئے اور پھر اس کے بخیئے ادھیڑ دیجئے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم نے زمانہ قدیم میں ہی اس حقیقت کو پہچان لیا تھا۔ اس راز فطرت کو اہل مغرب اب

تھوڑا تھوڑا سمجھنے لگے ہیں۔ لیکن وہ اس راز کے ہر گوشے اور ہر کونے سے واقف نہیں ہو سکے۔ مجھے افسوس ہے کہ اہل مغرب ابھی اس علم کا عشر عشیر بھی نہیں جان پائے، ہمارے رشیوں نے جسے صدیوں پہلے جان لیا تھا۔

سوال: آپ کی سوکھشم شریر، لطیف جسم سے کیا مراد ہے؟

جواب: سوکھشم شریر اور لطیف جسم کو ہم لنگ شریر بھی کہتے ہیں۔ جب یہ جسم مر جاتا ہے تب تو یہ روح ایک جسم کو چھوڑ کر دوسرے جسم کو کس طرح اختیار کرتی ہے؟ کوئی قوت بھی جسم کے بغیر نہیں رہ سکتی، اس لئے، ان سب قوتوں کی سرچشمہ قوت، آتما کے لئے اس جسم کا کچھ لطیف حصہ باقی رہ جاتا ہے جس سے یہ سوکھشم شریر لطیف جسم بنتا ہے۔ یہی سوکھشم شریر ہمارے من اور سنسکاروں اور وچاروں سے بنتا ہے۔ اگر میں نے نیا جسم کسی دانشور اور صاحب ہوش، صاحب ایمان کا پایا ہو تو یہ دماغ ایشور، صاحب ہوش، صاحب ایمان کا دماغ بن جائے گا۔ یوگی تو یہاں تک کہتے ہیں کہ آپ اسی زندگی میں بھی سوکھشم شریر کے ذریعہ اپنے جسم کو تبدیل کر سکتے ہیں۔

ہمارے یوگی اس بارے میں حیرت انگیز باتیں کہتے ہیں۔ مجھ سے پوچھئے تو میں کہوں گا کہ تجربہ اور مشاہدہ کا ایک ذرہ، ہزاروں من بھاری تھیوری سے کہیں زیادہ بیش قیمت ہے۔ مجھے ان دعووں کو جھٹلانے کا کوئی حق نہیں۔ آپ کو ان کی تردید محض اس لئے نہیں کرنی چاہئے کہ آپ کے مشاہدہ میں ایسی باتیں نہیں آئیں۔ ان کی کتابیں تو کہتی ہیں کہ آپ تھوڑی سی ریاضت اور مشق کے ساتھ ایسی حیرت انگیز باتیں انجام دے سکتے ہیں جن کا کوئی حد وحساب نہیں۔ چھوٹے چھوٹے حیرت انگیز نتائج تھوڑی سی مشق سے برآمد ہو جاتے ہیں۔ اس بارے میں کسی شک وشبہ کرنے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ اس بارے میں کوئی لاف زنی نہیں کی گئی۔ یہی نہیں، یہ یوگی تو اپنی مقدس کتابوں میں لکھی ہوئی حیرت انگیز باتوں کو بہت ہی سائنٹفک طریقے سے بیان کرتے ہیں۔ حیرت کی بات تو یہی ہے کہ دنیا کے کسی ملک میں چلے جائیے، آپ ہر قوم میں ایسے یوگیوں کی کرامات کے کتنے ہی قصے مروج دیکھیں گے۔ اس آدمی کی تو کوئی بات نہ کیجئے جو ان سب باتوں کو غلط سلط سمجھتا ہے اور ان کے حق میں کسی شہادت کو سننے یا کسی ثبوت کو دیکھنے کا آرزومند نہیں۔ ایسا شخص متعصب ہے، اس کے سامنے ان باتوں کی وضاحت کرنے کی کیا ضرورت ہے حق وصداقت کا تقاضا یہ ہے کہ جب تک آپ ان کو غلط نہ ثابت کر دیں، تب تک آپ ان کو غلط اور بے بنیاد نہیں کہہ سکتے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ہم ان باتوں کی تردید تو کر نہیں سکتے

پھر بھلا ہم کیسے ان کی صحت سے انکار کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس یوگی کہتے ہیں کہ یہ سب باتیں خداداد کرامات نہیں ہیں بلکہ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ آج بھی ان سب باتوں کو کرکے دکھا سکتے ہیں۔ ہندوستان میں تو آج بھی ایسی بہت سی حیرت انگیز باتیں کرکے دکھائی جاتی ہیں لطف یہ ہے کہ یہ سب باتیں کرامات نہیں۔ اس بارے میں متعدد کتابیں ہیں۔ اس سلسلے ہم ان یوگیوں کو جس قدر داد وتحسین دیں اتنی ہی کم ہے۔

سوال: کیا آپ وثوق سے بتا سکتے ہیں کہ وہ کیا کیا باتیں ہیں جو یوگی کرکے دکھا سکتا ہے؟

جواب: یوگی یہ نہیں کہتے کہ انہیں کوئی غیر معمولی صدق واعتماد دے دیجئے۔ وہ تو کہتے ہیں کہ کہ آپ جتنا بھروسہ کسی دوسری سائنس کو دیتے ہیں اسی قدر اعتماد اس سائنس کو دیجئے۔ یوگی کا نصب العین بے حد بلند ہے۔ میں نے ایسی حیرت انگیز باتیں دیکھی ہیں جنہیں یکسوئی قلب کی قوت کو تیز کرنے سے سرانجام دیا جا سکتا ہے اس صورت میں مجھے یوگیوں کے دعووں کی تردید کرنے کی کیا مجال ہے۔ یوگی کا نصب العین یہ ہے کہ سرد شکستان اور سرد دریا یک ایشور کو پہچان کر، جان کر لافنا سکون واطمینان، آنند حاصل کرنا ہے۔ میں ایک ایسے یوگی کو جانتا ہوں جسے ایک مرتبہ ایک پھن دار پھنیر سانپ نے کاٹ کھایا تھا۔ شام کو جب اسے ہوش آیا تو اس سے پوچھا گیا کہ صبح کیا ہوا تھا تو وہ یوگی مسکرا کر کہنے لگا "میرے محبوب میرے ایشور کا سلام و پیغام آیا تھا۔"[1] اس منزل پر پہنچ کر ہر قسم کا غصہ، ہر قسم کا عناد، ہر قسم کی دشمنی دل سے مٹ جاتی ہے۔ ان کا دل جانتا ہی نہیں کہ نفرت کسے کہتے ہیں، حقارت کس کا نام ہے، بغض وکینہ کس بلا کو کہتے ہیں۔ ایسے یوگی کو دنیا کی کوئی قوت مشتعل نہیں کر سکتی، بھڑکا نہیں سکتی۔ اس کا دل محبت و پیار کا ایک بحر بیکراں بن جاتا ہے۔ وہ اپنی محبت کے بل بوتے کی وجہ سے مجسم خدا بن جاتا ہے۔ ایسا انسان ہی صحیح معنوں میں یوگی ہوتا ہے دوسری کراماتی باتیں کر دکھانا تو گویا ثانوی باتیں ہیں۔ راہ چلتے ہوئے کچھ کر دکھانا، یہ گویا یوگیوں کے نزدیک محض اتفاق کی باتیں ہیں جنہیں بہت زیادہ اہمیت نہیں دی جانی چاہیئے۔ یوگی تو یہاں تک کہتے ہیں کہ یوگی کے سوا باقی کل عالم قید وبند میں جکڑا ہوا غلام ہے۔ عام انسان کیا ہے، قیدی۔ کبھی روٹی کا غلام، کبھی ہوا کا محتاج، کبھی پانی کا طلب گار، کبھی روپیہ کا حاجت مند، کبھی بیوی کا خواہشمند تو کبھی اولاد کا تمنائی، کبھی حرص وہوا کا بندہ، کبھی شہرت کا متلاشی اور کبھی دولت کا پجاری۔ ہزار جان سے وہ اس دنیا پر فدا ہوتا ہے۔ اسے نہ جانے کتنی قسم کے بندھن جکڑے ہوئے ہیں۔ ایسا انسان جو ان تمام باتوں کی گرفت سے بالاتر ہے، سچا انسان، سچا یوگی ہے۔

---

[1] نشاط روح

گیتا پانچویں ادھیائے میں کہتی ہے کہ "ایسے یوگی زندگی اور موت کی قید سے آزاد ہو چکے ہوتے ہیں"۔ گیتا کے اس ادھیائے کے انیسویں شلوک میں بھگوانِ کرشن کہتے ہیں: "جن کا من سمتا کے ایکو بھاؤ میں ٹِک جاتا ہے وہ سنسار کو اسی جسم میں جیت لیتے ہیں اور چونکہ برہم نردوش اور سم ہے اس لئے وہ برہم میں ستھت رہتے ہیں۔

سوال: کیا یوگی ذات پات کو کوئی اہمیت دیتے ہیں؟۔

جواب: نہیں۔ یوگی کسی ذات پات کو نہیں مانتے۔ ذات پات تو صرف کچے اور اناڑی دلوں کی تعلیم وتربیت کے لئے ہوئی ہے۔

سوال: کیا سمادھی اوستھا کا ہندوستان کی گرم آب وہوا کے ساتھ کوئی تعلق ہے؟

جواب: نہیں۔ ان دونوں میں کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ یہ فلاسفی نہ صرف میدانوں اور ریگ زاروں میں پڑھائی جاتی ہے بلکہ ہمالیہ پہاڑ کی ان چوٹیوں پر بھی جو سطح سمندر سے پندرہ ہزار فٹ اونچی ہیں اور اس سے اوپر یخ بستہ مقامات پر بھی اس فلاسفی کی تعلیم وتربیت دی جاتی ہے۔

سوال: کیا سرد آب وہوا میں دھیان اور سمادھی لگائی جا سکتی ہے؟۔

جواب: کیوں نہیں۔ نہ صرف ایسا کیا جا سکتا ہے بلکہ دنیا میں یہی ایک بات قابل عمل ہے۔ ہم تو ہر انسان سے کہتے ہیں آپ سب پیدائشی طور پر ویدانتی ہوں۔ آپ میں ہر ایک ویدانتی ہے۔ آپ اپنی زندگی بھر اپنے آپ کو ایشور کی انش، اس کا جز و تصور کرتے ہیں۔ اس لئے آپ حقیقی معنوں میں ویدانتی ہیں۔ آپ یہ جانے بغیر کہ اس کی وجہ کیا ہے، پرہیزگار ہیں، نیک نفس ہیں۔ آخر ویدانت کی فلاسفی کیا ہے، انسان کو پرہیزگار اور نیکوکار بننے کی تعلیم۔ اور یہی سب مذاہب اور سب روحانی عقیدوں کا لب لباب اور مقصد ہے۔

سوال: کیا آپ کے خیال میں ہم اہل مغرب طبعاً بعض ایسی بداعمالی یا بداعتدالی رکھتے ہیں جس کی وجہ سے ہم اس قدر ہوس پرست اور نفس پرست ہیں اور اہل مشرق ہماری بہ نسبت کہیں زیادہ نیکوکار ہیں؟۔

جواب: یہ محض خیال ہے اور آپ مجھے یہ کہنے کے لئے معاف کریں کہ اہل مغرب زیادہ درشت سیرت اور بے رحم ہوتے ہیں اور ان کے برعکس اہل مشرق رحم دل اور نیک نفس ہوتے ہیں۔ لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کی تہذیب تازہ ہے، نئی ہے، جدید ہے اور آپ ابھی تک حیوانی رجحانات سے کلیتاً آزاد اور پاک نہیں ہو سکے۔ رحم دل بننے اور نیک نفس بننے کے لئے ایک

مدت درکار ہوا کرتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ آپ میں بے پناہ قوت ہے لیکن یکسوئی قلب اور تجزیہ نفس کی قوت کو بہت کم بروئے کار لایا گیا ہے۔ جوں جوں آپ اس قوت کو بروئے کار لائیں گے، توں توں آپ زیادہ نیک نفس اور رحم دل بنتے چلے جائیں گے۔ ہندوستان میں تو ہمارے خون کے ایک ایک قطرے میں یہ روحانیت اور نیک نفسی بھری پڑی ہے۔ ہندوستان میں اگر میں اس روحانیت کی تعلیم دینے دور افتادہ دیہات میں بھی چلا جاؤں تو بھی وہاں کے لوگ میری باتیں بخوبی تمام سمجھ جائیں گے اور کہیں گے کہ "سوامی جی! آپ جو کچھ کہتے ہیں حرف بحرف درست ہے"۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں جہاں کہیں چلے جائیے ویراگیہ اور تیاگ کی بھاونا ہر جگہ موجزن ہے۔ یہ جدا بات ہے کہ ہم اس وقت زوال پذیر ہیں اور اپنے راستہ سے ہٹ چکے ہیں اور یہ سب کچھ فراموش کر چکے ہیں۔ لیکن ایک وقت تھا جب تاجداروں نے پائے حقارت سے تاج و تخت کو ٹھکرا دیا تھا اور فقیر اور سنیاسی بن کر ملک میں گھومنے لگے تھے۔

یہ شرف ہندوستان کی سرزمین کو نصیب خاطر ہے کہ اس کے دیہات میں عام 'سادھارن' دیہاتی لڑکی چرخہ کاتتی ہوئی بھی ایسے گیت گاتی ہے جس گیت میں کہا گیا ہے "اے میری سکھی، اے میری سہیلی! مجھ سے باتیں نہ کر، میرا دھیان اپنی طرف نہ ہٹا کیونکہ میرا چرخہ "سوہنگ، سوہنگ" کی دھنی دے رہا ہے"۔ یعنی میرا چرخہ یہ کہتا ہے کہ "میں ہی وہ ہوں، میں ہی وہ ہوں"۔ آپ ان لوگوں کے پاس جائیے اور ان سے دریافت کیجئے کہ آپ یہ باتیں کیوں کہتے ہیں اور پھر وہ مورتی پوجا کیوں کرتے ہیں۔ وہ لوگ آپ کو یہ مثبت جواب دیں گے کہ مذہب آپ کے نزدیک ایک عقیدہ اور نظریہ ہے، ایک فلاسفی ہے۔ لیکن ان کے نزدیک اس کا مطلب ہے خود شناسی، خدا شناسی، وصل خدا شناسی ان میں سے ایک شخص والہانہ مستی میں جھومتا ہوا پکار اٹھے گا کہ "میں تو ویدانتی اس وقت ہی بنوں گا جس وقت یہ سب کچھ فنا ہو جائے گا۔ میں دیدار حق کر لوں گا۔ اس وقت مجھ میں اور ایک انجان اور غافل میں کوئی فرق نہیں ہے اس لئے میں ابتدائی منزلوں میں ہونے کی وجہ سے پتھر کی ان مورتیوں کی پوجا کرتا ہوں، مندروں میں جاتا ہوں اور باقی سب کچھ کرتا ہوں تاکہ میں خود شناس بن سکوں"۔

بھگوان شنکرا چاریہ نے سچ ہی کہا ہے "اسلوب گفتار اور اسلوب بیان محض اہل علم کے لئے باعث لطف و سرور ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان سے نہ نجات مل سکتی ہے نہ مکتی۔ کیونکہ مکتی اور نجات تو اس وقت ہی نصیب ہو سکتی ہے جب کوئی انسان حق شناس ہو جائے اور دیدار حق کر لے"۔

---

نشاط روح

سوال: کیا حق شناسی اور خود شناسی کا تعلق ذات پات سے بھی ہے؟

جواب: ہرگز ہرگز نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم کسی ذات پات کو نہیں مانتے۔ ہم کسی ذات پات کو نہیں چاہتے۔ حتیٰ کہ جو لوگ اس نظام کو تسلیم بھی کرتے ہیں وہ بھی اسے کامل نظام نہیں سمجھتے بلکہ ان کا کہنا تو یہ ہے کہ اگر آپ ہمیں اس سے بہتر نظام دیدیں گے تو ہم اس موجودہ نظام کو خیرباد کہہ دیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اسے ترک کرنے کو تیار ہیں۔ ہمیں اس کو ترک کرنے میں کوئی عار نہیں۔ لیکن ہمیں یہ تو بتایا جائے کہ آپ اس کے بدلے میں ہمیں کیا دیتے ہیں اور پھر سوال تو یہ ہے کہ کس جگہ ذات پات کا نظام موجود نہیں ہے۔ امریکہ کو لے لیجئے۔ آپ لوگ مسلسل اس بات کی جدوجہد کر رہے ہیں کہ یہ ذات پات کا نظام قائم ہو جائے۔ آپ کے ہاں یہ ذات پات دولت کے ترازو سے قائم کی جاتی ہے۔ کم دولت والا ادنیٰ، زیادہ دولت والا اعلیٰ۔ دولت کے ساتھ ساتھ ذات پات بھی بدلتی ہی جاتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس ہم نے یہ نظام مستقل بنیادوں پر استوار کر رکھا ہے۔

دوسری قومیں اس نظام کو قائم کرنے کی تگ و دو کر رہی ہیں لیکن اس کام میں کامیابی حاصل نہیں کر رہیں۔ ہمارے ہاں تو پہلے ہی توہمات کی بھرمار ہے آپ کے ملک سے ہم مزید توہمات مستعار لیکر کیا کریں گے؟ کیا اس سے ہمارا نظام بہتر ہو جائے گا؟ میں تو کہوں گا کہ یہ ہمارے اس ذات پات کے نظام کی برکت ہے کہ تیس کروڑ ہندوستانیوں کو ابھی تک روٹی نصیب ہو رہی ہے۔ بلاشبہ یہ ایک ناقص اور غیر مکمل نظام ہے لیکن یہ بات بھی نظرانداز نہیں کی جا سکتی کہ اگر یہ ذات پات کا نظام نہ ہوتا تو ہم آج ایک بھی سنسکرت کی کتاب نہ دیکھ پاتے۔ ذات پات کے اس نظام نے ہمارے معاشرے کے اردگرد ایسی اونچی اونچی دیواریں کھڑی کر دیں جن کے اندر انقلاب بھی آتے رہے، آندھیاں بھی آتی رہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان دیواروں توڑ کر کوئی باہر نہ جا سکا۔ چونکہ ہماری ضرورت ابھی پوری نہیں ہوئی، برابر قائم ہے، اس لئے ذات پات کا نظام بدستور قائم اور مروج ہے۔ لیکن جو ذات پات آج سے سات سو برس پہلے تھی، اب ایسی ذات پات کہیں نظر نہیں آتی۔ اس پر جو جو ضرب پڑی اس نے اسے اور بھی مضبوط اور مستحکم بنایا۔ کیا آپ کو اس بات کا احساس ہے کہ ہندوستان واحد ملک ہے جس نے اس قدر عظمت و حشمت پا کر بھی باہر کے کسی دوسرے ملک پر کبھی حملہ نہیں کیا، کبھی دھاوا نہیں بولا، کبھی جارحیت کا ارتکاب نہیں کیا؟ سمراٹ اشوک نے اس بات کی قطعی وصیت کر دی تھی کہ ان کا کوئی جانشین

ہرگز ہرگز کسی دوسرے ملک کے خلاف لشکرکشی نہ کرے۔ آپ لوگ یا دنیا کے دوسرے لوگ اگر ہماری امداد کرنا چاہتے ہیں، ہمیں اپنے علم وفضل سے مالا مال کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں معلم دیجئے، استاد مہیا کیجئے۔ لیکن ان کا کام تعمیر ہونا چاہیئے، تخریب نہیں۔ انہیں ہمارے ملک میں جاکر کچھ دینا چاہیئے، کچھ بگاڑنا نہیں چاہیئے۔ یہ سب لوگ دھاوا بول کر ہندوؤں کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔ کیا ہندوؤں نے ان کا کچھ بگاڑا ہے ؟ ان کا کوئی نقصان کیا ہے جس کا یہ انتقام لینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے (ہندوؤں نے) تو حتی المقدور دنیا کی بھلائی کی ہے۔ دنیا کو سائنس دی ہے، فلاسفی دی ہے، مذہب دیا ہے، تہذیب دی، ذہانت دی، قابلیت دی ہے۔ ننگ دھڑنگ وحشیوں اور حیوانوں کی طرح گھومتے پھرنے والے انسانوں کو تہذیب وعلم سے مالا مال کیا ہے۔ لیکن اس کا صلہ کیا دیا جارہا ہے ؟ قتل، ظلم تشدد، دشنام طرازی۔ ذرا ان کتابوں کی ورق گردانی کیجئے جو اہل مغرب نے ہندوستان کے بارے میں لکھی ہیں۔ کتنی گالیاں ہیں جو انہیں دی گئی ہیں ؟ کتنی تہمتیں ہیں جو ان پر لگائی گئی ہیں ؟ سوال یہ ہے کہ ہندوؤں کو کون سے جرم کے بدلے میں یہ سزا دی جارہی ہے ؟۔

سوال : جس طرح کی سہد سادھنا، مشترک بھگتی کا ذکر آپ نے کیا ہے، کیا یہ محض ایک آدرش ہے یا لوگ فی الحقیقت اس آدرش کو اپنا چکے ہیں ؟

جواب : میرا یقین ہے کہ یہ سہد سادھنا ہمارے بس میں ہے۔ اسے پانا مشکل نہیں، بلکہ میں تو کہوں گا کہ ہم نے قریب قریب اس آدرش کو پا لیا ہے۔ اگر یہ سب کچھ محض زبانی جمع خرچ ہے تو پھر اس کی کیا قدر وقیمت ہے۔ وید ہمیں تین باتوں کی تعلیم دیتے ہیں۔ وید کہتے ہیں کہ اولین آدرش آپ کا آتم گیان ہونا چاہیئے، خود آگہی۔ جو اپنے کو نہیں جانتا وہ کچھ بھی نہیں جانتا۔ دوسری تعلیم جو وید دیتے ہیں یہ ہے کہ ہم ہر بات کو عقل ودلیل کی کسوٹی پر پرکھیں، وویک سے کام لیں۔ وید کا تیسرا اپدیش یہ ہے کہ ہمیں اگر بھگتی کرنی ہے تو اگر کوئی عبادت وریاضت کرنی ہے تو اپنے رب کی کرنی ہے۔ وید کے اس اپدیش کو سنکر اندھ وشواس بننے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ ہمیں سب کچھ سنکر اس پر دل سے غور وخوض کرنا چاہیئے۔ اگر انسان کا دل گواہی دے تو اسے چاہیئے کہ انسان اس کو اپنی ریاضت وعبادت کے سانچے میں ڈھال لے اور پھر اس حق وصداقت کو خود اپنے مشاہدہ ومجاہدہ میں لائے۔ سچا مذہب تو یہی ہے۔ اندھ وشواس تو کسی بھی جگہ مذہب کا حصہ نہیں ہے۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ سچا مذہب ایک ایسا شعور ہے جس کا تعلق حواس کے ساتھ نہیں ہوتا۔

---

سوال : کیا انسان جسم پاکر بھی انسان زوال پزیر ہوکر دوسری یونیوں میں بھی جنم لیا جاسکتا ہے؟ تناسخ کے چکر کا انسان کے جسم پر کیا اثر ہے ؟

جواب : تناسخ کا انحصار کرموں پر ہے ۔ کرم بُرے ہوں گے تو جنم بُرا ہوگا ۔ کرم اچھے ہوں گے تو اچھا جنم ملے گا ۔ اگر انسان اشرف المخلوقات کا جسم پاکر بھی حیوانوں جیسے کام کرے گا تو اُسے حیوان بنا دیا جائے گا ۔ جیسے جیسے کرم، ویسا ویسا جنم

ایک دوسری صحبت میں (۱۸۹۸ء کے برس میں) سوامی جی نے فرمایا کہ سرزمین ہندوستان میں مورتی پوجا ۔ بُت پرستی کا آغاز بودھ عناصر کی وجہ سے ہوا ۔ پہلے بھگوان بدھ کے پوجا کے لئے مرکز ۔ پھر مٹھ سٹوپ Stupa اور پھر بُدھ مٹھ تعمیر کئے جانے لگے ۔ ادھر یہ مندر بنتے گئے ادھر ہندوؤں نے اپنی دیوی دیوتاؤں کے مندر تعمیر کرنے شروع کر دیئے ۔

سوال : کیا اس مادی جسم میں سچ مچ ہی کنڈلنی ہوتی ہے ؟

جواب : شری رام کرشن کہا کرتے تھے کہ یوگی لوگ جن چکروں اور کنولوں کا ذکر کیا کرتے ہیں ۔ یہ فی الحقیقت اس فانی جسم میں موجود نہیں ہوتے ۔ بلکہ یوگ بل سے ہی یوگی لوگ انہیں اپنے اندر پیدا کر لیتے ہیں ۔

سوال : کیا کوئی انسان بت پرستی مورتی پوجا کے طفیل مکتی پراپت کر سکتا ہے ؟

جواب : مورتی پوجا یا بُت پرستی سے براہ راست مکتی نہیں ملتی ۔ مورتی پوجا تو ایک معاون اور ذریعہ امداد بن سکتی ہے ۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مورتی پوجا کی نندا اور مذمت کرنی شروع کر دو ۔ کیونکہ بہت سے انسانوں کو مورتی پوجا سے ویدانت تک رسائی مل جاتی ہے اور بالآخر وہ مردِ کامل بن جاتے ہیں ۔

سوال : کردار کی بلندی کس بات میں ہے ؟

جواب : تقوے میں، تیاگ میں ۔

سوال : خدا شناسی کا بہترین ذریعہ کیا ہے ؟

جواب : مرشد شناسی ۔ گورو بنا گیان کیسے ہو سکتا ہے ؟ گورو ہی ایشور درشن کرا سکتا ہے ۔



# سفرنامۂ یورپ

# سفرنامۂ یورپ

اوم نمو نارائن سوامی[1] —— ! دوسرے لفظ کے آخری حرف کی آواز رشی کیش کے لہجہ میں تھوڑی سی کھینچیئے میرے بھائی! سات دن ہو گئے ہیں کہ ہم جہاز پر ہیں، ہر دن سوچتا ہوں کہ کچھ احوال لکھوں آپ نے لکھنے لکھانے کا بہت سا سامان بھی اگرچہ میرے ساتھ کر دیا ہے لیکن وہ سُستی و کاہلی جو ایک بنگالی کا خاص وصف ہے کچھ لکھنے لکھانے نہیں دیتی اور ہر چیز خراب کر دیتی ہے۔ سُستی و کاہلی پہلے درجہ میں اور کبیر عدیم الفرصتی، ہر دن سوچتا ہوں کہ جس کو آپ ڈائری کہا کرتے ہیں وہی لکھ ڈالوں مگر لکھنے لکھانے کی بات کل پر ٹل جاتی ہے اور کل ہے کہ آنے کا نام نہیں لیتی، دوسری بات یہ ہے کہ مجھے تاریخیں وغیرہ یاد نہیں رہتیں، کرپا کر کے یہ سب آپ خود ہی لکھ لیں، اگر آپ اپنی کریم النفسی کی بنا پر یہ سمجھیں کہ میرے دل میں بھی ہنومان کی طرح چونکہ بھگوان بسا ہوا ہے لہذا تاریخوں یا اسی طرح کی دوسری

---

1۔ " ایشور کو پرنام" یا ایک سنیاسی سے خطاب کرنے کا مروج طریقہ ہے، ۱۹۰۰ء میں سوامی جی نے دوسری بار مغرب کا سفر کیا تھا اور اس سفر کی یادداشتیں "اُدبودھن" کے ایڈیٹر سوامی ترگناتیتا نند کے نام نام قلمبند کی گئی تھیں، لہذا یہ یادداشتیں روایتی اور مروج خطاب سے شروع کی گئیں۔ ان کو پڑھتے ہوئے قارئین کرام کو یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ سوامی جی نے انہیں آسان اور سلیس بنگالی زبان میں لکھا تھا، جس کی لطافت و روانی اردو میں منتقل کرنا ممکن ہی نہیں۔ مذکورہ اردو ترجمہ اصل بنگالی تحریر کے انگریزی ترجمہ سے لیا گیا ہے۔

---

یہ کام سونپا ہے، مجھے کرنا تو یہ تھا کہ سات دن کے سمندری سفر کی منظر کشی کروں ذرا شاعرانہ اور دلچسپ انداز میں لیکن اس کے بجائے میں نے یہ سب بکواس شروع کر دی! لیکن بات یہ ہے کہ مایا کا جال توڑنے کے بعد میں نے ساری زندگی تو براہمن کی گیری کھاتے کھاتے گزار دی ہے اس لئے مجھ میں اچانک مناظر قدرت کی خوشنمائی کی تعریف کرنے کی شکتی کہاں سے آسکتی ہے، میری تمام زندگی تو پورے ہندوستان میں چلتے پھرتے کٹی؟ بنارس سے کشمیر اور پھر خراسان اور گجرات[1] "کتنے پہاڑ، دریا، آبشار، چشمے، وادیاں کتنے پہاڑوں کی سدا برف سے ڈھکی رہنے والی چوٹیاں، حد نگاہ تک کتنے پھیلے ہوئے جذبات انگیز و طوفان خیز سمندر ہیں جو میں نے نہیں دیکھے جن کے بارہ میں نے سنا نہیں اور جنہیں میں نے عبور نہیں کیا، لیکن یہ جہاز کی سب سے نچلی منزل کا ایک اندھیرا کمرہ ہے جس میں دن میں چراغ جلانا پڑتا ہے اس کے در و دیوار یان کی پیکوں کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، ہم لکڑی کے سیلے ہوئے فرش پر دراز ہیں اِدھر اُدھر سے نکلنے والے چوہوں، چھچوندروں اور خرگوشوں کا شور ایسا لگتا ہے جیسے سڑک پر چلنے والی ٹرام کاریں کھڑکھڑا اٹھیں یا کالا بادل گرجنے لگے، ایسے شاعرانہ ماحول میں کوی شیام چرن کی منظر نگاری کا چربہ اتارنا سعی لاحاصل ہے، کوہساروں، سمندروں، مرغزاروں اور ریگستانوں وغیرہ کی جو تصویر کشی اور منظر نگاری وہ کیا کرتے، اس کی کوئی نظیر نہیں! حقہ کا کش لے رہے ہیں، دھواں چھوڑ رہے ہیں، اور مناظر فطرت کے وہ نقش اتار رہے ہیں جن میں ہوتی تھی اور جو بنگال کے لوگوں کے لئے سچ مچ سرمایہ فخر ہیں۔ شیام چرن، تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے اپنی جوانی کے دنوں میں ملک کے بالائی حصہ میں مقیم رہے تھے، جہاں کا پانی اتنا زود ہضم ہوتا ہے کہ آپ ثقیل غذا کھالیں اور اس پر سے ایک لوٹا بھر یہ پانی پی لیں تھوڑی دیر میں یہ سب کچھ ہضم ہو جائے گا اور پھر آپ بھوک محسوس کرنے لگیں گے یہاں شیام چرن کی چشم تصور نے فطرت کے خوبصورت ترین پہلوؤں کا نظارہ کیا اور اس نظارہ سے اپنے تخیل کو تابناک کر لیا۔ لیکن دودھ میں ایک مکھی بھی ہے —— لوگ کہتے ہیں کہ شیام چرن کی معلومات بس بردوان (بنگال کا ایک مقام) تک ہیں اس سے آگے نہیں ہیں۔

بہر حال آپ کی مخلصانہ خواہش کے تحت اور یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ مجھے شاعرانہ صلاحیت و استعداد ودیعت نہیں ہوئی، یہ کام ایشور کا نام لے کر شروع کرتا ہوں اور آپ بھی ہمہ تن متوجہ رہیں۔

معمولاً جہاز رات کے وقت بندرگاہ سے روانہ نہیں ہوا کرتے، خصوصیت سے ہگلی جیسے دریا میں اور تجارتی بندرگاہ سے جیسے کلکتہ ہے، جہاز رات کے وقت روانہ نہیں ہوا کرتے، جب تک جہاز سمندر

---

[1] تلسی داس کا تخیّل

چھوٹی باتوں کی یاد کے لئے گنجائش نہیں ہے تو میں آپ سے معذرت کرتے ہوئے کہوں گا کہ[1] "چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک، کہاں ہنومان کہاں میں، اس کا دل شری رام کا مسکن تھا جو سورج بنسی راجہ ہیں اور میں کمتروں میں کمتر ہوں! حقیقت بس میری حماقت ہے سستی و کاہلی ہے، ہنومان نے اپنا پورا دل شری رام کی بھگتی میں بھر لیا تھا اور تب اس نے وہ سمندر عبور کیا تھا جس کی وسعت ایک سو یگیوں کے برابر تھی جبکہ ہم جس وسعت کو عبور کر رہے ہیں وہ لکڑی کے ایک مکان کے اندر محدود ہے، بس یوں سمجھئے کبھی اِدھر ہچکولے کھاتے ہیں کبھی اُدھر، کبھی اپنے پاؤں پر ستون و مستول کا سہارا لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن ایک معاملہ میں ہمیں ہنومان پر برتری حاصل ہے اور وہ یہ کہ جب وہ لنکا پہنچے تھے تو انہوں نے راکشسوں اور راکشسیوں کا محض نظارہ کیا تھا جبکہ ہم ان کے ہمسفر ہیں، ڈنر کے وقت چمکتی ہوئی سیکڑوں چھریاں اور بجتے ہوئے کانٹے دیکھ کر بھائی ت[2] لرز اٹھتے ہیں اور آپ سے باہر ہو جاتے ہیں۔ بسا اوقات تو وہ یہ سوچنا شروع کر دیتے ہیں کہ بھورے رنگ کے بالوں اور بلی جیسی آنکھوں والی ان کی پڑوسن کی چھری بے خیالی میں ان کے گوشت میں نہ اُتر جائے، اور پھر اس سے بھی زیادہ! اور آپ جانتے ہیں کہ ان پر چربی بھی چڑھی ہوئی ہے اور وہ تھوڑا سا موٹے بھی ہیں، میں پوچھتا ہوں کہ جب ہنومان سمندر پار کر رہے تھے تو کیا انہیں سمندری تجارے سے سابقہ پڑا تھا؟ کیا پرانی کتابوں میں اس بات کا کوئی تذکرہ موجود ہے؟ آپ سب لوگ عالم و فاضل ہیں، رامائن پر کامل عبور رکھتے ہیں اور دوسری قدیم کتابیں بھی آپ کی نظر میں ہیں اس لئے آپ ہی لوگ اس سوال کا مختتم جواب دے سکتے ہیں! اگر ہمارے عصرِ حاضر کے دانشور تو اس سوال پر خاموش ہی دکھائی دیتے ہیں، شاید ہنومان کو سمندری تجارے سے سابقہ نہیں پڑا، تب اس واقعہ پر شبہ گزرنے لگتا ہے کہ وہ کسی شخص کے جبڑوں کے اندر گھس گئے تھے، بھائی ت — کا خیال بھی یہی ہے کہ جب جہاز کا اگلا حصہ اچانک آسمان کی طرف اونچا اٹھتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ دیوتاؤں کے دیوتا سے کوئی صلاح لینے والا ہے اور پچھلا حصہ سمندر کی تہہ کی طرف یوں جھکتا ہے جیسے وہ تحت الثریٰ کے دیوتا والی سے کوئی سرگوشی کر رہا ہے تو اس وقت بھائی ت — محسوس کرتے ہیں کہ جیسے کسی کے کشادہ اور خوفناک جبڑوں کے اندر وہ پھسلتے جا رہے ہیں، میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں کہ آپ نے کسی آدمی کو یہ

---

[1] سوامی جی نے یہاں کالی داس کے مشہور رگھوونش کی لائن کا حوالہ دیا ہے۔ "یاں اقلیمِ آفتاب کی شاہانہ شان اور میری بیچاری فراست وعقل میں کتنا فرق ہے۔"

[2] تمریانند

---

میں، نہ پہنچ جائے،وہ پائیلٹ کے چارج میں رہتا ہے اور پائیلٹ کپتان کے فرائض انجام دیتا ہے اور جملہ احکام جاری کرتا ہے، جہاز جب سمندر میں پہنچ جاتا ہے تو پائیلٹ کی ڈیوٹی ختم ہوجاتی ہے۔ اسی طرح جب کوئی جہاز سمندر سے بندرگاہ کی طرف آتا ہے تو پائیلٹ یہی فرائض انجام دیتا ہے اور اس کے بعد اس کی ڈیوٹی ختم ہوجاتی ہے، ہگلی کے دہانے کی طرف جاتے ہوئے ہمیں دو بڑے خطرات سے سابقہ پڑا، پہلے خطرہ سے ہم بچ بچ کے نزدیک سواحل جمیس میری پر دوچار ہوئے اور دوسرا خطرہ ہمیں ڈائمنڈ ہاربر میں داخل ہوتے ہوئے ریتیلے کنارے پر پیش آیا، صرف اسی وقت پائیلٹ ہوشیاری سے اپنے جہاز کو چلاتا ہے جب دریا میں جوار بھاٹا آتا ہے، ورنہ اور کوئی صورت نہیں ہے۔ چنانچہ ہگلی سے باہر نکلنے میں دو دن لگ گئے۔

رشی کیش میں گنگا کی جو صورت ہے، کیا آپ کو یاد ہے؟ وہ موتی جیسا صاف پانی، جس میں پانچ گز نیچے تیرنے والی مچھلیوں کے نلس تک ایک آدمی آسانی سے شمار کرسکتا ہے — کتنا میٹھا — برف کی طرح کتنا ٹھنڈا، "گنگا کا فرحت بخش[1] پانی" وہ موجوں کی روانی میں "ہر ہر" کی آواز، وہ آس پاس کے پہاڑی جھرنوں میں ہر ہر کی صدائے بازگشت! کیا آپ کو جنگل میں بیتنے والی زندگی کے وہ دن یاد ہیں جب گنگا کے اندر کسی چھوٹی سی چٹان کے جزیرہ پہ بیٹھ کر ہم مدھوکری[2] — گھر گھر سے مانگا ہوا دان کھایا کرتے تھے اور چلو سے گنگا کا دلپسند پانی پیا کرتے تھے اور نڈر مچھلیاں روٹی کے ریزوں کے گرد جمع ہو جایا کرتی تھیں، گنگا جل کے لئے وہ اشتیاق، وہ پُر شوکت گنگا، خواہشات نفسانی کو دھو دینے والا وہ حیل سرینگر، ٹہری وتر کاشی اور گنگوتری کے راستہ، ہمالیہ سے گنگا کی روانی آپ کو یاد ہوگی آپ میں سے بعضوں نے گنگا کا منبع بھی دیکھا ہوگا لیکن گنگا جب کلکتہ کے قریب پہنچتی ہے تو اس کی دلکشی ناقابل فراموش ہوجاتی ہے، گودی میں آتے ہوئے بے شمار جہاز، سفید مگر مٹیالا پانی ایسا لگتا ہے جیسے شیوجی کے پیکر کا رنگ آگیا ہے اس میں! اور وہ ان کے بدن سے چھو گئی ہے، یہ محض حب الوطنی ہے — یا بچکانہ خیالات؟ — یہ کون جانتا ہے؟ گنگا میا اور ہندوؤں کے درمیان کتنا عجیب تعلق ہے؟ کیا یہ محض عقیدہ ہے؟ ہوسکتا ہے! زندگی بھر وہ گنگا کے نام کی مالا جپتے ہیں اور جب مرتے ہیں تو گنگا کے پانی میں سیرائے جاتے ہیں، دور دراز کے لوگ اپنے ساتھ گنگا جل لے جاتے ہیں

---

[1] والمیکی رامائن سے ماخوذ۔

[2] در در اور گھر گھر سے بھیک مانگ کر جمع کیا ہوا دان!

اسے تانبہ کے برتن میں بڑی احتیاط سے محفوظ رکھتے ہیں اور مقدس تہواروں کے موقع پر اس کے چند قطرے تبرک کے طور پر پیتے ہیں، راجہ اور شہزادے گنگا جل کو مرتبانوں میں محفوظ رکھتے ہیں اور سیکڑوں روپیہ اس بات پر خرچ کرتے ہیں کہ گنگوتری سے گنگا جل لے کر آئیں اور اسے رامیشورم میں شیو جی کے سر پر ڈالیں ہندو بدیشوں میں جاتے ہیں، جیسے جاوا، رنگون، ہانگ کانگ، مدغاسکر، سویز، عدن مالٹا وغیرہ ــــ اور وہ وہاں بھی اپنے ساتھ گنگا جل اور گیتائے جاتے ہیں۔

گویا گیتا اور گنگا جل سے ہندوؤں کا ہندومت عبارت ہے، پچھلی بار جب میں مغرب کے سفر پر گیا تھا تو میں بھی اس خیال سے اپنے ساتھ تھوڑا سا گنگا جل لے گیا تھا کہ شاید ضرورت پڑ جائے، چنانچہ کبھی کبھی میں بھی گنگا جل کے چند قطرات پی لیتا تھا اور جب بھی میں نے گنگا جل پیا تو مجھے تمدن کی گونج، زندگی کے سمندر کی تلاطم خیز موجوں اور مغرب کے کروڑوں مردوں اور عورتوں کی دوڑ دھوپ کے شور کے درمیان ایک طرح کا دماغی سکون اور قلبی قرار میسر آیا اور میرا من شانت ہو گیا۔ لوگوں کا ہجوم مغربی زندگی کی سرگرمیاں ہر قدم پر تصادم ہر گام پر تقابل کا ہنگامہ ــــ پیرس، لندن، نیویارک، برلن اور روم ــــ وہ رئیسانہ ٹھاٹھ اور امیرانہ عیش و عشرت ــــ الغرض سب کچھ گنگا جل پیتے ہی میرے ذہن سے محو ہو جاتا تھا اور ایک بار پھر میرے کانوں میں ہر ہر کی وہی دلکش آواز گونجنے لگتی تھی، میں محسوس کرتا تھا جیسے میں ہمالیہ کے جنگلوں میں ہوں اور بہشتی دریا کی روانی میرے دل، میرے دماغ اور میری رگ رگ میں جاری ہے اور اس کی موجوں سے لگاتار وہی آواز آ رہی ہے ــــ "ہری ہر، ہری ہر، ہری ہر"۔

اس دفعہ آپ نے بھی میرا خیال ہے کہ گنگا میا کو مدراس منگوایا ہے لیکن میرے عزیز بھائی آپ نے میا کو کس عجیب ظرف میں رکھا ہے! بھائی تتا ــــ لڑکپن ہی کی عمر سے برہمچاری ہیں، اور اور اپنی روحانیت کی چمک سے بھڑکتا ہوا شعلہ دکھائی دیتے ہیں، پہلے بحیثیت براہمن "نمو براہمن" کہہ کر پرنام کیا جاتا تھا ــــ آہ اس کی جلالت! اور اب اسے "نمو نارائن" کہہ کر پرنام کیا جاتا ہے اس لئے کہ اب اس نے سنیاس لے لیا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس کے پاس جو ماں تھی وہ براہمن کا کمنڈل چھوڑ کر ایک مرتبان میں داخل ہونے کے لئے مجبور ہو گئی ہے، بہرحال رات گئے جب میں بستر سے اٹھا تو میں نے دیکھا کہ ماں اس بدنما ظرف میں اپنا قیام برداشت نہیں کر رہی ہے اور وہ اس سے باہر نکلنے کے لئے اپنا راستہ بنا رہی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ تو بہت خطرناک بات ہے اس لئے کہ اگر ماں نے اپنی زندگی کے سابقہ مناظر کو دہرانے کا فیصلہ کر لیا جبکہ وہ ہمالیہ

کی پہاڑیوں کو توڑ کر ابل پڑی تھی اور عظیم الشان ہاتھی اراوت کو خس و خاشاک کی طرح بہالے گئی تھی اور رشی جہنو کی جھونپڑی کو ڈھا گئی تھی۔ اگر یہ واقعات دوبارہ ہوئے تو کس قدر خوفناک ہوں گے میں نے بڑی پرارتھنا کی اور ماتا سے گڑگڑا کر کہا ـــــ میا تھوڑا سا توقف کر، کل ہم مدراس پہنچیں گے وہاں پہنچنے کے بعد جو تیرے دل میں آئے وہ کر، بہت سے ہیں جن کی کھال ہاتھی کی کھال سے بھی زیادہ موٹی ہے ـــــ بہتوں کی جھونپڑیاں بھی ایسی ہی ہیں جیسی جھونپڑی جہنو کی تھی ـــــ بہتوں کے آدھے مونڈے ہوئے اور چمکدار سر، جن پر چھوڑی ہوئی موٹی چوٹیاں اور جو اتنے سخت جیسے پتھر! اگر ان کی سختی کو ہمالیہ سے ملایا جائے تو پہاڑ کی چٹانیں بھی ان کی نسبت سے مکھن کی طرح ملائم نظر آئیں۔" ماتا تو ان کو جس حد تک توڑنا چاہے اس حد تک توڑ ڈال، انہیں چکنا چور کر دے لیکن تھوڑا سا توقف کر تھوڑا سا انتظار کر"۔ مگر میری تمام پرارتھنا بے کار گئی، ماتا میری خوشامد سننے کو تیار نہیں ہوئی تب میرے من میں ایک خیال آیا اور میں نے ماتا سے کہا "میا تو ان ملازمین کو دیکھ جن کے سروں پر پگڑیاں بندھی ہوئی ہیں اور جیت جاکٹ پہنے ہوئے، جہاز پر ادھر اُدھر دوڑتے پھرتے ہیں، یہ سب مسلمان ہیں، سچ مچ گائے کا گوشت کھانے والے مسلمان ـــــ اور یہ لوگ جنہیں تو جہاز کے کمروں میں جھاڑو لگاتے اور صفائی کرتے دیکھتی ہے یہ سب بھنگی ہیں، لال بیگ کے چیلے! اگر تو میری بات نہیں سنے گی تو میں ان کو بلاؤں گا اور ان سے کہوں گا کہ وہ تجھے چھوئیں اور تجھے ہاتھ لگائیں! اگر تجھے خاموش اور شانت کرنے کے لئے یہ بات بھی کافی نہیں ہوگی تو پھر میں تجھے تیرے پتا کے گھر بھیجوں گا ـــــ ماتا تو وہ کمرہ دیکھ رہی ہے ـــــ وہ بڑا کمرہ! اگر تجھے اس کمرہ میں بند کر دیا جائے تو پھر تو اسی حالت کو پہنچ جائے گی جس حالت میں تو ہمالیہ کے سینہ میں تھی۔ تو جم کر برف کا ایک تودہ بن جائے گی، میری اس بات نے ماتا کو خاموش کر دیا وہ شانت ہوگئی ـــــ نہ صرف دیوتاؤں میں بلکہ انسانوں میں بھی ہر جگہ ایسی ہی بات ہوتی ہے کہ جب کوئی چیلہ، معتقد اور پیروکار ملتا ہے تو وہ اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی سعی بلیغ کرتے ہیں۔

آپ دیکھتے ہیں کہ میں اپنے موضوع سے پھر کس طرح بہک گیا اور کس طرح میں نے فضول کی باتیں شروع کر دیں، میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ یہ سب چیزیں لکھنا میرے بس کی بات نہیں ہے لیکن اگر آپ مجھ کو ہی یہ کام سونپنا چاہتے ہیں تو بہر حال میں کوشش کر کے دیکھوں گا۔

ہر شخص کا اپنی قوم کے لوگوں میں بہر حال ایک خصوصی حسن ہوا کرتا ہے جو کسی دوسری جگہ

نظر نہیں آتا، چنانچہ ہمارے بھائی، بہن، بیٹے بیٹیاں، چاہے کتنے ہی مفلوک الحال کیوں نہ ہوں لیکن ان کے خصوصی حسن سے ساکنانِ جنت کے حسن کا بھی ایک اعتبار سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا، اگر آپ جنت کے لوگوں کو گھوم پھر کے دیکھیں تو آپ کو اپنے لوگ سچ مچ بہت خوبصورت دکھائی دیں گے، اور آپ کی مسرت کی کوئی انتہا نہیں رہے گی۔ ہمارے بنگال میں ایک خاص حسن ہے ـــــ حدِ نظر تک پھیلا ہوا ایک سبزہ زار، جس پر ہزاروں دریا اور چشمے اس طرح دکھائی دیتے ہیں جیسے اس نے اپنے گلے میں پھولوں کے ہار پہن رکھے ہیں، حسن کا ایک شائبہ مالابار میں بھی دکھائی دیتا ہے اور کشمیر میں بھی! کیا یہ حسن، دریا کا حسن نہیں ہے؟ جہاں چپہ چپہ پر پانی ہو، جہاں موسلا دھار بارش ہوتی ہو، اور ناریل اور کھجور کے درختوں کے پتے جہاں پانی کی بوندوں کی چوٹ کھا کھا کر اپنا سر جھکا لیتے ہوں اور جہاں ہر طرف سے مینڈک کے بولنے کی آواز آتی ہو ـــــ تو کیا اس سارے منظر میں کوئی حسن نہیں ہے؟ ہماری گنگا کے کنارے کتنے حسین و خوشنما ہیں، اس کا صحیح اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو بدیشوں کی سیر کر کے واپس آ رہے ہوں اور ان کا جہاز ڈائمنڈ ہاربر میں داخل ہو رہا ہو ـــــ! وہ نیلا ـــــ نیلا آسمان جس کے دامن میں کالے کالے بادل جن کی سنہری اور روپہلی بدلیوں سے کھنچی ہوئی جدولیں ـــــ ان کے نیچے ناریل اور کھجور کے سر اٹھائے ہوئے ہزاروں درخت جنہیں مرچھل سے تشبیہ دی جا سکتی ہے اور ان کی ہلکی گہری، پیلی، کاہی اور سبز رنگ کی مختلف الاقسام پوشاک، اس کے ساتھ ہی آم، لیچی اور جامن وغیرہ کے گھنے درخت ـــــ جن کے اردگرد بانس کے درختوں کی لہراتی ہوئی پتیاں اور دور دور تک مخملیں سبزہ زار جن کی نرمی اور خوبصورتی کے سامنے سمرقند و ایران اور ترکستان کے قالین بھی ہیچ ہیں، جہاں جہاں تک نظر کام کرتی ہے بس یہی سبزہ زار دکھائی دیتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نظر کو ان سبزہ زاروں نے اپنے دامن میں لپیٹ لیا ہے جو پھیلتے پھیلتے دریا کے کناروں سے جا ملتے ہیں ـــــ کناروں کے اندر گنگا کی نرم و نازک موجیں اٹھکھیلیاں کرتے دکھائی دیتی ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ سبز رنگ کے چوکھٹے میں کسی نے گنگا کے پوتر جل کو آئینہ کی طرح آویزاں کر دیا ہے اگر آپ آسمان سے زمین تک اپنی نظر دوڑائیں تو آپ چپہ چپہ پر مختلف رنگوں کا ایک کرشمہ دیکھیں گے، ایک رنگ کے مختلف شیڈ جو یہاں دکھائی دیتے ہیں کسی دوسری جگہ دکھائی نہیں دیتے، میں پوچھتا ہوں کہ آپ نے بھی رنگوں کے اس جادو کو بھی دیکھا ہے جس سے مسحور ہو کر پروانہ شمع کی لو پر گرتا ہے اور اپنی جان دے دیتا ہے، اور بھونرہ پھول کے قفس میں بھوک سے تڑپ تڑپ کر جان دے دیتا ہے ـــــ میں آپ سے ایک بات کہتا ہوں ـــــ اگر آپ گنگا کے حسین مناظر سے لطف

اندوز ہو جانا چاہتے ہیں تو ان مناظر کا حسن اب آپ کو اپنے من کی آنکھوں سے دیکھنا پڑے گا اس لئے کہ جلد ہی یہ سارا منظر بدل جانے والا ہے۔ دولت کمانے والے تاجروں کے ہاتھوں ہر شے نیست و نابود ہو جانے والی ہے ہر منظر برباد ہو جائے گا، سبزہ زاروں کی جگہ پکی ہوئی اینٹوں کے ڈھیر لگے ہوں گے، اینٹوں کے بھٹوں کی کھدائی کے گہرے گہرے غار ہوں گے، جہاں آب گنگا کی موجیں ہری ہری گھاس سے کھیل کھیلا کرتی ہیں وہاں جیوٹ کے انبار ہوں گے، باربرداری کی کشتیاں ہوں گی اور بدلیوں کا حسن یکسر غائب ہو جائے گا۔ ان کی جگہ کوئلہ کا دھواں ہوگا اور اس دھوئیں کے درمیان دیو کی طرح سر اُٹھائے ہوئے فیکٹریوں کی چمنیاں ہوں گی۔

اب ہمارا جہاز سمندر میں پہنچ گیا ہے، آپ نے کالی داس کے راگھوونش میں سواحل کی منظر نگاری کا مطالعہ کیا ہوگا "کھجور اور دوسرے درختوں کے جنگلوں کے درمیان نیلا نیلا سمندر" اور فولاد کے پیسے پر زنگ کا نظر آنے والا دھبہ" وغیرہ وغیرہ! ــــ یہ حقیقی تصویر کشی نہیں ہے اس عظیم المرتبت شاعر کا ادب واحترام کرنے کے باوجود میں گزارش کروں گا کہ کالی داس نے اپنی عمر میں شاید کبھی بھی نہ سمندر دیکھا تھا نہ ہمالیہ کی سیر کی تھی[1]۔

یہاں کالے اور سفید رنگ کے پانیوں کی دور تک ایک دھاری دکھائی دیتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے الہ آباد میں گنگا اور جمنا کے سنگم پر دو پانیوں کے ملنے سے ایک دھاری دور تک دکھائی دیتی ہے، اگرچہ بہت سے مقامات پر شاذو نادر ہی مکتی حاصل ہو سکتی ہے لیکن ہردوار، الہ آباد اور گنگا کا دہانہ وہ مقامات ہیں جہاں پر بالیقین مکتی حاصل ہوتی ہے، لیکن لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ دریا کا اصل دہانہ نہیں ہے، بہر حال مجھے تو یہاں بھی ایشور کو پرنام کرنے دیجئے اس لئے کہ وہ ہر جگہ دیکھتا ہے، ہر جگہ اپنا جلوہ دکھاتا ہے اور ہر جگہ موجود رہتا ہے[2]۔

کتنا حسین! کتنا خوبصورت! جہاں جہاں تک نظر کام کرتی ہے، سمندر کا گہرا نیلا پانی جھاگ اور لہروں کی صورت میں اُٹھتے اور ہوا کے ساتھ رقص کرتے دکھائی دیتا ہے، ہمارے پیچھے پوتر گنگا ہے، جو پیکر شیو کے غازہ سے سفید ہو رہی ہے، جیسا کہ ہم نے پڑھا ہے کہ گنگا کے جھاگوں سے

---

[1] سوامی جی نے بعد میں یہ خیال بدل دیا تھا۔ خصوصیت سے اس بارے کہ کالی داس نے ہمالیہ کا نظارہ نہیں کیا تھا۔ [2] گیتا تیرھواں ادھیائے۔ تیرھواں شلوک۔

شیوجی کی جٹائیں دھل کر سفید ہو گئی تھیں[1]۔ گنگا کے جل میں ایک طرح کا ٹھہراؤ دکھائی دیتا ہے ہمارے سامنے پانیوں کو جدا کرنے والا خط دکھائی دیتا ہے۔ جہاں سفید پانی ختم ہوتا ہے اور اب سمندر کا نیلا پانی شروع ہو جاتا ہے — ہمارے سامنے، ہمارے پیچھے، ہمارے چاروں طرف بس نیلا پانی — سمندر کا نیلا پانی! موجیں ہیں کہ لگاتار اُٹھ رہی ہیں، نیلا پانی ٹھاٹھیں مار رہا ہے، یوں سمجھئے جیسے ایک حسینہ ہے جس کے بال بھی نیلے ہیں، بدن بھی نیلا ہے، اور لباس بھی نیلا ہے، ہم نے پرانوں میں پڑھا ہے کہ لاکھوں اُسروں نے دیوتاؤں کے ڈر سے خود کو سمندر میں چھپا لیا تھا، آج ان کی باری آئی ہے آج انہیں موقع ملا ہے، سمندر کا دیوتا ان کا مددگار رہے، ہوا کا دیوتا ان کا پشت پناہ ہے، آج وہ سمندر کی سطح پر خوفناک جنگلی ناچ ناچ رہے ہیں، ایک شور ہے جس سے دل لرز اُٹھے، ایک غل ہے جو جسموں میں تھرتھری ڈال دے، یہ جھاگ دار گرجتی ہوئی موجیں درحقیقت ان کے قہقہوں کی ایک آواز ہے ان زلزلہ انگیزیوں کے درمیان ہمارا جہاز چل رہا ہے اور اس پر جس قوم کے مرد و زن شاہانہ ٹھاٹھ سے چہل قدمی کر رہے ہیں، خوبصورت لباس پہنے دکھائی دے رہے ہیں اور جن کا رنگ چاندی کی کرنوں کی طرح سفید ہے، درحقیقت وہ قوم ہے جو سمندر کی دنیا پر حکمرانی کر رہی ہے، وہ خود اعتمادی کا ایک مجسمہ دکھائی دیتے ہیں اور سیاہ فام قوموں کے سامنے سطوت و شوکت کی ایک تصویر ! سر پر برسات کے موسم کی گھٹائیں جھوم رہی ہیں، چاروں طرف جھاگ دار پرشور موجیں رقص کر رہی ہیں، ہمارے جہاز کے انجنوں کی طاقت سمندر کے جلال پر چھائی چلی جا رہی ہے، آوازوں کا یہ عجیب آہنگ ہے جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا، میں تو حیرت میں ڈوب جاتا ہوں، مجھ پر نیم خوابیدگی کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ برطانیہ کے قومی ترانے کی لے پر عورتوں اور مردوں کے مشترکہ گانے کی آواز سمندر اور اس کی پُرشور موجوں اور جہاز کے انجنوں کی کھڑکھڑاہٹ پر چھا گئی ہے اور بس ایک ہی آواز گونج اُٹھی ہے — "حکمراں برطانیہ! سمندر کی موجوں پر حکومت کرنے والا برطانیہ" گھبرا کر میں اپنے گردوپیش نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جہاز ایک شان کے ساتھ چل رہا ہے اور بھائی — ت —! اپنے ہاتھوں سے اپنا سر تھامے بیٹھے ہیں اور سمندری بخار کے حملے کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

---

[1] شنکر اچاریہ کا سُوتر

سیکنڈ کلاس میں دو بنگالی نوجوان تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مغرب جا رہے ہیں، ان کی حالت تو اور بھی زیادہ خراب ہے، ان میں سے ایک تو اتنا خوفزدہ دکھائی دیتا ہے کہ اگر اسے گھر واپس جانے کے لئے ساحل پر اُتر جانے کا موقع ملے تو اس کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہے اس جہاز پر دو ہم اور دو یہ نوجوان، بس یہی چار آدمی ہیں جو ہندوستانی ہیں — گویا ماڈرن انڈیا کے نمائندے! ان دو دنوں میں جبکہ ہمارا جہاز گنگا کے پانی سے باہر نہیں آیا تھا بھائی ت ادبودھی کے ایڈیٹر کی واضح ہدایات کے تحت مجھ پر یہ زور دیتے رہے کہ بس میں اپنا مضمون ماڈرن انڈیا جلد سے جلد ختم کر ڈالوں، آج مجھے موقع ملا تو میں نے اس سے پوچھا — بھائی ماڈرن انڈیا کی حالت کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے ؟ اور وہ ایک نظر سیکنڈ کلاس کو دیکھ کر اور پھر ایک نظر اپنی جانب دیکھ کر افسوس کی ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے مجھ سے بولے — " بہت افسوسناک! سب کچھ خلط ملط ہوا جا رہا ہے "۔

گنگا کی شاخ ہگلی کو اس کی بڑی شاخ پدما کی بہ نسبت کیوں زیادہ اہمیت دی جاتی ہے، بہت سے لوگوں کے یہاں کے مطابق اس کی وجہ یہ ہے کہ ہگلی دریا کا پہلا اور حقیقی راستہ تھا لیکن بعد دریا نے اپنا راستہ بدل دیا اور اس کی ایک اور شاخ بن گئی جس کو پدما کہتے ہیں اسی طرح "تلی نالا" گنگا کے قدیم راستہ کو ظاہر کرتا ہے اور آج کل ادی گنگا کہا جاتا ہے، کوی کن کن کے ہیرو نے جو بحری تاجر تھا، جب لنکا کا سفر کیا تھا وہ اسی راستہ سے وہاں گیا تھا، ماضی میں بڑے بڑے جہاز گنگا میں تربینی تک آتے جاتے تھے، قدیم بندرگاہ سپت گرام، تربینی سے تھوڑی دُور دریائے سرسوتی پر واقع تھا، پراچین کال سے بنگال کی بدیشی ممالک سے ساری تجارت اسی بندرگاہ سے ہوا کرتی تھی، تبدریج سرسوتی کا دہانہ مٹی سے بھرتا گیا اور ۱۵۳۹ء میں جب بہت زیادہ مٹی اکٹھی ہو گئی تو پرتگالی نوآبادکاروں کو اپنے جہازوں کی آمدورفت کے لئے گنگا کے زیریں حصہ میں ایک اور جگہ ڈھونڈھنی پڑی۔ اس جگہ پر بعد میں ہگلی کا قصبہ آباد ہو گیا۔ سولہویں صدی کے اوائل ہی سے ہندوستانی و بدیشی ممالک کے تاجروں کو اس بات سے بڑی تشویش لاحق تھی کہ گنگا کا دہانہ مٹی سے بھرتا جا رہا ہے، لیکن اس کا کیا تدارک ہو سکتا تھا، انجینیرنگ کی بشری استعداد اس مرحلہ پر بے بس ہو کر رہ گئی تھی، چنانچہ بے بسی کی یہ حالت ابھی تک جاری ہے ۱۶۶۶ء ایک فرانسیسی مشنری لکھتا ہے کہ گنگا کے نزدیک سوتی اس وقت مٹی سے بالکل بھر چکی تھی، ہول زیل جیسے بلیک ہول کے واقعہ نے بڑی شہرت دیدی ہے مرشدآباد جاتے ہوئے جب شانتی پور،

کے مقام پر پہنچا تو یہاں دریا اس قدر اُتھلا ہو چکا تھا کہ اسے معمولی دیہی کشتیاں اپنا سفر جاری رکھنے کے لئے استعمال کرنی پڑیں، ۱۷۹۷ء میں کیپٹن کول بروک نے لکھا کہ موسم گرما میں دیسی ساخت کی کشتیاں ہگلی اور جالنگی میں نہیں چل سکتیں، ۱۸۴۴، ۱۸۲۲ء کے درمیانی سالوں میں ہر قسم کی کشتی رانی بند رہی، ان ۲۴ برسوں میں پانی کی سطح زمین سے صرف دو تین فٹ اونچی رہی، سترھویں صدی عیسوی میں ڈچوں نے ہگلی سے آگے ایک میل کے فاصلہ پر واقع مقام چنسورا میں اپنا تجارتی مستقر قائم کیا، فرانسیسیوں نے جو بعد میں آئے تھے چندرنگر کے مقام پر اپنی نوآبادی قائم کی۔ ۱۷۲۳ء میں جرمن اوسٹنڈ کمپنی نے دریا کے دوسرے کنارے پر چندرنگر سے پانچ میل کے فاصلے پر واقع ایک مقام بانکی پور میں اپنی ایک فیکٹری کھولی، ۱۶۱۶ء میں ڈنمارک کے لوگوں نے چندرنگر سے آٹھ میل دور سیرامپور کے مقام پر اپنی ایک فیکٹری قائم کی اور اس کے بعد انگریزوں نے اور آگے بڑھ کر کلکتہ شہر آباد کیا۔ ان میں سے سوا کلکتہ کے اب کوئی مقام جہاز رانی کے مقصد کے لئے کام نہیں آتا، کلکتہ تک جہاز آتے جاتے ہیں لیکن مستقبل کا خطرہ ہر شخص کو ستا رہا ہے۔

موسم گرما میں بھی شانتی پور کے آس پاس گنگا میں اتنا زیادہ پانی کیوں رہتا ہے، اس کی ایک خاص وجہ ہے، جب دریا کی روانی تھمنے لگتی ہے تو زیر زمین پانی کی بہت بڑی مقدار سوتوں کے ذریعہ سے دریا کے پانی میں شامل ہو جاتی ہے، دریا کے دونوں کناروں پر زمین کی سطح بہت بلند ہے اور پانی کی سطح بہت نیچی ہے، اگر مٹی کے جمنے سے دریا کی سطح اونچی ہو جائے تو پھر یہاں بھی ایک مشکل پیدا ہو جائے گی، مزید براں ایک اور خطرہ کا بھی یہاں چرچا کیا جاتا ہے، زلزلے یا دوسرے وجوہ سے کلکتہ تک میں بسا اوقات دریا کا پانی اتنا سوکھ جاتا ہے کہ ایک شخص بڑی آسانی سے دریا کو چل کر عبور کر لیتا ہے، کہا جاتا ہے کہ ۱۷۷۰ء میں ایک بار ایسی ہی صورت پیدا ہو گئی تھی، ایک اور رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ ۹ راکتوبر ۱۹۳۴ء بروز ڈیمر وار، جب دوپہر کے وقت جوار آیا تو دریا کا پانی قطعی طور پر سوکھ گیا، اگر یہ واقعہ دوپہر کے بعد رونما ہوا ہوتا تو آپ خود ہی قیاس کیجئے کہ اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوتا، شاید دریا اپنی جگہ پر پھر واپس ہی نہ آتا۔

بہرحال یہ باتیں ہگلی کے بالائی حصہ کے بارہ میں تھیں، اب اس حصہ کا حال سنیئے جو کلکتہ کے نیچے ہے، اس حصہ میں سواحل جیمس ومیری بڑا خطرہ لاحق ہے، ماضی میں دریائے دمودر کلکتہ سے تیس میل اوپر دریائے گنگا سے جا کر مل جاتا تھا، لیکن مرور زمانہ سے یہ دریا اب جس مقام پر گنگا

سے ملتا ہے وہ کلکتہ سے تقریباً اکتیس میل دور جنوب میں واقع ہے، اس سے چھ میل دور ندی روپ نرائن دریائے گنگا میں ملتی ہے، یہ تو واقعہ ہے کہ دونوں دریا بحیثیت معاون دریا، گنگا کو پانی کی تعداد فراہم کرتے ہیں لیکن یہ دونوں جس تعداد میں مٹی کو اپنے ساتھ لاکر گنگا میں جمع کرتے ہیں اسے کس طرح ہٹایا جائے اصل سوال یہ ہے؟ انجام کار دریا میں ریت جمع ہو رہی ہے، یہ ریت کبھی ایک جگہ جم جاتی ہے اور کبھی بہہ جاتی ہے، پانی کے نیچے ریت کے اونچے اونچے ٹیلے بن گئے ہیں اور ان کی بنا پر خطرات بنے رہتے ہیں۔ چنانچہ رات دن پانی کی سطح اور اس کی گہرائی کو ناپا جاتا ہے اگر ایک دو دن بھی پانی کی گہرائی کو نہ ناپا جائے تو اس بے پروائی کی بدولت جہاز ان ریت کے ٹیلوں سے ٹکرا کر برباد ہو جائیں، ایسے واقعات ہو چکے ہیں کہ ان ٹیلوں سے ایک بہت بڑا جہاز ٹکرایا اور صرف آدھ گھنٹے کے اندر وہ دلدل میں ڈوب گیا اور صرف اس کا بالائی حصہ دکھائی دیتا رہا۔ ان دلدلی سواحل کو بجا طور پر "دمودر روپ نرائن"[1] دہانہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ متصل دیہاتوں میں سے دمودر دریا بہتا ہے اور اس میں جہاز اور سٹیمر وغیرہ آتے ہیں۔ ۱۸۷۷ء میں ایک جہاز جس کا نام کاونٹی آف اسٹرلنگ تھا اور جس پر ۱۴۴۴ ٹن گیہوں لدا ہوا تھا ان دلدلی ٹیلوں میں سے ایک ٹیلے سے ٹکرایا اور صرف چار منٹ کے اندر دلدل میں اس طرح ڈوبا کہ اس کا نشان تک نہ رہا، ۱۸۷۴ء میں ایک اسٹیمر کو بھی یہی حادثہ پیش آیا اس پر ۲۴۰۰ ٹن وزنی سامان لدا ہوا تھا، دو منٹ کے اندر یہ اسٹیمر بھی لاپتہ ہو گیا تھا۔ اے گنگا میا تو اپنے اس خوفناک دہانہ کے باوجود ہم پر اپنی کرپا رکھ، میں تجھے پرنام کرتا ہوں کہ ہم سلامتی کے ساتھ تیرے دہانے سے باہر نکل آئے ہیں ــــ بھائی ت ــــ فرماتے ہیں کہ "ماتا کی اس مہربانی کی بنا پر ہمیں ایک بکرا بطور قربانی بھینٹ کرنا چاہیئے۔" میں نے یہ جواب دیا کہ" ہاں بھائی آپ کی بات ٹھیک ہے لیکن صرف ایک ہی دن قربانی کیوں دی جائے، ہمیں تو ہر دن قربانی دینی چاہیئے"۔ دوسرے دن بھائی ــــ ت ــــ نے یہ بات پھر چھیڑی لیکن میں چپ رہا۔ اس کے بعد دوسرے دن میں نے رات کے کھانے پر انہیں محسوس کرایا کہ کتنے ہی بکروں کی قربانی کا عمل متواتر جاری ہے۔ بھائی ــــ ت ــــ بظاہر حیران و پریشان ہوتے ہوئے بولے" آپ کا مطلب کیا ہے؟ یہ بس آپ ہی تو ہیں جو کھا رہے ہیں"۔ تب میں نے بڑی رقت

---

[1] دمودر روپ نارائن نہ صرف یہ کہ دو دریاؤں کے نام پر اس دہانہ کا نام رکھا گیا ہے بلکہ اس سے ایک اچھا معنوی مذاق بھی پیدا ہوتا ہے۔ یعنی دمودر بحیثیت نارائن، جس کے معنی ہوئے ہر شئے کو نگل جانے والا۔

---

سے انہیں سمجھایا کہ کس طرح کلکتہ کا ایک نوجوان جب گنگا سے بہت دور ایک گاؤں میں اپنی سسرال کے لوگوں سے ملنے کے لئے گیا اور وہاں پہنچنے پر جب رات کے کھانے کا وقت آیا تو اس نے دیکھا کہ چاروں طرف خوب زور زور سے ڈھول بج رہے ہیں اور اس کی ساس اس کے پاس دودھ کا ایک پیالہ لئے ہوئے آئی ہے اور اس بات پر اصرار کر رہی ہے کہ کھانے سے قبل وہ دودھ کا یہ پیالہ پی لے، یہ سمجھتے ہوئے کہ شاید یہ مقامی رسم ہوگی۔ اس نوجوان نے دودھ کا پیالہ پی لیا تاکہ مقامی رسم کی پابندی کرکے وہ اپنی ساس کو خوش کر دے، جب اس نے دودھ پی لیا تو ساس نے اس کو اپنے گلے سے لگا یا اور اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آگئے اس نے کہا میرے لال تو نے سچ مچ آج میرے حقیقی بیٹے جیسا کام کیا ہے تو گنگا کے ساحل پر رہتا ہے اور چونکہ تیرے پیٹ میں گنگا جل موجود ہے اور اس دودھ میں تیرے سورگباشی خسر کی ہڈیوں کا سفوف ملا ہوا تھا جسے اب تیرے پیٹ میں گنگا جل مل گیا ہے لہٰذا اس کی آتما کو شانتی میسر آگئی ہے۔" بس یہاں بھی کلکتہ سے آیا ہوا ایک آدمی موجود ہے اور جہاز پر ہر وقت گوشت کی چیزیں تیار ہوا کرتی ہیں جنہیں وہ کھاتا ہے اور اس طرح گنگا میا کو گوشت بھینٹ کیا جاتا ہے۔ لہٰذا انہیں اس سوال پر ذرا بھی پریشان نہ ہونا چاہیئے۔ بھائی ــــ ت ــــ اس قدر سنجیدہ مزاج واقع ہوئے ہیں کہ یہ پتہ لگانا بہت ہی مشکل ہے کہ ان پر اس تقریر کا کیا اثر ہوا؟

جہاز کتنی عجیب چیز ہے؟ سمندر ساحل سے اس قدر خوفناک چیز دکھائی دیتا ہے لیکن بیچوں بیچ سمندر میں ایسا لگتا ہے کہ آسمان اس سے گلے ملنے کے لئے جھک آیا ہے، اس کی گود سے سورج اگتا ہے اور پھر اسی کی گود میں ڈوب جاتا ہے اور کسی کے دل میں ذرا سا بھی خوف نہیں آتا ــ سمندر اس وقت عظیم ترین شاہراہ بن چکا ہے اور جہازوں کا سفر تمام دوسرے ذرائع کے مقابلہ میں سب سے زیادہ ارزاں ہے، جہاز ایجاد کس نے کیا؟ کوئی واحد شخص جہاز کا موجد نہیں ہے، تمام دوسری مشینری کی طرح جو انسان کے لئے ناگزیر ہو چکی ہے اور جس کے بغیر بشر کے لئے ایک لمحہ بسر کرنا بھی اب مشکل ہے درحقیقت انسان کی مشترک محنت کا ثمر ہے۔ اسی مشترک محنت نے جس طرح مشینوں پر مشتمل اتنی بڑی بڑی فیکٹریاں کھڑی کر دی ہیں اسی طرح جہاز بھی معرض وجود میں آیا ہے، مثال میں پہیہ کو لیجیئے! یہ لازمی اور ناگزیر شے ہے، چرچوں کرتی ہوئی بیل گاڑی سے لے کر جگن ناتھ کی موٹر تک، نیز چرخہ سے لے کر بڑی بڑی دیو ہیکل فیکٹریوں تک ــــ ہر جگہ پہیہ کا استعمال لازمی اور ناگزیر ہے، اب بتایئے کہ پہیہ کس نے ایجاد کیا؟ کوئی واحد شخص پہیہ کا موجد نہیں، یہ ایجاد بھی مشترک محنت کا ثمر ہے، ابتدا میں آدمی کلہاڑی کی مدد سے پیڑوں کو زمین پر گرا لیا کرتا تھا

اوران کے تنے سے گول گول ٹکڑے کاٹ لیتا تھا جو ٹھوس ہوا کرتے تھے، ان سے پہیہ کا کام لیا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ پہیہ کی ساخت میں ترقی ہوتی گئی، یہاں تک کہ ہمارے دور کا پہیہ معرض وجود میں آیا، کون جانتا ہے کہ پہیہ کے ارتقا پر کتنے ہزار برس کی مدت گزری ہے ؟ لیکن ہندوستان میں ایسے نمونے محفوظ ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس کس زمانہ میں پہیہ کی ساخت میں کیسی کیسی ترقی ہوئی ہے، بہر طور کتنی ہی ترقی ہوئی ہو، یا پہیہ کی ساخت میں کیسی تبدیلی آئی ہو لیکن ارتقا ر کے ابتدائی ادوار سے لوگ سدا ہی وابستگی رکھتے ہیں لہذا ارتقا ر کے اس سلسلہ کی کڑی کڑی محفوظ ہے، سب سے پہلے ایک ساز جو معرض وجود میں آیا اس کی شکل یہ تھی کہ بانس کے ایک ٹکڑے پر ایک تار باندھ لیا گیا تھا، رفتہ رفتہ مضراب معرضِ وجود میں آئی اور پہلا وائلن ایجاد ہوا۔ پھر اس کی ساخت میں اور تبدیلیاں ہوگئیں، مضراب کی شکلیں بھی بدلیں اور مختلف النوع سازوں کے مختلف نام رکھے جانے لگے، یہاں تک ستارا ور سارنگی وغیرہ معرضِ وجود میں آگئے، لیکن اس کے باوجود کیا مسلمان ملاح قدیم وضع کی بین نہیں بجاتے ؟ اور کیا مجور کہار کی کہانی نہیں گاتے، وسطی ہند کے صوبوں میں چلے جائیے آپ کو لکڑی کے ٹھوس پہیئے سڑکوں پر چلتے ہوئے دکھائی دیں گے ــــ اگرچہ ٹائروں کے اس زمانہ میں ان پہیوں کے رواج سے لوگوں کی عقل کی کمی ظاہر ہوتی ہے لیکن پھر بھی ان ٹھوس پہیوں کا رواج جاری ہے۔

پراچین کال میں ــــ گویا عہد زریں میں جب عوام انتہائی مخلص اور صداقت کا شکار تھے خوف سے اپنے تن تک نہ ڈھا کتے تھے ان کا ظاہر ان کے باطن سے مختلف ہوا کرتا تھا۔ شادی نہ کرتے تھے کہ کہیں خود غرضی انہیں اپنی گرفت میں نہ لے، میوم اور توم کی تمام تمیزیں مٹا کر سدا دوسروں کی جائیدادوں کو حقیر چیز سمجھتے تھے۔ تو اس زرین عہد میں بھی دریائی سفر کے لئے وہ پیڑوں کے تنے کو اندر سے جلا کر کھوکھلا کر لیا کرتے تھے اور اس طرح وہ کشتیاں بنایا کرتے تھے۔ کیا آپ نے اُڑیسہ سے لے کر کولمبو تک سمندر کے ساحل پر ایسی کشتیاں پڑے ہوئے نہیں دیکھی ہیں ؟ آپ نے یقینی طور پر دیکھا ہوگا کہ یہ کشتیاں سمندر میں کتنی کتنی دور تک جا سکتی ہیں ؟ یہ کشتیاں ہی جہاز کی تعمیر کا ابتدائی تصور ہیں اور ان ہی کو دیکھ کر انسان نے جہاز بنایا ہے۔

---

۱؎ ابتدائی زمانہ میں عریاں انسان کے بارے سوامی جی نے طنزیہ انداز میں یہ باتیں لکھی ہیں اس لئے کہ یہ پتہ چلتا تھا کہ یہ وحشی انسان کس سے شادی کرتا تھا نیز یہ کہ دولت اور شخصیت کی اس کی نگاہ میں کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔

مثال کے طور پر مشرقی بنگال کے ملاحوں کی وہ کشتی جس پر سوار ہو کر آپ اپنی حفاظت و سلامتی کے لئے دریا کے پانچ سرپرست بوگیوں کی دہائی دیتے ہیں، آپ کا ہاؤس بوٹ جس کو چٹاگانگ کے ملاح کھیتے ہوں اور جو معمولی سے طوفان کی بھی تاب نہیں لاتی اور تمام مسافروں سے کہا جاتا ہے کہ اپنے اپنے دھرم کے مطابق وہ اپنے اپنے بھگوان سے دعا کریں کہ سوا دعا کے اور کوئی چارۂ کار نہیں ہوتا، یہ بڑی دیسی ساخت کی کشتی جس کے اگلے حصہ میں تانبے کی بنی ہوئی دو آنکھیں لگی ہوتی ہیں اور جسے ملاح کھڑے ہو کر پتواروں سے چلاتے ہیں ایسی ہی وہ کشتی بھی تھی جس پر تاجر شریمنت نے بحری سفر کیا تھا (کوی کنکن کے بیان کے مطابق سوداگر شریمنت نے خلیج بنگال اپنی کشتی کے ذریعہ پتوار چلاتے ہوئے عبور کیا تھا اور اس کی کشتی کو بڑی بڑی مچھلیوں کے جھرمٹ نے گھیر لیا تھا اور قریب تھا کہ یہ کشتی ڈوب جائے) یہ الفاظ دیگر جس کو گنگا ساگر کشتی کہا جاتا ہے ـــــ جس کی چھت بڑی خوبصورت ہوتی ہے، فرش بانس کی کھپچیوں سے بنایا جاتا ہے اور جس میں گنگا جل سے بھرے ہوئے ظروف رکھے ہوتے ہیں (پانی کی خنکی میں ایک ذائقہ ہوتا ہے، معاف فرمایئے گا آپ نے جب گنگا ساگر دیکھا تھا تو اس وقت سخت سردی پڑ رہی تھی شمال سے ٹھنڈی ہوائیں آ رہی تھیں لہٰذا آپ پانی کی خنکی سے لطف اندوز نہ ہو سکے) اور وہ چھوٹی سی کشتی جو بنگالی بابوؤں کو گھروں سے دفتر لے جاتی ہے اور دفتر سے گھروں کو لاتی ہے۔ پالی کے ایک بہت ہی ہوشیار ملاح کے زیر نگرانی چلتی ہے، وہ اتنا ہوشیار ہے کہ جیسے ہی اُسے اتنی دور پر بادل دکھائی دیتے ہیں جتنی دور کوُن ناگر ہے ویسے ہی وہ کشتی کو محفوظ جگہ پر لے آتا ہے، اب جونپور کے گٹھیلے بدن والے ملاح آ گئے ہیں وہ ایک خاص بولی بولتے ہیں اور آپ کے مہنت[1] مہاراج ان سے ازراہِ تمسخر انہی کے خاص لہجے میں کہتے ہیں "ذرا قازین تو پکڑ لاؤ" جن کو وہ "باکاسُر" سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ بات انہیں حیران کرتی ہے اور وہ پریشان ہو کر کہتے ہیں کہ "کرپا کر کے ہمیں بتایئے کہ یہ راکشش ہم کو کہاں مل سکتا ہے؟" ہمارے لئے یہ اس بھدی مست رفتار کشتی سے بھی زیادہ پریشان کن چیز ہے جسے بنگالی زبان میں "گدھا" کہا جاتا ہے اور جو کبھی سیدھی نہیں چلتی، سدا ڈول کر چلتی ہے، اور وہ بڑی کشتیاں جو سہ منزلہ ہوتی ہیں، اور جن پر لنکا، مالدیپ یا عرب سے خشک مچھلی، کھجوریں اور ناریل وغیرہ لاد کر لایا جاتا ہے ـــــ یہ اور اسی طرح کی بہت سی اقسام کی

---

[1] ایک بڑی قاز کی صورت میں راکشس جس کا بھگوت گیتا میں حوالہ موجود ہے۔

کشتیوں کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے جن سے بحری رسل ورسائل کے ارتقار کا پتہ چلتا ہے۔

بادبانوں کے ذریعہ جہاز کو چلانا یقیناً ایک حیرتناک دریافت ہے، جس سمت کی ہوا ہو اس سمت میں بادبانوں کو ہوشیاری سے استعمال کرنے پر جہاز بالیقین اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ جاتا، بادبانی جہاز کا منظر بہت ہی دلکش ہوتا ہے، ایسا لگتا ہے جیسے آسمان سے بہت سے بازوؤں والا کوئی طائر زمین پر اتر رہا ہے، بادبانوں کی وجہ سے جہاز سیدھے راستے پر نہیں چلتا بلکہ جیسے جیسے ہوا حرکت کرتی ہے ویسے ویسے جہاز بھی لہراتا ہوا چلتا ہے، لیکن جب ہوا رُک جاتی ہے تو بجائے جہاز حرکت کرنے سے معذور ہو جاتا ہے یا دبادبان کھول دیئے جاتے ہیں اور جہاز اپنی جگہ لنگر انداز ہو جاتا ہے، ان دنوں بادبانی جہازوں میں بھی لکڑی بہت کم استعمال کی جاتی ہے، یہ جہاز بھی زیادہ تر لوہے سے بنائے جاتے ہیں کسی سٹیمر کا کپتان ہونا بہت سہل ہے لیکن بادبانی جہاز کی کپتانی بہت مشکل کام ہے، اور اس کے لئے بڑے تجربے کی ضرورت ہوتی ہے، قدم قدم پر ہوا کا مزاج پہچاننا اور بہت دور سے خطرات کی بُو پالینا یہ دو لازمی اوصاف ہیں جو بادبانی جہاز کے کپتان میں ہونا چاہیں یہ دونوں اوصاف ایک سٹیمر کے کپتان کے لئے لازمی نہیں اسٹیمر زیادہ تر آدمی کے کنٹرول میں ہوتا ہے۔ ہر لمحہ اس کا انجن بند کیا جاسکتا ہے اس کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے، یا جس سمت میں بھی کپتان اسے لے جانا چاہے لے جاسکتا ہے، لیکن بادبانی جہاز کا دارومدار ہوا پر ہے۔ بادبان کھولتے کھولتے اور جہاز کا لنگر ڈالتے ڈالتے ہوسکتا ہے کہ وہ خشکی پر چڑھ جائے یا کسی پہاڑی سے اس کی ٹکر ہو جائے۔ آج کل بادبانی جہازوں پر سوائے قلیوں کے دیگر مسافر شاذونادر ہی سفر کرتے ہیں۔ ان سے سستے قسم کا سامان ڈھونے کا کام لیا جاتا ہے جیسے نمک وغیرہ! چھوٹے بادبانی جہاز ساحلوں پر تجارت کا سامان لاتے لیجاتے ہیں۔ بادبانی جہاز چونکہ سوئز نہر سے گزرنے کے لئے ہزاروں روپیہ بطور ٹول ادا نہیں کرسکتے لہٰذا وہ افریقہ کا چکر کاٹ کر انگلینڈ جاتے ہیں اور چھ ماہ میں اپنا سفر پورا کرتے ہیں۔

بادبانی جہازوں کے ان نقائص کی بنا پر بحری جنگوں میں ان کو استعمال کرنا خطرہ سے خالی نہیں ہوتا تھا، بس ہوا کا ذرا سا رُخ بدلا اور جنگ کا فیصلہ ہوا، مزید برآں یہ کہ بادبانی جہاز چونکہ لکڑی کے بنے ہوتے تھے لہٰذا ان میں جلدی سے آگ لگ جاتی تھی جسے بجھانا پڑتا تھا۔ ان کی ساخت بھی مختلف قسم کی ہوا کرتی تھی، ان کا ایک حصہ سپاٹ اور بلند ہوا کرتا تھا، نیز پانچ یا چھ کمرے ہوتے تھے، سب سے بلند کمرے کے سامنے ایک جگہ ہوتی تھی جس سے دالان کا کام لیا جاتا تھا، دالان کے سامنے کمانڈر کا کمرہ اور اس کا دفتر ہوتا تھا، پہلو بہ پہلو دوسرے افسروں کے کمرے ہوتے تھے، زیریں حصہ

میں بھی ایسے ہی چھت دار کمرے ہوتے تھے، انتہائی زیریں حصہ کے ایک کمرہ میں ملاحوں کے سونے اور کھانا کھانے کے انتظامات ہوتے تھے، ہر کمرے کے دونوں پہلوؤں میں توپیں رکھی ہوتی تھیں جن کے دہانے گول سوراخوں کے ذریعہ جہاز کی دیوار کے باہر نکلے ہوتے تھے اور توپوں کے قریب گولہ بارود کا ڈھیر لگا ہوتا تھا، ان قدیم جنگجو لوگوں کے جہازوں کے کمروں کی چھتیں بہت نیچی ہوا کرتی تھیں اور ایک شخص کو ان کے اندر جھک کر چلنا پڑتا تھا۔ بحری جنگ کے لئے ملاحوں کو فراہم کرنا بہت ہی مشکل کام تھا، چنانچہ حکومت کا مستقل ایک قانون تھا کہ لوگوں کو زبردستی بھرتی کیا جائے، ماؤں سے ان کے بچے جبر و زور کے ذریعہ چھین لئے جاتے تھے، بیٹیوں سے ان کے پتی زبردستی جدا کر لئے جاتے تھے، جیسے ہی یہ لوگ جہاز پر سوار ہوتے تھے ان کو مستول پر چڑھا دیا جاتا تھا حالانکہ ان کو اپنی زندگی میں اس کا پہلے سے کوئی تجربہ نہیں ہوتا تھا، اگر وہ خوف کی وجہ سے مستول پر چڑھنے کے حکم کی تعمیل نہ کرتے تو پھر ان کو کوڑے مارے جاتے، بعض لوگ تو کوڑوں کی مار کھاتے کھاتے مر جایا کرتے تھے، یہ امراء اور بااثر لوگ ہوا کرتے تھے جو ایسے قانون وضع کرتے تھے اور یہی لوگ ہوتے تھے جو تجارت، دوسرے ممالک کی فتوحات یا دوسری اقوام سے انتقام لینے کے جملہ فوائد حاصل کرتے تھے اور غریب لوگ صرف اس لئے تھے کہ وہ اپنا خون بہائیں اور اپنی جانیں لٹائیں — ساری دنیا کی تاریخ میں یہی بات نظر آتی ہے، اب ان قوانین کا وجود نہیں ہے، اور نہ وہ سرکاری ملازمین ہیں جو بحری فوج میں غریب کسانوں اور مزدوروں کو زبردستی بھرتی کیا کرتے تھے اور جن کے نام سے غربا کے جسموں میں تھرتھری پڑ جاتی تھی، اب بحری فوج کی ملازمت لوگ اپنی خوشی اور رضامندی سے کرتے ہیں، لیکن بہت سے عادی مجرموں کو جیل خانہ میں ڈالنے کی بجائے جنگی جہازوں پر بھیج دیا جاتا ہے جہاں انہیں ملاحی کی تربیت دی جاتی ہے۔ بھاپ کی طاقت یہ انقلاب لے آئی ہے، آج کل جہازوں کے ملاح بس ایسی ہی سجاوٹ کی ایک چیز ہیں جیسے کسی کے لئے زیور! اب ہوا پر جہازرانی کا انحصار نہیں ہے، طوفانوں اور آندھیوں سے بھی کوئی خطرہ نہیں محسوس کیا جاتا اب صرف اتنی سی بات کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ جہاز کسی سمندری پہاڑی سے نہ ٹکرا جائے۔ ماضی میں بحری جنگوں میں جو لوگ حصہ لیا کرتے تھے، وہ موجودہ زمانہ کے جنگجو لوگوں سے قطعاً مختلف ہوا کرتے تھے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اب جنگی جہاز فولادی قلعوں کی صورت کے دکھائی دیتے ہیں جو سمندر میں تیرتے پھرتے ہیں۔ اب ان کی صورت جہازوں سے بہت کم ملتی ہے، چھوٹے بڑے یہ مختلف اقسام کے فولادی قلعے ہوتے ہیں، اب توپوں کی تعداد بھی ان جہازوں پر کم ہوتی ہے، لیکن موجودہ زمانہ کی بڑی توپوں کا اگر ماضی کی توپوں سے موازنہ کیا جائے تو قدیم توپیں محض کھلونہ دکھائی دیتی ہیں۔

اور یہ جہاز کس قدر سبک رفتار ہوتے ہیں؟ ان میں سے سب سے چھوٹی کشتی کو ڈبکنی کشتی کہا جاتا ہے، کچھ بڑے جہاز دشمن کی تجارتی کشتیوں کو گرفتار کرنے کے لئے ہوتے ہیں اور سب سے بڑے جہاز جن پر حرب وضرب کا سامان موجود ہوتا ہے بحری جنگ میں عملاً حصہ لیتے ہیں۔

امریکہ کی خانہ جنگی کے زمانہ میں یونینسٹ Unionist پارٹی نے لکڑی کے جہازوں کی بیرونی دیواروں پر لوہے کی سلاخیں چڑھادی تھیں تاکہ توپ کے گولوں سے جہازوں کی بیرونی دیواریں ٹوٹنے سے محفوظ رہیں، چنانچہ دشمن کی توپوں کے گولے جب ان جہازوں پر لگتے تھے تو لوہے کی سلاخوں سے ٹکراکر گر پڑتے تھے اور جہازوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تھا۔ اس کے بعد سے جہازوں کی بیرونی دیواروں پر لوہے کی چادریں چڑھائی جانے لگیں تاکہ دشمن کے گولوں سے انہیں محفوظ رکھا جاسکے۔ جہازی توپوں میں بھی ترقی ہوئی ـــــ بڑی سے بڑی توپ ڈھالی گئی، اسے حرکت دینے، اس میں گولہ بھرنے اور گولہ چلانے کے طریق کار میں بھی سہولت پیدا کی گئی۔ پہلے توپ کا گولہ ہاتھ سے بھرا جاتا تھا اور پھر اس میں شعلہ لگایا جاتا تھا لیکن اب یہ کام مشینوں کے ذریعہ ہونے لگا، پہلے ایک توپ جس کو پانچسو آدمی مل کر بھی اپنی جگہ سے جنبش نہ دے سکتے تھے، اب محض ایک بچہ کے بٹن دبادینے سے آگے پیچھے دائیں بائیں ہٹ سکتی ہے اور مقررہ نشانہ پر گولہ پھینک سکتی ہے اور اب یہ سارا کام بس ایک سیکنڈ کے اندر ہوجاتا ہے۔ جہازوں کی بیرونی دیواروں کے فولادی خول جس طرح دبیز سے دبیز ہوتے جارہے ہیں اسی طرح توپوں کی طاقت میں بھی اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ موجودہ زمانے میں ایک جنگی جہاز فولادی دیواروں والا ایک قلعہ ہوتا ہے اور توپیں فرشتہ اجل! محض ایک گولہ بڑے سے بڑے جہاز کو پلک جھپکاتے ہی تہس نہس کردیتا ہے، لیکن یہ فولادی قلعہ بھی نکندر کے باپ نے (مشہور بنگالی کہانی) خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ تارپیڈو کی ہلاکت آفریں چوٹ سے خوفزدہ رہتا ہے۔ تارپیڈو کی شکل کم وبیش ایک سگار جیسی ہوتی ہے اور وہ پانی کے نیچے اپنے نشانہ کی طرف اس طرح جاتا ہے جیسے مچھلی تیرتی ہے، جونہی وہ اپنے نشانے سے ٹکراتا ہے آتش گیر مادہ ایک خوفناک دھماکہ کے ساتھ پھٹتا ہے اور جہاز کے ٹکڑے اڑجاتے ہیں آدمیوں کا تو پتہ بھی نہیں چلتا کہ وہ کہاں چلے گئے ـــــ بس ان کے گوشت کی کچھ بوٹیاں اور کچھ ہڈیاں ہی ملتی ہیں۔ جب یہ تارپیڈو ایجاد ہوا ہے بحری جنگیں تادیر نہیں چلتیں، ایک دو جھڑپوں کے بعد ہی فتح وشکست کا فیصلہ ہوجایا کرتا ہے، لیکن بحری جنگ میں فریقین کے جانی نقصان کے واقعہ نے آدمی کے اس فخر کو جھٹلا دیا ہے جو ان فولادی جنگی جہازوں کی ایجاد کی بنا پر اس کے دل ودماغ پر چھایا ہوا ہے۔

میدان جنگ میں بندوقوں اور رائفلوں سے برستی ہوئی گولیوں کی بنا پر فریقین کی فوجوں میں سے

اوسطاً ایک آدمی دو منٹ کے وقفہ میں ہلاک ہوتا ہے، لیکن اسی طرح اگر ایک جنگی جہاز سے صرف پانچسو گولے چلائے جائیں اور وہ اپنے اپنے نشانوں پر گریں تو پھر دونوں طرف کے جہازوں کا نام و نشان بھی نہیں رہے گا، لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ جیسے جیسے بندوق اور رائفل کی ساخت کو بہتر بنایا جارہا ہے جتنا جتنا ان کی مار کا فاصلہ بڑھتا جارہا ہے اتنا ہی اتنا نشانہ بھی خطا ہونے ہونے لگا ہے، قدیم ساخت کی ٹوپی دار بندوق سے مسلح سپاہی جب گولی چلاتے تھے تو ان کی گولی لازمی طور پر ان کے نشانے پر بیٹھتی تھی، جیسے آفریدی وغیرہ لیکن اس زمانہ کا تربیت یافتہ سولجر اپنی مشین گن سے ایک منٹ کے اندر ڈیڑھ سو گولیاں چلاتا ہے اور ان سے فضا میں صرف گرمی پیدا ہوجاتی ہے لیکن یہ تمام گولیاں نشانے پر نہیں پڑتیں، مشینری جزوی طور پر بہت اچھی چیز ہے لیکن اس کا بہت زیادہ استعمال بشر کے اقدام وعمل کی قوت کو ہلاک کر دیتا ہے اور آدمی خود بھی بے جان مشین بن کر رہ جاتا ہے فیکٹریوں میں لوگ سالہا سال اپنے خصوصی کام کا ایک جزو انجام دیتے رہتے ہیں، مثلاً لوگوں کا ایک گروہ بٹنوں کی ٹوپیوں پر پالش کر رہا ہے تو بس زندگی بھر وہ یہ پالش ہی کیا کرتے ہیں، یا لوگوں کا ایک گروہ جو سوت کاتا کرتا ہے، آگے پیچھے بڑھ کر بس یہی کام کرتا رہتا ہے اور اس کام میں ان کی عمریں بیت جاتی ہیں، لیکن ان کے اس خصوصی کام کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خود ان میں جو صلاحیت و استعداد ہوتی ہے وہ فنا ہو جاتی ہے اور وہ کوئی دوسرا ذریعہ معاش حاصل کرنے کے اہل نہیں رہتے اور فاقہ کشی کا شکار ہو جاتے ہیں، مشین کی طرح کام کرنے سے آدمی بھی مشین بن کر رہ جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ایک شخص جو زندگی بھر سکول میں ماسٹری کرتا ہے یا کسی دفتر میں کلرک کے فرائض انجام دیتا ہے اپنی زندگی کے آخری حصہ میں قطعی طور پر احمق دکھائی دینے لگتا ہے۔

تجارتی اور مسافری جہازوں کی ساخت مختلف قسم کی ہوتی ہے، اگرچہ بعض تجارتی جہاز جو زمانۂ جنگ میں تعمیر کئے گئے ہیں اس قسم کے ہیں کہ ان کو بآسانی توپوں وغیرہ سے لیس کیا جاسکتا ہے اور وہ غیر مسلح تجارتی جہازوں کا تعاقب کرسکتے ہیں۔ اور انہیں اس خدمت کے انجام دینے کی اپنی اپنی حکومتوں سے معقول اجرت بھی ملتی ہے۔ ان میں سے زیادہ تر اسٹیم شپ ہیں، وہ بالعموم اتنے بڑے اور اتنے قیمتی ہوتے ہیں کہ افراد شاذ و نادر ہی ان کے مالک ہوسکتے ہیں۔ یہ کمپنیاں ہوتی ہیں جو ان کو خریدتی ہیں اور ان کی مالک ہوتی ہیں۔ یورپ اور ہندوستان کے درمیان تجارتی جہاز راں کمپنیوں میں سے سب سے پرانی اور سب سے زیادہ مالدار کمپنی "پی اینڈ او کمپنی" ہے اس کے بعد "بی آئی ایس این کمپنی" کا نمبر آتا ہے، ان کے علاوہ بھی کئی دوسری کمپنیاں ہیں۔ دوسری بدیشی کمپنیوں میں میسجر یز میری ٹائمز (فرانسیسی) آسٹرین لائڈ، جرمن لائڈ اور روبیٹینو کمپنی (اطالوی) خاص شہرت کی حامل ہیں۔ پی اینڈ او کمپنی کے مسافری جہاز بالعموم

سب سے زیادہ تیز رفتار سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن کھانے پینے کا بہترین انتظام میسجریز میری ٹائمز کے
جہازوں میں ہوتا ہے۔

اس بار جب ہم یورپ کے لئے روانہ ہوئے تو موخرالذکر دو کمپنیوں نے طاعون کی وبا کے ڈر سے
مقامی باشندوں کی بکنگ بند کر رکھی تھی، مزید برآں حکومت ہند کا یہ قانون بھی ہے کہ کوئی مقامی باشندہ
ایمیگریشن آفس سے سرٹیفکیٹ حاصل کئے بغیر بیرونی ممالک کے سفر کے لئے روانہ نہیں ہو سکتا، یہ قانون
اس لئے بنایا گیا ہے کہ ہندوستان کا کوئی باشندہ بدیشی ممالک میں جا کر خود کو بطور غلام فروخت نہ کر دے
یا قلی گیری کا پیشہ اختیار نہ کرے، اور اس بات کا تیقن ہو جائے کہ وہ برضا و رغبت سفر پر جا رہا ہے کسی
کے جبر سے نہیں جا رہا ہے۔ یہ سرٹیفکیٹ جہاز پر سوار ہونے سے پہلے پیش کرنا پڑتا ہے۔ ہندوستان کے شرفاء
جو بدیشی ممالک کے سفر پر جایا کرتے تھے، ان سے اس قانون کی ایک زمانہ سے پابندی نہیں کرائی جا رہی
تھی۔ قانون تھا لیکن اس پر عمل درآمد نہیں ہو رہا تھا۔ مگر طاعون کی وبا پھوٹ پڑنے کی وجہ سے اب اس
پر عمل درآمد ہونے لگا ہے تاکہ حکومت کو بدیشی ممالک کے سفر پر جانے والے ہر ہندوستانی باشندے کے
بارے میں ضروری معلومات حاصل رہیں، بہرحال ہم اپنے وطن میں تو اس بارہ میں بہت کچھ سنا کرتے ہیں
کہ کون اشراف کے طبقہ سے تعلق رکھتا ہے اور کون پنچ ذاتوں سے تعلق رکھتا ہے لیکن حکومت کی نگاہ میں
بغیر کسی امتیاز کے سب مساوی حیثیت رکھتے ہیں، مہاراجہ، راجہ، براہمن، کھتری، ویش، شودر —— سب
ایک ہی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اس طبقہ کا نام ہے "ہندوستانی غلام" جو قانون اور ضابطہ قلیوں پر نافذ
ہوتا ہے وہی سب ہندوستانی باشندوں پر بغیر کسی امتیاز کے نافذ ہے —— اے برطانوی حکومت تیرا
شکریہ! تیری بدولت ایک ہی لمحہ کے لئے سہی لیکن میں خود کو انسانوں کے اس گروہ کا ایک فرد محسوس







Messageries Maritimes

جس کو ہندوستانی غلام کہا جاتا ہے، یہ احساس ہے جس کا بہت زیادہ خیر مقدم کرنا چاہیئے، اس لئے کہ میرا یہ بدن کائستھ خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور بہت سے طبقات نے اسے اپنا نشانہ بنایا ہے، آج کل ہم ہندوستان میں جملہ طبقات سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی زبان سے یہ سننے لگے ہیں کہ ان سب کی رگوں میں آریوں کا خون موجزن ہے، رائے کا فرق صرف اس بات میں ہے کہ کس میں کتنا خون ہے، کچھ لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ ان میں دوسروں کی بہ نسبت خون کی زیادہ مقدار موجود ہے، اس سے زیادہ رائے کا کوئی فرق نہیں ہے، لیکن وہ اس بات میں متفق ہیں کہ ان کی جملہ جاہتیاں کائستھ جاتی سے برتر ہیں، یہ چرچا بھی ہے کہ ان کا اور انگریز نسل کا ایک ہی تخم ہے، گویا وہ جرمنوں کی طرح انگریزوں کے ممیرے بھائی ہیں۔ اور وہ خالص ہندوستانی نہیں ہیں وہ بھی قوانین فطرت کے تحت اس طرح آئے تھے جس طرح انگریز آئے ہیں اور اگرچہ ہمارے دھرم میں صغر سنی کی شادی، کثرت ازدواج، مورتی پوجا، ستی اور عورتوں کے پردے کے برے رواجوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں، لیکن ان رواجوں کی داغ بیل کائستھوں کے اباواجداد اور انہی کی نسلوں سے تعلق رکھنے والے دوسرے لوگوں نے ڈالی تھی، ان کا دھرم بھی انگریزوں کے دھرم سے مشابہہ ہے اور ان کے آباواجداد بالکل انگریزوں جیسی شکل وصورت رکھتے تھے، ان کا رنگ یہاں کی گرمی کی وجہ سے کالا پڑ گیا، اگر ہمت وجرأت ہے تو اب اپنے سارے منطقی دلائل لے کر سامنے آئیے اگو رنمنٹ کہتی ہے کہ "تم سب غلام ہو" اب بتایئے کہ انگریزی فیشن کے لباس سے خود کو ملبوس کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ آپ کی انگریزی ٹوپیاں وغیرہ آپ کے کس کام آسکتی ہیں؟ اگر آپ سارا الزام ہندوؤں پر ڈال دیں اور انگریزوں کے ساتھ دوستی گانٹھنے کی کوشش کریں تب بھی آپ کو گھونسوں اور طمانچوں میں سے بڑا حصہ ملے گا، چھوٹا حصہ نہیں ملے گا۔ اے انگریز حکومت تیرا شکریہ! تجھ پر خوش قسمتی کے دیوتا کا سایہ ہے اور تیری خوشحالی میں دن دونا رات چوگنا اضافہ ہوتا رہے۔ ہم پھر انگوچھا اور دھوتی پہن کر مسرت محسوس کریں گے ـــــ ہمیں ہمارا انگوچھا بھلا، ہماری دھوتی غنیمت! غلاموں کا لباس ـــــ دیسی لباس! تمہارے فضل سے ہم پورے ملک کے طول وعرض میں اپنا سفر جاری رکھیں گے۔ ننگے پاؤں، ننگے سر، چلتے پھرتے رہیں گے اور ٹھیٹ ہندوستانی طریقہ سے اپنی مرغوب خوراک چاول اور دال اپنی انگلیوں سے نوالے بنا بنا کر کھاتے رہیں گے، بھگوان ہم پر کرپا کرے! انگلو انڈین فیشنوں نے ہمیں رجھا لیا تھا اور ہم ان کی چمک دمک میں ڈوب گئے تھے، ہم نے یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ جیسے ہی ہم اپنا دیسی لباس اتار پھینکیں گے، اپنا دیسی دھرم اور دیسی راج چھوڑ دیں گے ویسے ہی انگریز ہمیں اپنے کاندھے پر بٹھالیں گے اور ہمارے ساتھ برابری کا سلوک کریں گے، قریب تھا کہ ہم اپنا دیسی لباس چھوڑ دیں اپنے رواج ورسوم اور اپنا دھرم ترک کر دیں کہ ہمیں برطانوی بوٹوں کی ٹھوکریں ملنے لگیں انگریز کے مُکے اور گھونسے ملنے لگے ـــــ لوگوں کے ذہنوں میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی اور وہ انگریزی طور وطریق

اور رواج ورسوم کو خیر باد کہہ کر پھر اپنے راستہ پر پلٹ آئے اور ان کا دل یہ اقرار کرنے لگا کہ وہ جنم سے ہندوستانی ہیں۔

"انگریزوں کے رواجوں کی ہم نے کس محنت ومشقت سے نقل اُتارنے کی کوشش کی
لیکن برطانوی بوٹوں کی ٹھوکروں نے ہمارے سر توڑ دیئے، ہمارا بھیجا نکال دیا۔"

اے انگریز گورنمنٹ تیرا شکریہ! تیری حکمرانی کے تخت کا پایہ اور مستحکم و پائیدار ہو اور تو ہمیشہ ہمیشہ حکمرانی کرے، وہ تھوڑا سا رجحان جو انگریزوں کے طور وطریق اختیار کرنے کے لئے مجھ میں موجود تھا، امریکنوں کی مہربانی سے ندارد ہو گیا میں سدا بڑھتی ہوئی داڑھی سے بہت پریشان رہا کرتا تھا لیکن جیسے ہی میں نے حجامت کے ایک سیلون میں جھانکا کسی نے مجھے آواز دی — "یہاں تمہارے جیسے بدصورت اور بدقطع لوگوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے"۔ میں نے سوچا کہ میں پگڑی اور گیروا لبادہ پہنے ہوئے ہوں لہٰذا یہ شخص شاید میرے اس لباس کو دیکھ کر متنفر ہو گیا۔ پس مجھے انگریزی کوٹ اور ہیٹ خریدنی چاہیئے، میں یہ لباس خریدنے ہی والا تھا کہ خوش قسمتی سے مجھے ایک امریکن باشندہ مل گیا، اس نے مجھے صلاح دی کہ میرا گیروا لبادہ بہت اچھا ہے اس لئے کہ اس لباس سے کسی کو کوئی دھوکا نہیں ہوگا لیکن جیسے ہی میں یورپین وضع کا لباس زیب تن کروں گا ویسے ہی لوگوں کی ایک بھیڑ میرے پیچھے لگ جائے گی، میں جب لنکا میں گیا اور وہاں مجھے یہی تجربہ ہوا، پس میں نے اپنے ہاتھ سے حجامت شروع کر دی اور خود ہی اپنی حجامت کرنے لگا، ایک مرتبہ میں بھوک سے بہت بے چین ہوا اور ایک ریسٹورنٹ میں چلا گیا وہاں جا کر میں نے کسی کھانے کی چیز کا آرڈر دیا لیکن بیرے نے کہا کہ وہ چیز موجود نہیں ہے، میں نے پوچھا "آخر کیوں نہیں ہے؟" تو پھر اس نے مجھے سیدھی سادی زبان میں بتلایا کہ جس میز پر میں کوئی چیز کھاؤں گا اس میز پر دوسرے گاہک بیٹھنا پسند نہیں کریں گے، اس لئے کہ آپ کے ساتھ بیٹھنے سے وہ اپنی برادری اور اپنی جاتی سے خارج کر دیئے جائیں گے، کسی حد تک امریکن باشندے بھی خود میرے وطن کی طرح جوذات پات کے بھید بھاؤ کا شکار ہے اس معاملہ میں اس معاملہ میں مجھ سے اتفاق کرتے دکھائی دیئے، کالے گورے ان امتیازات سے قطع نظر کرتے ہوئے غلاموں کے درمیان آریائی خون کی تعداد پر یہ گھمنڈ پایا جاتا ہے، غلاموں میں اپنی نجابت پر اس طرح کا گھمنڈ کتنا برا لگتا ہے کسی زمانے میں ایک ڈوم تھا جو یہ کہتا تھا کہ روئے ارض پر بس ایک ہی جاتی ہے جو سب سے برتر ہے اور وہ ہماری جاتی ہے، آپ ہمیں پہچان لیجئے ہم ڈ........و........م........ہیں۔ آپ سوچئے آخر یہ مذاق کیا ہے؟ جن لوگوں کی عالم انسانیت میں کوئی وقعت نہیں ہے وہ ذات پات کے بھید بھاؤ میں اس قدر غلو کرنے کی عادت رکھتے ہیں۔

اسٹیم شپ[1] عام طور پر بادبانی جہازوں سے بڑے ہوا کرتے ہیں، بحر اوقیانوس کو عبور کرنے والے اسٹیم شپ ہمارے "گولکنڈہ" سے تقریباً دوگنے بڑے ہوتے ہیں جس جہاز پر جاپان سے سوار ہو کر مس نے

---

[1] اے بی آئی ایس این کا سٹیمر جس پر سوامی دویکانند نے دوسری بار مغرب کا سفر کیا تھا

بحر الکاہل کو عبور کیا تھا وہ بھی بہت بڑا جہاز تھا، بڑے جہازوں کے وسطی حصہ میں فرسٹ کلاس ڈبے ہوتے ہیں اور ان کے دونوں پہلوؤں پر تھوڑی تھوڑی جگہ ہوتی ہے اس کے بعد سکنڈ کلاس ڈبے ہوتے ہیں اور ان کے اہلو پہلو کم کرایہ ادا کرنے والے مسافروں کے لئے جگہ ہوتی ہے، ایک کنارے پر ملاحوں اور ملازمین کے کوارٹر ہوتے ہیں۔ اسٹیریج کے ساتھ ہی تھرڈ کلاس ڈبہ ہوتا ہے جس میں بہت ہی غریب لوگ سفر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ لوگ جو امریکہ یا آسٹریلیا کو ہجرت کر کے جاتے ہیں، ان کے بیٹھنے کی جگہ بھی بہت کم ہوتی ہے اور انہیں کھانا میزوں پر نہیں کھلایا جاتا بلکہ ان کے حصہ کی خوراک ان کے ہاتھوں میں پکڑا دی جاتی ہے۔ ان جہازوں میں جو ہندوستان و انگلستان کے درمیان چلتے ہیں سٹیریج نہیں ہوتی لیکن ان میں عرشہ ہوتا ہے اور وہ عرشہ پر سفر کرنے والے مسافروں کی بکنگ کرتے ہیں، فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹوں کے درمیان جو کھلی ہوئی جگہ ہوتی ہے اسے یہ مسافر بیٹھنے اور لیٹنے کے لئے استعمال کرتے ہیں لیکن مجھے عرشہ کے مسافروں میں کوئی ایسا مسافر نہیں ملا جسے بہت دُور کا سفر کرنا ہو، صرف ۱۸۹۳ء میں جبکہ میں چین جا رہا تھا تو مجھے عرشہ پر سفر کرنے والے بہت سے چینی مسافر ملے تھے جو بمبئی سے ہانگ کانگ جا رہے تھے۔

طوفان آنے کے وقت عرشہ کے مسافروں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے، تھوڑی تکلیف انہیں اس وقت بھی ہوتی ہے جب بندرگاہوں میں جہاز سے سامان اتارا جاتا ہے، ماسوا ہریکین ڈیک کے جو سب سے اوپر ہوتا ہے باقی تمام جہازوں کے عرشوں کے درمیان ایک چوکور خلا ہوتا ہے جس میں سے سامان اتارا اور چڑھایا جاتا ہے، اس وقت عرشے کے مسافروں کو تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے، ورنہ رات کے وقت کلکتہ سے لے کر سوئز تک عرشہ کا سفر بہت ہی خوشگوار ہوتا ہے، گرمیوں کا زمانہ ہو تو عرشہ پر یورپ کا سفر بھی خوشگوار ہوتا ہے جبکہ فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس کے مسافر گرمی کی وجہ سے پگھلتے ہوتے ہیں تو اس وقت عرشہ ان درجوں کے مقابلہ میں جنت معلوم پڑتا ہے، اس قسم کے جہازوں میں سیکنڈ کلاس بہت ہی غیر آرام دہ ہوتا ہے، صرف جرمن لائڈ کمپنی کے جہازوں میں جو حال ہی میں قائم ہوئی ہے سیکنڈ کلاس کے انتظامات بہت اچھے ہیں، یہ کمپنی جرمنی اور آسٹریلیا کے درمیان اپنے جہاز چلاتی ہے، اس کے جہازوں کے ہریکین ڈیک تک میں کیبین ہوتے ہیں اور جو کھانا ان جہازوں میں سیکنڈ کلاس کے مسافروں کو سپلائی کیا جاتا ہے وہ گولکنڈہ کے فرسٹ کلاس کے کھانے سے بھی کہیں زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اس کمپنی کے جہاز کولمبو کی بندرگاہ سے بھی گزرتے ہیں۔

گولکنڈہ جہاز کے ہریکین ڈیک کے اندر صرف دو کیبین ہیں، ایک ڈاکٹر کے لئے ہے اور دوسرا ہمیں الاٹ کرایا گیا ہے، لیکن گرمی کی وجہ سے ہمیں زیریں ڈیک میں پناہ لینی پڑتی ہے، اس لئے کہ ہمارا کیبن جہاز کے انجن والے کمرہ کے بالکل اوپر ہے، اگرچہ پورا جہاز لوہے سے بنایا گیا ہے لیکن مسافروں کے کیبن لکڑی کے بنے

ہوتے ہیں اور ان کی دیواروں میں صاف اور تازہ ہوا آنے کے لئے بہت سے روشندان بھی ہیں، کیبنوں کی دیواروں پر آیوری پینٹ کیا گیا ہے اور صرف رنگ کرانے پر ۲۵ پونڈ فی کمرہ کے حساب سے لاگت آتی ہے، کمرہ کے فرش پر چھوٹا سا قالین بچھا ہوتا ہے اور سامنے کی دیوار میں دو فولادی چوکھٹے آویزاں ہیں جو لوہے کے پلنگ جیسا کام دیتے ہیں لیکن ان میں پائے نہیں ہیں، یہ چوکھٹے اوپر تلے لگے ہوئے ہیں، کمرہ کے اندر داخل ہونے والے دروازہ کے بالمقابل مونہہ دھونے کا بیسن لگا ہوا ہے اور اس کے اوپر آئینہ لٹک رہا ہے، دو بوتلیں اور پینے کے پانی کے دو ٹمبلر ہیں پلنگ کے ساتھ پیتل کے چوکھٹوں کی الماریاں ہیں جو حسب ضرورت استعمال کی جا سکتی ہیں۔ رات کو سوتے وقت مسافر اپنی قیمتی چیزیں ان کے اندر رکھ کر محفوظ کر دیتے ہیں، زیریں پلنگ کے نیچے بکس اور بستر وغیرہ رکھنے کی جگہ ہے، سیکنڈ کلاس میں بھی ایسا ہی انتظام ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ جگہ کم ہے اور جو فرنیچر ہے وہ معمولی قسم کا ہے۔ جہاز رانی پر قریب قریب انگریزوں کی اجارہ داری مسلط ہے، لہٰذا دوسری اقوام بھی جو جہاز تعمیر کرتی ہیں ان میں کھانے پینے کا انتظام بالکل انگریزی طریقہ پر کیا جاتا ہے تاکہ انگریز مسافر جن کی تعداد کافی زیادہ ہوتی ہے ان جہازوں کے اندر کوئی تکلیف نہ اُٹھائیں، سارا ساز و سامان ایسا ہی ہوتا ہے، کھانے کے اوقات بھی انگریزوں کے اوقات کے مطابق ہوتے ہیں، انگلستان، فرانس، جرمنی اور روس کے کھانوں کے اوقات میں بڑا فرق ہوتا ہے جس طرح ہمارے ملک میں بنگال، شمالی ہند، مرہٹہ واڑ اور گجرات وغیرہ کے کھانوں کے اوقات میں بہت زیادہ فرق پایا جاتا ہے لیکن اوقات کے اس فرق کا جہازوں میں بہت کم لحاظ رکھتے ہیں، اس لئے کہ مسافروں کی اکثریت انگریزی زبان بولنے والوں کی ہوتی ہے لہٰذا کھانے پینے کے وہی اوقات مقرر کئے جاتے ہیں جو انگریزوں کے ہیں۔ جہاز کا کپتان ہی سب سے بڑا افسر ہوتا ہے۔ ماضی میں جہاز کے کپتان کو بڑے بڑے اختیارات حاصل تھے، وہ بالکل بادشاہ ہوتا تھا اور جہاز پر بادشاہ کی طرح حکمرانی کرتا تھا، مجرموں کو سزا دینے یہاں تک کہ بحری قزاقوں کو پھانسی پر لٹکا دینے کے اختیارات اسے حاصل ہوتے تھے۔ لیکن اس زمانہ میں اس کے اتنے وسیع اختیارات نہیں ہیں، لیکن جہاز پر بس اسی کا حکم چلتا ہے اس کے ماتحت چار افسر ہوتے ہیں جنہیں ہندوستانی زبان میں بالم کہتے ہیں، چار یا پانچ انجینئر ہوتے ہیں اور چیف انجینئر ایک افسر کی حیثیت رکھتا ہے جسے فرسٹ کلاس کھانا مہیّا کیا جاتا ہے، چار یا پانچ سٹیئرمین ہوتے ہیں جنہیں ہندوستانی زبان میں سُکانی کہتے ہیں۔ یہ لوگ باری باری ڈیوٹی دیتے ہیں اور یہ سب کے سب یورپین ہوتے ہیں۔ باقی دیگر ملازمین، ملاح، کوئلہ جھونکنے والے اور دوسرے خدمتگار سب کے سب ہندوستانی ہوتے ہیں اور وہ سب کے سب مسلمان ہیں۔ میں نے ہندو ملاح صرف بمبئی کی جانب پی اینڈ او کے جہازوں میں دیکھے ہیں۔ خدمتگار اور ملاح کلکتہ کے باشندے ہیں جبکہ کوئلہ

جھونکنے والے مشرقی بنگال کے رہنے والے ہیں ان کے علاوہ چار سویپر ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ کمپارٹمنٹوں سے میلا کچیلا پانی صاف کریں، پاخانہ وغیرہ کو صاف رکھیں اور ہمارے نہانے دھونے کا انتظام کریں۔ مسلم ملازمین عیسائی باورچیوں کے ہاتھ کا پکا یا ہوا کھانا نہیں کھاتے اس لئے کہ وہ جہاز پر سور وغیرہ کا گوشت پکاتے ہیں، مسلم ملازمین اپنے کھانے کی چیزیں آپ تیار کرتے ہیں لیکن وہ جہاز کے باورچی خانہ میں پکی ہوئی روٹی استعمال کرتے ہوئے کوئی پرہیز نہیں کرتے، کلکتہ کے رہنے والے جن ملازمین کو نئی روشنی کی ہوا لگ گئی ہے وہ کھانے پینے میں کسی بھی طرح کا کوئی پرہیز نہیں کرتے، ان لوگوں کے تین میس ہیں، ایک ملازمین کے لئے، دوسرا ملاحوں کے لئے، تیسرا کوئلہ جھونکنے والوں کے لئے، ہر میس میں کمپنی کی طرف سے ایک باورچی اور ایک ملازم دیا جاتا ہے اور ہر میس کے باورچی خانہ کے لئے الگ جگہ مقرر ہے، چند ہندو مسافر کلکتہ سے کولمبو جا رہے تھے، اور وہ ان باورچی خانوں میں سے ایک میں اپنا کھانا اس وقت پکایا کرتے تھے جبکہ ملازمین کا کھانا پک کر تیار ہو جایا کرتا تھا، ملازمین اپنے پینے کے پانی کا انتظام آپ ہی کیا کرتے ہیں ہر ڈیک کی آمنے سامنے کی دیواروں میں دو نل لگے ہوتے ہیں۔ جن میں سے ایک میں سمندر کا کھاری پانی آتا ہے اور دوسرے میں پینے کا میٹھا پانی! مسلمان بھی اسی نل سے اپنے پینے کے لئے میٹھا پانی لیتے ہیں، جن ہندوؤں کو پائپ کا پانی استعمال کرنے میں کوئی عذر نہیں وہ آسانی سے ان جہازوں کے ذریعہ انگلستان اور دوسری جگہوں کا سفر کر سکتے ہیں اور کھانے پینے کے معاملوں میں اپنی قدیم چھوا چھات کو بھی برقرار رکھ سکتے ہیں انہیں رسوئی مل سکتی ہے وہ پانی مل سکتا ہے جسے کسی نے ہاتھ نہ لگایا ہو، اشنان کے لئے بھی ایسا پانی مل سکتا ہے جو کسی نے نہ چھوا ہو، ہر قسم کی چیزیں مثلاً چاول، دال، ترکاری، مچھلی، گوشت، دودھ اور گھی وغیرہ جہاز پر ملتی ہیں، خصوصیت سے ان جہازوں پر یہ سب چیزیں بکثرت مل جاتی ہیں جن پر زیادہ تر ہندوستانی مسافر سفر کرتے ہیں۔ ان مسافروں کو چاول، دال، دہی، گوبھی، آلو وغیرہ ہر آن سپلائی کیا جاتا ہے، صرف ایک چیز ہونی چاہیئے — یعنی روپیہ! اگر آپ کے پاس روپیہ کثرت سے موجود ہے تو پھر آپ کی قدامت پرستی کی پوری پوری پاسداری کی جا سکتی ہے۔

کلکتہ اور یورپ کے درمیان چلنے والے قریب قریب تمام جہازوں میں یہ بنگالی ملازمین موجود ہیں۔ رفتہ رفتہ خود ان ملازمین کا ایک طبقہ بنتا جا رہا ہے انہوں نے متعدد سمندری اصطلاحیں بھی وضع کر لی ہیں، مثال کے طور پر وہ جہاز کے کپتان کو "باڑی والا" (زمیندار) کہتے ہیں، افسر کو مالم، مستول کو "ڈول" بادبان کو سرہ اتارنے کو ارپا اور چڑھانے کو ہا بش کہتے ہیں۔

جہازیوں اور کوئلہ جھونکنے والوں کی جماعت کا بھی ایک انچارج ہوتا ہے جسے سیرنگ کہتے ہیں اس کے تحت دو یا تین ٹنڈل ہوتے ہیں اور پھر جہازیوں اور کوئلہ جھونکنے والوں کا نمبر آتا ہے۔

بوائزیا خانساماؤں کا ایک انچارج ہوتا ہے جس کو بٹلر کہتے ہیں اور بٹلر پر ایک یورپین سٹیورڈ ہوتا ہے، جہازی لنگر کے رسوں کو پھینکتے اور سمیٹتے ہیں، جہاز کو دھو کر صاف کرتے ہیں، وہ کشتیوں کو پانی میں ڈالتے ہیں اور پھر انہیں اُٹھا کر جہاز پر چڑھاتے ہیں، انہیں بادبان بھی کھولنا اور باندھنا پڑتے ہیں لیکن اسٹیم شپ میں بادبان کھولنے اور باندھنے کی نوبت شاذونادر ہی آتی ہے، یہ لوگ بھی اسی قسم کے کام کرتے ہیں، سیرنگ اور ٹنڈل ہمہ وقت جہاز پر گھومتے پھرتے رہتے ہیں اور جہازیوں کو ان کے کام میں مدد دیتے ہیں، کول مین کا کام یہ ہے کہ وہ انجن کی بھٹی میں کوئلہ جھونکتا رہے اور آگ کو مقررہ حد پر روشن رکھے، وہ انجن کی صفائی بھی کرتا ہے اور اسے صاف ستھرا رکھتا ہے، بہت بڑے انجن کے پُرزے پرزے کو صاف رکھنا کوئی معمولی بات نہیں ہے، سیرنگ اور اس کے معاون (جہازیوں کی زبان میں برادر) کلکتہ کے رہنے والے ہیں اور بنگالی بولتے ہیں، صورت سے وہ بہت شریف دکھائی دیتے ہیں اور لکھ پڑھ لیتے ہیں، انہوں نے اسکول میں تعلیم پائی ہے اور انگریزی بھی اچھی خاصی بول لیتے ہیں، سیرنگ کا ایک بیٹا ہے، عمر تیرہ برس ہے، وہ ایک کپتان کا نوکر ہے اور اس کے کمرہ کے دروازہ پر اردلی کی طرح بیٹھا رہتا ہے، بنگالی جہازیوں، کوئلہ جھونکنے والوں، دیگر ملازمین اور کام کرنے والے لڑکوں کو دیکھ کر میرے دل میں اپنے ابنائے وطن کے متعلق مایوسی کا جو احساس تھا اس میں کسی قدر کمی آگئی ہے کس طرح ان کی انسانیت دھیرے دھیرے ارتقا پذیر ہے ــــ کتنے قوی الجثہ ــــ کتنے نڈر ــــ پھر بھی اطاعت گزار! وہ بزدلی اور خوشامد کا جذبہ جو غلاموں میں بالعموم ہوا کرتا ہے مہتروں تک میں نہیں ہے ــــ یہ کیسی عجیب تبدیلی ہے۔

ہندوستانی جہازی، بے عذر بہترین کام کرتے ہیں لیکن انہیں یورپین ملاح کے مقابلہ میں ایک چوتھائی تنخواہ ملتی ہے، اس بات سے انگلستان کے بہت سے لوگوں میں بڑی بے چینی ہے، خصوصیت سے ان یورپینوں میں بے چینی ہے جنہیں یہ ڈر ہے کہ کہیں وہ اپنا روزگار نہ کھو بیٹھیں! بعض دفعہ تو انہوں نے ایجی ٹیشن بھی کی ہے۔ ہندوستانی جہاز چونکہ یورپین کے مقابلہ میں کافی چاق چوبند ہوتے ہیں لہٰذا ان کے خلاف کوئی شکایت تو کی نہیں جاسکتی، بس ایک ہی بات کہی جاتی ہے کہ جب موسم خراب ہوتا ہے اور جہاز کو خطرات لاحق ہوتے ہیں تو ہندوستانی جہازی ہمت ہار دیتے ہیں، غضب خدا کا! یہ کیسی عجیب شکایت ہے! حقیقتاً اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے، خطرہ کے وقت یورپین ملاح خوف کی وجہ سے بری طرح شراب نوشی کرنے لگتے ہیں اور شراب کے نشہ میں مدہوش ہو جاتے ہیں اور ان کی عقل بیکار ہو جاتی ہے، ہندوستانی ملاحوں نے اپنی زندگی میں اور اب تک شراب کی ایک بوند بھی نہیں چکھی اور نہ ہی بڑے سے بڑے خطرے کے وقت ان میں سے کسی نے کبھی بزدلی دکھائی۔ کیا ہندوستانی سپاہی نے جنگ کے میدان میں کبھی اپنی بزدلی کا مظاہرہ کیا ہے؟ نہیں اور کبھی نہیں، بس ان کی رہنمائی کرنے والے لیڈر ہونے چاہئیں، ہندوستانی سپاہیوں کی بغاوت کے زمانہ میں ایک انگریز جنرل تھا جس

کا نام تھا جنرل سٹرانگ، جنرل سٹرانگ سے میری دوستی اور شناسائی تھی، اس نے مجھے بہت سے واقعات سنائے تھے، ایک دن بات چیت کے دوران میں نے جنرل اسٹرانگ سے پوچھا کہ کس طرح ہندوستانی سپاہیوں کو شکست ہوئی جبکہ ان کے پاس کثرت سے بندوقیں تھیں، افراط سے گولہ باردود تھا اور انہیں جنگ لڑنے کی تربیت ملی تھی، جنرل سٹرانگ نے اس کا یہ جواب دیا کہ ان میں جو لیڈر تھے وہ آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے سے صرف یہ شور مچاتے رہے کہ "بہادرو لڑتے رہو" جب تک جنگ کا حکم دینے والا کمانڈر خود آگے نہ بڑھے اور موت کا سامنا نہ کرے اس وقت تک اس کے محکوم سپاہی پورے جوش سے جنگ نہیں کرتے، زندگی کے ہر شعبہ میں ایسی ہی بات ہے۔" ایک کپتان کو اپنی قربانی دینی چاہیئے۔" اگر آپ کسی مقصد کے لئے اپنی جان کی قربانی دیں گے تب ہی آپ لیڈر بننے کے مستحق قرار پائیں گے، لیکن ہم لوگ یہ چاہتے ہیں کہ لیڈر بن جائیں اور کوئی قربانی نہ دیں ـــ لہٰذا اس کا نتیجہ ہے ـــ صفر! کوئی شخص بھی ہماری بات نہیں سنتا!

آپ اپنے آریائی آباؤ اجداد کی وراثت پر کتنا ہی گھمنڈ کیوں نہ کریں، قدیم ہندوستان کی شان و شوکت کے کتنے ہی گیت کیوں نہ گائیں اور اونچی جاتی میں اپنے جنم لینے پر آپ کتنا ہی فخر کیوں نہ کریں لیکن اونچی جاتیوں سے تعلق رکھنے والے اے لوگو سچ بتانا کہ کیا آپ زندہ بھی ہیں؟ آپ بس ممیوں جیسی حیثیت رکھتے ہیں جو دس ہزار برس پرانی ہیں، انہی مردہ پیکروں کو آپ کے آباؤ اجداد حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے جن میں اب بھی تھوڑی سی شکتی موجود ہے جسے ہندوستان میں ڈھونڈھا جا سکتا ہے اور یہ شکتی جن میں ہے وہ حقیقتاً آپ ہی لوگ ہیں جو چلتی پھرتی لاشوں کی حیثیت رکھتے ہیں، آپ کا گھر، آپ کا فرنیچر، بالکل مردہ عجائب خانہ کی چیزیں معلوم ہوتی ہیں، جو زندگی کے آثار سے محروم ہیں، ایک شخص جب آپ کے رسوم و رواج، نقل و حرکت اور زندگی کے طور طریق دیکھتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی دادی اماں کی کہانی سن رہا ہے، ذاتی طور پر آپ سے متعارف ہو کر بھی ایک بدیشی شخص جب اپنے وطن کو لوٹتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہ جیسے وہ کسی آرٹ گیلری کی تصویریں دیکھ کر لوٹا ہے، مایا کے اس سنسار میں آپ سچ مچ ایک خیالی پیکر ہیں، ایک معمہ ہیں۔ اے اونچی جاتیوں کے لوگو! آپ کی کل حیثیت بس اتنی ہی ہے جتنی کسی ریگستان میں نخلستان کی! آپ ماضی کا صحیفہ ہیں۔ جیسے ماضی کے کسی مصدر کی گردان کی جاتی ہے بس ویسے ہی آپ بھی گردانے جاتے ہیں، زمانہ حال میں آپ کا وجود بس ایسا ہی ہے جیسے کسی کو بدہضمی کی وجہ سے یہ خرابی ہو جاتی ہے آپ ندارد ہیں، آپ کے مستقبل کی کوئی بنیاد نہیں ہے، اے خواب و خیال کی دنیا کے ساکنو آپ کس لئے مٹر گشت کرتے رہتے ہیں؟ ماضی ہند کے مردہ جسم کے بے گوشت اور بے خون ڈھانچو! آپ کیوں مٹی میں نہیں مل جاتے اور کیوں آپ کی خاک ہوا میں منتشر نہیں ہوتی؟ ہاں آپ کی بے گوشت انگلیوں کی ہڈیوں

میں اب بھی بیش بہا انگوٹھیاں اٹکی ہوئی ہیں جن میں وہ جواہرات آویزاں ہیں جو آپ کے آبا و اجداد کی بیش بہا دولت ہیں اور آپ کے تابوت میں ماضی کا بہت بڑا خزانہ پوشیدہ ہے۔ اب تک یہ پوشیدہ خزانہ آپ کو اپنے مردہ سینہ سے منتقل کرنے کا موقع نہیں ملا ہے، اب برطانوی حکومت کے زمانہ میں مفت تعلیم کے اس دور میں آپ یہ پوشیدہ اور قیمتی خزانہ اپنے ورثاء کو منتقل کر دیں اور ہاں جتنا جلد ممکن ہو سکتا ہے اتنا جلد منتقل کر دیں، آپ کا کوئی وجود نہیں ہے، آپ فنا ہو چکے ہیں، بس اپنی جگہ نئے ہندوستان کو تعمیر ہونے دیجئے! —

ان کسانوں کی جھونپڑیوں میں سے نئے ہندوستان کو اُبھرنے دیجئے! جن کے باشندے ہل پکڑے ہوئے ہیں ان ملاحوں اور ماہی گیروں کی جھونپڑیوں سے نئے ہندوستان کو اُبھرنے دیجئے، ان لوہاروں اور مہتروں کی جھونپڑیوں سے نئے ہندوستان کو بننے دیجئے! نیا ہندوستان پنساری کی دوکان سے اُبھرے گا! فیکٹریوں کی چمنیوں سے اُبھرے گا! منڈیوں اور بازاروں سے ابھرے گا، نئے ہندوستان کو جنگلوں کے درمیان سے ابھرنے دیجئے، پہاڑیوں کی چوٹیوں سے ابھرنے دیجئے، عام لوگ ہزاروں برس سے کچلے جا رہے ہیں —— انہوں نے ہر مصیبت برداشت کی ہے اور وہ اپنی زبان پر اُف تک نہیں لائے —— ان میں کس بلا کا تحمل ہے کس قیامت کا صبر ہے! انہوں نے نہ ختم ہونے والی مصیبت برداشت کی جس نے ان میں بے پناہ شکتی پیدا کر دی وہ مٹھی بھر چنوں پر گزارہ کرتے رہے، اب آپ انہیں آدھی روٹی دیدیجئے پھر دیکھئے کہ وہ ساری دنیا کو اُلٹ کے رکھ دیں گے، طرف عالم میں ان کی شکتی کی سمائی نہیں ہے، ان میں رکت بیج[1] کی نہ ختم ہونے والی شکتی بھری ہے، مزید براں ان میں پاکیزہ اور اخلاقی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے مزید شکتی آگئی ہے اور اس شکتی کی پوری دنیا میں کوئی نظیر نہیں ہے، اتنی طمانیت، اتنا تحمل، اتنی محبت، اتنا سکوت، اتنی مشقت اور اقدام کے وقت شیر جیسی شجاعت — آپ نے یہ صفات اور کہاں پائی ہیں؟ ماضی کے کھنڈرات میں آپ! اور آپ کے جانشین آپ کے سامنے ہیں، یہی ہیں جنہیں ہندوستان کی باگ ڈور سنبھالنی ہوگی، جتنا ممکن ہو سکتا ہے آپ اپنے سینہ کا خزانہ اور اپنی انگلیوں کی انگوٹھیاں انہیں دیدیں اور خود غائب ہو جائیں، نیست و نابود ہو جائیں اور پھر کبھی نظر نہ آئیں — بس اپنے کان کھلے رکھیں، جیسے ہی آپ صفحۂ ہستی سے غائب ہوں گے ویسے ہی آپ ہندوستان کے دوبارہ جنم لینے کی آواز سنیں گے، لاکھوں اور کروڑوں آدمیوں کی ایک آواز گونجے گی جو ساری کائنات میں پھیل جائے گی — واہگورو کی فتح!

---

[1] ہندو سپتا شتا میں ایک راکشس جس کے خون کے ہر خطرہ سے جبکہ وہ زمین پر گرتا تھا تو ایک دوسرا راکشس جنم لے لیتا تھا۔

ہمارا جہاز اب خلیج بنگال میں ہے، کہتے ہیں کہ یہ بہت زیادہ گہری ہے، اس کے تھوڑے سے حصہ میں جو اُتھلا تھا گنگا نے وہ مٹی بھر دی ہے جو ہمالیہ اور شمال مغربی صوبوں (یوپی) سے بہتی ہوئی اس کے ساتھ آئی تھی، دریائی مٹی سے بھرا ہوا خلیج بنگال کا یہی حصہ ہمارا بنگال ہے، اس کے آثار کہیں بھی نہیں ملتے کہ بنگال کبھی سندربن سے آگے بھی پھیلا ہوا تھا، بعضوں کا خیال ہے کہ سندربن میں پہلے بہت سے دیہات اور قصبات تھے اور یہ کافی ترقی یافتہ علاقہ تھا، لیکن بہت سے لوگ اس خیال سے اتفاق نہیں کرتے، بہرحال سندرابن اور خلیج بنگال کا شمالی حصہ وہ علاقہ ہے جس میں بہت سے تاریخی واقعات ہوئے ہیں۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں پرتگال کے بحری قزاق ملا کرتے تھے، ارکان کے بادشاہ نے کئی بار اس علاقے پر قبضہ کرنے کی کوشش کی اور مغل بادشاہ کے گورنر نے کئی بار پرتگال کے ان بحری قزاقوں کو بھی یہاں سزا دینے کی کوشش کی جن کا سردار گونزلیز تھا، مزید براں یہاں عیسائیوں، مغلوں، مگوں اور بنگالیوں کے درمیان کئی بار لڑائیاں بھی ہوئیں۔

خلیج بنگال کا پانی قدرتی طور پر بہت پُرشور ہے، خصوصیت سے برسات کے زمانہ میں اس میں ایک تلاطم مچا رہتا ہے، چنانچہ ہمارا جہاز بھی اس تلاطم کا مقابلہ کرتے ہوئے چل رہا ہے لیکن یہ تو محض ابتدا ہے آگے آگے دیکھیے کیا ہوتا ہے اور مدراس تک ہم کس طرح پہنچتے ہیں جنوبی ہندوستان کا بڑا حصہ اب مدراس پریسیڈنسی میں شامل ہے، لیکن صرف رقبہ کی توسیع کا کیا فائدہ؟ ایک خوش نصیب مالک کی نگرانی میں ریگستان تک ارضِ جنت بن سکتا ہے! مدراس کا ایک غیر معروف چھوٹا سا گاؤں جس کا ماضی میں چینا پٹنم یا مدراس پٹنم نام تھا چندرگیری کے راجہ نے سوداگروں کی ایک کمپنی کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا تب انگریزوں کا خاص تجارتی مرکز جاوا تھا اور بنتم[^۱] تھا انگلستان کی ایشیائی تجارت کا وسطی مقام! مدراس اور ہندوستان میں انگریزوں کی دوسری تجارتی نوآبادیاں بنتم کے کنٹرول میں تھیں، اب بنتم ہے کہاں؟ اور مدراس نے کیا ترقی کر لی ہے؟ بے شک یہ کہنا سو فیصدی سچ نہیں ہے کہ خوش قسمتی صرف حوصلہ مند آدمی ہی کا ساتھ دیا کرتی ہے اور ایشور کی مدد کا ہاتھ صرف اسی کی پشت پر ہوتا ہے، لیکن میں اقرار کرتا ہوں کہ حوصلہ مند انسانوں کی ایشور مدد کرتا ہے اور ان کو طاقت دیتا ہے۔

مدراس میں خالص جنوبی ہندوستان کے خصائص محسوس ہوتے ہیں، اگرچہ کلکتہ کے جگن ناتھ گھاٹ ہی سے جنوب کے آثار نظر آنے لگتے ہیں، مثال کے طور پر اڑیسہ کے براہمن کو دیکھ کر جنوب کے آثار کو شناخت کیا جا سکتا ہے جس کا سر منڈا ہوتا ہے اور سر پر موٹی سی چوٹی ہوتی ہے، ماتھے پر قشقہ، پاؤں میں لکڑی کی انگوٹھے دار کھڑاؤں اور تیز قوتِ شامہ! اسی وجہ سے وہ اپنے بچوں کے جسم پر صندل کا لیپ لگاتے ہیں۔ گجراتی براہمن، انتہائی کالا مہاراشٹری براہمن، اور کونکن کا براہمن جس کا رنگ نسبتاً صاف

[^۱]: Bantam.

ہوتا ہے، آنکھیں بلّی کی طرح چمکیلی اور سر چوکور ا یہ سب ایک ہی وضع کا لباس پہنتے ہیں اور ان کو دکنی کہا
بھی جاتا ہے لیکن خالص جنوبی ہندوستان کے خصائص رکھنے والا براہمن صرف مدراس ہی میں دکھائی دیتا
ہے۔ پورے ماتھے کو چھپا لینے والے قشقے میں رامانج فرقے کے مسلک کی کارفرمائی نمایاں طور پر نظر آتی ہے
(شمالی ہند کے رامانند فرقے میں جس قشقے کی نقل کرتے ہوئے بہت سی صورتیں بنائی جانے لگی ہیں اور جنہوں
نے اس رواج کو پس پشت ڈال دیا ہے جو وشنو میں عقیدہ رکھنے والے بنگالی فرقے کے لیڈروں میں پایا
جاتا ہے یعنی یہ کہ وہ اپنے پورے بدن پر بہت زیادہ تصویریں بناتے ہیں) تلگو تامل اور ملیالم زبانوں کو
آپ چاہے چھ برس تک بولتے ہوئے سنتے رہیں لیکن ان زبانوں کے لہجہ کی وجہ سے آپ ایک لفظ بھی نہ سمجھ
پائیں گے اس لئے کہ ان میں "ای" اور "دا" کی آوازوں کی جتنی بھی ممکن قسمیں ہو سکتی ہیں وہ سب کی سب
رائج ہیں اور ایسا لگتا ہے جیسے کوئی شخص کالی مرچیں پڑی ہوئی دال کے ساتھ چاول کھا رہا ہے ان
کی آوازوں کے زیر و بم سے دل بھرا جاتا ہے (اتنی تیز اور تیزابی ہوتی ہیں یہ آوازیں) مزید براں مرگوسا
ساگ، حو وغیرہ ان کی تیز بو، چاول اور دہی وغیرہ، بدن سے السی کا تیل مل مل کر اشنان اور السی کے تیل
میں مچھلی کا بھوننا ــــ ان سب چیزوں کو جانے بغیر ایک شخص جنوبی ہند کو کس طرح جان سکتا ہے؟

مزید براں مسلمانوں کی حکومت کے زمانہ میں بھی جنوب نے ہندومت کو زندہ وسلامت رکھا اور
مسلمانوں کی حکمرانی کا زمانہ شروع ہونے سے کچھ عرصہ پہلے سے بھی وہ ہندومت کو زندہ رکھنے کی سعی
کر رہا تھا، یہ جنوب ہی تھا جس کی ایک جاتی میں (جو ناریل کا تیل کھاتی تھی اور اپنے ماتھے پر "پر" باندھا
کرتی تھی) شنکراچاریہ نے جنم لیا تھا، یہ جنوب ہی تھا جہاں رامانج کی ولادت ہوئی، اسی جگہ مادھومنی نے
بھی جنم لیا، ہندومت کی اصلاحات انہی لوگوں کی مرہون منت ہیں۔ چیتنیہ مت نے جو وشنو کا معتقد ہے
مادھو فرقے ہی کے مسلک سے کسب ضیا کیا ہے، شمالی ہند میں دھرم کے مصلحین، جیسے کبیر، دادو، نانک اور
رام سنیہی وغیرہ درحقیقت شنکراچاریہ کی صدائے بازگشت کی حیثیت رکھتے ہیں، چنانچہ الہ دھیا اور دوسرے
مقامات پر آپ رامانج کے پیرو موجود پائیں گے۔ جنوب کے یہ براہمن شمال کے براہمنوں کو سچا براہمن نہیں مانتے
وہ یہ بھی نہیں مانتے کہ وہ براہمنوں کی اولاد ہیں، یہاں تک کہ وہ انہیں سنیاسی تک نہیں مانتے، مدراسی اب بھی
دھرم کی مسند پر فائز ہیں۔ مسلم حملہ آوروں کے نعرہ ہائے جہاد جب شمالی ہندوستان کی فضا میں گونج رہے
تھے اور شمالی ہند کے لوگ اپنی دولت اور اپنے گھر حملہ آوروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اپنی مورتیوں، اپنی بیویوں
اور بچوں کے ساتھ خود کو جنگل میں چھلاتے پھرتے تھے تو اس وقت بھی یہ جنوبی ہند تھا جہاں ودیانگر کے
راجہ کا طوطی بول رہا تھا۔ جنوبی ہندوستان ہی میں ایک بار پھر سائن اچاریہ پیدا ہوئے جس نے اپنی سینا کی طاقت

سے مسلمانوں کو پسپا کر دیا اور راجہ بکاّ بدستور اپنے تخت پر فائز رہے۔ یہ راجہ کے دانشمند وزیر و مشیر تھے جنہوں نے سلطنت وجیانگر کا سنگ بنیاد رکھا اور اسے مستحکم و پائیدار بنایا اور راجہ بکاّ کی راج نیتی کی بدولت جنوبی ہند میں امن وامان قائم رہا اور خوشحالی نے فروغ پایا، اس کی عقل و دانش اور غیر معمولی استعداد کی وجہ سے تمام ویدوں کی شرحیں کی گئیں اور یہ اس کی قربانی اور مکتی تھی کہ ویدانت پر تحقیق و تدقیق کی گئی اور یہ علمی تحقیقی کا "پنچ داشتی" کے نام سے معرضِ وجود میں آیا، سنیاسی یامنی و دیارائن[1] بھی جنوب ہی میں پیدا ہوئے تھے، صوبہ مدراس میں ٹامل زبان بولنے والی وہ نسل آباد ہے جس کا تمدن انتہائی قدیم ہے اسی نسل کی ایک شاخ کا نام "سمیرین" ہے اور یہی وہ شاخ ہے جس نے پراچین کال میں دریائے دجلہ و فرات کے کناروں پر ایک وسیع تمدن کی داغ بیل ڈالی تھی اس شاخ کا علم جیوتش، دھرم، ضابطہ، اخلاق و تہذیب اور ادب وغیرہ بابلی اور اسیری تمدنوں کی سنگ بنیاد بنا اور اسی شاخ کی دیومالا انجیل مقدس کا اصل ماخذ ہے۔ اس ٹامل زبان بولنے والی نسل کی ایک اور شاخ مالابار کے سواحل سے چلی اور اس نے مصری تمدن کا سنگ بنیاد رکھا، اس نسل میں آریہ مختلف اعتبارات سے مخلوط تھے، ان کے عظیم الشان منادر کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ویروشنو اور ویرشیو فرقوں کا بھی جنوب میں سکہ چلا کرتا تھا۔ ہندوستان میں وشنومت کی ابتدا ایک ٹامل پریہہ نے کی تھی جس کا نام "سھاکوپ" تھا وہ پنکھے بیچا کرتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ بہرحال ایک یوگی تھا! مزید براں ٹامل الوریا معتقد اب بھی پورے وشنو فرقے میں احترام و عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ویدانت کے نظام ہائے دوییتیہ وشسٹ دویت اور ادویت اب بھی ہندوستان ہی میں فروغ پاتے دکھائی دیتے ہیں، دوسری جگہوں کی بہ نسبت یہاں دھرم کی تشنگی بھی زیادہ پائی جاتی ہے۔

۲۴ جون کی رات کو ہمارا جہاز مدراس پہنچا، صبح کو بستر سے اُٹھنے پر میں نے دیکھا کہ ہم مدراس کی گودی کے اندر ہیں، گودی کے اندر پانی ٹھہرا ہوا تھا لیکن میناروں کی طرح اٹھتی ہوئی پر شور موجیں گودی کی دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر پندرہ پندرہ بیس بیس فٹ اونچی اُٹھ جاتی تھیں اور ان کی چھینٹیں جھاگ کی طرح اڑتی تھیں، سامنے مدراس کی مشہور سڑک دکھائی دے رہی تھی جس کا نام ہے "اسٹرینڈ روڈ" دو یورپی پولیس انسپکٹر، ایک مدراسی جمعدار اور ایک درجن کانسٹبل ہمارے جہاز پر چڑھے اور مجھ سے بڑی شائستگی کے ساتھ بولے کہ دیسی لوگوں کو یہاں بندرگاہ میں اترنے کی اجازت نہیں ہے، دیسی لوگ چاہے وہ کوئی بھی ہوں اتنی گندی عادتیں رکھتے ہیں کہ ان کی وجہ سے طاعون کے جراثیم پھیل جانے کا خطرہ لگا رہتا ہے، لیکن مدراسیوں نے میرے لئے خصوصی پرمٹ کی درخواست دی ہے اور توقع ہے کہ وہ خصوصی پرمٹ حاصل کر لیں، رفتہ رفتہ مدراسی احباب کشتیوں کے ذریعہ چھوٹے

---

[1] بعض لوگوں کے خیال کے مطابق ویدوں کے مفسر سائن و دیارائن منی کے بھائی تھے۔

چھوٹے گروپوں میں ہمارے جہاز کے قریب آنے لگے، چونکہ ہرطرح کا میل جول ممنوع ہے، لہذا ہمارے جہاز اوران کی کشتیوں کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ چھوٹا رہا جس کی وجہ سے ہم جہاز پر سے ان سے کوئی بات چیت نہیں کرسکے مجھے میرے سب دوست کشتیوں پر ملے ـــــ الاسنگ، بلگیری، نرسماچاری، ڈاکٹر تیجنڈا راؤ اور دوسرے دوست! آموں کی بھری ہوئی ٹوکریاں، ناریل، پکے ہوئے چاول، دہی مٹھائیاں اور نمکین چیزیں بڑی مقدار میں میرے پاس پہنچائی جانے لگیں آہستہ آہستہ مجمع بھی بڑھا ــ مرد، عورتیں اور بچے کشتیوں میں بھر بھر کر آنے لگے اور چاروں طرف کشتیاں ہی کشتیاں دکھائی دینے لگیں، مجھ سے ایک انگریز دوست مسٹر چیمبرز سے بھی ملے، وہ بیرسٹر کی حیثیت سے مدراس آئے ہوئے ہیں۔ رام کرشنانند اور نربھے نند کئی بار جہاز کے قریب آئے۔ انہوں نے ضد کی کہ وہ دن بھر دھوپ میں اپنی کشتی پر بیٹھے رہیں گے لیکن جب میں نے بہت کہا سُنا تو انہوں نے اپنی ضد چھوڑ دی، جیسے جیسے یہ خبر پھیل رہی ہے کہ مجھے جہاز سے اترنے کی اجازت نہیں ہے، ویسے ویسے کشتیوں میں آنے والوں کا ہجوم بڑھتا جارہا ہے۔ میں بھی جب جہاز کی ریلنگ پر جھکے جھکے ایک طرح کی تھکن سی محسوس کرنے لگتا ہوں تو اپنے مدراسی بھائیوں کو وداع کر کے اپنے کیبن میں واپس آجاتا ہوں۔ آلا سنگھ کو مجھ سے برہمودن کے بارے میں اور مدراس میں ہونے والے کام کے متعلق بات چیت کرنے کا کوئی موقع نہیں ملا، لہذا وہ کولمبو تک میرے ساتھ چل رہے ہیں۔ شام کے وقت جب بندرگاہ سے جہاز چلنے لگا تو میں نے ایک شور سنا اور میں نے اپنے کیبن سے ؟ انک کر باہر کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک ہزار مدراسی مرد، عورتیں اور بچے جو بندرگاہ کی دیواروں پر چڑھے بیٹھے تھے مجھے اس طرح وداع کر رہے تھے مدراسی بھی مسرت کے مواقع پر بنگالیوں کی طرح ایک خاص قسم کی آواز زبان سے نکالتے ہیں" ہولو" کی آواز سے ملتی جلتی ہوئی ہے۔

مدراس سے لنکا پہنچنے میں ہمیں چار دن لگے، جیسے جیسے ہم آگے بڑھ رہے تھے وہ اٹھتی ہوئی دیو ہیکل موجیں بھی بڑھتی جارہی تھیں جو گنگا کے دہانے سے شروع ہوئی تھیں، جہاز بڑی مشکل سے چل رہا تھا سمندری فضا سے سب ہی مسافر بری طرح متاثر تھے، دونوں بنگالی لڑکوں پر بھی بہت زیادہ اثر تھا ان میں سے ایک کو تو اس بات کا یقین تھا کہ بس وہ مرنے ہی والا ہے اسے ہم بڑی مشکل سے دلاسہ دیتے تھے۔

بہرحال یہ تھا برسات کا موسم! جہاز جیسے جیسے جانب مغرب بڑھ رہا تھا، ویسے ویسے طوفانی ہواؤں میں بھی اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ مدراسیوں نے بہ افراط میوے، مٹھائیاں اور چاول، دہی وغیرہ ساتھ کر دیا تھا جس میں سے بڑی مقدار میں نے لڑکوں کو دیدی۔ الاسنگ نے بہ عجلت ٹکٹ خریدا اور ننگے پاؤں جہاز پر سوار ہوگئے ان کا بیان ہے کہ وہ شاذونادر ہی جوتے پہنتے ہیں۔ مختلف ملکوں کے رسوم ورواج بھی ایک دوسرے سے مختلف

ہی کرتے ہیں یورپ میں عورتوں کا ننگے پاؤں ہونا بہت ہی معیوب سمجھا جاتا ہے لیکن ان کا آدھا سینہ اگر عریاں ہو تو اس میں کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ ہمارے ملک میں سر کو ڈھانکنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اگر بدن کا کوئی اور حصہ ڈھکا ہوا نہ ہو تو اس میں کوئی بری بات نہیں ہے۔ لیکن سر کو کسی نہ کسی چیز سے ضرور ڈھکنا چاہیئے الاسنگھ "پرشمودن" کے ایڈیٹر ہیں، براہمن ہیں اور میسور کے رہنے والے ہیں راماتج فرقے سے ان کا تعلق ہے کھانے میں "رسم"[1] کے بہت شوقین ہیں۔ سر منڈاتے ہیں اور ماتھے پر تنگل فرقہ کا مروج قشقہ کھینچتے ہیں۔ ان کے ساتھ بھی جہازی سفر کے دوران میں کھانے کے لئے چاول کے مرمروں کا ایک چھوٹا سا بنڈل ہے اور دوسرے بنڈل میں بھنی ہوئی دال اور بھنے ہوئے مٹر ہیں۔ یہ دونوں بنڈل بڑی احتیاط سے وہ اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں ان کا خیال ہے کہ لنکا تک وہ ان ہی چیزوں پر گزارہ کریں گے تاکہ ان کی جاتی محفوظ و مامون رہے اور اسے کوئی گزند نہ پہنچے۔ الاسنگھ ایک بار پہلے بھی لنکا ہو آئے ہیں۔ اس وقت ان کی جاتی کے لوگوں نے پریشان کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ان لوگوں کو اپنے مقصد میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی ہندوستان کے جات پات کے نظام میں یہ بچت کا پہلو ہے اگر ایک شخص کی جات کے لوگوں کو اعتراض نہ ہو تو پھر کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس کے خلاف کوئی اعتراض کرے چنانچہ جہاں تک جنوبی ہند کی جاتیوں کا تعلق ہے ان میں بعض جاتیاں ایسی ہیں جو صرف پانچ پانچ سو، سات سات سو یا زیادہ سے زیادہ ہزار ہزار نفوس پر مشتمل ہیں اور چونکہ ان کا اپنا حلقہ بہت ہی محدود ہوتا ہے لہذا شادی وغیرہ جیسے رسوم میں بڑی دشواری پیدا ہوتی ہے اور اس دشواری کی بنا پر ان میں سے ایک شخص اپنی بہن کی بیٹی تک سے شادی کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے میسور میں جب پہلی بار ریل گاڑی چلی تھی تو ان براہمنوں کو جاتی سے خارج کر دیا گیا تھا جو اسے دیکھنے کے لئے دور دراز سے آئے تھے۔ بہر حال اس سنسار میں ہمارے الاسنگھ کی طرح کے لوگ شاذونادر ہی دکھائی دیتے ہیں۔ اتنا بے غرض اور بے لوث، اتنا محنتی اور اپنے گورو کا اتنا ارادتمند! دنیا میں اتنے سعادت مند چیلے کمیاب ہیں! جنم سے مدراسی، سر منڈا ہوا، سر کے بیچوں بیچ چھوڑی ہوئی چوٹی، ننگے پاؤں، دھوتی میں ملبوس یہ ان کی وضع قطع ہے، وہ فرسٹ کلاس کے مسافر ہیں لیکن وقتاً فوقتاً عرشہ پر چہل قدمی کرتے دکھائی دیتے ہیں اور جب بھوک لگتی ہے تو مرمرے اور بھنے ہوئے مٹر چباتے نظر آتے ہیں۔ جہازی عملہ کے لوگ بالعموم چھینی (تاجر) قرار دیتے ہیں اور ان کا یہ خیال ہے کہ ان کے پاس کثیر دولت ہوا کرتی ہے لیکن وہ اپنی دولت میں سے ایک پیسہ بھی اپنی خوراک اور اپنے لباس پر خرچ کرنا پسند نہیں کرتے۔ ملازمین کا یہ خیال بھی ہے کہ ہمارے ساتھ رہ کر الاسنگ کی خالص براہمینت میں ملاوٹ آتی جا رہی ہے اور یہ ٹھیک بھی ہے ـــــ مدراسی باشندے ہمارے روابط کی بنا پر جات پات کے اعتبارات کی

---

[1] دال کا شوربہ تیز مرچ اور خوشبودار

شدت کو کھو دیتے ہیں۔

الاسنگھ پر بجری ہوا کا کوئی اثر نہیں ہوتا، بھائی تریا نند پہلے پہلے تھوڑی سی تکلیف محسوس کی تھی لیکن اب وہ بالکل ٹھیک ہیں، چنانچہ گزشتہ چار دن مختلف دلچسپ باتوں اور گپ شپ میں بیت گئے۔ ہمیں اپنے سامنے کولمبو نظر آ رہا ہے ــــ یہ ہے سنہال ــــ لنکا! شری رامچندر پل کے ذریعہ سمندر کو عبور کر کے لنکا پہنچے تھے اور انہوں نے اس کے راجہ راون کو شکست دی تھی، میں نے وہ پل دیکھا ہے، مزید برآں رامند کے ست پتی مہاراج کے محل میں پتھر کا وہ تخت بھی میں نے دیکھا ہے جس پر بھگوان رامچندر نے ان کے جدامجد کو بحیثیت ست پتی پہلی بار فائز کیا تھا لیکن لنکا کے بودھی اس بات کو نہیں مانتے! ان کا کہنا ہے کہ ہمارے ملک میں تو اس کا کوئی ذکر تک نہیں ہے لیکن ان کے انکار سے کیا ہوتا ہے؟ کیا ہماری قدیم کتابوں کی سند کافی نہیں ہے؟ مزید براں وہ اپنے ملک کو سنہال کہتے ہیں، وہ اسے لنکا[1] نہیں کہتے ــــ وہ اسے لنکا کہہ بھی کیسے سکتے ہیں؟ ان کے الفاظ، ان کے عمل، ان کی فطرت اور ان کی صورت میں کوئی درشتی یا تلخی نہیں ہے، لباوہ ان کا پہناوا ہے، بڑے سے کنگھے میں وہ اپنے بال گوندھتے ہیں اور صورت میں بالکل عورت دکھائی دیتے ہیں، مزید براں ان کے بدن بھی عورتوں کی طرح دبلے پتلے اور نازک ہوتے ہیں ــــ کیا یہ ہیں راون اور کمبھ کرن کی اولاد ــــ نہیں! بالکل نہیں! روایات سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے بنگال سے ہجرت کی ہے ــــ اور یہ بہت ہی خوب ہوا! بنگال میں نئی پیڑھی کے لوگ ــــ جو عورتوں جیسا لباس پہنتے ہیں، نرم لہجہ میں نزاکت کے ساتھ بات چیت کرتے ہیں، زنخوں کی طرح لہراتی ہوئی چال چلتے ہیں، کسی سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتے اور جنم لیتے ہی عشقیہ گیت لکھنے لگتے ہیں، اپنی محبوبہ کے فراق میں درد بھرے گیت گانے لگتے ہیں ــــ لنکا چلے جائیں تو اچھا ہے وہاں انہیں ان کے ساتھی مل جائیں گے۔ کیا گورنمنٹ سو رہی ہے؟ حال ہی میں پوری میں کچھ لوگوں کو پکڑنے کی کوشش کی گئی تھی تو غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی تھی آخر کیوں؟ خود کلکتہ میں ایسے بہت سے ہیں جن کو پکڑا جائے اور ان کا بوریا بستر گول کر دیا جائے۔ کسی زمانہ میں ایک بہت ہی شوخ اور شریر بنگالی شہزادہ تھا جس کا نام تھا وجے سنگھ! اس نے اپنے باپ سے لڑائی لڑی اور اپنے بہت سے ساتھی جمع کر لئے، انجام کار وہ اپنے ساتھیوں سمیت ایک جہاز پر بیٹھا اور لنکا پہنچ گیا، اس زمانہ میں لنکا میں غیر متمدن قبیلے کے راجہ نے وجے سنگھ کا دل سے سواگت کیا اور بنگالی شہزادہ کے ساتھ اپنی بیٹی کا بیاہ کر دیا، کچھ دنوں تک بنگالی شہزادہ سکون اور خاموشی کے ساتھ بسر کرتا رہا لیکن اس نے اپنی بیٹی کو اپنے ساتھ ملا کر ایک رات کو اچانک راجہ اور اس کے درباریوں پر حملہ کر دیا اور ان سب کو قتل کر ڈالا، اور خود لنکا کا راجہ بن بیٹھا لیکن اس کی مکاری کی بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی ایک وقت آیا کہ وہ اپنی رانی سے بھی تنگ

---

[1] بنگالی زبان میں مرچوں کے معنی میں مستعمل ہے۔

آگیا اور اس سے بھی اس کا دل بھر گیا، چنانچہ اس نے بہت سے مردوں اور بہت سی عورتوں کو ہندوستان سے بلایا اور ان ہندوستانی عورتوں میں سے ایک خوبصورت عورت سے اس نے شادی کر لی جس کا نام انورادھا تھا اپنی پہلی رانی کو اس نے بالکل ہی نظر انداز کر دیا اور اس کی طرف سے اپنی نظریں موڑ لیں اس کے بعد اس نے لنکا کے مقامی قبیلے کے لوگوں کا قتل عام شروع کر دیا اور اس قبیلے کے سب ہی نفوس قریب قریب ہلاک کر دیئے گئے، جو بچ گئے وہ جنگلوں میں بھاگ گئے اور انہوں نے وہاں جاکر اپنی زندگی بچائی اس بنا پر لنکا کو سنہالا کہا جانے لگا اور وہ بنگالی مہاجرین کی ایک نو آبادی بن گیا۔

ایک زمانہ کے بعد جب اشوک اعظم ہندوستان پر حکمرانی کر رہا تھا تو اس کا بیٹا مہندرا اور اس کی بیٹی سنگ مترا بدھ دھرم کے مبلغ کی حیثیت سے لنکا آئے۔ انہوں نے سنیاس لے لیا تھا، لنکا پہنچنے پر انہوں نے دیکھا کہ وہاں کے باشندے بالکل وحشیانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ لہذا انہوں نے اپنی پوری زندگی اس کام کے لئے وقف کر دی کہ لنکا کے لوگوں کو جہاں تک ممکن ہو سکے دوبارہ متمدن بنایا جائے اور انہیں از سر نو تہذیب و اخلاق کی تعلیم دی جائے۔ چنانچہ انہوں نے بہت سے اخلاقی ضابطے رائج کئے اور لنکا کے لوگوں کو بدھ دھرم قبول کرنے کی دعوت دی اور ان کو بدھ مت کا پیرو بنا لیا، جلد ہی لنکا بدھ مت کا زبردست مرکز بن گیا اور جزیرہ کے وسطی حصہ میں ایک بڑا شہر تعمیر ہوا جس کا نام "انورادھاپورم" تھا اس شہر کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ بہت بڑے ستوپ، پتھروں کی بنی ہوئی عمارتوں کے کھنڈرات میلوں تک پھیلے ہوئے ہیں، ان پر جنگل اُگ آئے ہیں جنھیں اب تک صاف نہیں کیا گیا ہے۔ سر گھٹائے بھکشو اور بھکشونیں زرد لباس میں ملبوس ہاتھ میں کشکول لئے پورے لنکا میں بھیک مانگتے ملتے ہیں، منادر سے ملحق مقامات پر مہاتما بدھ کی بڑی بڑی مورتیاں ہیں مہاتما بدھ کو گیان کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے یا بدھ دھرم کی تبلیغ کرتے ہوئے یا پھر نروان کی حالت میں۔ لنکا کے لوگوں نے مندروں کی دیواروں پر شرارتاً ایسی تصویریں بنائی ہیں جن میں گناہگاروں پر گزرنے والی مصیبتیں دکھائی گئی ہیں۔ بعض تصویروں میں انہیں آرے سے چرتے ہوئے دکھایا گیا ہے بعض میں انہیں تیل میں ابلتے ہوئے اور بعض میں سولی پر لٹکتے ہوئے ___ مجموعی طور پر ان تصویروں سے بہت ہی بھیانک اور خوفناک تاثر مرتب ہوتا ہے، ایک ایسے دھرم میں جس نے اہنسا پر اتنی شدت کے ساتھ زور دیا ہے کون مان سکتا ہے کہ ایسی چیزوں کے لئے بھی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے۔ چین اور جاپان میں بھی ایسی ہی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ نظریاتی طور پر جبکہ جیو رکھشا اور اہنسا کی اتنی زبردست تبلیغ کی جاتی ہے تو سزاؤں کی یہ بھیانک تصویریں دیکھ کر ایک شخص کا خون کھول جاتا ہے۔ اس قماش کی جیو رکھشا میں عقیدہ رکھنے والے ایک شخص کے مکان میں ایک مرتبہ ایک چور آیا اور مکان کے رہنے والوں نے اسے پکڑ لیا اور خوب اچھی طرح اس کی مرمت کی۔ شور غل کی آواز سُنی تو اس گھر کے بزرگ نے اپنے کمرہ کے چھجے پر کھڑے ہو کر پوچھا

میرے بچو کیا معاملہ ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ایک چور پکڑا گیا ہے۔ اس پر بزرگ شخص نے کہا — میرے بچو! اسے مارو نہیں، کسی پر تشدد کرنا پاپ ہے، عدم تشدد بہت اعلیٰ صفت ہے، بچوں نے پوچھا کہ پھر اس چور کے ساتھ کیا سلوک کریں۔ بزرگ آدمی نے فرمایا کہ اسے ایک بورے میں بند کرکے کنوئیں میں ڈال دیا جائے۔ چور نے یہ فیصلہ سنا تو اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر انسانی ہمدردی کا شکریہ ادا کیا کہ آپ کتنے دیالو، کتنے ہمدرد اور کتنے مہاپرش ہیں۔
میں نے سنا تھا کہ بدھ مت کے پیروکار بڑے متحمل، بڑے صابر اور بڑے ہمدرد اور تمام مذاہب کے ساتھ بڑے روادار ہوتے ہیں، بدھ مت کے مبلغین کلکتہ آتے ہیں اور ہمیں اپنی پسندیدہ گالیوں سے سرفراز فرماتے ہیں، جبکہ ہم ان کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں انورادھاپورم میں ہندوؤں میں — بدھ مت کے پیروکاروں میں نہیں — تبلیغ کر رہا تھا۔ ایک کھلا ہوا میدان تھا اور کسی ایک شخص کی ملکیت بھی نہ تھا میری تقریر کے دوران میں بدھ بھکشوؤں کا ایک مشتعل گروہ وہاں آگیا اس کے ساتھ بہت سے جاہل مرد اور عورتوں کا ہجوم تھا اور وہ زور زور ڈھول بجانے لگے، اتنا شور مچایا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ مجھے اپنی تقریر بند کرنی پڑی اس لئے کہ یہ خدشہ تھا کہ کہیں دنگا نہ ہونے لگے اور خونریزی نہ شروع ہو جائے۔ بڑی مشکل سے میں نے ہندوؤں کو یہ ترغیب دی کہ اگر ان میں رواداری نہیں ہے تو آپ ان کو اپنی رواداری دکھائیں۔ تب یہ ہنگامہ ختم ہوا اور کوئی ناخوشگوار واقعہ نہیں ہوا۔

پھر تامل زبان بولنے والے ہندو آہستہ آہستہ لنکا جاکر آباد ہونے لگے، بدھ مت کے پیروکاروں نے جب خود کو ناسازگار ماحول اور نامساعد حالات میں پایا تو انہوں نے ایک پہاڑی پر اپنا مرکز قائم کرلیا اس مرکز کو کانڈی کہا جاتا ہے۔ اس مرکز کو بھی تامیلیوں نے ان سے چھین لیا اور کچھ عرصہ تک ایک ہندو راجہ کانڈی میں بھی حکمرانی کرتا رہا اس کے بعد یورپین حملہ آور آنے لگے — سپینی، پرتگالی اور ولندیزی! سب سے آخر میں انگریز آئے اور وہ حکمران بن بیٹھے! کانڈی کے شاہی خاندان کو تنجور بھیج دیا گیا اور ان کو پنشن دیدی گئی۔

شمالی لنکا میں ہندوؤں کی بڑی مرکزیت ہے جبکہ جنوبی علاقوں میں بدھ مت کے پیروکار مخلوط النسل پرو نیز مختلف طاقتور اور قوی الجثہ نسلیں رہتی ہیں۔ بدھ مت کا مرکزی مقام کولمبو ہے جو لنکا کا پایہ تخت بھی ہے ہندوؤں کا مرکزی مقام جفنا ہے۔ ہندوستان کی بہ نسبت یہاں جات پات کے قیود بہت کم ہیں، شادی وغیرہ کے معاملہ میں بدھ مت کے پیروکاروں میں تھوڑی بہت قیود ضرور ہیں لیکن کھانے پینے کے معاملات میں کوئی بھی پابندی نہیں ہے۔ جبکہ ہندوؤں میں بہت سی پابندیاں ہیں۔ لنکا کے تمام قصاب ماضی میں بدھ مت کے پیروکار تھے، لیکن بدھ مت کے احیار کی بدولت اب ان کی تعداد میں کمی ہوتی جارہی ہے۔ بہت سے بدھی اب اپنے آسمانی اعزاز و خطاب کو مقامی اعزاز و خطاب کے الفاظ سے بدلتے جارہے ہیں، پنجاب کے

جاٹوں کی طرح لنکا میں تمام ہندو جاتیاں مخلوط ہوگئی ہیں اور ان کے اختلاط سے واحد ہندو جاتی بن گئی ہے۔ کسی بھی جاتی کی لڑکی سے ایک ہندو یہاں شادی کر سکتا ہے، یہاں تک کہ یورپین لڑکی سے بھی شادی کی جا سکتی ہے بیٹا مندر میں جاتا ہے ماتھے پر تلک لگاتا ہے، زبان سے شیو شیو کہتا ہے اور بس ہندو بن جاتا ہے۔ شوہر ہندو ہو سکتا ہے، بیوی عیسائی ہو سکتی ہے، ایک عیسائی ماتھے پر تلک لگا کر پاروتی پتی کو پرنام کرتے ہی ہندو بن جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ کرسچین مبلغین ہندوؤں میں اس قدر مخلوط ہو گئے ہیں۔ لنکا میں آپ کے آنے کے بعد سے بہت سے عیسائی اپنے ماتھے پر تلک لگا کر شیو کو پرنام کر کے پھر ہندو ہو گئے ہیں اور اپنی جاتی میں ملٹ گئے ہیں۔ ادویتیہ ویدا اور ویر شیو وید یہاں کے دو مروج دھرم ہیں، بجائے ہندو کہلانے کے وہ خود کو شیو کہلاتے ہیں۔ شری چیتنیہ نے بنگال میں جو دھارمک ناچ اور سنکیرتن رائج کیا تھا وہ اصلاً جنوب کے تاملیوں کی چیز ہے، لنکا کے ٹامل خالص تامل ہیں اور لنکا کا دھرم بھی خالص تامل دھرم ہے وہ بہت ہی عجیب منظر ہوتا ہے جب ہزاروں لوگ ہزاروں مردنگ بجاتے ہوئے شیو کے گیت گاتے ہیں اور دھارمک جذبات میں ڈوب کر رقص کرتے ہیں۔ ان کے گلوں میں رودرکھشا کی مالائیں پڑی ہوتی ہیں، آنکھیں سرخ ہوتی ہیں اور وہ ہنومان کے سچے اور عقیدت گزار دکھائی دیتے ہیں، آپ جب تک اپنی آنکھ سے نہ دیکھیں اس سارے منظر کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔

کولمبو کے دوستوں نے ہمارے لئے جہاز سے اُترنے کا اجازت نامہ لے رکھا تھا چنانچہ ہم نے جہاز سے اُتر کر قیام کیا اور اپنے دوستوں سے ملاقات کی، ہندوؤں میں سرکمار اسوامی بہت ہی معروف و ممتاز شخصیت کے حامل ہیں۔ ان کی پتنی ایک انگریز خاتون ہیں اور ان کا بیٹا ننگے پاؤں رہتا ہے اور ماتھے پر تلک لگاتا ہے، شری ارون چلم اور دوسرے دوست مجھ سے ملنے کے لئے آئے، بہت عرصہ بعد مدگوئنی اور ناریل سے میرا سابقہ پڑا، انہوں نے میرے کیبن میں بے شمار کچے ناریل رکھ دیئے تھے میں نے مسز ہیگنس سے بھی ملاقات کی اور انہوں نے بدھ لڑکیوں کے لئے جو اسکول کھول رکھا ہے اس کا بھی معائنہ کیا۔ میں نے بدھ مندر بھی دیکھا اور اپنی پرانی چیلی کنورا کی کاؤنٹس کا اسکول بھی دیکھا، کاؤنٹس کا گھر مسز ہیگنس کے گھر سے زیادہ آراستہ و پیراستہ ہے۔ کاؤنٹس نے اپنا روپیہ صرف کیا ہے جبکہ مسز ہیگنس نے سارا روپیہ بھیک مانگ مانگ کر جمع کیا ہے۔ کاؤنٹس بنگالی ساری کی طرح کا گیروا لباس پہنتی ہیں۔ لنکا کے بدھیوں میں اس لباس کا بڑا رواج ہو گیا ہے۔ میں نے ان گنت عورتیں ایسی ہی بنگالی ساری میں ملبوس دیکھی ہیں۔

کانڈی میں مہاتما بدھ کے دانت کا مندر ہے جس کا نام ہے" دالدا مالیگوا" بدھیوں کی یہ خاص عبادت گاہ ہے۔ لنکا کے لوگوں کا کہنا ہے کہ پہلے یہ دانت پوری کے جگن ناتھ مندر میں رکھا ہوا تھا اور بہت سے نشیب و فراز سے گزرتا ہوا یہ دانت بالآخر لنکا پہنچا جہاں یہ اب تک موجود ہے اور بالکل محفوظ ہے

لنکا کے لوگوں کے پاس ان کی تاریخ کا بہترین ریکارڈ ہے، وہ ہماری طرح نہیں ہیں کہ ہمارے پاس تاریخ کے نام سے اگر کچھ ہے تو بس طوطا مینا جیسی چند کہانیاں! بدھ تصانیف بھی بڑی احتیاط سے محفوظ رکھی گئی ہیں اور وہ گلدھی زبان میں ہیں۔ یہاں سے بدھ دھرم برما، سیام اور دوسرے ممالک میں پھیلا۔ لنکا کے بدھی صرف شاکھامنی کو مانتے ہیں جن کا تذکرہ ان کی قدیم تصانیف میں موجود ہے اور وہ ان کے عقائد پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نیپال، بھوٹان، سکم، لداخ، چین اور جاپان کے لوگوں کی طرح وہ شینو کی پرستش نہیں کرتے اور تارا دیوی جیسی دیویوں کی پرستش کے پراسرار منتروں سے واقفیت نہیں رکھتے لیکن وہ اس قسم کی چیزوں کی قوت اور تاثیر میں عقیدہ ضرور رکھتے ہیں۔ بدھی اب دو سکولوں میں بٹ گئے ہیں، ایک شمالی سکول اور دوسرا جنوبی سکول۔ شمالی سکول کا نام ہے مہایانہ اور جنوبی سکول کو جو سیلون، برمی اور سیامی عقائد وغیرہ سے عبارت ہے ہینایانہ کہا جاتا ہے۔ مہایانہ شاخ مہاتما بدھ کے نام کی پرستش کرتی ہے ورنہ ان کی پرستش کی خاص مورتی تارا دیوی کی ہے یا پھر آولوکیتشور کی ہے (چینی، جاپانی اور کوریائی اسے ون ان کے نام سے یاد کرتے ہیں) ان میں شلوک اور منتر پڑھنے کا بڑا رواج ہے، تبتی شیو کے دیتہ ہیں، وہ تمام ہندو دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں، ڈمرو بجاتے ہیں، مردہ بھکشوؤں کی ہڈیوں کا بنا ہوا شنکھ پھونکتے ہیں، شراب اور گوشت کا خوب رواج ہے، ہمیشہ جادو ٹونے سے بدروحوں کو مسخر کرتے ہیں اور بیماریوں کا علاج کرتے ہیں، چین اور جاپان میں سب مندروں کی دیواروں پر میں نے منتر لکھے ہوئے دیکھے ہیں، بڑے چمکدار حروف میں ان کو لکھا جاتا ہے۔ اگر آپ ان حروف پر نظر ڈالیں گے تو آپ پہچان لیں گے کہ ان میں اور بنگالی حروف میں کتنی مماثلت و مشابہت موجود ہے۔

الاسنگھم کولمبو سے مدراس واپس چلے گئے اور ہم اپنے جہاز پر سوار ہو گئے۔ کمار اسوامی نے تحفہ کے طور پر دو بوتل شربت اور بہت سے لیمو اور ناریل ہمارے ساتھ کر دیئے تھے (کارتک دیوتا کے بہت سے نام ہیں مثال کے طور پر سبرامنیا، کمار اسوامی وغیرہ۔ جنوب میں کارتک دیوتا کی پرستش کا بڑا رواج ہے، وہ کارتک کو ادم کا اوتار مانتے ہیں)

۲۵ جون کی صبح کو ہمارا جہاز کولمبو سے روانہ ہوا، اب ہمیں برسات کے بھرپور موسم کا سامنا کرنا تھا، جیسے جیسے جہاز آگے بڑھتا جا رہا تھا ویسے ویسے باد و باراں کے طوفانوں کی شدت بھی بڑھتی جا رہی تھی، ہوا کا شور، بے انتہا بارش، بادلوں کا چھایا ہوا اندھیرا، جہاز سے ٹکراتی ہوئی موجیں اور ان کی خوفناک آواز، عرشہ پر ٹھہرنا تک ممکن نہ تھا۔ ڈائننگ ٹیبل کو لمبائی اور چوڑائی میں لکڑی کا پارٹیشن لگا کر چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ان چھوٹی چھوٹی میزوں پر بھی کھانے کی پلیٹیں اچھلتی کودتی رہتی ہیں، جہاز اس طرح چرچراتا ہے جیسے وہ ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ کپتان کا کہنا ہے کہ اس برس برسات کا بہت ہی سخت موسم آیا ہے، وہ بہت ہی دلچسپ آدمی ہے اور

بحر ہند و بحر چین کا اسے بڑا تجربہ ہے، اس نے ان سمندروں میں کئی برس گزار دیئے ہیں، وہ خوب دل بہلاتا ہے اسے بہت سے قصے کہانیاں یاد ہیں اور بہت ہی ہوشیار اور ذہین آدمی ہے، وہ بحری قزاقوں کے بھی بہت سے قصے سناتا ہے، کس طرح چینی قلیوں نے جہاز کے ایک افسر کو قتل کر دیا، کس طرح جہاز کو لوٹا اور کس طرح وہ فرار ہو گئے یہ اور ایسے ہی بہت سے قصے! جہاز جب اتنے زبردست ہچکولوں میں مبتلا ہو تو لکھنے پڑھنے کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا، کیبن کے اندر بیٹھنا بہت ہی دشوار کام ہے کھڑکیاں اس ڈر سے بند رکھی جاتی ہیں کہ لہروں کا پانی جہاز کے اندر نہ آجائے۔ ایک دن بھائی نریانند نے ذراسی کھڑکی کھول دی تھی تو پورا کیبن پانی سے بھر گیا تھا جیسے سیلاب آ گیا ہو، عرشہ پر جو کچھ بیت رہی ہے وہ بیان سے باہر ہے، ان حالات کے باوجود آپ کے اور بودھن کا کچھ نہ کچھ کام چل ہی رہا ہے!

ہمارے جہاز کے مسافروں میں جو مسیحی مشنری بھی ہیں جن میں سے ایک امریکن ہے اس گھر کے لوگ بھی اس کے ساتھ ہیں، وہ بہت ہی اچھا آدمی ہے اس کا نام ہے پوگیش! سات برس ہوئے جب اس کی شادی ہوئی تھی لیکن اس کے بچوں کی تعداد آدھی درجن ہے! بندے اسے ایشور کی خاص کرپا کہتے ہیں ــــ لیکن خود بچے شاید یہ نہیں سوچتے! وہ غالباً مختلف خیال رکھتے ہیں، مسز پوگیش عرشہ پر ایک میلا سا بستر بچھا کر بچوں کو اس پر لٹا دیتی ہیں اور خود چلی جاتی ہیں، وہ عرشہ پر لوٹ لگاتے ہیں، اپنے کو میلا کرتے ہیں اور بہت شور مچاتے ہیں، سب سے چھوٹے بچے کو ایک چوکور ٹوکری میں رکھ کر وہ اسے اونچے پر لٹکا دیتی ہیں اور پھر مسٹر اور مسز پوگیش ایک گوشہ میں بغل گیر ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور چار گھنٹے گزار دیتے ہیں، آپ کی یورپین تہذیب کی تعریف کرنا بڑا مشکل کام ہے اگر ہم اپنا مونہہ، ہاتھ یا دانت سر عام دھوئیں تو آپ اسے بدتمیزی کہتے ہیں آپ کا کہنا ہے کہ یہ سب کام خلوت میں ہونا چاہئیں، یہ ٹھیک ہے لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ شائستگی کی بات نہیں ہو گی کہ ایسی حرکتیں بھی جن کا میں نے مندرجہ بالا سطور میں حوالہ دیا ہے سر عام نہ کی جائیں! کیا آپ ایسی تہذیب پر فریفتہ ہیں؟ بہرحال جب تک آپ پروٹسٹنٹ پادری کو اپنی نظر سے دیکھ نہ لیں اس وقت تک آپ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ پروٹسٹنٹ نظریہ نے شمالی یورپ کو کیا فائدہ پہنچایا ہے اگر دس کروڑ انگریز مر جائیں اور صرف پادری زندہ رہ جائیں تو بیس برس کے اندر پھر دس کروڑ انگریز پیدا ہو جائیں گے۔

جہاز چلنے کی وجہ سے بہت سے مسافر درد سر میں مبتلا ہو گئے ہیں ایک چھوٹی سی لڑکی جس کا نام ٹوٹل ہے اپنے باپ کے ساتھ سفر کر رہی ہے، اس کی ماں مر چکی ہے، ہماری نویدیتا، ٹوٹل اور پوگیش کے بچوں کی ماں بن گئی ہیں، ٹوٹل اپنے باپ کے ساتھ میسور میں رہی ہے اور وہیں اس کی پرورش ہوئی ہے، اس کا باپ باغات کا مالک ہے، میں نے پوچھا "ٹوٹل تم کیسی ہو؟" اس نے جواب دیا "یہ بنگلہ ٹھیک نہیں ہے، ہر وقت چلتا رہتا ہے

اس نے مجھے بیمار ڈال دیا ہے ۔" اس کے لئے تو ہر گھر ایک بنگلہ ہے، پرتگیش کا ایک بچہ بیمار ہے اور اس کی ساری بیماری یہی ہے کہ اس کی ٹھیک طرح نگہداشت نہیں ہوتی، سب سے بری بات تو یہ ہے کہ وہ پورے دن لکڑی کے عرشہ پر رینگتا رہتا ہے، بوڑھا کپتان کبھی کبھار اپنے کیبن سے نکل کر آتا ہے تو اسے پیچھے سے شوربہ پلاتا ہے اور اس کی لاغر ٹانگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کیسا مریل بچہ ہے ـــــ ماں باپ کی بے پروائی کا شکار!

بہت سے لوگ مسرت جاوداں کے طالب ہوتے ہیں لیکن اگر مسرت دائمی ہو جائے تو پھر مصیبت بھی دائمی ہو جائے گی، ذرا اس بارے میں سوچئے تو! اگر یہ صورت ہوتی تو کیا ہم کبھی بھی عدن پہنچ سکتے؟ خوش قسمتی سے نہ مسرت جاودانی ہے نہ مصیبت جاودانی ہے، بہر طور ہمارا چھ روز کا سفر دراز ہو کر چودہ دن کا ہو گیا، رات دن طوفان ـــــ رات دن بارش، ان سب بلاؤں کا سامنا کرتے ہوئے بالآخر ہم عدن پہنچے، کولمبو سے ہم جتنا جتنا آگے بڑھے، طوفان اور بارش میں بھی اضافہ ہوتا گیا، آسمان ایک جھیل بن گیا تھا جس میں ہوا کے دوش پر خوفناک موجیں اُٹھ رہی تھیں ـــــ اور جہاز کے لئے آگے بڑھنا قریب قریب ناممکن ہو گیا تھا، ہوا اور موجیں اتنی سخت تھیں کہ جہاز کی رفتار تقریباً آدھی رہ گئی تھی، جزیرہ سوکوٹرا کے نزدیک تو غضب کی برسات تھی، کپتان نے بتایا کہ یہ جگہ مانسون کا مرکز ہے اور اگر ہم اس جگہ سے گزر گئے تو پھر آہستہ آہستہ پرسکون سمندر میں پہنچ جائیں گے، چنانچہ ہم پہنچے ـــــ اور یہ آفت بھی بالآخر ختم ہوئی۔

۸ تاریخ کی شام کو ہم عدن پہنچے، گورے یا کالے کسی بھی شخص کو ساحل پر اترنے کی اجازت نہیں تھی، جہاز پر کام کرنے والے عملہ کے لوگوں کے لئے بھی ساحل پر اُترنا ممنوع تھا۔ مزید براں وہاں دیکھنے کے لائق بھی کوئی چیز نہیں ہے۔ جیسے راجپوتانہ میں ریگستان دکھائی دیتا ہے ایسا ہی ریگستان یہاں بھی نظر آتا ہے، دور دور تک کوئی درخت نہیں دکھائی دیتا بس سوکھی پہاڑیاں ہیں، بے آب و گیاہ! پہاڑیوں کے درمیان قلعے بنے ہوئے ہیں اور ان قلعوں کے اوپر فوجی سپاہیوں کی بیرک ہیں۔ سامنے کی طرف ہوٹل اور دکانیں ہیں اور وہ اس طرح تعمیر کی گئی ہیں جیسے پہلی رات کا چاند ہوتا ہے، یہ ہوٹل اور دکانیں جہاز سے نظر آتی ہیں، بہت سے جہاز لنگر ڈالے کھڑے ہیں، ان میں سے ایک برطانوی اور ایک جرمن جنگی جہاز ہے، باقی جہاز یا تو باربرداری کے ہیں یا مسافروں کے ہیں، میں نے پچھلی دفعہ شہر کو جا کر دیکھا تھا۔ پہاڑیوں کے پیچھے مقامی لوگوں کے مکانات اور بازار ہیں، یہاں سے چند میل کے فاصلہ پر پہاڑیوں سے متصل ایک بہت بڑا تالاب کھودا گیا ہے جس میں بارش کا پانی اکٹھا کر لیا جاتا ہے، ماضی میں بس یہی ایک تالاب تھا جس سے میٹھا پانی حاصل کیا جاتا تھا لیکن اب سمندر کے پانی کو بھی ایک مشین کے ذریعہ نتھار کر قابل استعمال بنا دیا جاتا ہے، یہ پانی بھی بہت اچھا اور تازہ ہوتا ہے لیکن اپنی قیمت میں گراں پڑتا ہے، عدن بالکل ہندوستانی شہر جیسا نظر آتا ہے، اس لئے کہ اس کی آبادی میں کافی تعداد

ہندوستانیوں کی ہے جن میں شہری باشندے بھی شامل ہیں اور فوجی بھی ہیں۔ پارسی دکانداروں اور سندھی تاجروں کی اچھی خاصی تعداد ہے، عدن بہت ہی قدیم مقام ہے، روم کے شہنشاہ قسطنطین نے مبلغین کا ایک گروہ مسیحت کی تبلیغ کے لئے یہاں بھیجا تھا پھر عرب اٹھے اور انہوں نے عیسائیوں کو قتل کر ڈالا، اس پر روم کے بادشاہ نے حبش کے سلطان سے کہا کہ ایک عیسائی ملک کا فرمانروا ہونے کے ناطے وہ عربوں کو ان کے اس کام کی سزا دے، حبش کے بادشاہ نے ایک فوج بھیجی جس نے عدن کے عربوں کو بڑی عبرتناک سزا دی اس کے بعد عدن پر ایران کے صمندی بادشاہوں نے قبضہ کر لیا اور مدتوں عدن پر حکمرانی کرتے رہے۔ یہی بادشاہ تھے جنہوں نے پہاڑی چٹانوں کے درمیان سب سے پہلے تالاب کھدوایا تھا جو عدن کے باشندوں کے لئے پانی کی رسد کا واحد ذریعہ تھا، پھر مسلمانوں کے عروج کا زمانہ آیا اور عدن پر عربوں نے قبضہ کر لیا، کچھ عرصہ بعد ایک پرتگالی جنرل نے اسے مسخر کرنے کی ناکام کوشش کی، اس کے بعد ٹرکی کے سلطان نے بحر ہند سے پرتگالیوں کا صفایا کر ڈالا اور عدن کو اپنے بحری بیڑہ کا مستقر بنالیا۔

اس کے بعد ایک بار پھر ایک پڑوسی عرب حکمراں نے اس پر اپنا قبضہ جمالیا، بعدۂ انگریزوں نے عدن کو خریدا اور عدن کے موجودہ شہر کی تعمیر کی، اب تمام اقوام عالم کے جنگی جہاز ساری دنیا میں چکر کاٹتے پھرتے ہیں اور اگر دنیا کے کسی حصہ میں کوئی ہنگامہ برپا ہوتا ہے تو وہ اس میں چکر کاٹتے پھرتے ہیں اور اگر دنیا کے کسی حصہ میں کوئی ہنگامہ برپا ہوتا ہے تو وہ اس میں دخل انداز ہونے کی کوشش کرتے ہیں، ہر قوم اپنی خود مختاری، اپنی برتری، اپنے سیاسی مفادات اور اپنی تجارت کے تحفظات چاہتی ہے، لہٰذا ہر قوم کو وقتاً فوقتاً کوئلہ کی ضرورت ہوتی ہے جنگ کے زمانہ میں چونکہ دشمن ملک سے کوئلہ دستیاب نہیں ہو سکتا لہٰذا ہر قوم یہ چاہتی ہے کہ اس کے پاس کوئلہ کے اپنے ذخائر موجود ہوں کوئلہ کی بہترین کانوں پر انگریزوں کا تسلط ہے اس کے بعد فرانس کا نمبر آتا ہے، جو بہترین کانوں پر قابض ہے پھر یورپ کی دوسری قومیں ہیں جنہوں نے کوئلہ کے ذخائر بجبر و زور سے حاصل کئے ہیں یا دوستی اور تعلقات کے ذریعہ حاصل کئے ہیں یا پھر انہیں خرید کر اپنے قبضہ میں کر لیا ہے اب سوئز نہر ایشیا اور یورپ کے درمیان رابطہ کی ایک کڑی کا کام دیتی ہے۔ سوئز پر فرانسیسیوں کا کنٹرول ہے اسی بنا پر انگریزوں نے عدن میں اپنی پوزیشن بہت زیادہ مستحکم بنا رکھی ہے اور دوسری اقوام بھی بحر قلزم کے آس پاس اپنے مضبوط مرکز قائم کئے ہوئے ہیں، بسا اوقات علاقہ میں زمین حاصل کرنے کی اشتعال انگیز خواہش کے سنگین نتائج برآمد ہوتے ہیں، سات صدیوں تک اٹلی دوسروں کے قدموں تلے روندا گیا لیکن اب وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا ہے اور اس نے بڑی مشکلات جھیلی ہیں لیکن اپنے پاؤں پر کھڑے ہوتے ہی اس نے ایک بار پھر یہ سوچنا شروع کر دیا ہے کہ دوسرے ملکوں کو مسخر کیا جائے اور کچھ فتوحات کرنے کا شوق اس کے دل میں از سر نو سما گیا ہے، یورپ میں کوئی طاقت نہیں ہے جو کسی دوسرے کی مقبوضہ زمین کا ایک ٹکڑا بھی چھین سکے۔ اس لئے کہ تمام طاقتیں مل کر حملہ آور کو کچل ڈالیں گی۔ ایشیا میں بھی بڑی طاقتوں نے مثال کے طور پر انگریز، روس، ولندیزی اور فرانسیسی طاقتوں نے کوئی غیر مقبوضہ علاقہ نہیں چھوڑا ہے، صرف

افریقہ ہی ایسا براعظم ہے جس میں تھوڑا بہت علاقہ ہے جس پر قبضہ جمایا جاسکتا ہے چنانچہ اٹلی اسی جانب توجہ کر رہا ہے پہلے تو اس نے شمالی افریقہ میں اپنے پاؤں پھیلانے کی کوشش کی تھی لیکن فرانس کی طرف سے اس کوشش کا مقابلہ کیا گیا تب انگریزوں نے بحیرۂ قلزم میں اٹلی کو تھوڑا سا علاقہ اس خیال کے پیش نظر دیدیا کہ وہ حبش کے علاقہ کو ہضم کر جائے چنانچہ اٹلی بہت بڑی فوج لایا مگر حبش کے بادشاہ مناسک نے اس کی وہ دُرگت بنائی کہ اٹلی کی فوجوں کو افریقہ سے بھاگتے ہی بنی، مزید برآں یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ روس اور حبش کے بادشاہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور زار روس نے حبش کے بادشاہ سے مخفی طور پر دوستی کا معاہدہ کر رکھا ہے۔

جہاز شمال کی جانب آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا ہے بحیرۂ قلزم کے سواحل قدیم تہذیب وتمدن کا مرکز رہے ہیں سمندر کے ایک کنارے پر ریگستان عرب پھیلا ہوا ہے اور دوسرے کنارے پر مصر ہے، یہی قدیم ترین مصر ہے۔ ہزاروں برس پہلے ان مصریوں نے پنت (غالباً مالابار) سے چل کر بحیرۂ قلزم کو عبور کیا تھا اور اپنی سلطنت کو مصر کی سرحدوں تک وسیع کر لیا تھا ان کی طاقت وسلطنت اور ان کے تمدن کا یہ پھیلاؤ یقینی طور بہت ہی حیرتناک واقعہ ہے، یونانی بھی انہی کے چیلے ہیں، ان کے بادشاہوں کے مقابر، اہرام اور ان کی ممی کی ہوئی نعشیں آج تک موجود ہیں۔ یہاں قدیم مصری باشندے آباد تھے ان کے بال گھونگر والے تھے، اور وہ اپنے کانوں میں بالیاں پہنا کرتے تھے وہ برف کی مانند سفید دھوتی باندھتے تھے لیکن دھوتی کے ایک سرے کی گانٹھ پشت کی طرف نہیں لگاتے تھے، یہ ہے قدیم مصر —— جہاں ہیکوسس ( Hyksos, ) فراعنہ، ایرانی شہنشاہوں، سکندر اعظم، رومیوں اور عربوں نے اپنی اپنی معرکہ آرائیوں کا مظاہرہ کیا ہے صدیوں پرانے مٹی کے ظروف پر، پتھروں پر، پوست ہرن کے بنے ہوئے کاغذ پر ان کی تاریخ اور ان کے آثار اب تک موجود ہیں۔

یہی وہ سرزمین ہے جس پر یوسف وہارون کی پرستش کی گئی ہے۔ قدیم مصریوں کے عقائد کے مطابق ایک آدمی جب مرتا ہے تو اس کا "پیکر نفیس" متحرک وفعال رہتا ہے، مگر جب اس کے مردہ جسم کو کوئی جراحت پہنچتی ہے تو اس کا پیکر نفیس بھی اس سے متاثر ہوتا ہے یعنی یہ کہ اگر نعش کے اجزاء منتشر ہو جائیں تو پھر اس کا پیکر نفیس بھی فنا ہو جائے گا اشوک اعظم نے بھی بدھ دھرم کے مبلغین کو مصر بھیجا تھا، وہ دھرم کا پرچار کیا کرتے تھے امراض کا علاج کرتے تھے، سبزی کھا کر گزارہ کرتے تھے، بہت ہی اچھی اور نیک زندگی بسر کرتے تھے اور انہوں نے اپنے سنیاسی چیلے بنائے تھے، ان سے بہت سے فرقے بنے، مثال کے طور پر تھراپتی ( Therapeutæ, ) ایزن Essenes, اور مینشئین Mani·chaeans, وغیرہ، یہاں کا ایک شہر اسکندریہ اپنی یونیورسٹی، اپنے کتب خانہ اور اپنی ادبی مرکزیت کی بنا پر ساری دنیا میں بڑی شہرت رکھتا تھا — یہی اسکندریہ جب جاہل، وحشی اور مذہب کا جنون رکھنے والے عیسائیوں کے ہاتھ آیا تو انہوں نے اسے تباہ وبرباد کر ڈالا، اس کے کتب خانوں کو جلا کر خاک کر دیا اور علم کے جتنے بھی سرچشمے تھے ان سب کو خشک کر ڈالا، انجام کار عیسائیوں

نے خاتون ساونت ہیپیا سشیہ کو بھی قتل کرڈالا اور اس کی نعش کے ساتھ بہت ہی توہین آمیز سلوک کیا۔ وہ اس کی نعش کو گلی کوچوں میں کھینچتے پھرے یہاں تک کہ اس کی ہڈیوں سے گوشت کی ایک ایک بوٹی الگ ہوگئی۔

اور جنوب میں ہے ریگستان عرب! اہل شجاع کی جنم بھومی! کیا آپ نے کبھی ایک بدوی عرب دیکھا ہے۔ ٹخنوں تک ڈھیلا سا لبادہ پہنے اور سر پر ایک بڑا سا رومال اونی ڈوری سے باندھے ہوئے جس کے دونوں سروں پر پھندنے لٹکتے ہوئے ہیں؟ — یہ چال — کھڑے ہونے کا یہ انداز — اور یہ شان آپ کو کسی دوسرے ملک میں نظر نہیں آئے گی! کھلے ہوئے ریگستان کی فضا آزادی سے معمور ہیں اور اگر آپ ایک بدو عرب کو دیکھیں گے تو آپ کو اس آزادی کی ایک تصویر دکھائی دے گی — سر سے پاؤں تک حریت کی تصویر! جب عیسائیوں کے مذہبی جنون اور گوتھوں کی وحشیانہ سرگرمیوں نے قدیم یونان و روم کے نمونوں کا چراغ گل کر دیا تو اس وقت ایرانی اپنے نفوس کی خباثتوں پر سونے کا پتر چڑھا رہے تھے، پاٹلی پترا اور اجین کی شان و شوکت کا آفتاب بھی ڈوب چکا تھا اور جاہل و ظالم بادشاہوں کی حکومت کا دور شروع ہو گیا تھا، عیش و عشرت کی پرستش کی جا رہی تھی، ظلم و بے انصافی کا دور دورہ تھا اور خوفناک اخلاقی گراوٹ پھیل رہی تھی اس وقت جبکہ دنیا کی یہ حالت تھی تو اس وقت یہ حقیر اور خونخوار عرب نسل اٹھی اور بجلی کی رو کی طرح ساری دنیا میں پھیل گئی!

ذرا دیکھئے — مکہ کی جانب سے ایک سٹیمر آرہا ہے، اس میں سب حجاج اور زائرین ہیں، ذرا غور سے دیکھئے — یہ ترک ہیں، یوروپین لباس میں! یہ مصری ہیں نیم یوروپین لباس میں! یہ شامی مسلمان ہیں ایرانیوں کے لباس میں، اور یہ ہیں حقیقی عرب جو ٹخنوں تک کرتہ پہنے ہوئے ہیں حضرت محمد سے پہلے عربوں میں یہ دستور تھا کہ وہ کعبہ کے مندر میں بالکل ننگے جمع ہو جاتے تھے لیکن حضرت محمد کے وقت سے وہ ایک کپڑا پیٹنے لگے ہیں، چنانچہ ہمارے زمانہ کے مسلمان بھی حج کے موقع پر اپنا سارا لباس اتار کر بس ایک چادر لپیٹ لیتے ہیں جو ان کے پاؤں تک چھپا لیتی ہے عربوں کے یہ دن بیت چکے ہیں! کافر، شیدی اور حبشی خون کی لگاتار آمیزش نے ان کے جسمانی قویٰ اور طاقت میں ایک تبدیلی پیدا کر دی ہے — اور ریگستان کے عرب کی ساری سابقہ شان و شوکت مٹی میں مل کر رہ گئی ہے، جو عرب شمال میں آباد ہیں وہ ترک سلطنت کے پرامن شہری ہیں لیکن سلطان ترکی کی عیسائی رعایا ترکوں سے تو نفرت کرتی ہے مگر عربوں کو پسند کرتی ہے اور ان سے محبت و ہمدردی رکھتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عربوں کو اگر تعلیم مل جاتی ہے تو وہ شریف لوگ بن جاتے ہیں اور پھر ان سے کوئی تکلیف نہیں پہنچی لیکن ترک باشندے عیسائیوں کو بری طرح کچلتے رہتے ہیں۔

ریگستان اگرچہ بہت گرم ہے لیکن اس گرمی سے توانائی زائل نہیں ہوتی اور اضمحلال یا کمزوری پیدا نہیں ہوتی اگر آپ گرمی کی لپٹ سے اپنے بدن اور اپنے سر کو بچالیں تو پھر کوئی تکلیف نہیں ہوتی خشک گرمی سے نہ صرف یہ کہ کمزوری پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس کے برعکس وہ جرأت آفریں اثر پیدا کرتی ہے، راجپوتانہ، عرب اور افریقہ کے لوگ اس

بات کا ایک ثبوت ہیں، مر واڑ کے بعض اضلاع کے لوگ، مویشی اور گھوڑے کتنے تندرست و توانا ہوتے ہیں، عربوں اور رشیدیوں سے ملنے پر بڑی خوشی ہوئی ہے، جہاں گرم و مرطوب آب و ہوا ہے جیسے بنگال میں وہاں کمزوری پیدا ہوتی ہے اور ہر حیوان کمزور اور لاغر ہوتا ہے۔

بحیرۂ قلزم کا نام ہی ہر مسافر کے دل میں ایک طرح کا خوف پیدا کر دیتا ہے، اس لئے کہ وہاں بڑی سخت گرمی ہوتی ہے بخصوصیت سے موسم گرما میں ــــ آج کل یہی موسم ہے! ہر شخص عرشہ پر بیٹھتا ہے اور اپنے علم کے مطابق کوئی نہ کوئی دہشتناک قصہ سناتا ہے۔ کپتان نے تو ان سب پر پانی پھیر دیا ہے، اس کا بیان ہے کہ کچھ دنوں پہلے ایک چینی جنگی جہاز جب بحرۂ قلزم سے گزر رہا تھا تو اس کا کپتان اور کوئلہ جھونکنے والے آٹھ آدمی گرمی کی تاب نہ لاکر مر گئے تھے۔

بے شبہ کوئلہ جھونکنے والے قلی جہاز کی بھٹی میں آگ کے سامنے رہتے ہیں اور اس پر سے یہ قیامت خیز گرمی ہوتی ہے، بسا اوقات وہ گرمی کی وجہ سے پاگل ہو جاتے ہیں بھاگ کر عرشہ پر آتے ہیں اور سمندر میں چھلانگ لگا دیتے ہیں اور پھر ڈوب جاتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ انجن کے کمرہ ہی میں گرمی کی تاب نہ لاکر مر جاتے ہیں۔

یہ قصے آدمی کو بدحواس کر دینے کے لئے ناکافی نہیں ہیں لیکن خوش قسمتی سے ہمیں اتنی سخت گرمی سے سابقہ نہیں پڑا جنوبی ہوا کی جگہ شمالی کی ہوا لگاتار چلتی رہی اور یہ بحیرۂ روم سے آنے والی ٹھنڈی ہوا ہوتی ہے ــ ۱۴ر جولائی کو ہمارا سٹیمر بحر قلزم سے نکل کر نہر سوئز میں داخل ہوا، جہاز میں کچھ سامان لدا ہوا تھا جسے سوئز میں اتارنا تھا، مصر میں بہرحال طاعون کی وبا پھیلی ہوئی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہمارے ساتھ بھی طاعون کے جراثیم موجود ہوں لہذا اس متعدی بیماری کے اندیشے دونوں ہی طرف ہیں۔ یہاں کے احتیاطی اقدامات کا اگر موازنہ کیا جائے تو ہمارے ملک کے احتیاطی اقدامات ان کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہیں۔ سامان اتارنا ہے لیکن سوئز کے قلی جہاز کو ہاتھ تک نہیں لگا سکتے اس کا یہ مطلب ہے کہ جہاز کے ملاحوں کو مزید تکلیف اٹھانی پڑے گی، انہیں بطور قلی کام کرنا پڑے گا اور سامان بغیر ہاتھ لگائے کرینوں کے ذریعہ اٹھا کر سوئز کی کشتیوں میں اتارنا ہوگا اور یہ کشتیاں سامان کو لے کر سوئز کے ساحل پر چلی جائیں گی۔ کمپنی کا ایجنٹ ایک چھوٹے سے لانچ میں ہمارے جہاز کے قریب آیا لیکن اسے جہاز کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں ملی، لانچ میں ایجنٹ ہے اور جہاز میں کپتان ہے اور ایجنٹ اپنے لانچ سے ہمارے جہاز کے کپتان سے بات چیت کر رہا ہے، آپ کو جاننا چاہئے کہ یہ ہندوستان نہیں ہے کہ گورے ضابطہ طاعون اور دوسرے سارے قوانین سے ماورا ہوں اور ان پر کوئی قانون نافذ نہ ہوتا ہو۔ لیکن کسی مصری باشندے سے اگر ہم ذرا سا چھو جائیں تو ہمیں پھر دس دن تک قرنطینہ میں رہنا پڑے گا اس صورت میں کوئی مسافر نہ تو نیپلز میں اترے گا نہ مارسیلز میں، لہذا ہر کام بغیر ہاتھ لگائے یا بغیر چھوئے بس دور ہی سے ہوتا ہے، بنابریں جہاز سے سامان اتارنے

میں پورا دن لگ جائے گا کیونکہ کام کو آہستہ آہستہ ہونا ہے۔ ہمارا جہاز بہ آسانی رات ہی رات میں نہر سوئز کو عبور کر سکتا ہے بشرطیکہ سرچ لائٹ دستیاب ہو جائے لیکن سرچ لائٹ کو جہاز میں فٹ کرنے کے لئے مصریوں کو ہاتھ لگانا پڑے گا اور اس وجہ سے ہمیں دس دن تک قرنطینہ میں رہنا ہوگا اس لئے ہمارا جہاز رات کو سفر نہیں کرے گا اور سوئز کی بندرگاہ میں مزید ۲۴ گھنٹے تک کھڑے رہیں گے۔ یہ بہت ہی خوبصورت قدرتی بندرگاہ ہے قریب قریب تین طرف سے وہ ریت کے ٹیلوں اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے گھری ہوئی ہے اور پانی بھی بہت گہرا ہے شارک اور بے شمار مچھلیاں پانی میں تیرتے ہوئے دکھائی دیتی ہیں۔ اس بندرگاہ میں اور آسٹریلیا کی بندرگاہ سڈنی میں جتنی بڑی تعداد میں شارک دکھائی دیتے ہیں دنیا کے کسی بھی حصہ میں اتنی زیادہ تعداد میں نہیں دکھائی دیتے، ذرا سا موقع ملے تو یہ شارک آدمی کو نگل لیتے ہیں، کسی میں پانی کے اندر غوطہ لگانے کی جرأت نہیں ہوتی، لوگ بھی سانپوں اور شارکوں کے دشمن ہوتے ہیں اور وہ بھی انہیں ہلاک کر دینے کا کوئی موقع نہیں چھوڑتے۔

صبح کے وقت جبکہ ہم نے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا تو ہمیں یہ خبر ملی کہ بڑے بڑے شارک جہاز کے عقبی حصہ کی طرف تیر رہے ہیں، میں نے اپنی عمر میں زندہ شارک کبھی نہیں دیکھے تھے۔ پچھلی دفعہ جب میں آیا تھا تو ہمارا جہاز سوئز میں بس تھوڑی ہی دیر کے لئے رُکا تھا اور وہ بھی شہر کے بالکل ہی قریب ٹھہرا تھا۔ جیسے ہی ہم نے سُنا کہ شارک تیرتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں ہم ویسے ہی انہیں دیکھنے کے لئے چلے گئے، سیکنڈ کلاس جہاز کے بالکل کنارے پر تھا اور عرشہ پر ایک ہجوم تھا، ریلنگ پر عورتیں، مرد اور بچے جھکے کھڑے تھے اور ان شارکوں کو دیکھ رہے تھے لیکن ہمارے دوست جن کو ہم دیکھنے آئے تھے یعنی یہ شارک ہمارے آتے ہی اپنی جگہ سے ہٹ کر تھوڑی دور چلے گئے اور ان کی اس بیرخی نے ہمارے جذبات کو ٹھیس پہنچائی، لیکن ہم نے ایک خاص قسم کی مچھلی دیکھی جس کا منہ چڑیا کی چونچ جیسا ہوتا ہے یہ بہت چھوٹی مچھلی ہوتی ہے اور اپنے جھنڈ بنا کر تیرتی ہیں، اکثر اوقات ایک بڑی مچھلی جو "لھسا" سے مشابہ ہوتی ہے ان پر تیر کی طرح گرتی ہے اور ان چھوٹی مچھلیوں کو اپنی خوراک بنا لیتی ہے، میرا خیال تھا کہ یہ بڑی مچھلی شارک مچھلی کا بچہ ہوتی ہے لیکن تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ ایسا نہیں ہے۔ اس مچھلی کا نام "بونیٹو" ہے ہاں میں نے اس کے بارے میں پہلے بھی پڑھا تھا اور یہ بھی پڑھا تھا کہ بڑی بڑی کشتیوں کے ذریعہ یہ مچھلی سوکھی ہوئی حالت میں بنگال سے مالدیپ میں درآمد کی جاتی ہے۔ مزید براں میرے مطالعہ میں یہ بات بھی آئی تھی کہ اس کا گوشت سرخ رنگ کا ہوتا ہے اور بہت ہی لذیذ ہوتا ہے اور اب ہمیں اس کی سبک رفتاری اور طاقت دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، اتنی بڑی مچھلی پانی میں تیر کی مانند دوڑتی پھرتی ہے اور برف جیسے شفاف پانی میں اس کے جسم کی ہر حرکت صاف طور پر دکھائی دیتی ہے۔ ہم بیس تیس منٹ تک بونیٹو اور چھوٹی مچھلیوں کو دیکھتے رہے۔ ہم قریب قریب تھک سے گئے تھے کہ کہ کسی نے چلا کر کہا "وہ آ رہا ہے پھر لگ بھگ بارہ آدمی ایک ساتھ چلائے "وہ آ رہا ہے"، میں نے غور سے دیکھا

تو مجھے ایک کالی سی چیز اپنی جانب آتے ہوئے تھوڑی دور پر نظر آئی ۔۔۔ ایک قوی ہیکل مچھلی! آہستہ آہستہ ہماری طرف آ رہی تھی اس کے آگے آگے ایک یا دو چھوٹی مچھلیاں تھیں اور اَن گنت چھوٹی چھوٹی مچھلیاں اس کی کالی پشت اور پورے بدن پر اچھل کود رہی تھیں کچھ مچھلیاں تو اس کی گردن سے لپٹ گئی تھیں، جو مچھلی اس کے آگے آگے چل رہی تھی اسے "پایلیٹ فش" کہتے ہیں۔ اس کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ شارک کو اس کا شکار دکھائے اور اس کی خوراک سے جو کچھ بچ جائے وہ اس کی اپنی خوراک بن جائے لیکن جن لوگوں نے شارک کے خوفناک جبڑوں کو دیکھا ہے وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ اس کے مونہہ سے کوئی چیز بچ سکتی ہو گی۔ ان مچھلیوں کو "سکر" کہا جاتا ہے جو شارک کی پیٹھ پر سوار ہیں، ان کے سینہ کے قریب سپاٹ مگر گولائی کی شکل میں ایک ایسا حصہ ہوتا ہے جو بہت سے انگریزوں کے جوتوں کی طرح سکڑتا اور پھیلتا ہے، یہ حصہ شارک کی پشت پر لگ کر جب سکڑتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ شارک کی پیٹھ پر اس طرح سوار ہیں جیسے کوئی گھوڑے پر سوار ہوتا ہے ان کا کام یہ ہے کہ شارک کی پیٹھ پر جو کیڑے وغیرہ پیدا ہو جائیں وہ انہیں اپنی خوراک بنالیں۔ شارک کو ان دونوں ہی رفقار کی سدا ضرورت رہتی ہے اور وہ اپنے ان رفیقوں کو کبھی کوئی گزند نہیں پہنچاتا۔

سیکنڈ کلاس کے مسافروں کی جرأتیں بہت بڑھی ہوئی ہیں، ان میں سے ایک فوجی آدمی ہے اور اس کی حوصلہ مندیوں کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے جہاز میں تلاش کرنے پر انہیں ایک کانٹا مل گیا جو اس کانٹے سے ملتا جلتا ہے جو بنگال کے لوگ کنوئیں میں ڈول گر جانے پر اسے باہر نکالنے کے لئے استعمال کرتے ہیں اس کانٹے میں انہوں نے قریب قریب دو پونڈ گوشت مضبوطی سے باندھ کر اسے ایک مضبوط تار سے باندھ دیا۔ اس کانٹے سے قریب چھ فٹ اونچا انہوں نے لکڑی کا ایک ٹکڑا باندھ دیا جو پانی میں کشتی کی طرح تیرنے لگے۔ تب انہوں نے یہ کانٹا پانی میں ڈال دیا جب سے ہم آئے ہیں جہاز کے نیچے پولیس کی ایک کشتی ہر وقت موجود رہتی ہے تاکہ جہاز کا کوئی آدمی ساحل کے کسی شخص سے ملاقات نہ کرے، اس کشتی پر دو کانسٹیبل تھے جو آرام سے سوتے رہتے تھے اور اس بات پر جہاز والے ان سے جلنے لگے تھے لیکن اس موقع پر وہ بڑے دوست بن گئے، شور مچنے پر ان میں سے ہمارا ایک عرب دوست اپنی آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور یہ سوچ کر کہ شاید کوئی مصیبت آگئی ہے وہ اپنی وردی ٹھیک کرنے لگا جب اسے یہ پتہ چلا کہ یہ شور محض اس لئے مچ رہا ہے کہ اس سے وہ لکڑی کھولنے کی درخواست کی جائے جو شارک پکڑنے کے لئے کانٹے میں باندھی گئی ہے اور وہ اُسے تھوڑی دور تک پانی میں پہنچا دے تو اس نے اطمینان کا سانس لیا اور ایک بانس کے ذریعہ اس نے لکڑی کے اس ٹکڑے کو کچھ دور تک پانی میں ٹھیل دیا، اب ہم بڑے شوق سے ریلنگ پر جھکے ہوئے شارک کے آنے کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ بے چین نظریں اس آنے والے کے انتظار میں تھیں اور ہماری حالت بالکل ایسی ہی تھی جیسے کوئی امید و بیم کی حالت میں کسی

کے آنے کا انتظار کر رہا ہو۔ لیکن ہمارا وہ محبوب پھر کبھی پلٹ کر نہیں آیا، لیکن انتظار کی یہ ساری زحمت اس وقت ختم ہو گئی جب ہمارے جہاز کے قریب قریب سو گز کے فاصلہ پر ہمیں ایک کالے رنگ کا تھیلا سمندر کی سطح پر بہتے ہوئے دکھائی دیا، جیسے پانی کی مشک ہوتی ہے۔ یہ بھی بالکل ویسا ہی تھا، اسے دیکھتے ہی شور مچا "شارک آگیا" کوئی چلایا خاموش رہو! نہیں تو وہ بھاگ جائے گا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ اپنے ہیٹ اتار لو، اس لئے کہ شارک ان کو دیکھ کر گھبرا جاتا ہے۔ اِدھر تو یہ شور تھا اور اُدھر شارک کانٹے کے قریب آرہا تھا جیسے کینوس میں لپٹی ہوئی کوئی کشتی پانی پر ڈول رہی ہو۔ سات آٹھ فٹ اور آگے بڑھ آئے تو شارک کا مونہہ کانٹے کے پاس آجائے گا، لیکن سیدھا آتے آتے وہ اچانک ایک طرف کو مڑ گیا، مگر پھر وہ کانٹے کی طرف مڑا اور اس کی زبردست دُم نے پھر حرکت کی، اب قریب ہے کہ وہ کانٹے کو نگل جائے، لیکن پھر اس نے اپنا رُخ موڑ لیا اور تھوڑی ہی دیر میں پھر اس کا مونہہ کانٹے کی طرف آگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے کانٹا نگل لیا۔ کھینچو، کھینچو، زور لگاؤ، خوب زور لگا، چالیس پچاس آدمی مل کر کھینچنے لگے، اور ذرا سا زور لگاؤ، بس شارک پانی کی سطح سے اونچا اُٹھنے ہی والا ہے، کتنی طاقتور مچھلی ہے، چالیس پچاس آدمی کا زور بھی ناکافی ہے۔ اور زور لگاؤ، اور زور سے کھینچو ایک بار پھر شور مچا اور سب نے پورا زور لگایا لیکن اچانک ساری تمناؤں پر پانی پھر گیا۔ شارک نے کانٹے کو اپنے جبڑوں سے چھوڑ دیا اور سمندر میں بھاگ گیا۔ اب جتنے مونہہ تھے اتنی باتیں تھیں، کوئی کہہ رہا تھا کہ کانٹا کھینچنے میں جلدی کی، اسے پوری طرح نگلنے دیا ہوتا تب ہی کھینچا ہوتا، کوئی کہہ رہا تھا کہ بڑی بے صبری دکھائی اور ہاتھ آیا ہوا شکار ہاتھ سے نکل گیا۔ بہر طور گرے ہوئے دودھ پر آنسو بہانے سے کیا حاصل؟ شارک کانٹے سے چھوٹ کر سمندر میں دور جا چکا تھا، یہ پتہ نہیں کہ اس نے "پائیلٹ فش" کو کوئی سزا دی کہ نہیں لیکن وہ خود چھوٹ کر فرار ہو گیا۔ شارک کے بدن پر شیر کے جسم کی طرح کالی کالی دھاریاں ہوتی ہیں اور دریا کا یہ شیر اپنے پائیلٹوں اور سکروں سمیت کانٹے کے خطرات کی حدوں سے باہر نکل چکا تھا۔

مگر بالکل ہی مایوس ہو جانے کی ضرورت نہیں، ہو سکتا ہے کہ ایک بھاگے ہوئے شیر کی جگہ کوئی دوسرا شیر آجائے، افسوس کہ شارک کے زبان نہیں ہوتی، ورنہ وہ دریا کے ہر شیر کو خبردار کر دیتا کہ ایک نیا جانور ہماری مملکت میں آگیا ہے جس کا گوشت تو بہت لذیذ ہے لیکن اس کی ہڈیاں بہت سخت ہیں۔ میں نے شارک کے گھرانے میں جنم لیا ہے اور اپنی زندگی میں اَن گنت جانوروں سے اپنا پیٹ بھرا ہے، ان کی ہڈیاں چبائی ہیں لیکن اس نئے جانور کی ہڈیاں جتنی سخت ہیں اتنی سخت ہیں اتنی سخت ہڈیوں سے مجھے کبھی سابقہ نہیں پڑا، ذرا دیکھو کہ ان ہڈیوں کی سختی نے

---

ع۱ سنسکرت کے معروف بنگالی شاعر جے دیو کے کلام سے ماخوذ

میرے جبڑے اور میرے دانتوں کا کیا حال کر ڈالا ہے یا پانی کی دنیا میں ان کے لئے ایک دوسرے سے بات کرنا ممکن نہیں! یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دریا کا یہ شیر آدمیوں کی صحبت میں رہ کر آدمی کے خصائل سیکھ گیا ہو اور سچائی کے اظہار کی جگہ وہ اپنا چوڑا سا سر ملا کر ہنگام وداع مسکراتے ہوئے کہتا ہو —— "صرف میں ہی تو بیوقوف نہیں بنا!"

بنگالی نظم میں یہ بات کہی گئی ہے کہ پہلے بھاگیرتی میں اس توپ کا گولہ چلتا ہے اور پھر وہ گنگا میں اپنا لاؤ لشکر لے کر آتا ہے —— بہر حال اس توپ کے گولے کی آواز تو نہیں سنی گئی ہے لیکن پہلے پائیلٹ فش چلتی ہے اور اس کے پیچھے یہ چوڑے چکلے سر والا قوی الجثہ جانور آتا ہے اور "سکر" اس کے آس پاس رقص کرتے ہوتے ہیں، لذیذ ترین خوراک نظر آئے تو کس کے مونہہ میں پانی نہیں بھر آتا؟ پانی کی سطح پر پانچ گز کی جگہ میں چربی تیر رہی ہے اور یہ بات خود چوڑے چکلے سر والا ہی کہہ سکتا ہے کہ اس چارہ کی خوشبو کتنی دور تک پہنچ رہی ہے —— مزید براں کیا عجیب منظر ہے، سفید اور سرخ اور زرد —— سب ایک جگہ ہے! یہ انگلستان کے سور کے گوشت کا ٹکڑا ہے جو ایک بڑے سے کالے کانٹے میں بندھا ہوا سمندر کے اندر لٹک رہا ہے۔

اب ہر شخص چپ ہو جائے! کوئی اپنی جگہ سے ہلے نہیں! کوئی جلد بازی نہ کرے! بس ہر شخص کانٹے میں بندھے ہوئے تار کے پاس کھڑا رہے! بڑی ہوشیاری اور بڑی احتیاط کے ساتھ! وہ کانٹے کے قریب آ رہا ہے اور چارہ کی دیکھ بھال کر رہا ہے! اور اسے اپنے مونہہ میں لینا ہی چاہتا ہے —— دیکھو، اس نے گوشت کا ٹکڑا نگل لیا ہے اور اب اپنی پیٹھ موڑ رہا ہے، اسے گوشت کو پوری طرح نگل جانے کا موقع دیجئے —— بڑی ہوشیاری سے بس خاموش کھڑے رہیئے، وہ گوشت نگل کر مڑا اور جیسے ہی مڑا اسے ایک زور کا جھٹکا لگا اس لئے کہ گوشت کا کانٹا ایک تار سے بندھا ہوا تھا۔ جھٹکا لگنے سے کانٹا اس کے جبڑوں میں اتر گیا اور وہ کانٹے میں پھنس گیا اور اب سب نے تار کو کھینچنا شروع کر دیا، جوان بوڑھے، بچے سب تار کو زور سے کھینچ رہے ہیں، شارک کا سر پانی کے اوپر ہے —— شور مچ رہا ہے کھینچو اور زور سے کھینچو —— اب شارک کا آدھا جسم پانی کی سطح کے اوپر آ گیا ہے، اور کھینچو —— اور زور لگاؤ! کیا عجیب جبڑے ہیں، کیا عجیب گردن ہے! کھینچو اور زور سے کھینچو یہاں تک کہ وہ کل کا کل پانی سے باہر نکل آئے۔ کانٹا اس کے جبڑے میں آر پار ہو چکا ہے خوب کھینچو —— بہت زور سے کھینچو، اچھا ذرا ٹھہریئے —— اے عرب پولیس مین کیا آپ اس کی دُم میں رسی باندھ دیں گے؟ وہ اتنا بھاری ہے کہ اس کے بغیر اسے کھینچ کر باہر نکالنا ممکن ہی نہیں ہے، مگر ذرا ہوشیاری سے اس لئے کہ اگر وہ اپنی دُم مار دے تو گھوڑے کی ٹانگ تک ٹوٹ جائے، کھینچو —— ہاں ذرا زور سے کھینچو! اُف اللہ کتنا وزن ہے اس میں! مگر شارک کے پیٹ کے نیچے کیا چیز لٹک رہی ہے؟ کیا یہ اس کی کھال ہے؟ اچھا تو اسے کاٹ دیا جائے اور اسے پانی میں ڈوب جانے دیا جائے اس طرح اس کے وزن میں کچھ کمی ہو جائے گی، بھائیو! کھینچو، اور زور لگاؤ! اُوہ! خون کا ایک فوارہ چھوٹ رہا ہے، کپڑے بچانے کا کوئی

فائدہ نہیں ہے؟ اپنے کپڑوں کی کوئی پروا نہ کیجئے! کھینچئے! بس وہ ہاتھ کے قریب آگیا ہے! اب اسے عرشہ پر ڈال دیجئے مگر ذرا اس کی دُم سے خبردار رہئیے! اُفوہ! کتنا بڑا شارک ہے! بہر طور کہاں تک اس سے خبردار رہا جاسکتا ہے، اس کے سر پر لٹھ ماریئے! اے فوجی آدمی! آپ آیئے! آپ ہی اس کام کے لئے موزوں ہیں! اس کے سر پر لٹھ ماریئے! فوجی مسافر کے کپڑے خون میں لت پت ہو گئے تھے اس نے ڈنڈا اٹھایا اور اس کے سر پہ مارنا شروع کیا، عورتیں لرزنے لگیں —— اُفوہ! کتنا ظلم ہے یہ! اسے مت مارو! اور ایسی ہی دوسری باتیں کہی جانے لگیں، کس طرح شارک کا پیٹ چاک کیا گیا کس طرح اس کے پیٹ سے خون کے دھارے چھوٹے، کس طرح اس کے سینہ سے اس کا دل نکالا گیا، کس طرح اس کے جسم کے ٹکڑے کئے گئے اور اس کے گوشت، ہڈیوں اور کھال کا کتنا بڑا ڈھیر لگ گیا، یہ سب باتیں اب چھوڑیئے بس اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ اس دن میرا کھانا ستیاناس ہو گیا ہر چیز میں شارک کی بو بسی ہوئی تھی۔

نہر سویز کینال، انجینئرنگ کا ایک شاہکار ہے، اسے ایک فرانسیسی انجینئر فرڈیننڈ ڈی لیسپس نے کھودا تھا، اس نہر نے بحرِ قلزم کو بحرِ روم سے ملا دیا ہے اور اس کی وجہ سے ہندوستان اور یورپ کے درمیان تجارت کی بڑی سہولت حاصل ہو گئی ہے۔

زمانہ قدیم سے انسانی تمدن کو موجودہ حالت پر پہنچانے میں جو وجوہ بروئے کار رہے ہیں ان میں ہندوستان کی تجارت کو شاید خاص اہمیت حاصل رہی ہے، اس زمانہ سے جس کی یاد تاریخ کے حافظہ میں بھی محفوظ نہیں ہے، ہندوستان صنعت و تجارت کے معاملہ میں دوسرے تمام ملکوں کو مات دے کر آگے نکل گیا تھا، ایک صدی پہلے تک دنیا میں ہندوستان کے بنائے ہوئے سوتی کپڑے، کپاس، جیوٹ، مسالے، چاول، ہیرون اور موتیوں کی مانگ رہتی تھی اور یہ سب چیزیں ہندوستان سے سپلائی کی جاتی تھیں۔ مزید براں ہندوستان کے ریشمی اور اونی کپڑوں کا کوئی جواب نہیں تھا اور کمخواب جیسا کپڑا دنیا کے کسی ملک میں تیار نہ ہوتا تھا۔ مزید براں ہندوستان میں مختلف اقسام کے مسالے پیدا ہوتے تھے لہٰذا یہ قدرتی بات تھی کہ جو ملک ذرا سا متمدن ہوتا اسے ان چیزوں کی احتیاج ہوتی اور وہ ان چیزوں کے لئے ہندوستان پر انحصار کرتا، اس تجارت کے دو راستے تھے، ایک خشکی کا راستہ —— براہ افغانستان و ایران دوسرا سمندر کا راستہ —— براہ بحرِ قلزم! ایران کو فتح کرنے کے بعد سکندرِ اعظم نے اپنے ایک جنرل نیارشس کو اس کام پر مامور کیا تھا کہ وہ بحری شاہراہ تلاش کرے جو بحرِ قلزم سے ہوتی ہوئی دریائے سندھ کے دہانے تک پہنچے، بہت سے لوگ شاید اس حقیقت سے واقف نہیں ہیں کہ بابل، روم، ایران اور یونان جیسے قدیم ممالک کی امارت و دولت بڑی حد تک ہندوستان کی تجارت پر منحصر تھی، روم کے زوال کے بعد سلطنت اسلامیہ میں بغداد اور اٹلی میں وینس اور جینیوا ہندوستان کے تجارتی مال کی زبردست منڈیاں بن گئے تھے، مزید براں جب ترکوں کو اقتدار حاصل ہوا اور انہوں نے خود کو سلطنت روم کا حکمراں بنا لیا

تو ہندوستان و اٹلی کے درمیان جس راستہ سے تجارت ہوا کرتی تھی انہوں نے اس راستے کو بند کر دیا، چنانچہ کرسٹوفر کولمبس (کرسٹوبل کوسن) ایک سپینی یا جینوسی باشندہ اس غرض سے نکلا کہ وہ براہ بحر اوقیانوس ہندوستان کے سفر کے لئے ایک نیا راستہ ڈھونڈھنے کی کوشش کرے، اس کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ کولمبس امریکہ جا پہنچا اور اس نے ایک نئے براعظم کو دریافت کیا۔ امریکہ پہنچ کر بھی کولمبس اسی خوش فہمی میں مبتلا رہا کہ "یہ ہندوستان ہے" چنانچہ امریکہ کے قدیم باشندوں کو آج تک "انڈین" کہا جاتا ہے۔ ویدوں میں ہمیں دونوں نام ملتے ہیں "سندھو" اور "اندو" ایرانیوں نے "اندو" کا تلفظ "ہندو" کر لیا اور یونانیوں نے "انڈین" اسی سے لفظ "انڈیا" اور "انڈین" وضع ہوئے، مسلمانوں کے عروج کے زمانہ میں لفظ ہندو کے معنی میں ایک طرح کی گراوٹ آئی اور یہ لفظ اپنے معنی میں ایک سیاہ فام شخص کے لئے استعمال کیا جانے لگا جیسا کہ اب بھی یہ لفظ "غلام" کے ہم معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

اسی اثنا میں پرتگالیوں نے براعظم افریقہ کا چکر کاٹ کر ہندوستان پہنچنے کے لئے ایک نیا راستہ دریافت کر لیا، ہندوستان نے پرتگالیوں کی قسمت چمکا دی، پھر فرانسیسیوں کی باری آئی، اس ولندیزی، ڈینس اور انگریز ہندوستان آتے رہے، ہندوستان کی تجارت، آمدنی کے وسائل اور ریونیو وغیرہ سب کچھ ان دنوں انگریزوں کے ہاتھ میں ہے، لہذا وہ تمام اقوام سے آگے نکل گئے ہیں اور سربلند و سرفراز ہیں لیکن جو پیداوار ہندوستان کی تھی اب وہ دوسرے ممالک میں بھی پیدا ہونے لگی، جیسے امریکہ وغیرہ میں اور یہ مبالغہ نہیں ہے کہ امریکہ وغیرہ میں ہندوستان سے بھی بہتر پیداوار ہو رہی ہے اس لئے ہندوستان کی اہمیت و حیثیت گھٹتی جا رہی ہے، یورپین اس کا اقرار کرنے کو رضامند نظر نہیں آتے کہ ہندوستان — غلاموں کا ہندوستان — ہی ان کی دولت اور ان کے تمدن کی تعمیر کا خاص وسیلہ ہے۔ اس حقیقت کا یا تو وہ اعتراف کرنا نہیں چاہتے یا انہیں اس کا کوئی احساس ہی نہیں ہے ہم خود بھی اس احساس سے بیگانہ ہیں اور اپنے ملک کے لوگوں کو ہم نے یہ حقیقت ابتک نہیں سمجھائی ہے حالانکہ اسے سمجھانا چاہیئے۔

ذرا اس بات کو اپنے دماغ میں تولئے، ہندوستان کے کسانوں، نوکروں اور دیگر پسماندہ طبقات جن کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی، جنہیں بدیشیوں نے فتح کر لیا ہے اور فاتحین جنہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں درحقیقت وہ طبقات ہیں جو غیر معینہ مدت سے صبر و سکون کے ساتھ کام کرتے چلے آتے ہیں اور جنہوں نے اپنی محنت کا معاوضہ تک نہیں لیا ہے، لیکن قوانین فطرت کی مطابقت میں ساری دنیا کے اندر بڑی بڑی تبدیلیاں آ رہی ہیں، ممالک میں، تمدنوں میں اور حکومتوں میں انقلاب آ رہا ہے۔ اے ہندوستان کے محنت کشو! تمہاری خاموش اور لگاتار محنت کی بدولت بابل، ایران، سکندریہ، یونان، روم، وینس، جینوا، بغداد، سمرقند، سپین، پرتگال، فرانس، ڈنمارک، ہالینڈ اور انگلینڈ یکے بعد دیگرے اقتدار اور بالادستی حاصل کرتے رہے ہیں اور دنیا میں انہیں ناموری اور شہرت ملتی رہی ہے، مگر آپ

کو کیا ملا ہے؟ آپ نے یہ کب سوچا ہے؟ آپ کو یہ سوچنے کی مہلت کہاں ہے؟ میرے عزیز سوامی! آپ کے آباؤاجداد نے چند فلسفیانہ کتابیں تصنیف کیں، لگ بھگ ایک درجن رزمیہ نظمیں کہہ ڈالیں یا چند مندر تعمیر کئے ــــ کل اتنا کام ہے لیکن اس پر بھی آپ نے دادِ تحسین کے شور سے آسمان سر پر اٹھالیا ہے مگر ان لوگوں کی تعریف و تحسین کی کسی کو فکر نہیں ہوتی جنہوں نے اپنا خون پسینہ ایک کرکے دنیا کو یہ ترقی دی ہے، روحانیت، جنگ اور شاعری میں عالمگیر شہرت پانے والے چند ہیروز تو سب کی نگاہوں میں ہیں اور انسان برادری سے انہوں نے عقیدت و ارادت کا خراج بھی وصول کیا ہے لیکن جدھر کوئی شخص بھی ایک نگاہ اٹھاکر نہیں دیکھتا، جہاں کوئی بھی حوصلہ افزائی کا ایک لفظ تک نہیں کہتا ــ جہاں ہر شخص نفرت کرتا ہے، اس ماحول میں زندگی بسر کرنے والے ہمارے پرولتاری رات دن اپنے گھروں میں بیٹھے اپنے فرائض انجام دیا کرتے ہیں اور زبان پر اُف تک نہیں لاتے، ان کا صبر بے پناہ ہے ان کی محبت بے حد ہے ان کی قوت عمل کی کوئی انتہا نہیں ہے کیا ان پرولتاریوں کے اس جذبہ خدمت اور ادائیگی فرض میں کوئی "ہیروازم" نہیں ہے؟ جب بھی انہیں کوئی بڑا کام پیش آتا ہے تو ان میں سے بہت سے عظیم ہیرو ثابت ہوتے ہیں۔ بزدل تک اپنی جان کی قربانی دیدیتے ہیں۔ انتہائی خود غرض آدمی تک بے لوث ثابت ہوتا ہے مگر کب؟ جبکہ اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے جبکہ اس کا دل بڑھایا جاتا ہے اور اس کی تعریف و توصیف کی جاتی ہے، مگر ان کا درجہ کتنا بلند ہے جو چھوٹے چھوٹے کاموں اور چھوٹے چھوٹے فرائض بھی تندہی اور بے غرضی سے انجام دیتے ہیں۔ ایشور ان پر اپنا کرم کرے یہ لوگ اپنی خدمات کا تذکرہ تک نہیں کرتے اور خاموشی سے اپنے فرائض انجام دیتے رہتے ہیں انہیں نہ ستائش کی تمنا ہے نہ صلے کی پروا! ــــ اے ہندوستان کے محنت کشو! آپ ایسے ہی بے لوث اور بے غرض لوگ ہیں! اے ہندوستان کے محنت کشو! آپ کو ہمیشہ کچلا گیا ہے مگر میں آپ کی عظمت کے آگے ادب سے اپنا سر جھکاتا ہوں۔

یہ نہر سوئز بھی زمانہ قدیم کی ایک چیز ہے، مصر میں جب فرعونوں کی حکومت تھی تو اس عہد میں بہت سی سمندری جھیلوں کو نہروں کے ذریعہ ایک دوسرے سے جوڑ دیا جاتا تھا اور اس طرح ایک ایسی نہر بن جاتی تھی جو ایک سمندر سے شروع ہو کر دوسرے سمندر تک جاتی تھی جب مصر روم سلطنت کے زیر نگیں آیا تب بھی وقتاً فوقتاً اس امر کی کوشش کی جاتی رہی کہ دونوں سمندروں کے درمیان نہری راستہ کھلا رہے، پھر مسلم جنرل عمرو بن عاص نے جب مصر کو فتح کیا تو انہوں نے بھی نہر کی ریت کھدوائی اور کئی دوسری تبدیلیاں کیں تاکہ آمدورفت آسانی سے جاری رہ سکے۔

اس کے بعد کسی نے اس جانب کوئی خاص توجہ نہیں کی، موجودہ نہر مصر کے خلیفہ اسمٰعیل نے جو سلطان ترکی کی جانب سے مصر کے گورنر تھے، اس نہر کو کھدوانے کا فرانس نے مشورہ دیا تھا اور اس کی کھدوائی کے لئے سرمایہ

فرانس ہی نے فراہم کیا تھا۔ یہ نہر چونکہ ریگستان میں ہے اس لئے بار بار اس میں ریت بھر جاتی ہے اور ہمیشہ ہی یہ مشکل پیدا ہوتی رہتی ہے اس کی چوڑائی بس اتنی ہے کہ ایک وقت میں بس ایک ہی بڑے سائز کا تجارتی جہاز اس میں سے گزر سکتا ہے، کہا جاتا ہے کہ بہت بڑے جنگی اور تجارتی جہاز اس میں سے نہیں گزر سکتے، اس اندیشہ کے تحت کہ آنے جانے والے جہاز ایک دوسرے سے ٹکرا نہ جائیں نہر کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ہر حصہ کے دونوں سروں کو اتنا چوڑا کر دیا گیا ہے کہ ان دو یا تین جہاز لنگر ڈال کر کھڑے ہو سکیں، ہیڈ آفس بحر روم کے کنارے پر ہے اور نہر کے ہر سیکشن میں ریلوے اسٹیشنوں کی طرح اسٹیشن بنے ہوئے ہیں جیسے ہی ایک جہاز نہر کے اندر داخل ہوتا ہے ویسے ہی ہیڈ آفس کو تار کے ذریعہ اطلاع دیدی جاتی ہے۔ ایسے ٹیلیگرام ہیڈ آفس کو متواتر موصول ہوتے رہتے ہیں اور اسے پتہ رہتا ہے کہ کتنے جہاز ایک طرف سے آ رہے ہیں اور کتنے جہاز دوسری طرف جا رہے ہیں اور نہر میں کس کس جگہ ان کی کیا پوزیشن ہے۔ ہیڈ آفس میں ایک نقشہ ہوتا ہے جس پر ان جہازوں کی پوزیشن نشانات کے ذریعہ دکھائی جاتی ہے۔ جہازوں کے تصادم کا خطرہ ٹالنے کے لئے ہر جہاز کو یہ ہدایت ہوتی ہے کہ جب تک اسے لائن کلیر نہ مل جائے اس وقت تک وہ اپنے اسٹیشن سے روانہ نہ ہو۔

نہر سوئز فرانسیسیوں کے ہاتھ میں ہے، اگرچہ کینال کمپنی کے حصص کی بڑی تعداد انگریزوں کی ملکیت ہے اور انہوں نے ایک سیاسی معاہدہ کے تحت یہ حصص خرید لئے ہیں لیکن اس کے باوجود نہر کا نظم و نسق فرانسیسیوں کے ہاتھ میں ہے۔

یہ بحیرہ روم ہے! ہندوستان کے باہر اس سے زیادہ یادگار علاقہ اور کوئی نہیں ہے، یہاں ایشیا، افریقہ اور قدیم تمدن ختم ہو جاتا ہے، یہاں ایک قسم کے رواج و رسوم رہن سہن کے طریقے اور عادات و اطوار ختم ہوتے ہیں اور دوسری قسم کا لباس، خوراک، عادات و اطوار، رہن سہن کے طریقے شروع ہوتے ہیں — گویا ہم یورپ میں داخل ہو گئے — صرف اتنا ہی نہیں بلکہ یہاں رنگوں، نسلوں، تمدنوں، ثقافتوں اور رواجوں کا تاریخی امتزاج نظر آتا ہے، جو صدیوں میں ظہور پذیر ہوا اور جس کی کوکھ سے نئے تمدن نے جنم لیا، یہ مذہب، کلچر اور تمدن کی زبردست طاقت جس نے پوری دنیا کو اپنے حصار میں لے رکھا ہے، درحقیقت ان ہی علاقوں میں پیدا ہوئی تھی جو بحیرہ روم کے آس پاس واقع ہیں۔ اس کے جنوب میں مصر ہے جو قدیم ترین ملک ہے،

بہرطور سوامی جی آپ نے بہت سے ملکوں، دریاؤں، پہاڑوں اور سمندروں کو دیکھا ہے اب ذرا زمانہ قدیم کی تاریخ کا تھوڑا سا ذکر سنیئے! زمانہ قدیم کے بہت سے عجائبات محض افسانہ نہیں ہیں، ان میں سچائی ہے — میں جو تھوڑی بہت معلومات ہیں وہ یونان کے قدیم مورخین نے اپنے ذہن سے ایجاد کی ہیں اور انہیں ایک افسانہ بنا دیا ہے یا پھر یہودیوں کی دینیات میں جس کو بائبل کہا جاتا ہے یہ قدیم تاریخ ان کو اس طرح

بیان کیا گیا ہے کہ وہ ایک پُراسرار کرشمہ معلوم ہوتی ہے، اب جو آثار قدیمہ برآمد ہوئے ہیں اور ان ممالک کی قدیم زبانوں کے مفاہیم و مطالب سمجھنے کی جو کوشش کی گئی ہے اس سے ان ممالک کی تاریخ کے بارے میں انتہائی قیمتی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ اور یہ معلومات ہمارے دلوں میں ان قدیم ممالک کے لئے توصیف و تعریف کا پیدا کرتی ہیں، اب بھی مزید آثار برآمد ہو سکتے ہیں اور کون جانتا ہے کہ مستقبل میں ان قدیم ممالک کے متعلق جو معلومات حاصل ہوں گی وہ کتنی حیرتناک ہوں گی ؟ تمام ملکوں کے بڑے بڑے دانشوررات دن ان قدیم دنوں کی تاریخ ڈھونڈھنے میں سرگرداں ہیں جو زمانہ کی اتھاہ گہرائی میں ڈوب گئی ہے۔ ایک ٹوٹا ہوا برتن زمین سے نکل آتا ہے تو وہ اس پر بھی اپنی عقل کھپانے لگتے ہیں۔

مسلمانوں کے خلیفہ حضرت عثمان نے جب قسطنطنیہ پر قبضہ کیا اور پورے مشرقی یورپ میں جب اسلام کا پرچم لہرانے لگا تو وہ کتابیں اور علوم وفنون کے وہ ذخائر جو یونانی دانشوروں کی طاقتور اولاد نے اپنے پاس چھپاکر رکھے تھے مغربی یورپ میں منتقل ہونے لگے، اس لئے کہ یہ یونانی مسلمانوں سے پسپا ہوکر مغربی یورپ میں پھیل رہے تھے اس حد تک یونانیوں کا مسیحیت پر احساس ہے چنانچہ انجیل یونانی زبان میں لکھی گئی اور روم کی پوری سلطنت میں مسیحیت کا بول بالا ہوا۔ لیکن قدیم یونانی جنہیں ہم یونٓن کے نام سے جانتے ہیں، یورپین تمدن کے پہلے معلم ہیں اور عیسائیوں سے بہت پہلے ان کا تمدن اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا، جب سے یونانیوں نے مسیحیت کو قبول کیا ہے تب سے ان کے تمام علوم وفنون اور ان کی تہذیب کے چراغ گل ہوگئے ہیں لیکن ان کے آباؤ اجداد کی ثقافت کا کچھ حصہ اب بھی چونکہ ہندو گھرانوں میں محفوظ ہے، لہٰذا ان یونانیوں کے ذریعہ سے جنہوں نے مسیحیت اختیار کر لی تھی یہ کتابیں تمام یورپ میں پھیلیں! یہ ہی انگریزوں، جرمنوں، فرانسیسیوں اور دوسری اقوام کی تہذیبوں کا پہلا سرچشمہ اور پہلا ماخذ ہے، چنانچہ یونانی علوم حاصل کرنے اور یونانی آرٹ سیکھنے کا ایک شوق پیدا ہوا۔ انہیں ان کتابوں میں جو چیز ملیں سب سے پہلے انہوں نے ان میں سے ایک ایک چیز کو چاٹ لیا، پھر اپنی ذہانت سے کام لے کر ان میں اضافہ کرنا شروع کیا اور اس طرح سائنس کی ابتدا اور اس کی ترقی کا آغاز ہوا، وہ اب تک ان قدیم کتابوں پر ریسرچ کرتے رہتے ہیں اور ان کتابوں کے ایک ایک موضوع پر انہیں کامل مہارت حاصل ہو چکی ہے۔ ان یونانیوں کی تمام کتابوں پر جو عیسائی نہیں تھے اظہارِ خیال کرنے کی پوری آزادی تھی لیکن مسیحت کی جو کتابیں تھیں اُن پر تنقید و نکتہ چینی قطعاً ممنوع تھی، اس کے نتیجہ میں ایک نئی سائنس نے جنم لیا —— یعنی داخلی اور خارجی تنقید!

مثال کے طور پر فرض کیجئے کہ کسی کتاب میں یہ لکھا ہے کہ فلاں فلاں واقعہ فلاں فلاں تاریخ کو رونما ہوا لیکن یہ بات کیا محض اس بنا پر اپنی قطعی حیثیت میں تسلیم نہیں کی جاسکتی ہے کہ کسی شخص نے اسے اپنی

مرضی سے اپنی کتاب میں درج کر دیا ہے، قدیم زمانہ کے لوگوں کا یہ دستور تھا کہ بہت سی چیزیں وہ اپنے قیاس سے لکھ دیا کرتے تھے۔ مزید براں انہیں فطرت اور اس دنیا کا بہت کم علم تھا جس میں ہم رہتے ہیں ان وجوہ سے ان چیزوں کے بارہ میں بھی سنگین شبہات پیدا ہوتے ہیں جو ایک کتاب میں پوری تصدیق و توثیق کے بعد لکھی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر فرض کیجئے کہ کسی یونانی مورخ نے یہ بات لکھی ہے کہ فلاں فلاں زمانہ میں ہندوستان میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا جس کا نام چندر گپت تھا، اب اگر ہندوستان کی کتابوں میں بھی یہی لکھا ہوا ہے کہ فلاں فلاں زمانے میں ہندوستان کا حکمراں چندر گپت تھا۔ تو یہ بات بڑی حد تک پایہ ثبوت کو پہنچ جائے گی لیکن پکا ثبوت تب ہی ملے گا جب چندر گپت کے زمانہ کے چند سکے بھی دستیاب ہو جائیں اور وہ عمارتیں بھی برآمد ہو جائیں جو اس کے عہد کو ظاہر کرنے والی ہوں۔

فرض کیجئے کہ کسی کتاب میں سکندر اعظم کے عہد میں رونما ہونے والے کسی خاص واقعہ کی تفصیلات دی گئی ہیں لیکن اس میں روم کے ایک یا دو ایسے بادشاہوں کا تذکرہ بھی موجود ہے جو سکندر اعظم کے عہد میں نہیں گزرے تو اس سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ متذکرہ کتاب سکندر اعظم کے زمانہ کی تصنیف نہیں ہے۔

پھر ایک بات زبان کی بھی ہے، ہر زبان میں وقت کے ساتھ ساتھ تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے اور ہر عہد کے مصنف کا خصوصی اسلوب ہوا کرتا ہے اگر ایک کتاب کا طرز نگارش مصنف کی خصوصی طرز سے قدرے مختلف ہے تو پھر اس کتاب کے بارے میں شبہات پیدا ہو جایا کرتے ہیں، یعنی یہ کہ وہ کتاب جس مصنف کی بتائی جاتی ہے آیا وہ اس کی تصنیف ہے کہ نہیں لہذا کتابوں کی تصدیق و توثیق اور ان کی صحت و صداقت کو پرکھنے کے لئے ایک خصوصی علم معرض وجود میں آیا۔

مزید براں جدید سائنس نے بڑی تیزی سے تمام چیزوں پر روشنی ڈالنی شروع کر دی ہے اس لئے جن کتابوں میں ایسے واقعات درج ہیں جو ماورائے خطرات ہیں اس کے بارہ میں شبہات پیدا ہو گئے ہیں اور اب ان پر یقین اور بھروسہ نہیں کیا جائے گا۔

سونے پہ سہاگہ یہ کہ یورپ میں سنسکرت کی تعلیم ایک طوفانی لہر کی طرح دوڑ گئی ہے ہندوستان کی قدیم کتابوں کا مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ دریائے فرات کے کناروں پر اور مصر میں جو مندر وغیرہ برآمد ہوئے ہیں ان کا جائزہ لیا جا رہا ہے اور صدیوں سے جو چیزیں زمین اور پہاڑی غاروں میں دفن تھیں ان کے برآمد ہونے سے قدیم ممالک کی تاریخ کا صحیح مطالعہ شروع ہوا ہے۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ تحقیق و تدقیق کی نئی سائنس نے بائیبل اور نئی انجیل کو تو اٹھا کر ایک طاق میں رکھ دیا ہے، کوڑھیوں پر اب تشدد اور ظلم کا کوئی خطرہ تو نہیں ہے اگر کوئی اندیشہ ہے تو بس سماجی رسوائی کا لیکن

اس سماجی رسوائی کا ملکین اس سماجی رسوائی سے قطع نظر بہت سے مفکرین نے ان کتابوں کو بھی اپنی تحقیق اور اپنے تجربہ کا موضوع بنایا ہے۔ ہمیں امید رکھنی چاہیئے کہ ہندو اور دوسری قدیم کتابوں کو بھی اپنی تحقیق و تدقیق کا عنوان بنائیں گے اور بے رحمی کے ساتھ ان کا تجزیہ کریں گے، اور وقت آئے گا کہ وہ یہودیوں اور عیسائیوں کی کتابوں کی تحقیق اور تجزیہ میں بھی جرأت دکھائیں گے۔ میں یہ بات کیوں کہتا ہوں ہمجھے اس کی وضاحت کرنے دیجئے! مصریات کے موضوع پر لکھنے والے ایک مشہور و معروف مصنف اور ایک عظیم ساونت ماسپیرو نے مصریوں اور بابلیوں کی ایک ضخیم تاریخ لکھی ہے ہسٹری انشین اورنٹیل Histoire Ancienne Orientale. ایک انگریز مہندس نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے چند برس ہوئے جب میں نے انگریزی ترجمہ پڑھا تھا اس مرتبہ جب میں برطانوی عجائب گھر کے ایک لائبریرین سے مصر اور بابل کے متعلق بعض کتابوں کے بارہ میں دریافت کیا تو مجھے ماسپیرو کی کتاب کا حوالہ دیا گیا لیکن جب اسے یہ پتہ چلا کہ میرے پاس کتاب کا انگریزی ترجمہ موجود ہے تو اس نے بتایا کہ اس ترجمہ سے کام نہیں چلے گا کیونکہ مترجم کسی حد تک متعصب عیسائی تھا اور ماسپیرو کی تحقیقات کے دوران میں جہاں کہیں کبھی مسیحیت پر کوئی آنچ آئی ہے تو مترجم نے اصل کتاب کی عبارت کو توڑ مروڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں ماسپیرو کی اصل کتاب پڑھوں جو فرانسیسی زبان میں ہے اور جب میں نے اصل کتاب پڑھی تو مجھے پتہ چلا کہ اس نے جو بات لکھی تھی وہ ٹھیک ہی تھی ـــــ یہ کیسا عجیب معاملہ ہے! آپ جانتے ہیں کہ مذہبی تعصب کیسی ہیبتناک چیز ہے! ـــــ یہ صداقت کو کذب سے اور حق کو باطل سے بدل دیتی ہے اس بنا پر ان تحقیقی کتابوں کے ترجموں پر اب مجھے کوئی اعتماد نہیں رہا ہے۔

ایک اور علم معرض وجود میں آیا ہے ـــــ یعنی علم الاقوام یا انسانوں کے رنگ، بال، قوئی، سر کی ساخت زبان اور اسی طرح کی دیگر چیزوں کا مطالعہ کرکے مختلف درجوں میں ان کی درجہ بندی کرنا اس سائنس کا فائدہ ہے جرمن اگرچہ تمام علوم میں مہارت تامہ رکھتے ہیں لیکن سنسکرت اور قدیم اسیری تہذیب کے علم میں انہیں خصوصی مہارت حاصل ہے بینفے اور دوسرے جرمن دانشور اس دعویٰ کا بہترین ثبوت ہیں۔ فرانسیسیوں کو مصریات میں مہارت تامہ حاصل ہے، ولندیزیوں کو یہودیوں اور قدیم عیسائی مذہب کی تاریخ پر کامل عبور حاصل ہے ـــ کیونن جیسے مصنفین کو عالمگیر شہرت حاصل ہے، انگریز بہت سے علوم کا آغاز کرتے ہیں لیکن پھر انہیں چھوڑ دیتے ہیں۔

اب میں آپ کو ان فاضلوں کی بعض رائیں بتاتا ہوں، اگر آپ ان کے خیالات کو پسند نہ کریں تو ان کے بارے میں آپ جتنا چاہیں خلاف رکھیں لیکن برائے مہربانی مجھ کو کوئی الزام نہ دیں۔

ہندوؤں، یہودیوں، مصریوں، بابلیوں اور قدیم دوسری نسلوں کے بیانات کے مطابق تمام انسان

ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ آج کل کے لوگ اب ایسے نظریہ میں عقیدہ نہیں رکھتے۔

کیا آپ نے کبھی ان کافروں کو دیکھا ہے جن کا رنگ انتہائی کالا، ہونٹ انتہائی موٹے، ناک چپٹی، بال گھونگھر والے اور ماتھا انتہائی تنگ ہوتا ہے؟ مزید براں آپ نے سنتھالوں، انڈیمان کے باشندوں اور بھیلوں کو بھی دیکھا ہوگا جن کے ایسے ہی خد وخال ہوتے ہیں لیکن قد کسی قدر پستہ ہوتا ہے اور بالوں میں گھونگھر کسی حد تک کم ہوتا ہے پہلی قسم کے لوگوں کو نیگرو کہا جاتا ہے اور یہ افریقہ میں بستے ہیں، دوسری قسم کے لوگوں کو نیگریٹو (کم حد تک نیگرو) کہا جاتا ہے اور زمانہ قدیم میں یہ نیگریٹو عرب کے بعض حصوں میں دریائے فرات کے کنارے پر، ایران کے جنوبی حصہ میں، پورے ہندوستان میں، انڈیمان اور دیگر جزائر میں قریب قریب آسٹریلیا تک بسے ہوئے تھے۔

کیا آپ نے تبتیوں، بھوٹیوں اور چینیوں کو دیکھا ہے جن کا رنگ سفید یا زرد ہوتا ہے اور جن کے بال سیدھے اور کالے ہوتے ہیں، ان کی آنکھیں کالی ہوتی ہیں لیکن دونوں آنکھیں اس طرح لگی ہوتی ہیں کہ وہ ایک زاویہ بناتی ہیں ان کی داڑھی اور مونچھ میں بہت کم بال ہوتے ہیں۔ چہرا چکلا ہوتا ہے اور رخسار کی ہڈیاں ابھری ہوئی ہوتی ہیں۔ کیا آپ نے نیپالیوں، برمیوں، سیامیوں، ملایوں، اور جاپانیوں کو دیکھا ہے؟ ان کی ساخت بھی ایسی ہی ہوتی ہے مگر ان کے قد چھوٹے ہوتے ہیں۔

ان دونوں اقسام کے لوگ منگول اور منگولی کہلاتے ہیں۔ ایشیا کے زیادہ تر حصہ پر ان دنوں منگول چھائے ہوئے ہیں، یہی منگول ہیں جو مختلف شاخوں میں منقسم ہیں، مثلاً کلمک ہن، چینی، تاتار، ترک، منچو، کرگیز وغیرہ یہ خانہ بدوشیوں کی زندگی بسر کرتے رہے، خیموں میں رہا کرتے تھے، بھیڑیں، بکریاں، مویشی اور گھوڑے پالتے تھے اور جب بھی انہیں موقع ملتا تھا ٹڈی دل کی طرح دنیا کے مختلف حصوں پر ٹوٹ پڑتے تھے — اس معاملہ میں بس چینی اور تبتی ہی مستثنیٰ کیے جا سکتے ہیں ان منگولوں کو تورانی بھی کہا جاتا تھا۔ "ایران توران" کی کہاوت میں جو توران ہے وہ یہی ہے۔

قدیم مصر اور قدیم بابل میں ایک نسل رہتی تھی جس کا رنگ گہرا ہوا کرتا تھا، بال سیدھے ہوتے تھے، ناک ستواں ہوتی تھی اور آنکھیں بڑی اور سیدھی ہوتی تھیں، یہی نسل اب ہندوستان میں آباد ہے اور خصوصیت سے جنوبی حصہ میں! یورپ میں بھی اس نسل کے مختلف مقامات پر آثار دکھائی دیتے ہیں۔ اس نسل کے لوگوں کو اصطلاحاً دراوڑ کہا جاتا ہے۔

ایک اور نسل تھی جس کا رنگ سفید آنکھیں سیدھی لیکن کان اور ناک بھتوڑی سے خمیدہ اور سر پر بھتوڑی سی موٹی، ماتھا تنگ اور ہونٹ موٹے ہوا کرتے تھے — مثال کے طور پر شمالی عرب کے لوگ یا عصر حاضر کے یہودی، یا قدیم زمانہ کے بابلی اور اسیری وغیرہ ان کی بھاشاؤں کا ایک ہی سرچشمہ تھا اور انہیں سمیتی نسل

کہا جاتا تھا۔

اور وہ لوگ آریہ کہلاتے تھے جو سنسکرت سے علاقہ رکھنے والی ایک زبان بولتے تھے جن کی ناک ستواں، دہانہ اور آنکھیں سیدھی، رنگ صاف، بال کالے یا بھورے اور آنکھیں کالی یا نیلی ہوا کرتی تھیں۔

تمام جدید نسلیں انہی نسلوں کے اختلاط سے پیدا ہوتی ہیں جس ملک میں ان میں سے ایک یا دوسری نسل کے لوگوں کا غلبہ رہا ہے اس میں اسی نسل کا ناک نقشہ اور اسی کی زبان پائی جاتی ہے۔

مغرب میں اس نظریہ کو بالعموم نہیں مانا جاتا کہ گرم ملک کے لوگوں کا رنگ کالا ہوتا ہے اور سرد ملکوں کے باشندوں کا رنگ گورا اور صاف ہوتا ہے، بہتوں کی رائے یہ ہے کہ کالے اور گورے کے درمیان جو مختلف شیڈ پائے جاتے ہیں وہ نسلوں کے اختلاط کا نتیجہ ہیں۔

مفکرین اور علماء کے نزدیک مصر اور بابل کا تمدن سارے تمدنوں میں سب سے زیادہ قدیم تھا۔ مکانات اور دیگر عمارتوں کے جو آثار ان ممالک میں برآمد ہوئے ہیں ان کے بارہ میں یہ اندازہ ہے کہ وہ چھ ہزار سال قبل مسیح یا اس سے بھی کچھ پہلے کے ہیں، ہندوستان میں جو سب سے قدیم عمارت دریافت ہوئی ہے وہ زیادہ سے زیادہ چندر گپت کے زمانہ کی ہے گویا تین سو سال قبل مسیح کی! اس سے زیادہ قدیم زمانہ کی عمارتیں اب تک دریافت نہیں ہوئی ہیں[1] لیکن ایسی کتابیں وغیرہ ہیں جو اس زمانہ سے بہت پہلے کی ہیں اور جو کسی دوسرے ملک میں موجود نہیں ہیں، پنڈت گنگا دھر تلک نے ایسی شہادتیں فراہم کی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے، ہندوؤں کے وید مسیحت کا دور شروع ہونے سے کم از کم پانچ ہزار برس پہلے موجود تھے۔

بحیرہ روم کے یہ سواحل یورپین تہذیب کا گہوارہ ہیں جس نے اب پوری دنیا کو فتح کر لیا ہے۔ ان علاقوں پر سمیتی نسلیں مثلاً مصری، بابلی، اسرائیلی اور آریائی نسلیں مثلاً ایرانی، یونانی اور رومی ایک دوسرے سے مخلوط ہوئیں اور ان کے اختلاط سے موجودہ یورپ کے تمدن نے جنم لیا۔

مصر میں پتھر کی ایک بڑی سی لاٹ برآمد ہوئی ہے جس پر عبارت کندہ ہے۔ اس پر لکھی ہوئی عبارت کا رسم الخط دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں کچھ حروف یونانی حروف سے مشابہ ہیں، اس لاٹ پر تین قسم کی تحریریں کندہ ہیں۔ ایک فاضل نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان تینوں تحریروں کا ایک ہی مطلب ہے اس کا یہ

---

[1] ہڑپہ اور موہنجوڈارو کے جو آثار شمال مغربی ہندوستان میں برآمد ہوئے ہیں ان کا پتہ ۱۹۲۲ء تک نہیں چلا تھا۔ یہ آثار اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ تین ہزار سال قبل مسیح میں ایک ترقی یافتہ شہر آباد تھا اور اس سے ہندوستان کے تمدن کا پتہ چلتا ہے۔

بیان ہے کہ قدیم مصری رسم الخط میں اس عیسائی نسل کے حروف تہجی بھی مخلوط ہو گئے تھے جو مصر میں آباد تھی اور قدیم مصریوں کی اولاد تھی، اسی طرح کی کچھ اینٹیں اور ٹائل بابلی زمانہ کی نکلی ہیں اور ان پر جو عبارتیں کندہ ہیں ان کا رسم الخط بھی یکساں ہے۔ مزید براں کچھ تحریریں ہندوستان میں بھی برآمد ہوئی ہیں جو اشوک اعظم کے زمانہ کی ہیں اور ان کے حروف کی ساخت ہل جیسی ہے، اس سے پہلے کی تحریریں ہندوستان میں دریافت نہیں ہوئیں۔[1] مصر کے مندروں وغیرہ پر جو قدیم تحریریں کندہ ہیں اب ان کا مفہوم سمجھا جا رہا ہے اور ان سے مصری تہذیب و تمدن کی قدامت کا مزید پتہ چل رہا ہے۔

مصری سمندر عبور کرکے ایک جنوبی ملک سے مصر میں آئے تھے جسے پنت کہا جاتا ہے، بعض مفکرین کی یہ رائے ہے کہ جس ملک کا نام پنت بتایا جاتا ہے وہ درحقیقت موجودہ مالابار ہے اور یہ کہ مصری اور دراوڑ دونوں ہی ایک نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے پہلے بادشاہ کا نام مینس تھا اور یہ کہ ان کا قدیم مذہب ہماری دھارمک کہانیوں سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے، بھگوان شیبو نے دیوی نوی کو اپنے محاصرہ میں لے رکھا تھا۔ بعد میں ایک اور بھگوان سہو آیا اور اس نے دیوی نوی کو بھگوان شیبو کے محاصرہ سے بزور چھڑا لیا، دیوی نوی کا بدن آسمان بن گیا اور اس کے دونوں ہاتھ اور ٹانگیں آسمان کے چار ستون بن گئے اور بھگوان شیبو زمین بن گئے دیوی نوی کا بیٹا اوسیرس اور بیٹی اسیس مصر کے خصوصی دیوتا اور دیوی ہیں اور ان کا بیٹا "ہورس" ہے جس کی مورتی کی پوجا ساری دنیا میں کی جاتی ہے ان تینوں کی ایک گروپ میں پوجا کی جاتی ہے یعنی اسیس کی ایک گائے کی صورت میں علیحدہ بھی پرستش کی جاتی ہے۔

جس طرح زمین پر دریائے نیل ہے اسی طرح آسمان پر بھی ایک دریائے نیل ہے اور زمین پر بہنے والا دریائے نیل اسی کا ایک حصہ ہے جو آسمان پر بہہ رہا ہے، مصریوں کے عقیدے کے مطابق سورج دیوتا ایک کشتی میں بیٹھ کر زمین کا چکر لگاتا ہے اور وقتاً فوقتاً ایک سانپ جس کا نام "رہی" ہے اسے نگل لیا کرتا ہے اور جب سورج دیوتا سانپ کے مونہہ میں ہوتا ہے تو اس وقت گہن لگتا ہے، چاند پر ایک سور حملہ آور ہوتا ہے اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے، پھر چاند کو اپنی اصل شکل میں آنے تک پندرہ دن لگ جایا کرتے ہیں، مصر میں جن مورتیوں کی پوجا کی جاتی ہے ان میں سے بعض کی صورت گیدڑ جیسی ہے، بعض کی صورت عقاب جیسی ہے اور بعض کی صورت گائے جیسی ہے۔

---

[1] وادی سندھ کا رسم الخط جس زمانہ میں رائج تھا وہ زمانہ سمیری اور مصری تمدنوں کا زمانہ ہے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور تمدن تھا جو دریائے فرات کے کنارے ابھر رہا تھا، بآل موش، استارت اور دموزی اس تمدن کے خصوصی دیوتا تھے، استارت کو ایک گڈریہ سے محبت ہوگئی جس کا نام دموزی تھا، ایک سور نے دموزی کو ہلاک کر دیا جس پر استارت اس کی جستجو میں تحت الثریٰ تک گئی وہاں پہنچنے پر وہ ایک اور دیوی الات کے جنگل میں پھنس گئی اور آلات نے اس پر بے حد ظلم کئے، انجام کار استارت نے یہ فیصلہ کر لیا کہ جب تک اسے دموزی دوبارہ دستیاب نہیں ہوگا اس وقت تک وہ زمین پر واپس نہیں جائے گی، یہ بڑی مشکل کی بات تھی اس لئے کہ وہ جنسی تحریک کی دیوی تھی اور جب تک کہ وہ زمین پر واپس نہ آتی اس وقت تک نہ انسان ہی کی افزائش نسل ہو سکتی تھی نہ جانور اور نباتات ہی کی نسلیں فروغ پا سکتی تھیں۔ تب دیوتاؤں نے یہ سمجھوتہ کر لیا کہ دموزی ہر برس چار ماہ تک تحت الثریٰ میں بسر کیا کرے گا اور سال کے باقی آٹھ مہینوں میں وہ زمین پر رہے گا۔ تب استارت واپس زمین پر آئی اور پھر موسم بہار آیا اور خوب پیداوار ہوئی۔

دموزی کا ایک نام اور بھی ہے — اسے ادونوی یا ادونس بھی کہتے ہیں، سمیتی نسلوں کے مذاہب تھوڑے تھوڑے سے فرق سے قریب قریب ایک ہی تھے۔ بابلی، اسرائیلی اور عرب مدتوں تک ایک ہی طریقہ سے پرستش کرتے رہے۔ قریب قریب ہر دیوتا کو موش کہا جاتا تھا یہ لفظ بنگالی زبان میں اب بھی مالک (حکمراں) اور ملوک (سلطنت) کی شکل میں رائج ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جس دیوتا کو الات کہا جاتا تھا اس کا نام بعد میں عربوں نے "اللہ" کے لفظ سے بدل لیا تھا۔

ان دیوتاؤں کی پرستش کے بعض بعض طریقے بہت ہیبتناک تھے۔ موش بآل کے سامنے زندہ بچوں کو جلایا جاتا تھا، استارت کے مندر میں جنسی خواہش کو فطری اور غیر فطری طریقہ سے تسکین دینے کا رواج عام تھا۔

بابلی نسل کی تاریخ سے اسرائیلیوں کی تاریخ نسبتاً قریبی زمانہ کی ہے بعض مفکرین کا خیال ہے کہ جس کتاب کا نام بائیبل ہے وہ یسوع مسیح کی ولادت سے پانچ سو برس پہلے لکھی گئی تھی یا یہ کہ مسیحت کا دور شروع ہونے سے کچھ عرصہ قبل لکھی گئی تھی۔ بائیبل کے بہت سے اجزا جن کے بارہ میں یہ مفروضہ ہے کہ وہ پہلے لکھے گئے تھے درحقیقت بہت پہلے کے لکھے ہوئے ہیں اور بائیبل کے خصوصی موضوعات دراصل بابلیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ بابلیوں کا علم کائنات اور قیامت کا تصور بجنسہ بائیبل میں شامل کر لیا گیا ہے۔ مزید براں ایشیائے کوچک میں ایرانی بادشاہوں کی حکومت کے زمانہ میں بہت سے ایرانی عقائد و نظریات اسرائیلیوں نے اختیار کر لئے تھے، قدیم عہد نامہ کے مطابق "سب کچھ بس یہ دنیا ہی ہے اس کے بعد نہ کوئی زندگی ہے، نہ کوئی روح ہے"۔ نئی انجیل زندگی ابعد از موت کا عقیدہ اور شیطان کا تصور ملتا ہے، جو خالص پارسی عقیدہ ہے۔

مذہب یہود کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں یادوے مولش کی پرستش ہوتی ہے لیکن یہ لفظ اہل یہود کی زبان کا نہیں ہے، بعض علماء کی رائے کے مطابق یہ مصری زبان کا لفظ ہے، لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ اہل یہود کی زبان میں یہ لفظ کب داخل ہوا، بائبل میں یہ تفصیلات ملتی ہیں کہ اسرائیلی مدت مدید تک مصر کے اندر محصور رہے لیکن یہ بات اب تسلیم نہیں کی جاتی اور ابراہیم و اسحٰق نیز یوسف کی شخصیتیں محض افسانہ معلوم ہوتی ہیں۔

یہودی جہاں یادوے کا نام لیتے ہیں اس کا استعمال اس مقام پر نہیں کرتے جہاں وہ" ادونوں" کا نام لیا کرتے ہیں، جب یہودی دو شاخوں میں بٹ گئے یعنی" اسرائیل" اور" افرائم" میں تو ان کے دو مندر دو الگ الگ ملکوں میں تعمیر ہوئے۔ جو مندر اسرائیلیوں نے تعمیر کیا وہ فلسطین میں تھا اور اس میں مادے کی مورتی تھی اور اس مورتی میں عورت اور مرد دونوں کے اعضائے جسمانی جڑے ہوئے تھے۔ یہ مورتی ایک محراب میں رکھی ہوئی تھی۔ اور دروازہ پہ ایک بڑا عضوِ تناسل رکھا ہوا تھا۔ افرائم میں یادوے کی مورتی بہت بڑے بیل کی صورت میں تھی جس پر سونا چڑھا ہوا تھا۔ ان دونوں جگہوں پر یہ رواج تھا کہ بڑے بیٹے کی مورتی کے سامنے جلتی ہوئی آگ میں قربانی دی جاتی تھی اور دونوں مندروں میں بہت سی عورتیں رہا کرتی تھیں۔ وہ مندر میں رہ کر عصمت فروشی کرتی تھیں اور ان کی جو آمدنی ہوا کرتی تھی وہ مندر پر صرف کی جاتی تھی۔

اسی اثناء میں یہودیوں میں لوگوں کا ایک طبقہ پیدا ہوا جس نے موسیقی یا رقص کے ذریعہ مورتیوں کی موجودگی کو اپنا ذریعہ معاش بنالیا۔ ان لوگوں کو انبیاء کہا گیا، ان میں سے اکثر کو ایرانیوں کی صحبت میں رہنے کا موقع ملا تھا اور جو لوگ ایرانیوں کی صحبت میں رہے تھے وہ مورتی پوجا، عصمت فروشی، بیٹوں کی قربانی اور ایسے ہی دیگر رواجوں کی سخت مخالفت کرنے لگے، بتدریج انسانی قربانی کی جگہ تزکیہ نفس کی خاطر عضوِ تناسل کو کاٹ کر مورتی پر چڑھایا جانے لگا عصمت فروشی اور مورتی پوجا وغیرہ رفتہ رفتہ ختم ہوتی گئی، دریں اثناء انہی انبیاء میں سے مسیحت کا آغاز ہوا۔

اس بات پر سخت اختلاف ہے کہ آیا" یسوع" نام کا کوئی شخص کبھی پیدا بھی ہوا تھا کہ نہیں، نئی انجیل چار کتابوں پر مشتمل ہے، ان میں سے ایک سینٹ جون کی کتاب کو اس بنا پر مسترد کردیا گیا ہے کہ اس کا ماخذ غلط ہے۔ باقی تین کے بارہ میں یہ رائے ظاہر کی جاتی ہے کہ وہ کسی قدیم کتاب کی نقل ہیں اور یہ کہ کتاب بھی یسوع مسیح کے بعد کسی زمانہ میں لکھی گئی تھی۔

مزید براں اس زمانہ میں جس میں یسوع کی یہودیوں کے درمیان ولادت کہی جاتی ہے، دو مشہور مورخ پیدا ہوئے ایک فیلو اور دوسرا جوسفس ان مورخین نے یہودیوں کے چھوٹے چھوٹے فرقوں تک

کے حوالے دیئے ہیں لیکن یسوع یا عیسائیوں کا کوئی معمولی سا حوالہ بھی نہیں دیا ہے، انہوں نے اس بات تک کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے کہ رومن جج نے یسوع کو مصلوب کرنے کی سزا دی تھی، جوسفس کی کتاب میں اس بارہ صرف ایک سطر ملتی ہے لیکن اب یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ یہ سطر بعد کے کسی زمانہ میں بڑھائی گئی ہے۔ اس زمانہ میں یہودیوں پر رومی حکومت کر رہے تھے اور یونانی علوم و فنون کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ انہوں نے یہودیوں کے متعلق بہت سی باتیں لکھی ہیں لیکن نہ تو یسوع کے بارہ میں کوئی تذکرہ کیا ہے نہ عیسائیوں کے متعلق!

ایک اور مشکل بھی ہے یعنی یہ کہ جو کہاوتیں، جو عقائد اور جو نظریات نئی انجیل میں ملتے ہیں وہ مسیحیت کا عہد شروع ہونے سے بہت پہلے یہودیوں میں موجود تھے اور مختلف ذرائع سے یہودیوں میں آئے تھے، یہ خیالات ہیں جو مفکرین اور علماء ظاہر کرتے ہیں لیکن اپنی آبرو کی خاطر وہ خود اپنے مذہب کے بارے میں بے سوچے سمجھے ایسی رائیں ظاہر نہیں کر سکتے جو وہ دوسروں کے مذاہب کے متعلق اکثر ظاہر کردیا کرتے ہیں، اس لئے وہ سوچ سمجھ کر اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں — اور اس کا نام ہے اعلیٰ اور معیاری تنقید!

مغرب کے علماء دور افتادہ ممالک اور مختلف نسلوں، مختلف مذہبوں اور مختلف رواجوں کی چھان بین کر رہے ہیں لیکن ہمارے بنگال میں اس طرح کی کوئی تحقیق نہیں ہو رہی ہے اور یہ ہو بھی تو کیسے ہو؟ ایک شخص اگر ایک ایسی کتاب کے ترجمہ میں دس برس تک لگاتار محنت و مشقت کرتا رہے تو وہ کھائے گا کیا؟ اور اس کتاب کو چھاپنے کے لئے کثیر سرمایہ کہاں سے آئے گا؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارا ملک بہت غریب ہے دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں عملی طور پر علوم کی تخم ریزی نہیں ہو رہی ہے کیا کبھی وہ دن آئیں گے جب ہم اپنے ملک میں مختلف علوم و فنون کی تخم ریزی کریں گے؟ ”یہ بات تو بس ایشور ہی جانتا ہے جو گونگوں کو قوت گویائی دے سکتا ہے اور اپاہجوں کے پہاڑ عبور کرا سکتا ہے۔“

جہاز نیپلز کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہے — گویا ہم اٹلی پہنچ گئے ہیں، اٹلی کا پایہ تخت روم ہے — وہی روم جو کبھی سلطنت رومہ کا پایہ تخت بھی رہا ہے — اپنے زمانہ کی سب سے زیادہ طاقتور سلطنت! جس کی سیاست، جس کی عسکریت اور فوجی حکمت عملی جس کا نو آبادیاتی نظام اور فتوحات آج تک ساری دنیا کے لئے ایک مثال بنی ہوئی ہیں۔

نیپلز سے جہاز روانہ ہو کر بس مارسلیز میں قیام کرے گا اور وہاں سے سیدھا لندن کے لئے روانہ ہو گا۔

آپ یورپ کے بارے میں پہلے ہی بہت کچھ سن چکے ہیں، یورپ کے لوگوں کی خورائی کیا ہے، لباس کیسا ہے

ان کے عادات واطوار اور رسوم ورواج کیا ہیں، یہ سب باتیں آپ جانتے ہیں، اس لئے ان کے متعلق مجھے کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں لیکن یورپین تہذیب و تمدن، اس کا ماخذ، ہمارے ساتھ اس تہذیب و تمدن کا تعلق نیز یہ کہ ہمیں کس حد تک اس تہذیب و تمدن کو اختیار کرنا چاہیئے یہ ایسے عنوانات ہیں جن کے بارے میں مجھے آئندہ بہت کچھ کہنا ہے، جسم شخصیتوں کا آئینہ دار نہیں ہے میرے بھائی، اس لئے میں اس کے بارے میں کسی دوسرے وقت بات چیت کروں گا! لیکن اس کا فائدہ کیا ہے ؟ بہرطور اس دنیا میں کون ہے جو باتوں اور گپ شپ میں ہمیں (بنگالیوں کو) مات دے سکتا ہے، اگر آپ کر سکتے ہیں تو کچھ عمل کر کے دکھائیے! اپنی زبان کو خاموش رکھیئے اور اپنے عمل کو بولنے دیجئے! لیکن میں سرسری طور پر ایک بات کہنی چاہتا ہوں! یعنی یہ کہ یورپ نے اس تاریخ سے ترقی شروع کی ہے جس تاریخ سے علم اور قوت اس کے غریب طبقات میں پھیلنی شروع ہوئی، دوسرے ملکوں کے سینکڑوں غریب لوگ جو گھاس کوڑے کی طرح ایک طرف کو پھینک دیئے جاتے ہیں امریکہ آنے پر اپنے رہنے کو ایک ٹھکانہ پا لیتے ہیں، انہیں ایک مکان مل جاتا ہے اور یہی لوگ ہیں جو درحقیقت امریکہ کے لئے اس وقت ریڑھ کی ہڈی بنے ہوئے ہیں، امراء اور علماء آپ کی بات سنیں یا نہ سنیں اس کا کوئی فرق نہیں پڑتا، اصل بات یہ ہے کہ آپ خود سمجھیں اور آپ ہی اپنی تعریف کریں یا اپنے اوپر ملامت کریں، امراء اور علماء تو محض زیور کی حیثیت رکھتے ہیں جو اس ملک کی سجاوٹ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے لیکن اس ملک کی زندگی جن پر منحصر ہے وہ ہیں یہ غریب اور پسماندہ لوگ! یہی اس ملک کی روح ہیں، یہی زندگی ہے، مٹھی بھر لوگوں کے خیالات عمل اور قول میں اگر اتحاد ہو تو وہ دنیا کو اس کے محور سے اٹھا کر پھینک سکتے ہیں، اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کیجئے! جتنی زیادہ مخالفت ہوگی اتنا ہی اچھا ہوگا، جب تک دریا کے راستے میں رکاوٹیں نہیں آتیں اس وقت تک اس کے بہاؤ میں زور پیدا نہیں ہوتا، ایک چیز جتنی نئی اور جتنی اچھی ہوگی اس کی مخالفت بھی اتنی ہی زیادہ کی جائے گی، یہ مخالفت ہوتی ہے جو کامیابی کی نوید دیتی ہے، جہاں مخالفت نہیں ہے وہاں کامیابی نہیں ہے —— اچھا رخصت!

ہمارے یہاں یہ بات مشہور ہے کہ جس آدمی کے تلوے میں چکر بنا ہوتا ہے وہ جہاں گشت ہوا کرتا ہے، مجھے ڈر ہے کہ کہیں میرے پاؤں کا تلوا ان ہی چکروں سے بھرا ہوا نہ ہو اور شاید کسی دوسرے نشان کے لئے ان چکروں کی وجہ سے میرے تلوے میں کوئی گنجائش ہی نہ رہی ہو میں نے ان چکروں کو ڈھونڈھنے کی بڑی کوشش کی ہے اور اپنے پاؤں کا تلوا خوب غور سے دیکھا ہے لیکن مجھے کوئی چکر نظر نہیں آیا۔ سردی کی وجہ سے تلوے بری طرح پھٹے ہوئے ہیں اور اس وجہ سے چکر وغیرہ کا کوئی نشان نظر ہی نہیں آتا بہرحال وقت کا رخ کون بدل سکتا ہے، اور میں آپ کو یہ

خط قسطنطنیہ سے لکھ رہا ہوں جو مسلمانوں کے اقتدار کی باقی رہ جانے والی آخری راجدھانی ہے۔

میرے ساتھ تین رفقائے سفر ہیں۔ ان میں سے دو فرانسیسی ہیں اور تیسرا امریکن ہے امریکن رفیق سفر مس میکلیوڈ کو آپ خوب اچھی طرح جانتے ہیں۔ فرانسیسی رفقائے سفر میں ایک موسیو جیوس بوئس ہیں جو مشہور فلسفی اور فرانسیسی ادب میں معروف ادیب کی حیثیت رکھتے ہیں، دوسری رفیق میڈم کالوی ہیں جو موسیقار کی حیثیت سے عالمگیر شہرت کی حامل ہیں۔ ان کی موسیقی کو اتنا پسند کیا جا سکتا ہے کہ محض موسیقی کے پروگراموں سے انہیں تین چار لاکھ روپیہ سالانہ کی آمدنی ہو جاتی ہے۔ ان سے میری پہلے ہی کی شناسائی ہے۔ مشہور اداکار میڈم سارہ برن باروت اور موسیقار کالوی صرف فرانسیسی زبان جانتی ہیں اور انگریزی سے نابلد ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ہر برس دو چار بار انگلستان اور امریکہ کا دورہ کرتی ہیں اور لاکھوں ڈالر اپنی اداکاری اور اپنی موسیقی سے کما لاتی ہیں۔ فرانسیسی مہذب دنیا کی زبان ہے۔ مغرب کے اشراف اس زبان میں خاص شغف رکھتے ہیں اور ہر شخص اسے جانتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں خواتین انگریزی سیکھنے کا ذرا سا بھی رجحان نہیں رکھتیں۔ میڈم برن باروت اگرچہ معمر خاتون ہیں لیکن جب وہ لباس پہنکر سٹیج پر آتی ہیں تو ان کی عمر پر پردہ پڑ جاتا ہے اور وہ بہترین اداکاری کرتی ہیں۔ وہ نہ صرف لڑکی بلکہ لڑکے کا کردار بھی ادا کرتی ہیں اور دونوں کردار ادا کرنے میں انہیں مہارت تامہ حاصل ہے۔ آپ جو اداکاری بھی چاہیں ان سے پوری خوبی اور پورے سلیقہ کے ساتھ کرا سکتے ہیں اور وہ حیرت ناک آواز ——— شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو! یہاں کے لوگ کہتے ہیں کہ اس کی آواز میں نقرئی گھنگھرو بجتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ میڈم برن باروت کے دل میں ہندوستان کی بڑی عزت ہے۔ وہ مجھ سے بار بار کہتی ہیں کہ آپ کا ملک بہت قدیم اور بہت مہذب ہے۔ ایک مرتبہ انہوں نے ایک ڈرامہ کیا تھا جو ہندوستان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس ڈرامہ میں انہوں نے سٹیج پر ہندوستان کی ایک سڑک کا منظر دکھایا تھا ——— مرد، عورتیں، بچے، سادھو اور ہر چیز ——— جو ہندوستان کی خصوصیت کو ظاہر کرتی تھی۔ اس ڈرامہ کے بعد انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ تقریباً ایک ماہ تک مختلف عجائب گھروں میں گھومتی پھرتی رہی تھیں تاکہ ہندوستانی مردوں، عورتوں اور ان کے لباس کے بارہ میں پوری آگاہی حاصل کریں اور ہندوستان کی ہر چیز سڑکوں اور گھاٹوں وغیرہ کے متعلق خوب اچھی طرح معلومات حاصل کرلیں۔ میڈم برن باروت

ہندوستان آنے کی بڑی گہری خواہش رکھتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ ہندوستان کے سفر کا میں اپنی
زندگی میں ایک خواب دیکھا کرتی ہوں، مزید برآں پرنس آف ویلز[1] نے اس سے وعدہ کیا
ہے کہ وہ انہیں شیر اور ہاتھی کے شکار کی مہم پر اپنے ہمراہ لے جائیں گے لیکن اس وقت ان کا
یہ کہنا تھا کہ اگر وہ ہندوستان گئیں تو ان کے دو لاکھ روپے صرف ہو جائیں گے۔ بے شک
ان کے پاس روپیہ کی کوئی کمی نہیں ہے، ان کا نام ہے ــــــ آسمانی حور سارا! اور آسمانی
حور کو روپیہ کی کمی کیا ہو سکتی ہے، وہ سوائے سپیشل ٹرین کے کبھی عام ریل گاڑی میں سفر نہیں
کرتیں ــــــ یہ شان و شوکت تو یورپ کا کوئی شہزادہ بھی نہیں رکھ سکتا۔ ان کا پروگرام
ایک شخص محض اسی وقت دیکھ سکتا ہے جب وہ دوگنا کرایہ دیکر ایک ماہ پہلے ہی اپنی نشست
محفوظ کرالے، ورنہ ان کے پروگرام میں کسی کو جگہ نہیں مل سکتی۔ ایسی حالت میں انہیں روپے
کی کیا کمی ہو سکتی ہے۔ لیکن سارا برن ہارڈت یہ روپیہ خرچ کرنے میں بہت کھلا ہاتھ رکھتی
ہیں اس لئے ان کا سفر ہندوستان فی الحال ملتوی ہو گیا ہے۔

میڈم کالوی اس برس موسم سرما میں کوئی گیت نہیں گائیں گی بلکہ وہ مکمل آرام کریں
گی اور ان جگہوں پر مقیم رہیں گی جن کی آب و ہوا معتدل ہے، جیسے مصر وغیرہ۔ میں ان کے
مہمان کی حیثیت سے ان کے ہمراہ ہوں۔ کالوی نے اپنے آپ کو صرف موسیقی ہی کے لئے
وقف نہیں کر دیا ہے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور انہیں فلسفیانہ اور مذہبی ادب
کا مطالعہ کرنے کا بڑا شوق ہے۔ وہ انتہائی غریب گھرانہ میں پیدا ہوئی تھیں، آہستہ آہستہ
انہوں نے اپنی ذہانت اور اپنی مشقت سے یہ شہرت و عزت اور یہ دولت و خوش نصیبی
حاصل کی اور اب ان کی یہ پوزیشن ہے کہ بادشاہ بھی ان پر فخر کیا کرتے ہیں۔

اور بھی مشہور گانے والیاں ہیں، جیسے میڈم میلبا، میڈم رمارمس اور بہت سی تو شہرت
کی انتہا کو پہنچ چکی ہیں جیسے جین ڈی ریزکی، پلنکن وغیرہ اور ان میں سے ہر ایک سال میں
دو دو تین تین لاکھ روپیہ کما لیا کرتی ہیں۔ لیکن کالوی کے پاس جو فن ہے اس کی کوئی نظیر نہیں
ہے۔ غیر معمولی حسن و جمال، جوانی، ذہانت و فراست اور اس پر پرسوز آواز! ان سب چیزوں
نے مل جل کر انہیں موسیقاروں کی صف اول میں بھی سب سے نمایاں اور ممتاز جگہ دلا دی

---

[1] شاہ ایڈورڈ ہفتم آنجہانی ــــــ وہ اس وقت پرنس آف ویلز تھے۔

ہے۔ لیکن دکھ اور غریبی سے بہتر کوئی دوسرا معلم نہیں۔ بچپن میں انہوں نے انتہائی تکالیف اٹھائیں، انتہائی محنت ومشقت کی اور متواتر جدوجہد اور زندگی سے مقابلہ کی مسلسل کوشش نے انہیں کامیابی کی اس منزل پر پہنچایا ہے اور ان ہی وجوہ سے ان میں بے پناہ ہمدردی کا جذبہ بھی ہے اور متانت وسنجیدگی بھی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ مغرب میں مواقع بھی کثرت سے موجود ہیں۔ لیکن ہمارے ملک میں مواقع کا فقدان ہے۔ اگر ترقی کا جذبہ اور امنگ بھی ہو تو بھی مواقع کا قحط ہے۔ بنگالی عورتیں تعلیم حاصل کرنے کا شوق رکھتی ہیں لیکن مواقع کی کمی کے سبب ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوتی، اور بنگالی زبان میں پڑھنے کے لئے رکھا بھی کیا ہے، زیادہ سے زیادہ چند معمولی ناول اور چند ڈرامے! علم یا تو بدیشی زبان میں ہے یا پھر سنسکرت بھاشا میں ہے اور سنسکرت صرف چند ہی افراد پڑھتے ہیں مغربی ممالک میں مادری زبانوں میں بے شمار کتابیں موجود ہیں اور جب بھی کسی بدیشی زبان کی کوئی نئی کتاب آتی ہے اس کا فوراً ہی ترجمہ ہو جاتا ہے اور وہ عوام میں پیش کر دیا جاتا ہے۔

موسیو جیولس بوئس مشہور لکھنے والے ہیں، مختلف مذاہب اور قدیم کتابوں کے بارے میں تاریخی حقائق کی دریافت ان کا خاص موضوع ہے۔ انہوں نے ایک مشہور کتاب کا حال ہی میں اضافہ کیا ہے، جس میں انہوں نے شیطان کی پرستش، جادو اور اسی طرح کی دیگر چیزوں کی تاریخی نقطۂ نگاہ سے کھوج کی ہے اور وسطی یورپ میں ان چیزوں کے رواج کے زمانے سے لیکر اب تک اس کے جو آثار پائے جاتے ہیں ان سب کی مکمل تاریخی تفصیلات فراہم کی ہیں۔ وہ بہت اچھے شاعر بھی ہیں اور ہندوستان کے ویدانتی نظریات کی بڑی وکالت کرتے ہیں جو فرانس کے وکٹر ہیگو اور سیمارٹائن اور جرمنی کے گوئٹے اور دوسرے معروف ومشہور فرانسیسی اور جرمن شعرا کے کلام میں راہ پا گئے ہیں۔ یورپ کی شاعری اور فلسفہ پر ویدانت کا گہرا اثر ہے۔ ہر اچھا شاعر ویدانتی ہے اور جب بھی کوئی فلسفیانہ کتاب لکھی گئی ہے تو اس پر ویدانت کا اثر کسی نہ کسی شکل میں ضرور پڑا ہے، کچھ ہی لوگ ہیں جو اس بات کا اقرار نہیں کرتے کہ انہوں نے اپنے نظریات ویدانت سے مستعار لئے ہیں۔ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ ان کے نظریات ان کے اپنے دماغ کی ایجاد ہیں، اور ان کے اپنے ہیں، جیسے ہربرٹ سپینسر اور دوسرے! لیکن فلسفیوں کی اکثریت اس بات کا اقرار کرتی ہے کہ انہوں نے ویدانت سے بہت کچھ مستعار لیا ہے۔ ٹیلی گراموں،

ریلوں اور اخباروں کے اس زمانے میں سوا اقرار کرنے کے اور چارہ کار ہی کیا ہے؟ موسیو جیولس بوئس بہت ہی شائستہ اور شریف آدمی ہیں اور اگرچہ ان کی آمدنی کے وسائل بہت ہی معمولی ہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے بطور مہمان میرا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا، اور میں پیرس میں ان کے گھر میں ان کا مہمان رہا، اب وہ ہمارے ہم سفر ہیں۔

ہمارے دو ہم سفر اور بھی ہیں، یہ قسطنطنیہ تک ہمارے ساتھ سفر کریں گے یعنی پیری ہیاسنتھے (Père Hyacinthe) اور ان کی اہلیہ! پیری کے معنی ہیں پادری! فادر ہیاسنتھے رومن کیتھولک چرچ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے علم و فضل، ان کی خطابت اور شرافت و شائستگی کی بنا پر پورے فرانس میں ان کو بڑے احترام اور بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور پورے کیتھولک فرقے میں انہیں بڑا مرتبہ حاصل ہے فرانس کے عظیم شاعر وکٹر ہیگو نے فرانسیسی اسلوب کے جن دو آدمیوں کی تعریف کی ہے ان میں سے ایک پیری ہیاسنتھے ہیں۔ چالیس برس کی عمر میں انہیں ایک امریکن عورت سے عشق ہو گیا اور بالآخر انہوں نے اس سے شادی کر لی۔ اس واقعہ سے ایک سنسنی پھیل گئی اور انہیں فی الفور کیتھولک فرقہ سے خود کو علیحدہ کر لینا پڑا۔ اپنا چوغہ وغیرہ انہوں نے اتار دیا اور اس کی جگہ انہوں نے ہیٹ، کوٹ اور جوتے وغیرہ پہننا شروع کر دیئے اور پیری ہیاسنتھے کی جگہ اب وہ موسیو لوئس بن گئے ہیں۔ مگر میں ان کو ان کے پرانے ہی نام سے مخاطب کرتا ہوں۔ یہ بہت پرانی داستان ہے اور ایک زمانے میں پورے یورپ میں اس کا چرچا رہا ہے، پروٹسٹنٹوں نے اس کا خیر مقدم کیا لیکن کیتھولک ان سے نفرت کرنے لگے۔ پوپ کو ان کی سابقہ خدمات کا چونکہ اعتراف تھا اس لئے انہوں نے یہ مشورہ دیا کہ وہ رومن چرچ کو خیرباد نہ کہیں بلکہ یونان کے چرچ میں پادری کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتے رہیں۔ (یونانی چرچ کے پادری کو شادی کرنے کی اجازت ہے مگر وہ صرف ایک ہی بار شادی کر سکتا ہے۔ لیکن شادی کرنے کی بنا پر اسے کوئی اونچا مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔) مسز لوئس نے بہر حال انہیں زبردستی پوپ کے حلقہ سے باہر کھینچ لیا۔ اسی اثنا میں ان کی اولاد ہوئی اور ان کے پوتے پیدا ہوئے۔ اب وہ بہت بوڑھے ہو چکے ہیں اور اس غرض سے بیت المقدس جا رہے ہیں کہ وہاں رہ کر عیسائیوں اور مسلمانوں کے تعلقات میں خوشگواری پیدا کریں۔ ان کی اہلیہ کو بہت سے وجوہ سے یہ خیال تھا کہ لوئس دوسرا مارٹن لوتھر بن

جائے گا اور بحر روم میں پوپ کے اقتدار کا تختہ الٹ دے گا۔ لیکن ایسی بات ہوئی نہیں اور صرف اتنا ہی نتیجہ نکلا کہ فرانسیسی زبان کی ایک کہاوت کے مطابق وہ دو سٹولوں کے درمیان کھڑے رہے، مگر میڈم لوئس اب بھی اپنے دن کے خواب دیکھا کرتی ہیں۔ بوڑھے لوئس بہت ہی خوش گفتار ہیں، بہت ہی شائستہ اور بہت ہی غور و فکر کرنے والے انسان ہیں۔ جب بھی وہ مجھ سے ملتے ہیں تو مختلف مذاہب اور مختلف عقائد کے بارے میں طویل گفتگو کرتے ہیں لیکن اپنے مزاج اور اپنی طبیعت کی وجہ سے وہ اودیت سے تھوڑا سا خائف رہتے ہیں۔ میڈم لوئس کا میرے ساتھ جو رویہ ہے اس کے پیش نظر مجھے یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید وہ میری موافقت میں نہیں ہیں۔ جب بھی میں نجات، مکتی اور یوگ وغیرہ کے عنوانات پر گفتگو چھیڑتا ہوں اور موسیو لوئس کے بوڑھے سینے میں ان کے قدیم جذبات بھڑکنا شروع ہوتے ہیں تو ان کی اہلیہ فوراً ہی ان بھڑکتے ہوئے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش شروع کر دیتی ہیں باوجودیکہ فرانس کے سب ہی لوگ، جن میں مرد و زن دونوں شامل ہیں، سارا الزام ان کی اہلیہ کو دیتے ہیں کہ انہوں نے ان کے ایک عظیم راہب اور پادری کی زندگی خراب کر دی ہے۔ میڈم لوئس کو حقیقتاً بڑی صلواتیں سنائی جاتی ہیں خصوصیت سے اس وقت جب کہ وہ پیرس میں مقیم ہوتی ہیں جو کیتھولک لوگوں کا مرکز ہے۔ وہ کیتھولک ایک شادی شدہ پادری کو بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کوئی بھی کیتھولک یہ بات برداشت نہیں کر سکتا کہ ایک شادی شدہ شخص مذہب کی تبلیغ کرے اور مذہب کی تعلیم دے۔ مزید یہ کہ میڈم لوئس تھوڑی سی جھکی بھی ہیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے ایک ایکٹریس سے یہ کہتے ہوئے اپنی ناپسندیدگی ظاہر کی تھی کہ شادی کے بغیر تمہارا فلاں شخص کے ساتھ رہنا سہنا بہت ہی بری بات ہے۔ اس کے جواب میں ایکٹرس نے کہا ——— "میں آپ سے ہزار درجے بہتر ہوں۔ میں ایک عام آدمی کے ساتھ رہتی سہتی ہوں، ہو سکتا ہے کہ میں نے قانونی طور پر اس سے شادی نہ کی ہو لیکن آپ تو بہت بڑی گناہگار ہیں، اس لئے کہ آپ نے ایک پادری سے شادی کر کے اس کے دھرم کو خراب کر ڈالا ہے اور اس کی تمام مذہبی قسمیں توڑ ڈالی ہیں۔ اگر آپ کو اس پادری سے اتنا ہی عشق تھا تو آپ اس کی داسی بن کر کیوں نہ رہیں، اس سے شادی کر کے اسے برباد کیوں کیا اور کیوں اسے ایک راہب کی زندگی ترک کر کے ایک گھر گرہست کی زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور کر دیا۔"

بہر طور میں سب کچھ سنتا ہوں اور خاموش رہتا ہوں لیکن بوڑھے پیری ہیاسنتھے بہت ہی اچھی طبیعت کے مالک ہیں۔ صلح جو اور خوش مزاج۔ وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ بہت خوش رہتے ہیں ــــــــ فرانس کے تمام لوگ اس کے خلاف اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ میرے خیال میں اگر ان کی اہلیہ ایک سیڑھی نیچے اتر آئیں تو ساری باتیں ٹھیک ہو جائیں گی لیکن ایک چیز میں نے محسوس کی ہے اور وہ یہ کہ ہر ملک کی عورتیں اور مرد مختلف زاویوں سے ایک چیز کو دیکھتے ہیں اور ان کے غور و فکر کے طریقے مختلف ہوا کرتے ہیں۔ مرد کا ایک زاویہ نگاہ ہوتا ہے تو عورت کا دوسرا۔ مرد ایک بات پر ایک خاص زاویہ سے گفتگو کرتا ہے تو عورت دوسرے زاویہ سے بحث کرتی ہے۔ مرد کو موقع ملتا ہے تو وہ سارا الزام عورتوں پر رکھ دیتا ہے اور عورت کو موقع ملتا ہے تو وہ سارا قصور مردوں کو لگانے لگتی ہیں۔

مجھے ان عورتوں اور مردوں کے ساتھ ہونے سے ایک فائدہ پہنچا اور وہ یہ کہ سوا ایک امریکن خاتون کے باقی کوئی بھی انگریزی نہیں جانتا اور انگریزی میں بات چیت نہیں ہوتی بلکہ مجھے ان سے بات چیت کرنے کے لئے فرانسیسی زبان بولنی اور سننی پڑتی ہے۔[1]

پیرس سے روانگی کے وقت ہمارے دوست میکسم نے ہمیں مختلف مقامات کے تعارف نامے مجھے دیدیئے تھے تاکہ میں سب ملکوں کو ٹھیک ٹھیک طریقے سے دیکھ سکوں۔ میکسم، مشہور "میکسم گن" کے موجد ہیں۔ اس بندوق سے آٹومیٹک طریقہ پر لگاتار گولیاں چلتی ہیں اور کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔ میکسم جنم سے امریکن ہیں لیکن اب وہ انگلستان میں بس گئے ہیں اور یہاں انہوں نے اپنی گن فیکٹریز کھول رکھی ہیں۔ اگر کوئی شخص میکسم کی موجودگی میں ان کی بندوق کی تعریف کرتا ہے تو وہ خوشی سے پھول جاتے ہیں اور پھر یہ بات کہتے ہیں کہ میرے دوست میں نے کچھ ایجاد کیا ہے وہ ایک تباہ کن اور ہلاکت آفریں انجن کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ "میکسم" چین اور ہندوستان کے بہت بڑے مداح ہیں، نیز مذہب اور فلسفہ کے عنوانات پر بہت خوب لکھتے ہیں۔ انہوں نے میری تصانیف کا مطالعہ کیا ہے اس لئے میری بڑی عزت کرتے ہیں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ میرے بہت بڑے مداح ہیں۔ وہ تمام بادشاہوں

---

[1] مغرب میں یہ دستور ہے کہ بات چیت بالعموم اس زبان میں کی جاتی ہے جو مجلس کے سب ہی لوگوں کی سمجھ میں آتی ہو۔

اور حکمرانوں کو بندوقیں سپلائی کرتے ہیں اور ہر ملک میں متعارف ہیں۔ ان کے خاص دوست اگرچہ لی ہونگ چانگ ہیں لیکن ان کے دل میں چین کی جو عزت ہے اس کی وجہ کنفوشس کے نظریات وعقائد ہیں۔ وہ بسا اوقات اخبارات میں مضامین لکھتے ہیں اور چونکہ ان کے ذہن پر چین کا گہرا اثر ہے لہذا وہ عیسائیوں پر سخت تنقید کرتے ہیں اور اس طرح کے سوالات اٹھاتے ہیں کہ وہ کس وجہ سے چین گئے؟ ان کی نیت کیا ہے، ان کا مقصد کیا ہے وغیرہ وغیرہ! وہ قطعی طور پر اس بات کو برداشت نہیں کر پاتے کہ عیسائی مشنری چین جائیں اور مسیحیت کا پرچار کریں۔ ان کی اہلیہ بھی چین کی بڑی عزت کرتی ہیں اور مسیحیت سے انہیں بھی اپنے شوہر کی طرح سخت نفرت ہے۔ میکسم کے کوئی اولاد نہیں ہے، وہ بوڑھے آدمی ہیں اور ان کے پاس بے پناہ دولت ہے۔

دورہ کا پروگرام یہ ہے، پیرس سے وی آنا، وہاں سے بذریعہ ریل قسطنطنیہ، پھر بذریعہ سٹیمر ایتھنز اور یونان، تب بحر روم عبور کرکے مصر، پھر ایشیائے کوچک اور بیت المقدس وغیرہ۔ "اورئنٹل ایکسپریس" روزانہ پیرس سے قسطنطنیہ کے لئے چلتی ہے اور اس میں امریکن طرز کا سارا انتظام ہے، سونے بیٹھنے اور کھانے کی جگہیں ہیں لیکن امریکن ریل گاڑی کا انتظام بہت ہی اچھا ہوتا ہے۔ میں ۲۴ راکتوبر کو بذریعہ ریل پیرس سے روانہ ہوں گا۔

آج ۲۴ راکتوبر ہے، کل شام کو مجھے پیرس سے روانہ ہونا ہے۔ اس سال پیرس ساری مہذب و متمدن دنیا کا مرکز بنا ہوا ہے اس لئے کہ اس برس "نمائش پیرس" ہو رہی ہے، اور اس وجہ سے کرہ ارض کے کونے کونے سے یہاں ممتاز مرد اور معروف عورتیں آئی ہوئی ہیں۔ تمام ممالک کے دانشور اور فن کار آج پیرس میں مل رہے ہیں تاکہ وہ اپنے اپنے ملک کی عظمتوں کا اظہار اپنی ذہانت و فراست کے ذریعہ کریں۔ وہ آدمی خوش نصیب ہوگا جس کے نام کا آج اس عالمی مرکز میں ڈنکا بجے گا اور وہ ساتھ ہی ساتھ اپنے ملک کے سر پر عزت وافتخار کا تاج رکھے گا اور ساری دنیا اس کی عظمتوں کا نظارہ کرے گی۔ مگر اے میرے وطن — اے میرے بنگال! تیرا آرٹ کہاں ہے؟ یہ عظیم راجدھانی جرمن، فرینچ، انگلش، اطالوی اور دوسرے ممالک کے فنکاروں اور فاضلوں سے بھری ہوئی ہے لیکن اے میرے وطن، اے میرے بنگال! ان میں تیرے فنکار کہاں ہیں، تیرے فاضل کہاں ہیں؟ تیرا نام لینے والا کون ہے؟ کون ہے جو یہ اعلان کرے کہ تو بھی زندہ ہے، تو بھی موجود

ہے ۔۔۔۔ ان سفید فام فاضلوں کے ہجوم کے اندر سے ایک ممتاز نوجوان ہیرو اپنے وطن کا بول بالا کرنے کے لئے آگے بڑھا ۔۔۔۔ اپنے وطن بنگال کا نام اونچا کرنے کے لئے آگے آیا اور یہ ہیرو دنیا کا معروف سائنس داں ڈاکٹر جے سی بوس[1] ہے ۔۔۔۔ محض ایک بنگالی نوجوان سائنس داں ۔۔۔۔ اس کو دیکھتے ہی مغرب کے ذہین وفہیم فاضلوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی اور اس نے اپنے وطن کے نیم مردہ تن میں نئی زندگی پھونک دی اور بجلی کی رو کی طرح نئی روح دوڑا دی۔ فزکس کے تمام فاضل سائنس دانوں میں اس وقت جگدیش چندر بوس ہی کا نام سر فہرست ہے ۔۔۔۔ ایک ہندوستانی ۔۔۔۔ ایک بنگالی، کیا شاندار کارنامہ انجام دیا ہے انہوں نے ۔۔۔۔ شاباش، اے ہیرو شاباش! جس ملک میں بھی ڈاکٹر بوس اپنی مثالی اہلیہ کے ساتھ جاتے ہیں اپنے ملک کا بول بالا کر دیتے ہیں اور ہندوستان کی عظمت میں چار چاند لگا دیتے ہیں اور بنگال کا سر جذبہ افتخار سے بلند ہو جاتا ہے۔ دونوں پر ایشور کی کرپا رہے!

پیرس نمائش میں ممتاز و معروف مردوں اور عورتوں کی روزانہ کی مجلسیں بھی جن کے ایٹ ہوم کے اخراجات مسز لیگیٹ نے برداشت کئے ہیں، آج ختم ہو جائیں گی۔ ہر فن اور ہر علم کے فاضل مسز لیگیٹ کے گھر پر جمع ہوتے ہیں۔ ان میں شاعر، فلسفی، پینٹر، آرٹسٹ، سنگتراش، موسیقار وغیرہ سب ہی شامل ہیں۔ مرد بھی اور عورتیں بھی۔ مسز لیگیٹ انہیں روزانہ اپنے گھر پر مدعو کرتے ہیں اور انہیں ایٹ ہوم دیتے ہیں۔ ان کی مہمان نوازی، میزبانی اور مہربانی میں اتنی کشش ہے کہ ہر شخص ان کی دعوت پر کھنچا چلا آتا ہے۔ الفاظ کا بہاؤ، جیسے صاف و شفاف دریا بہتا ہے، پہاڑوں سے آبشار گرتا ہے۔ ہر طرف سے جذبات و احساسات کا اظہار جیسے آگ سے اٹھتے ہوئے شعلے لہراتے ہیں، فاضلوں کے معجز نما دماغوں سے خیالات کی متصادم لہریں نکلتی ہیں اور موسیقی کی تانیں گونج اٹھتی ہیں اور اس کے ملے جلے اثر سے ذہنوں میں یہ بات تک نہیں رہتی کہ ہم کہاں ہیں اور کس ماحول میں ہیں۔ لیکن آج یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔

اس زمین پر جو کچھ ہے اسے ختم ہو جانا ہے۔ آج ایک بار پھر میں پیرس نمائش کا چکر

---

[1] بعد میں سر کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔

لگاؤں گا ــــــ یہ فاضلوں کی بے نظیر مجلس ہے جو روئے ارض پر منعقد ہو رہی ہے۔

گذشتہ دو تین دن سے پیرس میں بارش ہو رہی ہے۔ اس تمام وقت میں سورج اپنا منہ چھپائے رہا ہے اور اس نے اپنا شاندار چہرہ نہیں دکھایا ہے۔ حالانکہ وہ اہل پیرس پر ہمیشہ ہی مہربان رہا کرتا ہے۔ اہل علم وفضل، ماہرین فنون اور آرٹسٹوں کی اس مجلس میں ذہانت وفراست کا جو مخفی دریا بہہ رہا ہے یا تو اسے دیکھ کر سورج پشیمان ہو گیا ہے اور اس نے اپنی پشیمانی کے عالم میں اپنے چہرے پر بادلوں کا نقاب اوڑھ لیا ہے یا پھر اس نے اس تاسف کی بنا پر اپنا منہ چھپا لیا ہے کہ لکڑی اور کینوس سے بنی ہوئی ان گنت رنگوں کی یہ حسین وخوشنما جنت اب ختم ہونے والی ہے۔

نمائش کا ختم ہونا ایک آفت ہے ــــــ اور ہم بھی اس آفت کو دیکھنے کی بجائے اس سے فرار ہو جانے میں مسرت محسوس کریں گے۔ اس جنت ارضی کی سڑکیں گھنٹوں گھنٹوں تک کیچڑ اور پانی سے بھر جائیں گی ــــــ آجکل پیرس ــــــ باغ جنت بنا ہوا ہے۔ ایک یا دو خصوصی عمارتوں کو چھوڑ کر باقی تمام مکانات اور عمارات پر لکڑی اور کپڑوں سے سجاوٹ کی گئی ہے۔ چونا کاری ہوئی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ساری دنیا بس پیرس میں سمٹ کر سما گئی ہے، اور جب یہ سب کچھ ٹوٹے گا تو چونے کی دھانس اُڑے گی اور فضا میں سانس لینا دوبھر ہو جائے گا، دم گُھٹنے لگے گا، سڑکیں میلی کچیلی ہو جائیں گی اور اگر بارش ہوتی رہی تو پھر اور بھی مصیبت ہو گی۔

---

## نوٹ

اس کے بعد سوامی جی نے پیرس سے وی آنا ہنگری اور رومانیہ تک کی سیاحت کی داستان انتہائی پُرلطف پیرائے میں قلمبند کی ہے اور پھر یونان اور ترکی کے متعلق اپنے تاثرات بیان کیئے ہیں یونان کے فنونِ لطیفہ، بالخصوص اس کے آرٹ اور فلسفہ پر ان کے نظریات بہت دلکش اور معلومات افروز ہیں قلتِ جگہ کی وجہ سے ہم اس حال کو بادلِ نخواستہ چھوڑ رہے ہیں، جس کے لئے ہم ناظرین کرام سے معذرت خواہ ہیں۔ (ایڈیٹر)